انسانی جرائم کی تاریخ
کولن ولسن
ترجمہ: یونس منصور
مشعل

ترتیب

انسانی جرائم کی تاریخ

کولن ولسن کہتا ہے کہ جب انسان نے کسی تالاب میں پہلی بار اپنی صورت دیکھی تو حیران رہ گیا۔

''اچھا! تو یہ 'میں' ہوں؟''

اور غضب ہو گیا، کہ پھر 'میں' کی خون آشام تلوار میان میں کبھی واپس نہیں گئی۔

تاریخ بدلتی رہی، ہاتھ بدلتے رہے مگر تلوار وہی رہی—— 'میں' کی تلوار—— کبھی اٹیلا کے ہاتھ میں لہرائی، کبھی ہلاکو کے ہاتھ میں بجلی بن کر چمکی—— صدیوں کا سفر طے کرتے ہوئے، ہاتھ بدلتے ہوئے—— آج یہ تلوار جس کے ہاتھ آئی ہے اس کا کوئی نام نہیں، کوئی چہرہ نہیں——

مگر اٹیلا ہو یا ہلاکو—— ایک دن میں وہ کتنے انسان قتل کر سکتے تھے؟ کتنی فصلیں، کتنے درخت اجاڑ سکتے تھے، جبکہ آج تلوار جس 'بے نام'، 'بے چہرہ' تلوار باز کے ہاتھ میں ہے وہ آنکھ جھپکنے میں بستیوں کی بستیاں اُجاڑ سکتا ہے۔

سکندرِ اعظم کے لیے جنگ محض عیاشی تھی۔ شاید اسے فاتح عالم کہلانے کا شوق تھا۔ اس نے انسانوں کی لاشیں رَوند کر اپنا شوق پورا کیا۔ ان انسانوں کی لاشیں، جن کے متعلق تاریخ نے کبھی نہیں بتایا کہ ان کے کیا خواب تھے، کیا آرزوئیں تھیں۔

پھر قتل کے جواز کی تلاش شروع ہوئی، مگر قتل کا کبھی کوئی جواز نہیں ہوتا۔ عالمی جنگ کے میدانوں میں، نہ شکاگو کے تہہ خانوں میں۔ ہر دور میں قاتل قتل کا جواز پیدا کرتا ہے، اپنے لیے بھی اور ان کے لیے بھی جنہیں اس سے بدلہ لینا ہوتا ہے۔

'میں' سے 'میں' ٹکراتی ہے، اور انسان ایک بار پھر خاک و خون میں غلطاں نظر آتا

ہے۔ کنفیوژن ہے ـــــ بے پایاں کنفیوژن ـــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کچھ دکھائی نہیں دیتا.. کسے مارنا ہے؟ کیوں مارنا ہے؟ گونگی اندھی تقلید ہے، ریموٹ کا بٹن دبنا ہے اور جیتے جاگتے انسان کو چھوٹے بڑے ٹکڑوں کی صورت فضا میں بکھر جانا ہے۔ جب کہ اس کا نام ان کی ہٹ لسٹ میں بھی نہیں۔

یہ ایک نیا شہر آشوب ہے۔

آج کا انسان ترقی یافتہ ہے۔ اس ترقی یافتہ انسان نے قتل کے 'ترقی یافتہ' طریقے دریافت کر لیے ہیں۔ ایسے طریقے کہ چشم زدن میں ناگاساکی اور ہیروشیما برپا ہو سکتے ہیں۔

تشدد ہمیشہ بے جواز ہوتا ہے۔ انسانی عقل کی ناکامی اور انسانی دانش کی شکست تشدد کا دوسرا نام ہے۔ مگر اس میدانِ جنگ میں ایک اور طاقت بھی ہمیشہ موجود رہتی ہے جو کسی کی غلام بنتی ہے نہ کسی کو غلام بناتی ہے۔ اس نے اپنی 'میں' پر فتح پائی ہے، وہی طاقت اس دُنیا کی آخری اُمید ہے۔

یہ کتاب کولن ولسن کی مشہور کتاب **A Criminal History of ManKind** کا خلاصہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۴ء میں چھپی تھی اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کولن ولسن نے ناول اور ادبی تنقید سے لے کر فلسفہ، مخفی علوم، جرائم اور نفسیات جیسے ہر موضوع پر کتاب لکھی ہے اور اس کی ہر کتاب مقبول ہوئی ہے۔ اب تک وہ ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھ چکا ہے۔ وہ ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوا اور اس کی پہلی کتاب **The Outsider**، ۱۹۵۶ء میں چھپی۔ کہتے ہیں اس کا گھر کتابوں سے بھرا ہوا ہے اور ہر موضوع پر کتابوں کے لیے اس نے الگ الگ سائبان بنا رکھا ہے۔

یونس منصور

لاہور

تعارف

میں قریباً بارہ برس کا تھا جب ایک بک شاپ میں مجھے ایچ جی ویلز کی کتاب 'آؤٹ لائن آف ہسٹری' کا اوریجنل ایڈیشن ملا۔ (جو 1920 میں شائع ہوا تھا) اس کے بعض حصے کھو جانے کی وجہ سے تھوڑی سی رقم کے عوض میں نے اسے خرید لیا۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے وہ شان دار رنگین تصاویر بہت اچھی لگیں جو پورے صفحات پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پر پتھر کے زمانہ سے بھی پہلے کے ڈائنا سور سے مشابہ مکروہ اور گھناؤنے اژدھے، پتھر کے زمانے سے تعلق رکھنے والے یورپ کے وہ وحشی اور خونخوار انسان جو اپنے غاروں میں داخل ہو رہے تھے اور رامسیز دوم کے چٹانوں جیسے قدر آور مجسمے اور ابوسمبل میں اس کے یادگار کھیل اور تماشے طبع تھے۔ میں ان میں اس طرح ڈوبا کہ یہ سنسنی خیز تجربہ ویلز کی تاریخ کو پرکاہ کی طرح بہا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ آج بھی میں جب ان تصویروں پر نظر ڈالتا ہوں تو ایک جادوئی مسرت میرے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ بالکل اس مسرت کی طرح جسے بچے ہمیشہ اس فقرے میں پاتے ہیں کہ 'ایک دفعہ کا ذکر ہے۔'

1946 میں 'پینگوئین' نے ویلز کی اَسّی ویں (80) سالگرہ کے موقع پر ''آؤٹ لائن آف ہسٹری'' کی دس جلدیں ایک بار پھر شائع کیں۔ ان کے ساتھ ''آؤٹ لائن . . '' کا خلاصہ بھی 'اے شارٹ ہسٹری آف دی ورلڈ' کے نام سے شائع کیا۔ یہی وہ ایڈیشن تھا جس کے آخر میں وہ مختصر سی تحریر دیکھی جس کا عنوان تھا 'ذہن مایوسی کی انتہا پر'۔ میں یہ تحریر پڑھ کر اتنا دل گرفتہ ہوا کہ دیواروں سے سر ٹکرانے کو جی چاہا۔ ''1940 سے واقعات کے ایک زبردست سلسلہ نے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ انسانی تاریخ شاید اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے اور وہ انسان جیسا کہ وہ اپنے آپ کو کہہ کر اِترایا کرتا تھا، homosapiens بازی ہار چکا ہے۔''

یہ بات دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں نہیں لکھی گئی تھی ورنہ شاید سمجھ میں آ جاتی۔ یہ انکشاف ہٹلر کی شکست کے بعد ہوا تھا۔ جب میں نے ''شارٹ ہسٹری . . '' کا ابتدائی ایڈیشن دیکھا تو 'آؤٹ لائن' کی طرح اس کا خاتمہ بھی پُر امید اور خوشگوار تھا۔ ''اب تک انسان نے جو چھوٹے چھوٹے کارنامے کیے ہیں اور جن کی تاریخ ہم بیان کر چکے ہیں، وہ اس آنے والے عہد کی طرف محض ایک اشارہ ہے جب انسان فی الحقیقت بڑے کارنامے سرانجام دے گا،'' اور 'آؤٹ لائن' کا خاتمہ اس نوید پر ہوتا ہے کہ ''دنیا لیگ آف نیشنز اور ورلڈ گورنمنٹ کے ذریعے امن حاصل کرلے گی؛'' اور یہ جملہ کہ ''جنگ کے خاتمہ کیلئے جنگ''، بھی ویلز کی ایجاد ہے۔

پھر کیا ہوا؟ کئی سال بعد میں نے ویلز کے ایک دوست، ایک انجیلی مؤرخ ہیو اسکوفیلڈ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ 'ویلز کو پورا یقین تھا کہ نسل انسانی کے ہر مسئلہ کا حل اس کے پاس ہے مگر جب اسے احساس ہوا کہ کوئی شخص اسے اہمیت نہیں دیتا تو وہ برا مان گیا اور اس کے مزاج میں تلخی آ گئی۔'' اس وقت تو یہ بات میں نے مان لی مگر مجھ پر اصل حقیقت بعد میں آشکار ہوئی۔ 1936 میں ویلز نے ایک مختصر ناول 'The Croquet Player' لکھا جو اس کی پہلی تحریروں سے حیرت انگیز طور مختلف تھا۔ اس ناول سے پتہ چلتا ہے کہ ویلز کو انسانوں کی سفاکی اور اذیت پسندی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ لیکن 'آؤٹ لائن' خونریزی اور ظلم سے صرفِ نظر کرتی ہے۔ بلکہ اس میں ان کا ذکر بھی شاید ہی کہیں ہو۔ لگتا ہے کہ ویلز بدی اور ظلم کے اس رجحان سے بالکل بے خبر تھا جس کا ذکر آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی تصنیف ''سٹڈی آف ہسٹری'' (مطالعہ تاریخ) میں کیا ہے۔ اور جسے ٹائن بی نے انسانی معاملات میں گناہ کے لرزہ خیز وجود سے تعبیر کیا ہے۔ جرم کے بارے میں ویلز کا نقطۂ نظر بڑے عملیت پسندانہ اطمینان کا مظہر ہے۔ اپنی تصنیف 'Wealth and Happiness' کے مطابق وہ سمجھتا ہے کہ جرم کی کوئی اصلیت نہیں۔ ''جرم کا وجود نارمل ''نیچرل'' انسان پر پابندیوں کا نتیجہ ہے۔'' پابندیاں اس لیے عائد کی جاتی ہیں کہ معاشرہ قائم رہے اور روز افزوں ترقی کرے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے تقریباً 2500 سال (قبل مسیح) کی انسانی تاریخ کا علم نہیں تھا جو مسلسل خونریزی، قتل اور تشدد سے عبارت ہے۔ نازی دور کے مظالم سے اسے احساس تو ہوا مگر ہیروشیما اور ناگاساکی کی بربادی، Belsen اور Buchenwald کے انکشافات نے اسے قائل کر دیا کہ انسان شروع سے ہی ہلاکت کے راستہ پر گامزن ہے اور اب اس کا انجام دور نہیں۔

میں نہیں کہتا کہ تاریخ کے بارے میں ویلز کا نقطۂ نظر غلط یا صداقت سے عاری

ہے۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے وہ تو آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ وکٹورین عہد کے آخری دنوں سے تعلق رکھتے ہوئے وہ انسانی تاریخ کو کارناموں اور ایجادات کی شان دار کہانی سمجھتا تھا، خطرات اور مصائب کے خلاف ایک طویل جنگ، جس سے نئی تہذیب پیدا ہوئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا تخلیقی جوہر اس کا امتیازی وصف ہے۔ مگر اس سے یہ خطا ہوئی کہ وہ دیکھ نہیں سکا کہ انسان کتنا تنگ نظر اور خود پسند ہے۔ وہ اپنا توازن کھو چکا ہے جس کی وجہ سے وہ مفاد پرست اور ظالم ہو گیا ہے۔ ظلم کا یہ رجحان 'شارٹ کٹ' کی ذہنیت پیدا کرتا ہے، جو ہر جرم کی بنیاد ہے۔

ہٹلر کے دور میں قتل عام اس لیے نہیں ہوئے کہ ''نیچرل'' انسان پر کوئی پابندی لگائی گئی تھی تا کہ انسانی معاشرہ قائم رہے اور پھلے پھولے۔ اس کے برعکس وہ قتل ایک بگڑے ہوئے بے سمت آئیڈیل ازم کی پیداوار تھا تا کہ اس دنیا سے بہتر دنیا تخلیق ہو سکے۔ ہیروشیما کو تباہ کرنے کے پیچھے بھی یہی مریضانہ ذہنیت کارفرما تھی اور 1960 سے یہ دہشت پسندوں کی فائرنگ، دھماکے اور بے دریغ انسانی قتل، جو روز مرہ کا معمول بن گئے ہیں، ان کا محرک بھی یہی خودستائی اور کج فہمی ہے۔ جاپانی رَیڈ بریگیڈ جس نے Lod ائیر پورٹ پر مسافروں کو مشین گنوں سے بھون ڈالا اور اطالوی دہشت پسند جنھوں نے یونیورسٹی کلاس روم پر حملہ کر کے پروفیسر کی ٹانگوں پر اس لیے گولیاں برسائیں کہ وہ طالب علموں کو ''بورژوائی قدریں'' سکھاتا ہے، ان سب کے متعلق ہول ناک بات یہ ہے کہ وہ کوئی حواس باختہ پیشہ ور قاتل نہیں تھے بلکہ سچے دل سے دنیا کی بہتری اور بھلائی چاہتے تھے۔ یہ جان کر محسوس ہوتا ہے کہ جرائم کی دنیا چند سر پھرے اخلاق باختہ افراد سے آباد نہیں بلکہ ٹیڑھی سوچ اور تخلیقی قوت کی کج روی کا لازمی نتیجہ ہے۔ دنیا کے بدترین جرائم برے اور بھٹکے ہوئے لوگوں نے نہیں کیے، ان کے پیچھے ذہین اور ذمہ دار افراد کا ہاتھ ہے۔

بنیادی طور پر اس احساس نے ویلز کو اس کے آخری دنوں میں دنیا سے مایوس کر دیا۔ عمر بھر وہ کہتا رہا کہ عقل (استدلال) اور ذہانت ہی انسانوں کی رہنما ہیں۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ پہلی عالمی جنگ اس لیے لڑی گئی کہ آئندہ جنگ نہ ہو اور یہ کہ لیگ آف نیشنز اور عالمی حکومت دنیا میں امن کے قیام کو یقینی بنائیں گی، مگر اسی موقع پر دنیا نئے تشدد، قتل اور غارت گری کی آماج گاہ بنی۔ سٹالن کے ہاتھوں Kulaks (خوشحال روسی زمیندار) کا خون، جاپانیوں کے ہاتھوں نانکنگ کی بربادی، ہٹلر کے ٹارچر کیمپ اور ایٹم بم۔۔۔۔ ویلز کو یقین آ گیا

ہو گا کہ اس کی ساری زندگی خوش فہمیوں کی نذر ہوئی ہے اور یہ کہ انسان مایوس کن حد تک ظالم اور جاہل ہے۔

اگر ویلز کو تشدد کی نفسیات سے کچھ اور واقفیت ہوتی تو اس کی بصیرت اتنی آسانی سے اسے مایوسیوں کے حوالے نہ کرتی۔ کسی بگڑے ہوئے انسان کی نیکی کے بجائے بدی کرنے کی خواہش کو جرم نہیں کہہ سکتے۔ 'شارٹ کٹ' لینا صرف بچکانہ ذہنیت ہے۔ ہر جرم کا مقصد چھیننا اور جھپٹنا ہے۔ کچھ دیئے بغیر لینے کی کوشش ہے۔ چور محنت کے بجائے چوری سے اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔ جنسی مریض لڑکی کو سپردگی پر آمادہ کرنے کے بجائے اس کی عزت لوٹتا ہے۔ فرائیڈ نے کہا ہے کہ ''اگر بچے کے پاس طاقت ہو تو وہ ساری دنیا تباہ کر سکتا ہے۔'' اس کا کہنا ہے کہ بچہ اپنی اندر کی دنیا میں گم رہتا ہے۔ وہ کسی اور کی بات سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مجرم ایک ایسا بالغ ہے جو بچہ ہونے اور بچہ رہنے پر اصرار کرتا ہے۔

مگر اس بچکانہ ذہنیت میں خرابی ہے۔ لوٹ مار کا خواہشمند زیادہ دیر خوش نہیں رہتا، حساس ہو تو اس کی حالت اذیت ناک بلکہ قابل رحم ہوتی ہے۔ زندگی میں وہ لمحے مسرت کے ہوتے ہیں جب ہم اپنے باطن کی دنیا سے اوپر اٹھ کر دنیا کو دیکھتے ہیں۔ جو ہمارے اندر کی حقیر خواہشات اور جھوٹے پندار سے ہمیں نجات دلاتے ہیں۔ تاریخ کے بڑے بڑے ظالم اور جابر لوگ جو دوسروں کو خاطر میں لائے بغیر اپنی سفلی خواہشات اور عزائم پورے کرتے رہتے ہیں، وہ بالآخر پاگل ہو کر مرتے ہیں۔ اس لیے کہ خواہشات سے بڑا ظالم اور جابر کوئی اور نہیں ہوتا۔

ہر نسل کے ساتھ جرم نئے سرے سے زندہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر انسان ہمیشہ نابالغ رہتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو بالغ ہوں۔ مگر اتنا تو ہے کہ یہ کیفیت دائمی نہیں ہوتی، جبکہ انسانی تخلیق ایک دائمی عمل ہے۔ شیکسپیئر مارلو سے فیض پاتا ہے اور گوئٹے کو انسپائر کرتا ہے۔ بیتھوون ہیڈن سے سیکھتا ہے اور واگنر (**Wagner**) کو انسپائر کرتا ہے۔ نیوٹن کیپلر سے فیض پا کر آئن سٹائن کو راستہ دکھاتا ہے۔ اسی طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے مگر جیک دی رپر، ولاد امپیلر اور ایل کپون کا کوئی وارث، کوئی نام لیوا نہیں ہوتا۔ ان کے سیاہ اعمال ان کے ساتھ ہی دفن ہو جاتے ہیں۔ اپنے اوپر کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے مجرم قدرتی طور پر حالات و اتفاقات کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان نے تہذیب کا موجودہ معیار اس لیے حاصل کیا ہے کہ تخلیق کا عمل آگے بڑھے۔ جبکہ جرم ٹھہرے ہوئے پانیوں کی طرح ساکت و جامد ہوتا ہے اور سڑتا رہتا ہے۔

شاید ہم سوچیں کہ ویلز کوئی نا تجربہ کار مؤرخ تھا جس نے سادہ دلی کی وجہ سے مان لیا تھا کہ جنگ اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔ مگر اس میں کسی حد تک تو اس کی سوشو بائیالوجی سے ناواقفیت کا دخل ہے۔ جب ٹن برگن (Tinbergen) اور لورنز (Lorens) نے ہمیں بتا دیا کہ حیوان زیادہ تر حملہ زمین کے کسی حصے پر قبضہ کرنے کے لیے کرتا ہے تو صاف واضح ہو گیا کہ دنیا کی تمام جنگیں خطۂ زمین (territory) حاصل کرنے کے لیے لڑی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ ظالموں کے ظلم اور سفا کی کی مثالیں حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ اکثر زور آور نر شیر اورBaboons بن مانس سے لے کرHamstrs اور Gerbals تک اکثر اپنے شکست خوردہ حریفوں کے وارثوں کو بھی مار ڈالتے ہیں۔ مرغیاں اپنے چوزوں سے اور زیادہ چھوٹے چوزوں کو مروا دیتی ہیں۔ بگلے کے علاقہ میں آس پاس سے کوئی چھوٹا بگلا آ جائے تو بچ نہیں سکتا۔ پرنس کاٹپکن لگتا ہے غلطی پر تھا جب اس نے یقین کر لیا کہ تمام جانور آپس میں مل جل کر پیار سے رہتے ہیں اور صرف انسان ہیں جو آپس میں قتل و غارت کرتے ہیں۔Zoology (حیوانیات) سے ہم نے سیکھا ہے کہ جرم ہمارے حیوانی ورثہ کا حصہ ہے۔ اس لیے انسانی تاریخ عمرانیات کو ٹیکسٹ بک (نصابی کتاب) کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

کیا تاریخ کے اس نئے تصور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنے ہی تشدد کے ہاتھوں مارا جائے گا؟ کوئی اس امکان کو رَد نہیں کر سکتا۔ مگر ہر بات کا تاریک پہلو دیکھنے والے ہماری شخصیت کے اس حصہ کو نظر انداز کرتے ہیں جسے ویلز نے اتنی اچھی طرح سمجھا ہے۔ یعنی اپنی ذہانت کے زور پر آگے بڑھنا۔ یہ سچ ہے کہ انسانی تاریخ بنیادی طور پر جرائم کی تاریخ ہے مگر انسانی تاریخ تخلیق کی تاریخ بھی ہے۔ ٹھیک ہے کہ نسل انسانی کسی ایٹمی سانحہ کی وجہ سے تباہ ہو سکتی ہے۔ مگر جس کسی نے بھی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتا ہے کہ ایسا ہونا امکان سے دور . . بہت دور ہے۔ جرم کی نوعیت کو سمجھنا اس بات کو سمجھنا ہے کہ جرم کیوں ہمیشہ ذہانت اور تخلیق کا اثر قبول کرتا رہے گا۔

یہ کتاب یعنی نسل انسانی کی کہانی، جرم اور تخلیق کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔ اس سے جو بصیرت حاصل ہو، اس کے ذریعہ انسانی ترقی کے اگلے مرحلہ پر ان دونوں میں تمیز کرنا ہے۔

انسانی تشدد کی نفسیات

1959 کی گرمیوں میں میرے پاس جرائم کے متعلق کتابوں کا ڈھیر لگ گیا۔ ان میں ایک میگزین True Detective کے شمارے بھی تھے۔ ارادہ تھا کہ قتل کی وارداتوں کا ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کیا جائے جو ممکن ہے کہ جرائم کے لکھاریوں کے کام آ سکے۔ مگر مجھے یہ بھی امید تھی کہ تشدد کے بارے میں ان متفرق معلومات کی تہہ میں تشدد کے بعض انجانے طریقوں کا بھی شاید پتہ چل سکے۔ جن کی مدد سے ہم جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کی وجہ جان سکیں۔

مثال کے طور پر میں جانتا تھا کہ قتل کی قسمیں سب ملکوں میں ایک جیسی نہیں ہیں۔ فرانسیسی اور اطالوی (Crime Passioneel) طیش میں قتل کرتے ہیں۔ جرمن اذیت پسندی کی وجہ سے اور انگریز بڑی منصوبہ بندی سے کسی بیوی، شوہر یا عاشق کا قتل کرتے ہیں۔ امریکی روا روی میں بے سوچے سمجھے قتل کرتے ہیں۔ جرائم کی قسم اور طریقے ہر صدی بلکہ ہر عشرہ میں بدلتے رہتے ہیں۔ انگلستان اور امریکا میں 1940 اور 50 کے عشروں میں جرائم کا محور جنس اور دولت تھے۔ یا جنسی جرائم کے لیے انگلستان میں مشہور اذیت پسند نیول ہیتھ (Nevelle Heath) تیزاب میں نہلا دینے والا (Haigh) اور امریکا میں سرل چیس مین (Cyral Chessman) اور جنسی قاتل ہیری گلٹمین (Harry Glatman) تھے۔

True Detedtive پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے ایک نئے تکلیف دہ رجحان کا احساس ہوا۔ یعنی بالکل بے مقصد اور لاحاصل قتل۔ اس قسم کے جرم کے لیے 1912 میں آندرے ژید نے بلا معاوضہ قتل کی ترکیب ایجاد کی تھی۔ اس کے ناول Les Caves du Vatican کے ہیرو کے دل میں اچانک ایک اجنبی کو قتل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے جو

اس کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا ہے۔ ''کسی کو کیا پتہ چلے گا؟ پولیس کی سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔'' کسی مقصد کے بغیر قتل! وہ دروازہ کھولتا ہے اور اس شخص کو دھکا دے کر موت کے حوالے کر دیتا ہے۔ ژید کا ناول 'بلیک کامیڈی' ہے، 'بے مقصد قتل' آسکر وائلڈ کے مضمون کی طرح ایک مذاق تھا۔ جس میں ایک اٹھائی گیرا اپنی خوش دامن کو محض اس لیے قتل کر دیتا ہے کہ اس کے ٹخنے موٹے تھے۔ فلسفیوں کی نہ پولیس کی سمجھ میں آیا کہ ایسا کوئی واقعہ ہوسکتا ہے۔ مگر 1959 تک ایسا ہو رہا تھا۔ 1952 میں ہربرٹ 19 برس کا ایک کلرک 48 برس کی ایک خاتون کے ساتھ بیٹھا نوٹنگھم میں سینما دیکھ رہا تھا۔ اس نے طے کیا کہ وہ خاتون قتل کے لیے نہایت مناسب ہے۔ اس نے اس خاتون سے ملنے کے لیے اگلے دن کوئی وقت مقرر کیا اور اسے سیر پر لے چلا اور ایک درخت تلے جا کر اس کا گلا گھونٹ دیا صرف اس لیے کہ وہ اپنے کامیاب جرم پر اترا سکے۔

ایک شخص نارمن نے نیو میکسیکو میں اپنی جیپ روکی اور دو بچوں کو گولی مار دی۔ گرفتاری پر اس نے بتایا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ فروری 1959 میں پینی بیور کلینڈ ایک خوبصورت لڑکی نے کیلیفورنیا میں ایک شادی شدہ مرد سے لفٹ لی اور کسی اشتعال کے بغیر بارہ گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ گرفتاری کے بعد اس نے بیان دیا کہ وہ جاننا چاہتی تھی کہ قتل کرنے کے بعد وہ اس کے متعلق پریشان تو نہیں ہوگی۔ ڈاکٹروں کے مطابق وہ لڑکی اپنے حواس میں تھی۔ اپریل 1959 میں نارمن اسمتھ نامی ایک شخص نے ٹیلی ویژن دیکھتی ہوئی ایک عورت کو کھلی کھڑکی میں سے گولی مار دی جسے وہ بالکل نہیں جانتا تھا۔ ٹیلی ویژن پروگرام ''The Spniper'' دیکھتے ہی اس میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی۔ 1961 میں The Encyclopedia of Murder شائع ہوا۔ اس میں ایک باب 'بے مقصد قتل' پر بھی تھا۔ 1970 تک بات واضح ہوگئی کہ یہ رجحان زوروں پر ہے۔ عجیب بات ہے کہ بعض حالات میں یہ عام ذہنی سطح سے اوپر تھا۔ ہربرٹ ملز نے نظم لکھی اور اس کے کچھ حصے اپنے شکار کی لاش پر پڑھے۔ Moors کے قاتل بریڈی نے اپنے جرم کا جواز مشہور فرانسیسی مصنف داساد (De Sade) سے پیش کیا اور عدالت میں لچھے دار اور جناتی زبان بول کر اپنے آپ کو ایک 'دانش ور' ثابت کرنے کی کوشش کی۔ چارلس میسن نے نسل پرستی کو اپنے 'خاندان' کے جرائم کا جواز قرار دیا۔ سان فرانسسکو میں زوڈیاک کے قاتل نے اپنے خطوط ناقابل فہم اشاروں میں لکھے اور دستخط کی جگہ Zodiac (برج) کے نشان بنائے۔

جان فریزیئر (ایک آوارہ شخص جس نے ایک آئی سرجن وکٹراوٹا کا خاندان قتل کیا) نے Tarot Pack کے نشانات پر مشتمل خط چھوڑا۔ نومبر 1966 میں رابرٹ سمتھ ایک اٹھارہ سالہ طالبہ کے ساتھ ایک بیوٹی پارلر میں گیا۔ پانچ عورتوں اور دو بچوں کو فرش پر الٹا لٹا کر سب کے سروں میں گولی ماردی۔ اپنے والدین کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے اور وہ بہت اچھا طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ کسی صورت میں بھی وہ پرابلم نوجوان نہیں تھا۔ اس نے پولیس کو بیان دیا۔ کہ 'میں چاہتا تھا کہ میرا نام ہو' لوگ مجھے جانیں۔ کیلیفورنیا میں ہوٹل کے ایک کمرے کے اندر کوئی عورت داخل ہوئی اور باسکٹ بال کے ایک کھلاڑی کو سوتے میں قتل کر دیا۔ ان کی آپس میں بالکل کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ اس نے پولیس کو بتایا ''وہ مشہور آدمی تھا اور میں جانتی تھی کہ اسے قتل کر کے میں بھی مشہور ہو جاؤں گی۔''

ایسی باتوں سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہر انسان (چاہے اس کے مزاج میں کتنا ہی انکسار ہو) مشہور ہونا چاہتا ہے۔ مونٹین کا کہنا ہے کہ وہ ایک معمولی آدمی ہے پھر بھی اسے احساس ہے کہ اس کے خیالات توجہ کے قابل ہیں۔ کوئی ہے جو اس سے انکار کرے؟ بلکہ دنیا میں کوئی ایسا ہے جو اندر ہی اندر سوچتا ہو کہ اس کی ایک سوانح حیات لکھی جانی چاہیے؟ ارنسٹ بیکر نے اپنی تصنیف The Denial of Death میں لکھا ہے کہ ''ہیروازم انسان کی بنیادی خواہشات میں سے ہے۔ ہم سب۔'' اس کا کہنا ہے کہ ''مایوس کن حد تک اپنے آپ میں کھوئے رہتے ہیں۔ بچوں کے اندر اپنے آپ کو اہمیت دینے کی خواہش ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ بچہ چیخ چیخ کر اپنے مطالبے دہراتا ہے۔ وہ اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھتا کہ اس کی ذات ہی مرکز کائنات ہے۔ وہ سختی کے ساتھ احتجاج کرتا ہے اگر اس کے بھائی کو کیک کا بڑا ٹکڑا دے دیا جائے۔ اسے بتانا ہوتا ہے کہ کائنات میں اہمیت کی حامل بس وہی ایک ہستی ہے، اسے سب سے الگ کھڑا ہونا ہے۔ ایک ہیرو کی طرح جینا ہے اور دنیا پر سب سے زیادہ احسان اسی کو کرنا ہے۔ ثابت کرنا ہے کہ اسے سب پر فوقیت حاصل ہے، چنانچہ وہ ہیروازم کے کبھی ختم نہ ہونے والے خوابوں میں ڈوب جاتا ہے۔

''پھر وہ بڑا ہوتا ہے تو زندگی کی اصلیت اس پر ظاہر ہوتی ہے۔ اسے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے مقابلہ میں وہ کچھ بھی نہیں۔ بظاہر وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے مگر دور کہیں اندر کی گہرائیوں میں اسے اپنی فوقیت کا احساس رہتا ہے۔'' Becker کا کہنا ہے کہ اگر ہم ایمانداری کے ساتھ اپنے ہیرو بننے کی خواہش کو مان لیں اور اسے پورا کرنے کی فکر کریں تو

معاشرہ کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ صرف سادے قدیم معاشرے ہی اپنے افراد کو فوقیت اور شہرت کا مقام دے سکتے ہیں۔ آج کے صنعتی معاشرے کے اقلیتی گروپ جو آزادی اور انسانی وقار کے نعرے لگاتے ہیں۔ دراصل وہ بھدے انداز میں مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں ہیروازم کا احساس اور مقام دیا جائے۔

بیکر کے الفاظ صنعتی بے چینی سے لے کر سیاسی دہشت پسندی تک تمام معاملات بصیرت کا ذریعہ ہیں۔ یہ کچھ ہونے کی نیم مردہ خواہش کا اظہار ہیں اور اس معاشرہ کے خلاف بغاوت بھی ہے جو ایسا ہونے سے روکتا ہے۔

جب ہربرٹ ملز نے پرفیکٹ قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ اپنے آپ کو اسی فوقیت اور برتری کا جواز مہیا کر رہا تھا۔ 'سماجی ناانصافی' یا اسی نوع کے جواز جب جرائم کے سلسلہ میں دیئے جائیں تو بھی ہمیں انہیں نظر انداز کر کے اسی پہلو، یعنی اپنی فوقیت منوانے کے پہلو پر غور کرنا ہے۔ چارلس میسن نے عدالت میں آٹھ انسانوں کی موت کا بزعم خود بڑا پراسرار اور فنکارانہ جواز پیش کیا کہ وہ ان کی موت کا ذمہ دار نہیں کیونکہ معاشرہ تو اس سے بھی گھناؤنے جرائم کا ذمہ دار ہے۔ شہادت کے بغور جائزے سے پتہ چلا کہ میسن سمجھتا تھا کہ اسے بھی بیٹلز یا گانے والے باب ڈلن کی طرح مشہور ہونے کا حق ہے۔ ڈلن نے بڑی کوشش کی تھی کہ ریکارڈ کمپنیاں Helter Skelter منصوبہ بندی کرتے ہوئے ان ٹیپ کو ریکارڈ کریں جو اس نے تیار کی تھیں) موسیقی میں یہ ایک ایسا انقلاب تھا جس نے امریکی معاشرہ بدل دیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی فوقیت پر اصرار کر رہا تھا۔

مجھے 1960 کے آخری ایام کے ان جرائم پر بڑا صدمہ اور حیرانی ہوئی۔ میسن مور کے ہاتھوں ہونے والے قتل، فریز یئر اور زوڈیاک ان میں ملوث تھے۔ اس سے دس بیس برس پہلے کے جرائم (ہیگ، ہیتھ، چیس مین اور کرسٹی) نے بھی مجھے چونکا دیا تھا۔ جان کرسٹی جنسی مقاصد کے لیے لڑکیاں قتل کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ نامرد تھا اگر عورت ہوش میں ہوتی تو وہ اسے باورچی خانہ کی الماری میں لے جاتا، الماری اس قسم کے جرائم کی علامت ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں وہ لوگ انسانی کھوپڑیاں چھپاتے ہیں جنہیں نارمل اور عزت دار نظر آنے کی جلدی ہوتی ہے۔ میسن کا خاندان ٹیلی ویژن کے پاس بیٹھا ہوا خبریں سن رہا تھا اور شیرون ٹیٹ کے گھر ہونے والے قتل کی خبر پر خوش ہو رہا تھا مگر آخری بات وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے جرائم پر پردہ پڑا رہے۔

یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ جرائم کے سلسلہ میں ایک قسم کا پیٹرن موجود ہے۔ مگر اس کے اصول اور قواعد کیا ہیں؟ 1960 کے عشرے میں ابراہم میسلو (ماہر نفسیات) نے اپنی تصنیف (Motivation and Personality (1954 مجھے بھیجی۔ اس کے چوتھے باب 'Human Motivation' میں بدلتے ہوئے پیٹرن کے بارے میں ایک طرح کی وضاحت موجود تھی۔ یہ باب 1943 میں پہلی دفعہ Psychological Review میں شائع ہوا تھا اور پیشہ ور ماہرین نفسیات میں اس نے ایک کلاسک کا درجہ حاصل کیا تھا۔ مگر کسی وجہ سے عام لوگوں کی رائے اس کے متعلق معلوم نہیں کی گئی۔ میسلو نے اپنی اس تحریر میں کہا ہے کہ انسان اپنی قدروں اور ضروریات کی وجہ سے متحرک ہوتا ہے اور ان ضروریات اور قدروں میں ترتیب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی چار قسمیں ہیں۔ جسمانی ضرورت، خوراک، تحفظ، سر پر چھت ہونا، رشتے اور محبت اور مطلوب ہونے کی خواہش، "(احترام پسندیدہ ہونے اور چاہے جانے کی خواہش)۔ ان چار اقسام کے علاوہ میسلو نے ایک پانچویں قسم بھی بتائی ہے۔ اپنی حقیقت جاننا، سمجھنا اور تخلیق کرنا مسائل کو تفریحاً حل کرنا۔

جب انسان بھوکا ہو تو روٹی کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتا، بہت سی روٹیاں اس کی جنت ہے۔ اگر روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے تو تحفظ، گھر اور قطعۂ زمین کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ صرف تحفظ نہیں، پھولوں کی سیج کے خواب بھی دیکھے جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو جنس کی باری آتی ہے۔ صرف جنسی سکون نہیں بلکہ محبت تحفظ اور وابستگی اس کے تقاضے ہیں۔ یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے تو چاہے جانے اور پسند کئے جانے کی خواہش سر اٹھاتی ہے۔ اپنی عزت نفس اور ہمسائے کے احترام کا خیال ستانے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو جائے تو 'اپنی حقیقت' کا چیلنج سامنے آتا ہے۔ (اگرچہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا میسلو کا کہنا ہے کہ اکثر لوگ چوتھی سطح سے اوپر نہیں اٹھتے۔)

اب میں نے ایک اور کتاب 'A Casebook of Murder' کا مطالعہ کیا تو میں نے محسوس کیا کہ میسلو کا ایک کے بعد دوسری ضرورت کا تصور تو جرائم کے تاریخی ادوار سے کم وبیش ملتا جلتا ہے۔ انیسویں صدی کے پہلے حصے تک زیادہ تر جرائم میسلو کی پہلی سطح یعنی 'زندہ رہنے کے لیے کیے گئے تھے۔ انسانی لاشوں کے تاجر Edinborgh اور Hore اپنے شکار کو گلا گھونٹ کر مار دیتے اور حقیر رقم کے عوض ان کی لاشیں میڈیکل سکول کو بیچ دیتے۔ انیسویں صدی کے وسط تک پیٹرن بدل رہا تھا۔ صنعتی انقلاب سے خوشحالی کا دور شروع ہو گیا

تھا۔ چنانچہ اچانک معزز متوسط گھرانوں میں قتل کی وارداتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر پامر، ڈاکٹر کانسٹن کینٹ پریچرڈ اپنی سیکیورٹی کے لیے جرم کرتے ہیں۔ چارلی پیرز (نقب زن اور قاتل) متوسط درجہ کی زندگی کے لیے دھوکے بازیاں کرتا ہے۔

اس صدی کے خاتمہ سے پہلے جرائم کی ایک نئی قسم جنسی جرائم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔1888 میں جیک دی ریپر والے قتل اس قسم کے پہلے قتل تھے، مزے کی بات ہے کہ قاتل کے ہم عصر انہیں 'جنسی جرائم' نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ Ripper 'اخلاقی لحاظ' سے پاگل تھا۔ گویا کہ اس کے جرائم بیک وقت ظلم اور پاگل پن کی پیداوار تھے۔'پاگل خونیوں کی طبعی قطار میں ریپر پہلا خونی ہے جبکہ یہ قطار ہیتھ اور گلوٹ مین تک جاتی ہے اور آج بھی بریڈی وغیرہ اس کی افسوسناک مثالیں ہیں۔ جنسی جرائم میں ہمیں وہ جرائم بھی شمار کرنے چاہئیں جو کرپن (Crippen) بائی واٹرز (Bywaters) ٹامسن (Thompson)، سنائڈر (Snyder) اور گرے (Gray) نے رقابت یا بیوی سے جان چھڑا کر محبوبہ کو اپنانے کے لیے کیے ہیں۔

چنانچہ 1959 میں میں نے دیکھا کہ 'خود پسندی' کے جرائم کی صورت میں جرائم کی ترتیب میں ایک نئی سطح نمودار ہوئی ہے۔ اس وقت سے ایسے جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے جن میں مجرم محسوس کرتا ہے کہ معاشرہ نے اسے ایک فرد کی حیثیت سے وقار، انصاف اور اہمیت نہیں دی۔ اس لیے اس کا جرم احتجاج کی ایک جائز صورت ہے۔ جب 1970 میں وکٹر اوٹا اور اس کا خاندان اپنے گھر (کیلی فورنیا) میں قتل ہوئے تو وکٹر کی رولز رائس پر ایک تحریر پائی گئی، ''آج تیسری عالمی جنگ شروع ہو گی جس کا آغاز آزاد دنیا کے لوگ کریں گے۔ میرے ساتھی اور میں آزادی یا موت تک ہر اس شخص کے خلاف لڑیں گے جو اس زمین پر 'نیچرل زندگی' کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ مادہ پرستی ختم نہ ہوئی تو انسانیت ختم ہو جائے گی۔'' جان فریزییئر (قاتل، جس کی عمر 24 برس تھی) نے گواہوں کو بتایا کہ اوٹا کا خاندان بہت مادہ پرست تھا اس لیے وہ قتل کا مستحق تھا۔ دراصل فریزییئر بچوں جیسی خود پسندی اور نخوت کا مظاہرہ کر رہا تھا کہ میں ہی مرکزِ حیات ہوں، اس لیے بڑا کیک میرا ہے۔

ستم ظریفی ہے کہ خود روٹا بیکر کے ''ہیروازم'' کی اچھی مثال تھا۔ وہ ایک جاپانی آبادکار کا بیٹا تھا۔ جسے 1941 میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ مگر اسے بالآخر امریکی فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت مل گئی۔ اس کا بڑا بھائی یورپ میں لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ اوٹا نے میڈیکل سکول

سے کامیاب ہونے کے لیے ریلوے میں ملازمت کی اور ٹیکسی بھی چلائی تھی۔ آئی سرجن کے طور پر کامیابی اس کی زندگی میں دیر سے آئی تھی۔ اوٹا نے لوگوں سے یگانگت خدمت خلق کے ذریعہ کمائی تھی۔ وہ سینٹا کروز کے ڈومینین ہسپتال کے بانیوں میں سے تھا۔ وہ ان مریضوں کا مفت علاج کرتا تھا جو اس کی فیس ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ فریز یئر ان باتوں سے بالکل ناواقف تھا، واقف ہوتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ تو مکمل طور پر اپنی خود پسندی کا اسیر تھا۔

کئی راستے ہیں جن پر انسان چل کر 'نمبر ایک' ہونے اور اپنے خود پسندی کے جذبہ کی تسکین کر سکتا ہے۔ اوٹا اپنی حقیقت پسندی اور توازن کی وجہ سے اس کی ایک روشن مثال تھا جبکہ فریز یئر 'نابالغ' اور حقیقت سے دور تھا۔ اس کے جرائم سے کسی اور کا کیا بھلا ہوتا۔ خود اس کا بھلا ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میسلو کی تھیوری برونکس کے چڑیا گھر میں اس کے بندروں کے مشاہدہ (1930 کے عشرہ کے وسط میں) سے پیدا ہوئی۔ وہ فرائیڈ اور ایڈلر کے نظریات میں بٹا ہوا تھا۔ فرائیڈ کا کہنا ہے کہ تمام اعصابی خرابیوں (Neurosis) کی وجہ درحقیقت جنس ہے جبکہ ایڈلر سمجھتا ہے کہ انسان کی زندگی، کمتری کے احساس کے خلاف جنگ ہے اور اس کا بڑا مقصد 'طاقت کا حصول ہے'۔ چڑیا گھر میں وہ بندروں کی زور آوری پر حیران رہ گیا۔ ہر زور آور بندر کمزور بندروں کو ڈرا دھمکا رہا تھا اور جس پر چاہتا سوار ہو جاتا تھا۔ میسلو نے سوچا کہ فرائیڈ اور ایڈلر دونوں ہی صحیح کہتے ہیں۔ ایک روز اچانک میسلو پر انکشاف ہوا کہ زور آور بندر بلاتمیز کسی بھی کمزور حریف یا دوست کو اس لیے دبوچ لیتے ہیں کہ وہ اس کے اہل ہیں۔ اس لیے کم از کم اس معاملہ میں تو ایڈلر کا نظریہ درست ہے۔

چونکہ زور آوری بندروں کی بنیادی نفسیات ہے اس لیے میسلو سوچنے لگا کہ کیا اس کا اطلاق انسانوں پر بھی ہوتا ہے۔ اس نے طے کیا کہ مردوں کے بجائے وہ صرف عورتوں کی نفسیات کا مطالعہ کرے گا۔ اس لیے بھی کہ عورتیں اپنی زندگی بیان کرتے ہوئے زیادہ دیانتدار ہوتی ہیں۔ 1936 میں 'کالج فار ویمن' سے اس نے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ جنس اور زور آوری میں کوئی رشتہ ہے؟ اسے جلد ہی پتہ چل گیا کہ یہ رشتہ موجود ہے۔

عورتیں تین مختلف اقسام میں شمار کی گئی تھیں۔ زیادہ غلبہ والا گروپ، درمیانہ اور کم غلبہ والا گروپ۔ زیادہ غلبہ گروپ تینوں میں سے چھوٹا گروپ ہوتا ہے۔ زیادہ غلبہ گروپ کی عورتیں اپنی زندگی اس انداز سے بسر کرتی تھیں کہ ہم چاہیں تو اسے کسی حد تک مردانہ انداز بھی

کہہ سکتے ہیں۔ درمیانے گروپ کی عورتیں بنیادی طور پر رومان پرست تھیں۔ ان کی شخصیتیں زور دار تھیں مگر تجربے محدود تھے۔ وہ ایسے شخص کی متلاشی رہتی تھیں جو ان کے لیے پھول لائے، کھانے کے لیے ایسے ریستوران میں لے جائے جس کی روشنیاں مدھم اور موسیقی دل گداز ہو۔ کمزور گروپ سے متعلق عورتیں زیادہ بے تکلفی پسند نہیں کرتی تھیں یا اسے ایک ناگزیر مجبوری سمجھتی تھیں۔ زور دار شخصیت کی عورتیں چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر کھلاڑی اور غیر جذباتی ہوں۔

درمیانے گروپ والیاں مہربان اور گھریلو لوگ چاہتی تھیں جو گھر بیٹھے سکون سے پائپ پیتے رہیں اور مفکر لگیں۔ وہ رومانی شوہر پسند کرتی تھیں مگر کسی کھردرے اور سخت مزاج شخص کے ساتھ بھی زندگی گزار سکتی تھیں جس کی عادتیں خراب نہ ہوں۔ کمزور گروپ کو تو مردوں پر اعتبار ہی نہیں تھا۔ وہ شریف شرمیلے شخص کو ترجیح دیتی تھیں جو بولنے کی جرأت کیے بغیر برسوں انہیں دور سے دیکھ کر داد دیتا رہے۔

مگر میسلو کا بڑا دلچسپ مشاہدہ یہ تھا کہ ہر گروپ کی عورت اپنے سے ذرا زیادہ غالب مزاج کا شوہر چاہتی تھی۔

شاید یہ اصول تھا کہ ہمیشہ ساتھ رہنے کے لیے مرد اور عورت کو ایک ہی گروپ سے ہونا چاہیے۔ میسلو نے یہ جاننے کے لیے نفسیاتی تجربے بھی کیے تھے کہ اگر عورت اور مرد کے گروپ میں مناسب حد تک dominance gap ہو تو کیا ایسا فرق ہمیشہ ساتھ رہنے کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔

میسلو پر کتاب 'New Pathway in Psychology' (1972 میں) لکھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ 'dominance gap' کا معاملہ جرم کی پارٹنرشپ (شراکت) کو دلچسپ انداز میں واضح کرتا ہے۔ اس نوعیت کا پہلا مقدمہ نیویارک کے ایک خبیث وکیل البرٹ ٹی پیٹرک کا تھا۔ جس نے 1900 میں چارلس جونز نامی ایک ملازم کو اکسایا کہ وہ کلوروفارم کے ذریعہ اپنا مالک قتل کردے۔ جونز کا مالک ولیم رائس ایک دولت مند اور عمر رسیدہ شخص تھا اور جونز پر اس کے بڑے احسان تھے۔ اس کے باوجود اس نے پیٹرک کے اثر میں آ کر قتل اور فراڈ کے اس منصوبے میں حصہ لیا۔ مگر منصوبہ ناکام ہو گیا اور دونوں گرفتار ہو گئے۔ پولیس نے دونوں کو جیل میں بند کر دیا جہاں پیٹرک نے جونز کو ایک چاقو دیا اور کہا کہ ''تم پہلے اپنا گلا کاٹو، پھر میں بھی یہی کروں گا۔'' جونز اتنی بری طرح اس سے مرعوب تھا کہ

اس نے پیٹرک سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ چاقو اس سے کیسے واپس لے گا۔ کٹتے ہوئے گلے کے شور سے پولیس چونکی اور اس نے خودکشی کی کوشش ناکام کر دی۔ پیٹرک کو موت کی سزا ہوئی مگر بالآخر معافی مل گئی اور رہا ہو گیا۔

پیٹرک نے جونز پر یہ غلبہ کیسے حاصل کیا؟ ان کے مابین کوئی ایسا تعلق نہیں تھا کہ پیٹرک اسے بلیک میل کرتا، مگر مقدمے کی تفصیلات سے جو بات سامنے آئی اس کے مطابق پیٹرک میں چھا جانے کی صلاحیت بہت زیادہ تھی۔ جبکہ جونز میں یہ صلاحیت درمیانے درجہ کی تھی۔ پیٹرک کی کشش اور اس کی غالب شخصیت دونوں نے مل کر جونز کو مسحور کر دیا۔

مجھے اس سے خیال آیا کہ شراکت کے قتل اور کئی جرائم میں ایک فریق زور آور اور دوسرا فریق درمیانہ درجہ کا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس عجیب اور خلافِ معمول آمیزش سے تشدد جنم لیتا ہے۔

شراکت کے قتل کی ہر واردات سے یہی پیٹرن ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے اس صدی کے ایک نہایت پیچیدہ مقدمہ کی سمجھ آتی ہے۔ یعنی مئی 1924 میں ناتھن، لیوپولڈ اور رچرڈ لوئب کے ہاتھوں چودہ سالہ بوبی فرینکس کا قتل ہونا۔ قتل کے دونوں پارٹنر امیر جرمن یہودی گھرانوں سے تھے۔ دونوں یونیورسٹی گریجوایٹ تھے۔ دونوں مل کر کامیابی کے ساتھ معمولی چوریاں کرتے رہے۔ آخرکار انہوں نے Perfect Murder جیسا کوئی بڑا جرم کرنے کا فیصلہ کیا۔ لوئب کے چھوٹے بھائی کے دوست بوبی فرینکس کو انہوں نے اپنے شکار کے طور پر چن لیا۔ فرینکس کو انہوں نے سکول سے باہر آتے ہوئے لے لیا اور گاڑی کے پچھلے حصہ میں لوئب نے اسے قتل کر دیا جبکہ لیوپولڈ گاڑی چلاتا رہا۔ انہوں نے لاش چھپا دی اور فرینکس کے خاندان سے تاوان کی رقم وصول کرنے کی کوشش کی مگر ریلوے کے ایک ملازم کو لاش مل گئی اور لاش کے آس پاس ہی لیوپولڈ کا چشمہ بھی مل گیا جسے عینک ساز نے پہچان لیا۔ دونوں بگڑے ہوئے لڑکوں کے لیے یہ ایک ''تفریحی قتل'' تھا۔ لیوپولڈ نے اعتراف کیا کہ وہ نٹشے کے ''سپرمین'' سے متاثر تھا۔ دونوں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔

یہ جان کر مقدمہ کو سمجھنے میں اور آسانی ہوتی ہے کہ گول مٹول لیوپولڈ کسرتی اور چست و چالاک لوئب کو 'ماسٹر' یعنی آقا کہتا تھا اور اپنے آپ کو اس کا 'غلام' سمجھتا تھا۔

لیوپولڈ کو زیر کر کے لوئب کو بے انتہا مسرت حاصل ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ لیوپولڈ اپنے دوست سے زیادہ چالاک ہو مگر وہ لوئب کا ہر حکم مانتا تھا۔ یہ لوئب ہی تھا جس نے لیوپولڈ

سے جرائم میں پارٹنرشپ کا کنٹریکٹ کیا تھا۔ لوئب کا بس چلتا تو وہ کبھی قتل نہ کرتا مگر لیوپولڈ کو زیر کر کے اسے اتنی خوشی حاصل ہوتی تھی کہ وہ اسے جرائم کی گہرائیوں میں دھکیلتا چلا گیا۔

غالب و مغلوب کی مثال کو مزید واضح کرنے کے لیے مورز کا قتل ہمارے سامنے ہے۔ بریڈی اور مائرہ ہنڈلے اکتوبر 1965 میں گرفتار ہوئے۔ اس لیے کہ پولیس کو خبر ہو گئی تھی کہ انہوں نے اپنے گھر میں لاش چھپا رکھی ہے۔ مناجات کی ایک کتاب میں چھپائے گئے ایک کلوک روم Cloak Room کے ٹکٹ سے پتہ چلا کہ مانچسٹر کے (گم شدہ سامان) کے ریلوے گودام میں دو سوٹ کیس، فوٹو اور ٹیپ تھیں جن کے ذریعے بریڈی اور ہنڈلے کا تعلق دس سالہ لیزلی کی گمشدگی سے ثابت ہوتا تھا۔ لیزلی 1964 میں باکسنگ ڈے پر کھوئی تھی۔ مورز میں تلاش کرنے پر پولیس نے لیزلی اور چودہ سالہ لڑکے کلبرٹ کی لاشیں برآمد کی تھیں۔ ان کے گھر سے ایونز کی لاش ملی جسے کلہاڑے سے قتل کیا گیا تھا۔ انہیں تین ہلاکتوں کے ملزم قرار دے کر دونوں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔

ایملن ولیمز (اداکار اور ڈراما نویس) نے ان ہلاکتوں کے نفسیاتی پس منظر اور پیٹرن کو اس طرح اجاگر کیا ہے بریڈی اور مائرہ ہنڈلے کی پہلی ملاقات 16 جنوری 1960 کو ہوئی، جب مائرہ ہنڈلے مانچسٹر کے ایک دوا ساز ادارے میں ٹائپسٹ بھرتی ہوئی۔ مائرہ کیتھولک تھی جسے جانوروں اور بچوں سے بہت پیار تھا۔ بریڈی عمر میں مائرہ سے چار سال بڑا تھا۔ پولیس نے تیرہ برس کی عمر میں ہی اسے جیل بھیج دیا تھا۔ بورسٹل میں اس نے ایک سال کی قید کاٹی تھی۔ جرائم کی کتابوں کے علاوہ بریڈی نازیوں کی کتابیں بھی پڑھتا تھا جنہیں وہ بہت پسند کرتا تھا۔ بریڈی نے مائرہ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کی نظر میں وہ ایک عام ملازمت پیشہ لڑکی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مائرہ اس کی مردانہ وجاہت سے متاثر ہوتی رہی مگر ایسے لمحے بھی آئے جب مائرہ اس کی گفتگو کے انداز سے بیزار ہو کر اسے گنوار سمجھتی۔ بریڈی اس سے اکثر بے نیاز رہتا۔ مائرہ بھی بعض اوقات اس کے خلاف اپنے دل میں نفرت محسوس کرتی مگر بالآخر اس نے سوچ لیا کہ اسے بریڈی سے محبت ہو گئی ہے۔ ولیمز کا کہنا ہے کہ بریڈی اپنی برتری کے نشہ میں بدمست تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اسے مائرہ کی خوشی یا غم پر پورا اختیار حاصل ہے اور وہ جب چاہے اس کے جذبات سے کھیل سکتا ہے۔ جبکہ مائرہ کے انداز بہر طور غلامانہ تھے۔ 1961 کے نئے سال کی تقریب وہ دونوں مائرہ کی دادی کے گھر مناتے ہیں اور مائرہ دوسرے روز اپنی ڈائری میں لکھتی ہے کہ مجھے اُمید ہے کہ میں اور بریڈی تمام

زندگی ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے، شادی کریں گے اور خوش رہیں گے۔'

مگر بریڈی کا مسئلہ شادی نہیں بلکہ پاور گیم ہے۔ اسے ہر سطح پر اپنی طاقت اور برتری کے زور پر مائرہ یا کسی کو بھی نیچا دکھانا ہے۔

تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مائرہ، نازیوں کے متعلق بریڈی کی رائے سے متفق ہونے پر مجبور ہے۔ نازی ازم پر بریڈی کے پاس بہت سی کتابیں ہیں۔ وہ ان کے خیالات سے متاثر ہے۔ تمام معاشرہ بے ایمان ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں اور فطرت بڑی بے نیاز ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جس کے کوئی معنی نہیں۔ جس کی تخلیق محض ایک اتفاق ہے۔ اخلاقیات فریب ہے جسے حکمرانوں نے غریبوں کو بیوقوف بنانے کے لیے ایجاد کیا ہے۔ صرف شادمانی ہے جسے حقیقت کا درجہ حاصل ہے، وہی نیکی ہے۔ جو شخص اپنے عزائم طاقت کے زور پر پورے کرتا ہے وہ اپنی طاقت کا خراج لیتا ہے، اور مائرہ سمجھتی ہے کہ وہ بڑا ذہین ہے۔ بہت بڑا دانشور ہے۔ (وہ ہٹلر کی تصنیف 'مین کیف' Mein Kampf پڑھنے کے لیے جرمن سیکھ رہا ہے) کسی گرم جوشی کے بغیر مائرہ سب کچھ برداشت کرتی ہے مگر ایک بے بس کنیز کی طرح، جسے یقین ہے کہ اس کا مالک کبھی غلطی نہیں کرتا۔

سوال یہ ہے کہ اپنی طاقت کے زعم میں وہ اسے کیچڑ میں کہاں تک گھسیٹے۔ بریڈی اسے بتاتا ہے کہ وہ بینک میں ڈاکہ ڈالنے کی سوچ رہا ہے۔ یہ سن کر پہلے تو وہ گھبرا جاتی ہے پھر حسب معمول سمجھ لیتی ہے کہ یہ بھی اس کی بڑائی اور خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔ وہ اسے ایک ریوالور خرید کر دیتا ہے اور رائفل کلب میں شامل ہونے کے لیے کہتا ہے۔

اس موقعہ پر ایک ہی طریقہ ہے جس سے وہ مائرہ کو مکمل اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ یعنی جرائم کے خوابوں کو حقیقت میں بدلے اور مائرہ کو اپنی شریک کار پارٹنر بنائے۔ مگر بینک پر ڈاکہ ذرا خطرناک واردات ہے۔ درحقیقت اکثر جرائم میں گرفتاری کا ڈر ہوتا ہے۔ شاید کوئی ایسا جرم جس میں کم سے کم خطرہ ہو وہ جرم ہے لیوپولڈ اور لوئب کے ایک بچہ کو ورغلا کر گاڑی میں بھگا لے جانا۔ مئی 1963 میں مائرہ نے ایک چھوٹی سیکنڈ ہینڈ موریس خریدی۔ (ایک حادثہ کے بعد بریڈی اپنی موٹر سائیکل چلانا چھوڑ چکا ہے) دو مہینے بعد ایک سولہ سالہ لڑکی پولین ریڈ Pauline Reade (جو مائرہ کے گھر کے پاس ہی رہتی تھی) ڈانس کے لیے جاتے ہوئے لاپتہ ہوگئی اور اس کے بعد کبھی نہیں دیکھی گئی۔ جب پولیس نے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ پولین کو ایک کار لے گئی تھی۔ گاڑی میں وہ کسی اجنبی کے ساتھ تو نہیں گئی ہوگی۔

اس کا کوئی جاننے والا بھی وہاں ضرور ہوگا۔ لاش نہ ملنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دفن کر دی گئی تھی۔ عام مجرم لاش دفن کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔

23 نومبر کی سہ پہر کو اینشٹن جاتے ہوئے انہوں نے بارہ برس کے ایک لڑکے Kilbinole کو لفٹ دی جو اس کے بعد کہیں زندہ نظر نہ آیا۔ اس کی لاش پولیس نے سیڈل ورتھ جنگل سے برآمد کی جو نیم برہنہ تھی۔

26 نومبر 1964 کو بریڈی اور ہیڈلے فیئر گراؤنڈ گئے اور دس برس کی ایک لڑکی لیزلی کو اٹھا لائے۔ اسے اپنے گھر لے گئے۔ ننگا کیا اور اس کی کئی تصویریں اتاریں۔ انہوں نے اس کی چیخیں اور رہائی کے لیے منت سماجت ریکارڈ کی جس کے بعد اسے قتل کر کے جان کلبرائڈ کی لاش کے پاس دفنا دی۔ پھر انہوں نے کمبل لیے اور جا کر ان کی قبروں پر سو گئے۔ یہ ان کے اس خواب کی تعبیر تھی جس کے ذریعے وہ خود کو معاشرے کے دشمن اور خطرناک انقلابی سمجھ بیٹھے تھے۔

نو مہینے بعد بریڈی سے ایک غلطی ہوگئی جس کی وجہ سے وہ گرفتار ہوگیا۔ سولہ برس کا ڈیوڈ سمتھ اس کا شاگرد بن گیا تھا۔ اس نے مائرہ کی بہن مورین سے اس وقت شادی کر لی جب وہ حاملہ ہوگئی۔ مائرہ کی طرح ڈیوڈ نے بھی آسانی کے ساتھ بریڈی کا رستہ اختیار کرلیا۔ پولیس پہلے ہی اس کے پیچھے تھی۔ اس لیے اسے زور آوری اور انقلاب کی بات اچھی طرح سمجھ آ گئی۔ سمتھ اچھا شاگرد تھا۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا ''ریپ جرم نہیں، یہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ قتل شوق hobby ہے جس سے بے انتہا مسرت حاصل ہوتی ہے۔ خدا وہم ہے، ایک کینسر جو دماغ کو چاٹ لیتا ہے۔ عوام کیڑے مکوڑے ہیں اندھے اور بے شعور۔ بریڈی جب بینک لوٹنے کے سلسلہ میں اپنے منصوبوں کی بات کرتا تو سمتھ بڑے غور سے سنتا۔ بریڈی نے اسے بتایا کہ اس نے تین چار قتل کیے ہیں اور مقتولوں کو جنگل میں دفن کیا ہے، میں نے ایک سنسان گلی میں گاڑی روکی اور بے سوچے سمجھے ایک شخص کو گولی مار دی۔ چھ اکتوبر 1965 کو بریڈی نے فیصلہ کیا کہ یہ سمتھ کے آگے بڑھنے کا وقت ہے۔ اس نے اور مائرہ نے مانچسٹر کے ایک شراب خانہ سے ایک سترہ سالہ نوجوان ایڈورڈ ایونز کو لیا اور ہیٹرزلے میں اپنے گھر واپس آ گئے۔ ساڑھے گیارہ بجے مائرہ ڈیوڈ سمتھ کو لینے گئی۔ ابھی وہ کچن میں ہی تھا کہ اس نے ایک زوردار چیخ سنی، ساتھ ہی کوئی چلایا کہ ''ڈیو اس کی مدد کرو'' اس نے دیکھا کہ بریڈی، کلہاڑے سے ایونز کو مار رہا تھا جب ایونز ساکن ہوگیا تو بریڈی نے ایک تار سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔

اس نے کلہاڑا سمتھ کو یہ کہتے ہوئے دیا کہ "اس کا وزن دیکھو" اس کے ہینڈل پر سمتھ کی انگلیوں کے نشان لے کر بریڈی نے کلہاڑا اس سے واپس لے لیا۔ تینوں نے مل کر کمرہ صاف کیا اور لاش کو پولی تھین کے تھیلے میں بند کیا۔ انہوں نے چائے پی۔ مائرہ نے بتایا کہ جب بریڈی ایک لاش دفن کر رہا تھا اور وہ گاڑی میں تھی تو ایک پولیس مین اس سے بات کرنے کے لیے رکا۔ سمتھ وعدہ کر کے چلا گیا کہ وہ گاڑی لے کر آتا ہے تاکہ لاش کو گاڑی تک لے جائیں۔ گھر جا کر اس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تو اس نے اپنی بیوی کو سارا واقعہ سنایا۔ بیوی نے پولیس بلا لی۔ اگلی صبح آٹھ بج کر چالیس منٹ پر ایک پولیس افسر نے بھیس بدل کر بریڈی کے دروازہ پر دستک دی۔ بریڈی باہر آیا تو پولیس افسر نے اسے اپنی پہچان کرائی۔ ایک بند کمرہ میں سے پولیس نے ایڈورڈ ایونز کی لاش برآمد کی۔ بریڈی کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

جرم کے اعتراف کا کوئی مرحلہ نہ آیا۔ بریڈی بڑی ہوشیاری سے ہر الزام کو ٹال دیتا۔ وہ یہی کہتا رہا کہ لیزلی کو دو آدمی اس کے گھر لے کر آئے تھے اور وہی اسے وہاں سے لے گئے تھے۔ مقدمہ کے وہ لمحے بڑے ہولناک تھے جب ٹیپ عدالت میں سنی گئی۔ مائرہ نے بعد میں کہا کہ لیزلی کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا اس پر وہ بہت شرمندہ ہے۔ (وہ صرف یہ مانی کہ ننگی تصویریں اتارنے میں اس نے مدد کی تھی) بریڈ، بہرکیف بے نیاز رہا۔ ایک مرحلہ پر اس نے بتایا کہ وہ جانتا تھا کہ ایک روز وہ پکڑا جائے گا۔ 6 مئی **1966** کو اسے تین بار عمر قید کی سزا ہوئی جبکہ مائرہ کو دو بار عمر قید کی سزا ہوئی۔ اسے جیل سے رہائی دلوانے کی باتیں ہوتی رہیں لیکن لوگوں کے احتجاج سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آج بھی ان کے گھناؤنے جرائم پر برافروختہ ہیں۔ بریڈی کے متعلق کسی نے نہیں کہا کہ وہ کبھی بھی رہا ہو۔

بہرحال یہ سوال تو اب بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ مائرہ ہیڈلی جیسی نارمل لڑکی قتل کی وارداتوں میں کیونکر شریک ہو سکتی ہے۔ اس وقت میں کیس کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ریچل سے تفصیل کے ساتھ میری بات ہوئی جو مائرہ سے جیل میں مل کر اس کی معصومیت کی قائل ہو چکی تھی۔ اس کے خیال میں مائرہ کو جیسے مسحور کیا گیا تھا۔ "میں آج بھی کہتی ہوں کہ قتل یا ٹارچر میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔" اس نے مجھے ایک خط میں لکھا 'میری تمام کوشش کا حاصل متاثر یا مسحور ہونے کی نفسیات کو سمجھنا ہے۔ جیسے راسپوٹین اور زارینہ، لوئب اور لیوپولڈ، ہٹلر اور اس کے شیدائی، یہ کمٹمنٹ اپنی جگہ بڑی دلچسپ ہے مگر میری سمجھ میں اب

بھی یہ بات نہیں آتی کہ جانوروں اور بچوں کو پیار کرنے والی ایک لڑکی ایسے گھناؤنے جرائم میں کیونکر شامل ہوسکتی ہے۔اس کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالیں تو ایک حد تک یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اتنی نارمل نہیں تھی جتنی کہ لگتی تھی۔ وہ کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ (ملے جلے) والدین کی اولاد تھی جسے چار برس کی عمر میں اس کی دادی کے پاس رہنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔اس کا باپ کسی حادثہ کی وجہ سے معذور ہو گیا تھا۔ مائرہ کو بلاشبہ یہ احساس تھا کہ اس کی چھوٹی بہن مورین کو اس پر ترجیح دی گئی ہے۔ چند گز کے فاصلے پر واقع دو گھروں میں بٹی ہوئی مائرہ اس ڈسپلن سے محض ناواقف تھی جو اسے ماں باپ سکھا سکتے تھے۔اس کی دادی کے پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ اس کی زور دار شخصیت اس کی مضبوط اور بڑی ٹھوڑی سے ظاہر تھی۔ مانچسٹر کی مخصوص کامن سینس اور تند مزاجی میں بھی اس کا حصہ کسی سے کم نہ تھا۔اس کی سکول رپورٹ میں اسے 'الگ تھلگ رہنے والی' بتایا گیا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں اسے ایک نفسیاتی صدمہ نے آ لیا۔ تیرہ سال کے ایک لڑکے مائیکل ہگنز سے اس کی دوستی تھی۔ وہ نازک اور شرمیلا تھا۔ لگتا ہے کہ اس نے مائرہ میں اپنے لیے ماں کی ممتا پیدا کر دی تھی۔ جون کی ایک گرم سہ پہر کو اس نے مائرہ سے تیرنے کے لیے ساتھ چلنے کو کہا مگر مائرہ نے انکار کر دیا۔خفا ہو کر وہ اکیلا چلا گیا۔مگر اس کے اعصاب نے بھی تیرنے میں اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ ڈوب گیا۔ یہ جان کر کہ مائیکل گھر واپس نہیں آیا وہ اس کی وجہ جاننے کے لیے گئی تو تالاب کے کنارے مائیکل کی لاش کے گرد پولیس کھڑی تھی۔اس منظر نے اسے توڑ دیا۔مہینوں اس نے سیاہ کپڑے پہنے۔ اس ماتمی لباس میں وہ گھنٹوں چپ بیٹھی رہتی۔اداسی نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔موت کے خلاف اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے وہ پروٹیسٹنٹ سے کیتھولک ہو گئی۔ چند ہفتوں بعد اس نے سکول چھوڑ دیا۔کئی دفتروں میں ملازمت کی مگر اس کا دل کہیں نہ لگا۔بوریت کی وجہ سے وہ اکثر غیر حاضر ہوتی، اس لیے کسی بھی دفتر میں ایک مہینہ سے زیادہ نہ ٹھہر سکی۔اس نے ناچ گھروں میں جانا شروع کیا اور اپنے بالوں کا رنگ بار بار بدلتی رہتی مگر لڑکوں کو بے تکلفی کی اجازت کبھی نہیں دیتی تھی، بلکہ ان کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتی۔ سترہ برس کی تھی تو منگنی ہوئی جسے اس نے اس لیے توڑ دیا کہ اس کی نظر میں لڑکے کی عادتیں بڑی بچکانہ تھیں۔ جب اس کا کتا ایک گاڑی تلے آ کر مر گیا تو ایک بار پھر اس کے شب و روز اداسیوں کی نذر ہو گئے۔

مائرہ کا بھی وہی مسئلہ ہے جو کسی بھی مضبوط عزم و ارادے کی لڑکی کا ہوسکتا ہے۔

جہاں تک مردوں کا تعلق ہے ان کی نظر میں آہنی ارادہ کی عورت ہونا کوئی خوبی نہیں۔ عورت کو تو نرم و نازک ہونا چاہیے۔ مگر تند خولڑکی کیا کرے کہ وہ تند خُو ہے اور اپنی جان پہچان کے اکثر مردوں سے اسے نفرت ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر مرد اس سے بیزار ہوتے ہیں اور وہ بھی اکثر مردوں سے بیزار رہتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اچھے مرد کی تلاش نہیں ہوتی، بالخصوص اگر وہ مائرہ جیسی گھر بساؤ لڑکی ہو۔ صرف وہ ایسے تجربے کرنے سے باز رہتی ہے جیسے تجربے کہ کمزور دل و دماغ کی لڑکیوں کو ہر ہفتہ کے اختتام پر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اسے اچھا بھی لگے تو وہ یہ بات اسے کیسے بتائے۔ پلکیں جھکائے، نظریں لڑائے یا اشارے کرے؟ ایسی فضول حرکات کے متعلق سوچ کر اس کا رویہ اور سخت ہو جاتا ہے۔ یا کوئی ایسی بات کہے جس سے پتہ چلے کہ اس کی معلومات اس شخص سے زیادہ ہیں۔ اُس سے زیادہ جانتی ہے۔ وہ کیا کرے کہ وہ آپ اپنی دشمن ہے۔

بریڈی پہلے سمجھا تھا کہ مائرہ ایک تیز طرار لڑکی ہے جو کاٹ پیٹ کر اسے اس کے سائز کا بنا دے گی۔ پھر جب یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ تند و تیز لڑکی اس کے پیچھے پڑ گئی ہے تو ایک مبہم سی دوری، قربت میں بدل گئی۔ ہم سب کے لیے یہ مشکل ہے کہ ہم ان کی شخصیت کے بہترین پہلو نہ دیکھیں جو ہمیں قبول کرتے ہیں۔ بریڈی محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک حد تک ہٹلر کے ٹارچر کیمپ کے گارڈ کی طرح لگتی ہے۔ وہ اپنا کھیل اس وقت تک کھیلنا چاہتا ہے جب تک کھیل سکے۔ جولائی میں وہ اس سے بات کرتی ہے تو بریڈی گھبرا جاتا ہے۔ اگست میں محسوس کرتی ہے کہ وہ اسے چور نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس دن سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ اسے زکام ہوتا ہے تو وہ چاہتی ہے کہ ماں بن کر اس کی دیکھ بھال کرے۔ اگلے دن وہ اسے نظر انداز کرتا ہے تو وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ ہر چند کہ منزل پر پہنچنے سے زیادہ منزل کا سفر پر لطف ہوتا ہے، ہر آنکھ مچولی ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی۔ پانچ مہینے بعد وہ اسے گھمانے لے جاتا ہے تو مارتھا بیک کی طرح اچانک اسے لگتا ہے کہ اپنے خوابوں کا شہزادہ مل گیا ہے۔

دوسرا مرحلہ سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ بریڈی نے اسے قاتلہ کیسے بنا دیا؟ اس میں مائیکل ہگنز کی موت کا بھی ضرور حصہ ہو گا۔ اس کی موت ایک نفسیاتی گھاؤ بن کر موجود ہے مگر موت کے خلاف بریڈی کا سخت رویہ ایک کتھارسس بن جاتا ہے۔ ٹارچر کیمپس کے متعلق کتابیں، نازیوں کا پریڈ میوزک اور ہٹلر کی تقریروں کے ریکارڈ، سب مل کر اسے ایسی سفاکانہ

سطح پر لے جاتے ہیں جہاں ٹریجڈی بے معنی ہو جاتی ہے۔

اگر وہ ایک خاموش اور لائق لڑکی ہوتی جس کا دفتر میں دل لگتا تو جو ہوا ہے وہ کبھی نہ ہوتا، مگر دفتر اسے بور کرتا تھا۔ چنانچہ وہ غیر حاضریوں کی وجہ سے ایک کے بعد دوسری ملازمت سے برخاست ہوتی رہی۔

بریڈی بھی کم وبیش ایسے ہی دور سے گزرا تھا۔ وہ بھی ایک کے بعد دوسری نوکری سے نکلتا رہا، مگر اس کی نوکریاں مشقت طلب تھیں۔ سٹاک کلرک بننا اس کے لیے خوشگوار تبدیلی ہوتی مگر دفتری اوقات میں اس کی مسلسل بے قاعدگیاں اور موقعہ ملتے ہی وہاں سے کھسک جانا اب بھی اس کی عادت تھی۔ نازیوں کے متعلق کتابیں ہمیشہ اس کے دفتری دراز میں ہوتیں۔ دوسرے ملازموں سے شاید ہی وہ کبھی بات کرتا ہو۔ کھانے کا وقفہ وہ جنگی جرائم کی کتابیں پڑھنے میں گزار دیتا۔ وہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے خوابوں کی دنیا میں بس گیا تھا۔ اس لیے مائرہ کو بھی وہاں بسانے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہ اسے ہیسی کہا کرتا اس لیے نہیں کہ اس کا نام مائرہ تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ہٹلر کے ڈپٹی روڈلف ہیس کا شیدائی تھا۔

ان باتوں سے مائرہ کی غلامی تو سمجھ میں آتی ہے مگر اس میں کوئی بات قطعی اور فیصلہ کن نہیں۔ بنیادی بات وہی مائرہ کا درمیانے گروپ سے ہونا اور بریڈی کا ٹاپ گروپ ہے۔ وہ اپنی تندی کے باوجود ایک رومانی ٹائپسٹ تھی جسے ایک مہربان دوست کی تلاش تھی۔ مگر بریڈی کو خوابوں سے قتل کی وارداتوں تک لے جانے کا ذریعہ بھی تھی۔ کیونکہ بریڈی کو محبت کا نہیں طاقت کا کھیل کھیلنا تھا۔

یہ مشاہدے جرائم کے سلسلہ میں میسلو کے ''عزتِ نفس'' کے تصور پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔ مگر 'کمزور پارٹنر' کی نفسیات سمجھنے کا کام باقی رہ جاتا ہے۔ لیوپولڈ اور لوئب یا بریڈی اور ہیڈلی کے معاملہ میں ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت سے یہ سوال دھندلا جاتا ہے جس کا مطلب ان کی یکساں ذمہ داری ہے۔ مگر البرٹ ٹی پیٹرک کیس میں ایسا کوئی رشتہ نہیں۔ اس لیے سوال اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ جب پیٹرک پہلی دفعہ جونز کے پاس گیا تو وہ کسی ایسی بات کی تلاش میں تھا جسے وہ ولیم رائس، جونز کے مالک کے خلاف استعمال کر سکے۔ جونز نے انکار تو کر دیا مگر ولیم رائس کو باخبر نہ کیا۔ جس کے معنی ہیں کہ جونز ایک حد تک پیٹرک سے مرعوب ہو چکا تھا۔ پیٹرک پھر اس کے پاس گیا۔ اس وقت تک جونز کی مدافعت جواب دے چکی تھی، اس نے پیٹرک کو موقع دیا کہ وہ ایک ایسی دستاویز پر اس کے مالک کے جعلی دستخط کرے جسے

عدالت میں ولیم رائس کے خلاف استعمال ہونا تھا۔ چھ ماہ بعد جونز اپنے محسن ولیم رائس کو زہر دے رہا تھا۔ جس نے اس کی زندگی بنائی تھی۔ شاید ہم کہیں کہ کوئی وجہ تو ہوگی کہ جونز اپنے مالک کے خلاف تھا، شاید وہ جونز سے بدسلوکی کرتا ہو۔ مگر پھر بھی اس مرعوبیت کی سمجھ نہیں آتی جس کی وجہ سے جونز جیل میں اپنا گلا کاٹنے پر رضامند ہو گیا تھا۔ اس ضمن میں ایک اور مقدمہ یاد آتا ہے۔ ایک عورت ٹرین پر ہائیڈل برگ جا رہی تھی جہاں وہ اپنے پیٹ کے درد کے سلسلہ میں ڈاکٹر سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ راستہ میں ایک ایسے ہم سفر سے باتیں کرنے لگی جو نیچر سے علاج کا دعوے دار تھا۔ اس شخص، فرینز والٹر نے اسے یقین دلایا کہ وہ اسے صحت یاب کر سکتا ہے۔ جب ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی تو اس نے عورت کو کافی پینے کی دعوت دی۔ اس کا جی تو نہیں مانا پھر بھی وہ اس کے ساتھ چل دی۔ پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے اس شخص نے عورت کا ہاتھ تھام لیا۔ ''مجھے لگا جیسے میری کوئی مرضی نہیں، مجھے بہت عجیب لگا اور میں لڑکھڑانے لگی۔'' اجنبی نے اس کی پیشانی چھوتے ہوئے اس پر مدہوشی طاری کر دی اور اسے ریپ کیا۔ عورت نے اسے پرے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ ہل نہیں سکتی تھی۔ ''میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔'' تم گہری نیند میں ہو، تم چلاّ نہیں سکتیں اور نہ ہی کچھ اور کر سکتی ہو، اس نے مجھے ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے میرے ہاتھ اور بازو موڑ کر پیچھے کر دیے، انہیں دباتے ہوئے اس نے کہا، 'تم حرکت نہیں کر سکتیں جب تم جاگو گی تو تمہیں کچھ بھی یاد نہیں رہے گا'

اس کے بعد والٹر نے اسے طوائف بنا دیا وہ اس کے گاہکوں کو ہپناٹزم کا وہ مخصوص لفظ بتا دیتا جسے سن کر اس میں ہلنے جلنے کی سکت نہ رہتی۔ جب اس نے شادی کر لی تو والٹر نے اس کے ہاتھوں اس کے شوہر کو قتل کروانے کے لیے کئی تدبیریں کیں۔ چھٹی بار جب اس نے قتل کرنے کی کوشش کی تو شوہر کو شک گزرا کیونکہ اس کی موٹر سائیکل کی بریک خراب کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے اسے حادثہ پیش آیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی نے ایک بڑی رقم کسی گمنام ڈاکٹر کو دے دی ہے تو پولیس کو شک گزرا کہ اسے ہپناٹائز کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر لڈوِگ میئر نے اسے اس عذاب سے نجات دلائی۔ والٹر کو دس برس کی سزائے قید ہوئی۔

مگر والٹر نے اتنی جلدی اور اتنی آسانی کے ساتھ اس پر کیسے قابو پا لیا تھا؟ اس لیے کہ وہ عورت کمزور تھی اور اسی لیے جلدی متاثر ہو سکتی تھی۔ پھر بھی ہاتھ پکڑ لینا، ہپناٹائز کرنے

کا کوئی مانا ہوا طریقہ نہیں۔ ہپنوسس کے ذریعہ اثر انداز ہونے کا واحد طریقہ دماغی قوت ہے۔ **1885** میں فرانسیسی ماہر نفسیات پیری جینٹ کولد ہاردے کے ایک ڈاکٹر گلبرٹ نے بلایا تا کہ وہ لینی نامی ایک مریضہ پر اس کے تجربات کا مشاہدہ کرے۔ لینی خصوصی طور پر مناسب کیس تھا، وہ فاصلہ پر ہو کر بھی گلبرٹ کے احکام کی تعمیل کرتی۔ وہ عام طور پر لینی کا ہاتھ چھو کر اس پر مدہوشی طاری کرتا تھا۔ مگر جینٹ نے کہا کہ وہ اس کے متعلق صرف سوچ کر اس پر مدہوشی طاری کر سکتا ہے۔ دوسرے موقع پر اس نے اپنی دماغی قوت کے ذریعہ لینی کو دُور سے بلا لیا۔ گلبرٹ سمجھ گیا کہ پوری توجہ اور انہاک سے یہ عمل کرنا ہے۔ اگر دماغ ذرّہ برابر بھی کسی اور طرف بہک گیا تو ناکامی کا سامنا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ایک طرح کی روشن لہر اس کی طرف بھیجتا تھا۔ **1920** کے عشرہ میں روسی سائنس دان ایل ایل وزیلیف نے یہی عمل اپنی ایک مریضہ پر کیا۔ جس پر بائیں طرف سے ہسٹیریائی فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اسے ہپوناسس کے زیر اثر کر کے وزیلیف نے اسے حرکت کرنے کا حکم دیا۔ اس نے وزیلیف کے تمام احکام کی تعمیل کی، یہاں تک کہ اپنے مفلوج بازو کو بھی ہلایا جلایا۔ **1890** کے عشرے میں ڈاکٹر پال جوئر نے اسی قسم کے تجربے کیے جن کے دوران مریضوں کو ہپناٹائز نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی تھی۔ اسے ایک دفعہ پھر احساس ہوا کہ دماغی احکام اسی صورت میں مانے جائیں گے جب اس کا دھیان ان پر پوری طرح مرکوز ہو۔ جے بی پریسٹلے کا کہنا ہے کہ ایک ادبی دعوت میں اس نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ اسے کوئی آنکھ مارے۔ فوراً ہی اس نے ایک سنجیدہ سی عورت پر توجہ دینی شروع کر دی تو اچانک اس عورت نے اسے آنکھ ماری۔ بعد میں اس عورت نے بتایا کہ اچانک اس کے دل میں یہ احمقانہ خیال پیدا ہوا تھا۔

ہم مانیں نہ مانیں کہ ہپنوسس ایک نہ ایک حد تک ذہنی رابطہ **telepathy** کا ذریعہ ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مخمصے میں ڈالنے کا باعث ہے۔ حیوانوں کو آسانی کے ساتھ ہپناٹائز کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات **1936** میں ایک ریاضی دان **Daniel Schwenter** نے محسوس کی ہے۔ اس نے دیکھا کہ اگر مرغی کی چونچ پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا مڑا ہوا ٹکڑا باندھ دیا جائے تو مرغی اس پر آنکھیں جما لیتی ہے اور اس طرح مدہوش ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر مرغی کی چونچ زمین سے لگا دی جائے اور چونچ سے دور لکیر کھینچ دی جائے تو مرغی بے حس و حرکت ہو جاتی ہے۔ دس سال بعد ایک پادری **Athanasius Kircher** نے مرغیوں پر

یہی تجربہ کیا۔ کرنا یہ ہوتا ہے کہ مرغی کا سر اس کے بازو تلے دے کر مرغی کو ہوا میں ہلکورے دو تو وہ ساکت ہو جائے گی۔ (فرانسیسی کسان اب بھی اسی طرح کرتے ہیں جب وہ مارکیٹ سے زندہ مرغیاں خریدتے ہیں) ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے انکشاف کیا کہ اگر مینڈک کو اس کی پشت کے سہارے لٹا دیں تو وہ ہپناٹائز ہو جاتا ہے۔ کیکڑے بھی ہپناٹائز ہو جاتے ہیں اگر ان کی پشت پر سر سے پاؤں تک آہستہ آہستہ انگلی ماری جائے۔ یہی عمل الٹا دیا جائے تو ان پر ہپنوسس کا اثر ختم ہو جاتا ہے Hypnosis of Man and Animals (جو 1963 میں شائع ہوئی) میں مصنف نے بتایا ہے کہ افریقا کے باشندے جنگلی ہاتھی کو کیسے ہپناٹائز کرتے ہیں۔ ہاتھی کو زنجیروں سے درخت کے ساتھ باندھ کر بری طرح پیٹا جاتا ہے پھر پتوں والی ٹہنیاں اس کے سامنے لہرائی جاتی ہیں۔ بار بار گایا جاتا ہے حتیٰ کہ ہاتھی کی آنکھیں جھپکتی ہیں، بند ہوتی ہیں اور ہاتھی دوست بن جاتا ہے تو اسے سدھائے ہوئے دوسرے ہاتھی کے ساتھ مختلف کاموں میں مصروف کر دیا جاتا ہے۔ پھر بھی اگر وہ قابو نہ آئے تو یہی علاج دہرایا جائے تو عام طور پر فوری کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

وہ سانپوں کے متعلق بھی بات کرتا ہے کہ وہ اپنے شکار کو کیسے مسحور کرتے ہیں۔ پرانے قصوں کہانیوں سے قطع نظر کئی سائنس دانوں نے مشاہدہ کیا ہے کہ مینڈک، خرگوش اور کئی دیگر جانور سانپ کی نظر کے سامنے ساکت ہو جاتے ہیں۔ اس کی آواز Hiss اور آنکھوں کی پتلیوں کے پھیلنے کا اس میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ مگر مصنف نے ایک بڑے مینڈک کو ہپنوسس کی لڑائی میں سانپ کو مات دیتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کی تصویر بھی اتاری ہے۔ اس نے دو چھپکلیاں دس منٹ تک آمنے سامنے ڈٹی ہوئی دیکھیں۔ دونوں ہی ڈھیٹ تھیں۔ اچانک ایک آگے بڑھی اور دوسری کو کھا گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ ہپنوسس کی لڑائی تھی۔ ایسی حالت میں لگتا ہے کہ ایک جانور دوسرے جانور کی قوتِ ارادی پر غالب آ جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اچانک کسی صدمے، پرندے کو زور سے پکڑ لینے یا شور کرنے سے بھی ہپنوسس جیسی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہپنوسس کا تعلق کسی حد تک خوف سے بھی ہے۔ خوف کی حالت میں خون کی نالیوں میں اتنی زیادہ adrenalin چلی جاتی ہے کہ متحرک کرنے کے بجائے اسے مفلوج کر دیتی ہے۔ (خوف کی حالت میں کمزور ہو جانے کا تجربہ ہر شخص کو ہے)

ہپنوسس کی وضاحت کیونکر ہو سکتی ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ ہم بڑی حد تک مشینیں ہیں۔ مگر مشینیں ہماری مرضی سے چلتی ہیں۔ ہپنوسس میں ہماری مرضی پر کسی اور کی مرضی

غالب آ جاتی ہے۔ جب ہمارا ارادہ مضبوط اور بامقصد ہوتا ہے تو ہم اپنی توانائی بڑھا کر اپنی توجہ مرکوز (فوکس) کر سکتے ہیں۔ ہپنوسس میں اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی توانائی اچانک کم ہوتی ہے اور توجہ منتشر ہو جاتی ہے۔ مشین ہپناٹائز کرنے والے کا حکم مانتی ہے۔ جیسے گاڑی کسی ڈرائیور کا حکم مانے۔

ہپنوسس کو سمجھنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ اگر میری توجہ کسی ضروری کام کی طرف ہے تو میں اپنی توجہ اور پورے انہاک سے وہ کام کروں گا جیسے فائر مین پانی کے پائپ سے آگ بجھاتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی شک وشبہ، سکون یا اپنے خیالات میں کھو جانے کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ اس سے آگ کو نشانہ بنانے والی پانی کی دھار کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کا رُخ بھی بدل سکتا ہے۔ اگر ہم سانپ کے مقابلہ میں بڑے مینڈک یا دو چھپکلیوں کا مقابلہ یاد کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جس کے ارادہ میں پہلے جھول آتی ہے، جس کی توجہ پہلے بٹتی ہے وہی دشمن کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ برنارڈ ہالینڈر نے اپنی کتاب **Hypnosis and Self Hypnosis** میں لکھا ہے کہ ہپنوسس بڑی تجریدی (**absract**) ہوتی ہے۔ جب ایک اکتایا ہوا لڑکا کسی چیز کے متعلق سوچے بغیر خالی خالی نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھتا ہے تو یہ سرسری ہپنوسس کی حالت ہے اور سکول ماسٹر اسے ٹھیک ٹوکتا ہے کہ ''جونز جاگ جاؤ۔'' لڑکا اپنی توجہ کہیں مرکوز کیے بغیر اپنی اندر کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ اگر وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش میں لگا ہوتا تو ایسا نہ کرتا۔ دراصل ہپنوسس ایک ایسی حالت ہے جب دماغ کہیں اور ہوتا ہے پھر بھی کہیں نہیں ہوتا۔ **Velgyesi** کی کتاب خوش اسلوبی کے ساتھ واضح کرتی ہے کہ دماغ کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ ایک جنگلی ہاتھی کا چیخنا چلاّنا بالکل قدرتی بات ہے۔ جبکہ وہی ہاتھی دوست بن جاتا ہے اگر اس کی آنکھوں کے آگے شاخیں لہرائی جائیں۔ حالانکہ یہ بات فطرت کے خلاف لگتی ہے اور کسی حد تک یہ خیال بھی غلط لگتا ہے کہ چھپکلی بلکہ مگرمچھ کی گردن پر بھی نرمی سے ہاتھ پھیرا جائے تو وہ ساکت ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں انہیں اس قدر کمزور کرنے میں قدرت کی کیا مصلحت ہے؟

شاید اس کا جواب یہ ہو کہ یہ کمزوری بالارادہ نہیں ہے۔ خود جرم کی طرح یہ بھی ایک غلطی ہے۔ ایک خامی جو کئی خوبیوں کے تشکیل پاتے ہوئے ابھری ہو۔ ملے جلے اجزا سے تعمیر کرنے کے لیے زندگی کو کوئی طریق کار تخلیق کرنا ہی تھا۔ ایک بڑی گاڑی پیٹرول بہت خرچ کرتی ہے۔ ایک حیاتیاتی ڈھانچے کی ضرورت بہت سی توانائی ہے۔ اگر توانائی اچانک کم یا ختم

ہو جائے تو اختیار بھی باقی نہیں رہتا۔

انسان پرندوں یا حیوانوں سے کہیں زیادہ پیچیدہ مخلوق ہے مگر ان پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔Volgyesi کا کہنا ہے کہ کمزوروں کو ہپناٹائز کرنا سب سے آسان ہوتا ہے۔ بے حد احمقوں کی نسبت حساس اور ذہین افراد پر ہپنوسس آسانی سے اثر کرتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ زیادہ حساس افراد کے ہاتھوں میں نمی ہوتی ہے۔ اس لیے ان سے ہاتھ ملاتے ہی اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہپنوسس کے لیے موزوں ہیں۔ ایسے افراد کو وہ psychopassive کہتا ہے جبکہ خشک ہاتھوں والے psychoactive ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہ ہپناٹائز ہو سکتے ہیں مگر اس کے لیے ان کا گہرا تعاون ضروری ہے۔ کبھی بجلی کے ہلکے کرنٹ کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے۔

یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ حساس اور ذہین افراد میں توانائی کی کمی اکثر ہوتی ہے اس لیے وہ دوسروں کی نسبت آسانی کے ساتھ بوریت اور اداسی کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔ توانائی میں ضرورت سے زیادہ کمی کی وجہ سے وہ بآسانی ہپناٹائز ہو سکتے ہیں Hipnotism and Crime میں ہائنز ہیمر شلاگ نے ایک ماہر نفسیات کا حوالہ دیا ہے جو اتفاقاً قریب بیٹھے نوجوان کی طرف دیکھتا ہے، تو نوجوان کہتا ہے کہ ''میری طرف اس طرح نہ دیکھو، میں اپنا بازو نہیں ہلا سکتا۔'' یہ کہا اور آنکھیں بند کر کے صوفے میں دھنس گیا۔ یہ auto suggestion کی ایک واضح مثال تھی۔ ہیمر شلاگ نے ایک میڈیکل سٹوڈنٹ کے مسخرے پن کا ذکر بھی کیا ہے جس نے پالین نامی ایک بیمار لڑکی کو ہسپتال میں ہپناٹائز کیا اور اسے حکم دیا کہ ہسپتال کے انچارج سے چار بجے بغل گیر ہو۔ جب ہسٹیریا کی اس مریضہ نے چار بجے وارڈ سے باہر جانے کی کوشش کی تو نرسوں نے اسے روکا۔ وہ ان سے دیوانہ وار لڑی۔ ایک ڈاکٹر جان گیا کہ لڑکی کو ہپناٹائز کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے مدہوش کیا اور اس سے ساری کہانی اگلوائی۔ ہپناٹائز کرنے والے سٹوڈنٹ کو بلا کر لڑکی کو ہپنوسس کے اثر سے آزاد کروا دیا۔ اس کے باوجود اسے دورے پڑتے رہے، جب تک کہ وہ انچارج سے بغل گیر نہیں ہوئی۔

ایسی مثال میں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی ذہنی لحاظ سے تقریباً نیند کی حالت میں ہوتی ہے۔ وہ بیداری اور نیند کی سرحد پر کھڑی ہوتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں توانائی کی کمی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مستقل طور پر خیالی (unreal) دنیا میں رہتی ہے۔ انچارج

سے بغل گیر نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس کی اعصابی بے چینی بڑھ جاتی ہے جب تک اسے اپنی طاقت بڑھانے کی ترغیب نہ دی جائے اور وہ فی الواقع اپنی توانائی میں اضافہ نہ کرے، اسی قسم کی الجھنوں میں پڑتی رہے گی۔ اعصابی بے چینی کی وجہ سے اس کی توانائی کم ہوتی ہے تو دنیا اسے غیر حقیقی لگنے لگتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس دنیا میں کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس سے اس کی بے چینی اور غیر حقیقت پسندی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

جو سکول ماسٹر جونز کو جاگنے کے لیے کہتا ہے درحقیقت وہ جونز کو اپنی ذہنی صلاحیت بہتر بنانے، اپنی توانائی بڑھانے کی تلقین کرتا ہے۔Volgyesi نے یہی مقصد مینڈکوں پر سلفیورک ایسڈ چھڑک کر حاصل کیا۔ جب کوئی ہپناٹزم سے بیدار ہوتا ہے، اس کے اثر سے نجات پاتا ہے، تو دنیا اسے بدلی ہوئی لگتی ہے۔ اچانک اس کی وہ قوت واپس آ جاتی ہے جس کے زور پر وہ دنیا کا سامنا کرتا ہے۔ ٹامس جے ہڈسن کی اصطلاح کا سہارا لیں تو اس معاملہ کی مزید وضاحت ہو سکتی ہے۔ ہڈسن نے 1893ء میں The Law of Psychic Phenomenon (یہاں سائیکک کا مطلب ذہنی ہے) کے نام سے ایک قابل قدر کتاب لکھی۔ ہڈسن ہپناٹزم کا طالب علم تھا۔ اسی نے یہ دلچسپ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہم سب کے دو دماغ ہیں، یا ہم سب دوہری شخصیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ خارجی اور دوسرا داخلی ہے۔ خارجی یا معروضی حصہ ہمارا باعمل حصہ ہے۔ وہ حصہ جو باہر کی دنیا اور اس کے مسائل کا سامنا کرتا ہے! داخلی حصہ ہمارے اندر کی دنیا کے مسائل سے عہد برآ ہوتا ہے۔ وہ ضرورت پڑنے پر توانائی بھی مہیا کرتا ہے، (جیسا کہ ہم آئندہ دیکھیں گے کہ ماڈرن ریسرچ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں حصے دماغ کے دائیں اور بائیں نصف مدار میں ہیں) ہڈسن کا کہنا ہے کہ ہپناٹزم میں دماغ کے معروضی حصہ کو سلا دیا جاتا ہے اور داخلی حصہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ ہپناٹائز کرنے والا خود مریض کا 'معروضی دماغ' بن جاتا ہے اور مریض اسی طرح اس کا حکم مانتا ہے جیسے کہ وہ اس کا اپنا معروضی دماغ ہو۔

جب سکول کا لڑکا خواب دیکھنے لگتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے داخلی دماغ میں چلا گیا ہے، اپنے اندر دیکھ رہا ہے۔ ''جاگو جونز!'' کی صدا اسے چونکا دیتی ہے اور وہ اپنی باہر کی دنیا، حقیقی دنیا میں واپس آ جاتا ہے اور اپنے معروضی دماغ کو جگا لیتا ہے۔

اب ہم اپنی بحث کے ایک نہایت اہم موڑ پر آ گئے ہیں۔ ہپناٹائز ہونے کے لیے دن کو خواب دیکھنے یا کسی اور مفروضہ کی ضرورت نہیں ہے۔ فرض کرو تمہیں دفتر پہنچنے کی جلدی

ہے اور سڑک پر خلاف معمول بے تحاشا ٹریفک ہے۔ ٹریفک سگنل ہر جگہ تمہارا راستہ روکتا ہے جس کی وجہ سے تم اور غضب ناک ہوتے ہو۔ ٹریفک کی بتی سبز ہو جاتی ہے مگر تمہارے سامنے کی کار حرکت نہیں کرتی۔ تم گاڑی سے باہر نکل کر ڈرائیور کو برا بھلا کہنا چاہتے ہو کہ اتنے میں گاڑی والا منہ موڑتا ہے۔ تم اپنا باس پہچان لیتے ہو۔ اس کے ساتھ ہی تمہارا غصہ غائب ہو جاتا ہے۔ اپنے غصہ اور ٹینشن کی وجہ سے تم داخلیت کے حصار میں دھکیلے جا رہے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے کہ سڑک پر اور بھی گاڑیاں ہیں، سڑک پر اُن کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ تمہارا ہے۔ ٹریفک کے خلاف تمہارا غصہ بے معنی ہے۔ رہ گئیں ٹریفک لائٹیں تو وہ ایک مشینی عمل ہے۔ ٹریفک لائٹ تمہیں آتا دیکھ کر سرخ نہیں ہوتی۔

جب تم نے اپنا باس پہچان لیا تو حقیقت بجلی بن کر تم پر گری اور تمہاری آنکھیں کھل گئیں۔ 'معروضی دماغ' ایک بار پھر اپنی جگہ پر آ گیا۔ غصہ کی وجہ سے تم اپنی ملازمت گنوانے لگے تھے یا کم از کم ترقی کا موقع تو ہاتھ سے چلا جاتا۔ تم نے اپنے باس کو بروقت پہچاننے پر اطمینان کا سانس لیا۔

چنانچہ ہپنوسس محض مدہوشی کی حالت کو نہیں کہتے۔ ہالینڈر کے مطابق یہ حقیقی سے غیر حقیقی کا سفر ہے۔ حقیقت سے رابطہ ختم کر کے داخلیت کے گرداب میں پھنس جانا ہے۔ اس حالت کی کسی چارلس مینسن، جون فریز بیئر یا کسی بریڈی کی برہمی کے ساتھ کھلی مشابہت ہے۔ اسے مان لیں تو ہم ایک دلچسپ نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہپنوسس کے زور پر مینسن اپنے شاگردوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بریڈی یہی قوت استعمال کر کے ہنڈلی کو اپنے ماتحت کرتا ہے۔ مگر یہ لوگ پہلے ہی خود ہپناٹائز ہو چکے تھے جیسے ہسپتال میں زیر علاج ہسٹیریا کی مریض لڑکی۔ مینسن دراصل ایک ایسی دنیا میں جی رہا تھا جس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ اس مشابہت سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہ کہ مجرم اپنے جرم کا ذمہ دار نہیں؟ نہیں! ایسا نہیں ہے، کیونکہ جرم کے انتخاب میں مجرم کی اپنی مرضی شامل ہے۔ ٹریفک جام میں غصہ کرنے کا مطلب اپنے اوپر غصہ خود طاری کرنا ہے، ورنہ ٹریفک جام کی حقیقت تسلیم کر کے غصہ سے بچ سکتے ہیں۔ اس طرح اپنی قوت ضائع ہونے سے روک سکتے ہیں۔ اس طرح ہماری شخصیت کا ایک حصہ اس ناگزیر ٹریفک جام سے بے تعلق ہو کر اس پر صبر کر لیتا ہے۔ لیکن غصہ اگر عادت بن جائے تو یہ بے تعلقی بتدریج کمزور ہوتی چلی جاتی ہے اور بالآخر غصہ میں بدل جاتی ہے۔ دوستوئیفسکی کی Crime and Punishment میں اس کی ایک واضح مثال ہے۔ اس کا کردار

راسکالنی کوف اپنی بڑھتی ہوئی غربت، اپنی محتاجی پر سخت پیچ وتاب کھاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے طیش میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پیسے کی خاطر ایک ضعیف عورت کو قتل کرنا اسے بالکل معقول اور جائز لگتا ہے۔ ہپناٹزم یہ ہے کہ حقیقی دنیا سے آنکھیں بند کر لی جائیں، اس کے وجود سے انکار کیا جائے۔ مگر اس کردار کو آخرکار احساس ہوتا ہے کہ بے چاری بوڑھی عورت بھی تو اس کی طرح ایک انسان ہے۔

اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ ہر جرم میں 'ہپنوسس' کا ایک عنصر موجود ہوتا ہے۔ اپنی تصنیف The Tower and the Abyss میں کاہلر نے جون 1944 میں ایک فرانسیسی گاؤں کے اندر نازیوں کے ہاتھوں قتل عام کا ذکر کیا ہے۔ فرانسیسیوں کو مزاحمت کی سزا دینے کے لیے جرمنوں نے تمام مردوں کو تو گاؤں سے باہر نکال دیا اور بچوں اور عورتوں کو گاؤں کے چرچ میں جمع کیا۔ اس وقت کسی نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا۔ جرمن سپاہی بچوں کے ساتھ ہنس بول اور کھیل رہے تھے۔ اتنے میں ان کے کیپٹن نے اشارہ کیا تو سپاہیوں نے سب کو گولیوں سے بھون دیا۔ چرچ کو آگ لگا دی گئی، عورتیں اور بچے زندہ جل مرے، جو بچے کسی نہ کسی طرح رینگتے ہوئے آگ سے بچ نکلے انہیں اٹھا کر واپس آگ میں پھینک دیا گیا۔ جس شخص نے اس قتل عام کا حال بیان کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ مجھے پورا یقین ہے کہ جرمن سپاہیوں کے دلوں میں ان فرانسیسی بچوں کے خلاف ذرّہ بھر نفرت نہیں تھی اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر انہیں قتل کر دینے کا حکم نہ دیا جاتا تو جرمن سپاہی بچوں کے ساتھ بدستور باپ بیٹے کا کھیل کھیلتے رہتے۔ مگر نازی سپاہی حکم کے ماتحت تھے اور اس حکم میں بھی اتنی ہی طاقت تھی جتنی ہپناٹسٹ کے حکم میں ہوتی ہے۔ انہوں نے عورتوں اور بچوں کی زندہ حقیقت کو نظر انداز کر دیا اور ''اپنا فرض ادا کیا۔'' ایک اٹھائی گیرا بھی لوگوں کو اسی طرح لوٹتا ہے۔ بے شک اس کے دل میں ان کے لیے دوستانہ جذبات ہوں اور بے شک وہ انہیں اپنے 'قابل اعتماد' ہونے کا یقین دلائے مگر اس سے حقیقت یا اس کی نیت تو نہیں بدلتی۔ مینسن کے خاندان نے اسی حالت میں شیرون ٹیٹ اور اس کے مہمان قتل کیے۔ مائرہ ہنڈلے نے اسی انداز سے بچوں کو قتل کرنے میں بریڈی کا ساتھ دیا، مگر بچوں سے پیار کا دعویٰ برقرار رہا۔ جب اسے پتہ چلا کہ اس کا کتا پولیس کے ہاتھوں مارا گیا ہے تو وہ چیخ اٹھی کہ ''یہ سب بدترین قاتل ہیں۔'' واقعہ یہ ہے کہ اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔

اگرچہ پُرتشدد جرائم میں خاص طور پر 'علیحدگی' اور 'بے تعلقی' کا یہ رجحان موجود ہوتا

ہے۔ مگر ایک لحاظ سے یہ جرم سے پیدا ہونے والی صورت حال سے باہر نکلنے کی کوشش بھی ہے۔ جنسی قاتل جان کرسٹی کا کہنا ہے کہ ''ریپ اور اس کے بعد قتل کر دینے سے میں ایک دفعہ پھر پُرسکون ہو جاتا ہوں۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا۔'' قتل سے اسے اپنے جذبات اور خواہشات کے گرداب سے، ان سے پیدا ہونے والے تناؤ سے نجات مل گئی۔ وہ ایک بار پھر جاگ گیا تھا۔

بوبی فرینکس کو قتل کرنے سے پہلے جو عام قسم کے جرائم لیوپولڈ اور لوئب نے کیے ان میں بھی یہ پہلو موجود ہے۔ لوئب کو جرائم میں مزا آتا تھا۔ جرم اس کے لیے ایک کھیل تھا، کھیل میں 'جیت' کر ہر بار اسے نیا سکون اور آرام حاصل ہوتا تھا۔ (جعل سازی میں پکڑا جانا کوئی فخر کی بات تو نہیں تھی) جرم، لوئب کے لیے تناؤ سے نجات حاصل کرنے، اپنے آپ کو بیدار کرنے کا ذریعہ تھا۔

اس طرح مورز کے معاملے کو بھی سمجھنا آسان ہے۔ جب بریڈی نے ایڈورڈ ایونز کو قتل کیا تو اس کی کوشش تھی کہ وہ ڈیوڈ سمتھ کو اس میں ملوث کر لے تاکہ وہ مجرموں میں شمار کیا جائے، ان کا حصہ بن جائے۔ بریڈی کا مقصد بینک میں ڈاکہ ڈالنا تھا۔ چونکہ وہ شروع سے بینک لوٹنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا اس لیے قتل کو اس نے اپنی تربیت کا حصہ جانا، جس کے بعد وہ کوئی بڑا جرم کرنا چاہتا تھا۔ بریڈی چاہتا تھا کہ وہ ہر لحاظ سے معاشرے کا دشمن بنے۔ اس اُمید کے ساتھ کہ کبھی پکڑا نہ جائے ہر جرم کے بعد کھائے پیے اور خوش رہے۔ جرم ہمیشہ اس کی زندگی کی رونق بنا رہے۔

اور اس میں ہم جرم کے پیٹرن کا ایک دلچسپ پہلو دیکھ سکتے ہیں کہ جرم کی موجودہ سطح کو مجرم اگلے قدم میں بدلنا چاہتا ہے۔ چارلی پیس اپنی روزی کمانے کے لیے جرم کرتا ہے مگر اپنے تحفظ کا پورا خیال رکھتا ہے۔ کئی گھریلو جرائم یعنی ڈاکٹر پچرڈ کو نسیٹنس کینٹ، ایڈیلیڈ بارٹلیٹ کے جرائم میں ''اذیت پسندی'' کا بڑا دخل ہے، یہاں تک کہ وہ جنسی سطح کو چھو لیتے ہیں۔ رپر کے جنسی جرائم میں نمائش کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ پولیس کے نام خط، لاشوں کو سجانا، سب اپنی بڑائی جتانے کے لیے ہے۔ مینسن اور بریڈی کے جرائم ایک بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا رخ تخلیقی سطح کی طرف ہے۔ (میں نے اپنی کتاب **Order of Assassins** میں ایسے قاتلوں کو **Assassins** کا نام دیا ہے جو اس لیے قتل کرتے ہیں کہ اپنے اظہار کو ایک پُرتشدد شکل دے سکیں۔ ایسے جرائم اور بعض مصوروں کے پُرتشدد آرٹ میں واضح مماثلت پائی

جاتی ہے۔

'تخلیقی عمل' کے طور پر جس کیس کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اسے سویڈن سے باہر بمشکل کوئی جانتا ہوگا۔ اس کیس کا تعلق ڈاکٹر تھرن مین سے ہے جو چارلس مینسن سے بھی زیادہ تنہا انقلاب لانے کے خواب سے زیادہ قریب تھا۔

1930 کے آغاز میں سٹاک ہام کے ایک قصبہ میں معمولی جرائم کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ 16 نومبر 1930 کو ڈیری کے ایک ملازم ایرکسن کی لاش ایک یخ بستہ نہر سے ملی۔ ایرکسن دو روز پہلے لاپتہ ہوگیا تھا جبکہ وہ کام کرنے کے بعد گھر آ گیا تھا۔ اسے سخت لڑائی کے بعد چھاتی میں گولی ماری گئی تھی کیونکہ اس کا چہرہ زخمی اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جب اسے نہر میں پھینکا گیا تو وہ زندہ تھا۔ قتل کا مقصد لوٹنا نہیں تھا کیونکہ ہفتہ بھر کا معاوضہ اس کے پرس میں موجود تھا۔ مسز ایرکسن نے بتایا کہ اس کا شوہر عصبی دباؤ میں تھا بلکہ اس بارے میں اس نے ایک ڈاکٹر سے مشورہ بھی کیا تھا۔ مگر مسز ایرکسن کی سمجھ میں نہ آیا کہ کوئی اسے کیوں مارنا چاہتا تھا۔ پولیس کو بھی اس قتل کا کوئی سراغ نہ ملا۔

آئندہ دو دنوں میں نقب زنی کی تین وارداتوں کے علاوہ دو گاڑیاں بھی چوری ہو گئیں۔ یا تو مجرم ناقابل یقین حد تک محتاط تھا یا ناقابل یقین حد تک خوش قسمت تھا کہ پولیس کو پھر کوئی سراغ نہ ملا۔

15 ستمبر 1933 کو صبح سویرے قصبہ کے وسط میں واقع ایک گھر میں آگ بجھانے والوں کو بلایا گیا۔ گھر کا مالک ایکسیل امیر کبیر آدمی تھا۔ آگ اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ اس پر قابو پانا بہت مشکل تھا۔ ایکسیل اور اس کے کسی ساتھی کی سوختہ لاشیں نکالی گئیں تو پتہ چلا کہ دونوں کے سر میں گولی ماری گئی تھی۔ مقصد لوٹنا تھا۔

اگلے سال نقب زنی کی چند وارداتیں تو ہوئیں مگر کوئی بڑا جرم نہیں ہوا۔ شہریوں نے رات کو نگہبانی کے لیے گروپ بنائے۔ 12 اکتوبر 1934 کو ایک گروپ نے دیکھا کہ مسز ٹلڈا کا گھر جل رہا ہے۔ گروپ کے شور کرنے پر مسز ٹلڈا کا ڈرائیور اور اس کی بیوی جلتے ہوئے گھر سے بخیریت نکل گئے۔ اس بار بھی مقصد لوٹنا تھا۔ مسز ٹلڈا کی لاش اس کے بیڈ روم میں تھی مگر اس پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ڈاکٹری معائنہ سے موت کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ مگر اندازہ ہوگیا کہ آگ سے پہلے اس کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ وہ ساٹھ برس کی ایک دولت مند عورت تھی۔ اس کی جیولری اور نقدی غائب تھی۔ اس کے دوستوں نے بتایا کہ وہ بیمار رہتی تھی

اور روحانیت اور یوگا میں دلچسپی لیتی تھی۔ پولیس ایک دفعہ پھر کوئی سراغ نہ لگا سکی۔
مگر 19 جون 1936 سے اس کی قسمت بدلنا شروع ہو گئی۔ جب ایلن پیٹرسن (پتھر نکالنے کی کمپنی کا ملازم) کو اسی قصبہ سالا کے گرد و نواح میں گولی مار دی گئی۔ وہ ہفتہ بھر کے لیے ملازموں کی تنخواہیں لے کر سائیکل پر پتھر کی کان کی جانب واپس جا رہا تھا۔ اس وقت ایک عمر رسیدہ شخص اپنے لان میں دھوپ کے مزے لے رہا تھا۔ پیٹرسن وہاں سے گزرا تو چند منٹ بعد گولی چلنے کی آواز آئی۔ وہ سڑک پر گیا تو اس نے دیکھا کہ دو آدمی پیٹرسن کی لاش گھسیٹ کر ایک گڑھے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک سیاہ امریکی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلے گئے مگر اس شخص نے کار کا نمبر لکھ لیا۔ کچھ دیر بعد ہوش میں آئے بغیر پیٹرسن مر گیا۔ اسے سینے اور پیٹ میں گولیاں ماری گئی تھیں۔
مگر جلد ہی پتہ چل گیا کہ کار کے نمبر سے بھی آسانی مدد نہیں ملے گی۔ اس نمبر کی کار امریکن نہیں تھی اور تمام دن وہ گیراج میں تھی۔ مالک کے پاس اس کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔ مگر ایک امریکن سیڈان (جو بالکل اسی نمبر کی تھی) حال ہی میں کسی دوسرے قصبہ سے چوری ہوئی تھی، جس کی نمبر پلیٹ بدلی گئی تھی۔ پولیس نے چوروں کو خوفزدہ کرنے کے لیے اخباروں کو بتایا کہ وہ ایک سیاہ شیورلٹ کی تلاش میں ہے جس کی نمبر پلیٹ انہی دنوں بدلی گئی ہے۔ نمبر دیتے ہوئے پولیس نے اعلان کیا کہ وہ گاڑی کو ہر گیراج میں تلاش کرے گی۔
اگلے دن کھوئی ہوئی کار سالا کے قریب سڑک پر کھڑی پائی گئی۔ گاڑی کا نمبر بڑی مہارت کے ساتھ بدلا گیا تھا کہ یہ کام کوئی ماہر ہی کر سکتا تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ پیشہ ور مجرم نہیں تھا کیونکہ بہت کم مجرم ایسے ہوتے ہیں جو اس کام کے ماہر بننے کے لیے اپنا وقت ضائع کریں۔ پولیس نے تمام گیراج اور نمبر پلیٹ کی دکانیں چھان ماریں۔ آخر کار ایک نوجوان کاریگر نے اعتراف کیا کہ نمبر پلیٹ اس نے بدلی تھی اور اس وقت وہ ایرک ہیڈ سٹارم نامی گیراج کے مالک کا ملازم تھا جو ایک قریبی مقام کوپنگ میں بزنس کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہیڈ سٹارم کے پاس ملازم ہوئے اسے چند روز ہی ہوئے تھے جب اسے پلیٹ بدلنے کے لیے کہا گیا تھا، اس لیے اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ چند روز بعد ہیڈ سٹارم نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ بینک کا کیش لے جانے والے کو لوٹنے میں اس کے ساتھ شریک ہونا چاہے گا؟ اس وقت تو وہ ہیڈ سٹارم سے سوچ کر جواب دینے کا وعدہ کر کے چلا گیا مگر دوسرے دن فون کیا کہ اس نے کہیں اور ملازمت کر لی ہے۔ جب ہیڈ سٹارم سے اس بارے میں پوچھا گیا تو اس نے ہر بات سے

صاف انکار کر دیا۔ مگر پولیس جونہی اس کے گھر سے نکلی اس نے آپریٹر کو اسٹاک ہام کا ایک نمبر ملانے کو کہا۔ پولیس نے معلوم کیا تو وہ نمبر عصبی خرابیوں کے ماہر ڈاکٹر سگورڈ تھرن مین کا تھا۔ پولیس آفیسر جس نے پہلے ایرکسن کے قتل کی تفتیش کی تھی، اسے یاد آیا کہ ایرکسن نے قتل ہونے سے کچھ دیر پہلے اپنے اعصابی تناؤ کے متعلق ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا تھا۔ ایرکسن کی بیوی نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر سگورڈ تھرن مین تھا۔

دوسرے دن اسٹاک ہام کا ایک پولیس آفیسر تھرن مین سے آ کر ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ جرم اور اعصاب کے باہمی تعلق پر معمول کی تفتیش کر رہا ہے۔ تھرن مین چھوٹے قد کا زردرُو نوجوان تھا۔ اس نے بڑی پس و پیش کے بعد پولیس افسر کو اپنی فائلیں دیکھنے کی اجازت دی۔ فائلیں دیکھ کر پولیس افسر نے تصدیق کر لی کہ ایرکسن اور مسز بلوم کوئسٹ دونوں ہی اس کے مریض تھے۔

ہیڈ سٹارم کو تفتیش کے لیے لایا گیا۔ پولیس نے اس کے گھر کی تلاشی لی۔ وہ بضد رہا کہ تھرن مین سے اس کی معمولی جان پہچان تھی۔ وہ کالج میں اکٹھے تھے، اس وقت سے وہ کبھی کبھار اس سے مشورہ کر لیا کرتا تھا۔ مگر تفتیش کے دوران فون پر بتایا گیا کہ پولیس نے اس کے گیراج سے وہ ریوالور برآمد کر لیا ہے جس سے ایرکسن کو گولی ماری گئی تھی۔ ہیڈ سٹارم نے فوراً اعتراف کر لیا اور بتایا کہ تمام جرائم کا ذمہ دار تھرن مین ہے۔ وہ دونوں یونیورسٹی میں اکٹھے تھے اور دونوں کو ہپناٹزم سے دلچسپی تھی۔ تھرن مین 'علم الاسرار' (تھیوسوفی) اور فلسفہ کا طالب علم تھا۔ ویسے بھی ہیڈ سٹارم اس کی شخصیت سے مرعوب تھا۔ یہ 1920 کے عشرہ کی بات ہے۔ تھرن مین کو جرائم سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ 'بے عیب جرم' کی منصوبہ بندی اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ ہیڈ سٹارم بھی اس کا شریک کار بن گیا۔ 1929 میں تھرن مین نے ارادہ کیا کہ جو جرائم انہوں نے اچھی طرح سوچ لئے تھے ان میں سے کسی ایک کو عملی طور پر آزما کر دیکھیں۔ چنانچہ انہوں نے ڈیری پر ڈاکہ ڈالنے کا فیصلہ کیا جہاں ایرکسن ملازم تھا۔ ایرکسن، تھرن مین کے زیر علاج تھا۔ وہ اس کا علاج ہپنوسس کے ذریعہ کیا کرتا تھا۔ ایرکسن نے ڈاکے میں شریک ہونا بھی مان لیا تھا۔ مگر آخری لمحہ اس نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔ تھرن مین ڈرا کہ وہ پولیس کو خبردار کر دے گا، یا کم از کم اپنی بیوی کو بتا دے گا۔ چنانچہ ہیڈ سٹارم کو دو اور افراد کے ساتھ اسے قتل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ہیڈ سٹارم نے بتایا کہ اس وقت سے تھرن مین ان سے جرم کرواتا رہا ہے۔ تھرن مین نے ایکسیل کیلبرگ کا گھر لوٹنے اور اسے قتل کرنے میں بھی حصہ لیا

تھا۔ اس نے اور تھرن مین نے پولیس کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ (جسے تھرن مین نے تھیٹر کے لباس تیار کرنے والے سے بنوایا تھا) تاکہ گھر کا دروازہ آسانی سے کھلوایا جاسکے۔ کیلبرگ اور اس کی بیوی کو قتل کر کے گھر کو آگ لگا دی گئی۔

ٹلڈا ابلوم کوئسٹ کا انتخاب اس لیے ہوا تھا کہ اس نے ہپنوسس کے اثر میں ہیروں کا ڈبہ رکھنے کی جگہ بتا دی تھی۔ اس کا قتل منصوبہ بندی کا کمال تھا۔ دونوں نے اس کے بیڈروم کی دیوار میں سوراخ کر لیا تھا۔ (سکینڈی نیویا کے کئی گھروں کی طرح اس کا گھر بھی لکڑی سے بنا تھا) جس میں سے انہوں نے ایک ربڑ ٹیوب اندر داخل کی۔ ٹیوب گاڑی کے ایگزاسٹ سے منسلک تھی۔ ٹیوب کے ذریعہ گیس اندر بھر گئی تو ٹلڈا دم گھٹ کر مر گئی۔ انہوں نے ہیرے چوری کیے اور گھر کو آگ لگا دی۔

ہیڈ سٹارم کا دستخط شدہ اعتراف دیکھ کر تھرن مین نے سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ دراصل جیل میں اس نے اپنی سوانح عمری لکھی تھی۔ بچپن میں وہ اپنی خراب صحت اور چھوٹے قد کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا رہا تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا اور اسرار وتصوف میں اسے گہری دلچسپی تھی۔ 1921 میں اس نے اپنے سکول کے لڑکوں پر ہپناٹزم کے تجربات شروع کر دیے۔ تصوف اور اسرار کو بھی جی بھر کے پڑھا۔ سولہ سال کی عمر میں اسے ایک پراسرار ڈین (ڈنمارک کا باشندہ) ملا جسے یوگا میں مہارت تھی۔ 1929 میں اس نے دعویٰ کیا کہ وہ کوپن ہیگن ہو آیا ہے اور ڈین کے اسراری گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔ سٹاک ہام واپس آ کر اس نے اپنی جادوئی کلب بنائی جس میں اطاعت اور راز داری کا حلف لے کر اس نے ہر طرح کے لوگ شامل کر لیے۔

ایسا لگتا ہے کہ ڈین کی طاقت میں تھرن مین کو اپنے وہ خواب پورے ہوتے نظر آئے جو اس نے ہمیشہ دیکھے تھے۔ نابالغ بچیوں کو بے آبرو کرنے میں اس نے ہپنوسس کی طاقت سے کام لیا۔ گروہ کے دوسرے اراکین کو بھی زیر اثر لانے کے لیے ہپنوسس سے کام لیا گیا۔ 1934 میں اس نے اپنے گروہ کے ایک رکن پر ہپنوسس کے ذریعہ گہری مدہوشی طاری کر کے اسے زہر کا ٹیکہ لگا دیا۔

تھرن مین اَن گنت دولت جمع کر کے جنوبی امریکا جانا چاہتا تھا۔ ایکسیل کلبرگ اور ٹلڈا کے قتل سے اسے بہت سی دولت حاصل ہوئی مگر جس 'بڑی واردات' کی وہ تیاری کر رہا تھا وہ بینک پر ڈاکہ تھا۔ بینک اسٹاک ہام سنٹرل پوسٹ آفس کی عمارت میں تھا۔ اس کے گروہ نے

36 کلوڈائنامائٹ چرایا تا کہ پوسٹ آفس کوڈائنامائٹ سے اڑا دیا جائے اور دھماکہ سے ہونے والی افراتفری میں بینک لوٹ لیں۔تھرن مین منشیات کی سمگلنگ میں بھی ملوث پایا گیا تھا۔

جولائی 1936 میں تھرن مین، ہیڈ سٹارم اور ان کے تین ساتھیوں کے خلاف مقدمہ شروع ہوا۔ان تینوں نے ایرکسن اور پیٹرسن کے قتل میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ پانچوں ملزموں کوعمر قید کی سزا دی گئی،مگر جیل میں چھ مہینے رہنے کے بعد تھرن مین پاگل ہوگیا تو اسے مجرموں کے پاگل خانے بھیج دیا گیا۔

تھرن مین کا مقدمہ ایک ایسے قاتل کی نفسیات پر گہری روشنی ڈالتا ہے جسے 'اپنی بڑائی' کا زعم جنون کی حد تک ہو۔ چارلس مینسن اور بریڈی اسی قسم کے مجرم بننے کو ترجیح دیتے۔ اس کا خاندان مکمل طور پر اس کا مطیع تھا۔ مرد اسے اپنا لیڈر مانتے۔عورتیں اس کی خواہشات پوری کرتیں اور اس کے ہاتھوں طوائفوں کے زمرے میں شامل ہو جاتیں۔ طاقت کے سلسلہ میں اس کے خواب حقیقت بن گئے۔ اسے کسی انسان کی پروانہیں تھی۔ جب اس کا قریبی دوست اس کے لیے خطرہ بنا تو اسے خودکشی پر مجبور کر دیا گیا۔ اپنے گروہ کے ایک رکن کی وفاداری پر شک ہوا تو بیمار کتے کی طرح اسے انجکشن لگا کر مار دیا۔ جب ڈاکہ ڈالتا تو گواہوں سے نجات حاصل کر کے پہچان اور شک کے امکان ختم کر دیے جاتے۔ (تھرن مین سوچتا ہوگا کہ اسی قاعدے کی خلاف ورزی کر کے ہیڈ سٹارم نے اسے مصیبت میں مبتلا کر دیا) تھرن مین نے اپنی برتری کے لیے ایسا راستہ اختیار کیا جو اس کی اپنی اختراع تھا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں اپنی غیر معمولی اہمیت کا احساس اس میں پیدا ہوگیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ ایسی ہی نمایاں شخصیت کا مالک تھا تو اس نے جرائم کا راستہ کیوں اختیار کیا۔ ممکن ہے اس کے بچپن کی کسی ذلت، کسی محرومی نے اس میں اپنا کردار ادا کیا ہو۔ ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جب اپنی بڑائی، اپنی انفرادیت کا مسئلہ ہو تو جرم کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تھرن مین میڈیکل میں سب سے اونچا مقام حاصل کرنا چاہتا ہو یا اسے گرو بننے کا شوق تھا جو پُر اسرار علوم اور فلسفہ وغیرہ پڑھا سکتا ہو۔ یا لکھاری بن کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش بھی کی ہو۔ مگر یہ راستے خارزار کی طرح ہیں اور ان میں ناکامی کا خطرہ بھی بہت ہے۔ اچھی کتاب لکھنے یا آئیڈیا تخلیق کرنے کی نسبت چوری کرنا بہت آسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ماہر چور بہت کم قیمت پر اپنی انا کی تسکین کر سکتا ہے۔ اپنی انفرادیت کے جھنڈے لہرا سکتا ہے۔ سوسائٹی نے اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اسے

عام آدمی سے بڑھ کر اہمیت دینے پر تیار نہیں تھی۔ جرائم کے ذریعے اس نے اخبارات کی زینت بن کر سوسائٹی کو اس کی غلطی پر گویا کہ سرزنش کی تھی کہ گمنام لوگوں کے ہجوم میں کہیں کوئی ایسا ہے جو ڈرانے اور منوانے کا اہل ہے۔ ہر بڑے چور کو جلدی یا بدیر احساس ہوتا ہے کہ لوگوں کی پسند اس کی قسمت میں نہیں۔ اسے ایک چھوٹے، بہت ہی چھوٹے گروہ کی تحسین پر صبر کر لینا چاہیے۔ جیسے لیوپولڈ اور لوئب، بریڈی اور ہنڈلی، صرف ایک فرد جسے وہ اچھا لگتا ہو۔ شاید اسی لیے بڑے بڑے چور پکڑے جانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اپنی گمنامی سے نجات تو ملی۔ تھرن مین نے محض اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ اپنی سوانح لکھ ڈالی جس میں اس نے اپنے تمام جرائم کی تفصیل بڑے فخر کے ساتھ بیان کی۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک بڑا مجرم جب تک پکڑا نہ جائے وہ اسی مایوسی اور گمنامی کے اس ناقابل برداشت احساس کے ساتھ زندہ رہتا ہے جو اسے جرم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسی بے معنی تضاد کے نتیجہ میں تھرن مین شاید اپنے حواس کھو بیٹھا ہو۔

تھرن مین کی مثال بالخصوص اس مسئلہ کی واضح شکل ہے جس نے مجھے 'انسائیکلوپیڈیا آف کرائم' پر کام کرتے ہوئے حیران کیا۔ تھرن مین کو یقین تھا کہ وہ اپنے آپ کو منوانے، اپنی انفرادیت کے لیے جو کچھ بھی کر رہا ہے اپنی مرضی اور آزادی کے ساتھ کر رہا ہے مگر جرم کے 'پیٹرن' کا حصہ سمجھ کر دیکھیں تو وہ آزاد تھا، نہ منفرد۔ تو سچ کیا ہے؟ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم بیتھوون اور شیکسپیئر کو بھی اس دور کے تاریخی پیٹرن کا حصہ سمجھتے ہیں جس دور میں وہ زندہ تھے۔ برنارڈ شا کا کہنا ہے کہ آرٹسٹ کی پہچان اس کے اعلیٰ ترین تخلیقی لمحے ہیں۔ مگر مجرم کی پہچان اس کے بدترین لمحے ہیں۔ تخلیق ذہنی کاوش سے ہوتی ہے، تباہ کاری اس کے بغیر ہوتی ہے۔

1890 کے عشرے میں ماہر عمرانیات ایمل درخائم نے خودکشی کے تجزیہ میں یہ سوال اٹھایا کہ کیا خودکشی کا سائنسی علاج ممکن ہے، کیونکہ ہر خودکشی کی وجہ الگ ہوتی ہے۔ اس نے یہ کہہ کر اسے رَد کیا کہ خودکشی کی شرح ہر ملک میں ایک جیسی نہیں، اس لیے اس کا انحصار انفرادی پسند پر نہیں بلکہ اس کے پیچھے کوئی نادیدہ قواعد اور غیر معمولی اسباب ہیں۔ علاوہ ازیں اس کے پیٹرن الگ ہیں جو آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ کسی طبقہ یا ادارے سے وابستہ افراد کی نسبت وہ افراد زیادہ خودکشی کرتے ہیں جو تنہائی پسند ہوتے ہیں۔ آزاد خیال پروٹسٹنٹ سے، پروٹسٹنٹ کیتھولک سے، کیتھولک یہودیوں سے زیادہ خودکشی کرتے ہیں۔ کم از کم 1880 کے عشرے میں یہودیوں نے سب سے کم خودکشیاں کیں کیونکہ یہودیوں میں سماجی

سالمیت کا شعور زیادہ ہوتا ہے۔

درخائم نے خودکشی کی ایک ایسی قسم کا ذکر بھی کیا ہے جو کم و بیش 'بے مقصد قتل' سے ملتی جلتی ہے۔ وہ اس خودکشی کی وجہ اقدار سے محرومی قرار دیتا ہے۔ کنوارے، شادی شدہ افراد کی نسبت زیادہ خودکشی کرتے ہیں۔ جنگ کے دوران میں خودکشی کی وارداتیں کم ہو جاتی ہیں مگر امن اور خوش حالی میں پھر بڑھ جاتی ہیں۔ (1981 میں لبنان کے ہسپتال برائے ذہنی امراض نے ریکارڈ کیا کہ سیز فائر میں مریضوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے مگر لڑائی شروع ہوتے ہی کم ہو جاتی ہے۔) اس سے درخائم نے یہ سمجھا ہے کہ ذہنی توازن اور ذہنی صحت کے لیے سماجی حدود اور ضابطے ضروری ہیں۔ اس لیے خودکشی انفرادی عمل نہیں بلکہ سماجی عمل ہے۔ وہ آخر میں کہتا ہے کہ خودکشی کے واقعات ایسے معاشروں میں ہوتے ہیں جو افراد سے مشینی انداز میں سلوک کرتے ہیں اور نتیجتاً ان کی ایک خاصی تعداد کو خودکشی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہی دلیل ان جرائم پر بھی صادق آتی ہے جو جرائم تھرن مین، مینسن، بریڈی اور فریز بیئر جیسے سماجی جڑوں سے محروم لوگوں نے کیے۔

اس بحث کے بعد ہم یہ اندازہ کرنے کی پوزیشن میں ہیں کہ درخائم سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ فرد کا سماجی ماحول اسے خودکشی کی طرف لے جاتا ہے۔ (یا جرائم کی طرف، جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے، ان میں قریبی تعلق ہے) جرم اور ہپنوسس کے باہمی تعلق کے بارے میں ہماری تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ اس طرح معاملہ کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہیں۔ یہ سچ ہے کہ معاشرہ ہمیں اصولوں اور قدروں کا شعور دیتا ہے مگر اس کے بدلے میں قدریں اور اصول، حقیقت کا شعور دیتے ہیں جو جرم اور خودکشی کو روکنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ مگر ہپنوسس کے مقابلہ میں حقیقت کا شعور کیوں اتنی آسانی کے ساتھ بے اثر ہو جاتا ہے۔ چوزوں کے لیے لکیر لگانے، چونچ پر مڑی ہوئی لکڑی رکھنے یا مینڈکوں کو تھپتھپانے سے تو ایسا ہو سکتا ہے مگر انسانوں کی بات دوسری ہے۔ ان کا معاملہ اگرچہ زیادہ نہیں مگر کسی حد تک تو پیچیدہ ہے۔ Volgyesi، ریفلیکسز Reflexes کی بات کرتا ہے کہ ایک ہی بات بار بار دہرانے سے غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہماری آنکھیں کسی غیر متحرک چیز پر زیادہ دیر جمی (فوکس) نہیں رہ سکتیں، دھندلانے لگتی ہیں۔ اچانک جھنجھوڑنے سے ہم جاگ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہیں۔ حقیقت کا یہ شعور ہی خودکشی کرنے یا نہ کرنے میں فرق پیدا کرتا ہے۔ اس لیے درخائم کا خیال غلط تھا۔ سماجی حالات

بجا مگر جرم یا خودکشی میں ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ بنیادی وجہ فرد کی نفسیات میں تلاش کرنی چاہیے۔

کیا اس کا مطلب ہے کہ درخائم کے مخالف ٹھیک کہتے تھے؟ ایسا بھی نہیں کیونکہ وہ اس پر زور دیتے تھے کہ خودکشی کو صرف نفسیات کے ذریعہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ درخائم نے ان کا کہنا غلط ثابت کر دیا۔ اسے سماجی اور نفسیاتی حوالوں کے ذریعہ سمجھنا چاہیے اور اگر ہمیں مجرموں کے رویہ کا بنیادی پیٹرن سمجھنا ہے اور اس طرح اس کا مقابلہ کرنا ہے تو پیٹرن کی تلاش نفسیاتی اور سماجی دونوں سطح پر جاری رہنی چاہیے۔

تشدد پسند آدمی

13 دسمبر 1937ء کو امپیریل جاپانی آرمی نانکنگ (وسطی چین) میں داخل ہوئی اور جدید دَور کا سب سے ظالمانہ قتل عام اور دہشت گردی شروع کر دی۔ قتل، زنا اور ٹارچر کا سلسلہ دو ماہ تک جاری رہا۔ چینی فوجیوں نے اپنی وردیاں اتار دیں اور عام لوگوں میں گھل مل گئے، اس اُمید پر کہ غیر مسلح ہونے کی صورت میں ان کی جانیں شاید بچ جائیں۔ مگر جاپانیوں نے انہیں لوگوں میں سے ڈھونڈ لیا اور اکٹھا کر کے ایک بڑی تعداد کو مشین گنوں سے بھون ڈالا۔ تقریباً پچیس ہزار لاشوں پر پیٹرول چھڑکا اور آگ لگا دی۔ جو گولیوں سے بچ گئے تھے وہ شعلوں کی نذر ہو گئے۔ سویلین چونکہ فوجیوں سے الگ پہچانے نہیں جاتے تھے اس لیے ان کی ایک بڑی تعداد بھی قتل کر دی گئی۔ گیارہ سے اسی سال کی بیس ہزار عورتیں ریپ کی گئیں۔ ریپ کے بعد ان کے جسموں کے بعض حصے کاٹ کر پھینک دیے گئے۔ جو زندہ بچ گئیں انہوں نے چینی رسم کے مطابق اپنے آپ کو آگ لگا کر خودکشی کر لی۔ نوعمر لڑکوں کے ہاتھ اوپر اٹھوائے گئے، کئی دنوں تک انہیں اسی حالت میں رہنے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے بعد انہیں سنگینوں سے چیر پھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ شنگھائی کے ایک صحافی رھوڈز کے قبضہ میں چند ایسے فوٹو آ گئے جن میں جاپانیوں کو ریپ کرتے اور بچوں کو قتل کرتے دکھایا گیا تھا۔ ان قتل گاہوں کی تصویریں بھی تھیں جہاں جاپانی فوجیوں کے جذبہ قتل کو بڑھانے کے لیے ایسے قیدی سنگینوں سے ہلاک کروائے جاتے جن کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہوتے۔ جب یہ تصویریں امریکی رسالے **Look** میں شائع ہوئیں تو دنیا بھر نے ان مظالم کی مذمت کی جس کی وجہ سے جاپانی کمانڈر کوٹو کیو واپس بلا لیا گیا۔ عجیب بات ہے کہ تمام تصویریں خود جاپانیوں نے ہی لی تھیں۔ وہ ان مظالم کو محض انتقامی کارروائی سمجھتے تھے۔ دو مہینوں کے اندر نانکنگ کے اندر

پچاس ہزار اور آس پاس کے دیہات میں تقریباً دو لاکھ انسان مارے گئے۔ (1982ء میں جب چینی اپنی 'تاریخ از سرِ نو' لکھنے کے بارے میں بحث کر رہے تھے تو سرکاری سطح پر چینیوں نے ہلاک ہونے والوں کی تعداد تین لاکھ چالیس ہزار بتائی)

نانکنگ کے شمال مغرب میں کوئی چھ سو میل کے فاصلے پر واقع پیکنگ پہلے ہی جاپانیوں کے قبضہ میں تھا۔ مگر چون کوتین نامی گاؤں (جنوب مغرب میں تیس میل کے فاصلہ پر) اب بھی چینی قوم پرستوں کے قبضہ میں تھا۔ جہاں سائنس دانوں کی ایک عالمی ٹیم ایک ایسے پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی جس نے آثارِ قدیمہ کے حلقوں میں بے حد دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ 1929ء میں پائی وان چینگ نامی قدیم حیاتیات کے ماہر پائی وینگ چن نوجوان کو قریبی غاروں سے قدیم انسان کی کھوپڑی ملی۔ انسان کے بجائے وہ کسی گوریلے کی کھوپڑی لگتی تھی۔ کیتھولک سائنس دان دی شارداں کا خیال تھا کہ اس کے دانت کسی ایسے جانور کے تھے جسے کسی اور جانور نے شکار کیا ہو۔ اس کی پیشانی خمیدہ، بڑی بڑی بھنویں اور ٹھوڑی پچکی ہوئی تھی۔ مگر دماغ گوریلے کے دماغ سے دوگنا بڑا تھا۔ جب مزید کھوپڑیاں، ٹانگیں، بازو اور دانت ملے تو واضح ہو گیا کہ یہ جانور تن کر، سیدھا ہو کر چلتا تھا۔ پہلے تو لگا کہ یہ آدمی اور بندر کا ملاپ ہے جسے ہیکل (Hackel) گمشدہ سراغ the missing link کہتا تھا۔ نصف صدی پہلے missing link کے تصور کی تصدیق ہو گئی۔ جب 'آدم نما بندر' (ape-man) کی ہڈیاں جاوا میں ملیں۔ پیکنگ کا ape-man بالکل اسی نسل سے تھا مگر chon-ken-tien کی پہاڑیوں نے گواہی دی کہ یہ 'missing link' نہیں ہے۔

پیکنگ مین نے چولھے بنائے اور آگ پر اپنی غذا تیار کی اس کی مرغوب غذا شاید ہرن کا گوشت تھا، جسے وہ آگ پر بھون لیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ یہی مخلوق درحقیقت انسان تھی، جسے زمین پر پانچ لاکھ برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ یہی مخلوق آدم خور بھی تھی chon-ken-tien سے ملنے والی چالیس کھوپڑیوں کے زیریں حصوں میں شگاف تھے جن میں سے ہاتھ مغز کو نوچ کر باہر لا سکتا تھا۔ ریسرچ پارٹی کے انچارج Franz Weidenreich کے مطابق ان سب کو اکٹھے قتل کر کے غار میں لے جایا گیا جہاں وہ بھونے اور کھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ یہ سلوک دوسری پیکنی مخلوق (Pekingmen) نے ہی کیا۔ آس پاس کے دوسرے غاروں سے Cro-magnon man کی ہڈیاں ملیں جو آدم خوری کی نشانیاں تھیں۔ مگر کرومیگنن چار لاکھ برس دیر سے ظاہر ہوا۔ یہ اس کی کارستانی

نہیں ہوسکتی Chon-kon-tien سے پتہ چلتا ہے کہ پیکنگ مین نے خونخوار درندوں سے لڑکر غار خالی کرائے تھے۔ اس کے بعد دوسرے پیکنگ مین سے لڑکر انہیں کھانے لگا۔ جب دنیا حیران تھی کہ مہذب لوگ ایک بڑے شہر کے باشندوں کا قتل عام کیسے کر سکتے ہیں تو پیکنگ کے غار مجسم جواب تھے کہ انسان ہمیشہ انسانوں کا قاتل رہا ہے۔

اور آج یہ جواب متنازع نہیں رہا۔ ایٹمی تباہ کاری نے ہمیں انسان سے مایوس کر دیا ہے۔ مگر 1937ء میں سائنس دانوں نے 'قاتل بندر' کے تصور کی سخت مخالفت کی تھی۔ اندازاً 1890ء سے یہ خیال رائج رہا ہے کہ ہوموسپیئن کا ارتقا اپنی ذہانت کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس نے اپنے بھائی بندر کی طرح اپنی زندگی ایک پرامن سبزی خور کی طرح شروع کی تھی۔ آہستہ آہستہ انہوں نے شکار اور زراعت سیکھ کر تہذیب کا آغاز کیا۔ 'پیکنگ مین' پر اپنی کتاب میں ڈاکٹر ہیری شپیرو نے کھوپڑیوں کی کاٹ پیٹ کی بات ہی نہیں کی۔ اس کا خیال تھا کہ پہاڑی تودوں اور چٹانوں کے گرنے سے کھوپڑیوں کو نقصان پہنچا تھا مگر نئی شہادت پرانے خیال کی تردید کرتی رہی۔ پہلے ہی 1924ء میں ریمنڈ ڈارٹ نے 'ape man' کی اس سے بھی پرانی قسم ڈھونڈ لی تھی، جسے وہ جنوبی ape-man کہتا تھا۔ 1940ء کے آخری ایام میں اسٹرک خونٹائن سے قریب جنوبی 'ape-man' کے علاقہ میں مشاہدہ کے دوران ڈارٹ کو 'بڑے بندر' (Baboon) کی ٹوٹی پھوٹی کھوپڑیاں ملیں۔ ڈنڈے جیسی ران کی ہڈی دیکھتے ہوئے اسے اچانک ایک خیال آیا۔ اس نے ہڈی اٹھائی اور زور سے کھوپڑی کے پچھلے حصہ پر ضرب لگائی۔ جس سے دو سوراخ کھوپڑی پر نمودار ہوئے جو ان سوراخوں سے مشابہ تھے جو ٹانگ کے جوڑ سے لگائے گئے تھے۔ اب ڈارٹ کے ہاتھ وہ ہتھیار لگ گیا جس سے 'فرسٹ مین' نے Baboon مارا تھا۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ 'پیکنگ مین' کے غاروں میں پائی جانے والی ران کی ہڈیاں ان کے ہتھیار تھے۔

1949ء میں ڈارٹ کا ایک مضمون شائع ہوا۔ جس میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ تقریباً بیس لاکھ برس پہلے پائے جانے والے 'جنوبی ایپ مین' نے ہتھیاروں کا استعمال جان لیا تھا۔ دوسرے سائنس دانوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ 1953ء میں اس نے The Predatory Transition from Ape to Man کے عنوان سے اپنے مؤقف کو دہرایا جس کی وجہ سے آثارِ قدیمہ کے رسالے کا ایڈیٹر اس قدر گھبرایا کہ اس نے مضمون نگار کے خیالات کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس مضمون میں ڈارٹ نے اس انقلابی

تصور کی وضاحت کی تھی کہ 'جنوبی ایپ مین' دوسرے بن مانسوں سے اس لیے آگے نکل گیا کہ اس نے ہتھیاروں سے قتل کرنا سیکھ لیا تھا۔ ہمارے دَور کے پیش رو اس لیے سیدھا کھڑا ہونا اور چلنا سیکھ گئے تھے کہ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوا کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ خالی ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ ہتھیار لے کر چلنا ان کی مجبوری تھی۔ دانتوں کے بجائے ہاتھوں ہی سے وہ گوشت کے ٹکڑے چیرتے پھاڑتے تھے۔ چنانچہ ہمارے دانت چھوٹے ہوتے چلے گئے اور پنجوں کی جگہ ناخنوں نے لے لی۔ جانوروں کو کلب (ران کی ہڈی) سے مارنا یا پتھر و کلب دور سے گھما کر ان پر پھینکنے سے ہاتھ اور آنکھ میں ایک نئی ہم آہنگی پیدا ہوئی جس سے دماغ کی نشوونما ہونے لگی۔

جب ڈارٹ اپنا مضمون لکھ رہا تھا تو ''ذہانت پہلے آئی'' کے پرانے نظریے کے حق میں ایک اہم شہادت ملی۔ یہ شہادت مشہور **Piltdown Skull** کے بارے میں تھی جو **1913**ء میں ایک ریتلے گڑھے سے ملی تھی۔ اس کا جبڑا تو بندر جیسا تھا مگر دماغ نئے انسانی دماغ کے سائز کا تھا۔ مگر چالیس برس بعد برٹش میوزیم میں ٹیسٹ کرنے سے پتہ چلا کہ وہ کھوپڑی ایک دھوکہ تھا۔ نئے آدمی کی کھوپڑی اور بندر کے جبڑے کو دواؤں کی مدد سے ایک جیسا ظاہر کیا گیا تھا۔ اس دھوکے کا پتہ اسی سال چلا تھا جس سال کہ ڈارٹ کا مضمون شائع ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے ڈارٹ کے نظریہ کو تقویت ملی۔ 'جنوبی ایپ مین' کا مغز بندر کے مغز سے بڑا تھا۔ مگر نئے آدمی کے مغز سے بہت چھوٹا تھا۔

1960ء کے آغاز میں ان دو اہم کتابوں نے 'انسان کی قاتلانہ جبلت' کے تصور کو خاصی شہرت دی۔ ایک **African Genesis** دوسری **On Aggression**۔ دونوں میں کہا گیا تھا کہ آدمی جارحیت کے زور پر آدمی بنا ہے اور یہ کہ ہمیں جنگ، جرائم اور پرتشدد رویہ پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ہمارے خمیر میں ہیں۔ آرڈری کے آخری باب کا عنوان بہت گمبھیر تھا۔ یعنی قابیل کے بچے (**Cains Children**) پھر بھی دونوں پرامید تھے۔ لورنیز کی رائے تھی کہ انسان کی جارحیت کو کھیل اور ایسی سمت دینی چاہیے جس میں خطرہ کم ہو۔ آرڈری کو امید تھی کہ تہذیب اور امن کے لیے انسان کی تڑپ اس کی تباہ کاریوں پر غالب آ جائے گی۔ آرڈری ایک نیم صوفیانہ قول پر بات ختم کرتا ہے کہ ''زندگی کی پشت پر ایک ایسی طاقت ہے جو ہمیشہ امن کے لیے کوشاں رہتی ہے۔'' اس کے باوجود دونوں کتابوں کا مجموعی تاثر حوصلہ افزا نہیں۔

یہی بات آرتھ کوئسلر کے اس نظریے کے متعلق کہی جا سکتی ہے جو اس نے Ghost in the Machine میں پیش کیا۔ کوئسلر کا کہنا ہے کہ حیوانوں کی دنیا میں انسان واحد مثال ہے جسے اپنی ہی نسل کو مٹانے میں کوئی پس و پیش نہیں ہوتا۔ (اسے یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جسے آدم خوری سے گھن نہیں آتی) کوئسلر کے خیال میں انسانی دماغ ایک ارتقائی غلطی ہے۔ اوپر تلے اس کے تین حصے ہیں۔ (1) Reptile Brain (2) Mamalian Brain (3) اور ان کے اوپر The human neo-cortex ۔ اس کا نتیجہ (جیسا کہ ڈاکٹر پی ڈی میکلین نے بتایا ہے) یہ ہے کہ جب ماہر نفسیات مریض کو صوفے پر لیٹنے کے لیے کہتا ہے تو گویا وہ اسے گھوڑے اور مگرمچھ کے ساتھ لیٹنے کو کہتا ہے۔ پچھلے پانچ لاکھ برس میں انسانی دماغ ناقابل یقین رفتار سے بڑھا ہے۔ یہاں تک کہ اسے 'برین ایکسپلوژن' کا نام دیا جاتا ہے اور ایک پھوڑے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کوئسلر کے مطابق مصیبت یہ ہے کہ پرانے کو نئے میں تشکیل دینے کے بجائے پرانے پر نیا ڈھانچا مسلط ہوا ہے۔ نئی طاقت بھی اسی طرح تہہ در تہہ آئی ہے۔ چنانچہ ہم ذہنی توازن سے محروم نسل ہیں اور شاید اسی لیے ہماری عقل، ہمارے استدلال پر ہمیشہ ہمارے جذبات غالب رہتے ہیں۔ ناشائستہ الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ ارتقائی عمل نے neo cortex اور hypothala کے درمیان چند پیچ ڈھیلے رہنے دیے ہیں جس کی وجہ سے انسان میں اپنی تباہی کا مجنونانہ رجحان پیدا ہوا ہے۔

یاس انگیزی (قنوطیت) کے خلاف ردعمل ناگزیر تھا۔ Anatomy of Human Destructiveness میں مشہور فرائیڈین، ایرک فرام نے ڈارٹ، آرڈرے اور لورینز کے خیالات کی تردید کی اور کہا کہ ہمارے قدیم پیش روؤں کے جنگجو اور جارحیت پسند ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ ہر شخص سوچتا ہے کہ اگر ترقی یافتہ آدمی اتنا جنگجو اور جارحیت پسند ہے تو قدیم آدمی کتنا زیادہ جنگجو اور جارحیت پسند ہوتا ہوگا۔ مگر 'A Study of War' کے مطابق جارحیت کا تعلق انسانی ترقی سے ہے۔ ترقی کی رفتار جتنی تیز ہوتی ہے، انسان جتنی ترقی کرتا ہے، اتنا ہی خونخوار ہو جاتا ہے۔ The Making of Mankind نامی ٹیلی ویژن سیریز (براڈ کاسٹ 1981ء) میں لوئیس لیکی کے بیٹے، جس کی 'جنوبی ایپ مین' کے متعلق تحقیق کا حوالہ آرڈری نے بار بار اپنے تھیسس کی حمایت میں دیا ہے ایپ مین تھیوری کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر بات جو ہم قدیم ترین انسان کے متعلق

جانتے ہیں اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ دنیا سے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ پر امن تھا۔ اس کے ظلم وستم کا آغاز شہروں میں رہنے کے بعد ہوا۔ ایرک فرام نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا۔

تاہم فرام کی کتاب کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ آندرے، لورینز اور کوئسلر صداقت سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ ''جانوروں سے انسان اس لیے مختلف ہے کہ انسان قاتل ہے۔'' فرام کہتا ہے ''اشرف المخلوقات جو اپنے ہی جیسی مخلوق کو کسی وجہ کے بغیر اذیت دیتا ہے اور قتل کرتا ہے۔''

فرام کا جواب فرائیڈ کے نظریہ سے بہت قریب ہے۔ Civilization and its Discontent میں فرائیڈ نے کہا ہے کہ تہذیب، انسان کے لیے نہیں بنی، نہ ہی انسان تہذیب کے لیے بنا ہے۔ تہذیب انسان کو ہر قدم پر روکتی اور اسے مایوس کرتی ہے۔ اسے پاگل بناتی ہے اور آپ اپنی تباہی پر آمادہ کرتی ہے۔

قدیم ترین انسان کے متعلق فرائیڈ کا خیال ہے کہ وہ اپنا وقت دوسرے انسانوں کو بال پکڑ کر گھسیٹنے یا انہیں مارنے میں صرف کرتا تھا اور ایسا کرنے سے نئے انسان کا گریز، اس کی مزاحمت ہے جو اسے ذہنی مریض بناتی ہے۔ درحقیقت ایرک فرام ان خیالات سے بہت قریب تھا جن خیالات کا اظہار ایچ جی ویلز نے تیس برس پہلے کیا تھا۔ اس کی ایک نہایت دلچسپ مگر بری طرح نظر انداز کی جانے والی تصنیف '42 to 44' میں (جو دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں لکھی گئی تھی) ویلز نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی تھی کہ انسان کیوں قاتل اور تخریب پسند ہے۔

اب ہم جانتے ہیں کہ برفانی عہد میں یورپ کے بڑے بڑے میدانوں کے شکاری کردار کے لحاظ سے دوست اور ملنسار تھے۔ تشدد کی طرف ان کا بہت کم رجحان تھا۔ فرام اور لیکی کی طرح ویلز کو بھی یقین تھا کہ مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب انسانوں نے شہروں کا رخ کیا اور آپس میں ان کے قریبی رابطے اور تعلقات قائم ہوئے جن کے لیے ان کے ماضی نے انہیں تیار نہیں کیا تھا۔ شروع کی تہذیبیں آہستہ آہستہ ابھریں اور قوموں کی شکل اختیار کی۔ وہ حالات سے دست و گریباں رہیں، جن میں ایسے ردعمل بھی ممکن تھے جن کی پہلے کوئی مثال نہیں تھی۔ زور آور اور ستمگر انسانوں نے طاقت اور دولت پر قبضہ کر لیا جبکہ جھگیاں اور جھونپڑے عوام کا مقدر بن گئے۔

انسانی ظلم کے مسئلہ پر ویلز پریشان ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب ہم کسی ظالمانہ

واردات کے متعلق سنتے ہیں تو غضب ناک ہو کر کہتے ہیں، ''تمہیں معلوم ہے کہ میں اس جانور کا کیا حشر کروں گا۔'' ایک انکشاف کہ انتقامی جذبہ ہی انسانی جانور کی اصل حقیقت ہے۔ جب ہم کوئی ظالمانہ واقعہ سنتے ہیں تو فوراً ایک فرق کا احساس ہوتا ہے۔ ایک فرق جس کے ذریعہ ہم اپنے آپ کو اس 'جانور' سے الگ کر لیتے ہیں جو اس ظلم کا ذمہ دار ہے۔ یکجہتی کے جذبہ کا یہی فقدان ہے جو ظلم کو ممکن بنا دیتا ہے۔

یہ ماننا ہو گا کہ ایک انسان کے ساتھ دوسرے انسان کی یکجہتی کا جذبہ کوئی فطری عمل نہیں۔ ہم ان کے لیے تو اسے محسوس کر سکتے ہیں جو ہم سے قریب ہیں مگر ان لوگوں کے لیے محسوس کرنا بہت دشوار ہے جو دنیا کے کسی دوسرے حصے یا ہماری گلی کے دوسرے کونے پر رہتے ہیں۔ سارتر نے تو اپنی کتاب Critique of Dilectical Reason میں یہاں تک کہا ہے کہ تمام انسان قدرتی طور پر آپس میں دشمن اور حریف ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص گاؤں کی سیر کے لیے جاتا ہے تو اوروں کو وہاں پا کر اسے گھٹن محسوس ہونے لگتی ہے۔ ''اگر یہ لوگ یہاں نہ ہوتے تو میں ان قدرتی مناظر سے زیادہ لطف اندوز ہو سکتا تھا۔'' جب وہ بس کے لیے قطار میں کھڑا ہوتا ہے تو قطار میں موجود ہر شخص اس کا حریف بن جاتا ہے۔ شہر ہو کہ سپر مارکیٹ، بینک میں بل جمع کروانا ہو یا ٹرین کا ٹکٹ خریدنا ہو، ہر ہجوم میں ہر شخص دوسرے کی باری بزور بازو اچک لینا چاہتا ہے۔ اگر کسی کو جادو آتا ہو تو وہ چاہے گا کہ دوسروں کو جادو کے ذریعہ ہوا میں تحلیل کر دے یا ان سب کو ٹمبکٹو دفع کر دے۔''

اسی پہلو پر کولن ٹرنبل نے اپنی تصنیف 'The Mountain People' میں زور دیا ہے، جس کا موضوع ایک محروم افریقی قبیلہ ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے زمانہ سے ایک IK یعنی سرکاری حکم کے ذریعہ پرانی شکارگاہ سے نکال دیے گئے تھے کیونکہ حکومت اسے کھیل کا میدان بنانا چاہتی تھی۔ مجبوراً وہ ایک ایسے علاقہ میں کاشت کاری کرنے لگے جہاں بارش کا گزر نہیں تھا۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ وہ تمام انسانی جذبات اور احساسات سے محروم ہونے لگے۔ تین سال کی عمر تک بچوں کو کھانے پینے کے لیے دیا جاتا اس کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا کہ جیسے بن پڑے اپنے پیٹ خود بھریں۔ بوڑھوں کو فاقوں سے مرنے دیا جاتا۔ ان کے دیہات میں نفسانفسی کا عالم تھا۔ ہر فرد کو بس اپنی فکر رہتی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی جسے اس کے ماں باپ نے باہر پھینک دیا تھا بار بار گھر واپس آتی کہ شاید ماں باپ اسے پیار کریں مگر ماں باپ نے تنگ آ کر اسے ایک کمرے میں بند کر دیا تا کہ بھوکی مر جائے۔ ایک ماں

بیگانگی کے ساتھ اپنے بچے کو (کیمپ فائر کے) شعلوں کی طرف رینگتے ہوئے دیکھتی رہی، یہاں تک کہ بچے نے آگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ بچے کی چیخیں لوگوں کے قہقہوں میں ڈوب گئیں تو ماں نے داد طلب نظروں سے مجمع کو دیکھا گویا کہ اس نے کوئی طربیہ منظر پیش کیا تھا۔ جب حکومت نے امدادی سامان فراہم کیا تو اسے زور آور افراد نے لوٹ لیا۔

آرڈری جیسے بعض لکھاری IK سے دور از کار نتائج نکالتے ہیں۔ یہ کہ انسانی قدریں کھوکھلی ہیں اور ایثار ہمارے مزاج کے مطابق نہیں۔ مگر یہ بے معنی باتیں ہیں۔ ہم اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ جب ہم بھوکے اور تھکے ہوئے ہوتے ہیں تو ہم میں سے اکثر بدمزاج ہو جاتے ہیں۔ IK کے معاملہ میں یہ ردِعمل اور بھی شدید ہو گیا کہ ان کی جڑیں اس سرزمین میں برسوں سے تھیں جہاں سے انہیں نکال باہر کیا گیا۔ ان کا ایک کلچر تھا۔ شکاریوں کی حیثیت سے ان کے مرد، عورتیں اور بچے مل جل کر کام کرتے تھے۔ انہیں ایک دوسرے کا قریبی تعاون حاصل تھا۔ اچانک انہیں ان کی سرزمین سے نکال کر بے آسرا اور بے سمت کر دیا گیا۔ زمین کے ساتھ ان کے جینے کا انداز بھی غارت ہوا۔ مگر انسان کے متعلق اہم سوال یہ نہیں کہ بے قابو ہو کر ہم بے حوصلہ ہونے اور اپنی سمت کھو دینے کے اہل ہیں۔ بلکہ یہ کہ ہم اپنے شعور اور ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے نئی تخلیق اور تنظیم کے لیے مخالفت سمت میں جانے کے کس قدر اہل ہیں۔ IK جیسی منفی مثالوں سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ جو حقیقت ہم پہلے سے جانتے ہیں کہ انسان خود غرض ہے اور اپنی زندگی کا سوال ہو تو وہ اور خود غرض ہو جاتا ہے۔ دراصل کئی قدیم قومیں بچوں کے قتل اور بزرگوں کے قتل پر عمل کرتی تھیں The Hunting People میں چارلس کون نے بتایا ہے کہ کیریبین کے علاقے میں جب شکار کیے جانے والے ہرنوں کے گلے نہ آتے تو بوڑھے افراد فاقوں کے خوف سے آپ ہی خودکشی کر لیتے۔ بوڑھے مر جاتے تو ننھی بچیوں کی شامت آ جاتی۔ انہیں مار دیا جاتا۔ جان فائفر نے اپنی کتاب The Emergence of Man میں کہا ہے کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں بچے مارنے کی رسم عام ہے۔ اس کے ذریعے وہ برتھ کنٹرول کرتے ہیں۔ پندرہ سے پچاس فیصد تک ننھی بچیاں مار دی جاتی ہیں۔ انہیں مارنے کا فیصلہ اور کام ماں کی ذمہ داری ہوتی ہے جو انہیں ولادت کے ایک گھنٹا بعد مار دیتی ہے۔

ایک اور پہلو بھی ہمیں جرائم کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جسے اجنبی لوگوں سے بیزاری کہا جاتا ہے۔ ''سوشل کنٹریکٹ'' میں آرڈری کہتا ہے کہ یہ جانوروں کی بنیادی جبلت یا فطرت

ہے اور اس کا تعلق شاید ان کی جین سے ہے۔ ساری مخلوق چھوٹے گروہوں یا قبیلے میں بٹ کر اکٹھا رہنا چاہتی ہے اور اسی کے ساتھ اس کی وابستگی ہوتی ہے۔ ڈارون نے تو یہ بھی دیکھا کہ یورو گوائے میں تقریباً ایک لاکھ مویشی فارم پر تھے جنھوں نے سو اور پچاس جانوروں کے چھوٹے گروپ بنا لیے تھے۔ جب ایک زبردست طوفان نے انہیں منتشر کر دیا تو چوبیس گھنٹوں کے بعد انہوں نے نئے سرے سے اپنے گروپ بنا لیے۔ اس دوران تمام مویشی اپنے پرانے گروپ ساتھیوں کی تلاش میں رہے۔ الگ الگ قبیلے بنانے کا یہ فطری رجحان شاید اپنی نسل محفوظ کرنے کا طریقہ ہے جو اس لیے محفوظ کر لی جاتی ہے کہ غیروں کی آمیزش اور اثرات سے اپنی پہچان نہ کھو بیٹھے۔ ایڈورڈ ہال نے شکاگو میں واقع گیٹو (غریبوں کی بستی) کے متعلق بتایا ہے کہ وہ خود مختار دیہات کا مربوط سلسلہ ہے اور زیادہ سرگرم سماجی گروپ میں ایک درمیانہ شخص بھی چاہتا ہے کہ اس کے اپنے چند شناسا ہوں جنہیں وہ اپنا قبیلہ سمجھے۔ 'Human Zoo' میں ڈیسمنڈ مورس نے بتایا ہے کہ پچاس سے ایک سو کے درمیان افراد مویشیوں کے متعلق ڈارون کی رائے سے متفق ہیں۔ گروپ اپنی طرزِ گفتگو، لباس اور رہائش میں خود اپنا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ انہیں گروہ کے ساتھ اپنی وابستگی کے احساس سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ مگر غیروں کے ساتھ ان کا رویہ اشتعال انگیز ہوتا ہے جیسا کہ شکاگو کے متعلق ہال نے بتایا ہے کہ گیٹو میں مختلف گروہوں کے درمیان اکثر لڑائی ہوتی ہے۔

اس سے یہ بیان کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ نازی کس طرح یہودیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح اپنے ٹارچر کیمپوں میں قید کرتے تھے۔ ہٹلر کی نسل پرست آئیڈیالوجی کبھی جڑ نہ پکڑتی اگر 'اجنبیوں سے بیزاری' ہمارا فطری ورثہ نہ ہوتا۔ نسل کشی کی نفسیات پر پروفیسر Rainer C. Baun نے اپنی کتاب میں جرمن بیوروکریٹس (جو ٹارچر کیمپوں اور ان کے تمام لوازمات کے ذمہ دار تھے) کے متعلق کہا ہے کہ وہ یہودیوں کے دشمن اور ان کے خون کے پیاسے ہی نہیں تھے۔ ان کے متعلق سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ انہیں عورتوں اور بچوں کا مطلق احساس نہیں تھا ورنہ وہ اتنی بے دردی کے ساتھ انہیں ٹرکوں میں نہ ٹھونستے۔ ان کے ظلم کی وجہ نازی آئیڈیالوجی نہیں، کیونکہ جانور بننے کے لیے انسان کسی آئیڈیالوجی کا محتاج نہیں۔ یہ ہماری فطرت کا تقاضا ہے۔ ہم اپنے آپ کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے ہمسایے کے وجود کی خبر نہیں ہوتی۔ ہمارا ہمسایہ ہمارے لیے زندہ حقیقت نہیں بلکہ ایک وہم بن جاتا ہے۔ ستمبر 1982ء میں صابرہ اور شتیلہ کے مہاجر کیمپوں میں فلسطینیوں کا قتل عام اسی حقیقت کو

اجاگر کرتا ہے۔ فلسطینی حریت پسند اس وعدے پر بیروت خالی کرنے پر آمادہ ہوئے تھے کہ ان کی عورتیں اور بچے محفوظ رہیں گے۔ 18 ستمبر ہفتہ کے روز دنیا کو پتہ چلا کہ عیسائی فلانجسٹوں نے ہزارہا فلسطینی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا ہے اور یہ کہ فلانجسٹوں کو اس خونریزی کے لیے کیمپوں میں اسرائیلیوں نے بھیجا تھا۔ جب قتل عام جاری تھا تو امریکی سفیر نے اسرائیلی جنرل شیرون کو پیغام بھیجا کہ ''یہ خوفناک قتل عام بند کرو، سارا علاقہ چونکہ تمہارے قبضے میں ہے اس لیے قتل عام کے ذمہ دار تم ہو۔''

اس خبر نے دنیا کو اور ان ہزاروں اسرائیلیوں (جنہوں نے تل ابیب میں مظاہرے کیے تھے) کو ہلا کر رکھ دیا کہ ان فلسطینیوں کے قاتل وہ یہودی تھے جن پر نازیوں نے ظلم کیے تھے۔ Baun کا تجزیہ اس سلسلہ میں صحیح ثابت ہوتا ہے کہ یہ بدی کا نہیں بلکہ بے تعلقی اور بیگانگی کا مسئلہ ہے۔ تاریخ میں اکثر قاتلوں نے مظلوموں کو اپنے بیوی بچوں کی کیٹیگری سے الگ رکھا ہے جیسے اوسط گوشت خور جانور گائے یا بھیڑوں بکریوں کو اپنے جیسا نہیں سمجھتا۔

ہمارا عہد انسان دوستی کا عہد ہے۔ اس عہد میں ظلم پہچانا جاتا ہے اور ہم یہ سبق سیکھتے ہیں کہ انسان دوستی محض ایک نعرہ نہیں اس کے لیے صدق دل سے کوشش کرنا پڑتی ہے۔ باہمی رفاقت کے مہمل مفروضے کام نہیں آتے۔ پانچ ہزار سال پہلے ان مفروضوں کا بھی کوئی وجود نہیں تھا۔ 'اجنبیوں سے بیزاری' کا رویہ غالب تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ باہمی تعلق رشتہ داروں یا قریبی ہمسایوں سے ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے تقریباً 200 قبل مسیح سے جرائم میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں پرانی مذہبی روایات دم توڑتی نظر آتی ہیں۔ جس طاقت نے انہیں اکٹھا کر کے شہروں میں بھیجا تھا وہ خود ہجوم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بے بس نظر آتی تھی۔ اپنی کتاب Animal Nature and Human Nature میں پروفیسر W.H.Thorpe نے کہا ہے کہ چمپینزی اور گوریلوں کے گروہوں میں لڑائی کی مثالیں تقریباً ناپید ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اس معاملہ میں انسان اتنے مختلف کیوں ہیں؟ مگر اپنے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جبکہ جنگل میں رہتے ہوئے جانوروں کے گروہوں میں بہت کم تشدد کے واقعات ہوتے ہیں مگر پکڑے جانے کے بعد خوراک وجگہ کی کمی اور قید کے غیر فطری ماحول کی وجہ سے صورت حال بالکل بدل جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ شہروں میں چلے آنے کے بعد انسانوں کا بھی یہی حال ہوا۔ خوراک

کے پیداواری علاقوں کو شہروں کے سیلاب سے بچانے کے لیے انسان جنگجو جانور بن گیا۔ مزید یہ ہے کہ شہروں کے دفاع کے لیے دیواریں کھڑی کرنے سے آبادی بڑھتی چلی گئی، یہ بالکل ایک نئی صورت حال تھی اور اسی وجہ سے انسان عادی مجرم بن گیا۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ہم بڑھتی ہوئی آبادی کے عذاب سے واقف ہوئے ہیں۔ 1958ء میں جان کرسچین نامی ایک سائنسدان نے جزیرے جیمز پر آباد ہرنوں کی زندگی کا جائزہ لیا، کیونکہ ہرن تیزی کے ساتھ مر رہے تھے۔ جزیرے پر ہرنوں کی تعداد تین سو تھی، جن میں سے دو سو بیس ہرن اگلے سال بغیر کسی ظاہری وجہ کے مر گئے۔ ان کے پوسٹ مارٹم سے پتہ چلا کہ ان کے ایڈرینل گلینڈ بڑھ گئے تھے۔ یہی گلینڈ خون کی شریانوں میں ایڈرینالین نامی ہارمون بھیجتا ہے۔ جزیرہ کا کل رقبہ نصف مربع میل تھا۔ چنانچہ ہر ہرن کے حصہ میں تقریباً پانچ ہزار مربع گز رقبہ آتا تھا جو ظاہر ہے کہ ناکافی تھا۔ ہر ہرن کے لیے تقریباً بیس ہزار مربع گز رقبہ ہونا چاہیے تھا۔ جب ان کی تعداد 80 سے بڑھی تو بیماری کی علامات ظاہر ہونے لگیں اور آبادی اپنے آپ کم ہوگئی۔

ماہر نفسیات جان کلہون نے بھی ناروے کے جنگلی چوہوں کے متعلق کچھ ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے۔ چوہوں کا ڈربہ ایک ایکڑ کا چوتھا حصہ تھا۔ جس میں پانچ ہزار چوہے رکھے جا سکتے تھے۔ دو سال میں پیدائش کی نارمل شرح سے ان کی تعداد دس گنا ہو سکتی تھی مگر صرف دو سو چوہوں تک محدود رہی۔

بعد میں کلہون نے ان چوہوں پر یادگار تجربہ کیا۔ اس نے انہیں چار مختلف پنجروں میں بند کیا جو آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ دو دروازوں والے پنجرے محفوظ اور پسندیدہ گھر تھے جن پر دو زور آور چوہوں نے اپنی محبوباؤں کی معیت میں فوراً قبضہ کر لیا۔ دوسرے تمام چوہے بیچ والے پنجروں میں بند کر دیے گئے۔ جس کی وجہ سے وہاں آبادی بہت گنجان ہوگئی۔ ان دو پنجروں میں بھی زور آور چوہے موجود تھے۔ اس نے جان لیا تھا کہ زور آور چوہے بیس میں ایک یعنی پانچ فیصد ہوتے ہیں مگر جگہ کی کمی کی وجہ سے وہ اپنی حاکمیت قائم نہیں کر سکتے تھے۔ آبادی بڑھنے سے بدمعاش چوہے جرائم میں ملوث ہو گئے۔ انہوں نے گروہ بنا لیے اور ریپ، ہم جنس پسندی اور چوہے خوری کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ عام حالات میں چوہے بڑے اہتمام کے ساتھ یارانے کی رسمیں ادا کرتے ہیں مگر بدمعاش چوہے زبردستی چوہیا کے بیڈ روم میں جا کر اسے ریپ کرتے ہیں اور اس کے بچے کھا جاتے ہیں۔ کلہون کے الفاظ میں درمیان

کے پنجرے اخلاقی گراوٹ کی بدترین مثال ہیں۔

لورینز کی تصنیف 'On Aggression' کے بعد ماہرین نے انسانی رویہ کے متعلق حیوانی رویہ سے نتائج اخذ کرنے کو خطرناک قرار دیا ہے۔مگر اس معاملے میں اس سے بچنا ممکن نہیں۔ ہم پہلے ہی جانتے ہیں کہ ہمارے گنجان جھونپڑے جھگیاں جرائم کی آماجگاہ ہیں۔میری لینڈ کے دماغی ہسپتال کے تجربہ سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب اقلیت کو اس کی طاقت کے نارمل اظہار سے کیوں محروم کیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ بلا امتیاز اور بے دریغ جارحیت کو اپنا شعار بنا لیتی ہے۔ڈیسمنڈ مورس 'The Human Zoo' میں لکھتا ہے کہ نارمل حالات میں اپنی قدرتی رہائش گاہ میں جنگلی جانور اپنے آپ کو مجروح یا مسخ نہیں کرتے نہ اپنے بچوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔انہیں معدہ کا السر نہیں ہوتا، ہم جنس پسندی نہیں کرتے، نہ کسی کو ہلاک کرتے ہیں۔شہر کے مکین انسانوں پر یہ ساری بلائیں نازل ہوتی ہیں۔پنجروں میں بند جانوروں میں بھی کئی گمراہیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے مورس، شہر کو انسانی چڑیا گھر کہتا ہے۔اور چڑیا گھر میں جرائم پلنے کی وجہ زندگی اور قوت کو اظہار کے جائز طریقوں سے محروم رکھنا ہے جس سے تشدد کے راستے کھل جاتے ہیں۔جیسا کہ ولیم بلیک کہتا ہے کہ ''جب خیال کو غاروں میں بند کر دیا جائے تو محبت کا ٹھکانہ جہنم کی پاتال میں ہوگا۔''

پھر بھی حیوانی مثالوں سے انسانی رویہ کا تعین کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ ہر بڑا شہر جرائم اور بے راہ روی کی آماجگاہ نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ایسے شہر بھی موجود ہیں مگر دوسرے شہر بھی ہیں۔ہانگ کانگ، جہاں زور آوروں کی کثرت ہے مگر جرائم کی شرح میں خاصی کمی ہے۔

'The Social Contract' میں آرڈری نے ایک باب 'Personal Space' میں ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے۔اس نے ایک ماہر نفسیات آگسٹن کنزل کے ایک تجربہ کا حوالہ دیا ہے جو اس نے 1969ء میں کیا تھا۔ جب جیل کے ایک خالی کمرے میں چند قیدی لائے گئے۔ قیدیوں کو کمرہ کے وسط میں کھڑا کیا گیا تو کنزل ان کی طرف آہستگی سے قدم بہ قدم بڑھنے لگا۔ قیدی سے کہا گیا کہ جب تم محسوس کرو کہ کنزل کو مزید قریب نہیں آنا چاہیے تو فوراً اسے سٹاپ کہہ کر روک دو۔ غیر متشدد قیدیوں کو دس مربع فٹ کی 'پرسنل سپیس' چاہیے تھی۔مگر تشدد پسند قیدی کنزل کے قریب آنے سے پہلے ہی مٹھیاں بھینچنے لگے تو اندازہ ہوا کہ انہیں چالیس مربع فٹ کی ذاتی جگہ (Personal Space) چاہیے۔

یہ تجربہ لگتا ہے کہ ذاتی یا نجی جگہ کی تھیوری کی تائید ہے۔مگر اس سوال کا جواب نہیں

کہ بعض مجرم کیوں دوسروں سے زیادہ کے طلب گار ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے تھوڑی سی کامن سینس درکار ہے کہ میں پرسکون ہونے کی نسبت تناؤ اور طیش میں زیادہ مشتعل ہوتا ہوں۔ میرے ٹینشن (تناؤ) کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ مثلاً بھوک، تھکاوٹ، ناخوشگوار یادیں، بے اطمینانی یا مایوسی۔ جیسا کہ جان کرسچین نے اپنے ہرن کی مثال دے کر بتایا کہ ان کا نتیجہ ایڈرینل گلینڈ پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ہے جو زیادہ عرصہ رہے تو جانوروں کے جگر بے کار ہو جاتے ہیں اور گردوں، دماغ، تھائیرائیڈ اور اڈرینل کا ہیمرج بھی ہوسکتا ہے۔ ٹینشن سے خوف کے ہارمون خون کی شریانوں میں جا سکتے ہیں۔ The Biological Time Bomb میں گارڈن ٹیلر کہتا ہے کہ اسی کی وجہ سے لیمنگ چوہے اجتماعی خودکشی اور بڑھتی ہوئی آبادی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کوریا میں امریکی قیدی بعض اوقات بے چینی اور ہنگامہ آرائی سے مرے ہیں یا رات کو بالکل سست اور کاہل ہو کر۔

مگر ہم سب جانتے ہیں کہ ٹینشن کا تعلق ہمارے رویہ سے ہے کسی معمولی سی بات پر خفا ہو کر ہم اپنے آپ کو غصہ دلاتے ہیں۔ کام کے دوران میں فون کی گھنٹی بجنے سے مداخلت ہوتی ہے تو غصہ ٹینشن میں بدل جاتا ہے۔ حالانکہ ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ مداخلت اگرچہ بے جا مگر ناگزیر ہے اس لیے اسے خوش دلی سے برداشت کرنا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ہماری توانائی کا نظام ایک طاقت اور جوابی طاقت کے زور پر کام کرتا ہے۔ اگر ہم کوئی ناپسندیدہ حرکت کریں تو جوابی طاقت ہمیں سرزنش کرتی ہے۔ بے چینی اور خلفشار سر اٹھاتے ہیں اگر یہ کیفیت دیر تک جاری رہے تو ہمارے بلڈ پریشر، اعصاب اور دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

دوسری طرف اگر ہم کسی مسئلہ میں گہری دلچسپی لیتے ہوں تو اس پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ سکون اور اطمینان کے ساتھ اس پر غور کرتے ہیں۔ ہم جوابی طاقت کے ذریعہ (تخریبی؟) طاقت کا سامنا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم موسیقی سن رہے ہیں تو جب تک ہم پر کیف وسرور کی حالت طاری رہے ہم شاید جوابی طاقت سے کام لیں۔

جب ہم اسے اس انداز سے دیکھیں تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ دونوں طاقتیں انسانی زندگی میں غیر معمولی کردار ادا کرتی ہیں۔ صبح سویرے اٹھتے ہی ہماری کئی مصروفیات ٹینشن کا باعث بنتی ہیں جن کا ہمیں خیال رہتا ہے کہ ہمارے قابو میں رہیں اور ممکن ہو تو ان سے کوئی اچھا کام لیں۔ ماہرین حیاتیات قوت ارادی اور اس کے آزادانہ مصرف کو نہیں مانتے مگر اس

صورت حال کو بیان کرنے میں ارادے اور مرضی کا ذکر لازمی ہے۔ کمزور لوگ جن میں کنٹرول کرنے کی صلاحیت برائے نام ہوتی ہے اپنی زندگی بدمزگی میں گزارتے ہیں۔ بلیک اپنی نظم میں کہتا ہے کہ ''وہی لوگ اپنی خواہشات پر قابو پا سکتے ہیں جن کی خواہشات اتنی کمزور ہوں کہ ان پر قابو پایا جا سکے۔'' اس نامور صوفی کے چند بیانات میں سے یہ ایک بیان ہے جو سراسر غلط ہے۔ بیتھوون، زود رنج اور آسانی سے مشتعل ہونے والا شخص تھا مگر اس میں ایک تخریبی رجحان کو تخلیقی کارنامہ میں بدل دینے کی صلاحیت بھی تھی۔

ظاہر ہے کہ سیکاہرن، ناروے کے چوہوں لیمنگز وغیرہ جیسی مخلوق دباؤ میں آ کر اس لیے مر جاتی ہے کہ اس میں مدافعانہ قوت کا فقدان ہوتا ہے۔ یقیناً ہر مخلوق کو یہ قوت حاصل ہونی چاہیے ورنہ وہ اپنی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کو کوئی سمت نہیں دے سکے گی۔ مگر جانوروں میں یہ قوت بیرونی عوامل سے مشروط ہے۔ جیسے بلی، چوہے کی تاک میں اس کے بل کے باہر بیٹھی ہو ایسی حالت میں بلی کو اپنی حرکات وسکنات پر پورا کنٹرول کر کے تمام توجہ اپنے شکار پر مرکوز کرنا ہوتی ہے۔ مگر کسی خارجی محرک کے بغیر جانور ایسا نہیں کر سکتے۔ انہیں بوریت ہوتی ہے یا وہ سو جاتے ہیں۔ انسان واحد جانور ہے جو غفلت کا کوئی لمحہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ جس کا طرز زندگی اسے ہر پل چوکس رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اب ہم **IK** کے مسئلہ کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جہاں تک ان کے ذاتی جذبات کا تعلق ہے انہیں دفاعی قوت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ شکاریوں کے طور پر ان کی زندگی پیچیدگیوں سے پاک تھی۔ ان جانوروں کی طرح جو شکار گاہ میں ان کے پارٹنر تھے۔ ایک ایسی صورت حال میں رہتے ہوئے جس کا تقاضا دوسری قسم کا کنٹرول تھا وہ آپ ہی اپنی تخریبی قوتوں کی زد میں آ گئے۔

جس کا مطلب ہے کہ کنزل قیدیوں کے معاملہ میں نجی جگہ (**Personal Space**) حقیقی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ بات اس کا تجربہ دہرانے سے سمجھ میں آ سکتی ہے کسی بچے کو کمرہ کے وسط میں کھڑا کریں پھر چاروں اطراف سے غراتے ہوئے اس کی طرف بڑھیں۔ پہلے تو بچہ خوشگوار حیرت کا اظہار کرے گا، اور قریب جائیں تو اس کی ہنسی میں خوف کا عنصر شامل ہو جائے گا اور آخرکار وہ بھاگ جائے گا۔ پراعتماد بچے ممکن ہے بے خوف ہو کر تمہارے پاس آ جائیں۔

اب کمرہ کے وسط میں خود کھڑے ہوں۔ کوئی اور شخص ڈراؤنی آوازوں کے ساتھ تمہاری طرف بڑھے۔ تمہیں محسوس ہو گا کہ اگرچہ تم محض ایک تجربہ کر رہے ہو مگر تمہارے اندر

خطرہ کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ایڈرنالین بہنے لگی ہے۔ ابتری کا عمل بڑی حد تک خودکار ہوتا ہے۔

اس سے ہمیں یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ ہم اپنے کنٹرول سسٹم سے کس حد تک کام لے سکتے ہیں۔ خطرہ کے خیال سے ہی خوف کا عمل شروع ہو کر ہم میں ٹینشن پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے نجات پانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے، اگر یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو، دفاعی میکانزم کی ان کوششوں کا تجربہ ہوگا جو تخریبی قوت کو کنٹرول کرنے کے لیے ہوں گی۔ ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے پاس اور کئی راستے ہیں جن کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اسے کہاں تک کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔ ہم خطرہ محسوس تو کر سکتے ہیں مگر اس کا اثر قبول کرنے سے انکار بھی کر سکتے ہیں۔ اسے دبا بھی سکتے ہیں یا اسے پیدا ہونے سے بالکل روک بھی سکتے ہیں۔

حال ہی میں مجھے ایک تفریحی پارک میں یہ میکانزم دیکھنے کا موقعہ ملا جہاں ایک چھوٹا سینما ایسی فلمیں دکھاتا ہے جنہیں دیکھ کر لوگوں کو چکر آئیں۔ ناظرین کو کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ سکرین بہت بڑی ہوتی ہے۔

ہوا یہ کہ جھولے کے آخری اچانک جھٹکے نے مجھے اس پوائنٹ سے پرے دھکیل دیا جہاں پر میرا کنٹرول تھا۔ پھر بھی میں پچھلے بیس منٹ تک عام کنٹرول سے زیادہ کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ایسے حالات میں شہریوں کو کچھ اسی قسم کا تجربہ ہر روز ہوتا ہے۔ تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ تمام کنٹرول اضافی ہے اور شاید اس لیے بے معنی ہے اور یہ غلطی جس کا ارتکاب اتنا آسان ہے دراصل مجرمانہ ذہنیت کی جان ہے۔ مجرم، کنٹرول سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ اتنا شدید کنٹرول کرنے میں اپنا وقت کیوں ضائع کرے۔ کنٹرول کی فکر دوسرے لوگ کرتے رہیں۔ اس کا نتیجہ سماج کے لیے تو تباہ کن ہے مگر خود مجرم کے لیے زیادہ تباہ کن ہے۔ سماج تو تشدد کی لہر برداشت کر لے گا مگر مجرم، ایک آوارہ فرد کا مقدر مکمل تباہی ہے۔

جب ہم تعمیری اور تخریبی قوتوں میں توازن کے اس مسلسل عمل کا مشاہدہ کرتے ہیں تو بنی نوع انسان کے ارتقا میں اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب ہرنوں اور لیمنگز کی آبادی حد سے بڑھ جائے تو اس کا نتیجہ تخریبی عمل میں تیزی ہے، اس تیزی سے آرڈرینل گلینڈز پر بوجھ پڑتا ہے جو ٹینشن کا سبب بنتا ہے اور ٹینشن ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو اس کا نتیجہ موت ہے۔ اس حالت کا کوئی علاج نہیں، کوئی بدل نہیں، تعمیری قوتیں بھی نہیں کہ انہیں متحرک

کرنے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ جب انسان اکٹھے ہو کر شہروں میں بسنے آئے تھے تو ان کا مقصد باہمی تحفظ تھا۔ ایک نتیجہ ان رجحانات کا فروغ تھا جو نارمل نہیں تھے اور جن کا ذکر ڈیسمنڈ مورس نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ مجرمانہ ذہنیت کا جنم لینا ہے مگر اس سے تعمیری قوتوں کو تقویت ملی اور اس درجہ کا ڈسپلن پیدا ہوا جو انسان کے علاوہ کسی اور ذی روح کے بس کی بات نہیں۔

اس ترقی کے ذریعہ ہی انسان پر یہ انتہائی اہم انکشاف ہوا کہ کنٹرول محض ایک منفی قدر نہیں۔ جس کسی نے بھی کوئی مشکل فن سیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ سیکھنے کا عمل محنت طلب اور صبر آزما ہے۔ جیسے جنگلی گھوڑے کو سدھانا ایک کٹھن کام ہے۔ تب غیر شعوری طور پر کنٹرول کی صلاحیت بڑھنے لگتی ہے اور کامیابی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ مایوسی اچانک قوت اور ڈسپلن میں بدل جاتی ہے، ہمیں احساس ہوتا ہے کہ جنگلی گھوڑا اگر جنگلی نہ رہے تو اچھا دوست بن جاتا ہے۔ تعمیری قوت کی نوعیت محض دفاعی نہیں بلکہ فاتحانہ ہے جو ہماری زندگی کو بدل دیتی ہے۔

ایک بار انسان کو اس کا احساس ہو جائے تو وہ نئی دنیائیں تسخیر کرنے کا عزم کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم وہ واحد مخلوق ہیں جو مصائب کو اس لیے گلے لگاتے ہیں کہ ان کے مزے لے سکیں۔ جو جان جوکھوں میں ڈال کر دشوار گزار برفانی پہاڑوں کی چوٹیاں صرف اس لیے سر کرتے ہیں کہ وہاں اپنا پرچم لہرا سکیں۔ جو ریکارڈ قائم کرنے کے لیے سمندروں میں تن تنہا دنیا کے گرد چکر لگاتے ہیں جس سے احساس ہوتا ہے کہ تعمیری قوت میں اضافہ بذات خود باعث مسرت ہے۔ وٹگنسٹائن (Luduwig Witgenstein) نے اپنے فلسفہ کی بنیاد زبان اور کھیلوں کے موازنہ اور اس دعوے پر رکھی کہ تمام کھیلوں میں کوئی بات مشترک نہیں۔ جیسے تاش کھیلنا اور فٹ بال اور دنیا کے گرد تنہا سفر کرنا۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ تمام کھیلوں کا مقصد ایک یعنی تخریبی قوت کے بجائے اپنی تعمیری قوت کو بڑھانا ہے۔ تمام کھیلوں سے ٹینشن پیدا ہوتا ہے جسے کنٹرول کرنے سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ (چنانچہ کہاوت ہے کہ واٹرلو کی فتح Eton کالج میں کھیل کے میدانوں میں حاصل ہوئی تھی) یہ انسان کی تخلیقی صفت ہے کہ وہ واحد مخلوق ہے جسے ٹینشن پر قابو پانا آتا ہے، وہ ٹینشن کو تخلیق میں بدل سکتا ہے اور اس سے تخلیقی مسرت حاصل کرتا ہے۔ اس کا دلچسپ نتیجہ یہ ہے کہ شدید ٹینشن میں مبتلا لوگ خلاف امید صحت مند ہوتے ہیں۔ بیل ٹیلی فون کمپنی کے ایک جائزے کے مطابق اعلیٰ افسروں کی نسبت معمولی کارکنوں میں دل کی بیماریاں تین گنا ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عام کارکنوں کی نسبت اعلیٰ افسروں کی حیثیت اور اختیارات زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ

سے وہ ٹینشن برداشت کر لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اعلیٰ حیثیت حاصل کرنے کے عرصہ میں مسائل سے نمٹنا اور ٹینشن کو برداشت کرنا سیکھ لیا تھا۔ ایک برطانوی جائزے کے مطابق اعلیٰ اور ممتاز حیثیت کے لوگوں کی عمریں طویل اور صحت اچھی ہوتی ہے۔ اس طرح ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ٹینشن برداشت کرنا سیکھنے کا محض منفی عمل نہیں۔ نوبیل انعام یافتہ شخصیات وار اکینِ آرڈر آف میرٹ کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لیے ٹینشن برداشت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جیفری گرے نے برٹش سائیکولوجیکل سوسائٹی کی ایک کانفرنس (دسمبر 1981ء) میں کہا کہ آج کل دواؤں کے ذریعہ ٹینشن سے نجات کی کوششیں عام ہیں مگر لوگوں کو دواؤں کے بغیر اپنی پریشانیوں پر قابو پانا اور ٹینشن برداشت کرنا سیکھنا چاہیے۔ ٹینشن کم کرنے کے لیے جن چوہوں کو لبریم اور ویلیم دی گئیں ان کی نسبت ایسے چوہوں کی حالت بہتر تھی جنہیں کوئی دوا نہیں دی گئی کیونکہ وہ ٹینشن کا سامنا کر سکتے تھے اور ان پر ٹینشن کا اثر بھی بہت کم ہوتا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمام جانور ٹینشن کی مزاحمت کر سکتے ہیں۔ صرف انسان ایک ایسا جانور ہے جس نے ٹینشن سے اپنے لیے اطمینان حاصل کرنا سیکھ لیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کیا بات ہے جو مجرم کو ہم سب سے الگ کرتی ہے۔ ویلیم پر زندہ رہنے والے چوہوں کی طرح مجرم بھی ٹینشن کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ ہر مجرم ٹینشن کا سامنا کرنے کے بجائے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اسے نکلنے کا راستہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی اس کی عادت ہے۔ جرم ایک شارٹ کٹ ہے، تشدد کرنے اور تشدد نہ کرنے والے دونوں مجرموں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جرم بنیادی طور پر آسانیوں کی تلاش ہے، آنکھ جھپکنے میں اپنی خواہشوں کی تکمیل کا خواب ہے۔

دوسرے انسانوں کے لیے اپنے احساس کے فطری فقدان کی وجہ سے حیرانی ہوتی ہے کہ ہمارے شہروں میں تشدد کی فراوانی کیوں نہیں ہے۔ اس لیے یہ اور حیرانی کی بات ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے ظالم نہیں۔ وہ یار باش ہے۔ وہ دوستی کے لیے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو گرم جوشی سے تھام لیتا ہے۔ بس میں سفر کرنے والے دو اجنبی مسافر آنکھ بھر کر ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو دوستی شروع ہو جاتی ہے۔ کسی کو غصہ کا خط لکھنا بہت آسان ہے مگر اس کے ساتھ ملاقات میں غصہ ظاہر کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے ہی ہمیں دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اصل تضاد یہ ہے کہ بچوں کو آگ میں پھینکنے والے جرمن غالباً اچھے شوہر اور مہربان باپ تھے اور وہ جاپانی جو سنگینوں کی نوکوں پر بچے

اچھالتے رہے اور ایک لڑکی کو ریپ کرنے کے بعد اس کے اندرونی اعضا باہر نکالتے رہے شاید وہ بھی اپنی بیٹیوں کی تصویریں اپنے تھیلوں میں لیے پھرتے ہوں۔

مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا انسان واقعی درندوں سے زیادہ ظالم ہے؟ اس کا جواب پروفیسر سٹینلے ملگرم نے ہارورڈ میں اپنے تجربات کے ذریعہ دیا ہے۔ اس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا 'عام لوگ' دوسروں کو اذیت (ٹارچر) دینے پر آمادہ کیے جا سکتے ہیں۔ لوگوں کو بتایا گیا کہ تجربہ کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ کیا سزا کے ذریعے کسی کی جاننے اور سیکھنے کی صلاحیت بڑھائی جا سکتی ہے۔ تجربہ کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک شخص کو الیکٹرک شاک مشین سے کنیکٹ (Connect) کر کے اسے بجلی کے جھٹکے دیئے جائیں جن کی طاقت بتدریج بڑھائی جائے۔ تجربہ کے لیے جسے چنا گیا وہ شخص ایکٹر تھا اور اسے چیخنا چلانا خوب آتا تھا۔ اسے بتا دیا گیا کہ بجلی کے جھٹکوں سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اسے Volt 45 کا جھٹکا دیا گیا تاکہ ثابت ہو جائے کہ تجربہ صحیح خطوط پر کیا جا رہا ہے اور اس میں کوئی تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ 'عام لوگوں' کی اکثریت خوفناک چیخوں کے باوجود Volt 500 تک شاک بڑھاتے رہنے پر آمادہ ہوگئی مگر چند لوگوں نے انکار کر دیا۔ ملگرم نے اپنے تجربات ایک امریکی فوجی کے حوالے سے بیان کیے ہیں جس نے ویت نام میں مائی لائی کے قتل عام میں حصہ لیا تھا اور جس نے بتایا تھا کہ لیفٹیننٹ کیلی نے کس طرح اسے اپنی سب مشین گن عورتوں، مردوں اور ننھے بچوں کی طرف موڑنے کا حکم دیا تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ ایک باپ ہوتے ہوئے تم نے ننھے بچوں پر گولیاں کیوں برسائیں؟ تو اس نے جواب دیا 'پتہ نہیں بس ایسا ہو جاتا ہے۔'

ان الفاظ سے اچانک خیال آتا ہے کہ انسانوں کا رویہ اس طرح کیوں ہے۔ شاید اس لیے کہ ہمارے پاس دماغ ہیں اور یہ دماغ ہماری فطری خواہشات کو رد کر سکتے ہیں۔ ایک جانور اپنی فطری خواہشات کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ جبکہ انسان دن میں سو بار ایسا کرتا ہے۔ ایک ماڈرن شہر میں رہنا پہلے ہی خلاف فطرت ہے، جس کی کوئی شخصیت نہیں، جس کی آبادی اس کی بساط سے کئی گنا بڑھ کر ہے۔ چنانچہ جب لیفٹیننٹ کیلی نے اپنے سپاہی کو بچوں اور عورتوں پر گولی چلانے کا حکم دیا تو وہ وہی کچھ کر رہا تھا جو بچپن سے اسے تہذیب اور اس کے ماحول نے سکھایا تھا۔ یعنی اس نے دماغ کو اپنی فطرت پر حاوی ہونے دیا۔

نانکنگ کی تباہی سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ دو چار سال کی شدید لڑائی کے بعد جاپانی فوجیوں کے لیے نانکنگ، بدمعاشی اور درندگی کا آخری سامان تھا جس کے بعد

جاپان میں انہیں اپنی بڑی منظم اور مہذب زندگی کی طرف لوٹنا تھا۔ مگر اس بات سے جاپانی کیریکٹر کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ 1946ء کی ایک رپورٹ نے اس کیریکٹر کی بہتر عکاسی کی ہے۔ ''سات دسمبر تک نانکنگ کے بیرونی دفاعی حصار شدید حملہ کی زَد میں تھے اور ایک ہفتہ بعد مضبوط چینی دفاع سے سٹ پٹا کر جاپانی قہر بن کر نانکنگ پر ٹوٹ پڑے۔ دراصل جولائی 1937ء سے ہی چینیوں کے خلافِ توقع مؤقف اور ان کی زور دار مزاحمت کے ہاتھوں جاپانیوں کو ندامت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لیے وہ غضب ناک ہو کر نانکنگ میں داخل ہوئے تھے۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ 'ندامت کا سامنا' اتنا اہم کیوں تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جاپانی کیریکٹر کی گہری مذہبی روایت پرستی کو سمجھیں۔ مشہور مؤرخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی تصنیف 'East to West' میں کہا ہے کہ بروسگروشہر اگر جاپان میں واقع ہوتا تو جاپانیوں کو ٹھیک ٹھیک پتہ چلتا کہ اس کا یہ نام کیوں رکھا گیا ہے۔ کیونکہ وہ 'جنگ کے دیوتا' Bron کی یاد میں مقدس Grove بناتے اور شاید اس کے پاس ہی کہیں بدھسٹ ٹمپل ہوتا۔ بھکشو اور پادری میں گہری دوستی ہوتی۔ انیسویں صدی میں جب جاپانیوں نے مغرب کی تقلید کا فیصلہ کیا تو انہوں نے تمام مذہبی جذبات اپنے شہنشاہ سے منسوب کر دیے جسے وہ خدا کی طرح پوجتے تھے۔ 1937ء میں شروع ہونے والی جنگ جو بالآخر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے سے 1945ء میں ختم ہوئی وہ جرمنی میں نازیوں کی طرح وطن پرستی کے جذبہ کا شدید اظہار تھا۔ تعداد میں کمی کے باوجود جاپانی فوجیوں کو احساس تھا کہ وہ اپنے 'دیوتا شہنشاہ' کے لیے لڑ رہے ہیں اور یہ کہ ان کا کاز انصاف پر مبنی ہے۔ اسی خیال نے شدید چینی مزاحمت کے خلاف ان کے اندر انتقامی جذبہ پیدا کر دیا جس میں نرمی اور رعایت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ملگرم کے لوگوں کی طرح وہ بھی سمجھتے تھے کہ شاک دے کر وہ چینیوں کا علاج کر رہے ہیں۔ مگر ان کا غصہ ظلم میں بدل گیا تھا۔

عجیب بات ہے کہ وَیلز نے انسانی ظلم کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ اپنے اسی خیال میں مگن کہ جھگیوں جھونپڑوں سے مایوسی پیدا ہوتی ہے، وہ انسانی ظلم اور اذیت پسندی کے لمبے چوڑے تجزیئے کرتا رہا ہے اور اس سلسلہ میں پندرھویں صدی کے مارشل گہلن کی مثال دے رہا ہے جس نے دوسو سے زیادہ بچوں کو جنسی جرائم کی نذر کیا تھا۔ درحقیقت گہلن کی بے راہروی کا عام انسانوں سے کوئی تعلق نہیں جن کا جنسی ذوق کسی کجروی کا روادار نہیں ہوتا۔ جن جاپانیوں نے نانکنگ کو جلایا، جن جرمنوں نے اوراڈور کو تباہ کیا وہ جنسی اعتبار سے گمراہ نہیں

تھے۔ اس قسم کی کوئی حرکت انہوں نے پہلے کی تھی نہ آئندہ کریں گے۔ وہ اتھارٹی کا حکم بجا لاتے ہوئے اپنی جارحیت کا اظہار کرتے ہیں۔

ایرک فرام سے بھی یہی غلطی سرزد ہوتی ہے۔ وہ روایتی جارحیت، زیرِحکم جارحیت کو مانتا ہے۔ مگر اس کا خیال ہے کہ انسانی تباہی کی وضاحت اذیت پسندی کے ذریعہ بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ اذیت پسندی کے متعلق اس کا کہنا ہے کہ اذیت پسندی ایک ذی روح پر مکمل کنٹرول، خدا جیسے کنٹرول کا نام ہے۔

وہ ہٹلر اور اسٹالین دونوں کو اذیت پسندی کی نمائندہ مثالیں سمجھتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ دونوں بہت مہربان ہوتے تھے، مگر صرف اس وقت غضب ناک ہو جاتے تھے جب ان کی مکمل اطاعت نہ ہو۔ مگر اس سے اس انسانی ذہنیت کی وضاحت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے جنگ میں انسان انسانوں کو قتل کرتے ہیں۔ چنانچہ فرام ایک مختلف قسم کی جارحیت کی بات کرتا ہے جسے وہ necrophillia کہتا ہے۔ اس سے مراد شاید فرائیڈ کے الفاظ میں 'thanatos' یعنی اپنی تباہی کی انسانی خواہش ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں فرائیڈ نے 'موت کی خواہش' کا ذکر اس قتل عام کی وضاحت کے لیے کیا تھا جو جنگ کے دوران میں مسلسل ہو رہا تھا۔ یہ اس کے بہترین خیالات میں سے نہیں تھا۔ اسی لیے اس کے اکثر شاگرد اس سے متاثر نہیں تھے کیونکہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ خودکشی اکثر کنفیوژن کی حالت میں کی جاتی ہے۔ جب انسان سوچتا ہے کہ زندگی جینے کے قابل نہیں جبکہ فطری طور پر وہ اور جینا چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ کیٹس جیسا رومان پسند بھی جو پرسکون موت کی محبت میں مبتلا ہے موت کو نیند اور آرام کے ساتھ کنفیوژ کرتا ہے۔ اگر انسان میں اپنی تباہی کی خواہش موجود ہو تو بھی وہ اسے چھپانا خوب جانتا ہے۔

فرام اس کے باوجود اپنی تباہی کے فرائیڈین تصور سے متاثر ہے۔ وہ اسپین کی خانہ جنگی کے ایک جنرل کا ذکر کرتا ہے جس کا پسندیدہ نعرہ 'موت زندہ باد' تھا۔ اسی شخص نے ایک آزاد خیال دانشور کے سامنے 'ذہانت مردہ باد' کا نعرہ لگا کر اس کی توہین کی۔ اس سے فرام کو خیال آتا ہے کہ ملٹری ازم، زندگی کا دشمن ہے اس لیے اسے necrophillia کہہ سکتے ہیں۔ مگر necrophillia کی دو حقیقی مثالوں کا ذکر کر کے وہ اپنے اس خیال کو جھٹلا دیتا ہے۔ ان دونوں مثالوں کا ماخذ جنسی بے راہروی کے متعلق ایک میڈیکل ٹیکسٹ بک ہے جس کی رو سے دفتر کے دو کارکن زنانہ لاشوں کی بے آبروئی میں لذت محسوس کرتے تھے۔ ان میں

سے ایک کا کہنا تھا کہ وہ نوعمری سے ہی جنسی خواہشات غیر فطری عمل سے پوری کرتا تھا یہاں تک کہ جوان ہو کر اسے عورتوں کی مزید قربت میسر آئی۔ مگر کیا یہ necrophillia یعنی جنسی خواہشات کا رخ موت کی طرف موڑ دینا ہے؟ اگر موقع ہو تو کئی نوعمر لڑکے شاید یہی کریں مگر یہ تو موت کے بجائے جنس کی خواہش ہے۔ صحیح معنوں میں necrophilla وہ ہے جو لاشوں کو اس لیے ترجیح دے کہ وہ لاشیں ہیں۔

چنانچہ necrophillia کے متعلق فرام کی ساری بحث اور ہٹلر کو necrophillic ثابت کرنے کی کوشش بے سود ہے۔ اسپینی جنرل بھی کسی طرح necrophilic نہیں تھا۔ وہ موت کو خاص معنوں میں لے رہا تھا یعنی وطن کی خاطر اپنی جان قربان کرنا۔ ہٹلر بے شک تخریب کا باعث تھا مگر اپنی تخریب نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی اس کا کوئی ثبوت ہے کہ اس کی خواہش مرگ مخفی تھی۔ اس کے برعکس وہ اپنے ان رومانی خوابوں میں گم تھا کہ اس کی ہزار سالہ سلطنت صحت، طاقت اور فرزانگی کی نمائندہ ہے۔ فرام کا necrophillia بھی ظلم کے متعلق ویلز کے خیالات کی طرح، انسانی ظلم کی کوئی ایسی توجیہہ نہیں کرتا جو دنیا پر محیط ہو۔

ندامت کے احساس سے سوچ کی ایک نئی راہ نکلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق ہملر اور اسٹالین کے ظلم سے ہے جس کا اظہار وہ اپنے اختیارات کے چیلنج ہونے کی صورت میں کرتے تھے۔ وہ دونوں رعونت اور خودستائی کے مارے ہوئے تھے۔ اس لیے اپنی توہین کا خیال ہی انہیں انتقام پر آمادہ کر دیتا تھا۔ ان دونوں کی ایک اور خصوصیت بھی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ سچا سمجھتے تھے، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان سے کوئی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔

ہملر اور اسٹالین کمیاب سہی مگر ان کا ٹائپ بہت عام ہے۔ اس حقیقت کو مان لینے کا کریڈٹ سائنس فکشن کے مصنف فان ووگٹ کو جاتا ہے جو اعلیٰ درجہ کے نفسیاتی مضامین کا خالق بھی ہے۔ اس کا 'اچھے آدمی' اور ''تشدد پسند آدمی' کا تصور جرائم کے سلسلہ میں اتنا اہم ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے۔ میں اس کا شکر گزار ہوں کہ اس نے KPFK پر براڈکاسٹ ہونے والی اپنی سیریز (1965ء) مجھے بھیجی۔ اس کے پہلے پمفلٹ A Report on the Violent Male کی طرح یہ بھی کتابی شکل میں کبھی شائع نہیں ہوئی۔

1954ء میں فان ووگٹ نے جنگ 'The Violent Man' نامی ایک ناول پر کام شروع کیا، جس کا پس منظر ایک چینی اسیری کیمپ تھا۔ کیمپ کمانڈنٹ ایک درندہ صفت آمر مطلق تھا جو ہر ایسے فرد کو کسی تذبذب کے بغیر گولی مار سکتا تھا جو اس کی اتھارٹی کو چیلنج

کرے۔ وون ووگٹ ہٹلر اور اسٹالین جیسے کردار تخلیق کر رہا تھا جونہی اسے کمانڈنٹ کے قاتلانہ رویے کا خیال آتا تو وہ حیران ہوتا کہ ایسے شخص کو کون سمجھا سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ بعض لوگوں کو یقین ہوتا ہے کہ جو کوئی ان سے اختلاف کرتا ہے وہ بددیانت ہے یا ان کا کھلا دشمن ہے۔ کیا وہ واقعی سمجھتے ہیں کہ وہ خدا ہیں جن سے کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ہے تو کیا وہ اس شخص کی طرح پاگل ہیں جو اپنے آپ کو جولیس سیزر سمجھتا ہے۔

ظلم کی مثالیں ڈھونڈتے ہوئے فان ووگٹ کو خیال آیا کہ شوہروں کے ظالمانہ رویہ کو پاگل پن سمجھنا زیادتی ہے جبکہ اخبارات کی سرخیاں خود اپنی کہانی بیان کرتی ہیں۔

کرسمس پارٹی میں شوہر، بیوی کو گولی مار دیتا ہے، غم سے نڈھال شوہر کو گلہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ واپس نہیں جاتی تھی۔

فنکار اپنی بیوی کو چھرا گھونپ کر قتل کر دیتا ہے کہ بیوی بے وفا تھی، دوستوں کا بیان ہے کہ شوہر بے وفا تھا نہ کہ بیوی۔

بیوی کو گاڑی تلے دے دیا، طلاق شدہ شوہر کا بیان کہ حادثہ تھا۔ شک کی بنا پر بری طرح زدوکوب، نالائق ماں تھی، سابق شوہر کا الزام۔ جھوٹ، خود جھگڑالو ہے، ہمسائے۔ شوہر، بیوی کو پہاڑی سے دھکیلنے میں ناکام، بیوی صلح کر لیتی ہے، سمجھتی ہے کہ اس سے محبت کرتا ہے۔

فان ووگٹ کے مطابق شادی مرد کی آمرانہ ذہنیت کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ اس مسئلہ پر اس نے اپنے ایک ماہر نفسیات دوست سے تبادلۂ خیال کیا۔ اس کے دوست نے اسے ایک شوہر کا دلچسپ کیس سنایا جو اپنی بیوی کو نفسیاتی علاج کے لیے ساتھ لایا تھا۔

اس نے اپنی بیوی کو مضافات کے ایک گھر میں بسایا تھا اور اس شرط پر اس کے اخراجات کی ذمہ داری لی تھی کہ وہ کسی اور مرد سے دوستی نہیں کرے گی۔ اسے بس بچے کی دیکھ بھال کرنی ہے۔

اس کی بیوی ایک نرس تھی اس نے دیکھا کہ ایک شخص مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو ضروری سمجھا کہ دو ڈاکٹروں کے ساتھ اپنے گزشتہ تعلقات کے متعلق اسے بتا دے، وہ شخص یہ جان کر حسد کی آگ میں جلنے لگا اور تمام معاملہ کو وہیں ختم کر دیا۔ مگر اگلے روز وہ ایک معاہدہ کی دستاویز لیے نمودار ہوا اور اصرار کرنے لگا کہ اگر شادی ہونی ہے تو نرس پہلے معاہدہ کو پڑھے بغیر اس پر دستخط کرے۔

فان ووگٹ کا قیاس تھا کہ معاہدہ نرس کے اس اعتراف پر مشتمل تھا کہ وہ ایک

اخلاق باختہ عورت ہے اور چونکہ اسے گٹر سے نکال کر عزت کا مقام دیا گیا ہے اس لیے قانونی لحاظ سے اس کے کوئی حقوق نہیں۔

شادی ہوگئی اور بیوی کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اپنے بزنس کے سلسلہ میں اس کے شوہر کو سفر پر جانا پڑتا تھا، اس لیے اسے کبھی پتہ نہ چلتا تھا کہ اس کا شوہر کب کہاں ہے۔ وہ گھنٹوں دفتر کی لڑکیوں کے پاس ان کے کمروں میں پڑا رہتا، اگر وہ اس معاملہ میں کچھ جاننا چاہتی تو وہ غصہ میں پاگل ہو جاتا اور اسے مارنے لگتا۔ اگلے دن کہیں دور سے فون پر اس سے معافی مانگتا اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ کرتا۔ بیوی اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آنے لگی۔ بالآخران میں طلاق ہوگئی مگر پھر بھی وہ اسے اپنی ذاتی جائداد سمجھ کر اس کی آزادی پر پابندیاں لگاتا رہا۔ جس سے ٹینشن میں اور اضافہ ہوتا رہا۔ آخر کار اس نے اسے کسی ماہر نفسیات سے ملنے کا مشورہ دیا اس طرح وہ ووگٹ کے دوست سے ملنے آئے۔

یہ کیس 'اچھے آدمی' اور 'تشدد پسند آدمی' کی اچھی مثال ہے۔ وہ شخص خود پسندی کی خواہش میں مجنونانہ حد تک مبتلا ہے، اسے اپنی مبالغہ آمیز اہمیت کا احساس ہے۔ ندامت کی فکر ہے اس لیے اپنی غلطی کبھی نہیں مانے گا اور اپنی بیوی کو اس کے پاگل ہونے کا یقین دلانا بھی کچھ ایسی ہی بات ہے۔

وحشیانہ اور مجنونانہ حسد بھی اتنا ہی دلچسپ ہے، ہم میں سے اکثر لوگ اس کے شکار ہیں۔ ہمارا محبوب اگر کسی اور کو ہم پر ترجیح دینے لگے تو اسے ہم اپنے ملکیتی حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ مگر ووگٹ کا 'اچھا آدمی' جس کی خود پسندی بڑھتے ہوئے ٹیومر کی طرح مسلسل بڑھتی رہتی ہے اس خیال سے ہی آگ بگولا ہو کر قتل کرنے پر اتر آتا ہے۔

ووگٹ کا کہنا ہے کہ 'اچھا آدمی' ایک آئیڈیلسٹ ہے جو اپنے ذہن میں بسائی ہوئی دنیا کے اندر رہتا ہے اور اس حقیقت کو سختی سے جھٹلا دیتا ہے، جو اس کی خیالی دنیا کے متضاد ہو۔ جیسے کمیونسٹ نئی تاریخ لکھنا چاہے۔ حقیقت بعد میں اس کی فاتحانہ شخصیت کا حصہ بنا دی جاتی ہے۔ اس کی خیالی دنیا میں عورتیں دلکش اور باوفا مخلوق ہیں جو بڑے صبر کے ساتھ سپردگی کے لیے اچھے آدمی کا انتظار کرتی ہیں۔ وہ خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ خود پسندی کو ہوا دینے کے لیے نرس اپنی خوبیوں کی وجہ سے اسے ایک مثالی شخصیت نظر آئی۔ ہمیشہ کے لیے ماں اور بیوی، صاف ستھرے لباس میں اس کی منتظر ہوتی ہے جب وہ چھٹی منانے کے لیے اپنی داشتہ کو ساتھ لیے گھر واپس آتا ہے۔ 'اچھا آدمی' کے متعلق ووگٹ کے گہرے مشاہدہ کا حاصل اس کا یہ

انکشاف ہے کہ اگر اس کی بیوی یا اس کا دست نگر کوئی فرد اس کا ساتھ چھوڑ دے تو وہ برباد ہو سکتا ہے۔ ایسے موقع پر وہ منت سماجت کرتا ہے، معافیاں مانگتا ہے، آئندہ محتاط رہنے کے وعدے کرتا ہے۔ پھر بھی بات نہ بنے تو شراب نوشی اور منشیات کا سہارا لیتا ہے، بلکہ خودکشی پر بھی تیار ہو جاتا ہے۔ بیوی نے ایک ہی ٹھوکر سے اس کا ریت کا محل زمین بوس کر دیا۔ جب ایسے شخص کو ایک چاہنے والی اور فرمانبردار عورت مل جاتی ہے تو اس کی خوداعتمادی میں گونا گوں اضافہ ہوتا ہے۔ (ہنڈلے اور بریڈی کے معاملہ میں یہی میکانزم کام کرتا ہے) چاہے وہ اس عورت سے کتنی ہی بدسلوکی کرے اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ اسے ایک نایاب شخصیت سمجھتی ہے، وہ اس کی برتری، اس کی یکتائی کی ضمانت ہے، اس کو پروا نہیں کہ باقی دنیا کیا سوچتی ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی شاید چھوڑ دے صرف یہ منوانے کے لیے کہ وہ کتنا زبردست اور جذباتیت سے بلند ہے۔ اگر بیوی اسے چھوڑ دے تو اس کی حالت ایک بے رحم دنیا میں بن ماں کے بچے جیسی ہو جاتی ہے۔ ''اکثر پرتشدد انسان ناکام ہوتے ہیں،'' ووگٹ کا خیال ہے، ''اس لیے انہیں چھوڑ دینا دراصل انہیں خود اپنے متعلق بدترین شبہات کے حوالے کرنا ہے۔''
اسی وجہ سے ووگٹ لکھتا ہے کہ ''خیال رہے کہ 'اچھا آدمی' ہمدردی کا مستحق ہے، وہ اپنے اندر کے خوف کے ساتھ بری طرح دست وگریباں ہے۔ اگر وہ اسے راستہ دے دے تو سمجھو اس کا کام تمام ہوا۔ وہ جنگ ہار رہا ہے اور اپنے ہونے کے جواز، اپنی باطنی دنیا کی تباہی کے راستہ پر گامزن ہے۔''

اور اس وقت کیا ہوتا ہے جب 'اچھا آدمی' ناکام نہیں ہوتا۔ جب اس کی یکتائی دنیا تسلیم کر لیتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس سے بہت کم فرق پڑتا ہے یا بالکل کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا مسئلہ جذبات پر کنٹرول نہ ہونا اور کمتری کا احساس ہے۔ کامیابی بھی ذہن کے ان گوشوں تک نہیں پہنچتی جہاں اس مسئلہ کی جڑیں ہیں۔ اداکار پیٹر سیلرز کی سوانح '**I Love You**' سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک خاص قسم کا 'اچھا آدمی' تھا۔ سوانح اس کے بیٹے مائیکل نے لکھی ہے۔ ایک بچے کی حیثیت سے ماں نے اس کا ستیاناس کیا تھا، جوان ہوا تو خواہشات پوری نہ ہونے پر زمین آسمان ایک کر دیتا۔ ایکٹرسوں کے ساتھ کبھی ختم نہ ہونے والے معاشقے تھے، مگر بیوی کے چال چلن پر شک کیا کرتا تھا۔ دن میں کئی بار فون کر کے معلوم کیا کرتا کہ وہ گھر پر ہے یا نہیں۔ نہ ہو تو جرح کر کے اس کا ناک میں دم کر دیتا۔ وہ بھی ایکٹریس تھی مگر اس نے مجبور کیا کہ اچھی بیوی اور اچھی ماں بننے کے لیے اپنا کیریئر ترک کر دے۔ اس

کے وحشیانہ غصے اور ایکٹرسوں کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے شادی ناکام ہوگئی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ اس سے چھٹکارا چاہتا ہے۔ اس نے اسے کسی اور شخص کے ساتھ چلے جانے کے لیے کہا۔ مگر جب بیوی نے بتایا کہ وہ طلاق چاہتی ہے تو زار و قطار رونے لگا اور خودکشی کی دھمکی دی۔ (اس نے خودکشی کا ذکر پہلی بار نہیں کیا تھا بلکہ ہر جھگڑے میں اس کا سہارا لیتا تھا)

پبلک سکول یا یونیورسٹی والوں کی محبت نے اس میں احساس کمتری پیدا کر دیا تھا۔ شہزادی مارگریٹ کے ڈنر میں جب یونانی مائتھالوجی کا موضوع زیر بحث آیا تو کسی بہانے جا کر اس نے اپنی سیکرٹری کو فون کیا کہ ریفرنس کتابوں میں سے دیکھ کر وہ اس موضوع پر اسے بریف کرے۔ ڈنر پر واپس جا کر بے نیازی کے ساتھ وہ مائتھالوجی کے حوالے دیتا رہا۔ ''کئی بار میں نے اسے یہ کھیل کھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔'' اس کے بیٹے کا کہنا ہے۔

ایک اور واقعہ نارمل اور 'اچھے آدمی' کے رویہ میں فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ بچوں کی آیا مضبوط دل و دماغ اور فیصلہ کن رائے کی مالک تھی۔ ایک رات سیلر کا اس کے ساتھ اختلاف ہو گیا تو وہ تیزی کے ساتھ گھر سے باہر چلا گیا اور کلب سے بیوی کو فون کیا کہ ''میں یہاں کیا جھک مار رہا ہوں گھر سے تو آیا کو نکلنا چاہیے۔'' گھر واپس آ کر چاقو لیا اور چیختے ہوئے کہا، ''میں تمہیں مار ڈالوں گا۔'' اس کے دروازے میں چاقو مار دیا۔ آیا کھڑکی سے باہر کودی اور ان کی زندگیوں سے نکل گئی۔

گھر سے چلا جانا سیلرز کا نارمل رویہ تھا۔ آیا کو میدان جنگ میں رہنے دینا گویا اس کی راستی کا اعتراف تھا۔ کلب کے اندر اس بات پر سوچتے ہوئے اس کے جذبات مشتعل ہوتے رہے۔ گھر واپس آتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے منوا لیا کہ وہ سچا ہے اور آیا جھوٹی ہے اور غصہ میں پاگل ہوگیا۔ یہ کہ قتل کی دھمکی حقیقی تھی یا نہیں اس سوال کا جواب رہنے دیا جائے۔ 'اچھا آدمی' ہار نہیں مان سکتا۔ اسے شبہ ہو کہ اس کی دھمکی کی کوئی اہمیت نہیں تو ظاہری طور پر اسے سچ کر کے دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ووگٹ کا مشاہدہ ہے کہ 'اچھے آدمی' کی مرکزی خصوصیت ہر کنٹرول سے آزاد ہونا ہے، کسی شعبے میں خصوصی طور پر۔ مگر ہم سب کو حقیقی دنیا میں رہنے کے لیے ضبط نفس سیکھنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔ ماں باپ، بیوی بچے کے سلسلہ میں اسے شاید ہم ضروری نہ سمجھیں اور گرجنے لگیں، مگر یہاں ہم مسئلہ کی تہہ تک پہنچتے ہیں کہ کنٹرول سے باہر ہونے کا فیصلہ مستقل کمزوری کا باعث بنتا ہے 'The family Chronicle' کے مصنف اساکوف نے اپنے پرانے روسی جاگیردار دادا کی بات کرتے ہوئے اس کی صحیح مثال

دی ہے۔ ''وہ نیک اور دریا دل آدمی جس کا سیلف کنٹرول، جس کا کردار انسانی فطرت کی بلندیوں کا آئینہ دار تھا، اسے غصہ کے دَورے پڑا کرتے تھے جن کی وجہ سے وہ بہیمانہ ظلم وستم پر اُتر آتا تھا۔ مجھے اس کے ایسے ہی ایک دَورے کا حال یاد ہے جس کا تجربہ مجھے بچپن میں ہوا تھا۔ اسے اپنی ایک بیٹی پر غصہ تھا جس نے اس سے جھوٹ بولا تھا اور جھوٹ پر اڑی رہی تھی۔ دو نوکروں کی مدد سے وہ کھڑا تھا (کیونکہ ٹانگوں سے معذور تھا) وہ غصہ سے کانپ رہا تھا اور اس کی غضب ناک آنکھوں سے گویا کہ شعلے برس رہے تھے۔ 'اسے میرے حوالے کرو' وہ غرایا۔ میری دادی اس کے پاؤں پڑ گئی اور اس سے رحم اور معافی مانگنے لگی، مگر دوسرے لمحے ہی اس نے اپنی شریکِ زندگی کے بال پکڑ لیے۔ اس عرصہ میں بیٹی، اس کی بہنیں بلکہ بھائی اور اس کی بیوی بچہ بھی گھر کی جھاڑیوں میں جا کر چھپ گئے۔ سب نے رات وہیں گزاری۔ صرف نوعمر بہو اپنا بچہ لیے واپس گھر آ گئی کہ بچہ کو سردی نہ لگ جائے۔ آخرکار وہ دادی کے بال پکڑ کر گھسیٹتا ہوا تھک گیا اور تھک کر گر پڑا تو اسے گہری نیند نے آ لیا۔ صبح سو کر اٹھا تو وہ ایک مختلف آدمی تھا، خوش مزاج اور پُرسکون۔ اس نے اپنی بیٹی کو بڑے خوشگوار لہجے میں یاد کیا تو میری دادی دوڑ کر اس کے پاس گئی گویا کہ گھر میں کوئی ناخوشگوار واقعہ ہوا ہی نہ تھا۔ 'مجھے چائے دو، بچے کہاں ہیں؟ الیکسی اور اس کی بیوی کہاں ہے؟ ننھے سرگئی کو میرے پاس لاؤ۔' اب وہ اپاہج نہیں تھا، اس کا غصہ نیند اپنے ساتھ لے گئی تھی۔''

اساکوف اپنے دادا کو ایک نیک، دریا دل اور اکثر اپنے قابو میں رہنے والے شخص کی صورت دیکھتا ہے۔ یعنی وہ سیلف کنٹرول کا اہل ہے۔ مگر اپنی زندگی کے اس حصہ میں جسے خاندان کہتے ہیں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کنٹرول سے آزاد رہے گا۔ اس کی بیٹی نے جھوٹ بول کر اور جھوٹ پر اصرار کر کے اسے مشتعل کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کا احترام نہیں کرتی۔ اسے بیوقوف سمجھتی ہے۔ اس لیے وہ غصہ میں پاگل ہو جاتا ہے اور بیوی کے بال پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہے۔ اسے اپنے رویہ پر ندامت نہیں ہوتی۔ صبح کی خوش دلی سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے بارے میں اپنی اچھی رائے نہیں بدلی۔ وہ سمجھتا ہے کہ کسی غضب ناک خدا کی طرح وہ مشتعل ہونے میں حق بجانب ہے۔ نانکنگ کے جاپانی سپاہیوں کی طرح اس کا رویہ بھی مبنی برانصاف ہے۔

دلچسپ بات ہے کہ 'اچھے آدمی' کا تشدد پسند جذبہ اسے حق بجانب ہونے کا جواز فراہم کرتا ہے اور یہ جواز اس کے غصہ کو اور بھڑکاتا ہے۔ وہ ایک گرداب میں پھنس جاتا ہے

جس سے رہائی ممکن نہیں تاوقتیکہ غصہ سے نجات نہ مل جائے۔ پیٹر سیلرز کا بیٹا کہتا ہے کہ اس کا باپ گھر کی ہر چیز توڑ دیتا تھا۔ ''اچھا آدمی'' سمجھتا ہے کہ اس کا غصہ ایک طوفان ہے جسے گزر جانے دینا چاہیے، قیمت چاہے کچھ بھی ہو۔ مگر اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی خواہش کا غلام ہے جس پر اس کا بس نہیں چلتا۔ اس کی جائداد، یہاں تک کہ ان کی زندگی جن سے وہ محبت کرتا ہے، سب کچھ اس کے جذبات کے رحم و کرم پر ہے ۔ یہ اس ناقابل یقین باطنی خوف کا حصہ ہے جس کی بات ووگٹ کرتا ہے۔ اپنے جذبات میں جواز تلاش کرنے کی ذہنیت تشدد اور اس لیے جرم کی نفسیات کا بنیادی حصہ ہے۔ اس خصوصی میکانزم کو سمجھے بغیر ہم ظلم کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں یقین نہیں آتا کہ ایک ماں اپنے بچے کو مار مار کر ہلاک کرسکتی ہے، صرف اس وجہ سے کہ وہ رو رہا ہے۔ مگر سال میں ہزار بار ایسا ہوتا ہے۔ ہمیں اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ غصہ سے نڈھال ہونے والی ہے اس لیے بچہ روتا ہے تو اسے برا لگتا ہے۔ اس کا رونا اسے پاگل بناتا ہے۔ اچانک اس کا غصہ ایک معصوم ہستی کو چیختے چلاتے شیطان میں بدل دیتا ہے جس کو پیٹنا لازمی ہے۔ لگتا ہے کہ کسی ظالم پری نے جادو سے اسے بدروح بنا دیا ہے۔ ہم کہیں گے کہ ماں چڑیل بن گئی ہے مگر اس کا غصہ جادو کی طرح بچے کی شکل بدل دیتا ہے۔

لفظ جادو پہلے انہی معنوں میں (یعنی خود فریبی کی ایک صورت) سارتر کی ایک تصنیف **A Sketch of Theory of Emotions** میں شائع ہوا تھا۔ بعد کی تحریروں میں سارتر نے خود فریبی کو ترجیح دی مگر بعض دوسرے طریقوں سے جادوئی سوچ **magical thinking** کی بہتر وضاحت ہوتی ہے۔ میلکم میگرج نے ایک اخباری رپورٹ کے حوالے سے ایشیا میں برتھ کنٹرول کے متعلق لکھا ہے کہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے بے پڑھی لکھی کسان عورتوں کو چند ڈوریاں بھیجیں جن میں اٹھائیس پتھر ہر ڈوری میں لگے ہوئے تھے۔ پتھروں کی ظاہری شکل موتیوں جیسی تھی، ہر ڈوری میں سات پتھر چار مختلف رنگوں میں پروئے گئے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ ہر روز ایک پتھر کو دوسری طرف کردیں۔ کئی عورتیں سمجھیں کہ پتھروں میں کوئی کرشمہ ہے۔ اس لیے ہر روز ایک پتھر ادھر سے ادھر کرتی رہیں تاکہ انہیں وہ راس آئیں۔

یہ جادوئی سوچ ہے۔ ایسے جذبات و خواہشات کو اپنے اوپر حاوی ہونے دینا جنہیں ہماری عقل (استدلال) رد کرتی ہے۔ 1960ء میں پیٹرک بائر نامی ایک مزدور عورتوں کے ہوسٹل میں داخل ہوا اور کئی عورتوں پر حملہ آور ہوا، جن میں سے ایک عورت کا سر

اس نے کاٹ دیا۔ اپنی صفائی میں اس نے کہا کہ ''چونکہ عورتیں میرے لیے جنسی ٹینشن کا باعث بنتی ہیں اس لیے میں نے ان سے انتقام لیا ہے۔'' یہ بھی جادوئی سوچ (magical thinking) ہے اسی طرح چارلس مینسن کا یہ کہنا کہ 'ویت نام پر بم برسانے کا ذمہ دار معاشرہ ہے اس کے لیے میں مجرم نہیں ہوں'؛ سارتر ایک لڑکی کی مثال دیتا ہے جس پر ایک مرد حملہ کرنے والا ہے، وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ یہ اسے بھگانے کے لیے ایک جادوئی کوشش ہے۔ اس لحاظ سے یہ اچھی مثال ہے کہ یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ 'جادو' ایک خالص جسمانی ردعمل بھی ہوسکتا ہے۔ جادوئی سوچ ''اچھے آدمی'' کو سمجھنے کے لیے ایک کنجی کا حکم رکھتی ہے۔

''اچھا آدمی'' کی کیا بنیاد ہے؟ فان ووگٹ کا کہنا ہے کہ اس کی بنیاد دنیا پر ہمیشہ مردوں کی حکومت ہے۔ 1961ء میں اٹلی کے اندر زنا کے جرم میں دو عورتوں کو سزائے قید ہوئی تو انہوں نے اپنی صفائی میں کہا کہ ان کے شوہر بھی تو داشتائیں رکھتے ہیں جیسا کہ اکثر اطالوی مردوں کی داشتائیں ہوتی ہیں۔ عدالت نے ان کے مؤقف کو ماننے سے انکار کر کے اپیل خارج کر دی۔ 1950ء کے چین میں عورتوں کو مزید آزادی دینے کے لیے قوانین بنائے گئے۔ 1954ء میں صرف ایک ضلع کے اندر دس ہزار بیویاں شوہروں کے ہاتھوں ماری گئیں جو نئے قانون سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں۔

اس وضاحت کے معنی ہوئے کہ دنیا میں 'اچھی عورت' نام کی کوئی چیز نہیں۔ مگر یہ بات نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ 'اچھا آدمی' کے مقابلہ میں بہت کم اچھی عورتیں ہوں مگر ہیں تو سہی۔ روسی ناول نویس تورگنیف کی ماں اپنے کئی مزارعوں کو تازیانے مار کر ہلاک کر دیتی تھی۔ جو جادوئی غصہ کے انتقال کی واضح مثال ہے۔ الزبتھ ڈنکن کیلیفورنیا کی ایک مطلقہ عورت اس بات پر سیخ پا تھی کہ اس کے بیٹے نے اس کی مرضی کے خلاف اولگا نامی نرس سے شادی کر لی۔ اس نے کرائے کے دو قاتلوں کے ذریعہ نرس کو قتل کروا دیا مگر قاتلوں نے جب معاوضہ طلب کیا تو وہ پولیس کے پاس چلی گئی اور قاتلوں پر بلیک میل کا الزام لگایا جس کے نتیجہ میں تینوں نے سان کوئنٹین کے گیس چیمبر میں موت کی سزا پائی۔ یہ بھی جادوئی یعنی غیر حقیقت پسندانہ فکر کی واضح مثال ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ''اچھی عورت'' کے کردار کی مرکزی خصوصیت بھی وہی ہے جو ''اچھا آدمی'' کے کردار کی ہے۔ اور یہ کہ وہ بھی سمجھتی ہے کہ اپنی مرضی کرنا فطرت کا قانون ہے۔ جو اس کی مخالفت کرے اسے بدترین سزا ملنی چاہیے۔ یہ دیوی اور دیوتا کا مسئلہ (syndrome) ہے۔ فان ووگٹ کا خیال ہے کہ ایڈلر کی 'عضوی شرابی' کے متعلق تھیوری

شاید 'اچھا آدمی' کو سمجھنے میں مدد دے۔ ایڈلر کا کہنا ہے کہ اگر کوئی عضو مثلاً دل، جگر یا گردے ابتدائی عمر میں بیمار یا خراب ہوئے ہوں تو اس کا اثر دماغ پر پڑتا ہے اور انسان احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ فان ووگٹ کہتا ہے کہ اس طرح کمی کو پورا کرنے کا مبالغہ آمیز جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہتا ہو مگر اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ 'اچھا آدمی' ہونا کلر بلائنڈ یا دمہ کا مریض ہونا ہے۔ اور یہ کہ اس کی وضاحت خالص میڈیکل تراکیب (**terms**) سے ہو سکتی ہے اور ایک بات جو ہر 'اچھا آدمی' کے حالات زندگی سے واضح ہے کہ 'اچھا آدمی' کا وار ناگزیر نہیں ہوتا ان کے بعض سیاہ کارنامے بڑی مہارت سے پلان ہوتے ہیں اور بڑے عزم سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ 'اچھا آدمی' اس لیے ایسا کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح اسے اپنے ارادے پورے کرنے کا موقع ملے گا جو اس کا حقیقی مقصد ہے۔

اور اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ 'اچھا آدمی' کا مسئلہ غالب اور بالادست لوگوں کا مسئلہ ہے۔ غلبہ حیاتیات اور زولوجی کے ماہرین کے لیے بڑی اہمیت اور دلچسپی کا حامل ہے۔ کیونکہ انسانوں یا زور آور جانوروں کی شرح حیرت انگیز طور پر مستقل ہے۔ جارج برنارڈ شا نے ایک کوہ پیما ایچ ایم سٹینلے سے پوچھا کہ اگر تم بیمار ہو جاؤ تو ایسے لوگ کتنے ہیں جو **Expedition** (مہم) کے لیڈر کی حیثیت سے تمہاری جگہ لے سکیں۔ سٹینلے نے فوراً جواب دیا کہ بیس میں سے ایک۔" "اندازاً یا ٹھیک؟" شا نے پوچھا، جواب ملا "ٹھیک۔" حیاتیاتی حلقوں نے اس کی تصدیق کر دی۔ عجیب بات ہے، پانچ فیصد— بیس میں سے ایک— جانوروں کی ہر قسم میں لیڈرشپ کے اہل ہیں۔ کوریا کی جنگ میں چینیوں کو یہ دلچسپ تجربہ ہوا کہ اگر وہ پانچ فیصد سرکش امریکی جنگی قیدیوں کو الگ کر دیں اور انہیں علیحدہ کمپاؤنڈ میں رکھیں تو باقی **95** فیصد فرار ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔

یہ ایک ایسی بات ہے جسے بیکر کے اس نظریہ پر غور کرتے ہوئے بھولنا نہیں چاہیے کہ ہر انسان ہیروازم کا اور قیادت کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس خواہش کی پذیرائی ہمارے معاشرہ میں مشکل نظر آتی ہے جہاں لوگوں کی کثرت مانتی ہے کہ انہیں قیادت کا شوق ہے نہ وہ اس کے اہل ہیں۔ بیکر کے مطابق اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہمارا قیادت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ مگر جس شخص نے اپنے بچوں کے انتظار میں کسی نرسری سکول کے باہر دس منٹ بھی گزارے ہوں وہ جانتا ہے کہ بچوں کی اکثریت اپنے اندر قیادت کے فقدان سے باخبر ہے۔ قیادت کے اہل پانچ فیصد لوگوں والا فارمولا بچوں پر بھی اسی طرح

صادق آتا ہے جیسے بڑوں پر۔

جہاں تک معاشرے کا تعلق ہے۔ پانچ فیصد شرح بڑی ڈراؤنی ہے۔ انگلستان کی مثال سامنے رکھیں تو 1980ء کے عشرہ میں پانچ فیصد کے حساب سے قیادت پسند لوگوں کی تعداد تیس لاکھ تھی۔ مگر معاشرے میں تیس لاکھ لیڈر کیونکر سماتے۔ اتنی جگہ کہاں تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ پانچ فیصد قیادت پسند لوگوں میں سے ایک بڑی تعداد کا خواب، بڑائی اور یکتائی کا خواب پورا نہیں ہوسکتا۔ انہیں اپنی زندگی ان کے ساتھ گزارنی ہے جن کا مسئلہ قیادت نہیں۔

ایک معاشرہ جو کسانوں اور رؤسا، غریب اور امیر پر مشتمل ہو، جس کا کلاس سٹرکچر مضبوط ہو، ایسے معاشرہ میں اس کی اہمیت نہیں۔ غالب کھیت مزدور لوہار بننے پر قناعت کر لے گا، اسے یہ توقع نہیں کہ وہ جاگیروں اور حویلیوں کا مالک بن جائے گا اور وہ اس بات کی بھی پروا نہیں کرتا کہ جاگیروں کا مالک اس سے کمتر شخصیت رکھتا ہے۔ مگر ہمارے جیسے معاشرے میں جہاں محنت کش بچے فلمی ہیرو بننے کے خواب دیکھیں اور جہاں ہر روز ہم اپنے لیڈروں کو ٹیلی ویژن پر دیکھیں، حالات بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ پانچ فیصد سے متعلق افراد کو ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ کیوں نہ مشہور اور دولت مند ہوں۔ انہیں اپنی حالت پر غصہ، مایوسی اور دکھ ہوتا ہے چنانچہ وہ اوروں کو کہنی مار کر، دھکا دے کر ان سے آگے نکلنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ یہی ذہنیت معاشرے میں جرم اور تشدد کی بنیاد بنتی ہے۔

ہم یہ اندازہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان غالب افراد میں سے کتنے افراد 'اچھا آدمی' بنتے ہیں۔ پانچ سو طلبا کے ہر اسکول میں پچیس ایسے طالب علم ہوتے ہیں جو ٹاپ کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں قدرتی خوبیاں ہوتی ہیں کہ وہ اچھے کھلاڑی ہیں، اچھے طالب علم ہیں، ڈبیٹر ہیں۔ (اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو غالب تو نہیں ہوتے مگر کچھ انعامات لے جاتے ہیں) یہ بات بھی ناگزیر ہے کہ بعض غالب طلبا میں کوئی جوہر اور خوبی نہ ہو بلکہ بعض بالکل احمق ہوں۔ ایسا لڑکا اپنی برتری کی خواہش کیونکر پوری کر سکتا ہے۔ قدرتی طور پر وہ اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ آزمائے گا۔ اگر صورت شکل اچھی پائی ہے تو لڑکیوں کی توجہ سے اسے تسکین حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر اس میں کوئی ٹیلنٹ ہے مثلاً موسیقی کا ذوق، مشاہدہ کی صلاحیت، اعلیٰ تخیل جن کی اہمیت سے اس کے استاد بے نیاز ہیں تو وہ اپنے ماحول میں تنہا ہو جاتا ہے اور اپنی دنیا الگ بسا لیتا ہے۔ ایسا طالب علم ممکن ہے کہ شوبرٹ، ڈارون، بالزاک بن جائے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کامیابی کے لیے کوئی شارٹ کٹ

تلاش کر لے اور غنڈہ، ٹھگ یا قاتل بن جائے۔

ان 'بے ہنر اجنبیوں' کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ بے انصافی کے خلاف نارمل انسانی ردعمل خود رحمی ہے۔ خود رحمی اور بے انصافی کا احساس انہیں کمزور کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ خود اپنے بدترین دشمن بن جاتے ہیں۔ ان کے مزاج میں زود رنجی اور جارحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ بھی ان سے دور ہو جاتے ہیں جو عام حالات میں شاید ان کے کام آ سکتے۔ اگر ان میں کوئی دل کشی یا ذہانت ہو تو اوروں کے ساتھ ان کا نباہ ہو سکتا ہے۔ مگر جلد یا بدیر خود رحمی اور بیزاری ظاہر ہونے لگتی ہے۔ جس سے بد اعتمادی اور دوری پیدا ہوتی ہے۔

ضبط نفس (سیلف ڈسپلن) ان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ غالب انسان اوروں سے زیادہ بے صبر ہوتے ہیں کیونکہ ان میں اوروں سے زیادہ قوت اور توانائی ہوتی ہے۔ بے صبری کی وجہ سے وہ شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ پیٹر سیلرز بآسانی ریس کلب سے اپنی بیوی کو فون کر سکتا تھا کہ آیا کو مہینہ کی تنخواہ دے کر فارغ کر دو اور پھر مزے سے سو جانا مگر اس نے غلط رستہ اختیار کیا جو کسی کے لیے بھی گمبھیر مسئلہ بن سکتا تھا۔ یہ بات بآسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اگر پیٹر سیلرز کی زندگی پانچ سال کی عمر سے ایسے ہی شارٹ کٹ پر مبنی رہی تھی تو بالغ ہو کر اس نے معاشرہ کے ایک نارمل رکن کی حیثیت سے زندگی کا سامنا کیونکر کیا ہو گا۔ فرائیڈ نے کہا ہے کہ تہذیب اپنے اراکین سے سیلف ڈسپلن کا تقاضا کرتی ہے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنے چاقو کی چمک اور تیزی سے ڈراتا پھرے۔

یہ سب باتیں ہمیں اس پوزیشن میں لے آئی ہیں کہ ہم ایرک فرام کے اس سوال کا جواب دے سکیں کہ کسی وجہ کے بغیر انسان انسانوں کو کیوں قتل کرتے اور اذیت دیتے ہیں۔ ایسا کرنے والی واحد مخلوق انسان ہیں۔ اس کا جواب نسلی وراثت ہے نہ موت کی خواہش بلکہ اپنے آپ کو منوانے کا فتنہ ساماں جذبہ ہے۔ ''اچھا آدمی'' کے رویہ سے ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ اس کا یہ احساس کہ میں اوروں سے بڑھ کر ہوں، اس کے پُرتشدد رویہ کا باعث ہوتا ہے۔ مگر یہ تشدد کسی طور پر دور رَس مقاصد پورے نہیں کر سکتا۔ بیتھو ون نے ایک بار سوپ ڈش ایک ویٹر کے منہ پر اس لیے دے ماری کہ وہ اسے ناپسند کرتا تھا۔ ''اچھا آدمی'' کی مخصوص بدسلوکی۔ مگر بیتھو ون نے اپنی یکتائی کے لیے تشدد کا سہارا نہیں لیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد صرف صبر اور سیلف ڈسپلن سے حاصل کر سکتا ہے یعنی اپنی صلاحیتوں کو ایک سمت دے کر (بے

صبری کا ایک اور نام) انہیں اپنے فن میں سمو کر وہ سرخ رُو ہو سکتا ہے۔ اس کے صبر آزما ڈسپلن نے اس کی صلاحیتوں کو نکھارا، انہیں گہرائی دی اور اس کی توانائی شمہ بھر بھی ضائع نہ ہوئی۔'اچھا آدمی' مشتعل اور بدحواس ہوتا ہے جب اس کی ساری صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اسی نازک لمحہ میں اسے تشدد کی سوجھتی ہے۔ چنانچہ اپنے منفی جذبات کو راہ دیتے ہوئے وہ اپنی تباہی کے سست رو مگر یقینی عمل میں الجھ جاتا ہے۔ جو بے ضابطگی اور بدنظمی کا جذباتی بدل ہے۔ اپنے دلی جذبات کا اظہار نہ کرنے سے گھٹن پیدا ہوتی ہے۔ اندر زہر پھیلنے لگتا ہے اسی لیے سکندر اعظم سے سٹالین تک تاریخ کی اکثر تشدد پسند شخصیتوں کا انجام ذہنی فتور اور خرابی ہے۔ اپنے اوپر قابو نہ ہونے سے ان کے منفی جذبات کھل کھیلتے ہیں اور کسی تعمیری رجحان کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔

اگر ہمیں جرائم کی نوعیت کو سمجھنا ہے تو مسئلے کی گہرائیوں یعنی خود تباہی کی نفسیات کو سمجھنا چاہیے، اس کی تہہ تک پہنچنا چاہیے۔

خودتباہی کی نفسیات

مارچ 1981ء میں نارمن میلر نے ایک سزا یافتہ قاتل کے خطوط پر مشتمل کتاب کا تعارف لکھا۔ قاتل جیک ہنری ایبٹ نے اپنی کتاب In the Belly of the Beast کے متعلق جیل سے نارمن میلر کو خط لکھا تھا۔ خطوط سے نارمن میلر کو اندازہ ہوا کہ تشدد کے بارے میں ایبٹ کوئی اہم رائے دے سکتا ہے۔ 37 سال کی عمر میں سے ایبٹ اپنے 25 سال جعل سازی، ڈاکہ اور قتل کے الزام میں جیل میں گزار چکا تھا۔ قید تنہائی میں اس نے تاریخ اور ادب پڑھا اور کمیونسٹ بن گیا۔ میلر نے جیل کے حکام کو یقین دلایا کہ ایبٹ میں ایک اچھا امریکی لکھاری بننے کی خوبیاں موجود ہیں اور وہ قلم کے ذریعہ اپنی روزی کما سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے اسے پیرول پر رہا کر دیا گیا۔ اس کی کتاب شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ چند ہفتے بعد نیویارک کے ایک ریسٹورنٹ میں ایک ویٹر (جو کبھی ایکٹر تھا) رچرڈ ایڈنن کے ساتھ اس کا جھگڑا اُس وقت ہوا جب ایڈنن نے اسے سٹاف ٹائیلٹ میں جانے سے روکا۔ اس وقت ایبٹ نے پُرسکون لہجے میں ایڈنن سے باہر نکلنے کو کہا تاکہ جھگڑا باہر جا کر طے کریں۔ باہر جا کر اس نے چاقو نکالا اور ایڈنن کے دل میں گھونپ دیا۔ کئی ماہ کی روپوشی کے بعد وہ بالآخر گرفتار ہوا۔ اب وہ اپنی زندگی کے باقی دن جیل میں گزارے گا۔

قتل کی واردات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر ایڈنن کے ساتھ ایبٹ کی ہاتھا پائی ہوتی اور وہ طیش میں آ کر ایڈنن کو چاقو مار دیتا تو یہ بات بآسانی سے سمجھ میں آ جاتی۔ دراصل ایبٹ کو تشدد کی عادت تھی۔ مگر جب وہ ایڈنن کو لے کر ریسٹورنٹ سے باہر آیا تو جانتا تھا کہ وہ ایڈنن کو قتل کرے گا۔ اسے یہ بھی احساس ہوگا کہ جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے اسے ضائع کرنے لگا ہے۔ تاہم یہ الفاظ اس شخص کے ہیں کہ کئی سال سے مجھے فرار ہونے کی عادت پڑ گئی ہے۔

فرار ہونا میری زندگی کا معمول ہے۔ میں جہاں بھی بھیجا جاؤں میری آنکھیں، میرا دماغ میرے بھاگ نکلنے کے راستے تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

ایبٹ کی تصنیف حوصلہ شکن ہے۔ مگر اس کے ساتھ میلر کی ہمدردی آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ فوسٹر ہوم میں بچپن گزارنے کے بعد (اس کے والدین نے اس سے شاید کنارہ کر لیا تھا) بارہ سال کی عمر میں اسے ریفارمیٹری میں بھیجا گیا کیونکہ وہ فوسٹر ہومز میں ایڈجسٹ نہیں کر سکا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں جعلی چیک بنانے کے جرم میں اسے جیل بھیج دیا گیا۔ جیل سے بھاگ کر اس نے ایک بنک میں ڈاکہ ڈالا۔ جس کی پاداش میں ایک دفعہ اور سزا ہوئی۔ جب اس نے اپنے ایک ساتھی قیدی سے لڑتے ہوئے اسے قتل کر دیا تو چودہ سال مزید سزا ہوئی۔ مایوسی اور غصہ سمجھ میں آتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ''وہ تمام دن قید خانے کی دیواروں سے لڑتا اور غصہ سے چیختا رہتا تھا۔'' غصہ میں میرا اتنا برا حال ہو جاتا کہ پرسکون حالت میں بھی میں بمشکل بات کر سکتا تھا۔ چلتے ہوئے بری طرح لڑکھڑاتا، میں گارڈ کے منہ پر کھانے سے بھری ٹرے دے مارتا۔ جب اسے دوسرے قیدی کو قتل کرنے کے جرم میں سزا سنائی گئی تو اس نے پانی کا جگ جج کے منہ پر پھینک کر اسے تربتر کر دیا۔ ''چھوٹی بڑی جیلوں کے ملازم میرے ساتھ نہایت سختی سے پیش آتے ہیں، میرے دل میں ان کے خلاف گہری اور سلگتی ہوئی نفرت کے سوا کچھ نہیں۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ میرے ساتھ کتنی بدسلوکی کرتے ہیں۔ اگر میں ذرّہ بھر بھی کمزور ہوتا تو وہ میرا نام ونشان مٹا دیتے۔'' مگر یہ کہنا کہ تشدد شدید دباؤ کا نتیجہ تھا اس کی اس ذہنیت کی وجہ سے غلط ہے جس کے ذریعہ وہ مجرم کو ایک رومانوی کردار بناتا ہے۔ اس کی اور بھی بعض وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مثلاً وقار، نیکی اور عزت کا مبالغہ آمیز احساس اور تشدد و طاقت کے لیے ہماری قدرتی خواہش بھی اس میں شامل ہے۔ اسی کے ذریعہ ہم دوسروں پر یعنی دنیا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ خطرناک قاتل جو جذبات سے عاری اور تنہا ہو کر قتل کرتے ہیں۔ جو منصوبہ کے ساتھ اور اصولوں کے نام پر قتل کرتے ہیں، وہ قانون کی پکڑ سے اکثر بچ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ مجرم کی مردانگی کا اعلیٰ ترین کتابی تصور ہے۔ مگر مردانگی کا یہ تصور بچکانہ ہے۔ اسکول کے بچوں کے تصور جیسا ہے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی مردانگی کی بات محض رومانی بکواس ہے۔ سڑک پر ایک ویٹر کی لاش شاید ہی فخر کی بات ہو، شاید یہی نیکی، عزت اور مردانگی کا ثبوت ہو۔ کسی ننھے بچے کا گلا گھونٹ دینا بھی اتنا ہی بہادری کا کام ہے جتنا کہ رچرڈ ایڈنن کو قتل کرنا ہے۔

قتل وتشدد اس وقت سمجھ میں آتے ہیں جب ہم تشدد پسند آدمی کے متعلق ووگٹ کی بات یاد کرتے ہیں کہ وہ ایک خاص علاقہ میں کنٹرول سے باہر ہوگا۔ یہ اس کا فیصلہ ہے اور اسی پر وہ عمل کرتا ہے۔ ایبٹ نے فیصلہ کیا کہ اس کے لیے کنٹرول سے آزاد علاقہ اپنی بڑائی کے احساس کا مجروح ہونا ہے۔ (اور کوئی شک نہیں کہ ناول Two Women کی موجودگی سے اس فیصلہ کو مزید تقویت ملی) غرضیکہ ہم ایک بار پھر جادوئی سوچ کے دائرہ میں واپس آ گئے ہیں۔ ایسی سوچ کہ جس کے ذریعہ جذبات کو حقیقت کا حلیہ بگاڑنے کی کھلی اجازت ہوتی ہے۔ 'جادوئی سوچ' کا نتیجہ غلط قدم اٹھانا ہے، جس سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ جیسے شترمرغ ریت میں سر دے کر سمجھتا ہے کہ دشمن دفع ہو گیا ہے۔ 'جادوئی سوچ' لایعنی اور کسی حد تک مزاحیہ ہوتی ہے، جیسے برنارڈ شا نے اپنے والد کا حال بتایا ہے کہ ایک بغل میں بطخ، دوسری بغل میں باجا اور گیٹ سمجھ کر باغ کی دیوار سے سر مارنا اور یہی کرتے ہوئے اپنی لمبی ٹوپی کو باجہ سا بنا دینا صرف دیکھنے والوں کے لیے کامیڈی ہے، مگر دیوار سے سر مارنے والے آدمی اور کھڑکی کے شیشہ سے بار بار ٹکرانے والی شہد کی مکھی کی حالت بہت مختلف اور سنگین ہے۔ ایک طرح سے شہد کی مکھی کا یہ عمل بالکل صحیح ہے کہ وہ روشنی کی سمت جاتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسا نہ کرے کہ یہ اس کی بنیادی فطرت ہے۔ مگر وہ غلطی پر ہے، کیونکہ روشنی ٹھوس اشیا میں سے نہیں گزرتی۔ اگر اسے اپنا مقصد حاصل کرنا ہے تو اپنی سمت بدلنا ہوگی۔ مگر شہد کی مکھی کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ لاکھوں برس سے اس کے جینے کا یہی انداز ہے اور اپنی فطرت بدلنا اس کے بس میں نہیں۔

مگر انسان سمت بدل سکتے ہیں۔ اس لیے کہ تشدد پسند انسان کا رویہ لایعنی اور مبہم ہوتا ہے۔ وہ شیشہ توڑ کر اس میں سے گزرنا چاہتا ہے یا اس کوشش میں اپنے آپ کو برباد کر لیتا ہے۔ پھر بھی وہ اسے بربادی نہیں کہتا کیونکہ اسے اپنی جرأت کے متعلق بڑی خوش فہمی ہوتی ہے۔ تشدد پسند انسان کا مسئلہ اس کی اپنی منطق ہے۔ اپنی زندگی کے متعلق اس کا رویہ ہے۔ شہد کی مکھی کی طرح وہ بھی سمجھتا ہے کہ کھڑکی کا شیشہ چونکہ نظر نہیں آتا اس لیے اس کا کوئی وجود نہیں۔ وہ غیر حقیقی ہے۔

ایبٹ نے جن لوگوں کے نام اپنی کتاب منسوب کی ہے ان میں اکثر 'مجرم باغی' ہیں۔ اس فہرست میں پہلا نام کارل پینزم کا ہے جس کی زندگی خود تباہی کی منطق کی مثال ہے۔ ایبٹ کی طرح پینزم بھی جیل جا کر لکھاری بن گیا۔ مگر 1928ء میں اس کی خودنوشت

سوانح پبلک کے لیے بھیانک سمجھی گئی۔ چنانچہ بیس برس سے زیادہ انتظار کے بعد وہ آخر چھپ کر شائع ہوئی۔ پینزم نقب زنی کے مقدمہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے اعتراف سے پتہ چلا کہ وہ امریکا میں جرائم کی تاریخ کے بدترین قاتلوں میں سے ایک ہے۔ عجیب بات ہے کہ ان قاتلوں میں سے اکثر نے کسی مقصد کے بغیر قتل کیے۔ پینزم نے سماج سے انتقام لینے کی غرض سے قتل کیے۔ پینزم کے بنیادی فلسفہ کی رُو سے زندگی ایک بڑا مذاق ہے اور اکثر لوگ اتنے احمق اور کرپٹ ہیں کہ انہیں زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ دیوار سے سر مارنے والوں میں سے اس کی مثال کلاسیک ہے۔ اس کا باپ کسان تھا کارل بچہ ہی تھا کہ اس کے باپ نے اپنے خاندان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ گیارہ سال کی عمر میں اس نے ایک آسودہ حال ہمسایے کی چوری کی تو اسے ریفارم سکول میں بھیج دیا گیا جہاں باغیانہ مزاج کے اس لڑکے کو شدت سے پیٹا گیا۔ اس لیے کہ وہ غالب مرد تھا جس کی وجہ سے ناانصافی کا بدلہ لینے کی خواہش اس میں اور گہری ہوگئی۔ اس نے مشہور پینٹر گاگین کی بات سچ مان لی تھی۔ ''زندگی جیسی کہ ہے، انسان اس سے بدلہ لینے کے خواب دیکھتا ہے۔''

مال گاڑی میں سفر کرتے ہوئے پینزم کو چار قلیوں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ اس تجربہ سے اسے جارحیت کے نئے انداز سوجھے۔ ''جب کبھی میرا سامنا کسی قلی سے ہوتا میں اسے پتلون اتارنے اور ہاتھ کھڑے کرنے کے لیے کہتا۔ وہ بوڑھا ہو کہ جوان، لمبا ہو کہ پستہ قد، کالا ہو کہ گورا میں اس پر سواری کرتا، جب ایک بریک مین نے پینزم اور دو قلیوں کو ریلوے ٹرک میں پکڑا تو پینزم نے فوراً ریوالور نکال لیا اور اسے ریپ کیا۔ قلیوں کو بھی گن پوائنٹ پر اس نے ایسا ہی کرنے کو کہا۔ اپنے طریقے سے وہ دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے۔

پینزم زندگی بھر لوٹ مار اور چوریاں کرتا رہا۔ اس نے کلیساؤں کو بھی لوٹنے سے گریز نہیں کیا۔ اس نے جیل میں بہت وقت گزارا مگر ایک ماہر مفرور بن گیا۔ وفاداری کے متعلق اس کا اپنا ہی مخصوص تصور تھا۔ سیلم میں جیل توڑ کر فرار ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر جیل توڑ کر اندر آیا تاکہ کال جورڈن نامی قیدی کو بچانے کی کوشش کرے جسے ایک مہینہ کی سزائے قید ہوئی تھی۔ ''بوڑھے کال نے میرا شکریہ اس طرح ادا کیا کہ وہ سمجھا کہ میں اس کی محبت میں مبتلا ہوں۔ اس لیے مجھ پر سوار ہونے کی کوشش کی۔ مگر اس میں سوار ہونے کی طاقت نہیں تھی۔ جبکہ میں سوار ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں اس پر سوار ہوا۔ وہ پچاس برس کا تھا اور میری عمر بیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ کمزور اور میں طاقتور تھا۔

مختلف جیلوں میں اسے بدترین مفسد کے طور پر جانا گیا۔ ناانصافی کے احساس کی بنا پر وہ اکثر تشدد پر اتر آتا۔ ریاست اوریگن میں اس سے کہا گیا کہ اگر وہ مال مسروقہ کا پتہ بتا دے تو اسے بہت کم سزا دی جائے گی۔ اس نے نہیں بتایا۔ اسے سات سال کی سزائے قید دی گئی۔ وہ اپنی کوٹھڑی سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے جیل کے فرنیچر کو آگ لگا کر اسے تباہ کر دیا۔ جیل کے حکام نے اسے بری طرح مارا اور ریاست کی سب سے سخت جیل میں بھیج دیا۔ وہاں اس نے جاتے ہی کوئی برتن گارڈ کے منہ پر مار دیا تو اسے مار مار کر بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے پر اسے ایک مہینہ کے لیے زنجیروں سے کال کوٹھڑی کے ساتھ باندھ دیا گیا جہاں وہ مزاحمت میں گالیاں بکتا رہا۔ اس نے فرار ہونے میں ایک اور قیدی کی مدد کی جس کا پیچھا کرتے ہوئے وارڈن کو گولی مار دی گئی۔ نیا وارڈن سب سے زیادہ سخت مزاج تھا۔ پینزم نے جیل کی ورکشاپ کو اور بعد میں فلیکس مل کو جلا دیا۔ اسے کچن میں کام دیا گیا تو وہ چھری دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ اس نے دوسرے قیدیوں کو بغاوت پر اکسایا تو ماحول میں اتنا تناؤ اور اشتعال آ گیا کہ پہرے داروں نے مداخلت نہ کی۔ آخرکار وارڈن برطرف کر دیا گیا۔

مرفی نامی نیا وارڈن آئیڈیلسٹ تھا۔ اسے یقین تھا کہ قیدی نرمی سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب پینزم فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا تو وارڈن نے اسے بلا کر بتایا کہ اپنی رپورٹس کے لحاظ سے وہ نہایت کمینہ، بزدل اور گرا ہوا شخص ہے، جس کا ثانی شاید ہی کہیں ہو۔ جب پینزم نے اس سے اتفاق کیا تو مرفی نے اسے یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ وہ اسے جیل سے باہر جانے دے گا، اگر وہ قسم کھائے کہ شام کے کھانے پر واپس آ جائے گا۔ پینزم نے وعدہ وفا کرنے کے ارادے بغیر وعدہ کر لیا۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو کسی چیز نے اسے واپس بھیج دیا۔ آہستہ آہستہ مرفی دوسرے قیدیوں اور پینزم کی آزادی میں اضافہ کرتا رہا۔ مگر ایک رات پینزم ایک حسین نرس کے ساتھ شراب پیتا ہوا بہک گیا اور بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فائرنگ کے دوران گرفتار ہوا تو اسے عقوبت خانہ میں پھینک دیا گیا اور مرفی کی انسان دوستی کا دور اچانک ختم ہو گیا۔

یہ تجربہ کسی حد تک فیصلہ کن تھا۔ اب تک پینزم دنیا کے خلاف تھا۔ اپنے خلاف نہیں تھا۔ مرفی کے ساتھ دغا کرنے کے بعد وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ وہ جیل سے ایک بار اور بھاگ گیا اور کہیں سے ایک موٹر بوٹ چرا لی اور قتل و غارت میں لگ گیا۔ وہ ملاحوں کو ملازمت کا لالچ دے کر موٹر بوٹ میں بلا لیتا۔ ان کے ساتھ بدفعلی کرتا اور انہیں

سمندر میں پھینک دیتا۔ پھر وہ مغربی افریقا کی کسی تیل کمپنی میں کام کرنے لگا۔ مگر ٹیبل ویٹر کے ساتھ بدفعلی کے جرم میں جلد ہی نکال دیا گیا۔ امریکی ہائی کمشنر نے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تو وہ باغ میں جا کر بیٹھ گیا اور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ ''میں بیٹھا ہوا تھا کہ گیارہ بارہ برس کا ایک سیاہ فام لڑکا اچھلتا کودتا ہوا وہاں آ گیا۔ وہ کسی چیز کی تلاش میں تھا اور وہ شاید اسے مل بھی گئی تھی۔ میں اسے ایک طرف لے گیا اس کے ساتھ بدفعلی کر کے اسے قتل کر دیا۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا۔ اس وقت اس کا مغز اس کے کانوں سے بہہ رہا تھا۔

''پھر میں شہر گیا اور بلجین سٹیمر کا ٹکٹ ساحل کے قریب خلیج لوبیٹو جانے کے لیے خریدا۔ وہاں میں نے ایک ہلکی کشتی کرائے پر لی۔ چھ سیاہ فام آدمی بھی کرائے پر ساتھ لیے اور خلیج میں شکار کرنے چلا گیا۔ میں مگرمچھ کی تلاش میں تھا۔ جلد ہی میں نے انہیں ڈھونڈ لیا، وہ سب بھوکے تھے۔ میں نے ان تمام سیاہ فام آدمیوں کو گولیاں ماریں اور ان کی لاشیں کشتی سے باہر پھینک دیں۔ باقی کام مگرمچھوں نے کیا۔ میں نے ان کی کشتی بھی چرا لی اور شہر واپس چلا گیا اسی رات کسی نے وہ کشتی چرا لی۔''

امریکا واپس آ کر اس نے مزید تین لڑکے ریپ کرنے کے بعد قتل کر دیے جس سے قتل ہونے والوں کی تعداد بیس ہو گئی۔ پانچ برس قتل، ریپ اور ڈاکہ زنی کے بعد پینزم نیویارک میں ایکسپریس آفس کو لوٹتے ہوئے پکڑا گیا تو اسے امریکا کی ایک بدترین جیل میں بھیج دیا گیا۔ مجھے ہر شخص سے نفرت تھی۔ نتیجہ اور زیادہ ضد، اور زیادہ مار۔ ایک ضدی اور ڈھیٹ بچے کی طرح اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ سماج چاہے اسے کتنی ہی مار مارے وہ اس کا مقابلہ کرے گا۔ ڈینی مورا جیل میں ایک اونچی گیلری سے کود کر اس نے اپنی ٹانگ توڑ لی اور باقی زندگی لنگڑا کر چلتا رہا اور تمام بنی نوع انسان سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ ریل کی سرنگ بھک سے کیسے اڑائی جائے۔ جب ریل اس میں سے جا رہی ہو۔ واٹر سپلائی میں آرسینک ڈال کر کیوں نہ سارے شہر کے پانی میں زہر گھول دیا جائے۔ بلکہ امریکا کے سمندر میں لنگر انداز برطانوی جنگی جہاز تباہ کر کے امریکا اور برطانیہ میں جنگ کیسے شروع کرائی جائے۔

جیل کے انہی دنوں میں پینزم کی ملاقات ایک نوجوان یہودی گارڈ ہنری لیسر سے ہوئی۔ لیسر ایک شرمیلا نوجوان تھا اور جیل کی ڈیوٹی اس لیے دیتا تھا کہ گارڈ کی باحیثیت پوزیشن سے اس کے احساس کمتری میں کمی آتی تھی۔ لیسر اس کی سرد مہری اور الگ تھلگ

رہنے کی عادت سے متاثر تھا۔ لیسر نے جب اس سے پوچھا کہ تمہارا ریکٹ یعنی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟ ''لوگوں کی اصلاح کرنا۔'' پینزم نے جواب دیا۔تھوڑی دیر اس کے جواب پر غور کرنے کے بعد لیسر نے پینزم سے پوچھا کہ وہ کیسے اصلاح کرتا ہے تو پینزم نے بتایا کہ لوگوں کی اصلاح کا ایک ہی طریقہ انہیں قتل کرنا ہے۔ پینزم نے اپنے آپ کو ایک ایسا شخص بتایا جو ہمیشہ نیکی کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔اس کا مطلب تھا کہ زندگی اتنی دشوار ہے کہ کسی کو قتل کرنا اس پر احسان کرنا ہے۔

جب ایک سلاخ اس کی کوٹھڑی میں پائی گئی تو اسے بری طرح مارا گیا اب تک شاید سو مرتبہ وہ اس مار کو سہہ چکا تھا۔ جیل کے تہہ خانہ میں اسے ازمنہ وسطیٰ کے طریقوں سے اذیت دی گئی۔ ٹارچر کے بارہ گھنٹوں بعد جب ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا تو پینزم چلّانے لگا۔ اپنے پیدا ہونے پر وہ ماں کو برا بھلا کہنے لگا۔اس نے اعلان کیا کہ وہ ہر انسان کو قتل کر دے گا، اسے تمام دن اپنی کوٹھڑی کے فرش پر لیٹنے کی اجازت دی گئی مگر جب اس نے ایک گارڈ کو گالی دی تو اسے پھر مار مار کر بے ہوش کر دیا گیا۔ لیسر کو اس کے ساتھ اس بدسلوکی پر بہت صدمہ ہوا۔اس نے ایک ہم راز کے ہاتھ پینزم کو ایک ڈالر بھیجا۔ پہلے تو اس نے اسے ایک مذاق سمجھا مگر جب اسے احساس ہوا کہ یہ ہمدردی کا اظہار ہے تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔اس نے کہا کہ وہ اسے ایک پنسل اور کاغذ لا دے اس طرح پینزم کی خودنوشت سوانح لکھنے کا آغاز ہوا۔

جب لیسر نے شروع کے چند صفحے پڑھے تو وہ اس کی ذہانت اور ادبی صلاحیت پر حیران رہ گیا۔ پینزم نے اپنے جرائم کی معافی نہیں مانگی۔

''اگر کوئی شخص عادی مجرم ہے تو وہ میں ہوں۔ زندگی میں انسان اور خدا کے بتائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی کرتا رہا۔ اگر وہ اور قوانین بناتے تو میں انہیں بھی خوشی سے توڑ دیتا۔اتنی سی بات کہ یہ سب کیا دھرا میرا ہے، عام آدمی کے جاننے کے لیے کافی ہے۔شاید ہی بہت تھوڑے لوگ اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کریں کہ جو میں ہوں وہ میں کیوں ہوں اور جو کرتا ہوں کیوں کرتا ہوں۔ بس وہ یہ چاہتے ہیں کہ مجھے پکڑیں، مقدمہ چلائیں اور چند برسوں کے لیے جیل بھیج دیں۔ اور جیل میں میری زندگی اجیرن کر دیں اور پھر مجھے کھلا چھوڑ دیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ کسی کے پاس پنجرہ میں شیر ہو وہ اس کے ساتھ بدسلوکی کر کے اسے خون کا پیاسا بنا کر آزاد کر دے کہ لوگوں کو چیرتا پھاڑتا پھرے۔ پھر تو چیخ و پکار اور خوف کا

عالم ہو گا۔ لیکن اگر بعض لوگ دوسرے لوگوں کے ساتھ یہی سلوک کریں تو دنیا حیران ہوتی ہے، اسے صدمہ ہوتا ہے اور وہ غضب ناک ہو جاتی ہے کیونکہ لوگ لٹتے ہیں، ریپ ہوتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا مگر جب میں نے اس کا بدلہ لیا تو دنیا کو اچھا نہیں لگا۔''

پینزم کا اعتراف اپنے اعمال کا جواز مہیا کرنے کی کوشش ہے۔ دوسرے لوگ پریشان تھے مگر وہ بے حیائی سے ڈھیٹ بنا رہا۔ مقدمہ کے دوران اس نے جیوری سے کہا ''جب تم مجھ پر مقدمہ چلا رہے تھے تو میں بھی تم پر مقدمہ چلا رہا تھا۔ میں نے تمہیں مجرم پایا۔ تم میں سے بعض کو تو میں پہلے ہی سزا دے چکا ہوں۔ اگر میں زندہ رہا تو تم میں سے کچھ اور لوگوں کو سزا دوں گا۔ مجھے تمام بنی نوع انسان سے نفرت ہے۔'' جج نے اسے پچیس سال قید کی سزا دی۔ دوسری جیل میں تبدیلی کے بعد پینزم نے لوہے کی سلاخ مار کر ایک فورمین قتل کر دیا جس کی پاداش میں اسے سزائے موت ہوئی۔ اس عرصہ میں لیسر اس کی سوانح کئی ادبی لوگوں کو دکھاتا رہا جو متاثر ہوئے۔ مگر جب پینزم نے سنا کہ اس کی رہائی کی کوششیں ہو رہی ہیں تو اس نے شدید احتجاج کیا۔ ''میں نہیں سدھروں گا اگر میرے لیے جیل کا دروازہ ابھی کھول دیا جائے اور میں باہر نکلوں اور ایک ملین ڈالر مجھے دیئے جائیں۔ مجھے نیکی کرنے اور نیک بننے کی کوئی خواہش نہیں۔'' اور ہنری لیسر کے نام ایک خط میں اس نے اپنا تعارف اس طرح کرایا ''اگر میں چاہوں تو بھی میری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ مجھے موجودہ ذہنی حالت میں آنے کے لیے اڑتیس برس، یعنی میری پوری زندگی صرف ہوئی ہے۔ اس عرصہ میں کچھ عادتیں میں نے اختیار کی ہیں۔ ان عادتوں کو اپنانے میں بھی پوری زندگی صرف ہوئی ہے۔ اگر میں اپنے آپ کو اور ان عادتوں کو چھوڑنا چاہوں تو اس کے لیے ایک اور زندگی چاہیے۔ جو بات مجھے حیران کرتی ہے وہ میرے ساتھ تمہارا دوستانہ رویہ ہے۔ تمہارے جیسا لائق اور ذہین آدمی جو مجھے جانتا ہے مگر پھر بھی میرے لیے نیک خواہشات رکھتا ہے حالانکہ خود مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے۔'' 11 ستمبر 1930ء کو جب وہ پھانسی کے تختہ پر پہنچا تو جلاد نے اس کی آخری خواہش پوچھی۔ ''ہاں، جلدی کرو! میں اتنی دیر میں ایک درجن آدمیوں کو پھانسی دے سکتا تھا جبکہ تم احمقوں کی طرح ادھر ادھر ہو رہے ہو۔''

یہاں ہم وہ منطق صاف طور پر سمجھ سکتے ہیں جس نے پینزم کو ایک طرح کی خودکشی کا راستہ دکھایا۔ شروع میں ہر مجرم کی طرح اس نے معاشرہ کو ایک فرد کی شکل میں دیکھا اور اس

نے بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ جیوری سے اس کے خطاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انہیں معاشرہ کا علاماتی نمائندہ سمجھتا تھا۔ ''تم میں سے بعض افراد کو میں پہلے ہی سزا دے چکا ہوں۔ جیتا رہا تو تم میں سے کچھ اور کو بھی سزا دوں گا۔'' شروع کے دنوں میں اس کے جرائم معاشرہ سے بدلہ لینے کی ایک جادوئی کوشش تھی۔ جادوئی، کیونکہ افراد تو ہیں مگر معاشرہ نام کی کوئی چیز نہیں۔ سات سال کی قید نے ایک اٹھائی گیرے کو مشنری بنا دیا، اس کی زندگی کو مقصد دیا، تا کہ وہ معاشرہ کو اس کا سبق سکھائے۔ مگر وارڈن مرفی والا واقعہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ فرار ہونے کے بعد پینزم نے مایوس ہو کر مسلح مار دھاڑ کی کیونکہ وہ قید خانے واپس آنے اور وارڈن کا سامنا کرنے سے شرماتا تھا۔ اس کے بعد اسے جو وحشیانہ سزائیں دی گئیں ممکن ہے کہ ان کی وجہ سے اس کے ضمیر کو کچھ سکون ملا ہو۔ اس مرحلہ پر مرفی اپنا اصلاحی کام مکمل کر لیتا اگر وہ پینزم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پوچھتا کہ اس نے (خلاف توقع) ایسا کیوں کیا ہے۔ مگر مرفی کے صبر کی حد ختم ہو چکی تھی اور اب پینزم سوسائٹی کے علاوہ اپنے آپ سے بھی نفرت کرنے لگا تھا۔ ڈاکہ اور ملاحوں کا قتل اس لیے تھا کہ شاید وہ اپنے آپ کو دائمی سزا یافتہ ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔

مرفی دراصل پینزم کو یہ احساس دلا رہا تھا کہ سوسائٹی اس کے خلاف نہیں اور اس بارے میں اس کی منطق غلط ہے۔ جب مرفی نے اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا تو اسے پتہ چلا ہو گا کہ معاشرہ تو ایک مفروضہ ہے۔ دنیا اس جیسے زندہ اور حقیقی افراد پر مشتمل ہے۔ مگر جب پینزم کی بے مہری کی وجہ سے مرفی کی انسان دوستی کو دھچکا لگا تو پینزم اپنی جھوٹی منطق پر اور زیادہ اصرار کرنے لگا کہ 'دوسرے لوگ' سب کے سب دشمن ہیں۔ کوئی شخص اس فلاسفی کے سہارے زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم ایک انسان سے تو اسے قربت حاصل ہو تا کہ وہ انسانوں کی طرح زندہ رہ سکے۔ اپنے فرار ہونے کے بعد پینزم نے جو بیس قتل کیے ان کے ذریعے شاید وہ اپنے آپ کو سزا دے رہا تھا۔ انہیں خود اذیتی کی ایک شکل سمجھا جا سکتا تھا۔ 1912ء میں وہ جیل توڑ کر اس میں واپس آیا تا کہ کارل جورڈن کی مدد کر سکے۔ 1920ء تک وہ ذاتی احساس و جذبات سے منہ موڑ چکا تھا اور غیر ارادی طور پر قتل کا مرتکب ہونے لگا تھا۔

اس وقت تک کہ پینزم پھر جیل جائے اور ہمیشہ کے لیے جائے وہ مکمل طور پر دنیا سے الگ تھلگ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا کہ دنیا بری ہے اور تمام انسان اس

قابل ہیں کہ انہیں مار دیا جائے۔ اس لیے اس کا جینا بے کار ہے۔ جذباتی لحاظ سے اسے ایک خلا کا احساس تھا مگر کسی انسان کے لیے اور بالخصوص پینزم جیسے انسان کے لیے یہ صورت حال خلافِ فطرت تھی۔

لیسر حیران تھا کہ پینزم نے جیل کی اصلاحات سے متعلق کئی اہم کتابیں پڑھ لی تھیں۔ ظاہر ہے کہ مرفی کے کہنے پر ایسا ہوا ہوگا۔ پینزم نے جیل میں فلاسفی بھی پڑھی تھی۔ اس نے شوپنہار اور کانٹ کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ (اپنی قنوطیت بھی شاید اس نے شوپنہار سے لی تھی) مگر پھر بھی اس شخص نے جس کی خود پسندی انتہا پر تھی اور جسے بے انتہا اذیت دی گئی مگر جس نے ہار نہیں مانی، اس نے تحفظ اور وابستگی کی شکل بھی کبھی نہیں دیکھی۔

ایک طرح سے اس کے لیے لیسر کی طرف سے ڈالر کا تحفہ بڑی ظالمانہ حرکت تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ دنیا نیکی اور شرافت سے خالی نہیں اور اگر پینزم ہمت کرتا تو اس کی زندگی تشنہ نہ رہتی۔ خیالات و اعمال میں تبدیلی کے عمل کا تقاضا ہے کہ گنہگار اپنے گناہوں کا پورا اعتراف کرے۔ اسی راستہ پر پینزم گامزن ہو گیا تھا مگر اپنے ضمیر پر بیس ہلاکتوں (جن میں اکثر بچے تھے) کا بوجھ لیے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے لیے کوئی نجات نہیں، بہت دیر ہو گئی تھی۔ بہت زیادہ دیر! اس نے اپنا چانس کھو دیا تھا۔

ایبٹ نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ پینزم اور خود اس جیسے لوگوں کے پاس شروع ہی سے کوئی چانس نہیں ہوتا۔ مگر کیا یہ سچ ہے؟ وارڈن مرفی کے ذریعے پینزم کے پاس ایک چانس تو تھا، ایبٹ کے پاس بھی ایک چانس تھا جب اس کی کتاب اشاعت کے لیے لے لی گئی تھی، مگر دونوں نے اپنے چانس ضائع کر دیے۔ اصل مسئلہ اس دن سے پیدا ہوا جب انہوں نے فرض کر لیا تھا کہ زندگی ان کے ساتھ انصاف نہیں کرے گی۔ پینزم کا کہنا تھا کہ بچپن میں اسے بری طرح مارا پیٹا جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی ماں سے نفرت کرنے لگا تھا۔ ''گھر چھوڑنے سے پہلے میں نے آس پاس دیکھا اور ایک ایسے ہمسایے کا گھر چن لیا جس کے پاس سب کچھ تھا اور میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔'' چنانچہ اس نے ہمسائے کے گھر چوری کی اور ریفارم سکول بھیج دیا گیا۔ یہاں ایک دفعہ پھر وہ کہتا ہے کہ ''میں جو بھی کرتا ہوں اسے غلط سمجھا جاتا ہے۔'' چنانچہ اسے بری طرح مارا گیا۔ ''تب میں انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر میں انہیں نقصان نہ پہنچا سکا جنھوں نے مجھے نقصان پہنچایا ہے تو میں کسی اور کو نقصان پہنچاؤں گا۔ تیرہ سال کی عمر میں ہی بدلہ لینے کی خواہش پیدا ہو چکی تھی اور چونکہ اس کی بنیاد خود

رحمی پر تھی، اس خیال پر کہ دنیا نے اس سے بہت برا سلوک کیا ہے۔ چنانچہ اپنی ذہانت اور قوت ارادی کو کامیابی کے لیے استعمال (اور اس عمر میں وہ سرکس کے مسخرہ سے مووی سٹار بننے تک کچھ بھی کر سکتا تھا) کرنے کے بجائے اس نے اپنے آپ کو حقیر باتوں کے لیے جرم کر کے ضائع کر دیا۔

پینزم یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ایک لحاظ سے اپنے جرائم کا ذمہ دار نہیں۔ اگر شیر کے بچے سے بدسلوکی کی جائے تو وہ خطرہ بن سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں کچھ سچائی ہے مگر وہ 'آزادانہ عمل' کی بات کیا ہوئی۔ 'کنٹرول سے باہر' ہونے کی بات۔ جو لگتا ہے کہ تشدد پسند مجرموں میں قدر مشترک ہے۔

پینزم کا طریقۂ واردات انوکھا نہیں۔ یہ طریقۂ واردات ان مجرموں کا بھی ہے جن کی پرورش، جن کی بیک گراؤنڈ پینزم سے بالکل مختلف ہے۔ جان ہیگ (جسے 1949ء میں چھ قتل کرنے کے جرم میں سزائے موت دی گئی) کا کیس ہمارے سامنے ہے۔ چند سال پہلے برنارڈ اور اس کی سیکرٹری بلانش ایک ہوٹل میں لنچ کر رہے تھے۔ مس بلانش اسی ہوٹل میں رہتی تھی۔ ہیگ قریب ہی دوسرے ٹیبل پر تھا۔ ایک بچے سے بم نما کھلونا زمین پر گر گیا تو ہیگ اس پر غرایا "اگر تم نے دوبارہ ایسا کیا تو میں تمہیں مار ڈالوں گا۔" مس بلانش نے مجھے 1956ء میں بتایا کہ برنارڈ نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ "اس کا انجام پھانسی کا پھندا ہے۔" گویا کہ برنارڈ نے اس کے بے قابو یا کنٹرول سے باہر ہونے کے فیصلہ کو پہچان لیا تھا جو کہ تشدد پسند مجرم کی خصوصیت ہے۔

پھر بھی ہیگ اور پینزم کئی لحاظ سے مختلف تھے۔ ہیگ مذہب کے پابند ماں باپ کا پیارا بیٹا تھا۔ وہ عمدہ موسیقار تھا جس نے ایک گرامر سکول سے سکالرشپ حاصل کی تھی اور چرچ میں کوائر بوائے بن گیا تھا۔ اسے اچھے کپڑے اور تیز کاریں بہت پسند تھی۔ اسی عمر میں اسے کسی جعل سازی کے مقدمہ میں عدالت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حالت میں اس نے بھی وہی فیصلہ کیا جو پینزم نے کیا تھا۔ جیل کے ابتدائی دنوں میں اس کے سامنے ایک چوائس تھی کہ سوسائٹی سے لڑنا لاحاصل ہے اس لیے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ دوستی ہو جائے یا یہ کہ سوسائٹی نے اس کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے تو وہ بھی اسے سبق سکھائے۔ اس نے جعل سازی کا دھندا شروع کیا (جس کے دوران میں وہ جیل بھی جاتا رہا) جو اُن کئی انسانوں کے قتل پر ختم ہوا جنھوں نے اپنے تجارتی معاملات اس کے سپرد کیے تھے۔ جرائم سے بھرپور اس کی زندگی

شروع سے آخر تک ایک غلط اندازہ تھا۔ جرائم کے پندرہ برسوں (جن میں سے کئی برس اس نے جیل میں گزارے) میں اس نے پندرہ ہزار پونڈ کمائے۔ اگر وہ چاہتا تو کسی کاروبار میں دیانت داری کے ذریعے وہ اس سے زیادہ رقم کما سکتا تھا۔ شروع ہی سے اسے احساس تھا کہ اس کے لیے ایک اچھا آغاز زندگی پر اس کا قرض تھا۔ دنیا سے بیزاری اور حقارت نے اسے کئی شارٹ کٹ دکھائے جن کے ذریعہ وہ اپنی ایسی خواہشات پوری کر سکتا تھا جن کا مستحق وہ اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔

یہ ایک ایسے تشدد پسند آدمی کا بنیادی رویہ ہے جو جرائم کی زندگی چاہتا ہے۔ وہ یہیں سے شروع کرتا ہے کہ زندگی نے اس کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے۔ یہ کمی پوری کرنے کے لیے وہ شارٹ کٹ اختیار کرتا ہے تاکہ جو چاہتا ہے اسے حاصل کرے۔ اس کا نتیجہ قانون سے ٹکر، حکومت سے تصادم اور جیل کی زندگی ہے۔ حقارت میں اضافہ ہے اور نئے شارٹ کٹ کی تلاش ہے جو اور بھی قریب ہو۔

اگر وہ بڑا ہی خوش قسمت ہو تو شاید سماج کے غیض وغضب سے بچ جائے مگر اپنے غیض وغضب سے نہیں بچ سکتا۔ جیسا کہ لیسر پینزم کے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے۔ ایک روز لیسر، پینزم کی کوٹھڑی میں گیا تاکہ اس کی سلاخیں چیک کرے۔ ''آئندہ ایسا نہ کرنا،'' پینزم نے پریشان ہو کر کہا، ''اپنی پشت میری طرف اس طرح نہ کرنا'' ''مگر مجھے پتہ ہے تم مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے،'' لیسر نے کہا۔ ''تم واحد شخص ہو جسے میں قتل کرنا نہیں چاہتا،'' پینزم بولا ''مگر میں غلطی کر سکتا ہوں، غلطی سے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔'' دراصل پینزم دو شخصوں میں بٹ چکا تھا یعنی ایک آدمی اور ایک درندہ۔ پینزم وہ آدمی تھا جس نے صاف اور واضح اعتراف لکھے تھے۔ جس نے لیسر کو خبردار کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ مگر اس نے اپنے آپ کو قاتل بننا بھی سکھایا تھا، جس طرح کہ وہ ایک ایلسیَشن کتے کو سکھاتا۔ جونہی لیسر نے اس کی طرف پیٹھ کی تو ایلسیَشن غرایا اور اس پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ اور اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا ہے کہ تشدد پسند مجرم میں خود تباہی کا رجحان کیسے پیدا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ معاشرہ کی قدروں کا مخالف ہے اور ان کے خلاف خود اپنی انفرادی قدریں بنا رہا ہے۔ آخر اسے پتہ چلتا ہے کہ بالکل حقیقی اور عملی لحاظ سے اس نے اپنی قدریں برباد کی ہیں اور اپنے آپ کو خلا میں چھوڑ دیا ہے۔ میکسم گورکی مرخلوف نامی ایک روسی قاتل کی کہانی سناتا ہے، جو گورکی کو ایک جج کے ذریعے معلوم ہوئی۔ مرخلوف بیل گاڑی چلاتا تھا۔ سمجھ دار گاڑی بان ہونے کے علاوہ وہ بیل جتنا طاقت ور

تھا۔ ایک روز اس نے اپنی گاڑی سے چینی چراتے ہوئے ایک شخص کو پکڑا اور اس زور سے اسے مکا مارا کہ اس کی موت واقع ہوگئی۔ قتل کے الزام میں اسے توبہ کے لیے مونیسٹری بھیجا گیا۔ جب پادری اس سے توبہ کی بات کر رہا تھا تو مرخلوف اس خیال میں غرق تھا کہ اس نے کتنی آسانی سے ایک انسان کی جان لی ہے، وہ اس خیال سے نجات نہ پا سکا کہ ایک ایسا ہی زوردار مکا اس کی موت کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ رہائی کے ایک روز بعد اسے ایک احمق لڑکی (جو اس کا دل بہلا رہی تھی) پر غصہ آیا تو اس نے اسے ایک لکڑی ماری۔ جس کی وجہ سے لڑکی ہلاک ہوگئی۔ اسے ہلاک کرنے کے جرم میں اسے جیل جانا پڑا۔ ہر دم دماغ پر چھانے والا خیال اب اذیت بن گیا تھا۔ سزا کاٹ کر وہ جیل سے باہر آیا تو اپنے نئے مالک سے اس کا سامنا ہوا۔ وہ بہت مہربان شخص تھا۔ ایک روز طیش کی حالت میں اس نے اپنے مالک کو گرایا اور اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار دیا۔ جیل جا کر اس نے اپنی زنجیروں سے پھانسی لے کر خودکشی کر لی۔

جج کے سامنے مرخلوف کے اعتراف سے صاف ظاہر ہے کہ وہ عام معنوں میں پاگل نہیں تھا۔ اسے یہ سوچ کر اذیت ہوتی تھی کہ اگر زندگی اتنی آسانی سے ختم ہوسکتی ہے تو وہ بے معنی ہے۔ اس نے انسانی ارادے اور انسانی قدروں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ''میں جسے چاہوں قتل کر سکتا ہوں اور مجھے جو چاہے قتل کر سکتا ہے۔'' یعنی وہ خود اپنی برتری اور اپنی محتاجی دونوں کے شعور سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ جب اس نے اپنے مالک کو قتل کیا تو اسے بھی وہی مجبوری تھی جس کی وجہ سے پینزم لیسر کو قتل کرنے سے ڈرتا تھا۔ کنٹرول ختم کرنے کے فیصلہ نے اسے اندر کی کسی چیز سے ڈرا دیا تھا۔

بائیس سالہ سٹیون جوڈی کے معاملہ میں بھی لگتا ہے کہ یہی محرک تھا۔ جوڈی کو مارچ 1981ء میں انڈیانا پولس کے مقام پر الیکٹرک چیئر کے ذریعہ موت کی سزا دی گئی تھی۔ جوڈی نے ایک بیس سالہ ماں اور اس کے تین بچوں کو مار کر دریا میں پھینک دیا تھا۔ ایک ٹوٹے ہوئے خاندان کے بیٹے جوڈی نے پہلا ریپ بارہ سال کی عمر میں کیا تھا۔ اس نے عورت کو بار بار چاقو مارا اور اس کی ایک انگلی بھی کاٹ دی۔ اس نے جیوری سے کہا کہ ''بہتر ہوگا اگر تم مجھے موت کی سزا دو کیونکہ اگلی دفعہ شاید تم میں سے کسی ایک یا تمہاری بیٹی کی باری ہو۔ موت سے پہلے اس نے اپنی سوتیلی ماں کو بتایا کہ اس نے لاتعداد عورتوں کو قتل کیا ہے، یہاں تک کہ ٹیکساس سے انڈیانا تک ان کی قطار بن سکتی ہے۔ پینزم کی طرح جوڈی نے بھی موت کے

خلاف اپیل کرنے کی مخالفت کی۔

ایک روسی کسان اور امریکی ریپسٹ میں شاید بہت زیادہ فرق نظر آئے۔ مگر معاملہ کی تہہ تک جانا ضروری ہے۔ انسانی مسرت کی بنیاد عزم و ارادہ یا انسان کے جوہر پر ہے۔ جب کوئی شخص اپنی بنائی ہوئی چیز دیکھتا ہے یا اسے اپنی کسی ایسی مصیبت کا خیال آتا ہے جسے اس نے اپنی جرأت اور ارادے کی مدد سے دفع کیا تھا تو اسے سکون اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بے بسی کا اور کنٹرول نہ ہونے کا احساس ذلت کی صحیح تعریف ہے۔ جسمانی قوت پر سب کو فخر ہوتا ہے، مگر جب مرغلوف دیکھتا ہے کہ نہ چاہنے کے باوجود وہ دوسروں کی موت کا سبب بنتا ہے تو یہی جسمانی قوت اس کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ اس کی طاقت دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کا رشتہ ختم کر دیتی ہے۔ وہ اس خدشہ کے بغیر کسی سے رشتہ جوڑ نہیں سکتا کہ ایک ہی جھٹکے سے دھاگا ٹوٹ سکتا ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت سٹیون جوڈی کی ہے۔ جب بھی وہ کوئی دل کش لڑکی دیکھتا ہے، خواہش کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ مگر اتنی عورتوں کو ریپ کر کے اور قتل کر کے وہ جان گیا ہے کہ خواہش کا ہر ذرّہ اس کی آزادی سلب کرنے اور زندگی ختم کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ تمام انسانوں کی طرح وہ بھی مہربان، دوست اور ملنسار ہوتا ہے۔ اسے بھی تحفظ، وابستگی اور بڑائی کی خواہش ہوتی ہے مگر خونی ایلسیئشن نہیں مانتا، اسے ضد ہے کہ وہ اس کی یہ خواہشات نارمل طریقہ سے کبھی پوری نہیں ہونے دے گا۔ اس نے اسے بنی نوعِ انسان کے دائرہ سے باہر کر دیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجرم کا مرکزی مسئلہ اپنی تقسیم ہے اور یہ جاننا بھی مشکل نہیں کہ یہ تقسیم کیسے ممکن ہے۔ کسی نہ کسی حد تک ہر انسان میں اپنے آپ کو منوانے کی خواہش ہوتی ہے۔ دوسرے انسانوں کی نسبت اپنی اہمیت اجاگر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ فرد کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مجمع میں الگ پہچانا جائے۔ اپنے لیے یہ مقام حاصل کرنا خوشی اور اطمینان کا باعث بنتا ہے مگر اس بات سے بھی بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ اس کا گروپ اس حیثیت کو تسلیم کرے۔ جرائم پردہ داری چاہتے ہیں اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض چالاک مجرم گرفتاری کے بعد اپنے جرائم کی تفصیل بتانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہیگ غالباً کبھی بھی مجرم قرار نہ دیا جاتا اگر وہ لاشوں کو تیزاب کے ذریعہ ٹھکانے لگانے کی ڈینگیں پولیس کے سامنے نہ مارتا۔ اسی طرح تھرن مین نے خود ہی اپنے جرائم کی کہانی لکھ کر اپنے آپ کو مجرم ثابت کر دیا۔

پینزم کے جرائم کی بنیاد اس کی یہ سوچ تھی کہ وہ نارمل طریقہ سے کبھی بھی بڑائی

حاصل نہیں کر سکے گا۔ مرفی کے واقعہ کے بعد وہ اس سوچ پر سختی سے قائم رہا اور اسے ایک ڈراؤنی اور بھیانک منطق میں ڈھال دیا۔ اس نے جتنے قتل کیے وہ اپنے 'اندر کے انسان' کی ہستی مٹا دینے کی کوشش تھی۔ وہ روتا اور چلاّ تا رہا، اس کے زخموں سے خون بہتا رہا، مگر اس نے پھر بھی مرنے سے انکار کر دیا۔ وہ پھر بھی اسے یاد دلاتا رہا کہ وہ انسانوں میں انسان بن کر جینا چاہتا ہے۔ پینزم کا یہ اعلان کہ ''میں ساری انسانی نسل قتل کر دوں گا'' درحقیقت اس کی اپنی خودکشی کا اعلان تھا۔

اس مرحلہ پر ضروری ہے کہ 'خود تباہی' اور 'بٹی ہوئی شخصیت' کے تضاد کو اچھی طرح سمجھا جائے۔

مجرم کی شخصیت کے دونوں پہلو ہر انسان کے اندر ہوتے ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ بھوک اور دوسری 'شارٹ ٹرم' خواہشات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وہ خوراک، حرارت اور توجہ کے لیے چیختا ہے، یہ اس کی فوری اور شارٹ کٹ ضروریات ہیں۔ بچہ، بچہ نہیں رہتا جب اس کے تخیل کو کوئی کہانی چھو لے۔ اس لمحے سے اس کی خواہشات تجربہ، مہم جوئی اور نئے افق کی تلاش میں بدل جاتی ہیں۔ انہیں ہم 'لانگ ٹرم' ضروریات کہہ سکتے ہیں اور ہم میں اکثر لوگ تسلسل کے ساتھ 'شارٹ ٹرم' اور 'لانگ ٹرم' کی کھینچا تانی میں لگے رہتے ہیں۔ بچہ اسے اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ اپنا جیب خرچ جمع کر کے سائیکل خریدنا چاہتا ہے تاکہ نئے افق دیکھنے کی خواہش پوری ہو جبکہ اس کے 'شارٹ ٹرم' حصے کا تقاضا ہوتا ہے کہ سینما دیکھا جائے، چاکلیٹ خریدی جائے۔

آدمی بالغ ہو تو اور بھی برا حال ہوتا ہے۔ قرضے، بجلی کے بل، بچوں کے کپڑوں کھانے پینے اور اسکول فیس کی فکر رہتی ہے اور اسے یاد نہیں رہتا کہ 'دور کے افق' نام کی بھی کوئی چیز کہیں ہے۔ دراصل ہم ایک آنکھ پر خوردبین اور دوسری آنکھ پر دوربین لگا کر چلتے ہیں مگر ہم شاید ہی کبھی ٹیلی سکوپ میں سے دیکھتے ہوں۔ یہ آنکھ ہمیشہ بند رہتی ہے۔

اور اب یہ سمجھنا ہمارے لیے آسان ہو گیا ہے کہ جرم، ہپنوسس سے کیوں جڑا ہوا ہے۔ مجرم، ایک ایسا آدمی ہے جو بگڑے ہوئے بچے کی طرح شارٹ ٹرم ضروریات کا غلام ہے، اس کی ضد ہے کہ 'مجھے ابھی چاہیے' مگر یہ شعور کی ایک خصوصیت ہے کہ شارٹ ٹرم دیکھنا (جیسا کہ خوردبین سے نظر آتا ہے) آسانی کے ساتھ نیند یا ہپنوسس میں بدل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن جانوروں کی دونوں آنکھوں پر مائیکروسکوپ ہوتا ہے انہیں اتنی آسانی سے ہپنا ٹائز

کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں الرٹ (ہوشیار) رکھنے کے لیے حقیقت کا شعور، ٹیلی سکوپ چاہیے۔ مرغی کی حقیقت پسندی، دانے دنکے کی تلاش یا انڈوں پر بیٹھنے تک محدود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاک کی صرف ایک لکیر اس کے شعور کو مکمل خلا میں دھکیل دیتی ہے اور مجرم میں حقیقت کا شعور جو شارٹ ٹرم مقاصد تک محدود ہوتا ہے، ایک ایسی حالت میں چلا جاتا ہے جو ہپنوسس سے قریب ہوتی ہے۔ باقی ہم سب کی نظر میں ہیگ کا یہ کردار کہ مٹھی بھر دولت کے لیے بے گناہوں کو تیزاب میں نہلا دینا، محض پاگل پن ہے۔ مقصد کتنا حقیر اور چھوٹا ہے جبکہ ذریعہ کیسا ڈراؤنا اور بھیانک ہے۔ ہیگ حقیقت کے شعور سے بالکل محروم ہو چکا تھا۔ اپنے مائیکروسکوپ اور ٹیلی سکوپ کو ملا کر، زندگی چاہتی ہے کہ چوزوں اور خرگوشوں کے مقابلہ میں انسان ہپنوسس کی بہتر مزاحمت کریں۔ ہم یقیناً ایسا کر سکتے ہیں اگر ہم تناسب اور حقیقت کا احساس زندہ رکھنے کے لیے دوربین کا صحیح استعمال کریں۔ ایک آنکھ بند رکھنے کی یہ واہیات عادت ہے جو ہمیں چوزوں کی طرح کمزور کر دیتی ہے۔

تو پھر ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ پھر ہمیں انسانی دماغ کے مخصوص عمل کو توجہ سے سمجھنا ہوگا۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو عجیب آوازوں اور مناظر کی حیران کن دنیا میں پاتا ہے، جسے وہ سمجھ نہیں سکتا۔ آہستہ آہستہ اسے زندگی کے سارے انداز (پیٹرن) سمجھ آنے لگتے ہیں، جنہیں وہ اپنے دماغ میں جمع کرتا رہتا ہے۔ چند برسوں میں وہ زندگی کے اتنے پیٹرن جمع کر لیتا ہے کہ ان سے ایک پوری دنیا جنم لے کر اس کی آنکھوں میں سما جاتی ہے۔ اب وہ جب بعض نئے پیٹرنز کا سامنا کرتا ہے تو اسے ان کی تفصیل میں نہیں جانا پڑتا کیونکہ اس کے دماغ میں پہلے سے موجود پیٹرن اس کا کام آسان بنا دیتے ہیں۔

مگر ہر میکانزم کی طرح اس میکانزم میں بھی ایک خرابی ہے۔ جونہی ایک بالغ کسی نئی صورت حال سے نمٹنے کے قابل ہوتا ہے تو وہ مشکل سے ہی اسے پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یا دلچسپی کے نئے پوائنٹ تلاش کرتا ہے۔ مزے سے اپنے دماغ کے کنٹرول روم میں بیٹھ کر وہ اپنی عادت کی بنیاد پر ان سے برتاؤ کرتا ہے۔ اس طرح بتدریج زندگی اور شعور ایک میکانکی معمول میں گھر جاتے ہیں۔ انسان واحد مخلوق ہیں جو اپنے وقت کا ننانوے فیصد اپنے سروں کے اندر خرچ کرتے ہیں۔ یعنی ہم حقیقت کے شعور کو صرف ایک فیصد وقت کے لیے الرٹ رکھتے ہیں تو پھر آسانی سے ہپناٹائز ہونے پر حیرت کیوں ہے؟

ہپنوسس کے میکانزم میں بھی بعض باتیں بڑی عجیب ہیں، ہپنوسس، دراصل دماغ

کی قوتوں کو دماغ کے خلاف استعمال کرنے کا نام ہے۔ دفاعی جنگ کے طلبا کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ کس طرح دشمن کو ناکارہ کریں۔ انہیں کہا جاتا ہے کہ دشمن کی ٹانگیں کھمبے کے گرد ایک خاص پوزیشن میں رکھ کر اسے ایڑیوں کے سہارے بیٹھنے پر مجبور کریں جس سے اسے 'تالا' سا لگ جائے گا اور وہ بھاگ نہیں سکے گا۔ ہپنوسس اسی طرح دماغ کو تالا لگا دیتا ہے اور دو ٹانگیں جو ایک دوسری کا راستہ روکتی ہیں، عادت اور احساس کمتری ہیں۔ ہم سب کو کسی دوسرے شخص کی نظروں تلے کام کرنے کا تجربہ ہے۔ مگر اس طرح ہم عمدہ کام نہیں کر سکتے کیونکہ دوسرے شخص کی موجودگی سے گھبرا جاتے ہیں مگر جو کام کرنے کی عادت ہوتی ہے اسے بڑی خوبی سے کرتے ہیں کیونکہ اس کے معاملہ میں ہمیں سوچنا نہیں ہوتا۔ اسے کرنا ہماری عادت ہے۔ کسی ایسے شخص کو توجہ سے کام کرنے کے لیے کہنا (جو مشینی انداز میں کام کرتا ہے) کام میں رکاوٹ ڈالنا ہے۔ سانپ بھی بالکل یہی کرتا ہے جب وہ خرگوش کی طرف مسلسل دیکھ کر اسے ساکت کر دیتا ہے۔

مگر لوگ ہپناٹسٹ کی آنکھوں میں دیکھے بغیر، اس کی آواز سنے بغیر بھی ہپنوٹائز ہو سکتے ہیں۔ اگر میں کسی کمرہ میں کوئی چیز لینے جاتا ہوں اور وہاں جا کر بھول جاتا ہوں کہ کیا لینے آیا تھا تو یہ بہت عام قسم کا ہپنوسس ہے۔ کمرہ کی طرف جانے سے میری توجہ اپنے مقصد سے ہٹ گئی جس کی وجہ سے میرا دماغ خالی ہو گیا۔ ایک غیر حاضر دماغ پروفیسر کی کہانی ہے جو اوپر اپنے ہیڈ روم میں مہمانوں کی آمد سے پہلے ٹائی بدلنے گیا۔ جب وہ بہت دیر تک واپس نہ آیا تو اس کی بیوی اوپر گئی اور دیکھا کہ پروفیسر بستر پر سو رہا ہے۔ ٹائی اتارتے ہوئے اسے اپنے آپ ہی کپڑے اتارنے اور بستر پر سو جانے کا خیال آیا۔ اس مثال سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ غیر حاضر دماغی، ہپنوسس سے کتنی قریب ہے۔ پروفیسر کو جیسے ہپنوسس کے ذریعہ بستر پر جانے کا حکم دیا گیا اور یہ اس لیے ہوا کہ جب ٹائی بدلنے اوپر گیا تو وہ بس اپنے سر میں جی رہا تھا جو حقیقت کے ساتھ محض ایک دھاگے سے منسلک تھا۔ ایک غیر شعوری اشارے نے کہ یہ سونے کا وقت ہے یہ دھاگا توڑ دیا۔ جیسے یہ دھاگا ہپنوسس کی کمانڈ سے ٹوٹا ہو۔

یہ جاننا اہم ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ زندگی کا زیادہ حصہ ہپنوسس سے قریبی حالت میں گزارتے ہیں۔ اس حالت کا بڑا نقصان یہ ہے کہ ہمارا رجحان منفی اشاروں کی طرف ہونے لگتا ہے۔ ہمارا موڈ لحہ بہ لحہ بدلتا ہے۔ (انگلستان میں) سورج نکلتا ہے تو ہم خوش ہوتے ہیں۔ بادلوں کے پیچھے چلا جائے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ایک جدید شہر میں اکثر آوازیں

اور مناظر حوصلہ شکن ہوتے ہیں۔ بریکیں لگنے کی آوازیں، انجنوں کا شور، حالیہ تباہی کی اخباری خبریں اور ان کی اناؤنسمنٹ، لوگوں کی دھکم پیل، ان کی بھاگ دوڑ، ان سب باتوں سے ایک مضبوط مقصد کے آدمی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا کیونکہ ہمارا مقصد ہمیں حقیقت سے جوڑتا ہے۔ مگر جدید شہری کے 'مقاصد' کم وبیش عادت کی بات ہے۔ اس لیے وہ اپنا زیادہ وقت منفی خیالات کے بوجھ تلے دب کر گزارتا ہے، یا اس مبہم اور مہمل بے چینی میں ڈوب کر جسے ماڈرن ڈاکٹر اعصابی ڈیپریشن کہتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں کہتی ہیں کہ ''دماغ حقیقت کا قاتل ہے۔'' یعنی ہمارے ذہنی رویے ہمیں حقیقت سے کاٹ دیتے ہیں۔ ٹامس مان کی ایک کہانی کا مرکزی کردار کہتا ہے کہ اس کی ساری زندگی بوریت، اس کے تمام تجربوں سے مایوسی کی وجہ سے خراب ہوئی ہے۔ ادب اور آرٹ نے اسے حیرت انگیز کامیابیوں اور سرفرازیوں کی امید دلائی تھی۔ مگر ہر چیز ایک دھوکا ثابت ہوئی، کیا سب کچھ ختم ہو گیا؟ موت آخری اینٹی کلائمکس، سب سے بڑی مایوسی ہو گی۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس کا مسئلہ یہ نہیں کہ زندگی مایوسی ہے بلکہ اسے کبھی زندگی کرنے کا تجربہ نہیں ہوا۔ اس نے زندگی اپنے سر کے اندر گزاری ہے۔ وہ کم و بیش مستقل طور پر ہپنوسس کی حالت میں ہے اور یہ حالت قدرتی طور پر اپنی شہرت کی خواہشمند ہوتی ہے۔ توقعات سے محرومی یا منفی توقعات ہپنوسس کا باعث بنتی ہے اور ہپنوسس کی حالت میں آدمی کو منفی رویوں کی ترغیب ملتی ہے جس سے ہپنوسس کا عمل طویل ہوتا ہے۔ یہ ایک گرداب ہے، برائی کا چکر ہے۔ جونہی ہم اس میکانزم سے واقف ہوتے ہیں اسے اپنے اندر دیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میری طبیعت ٹھیک نہیں اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ کہیں بیمار نہ ہو جاؤں۔ تو میں دیکھ سکتا ہوں کہ کوئی بھی خیال مجھے ایک طرف یا دوسری طرف لے جا سکتا ہے۔ غذا کا محض حوالہ ہی مجھے حیران کرنے کے لیے کافی ہے اور میرے لیے یہ بھی اتنا ہی آسان ہے کہ میں کسی خیال کی گرفت سے آزاد ہو جاؤں۔ میں کھڑکی پر آہٹ سن کر سوچتا ہوں کہ شاید بارش ہو رہی ہے؟ اور جب میری توجہ اپنے پیٹ کی طرف واپس آتی ہے تو بیماری کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ بارش نے مجھے اپنی بیمار ذہنی حالت سے نکال لیا ہے اور حقیقت کے ساتھ میرا رابطہ ایک بار پھر قائم ہو گیا ہے۔

اور اب یہ جاننا ممکن ہو گیا ہے کہ کیوں کوئی پینزم یا مرغلوف اپنی بربادی پر تل جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا منفی رویہ اسے حقیقت سے کاٹ کر الگ کر دیتا ہے۔ مرغلوف کو یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ کسی کو اتفاقاً مار دینے کے سلسلہ میں اس کا خوف بے معنی ہے۔ اس

کی حالت بھی پالینا جیسی ہے جسے اپنے سے ہم آغوش ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ شخص بھی یہ خیال اس کے دماغ سے نہ نکال سکا جس نے اسے سمجھایا تھا۔ پینزم کا المیہ یہ نہیں تھا کہ سماجی لحاظ سے اس کا بائیکاٹ کیا گیا تھا اور جس کے لیے جرم اور تشدد کی راہ پر چلنا ناگزیر ہو گیا تھا بلکہ یہ کہ وہ منفی خیالات میں الجھ گیا تھا۔ اس لیے وہ ایک انسان کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں سے فیض یاب نہ ہو سکا۔

مگر کیا واقعی یہی وجہ ہے؟ جرائم کے ماہرین کی نظر میں یہ سوال بہت اہم ہے۔ مگر اس کا جواب ''نہیں'' ہونا چاہیے۔ اگر دماغ حقیقت کا قاتل ہے تو اسے حقیقت کا خالق بھی ہونا چاہیے۔ اگر جرائم کا مسئلہ منفی رویہ ہے تو مثبت رویوں سے ان کی اصلاح ہو جانی چاہیے۔ ٹھیک ہے کہ پینزم ظالم اور کینہ توز تھا۔ مگر ذہین بھی تو تھا۔ اس کی ذہانت میں اتنی طاقت ہوتی تو وہ جرم کا حصار توڑ کر نکل جاتا۔

رویوں کی تبدیلی سے مجرموں کی اصلاح کا انقلابی تصور ایک امریکی ماہر ڈین میکڈوگل نے نہ صرف دیا بلکہ اسے ثابت کیا۔ مجرموں کی اصلاح کے کام میں اس کی شمولیت ایک واقعہ کے ذریعہ ہوئی۔ 1950ء کے وسط میں میکڈوگل (جو وکیل تھا) کے پاس کسان آئے، جنہیں فیڈرل حکام سے شکایت تھی کہ جارجیا کے ایک ڈیم سے زیادہ پانی بہنے کی وجہ سے ان کی فصلوں اور مویشیوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ چونکہ ان کی شکایت جائز تھی اس لیے میکڈوگل کو امید تھی کہ ان کے مقدمہ کا جلدی فیصلہ ہو جائے گا۔ مگر جب حکام نے ان کی بات نہ سنی تو اسے سخت حیرت ہوئی۔ ڈیم کے انجینئر انچارج نے اس سے کہا کہ تم انڈوں کے بغیر آملیٹ نہیں بنا سکتے۔ بہرحال کاشتکاروں کی شکایت رفع کرنے میں تین برس اور 46 ہزار ڈالر صرف ہو گئے۔

جس بات نے میکڈوگل کو پریشان کر دیا وہ حکام کو اپنی بات سنانے میں پیش آنے والی مشکل تھی۔ گویا کہ انہوں نے کانوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں۔ اسے اس کی وجہ اس وقت سمجھ آنے لگی جب اس نے ہارورڈ میں کیے جانے والے ڈاکٹر جیروم برنر کے تجربہ کا حال سنا۔ ڈاکٹر برنر تحرک کے دماغ تک جانے کا راستہ متعین کرنا چاہتا تھا۔ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ برقی لہروں کے ذریعہ حرکت کے ساتھ سفر کرتی ہیں اور تجربہ کرنے والوں نے اعصابی نظام میں الیکٹروڈ رکھ دیئے تھے۔ وہ اپنے تجربہ میں بلی سے کام لے رہے تھے تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ کون سی عصبی لہریں کس وقت وہاں سے گزرتی ہیں۔ انہوں نے معلوم کیا کہ اگر بلی ایک

خاموش کمرہ میں رکھی جائے اور ایک تیز آہٹ کی آواز اس کے کانوں میں آئے تو اس آواز کا پتہ اس وقت چل سکتا ہے جب وہ اعصاب سے ہو کر (دماغ کی بیرونی جھلی) تک جاتی ہے۔

پھر انہوں نے Bell Jar میں دو سفید چوہے رکھے اور اسے بلی کے سامنے رکھ دیا۔ کلاک کی آواز پھر آئی اور عجیب بات ہے کہ ان کے آلات نے کوئی برقی لہر ریکارڈ نہیں کی۔ یہ بے معنی بات تھی۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ بلی بڑے غور سے چوہوں کو گھور رہی ہے اس لیے وہ لہروں کو نظر انداز کر رہی ہے۔ لیکن اگر کان کے پردے میں جنبش ہوتی تو لہر کو (رگ) کے ساتھ دماغ میں رجسٹر ہونا چاہیے تھا۔ لگتا تھا کہ بلی کسی طرح کان کے پردے پر آواز بند کر رہی تھی دوسرے تجربوں سے بعد میں پتہ چلا کہ بلی آواز روکنے کے لیے اور کانوں کے پردے بند کرنے کے لیے جوابی لہروں سے کام لیتی ہے۔

میکڈوگل کو یہ حیرت انگیز خبر بھی ملی کہ ہماری پانچ حسیات معلومات کے تقریباً دس ہزار یونٹ ایک سیکنڈ میں حاصل کرتی ہیں اور یہ ساری معلومات دماغ کے پروسیسنگ سسٹم کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ مگر دماغ دس ہزار میں سے صرف سات فیصد استعمال کر سکتا ہے۔ باقی 9993 یونٹ نظر انداز کرنے پڑتے ہیں۔ اس لیے کہ دماغ کے 'فلٹر' سسٹم کی کارگزاری عمدہ ہوتی ہے۔ میں جب یہ صفحات ٹائپ کرتا ہوں تو میرے جسم کو کئی محسوسات کا سامنا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ میرے پاؤں ٹھنڈے ہیں۔ صبح میں نے اپنا انگوٹھا زخمی کر لیا تھا جس میں اب بھی درد ہو رہا ہے۔ آفٹر شیو لوشن کی وجہ سے ٹھوڑی اب تک جل رہی ہے۔ اپنی کرسی اور اپنے کپڑوں کا بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔ دروازہ سے آنے والی ہوا اور کئی چھوٹے چھوٹے احساسات، کہ اگر میں چاہوں تو ان پر فوکس ہو سکتا ہے۔ مگر جب میں لکھ رہا ہوتا ہوں تو میں انتخاب نہیں کرتا، نظر انداز کرتا ہوں یا میرا شاندار امتناعی نظام میری جگہ میرا کام کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص میری امتناعی رگیں کاٹ دے تو مجھ میں انہماک کی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔

میکڈوگل کی گہری بصیرت نے صرف وفاقی حکام کی اپنے فرائض اور لوگوں کے مسائل سے بے تعلقی واضح نہیں کی بلکہ جرائم پیشہ افراد کی سماج دشمنی کا پردہ چاک کیا ہے۔ بنیادی طور پر مجرم وہ فرد ہے جس کا نظریہ زندگی کے متعلق منفی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات صرف چھینا جھپٹی کے ذریعہ ہی پوری کر سکتا ہے۔ وہ زندگی کے اس منفی نقطۂ نظر کو رَد کرنے والی ہر چیز کے خلاف ہے۔ ڈکنز کا اسکروج 'منفی رکاوٹ' کی اچھی مثال ہے۔ بچپن کی تنہا زندگی سے اس نے یہی سیکھا کہ دنیا بڑی ناخوشگوار جگہ ہے۔ اس لیے زندگی کے معاملے میں وہ ڈرا اور سہا ہوا

ہے۔ کرسمس کو بھی فضول اور بے معنی سمجھتا ہے۔ وہ لڑکی جس سے کبھی اس کی منگنی ہوئی تھی اس کے مسئلہ کی نشان دہی کرتے ہوئے کہتی ہے کہ "تم دنیا سے بہت ڈرتے ہو۔" وہ اپنے تاریک کمرے میں ویران زندگی بسر کرتا ہے مگر اسے ہی اپنی دنیا قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے سامنے کوئی امکان نہیں۔ اس کے دل میں کوئی امید نہیں۔ وہ جلدی میں ہے خردبین کے جال میں پھنس چکا ہے۔ شارٹ کٹ کی تلاش میں ہے۔ کرسمس کا خیال اسے اپنا بچپن یاد دلاتا ہے۔ اس کے دل میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ بے معنی رکاوٹیں دُور ہوتی ہیں تو اسے احساس ہوتا ہے کہ فضا میں ہزار خوشبوئیں ہیں، مہک ہے اور ہر مہک کے ساتھ ہزاروں خیال وابستہ ہیں۔ اس طرح دنیا میں پوشیدہ ہزار دنیائیں اس پر اپنے دروازے کھول دیتی ہیں۔

ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اسکروج کی 'بے معنی رکاوٹ' اس کے لفظوں کے فہم میں جھلکتی ہے۔ اگر کوئی ماہر نفسیات اس سے کرسمس، مہربانی، سخاوت، محبت اور ہمسایہ داری جیسے الفاظ کے ساتھ کوئی اور لفظ جوڑنے کو کہتا تو وہ کرسمس کو منافقت، مہربانی کو فریب، سخاوت کو حماقت، محبت کو ذہنی معذوری اور ہمسایہ داری کو اکتاہٹ کہتا۔

مجرموں کو ٹھیک کرنے کے سلسلہ میں، ان کے مسئلہ کا یہی حل تھا جو میکڈوگل نے خود سوچا تھا۔ اس نے ولیم جیمز کا ذکر کیا ہے جس نے کہا تھا کہ میری نسل نے سب سے بڑا انکشاف یہ کیا ہے کہ 'انسان اپنے ذہن کا رویہ بدل کر اپنی زندگی بدل سکتا ہے۔ اور اس کے خیال میں انسان کا رویہ لفظوں کے فہم پر منحصر ہے۔ جہاں جرم کا تعلق ہے، کلیدی الفاظ مذہب، محبت، گناہ، ہمسایہ، سزا اور ذمہ داری ہیں۔ سماج دشمن عناصر کا فہم ان لفظوں کے سلسلہ میں نامکمل یا متضاد ہوتا ہے۔ مثلاً اکثر شرابی مانتے ہیں کہ ان کی بدحالی ان کی اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہے پھر بھی وہ اس کی ذمہ داری کسی اور پر عائد کرتے ہیں کیونکہ ذمہ داری کے متعلق ان کا تصور مہمل اور متضاد ہے۔

دراصل میکڈوگل مجرموں کا رویہ بدلنے، ان کی ذہانت سے مخاطب ہونے اور انہیں ان بنیادی الفاظ کے صحیح اور مکمل معنی سمجھانے نکلا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ نیا عہد نامہ ایک منظم سماج کے لیے مکمل تعلیم کا درجہ رکھتا ہے اور یہ کہ اور یجنل آرامی (حضرت عیسیٰؑ کے دور کی شامی زبان) میں انگریزی ترجمہ کی نسبت لفظوں کے معنی زیادہ صحیح ہیں۔ مثلاً 'خود' (**Self**) کے لیے لفظ '**naphshaُ**' ہے۔ اس کا مطلب **true self** یعنی انسان کی بنیادی ہستی ہے۔ جبکہ ہمیں سکھایا گیا ہے کہ خود پسندی ناپسندیدہ ہے کیونکہ یہ خودغرضی کا دوسرا نام ہے۔ مگر نیا

عہدنامہ کہتا ہے کہ ہم ہمسائے سے اس طرح محبت کریں جس طرح خود (self) سے کرتے ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ انسان کو خود (self) سے محبت کرنی چاہیے اور میکڈوگل سمجھتا ہے کہ یہ تصور عیسائیت کے بنیادی تصورات میں سے ایک ہے۔ جہاں تک پینزم کا معاملہ ہے اس کی بات سمجھنا آسان ہے۔ پینزم کو اپنے آپ سے نفرت تھی اور یہ بات اس نے کئی بار کہی۔مگر اس کی اپنی لکھی ہوئی سوانح سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی حد تک ذہین اور نیک تھا اور یہ اس کی بنیادی خوبیاں تھیں، اگر انہیں پہچان لیتا تو وہ کبھی بھی جرم نہ کرتا۔ مجرم ہونے کی حیثیت میں بھی اس نے اپنی ذہانت کے ذریعہ سمجھ لیا تھا کہ اسے اپنی 'naphasha' سے محبت کرنے کا حق حاصل ہے اور اس معاملہ میں اسے شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔

میکڈوگل نے ریاست جارجیا کے ایک قید خانے میں ان خیالات پر تجربہ کرنے کی اجازت لی۔اس نے تجربہ کی بنیاد اس مفروضہ کو بنایا کہ مجرم اتنے ذہین ضرور ہوتے ہیں کہ وہ برنز کے اس تجربہ کا مطلب سمجھ سکیں جو اس نے بلی کے سلسلہ میں کیا تھا کہ مجرم بعض چیزوں کو دیکھنے اور سننے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ قانون فطرت ہے کہ ہر شخص اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مجرم کی مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنے ناقص رویہ اور ابتر اپروچ کی وجہ سے اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ ہمیں ہیگ کی مثال سے اندازہ ہوا ہے کہ مجرم کی چالاکی ہی عام طور پر اس کی حماقت ہوتی ہے۔ مجرم کا بڑا مسئلہ ایک شرابی کی طرح اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ٹھیک قدم نہیں اٹھتا اور زندگی کو برا بھلا کہنے لگتا ہے۔ وہ مجرموں کو بتانا چاہتا ہے کہ اصل مسئلہ ان کے منفی رویے اور ان کا کنفیوژن ہے۔

اس تجربہ کے نتائج شان دار تھے۔ جارجیا کے اصلاحی قید خانے کے ابتدائی تجربات سے ظاہر ہوا کہ 63 فیصد قیدی (جن میں پینزم جیسے کئی نفسیاتی مریض بھی ہیں) چند ہفتوں کے اندر زندگی میں بحال ہو سکتے ہیں۔ تجربہ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اٹھارہ مہینے بعد پتہ چلا کہ اس عرصہ میں کوئی مجرم صحیح راستہ سے نہیں بھٹکا۔ میکڈوگل کی انسٹیٹیوٹ (جو اس وقت یونان Yonan کوڈیکس فاؤنڈیشن کہلاتی تھی) کے انسٹرکٹروں نے پہلے دو قیدیوں کو اپنے طریقہ سے دو ہفتے تربیت دی۔ پھر ان چاروں نے دوسرے بائیس قیدیوں (جن میں چار انسٹرکٹر کے طور پر چن لیے گئے تھے) کو تربیت دی۔ بعد میں کورس کا نام بدل کر جذباتی بلوغت کا ادارہ رکھا گیا۔ میکڈوگل نے اس کے کام کی ایک عمدہ مثال دی ہے کہ ایک قیدی کو کوئی دوسرا قیدی بہت برا لگتا تھا اور وہ اس کے خلاف بآسانی مشتعل ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ

جیک ایبٹ کا کہنا ہے کہ ایسے حالات میں قید خانے کی اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ دونوں آپس میں لڑ کر فیصلہ کریں اور اگر ایک قیدی دوسرے کو ہلاک کر سکتا ہے تو وہ ضرور ایسا کرتا ہے۔ قتل کا خواہش مند قیدی لڑائی کرنے کے لیے لوہے کا ایک پائپ کہیں سے لے آیا، مگر معافی کے تصور پر غور کرتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ یہ کیا بکواس ہے۔ یہ شخص تو میرا ہمسایہ ہے اور اس کے اپنے بگڑے ہوئے خیالات اسے ایک ایسا کام کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں جو بنیادی طور پر اس کے مفاد کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس نے دوسرے شخص کی خاطر سینڈوچ اور کافی خریدی اور دونوں حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے لگے، اس طرح ہمیشہ کے لیے دوست بن گئے۔

پہلی نظر میں تو لگا کہ میکڈوگل نے پرانی طرز کے ایونجلزم کو قید خانہ میں لانے کا راستہ نکال لیا ہے۔ مگر غور کریں تو احساس ہوتا ہے کہ ایسا سوچنا تو اصل بات کو نظر انداز کرنا ہے۔ اس کا بنیادی خیال تھا کہ بہت سے مجرم اپنی صلاحیتوں کی سطح سے بہت گر کر مصروف عمل ہیں۔ سارے انسانوں میں ترقی کرنے، پھلنے پھولنے اور اپنے مقاصد پورے کرنے کی ضرورت ایک جیسی ہوتی ہے۔ انہیں ان کی ذہانت کا احساس دلا کر، ترقی کا راستہ دکھا کر میکڈوگل نے ان کے بنیادی رویے بدل دیے تھے۔ درحقیقت اس کے طریقے کو دو عشرے پہلے ہی ہنگری کے ایک باشندے الفرڈ رینلڈ نے جان لیا تھا جس نے 1930ء کے عشرے میں اپنا وطن چھوڑا اور انگلستان میں رہنے لگا۔ جنگ کے دنوں میں وہ فوج کے محکمہ جاسوسی میں تھا۔ 1945ء میں اسے نوجوان نازی افسروں کو نازی ازم سے نجات دلوانے کا ناممکن کام دیا گیا۔ اس نے قیدی نازی افسروں کے کمرے میں داخل ہونے کا حال بتایا ہے کہ جب اس نے ان کے کمرے میں قدم رکھا تو ایک 'یخ بستہ دشمنی' کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اسے گھورنے لگے اور برنز کی بلی کی طرح ارادہ کر لیا کہ وہ جو بھی کہے اسے کانوں کے پردوں کے قریب آنے سے پہلے ہی کاٹ دیں گے۔ مگر انہیں حیرت ہوئی کہ نازی ازم کی برائیوں پر کوئی لیکچر نہیں دیا گیا۔ بلکہ اس نے ان سے کہا کہ وہ نازی ازم کے بارے میں اپنے خیالات اسے بتائیں۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ واقعی نازم ازم کے متعلق جاننا چاہتا ہے تو انہوں نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا، ان سے سوالات کیے، تضادات کی نشان دہی کی، چند دنوں میں نازی ازم کا بھوت ان سب کے سر سے اتر گیا۔

اس نے بس یہ کیا کہ انہیں اس حقیقت سے باخبر کر دیا کہ دنیا کے تمام مذاہب اور

ہر آئیڈیالوجی انسان کو صرف اپنے بارے میں سوچنے سے روکتی ہے۔ اس نے ہٹلر پر تنقید نہیں کی بلکہ انہیں موقع دیا کہ وہ ہٹلر کا نظریہ اسے سمجھائیں۔ یہاں تک کہ انہیں احساس ہونے لگا کہ وہ کسی اور کے خیالات کے محتاج نہیں اور یہ کہ وہ خود اپنے خیالات کی تشکیل کے اہل ہیں۔ اس نے یہ اس طرح کیا کہ نازی ازم کے خلاف مہم کو مناظرہ بنا دیا۔ باقی کام اپنی خیال انگیزی سے حاصل ہونے والے سرور نے کر دیا۔

رینلڈز کا کہنا ہے کہ زندگی میں مجرموں کی بحالی کا انحصار تعلیم کی نوعیت پر نہیں ہوتا، تعلیم چاہے مذہبی، اخلاقی، سیاسی، کسی قسم کی بھی ہو، بحالی کا انحصار اس پر ہے کہ انہیں اپنے دماغ سے کام لینا سکھایا جائے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ ان کے پاس بھی دماغ ہیں اور وہ اپنے فیصلے خود کر سکتے ہیں۔ مجرم کے تشدد کی لہر اس احساس سے ابھرتی ہے کہ اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے اس کے سامنے تشدد کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ درحقیقت وہ اپنے مقاصد پورے کرنے میں شروع ہی سے ناکام ہو رہا ہے کیونکہ وہ اپنے اس منفی اندازے پر چلتا ہے کہ اس کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے اور منفی اندازے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ہپنوسس کا باعث بنتے ہیں۔ جس لمحے وہ اپنے منفی اندازے کو مثبت سے بدلتا ہے اُسی لمحہ اس کی کنٹرولنگ خودی بیدار ہو جاتی ہے اور کمان سنبھال لیتی ہے۔ اپنے آپ کو کنٹرول کر لینے کا احساس بھی اپنی ذات کا عرفان naphsha کا احساس ہے۔ میسلو اور دیگر ماہرین نفسیات کے مطابق شرابی بھی نشہ آور LSD کی مدد سے ایسی ہی پہچان کے ذریعہ صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ جب LSD کے ذریعہ شراب سے نجات کا خیال پہلی دفعہ دو معالجوں ابرام ہوفر اور ہمفری اوسمنڈ کو آیا تو ان کا مقصد دراصل DTS جیسے تجربہ سے مریض کو خوف زدہ کرنا تھا۔ مانی ہوئی بات ہے کہ کئی شرابی، شراب نوشی انتہا تک پہنچنے کے بعد سنبھلنا شروع ہوتے ہیں۔ نشہ میں بدحواس ہونے، لڑکھڑانے کی حالت میں بعض ڈاکٹر LSD کا استعمال زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ میسکالین کی طرح LSD دیکھنے، سننے، سونگھنے اور بولنے کی صلاحیت کو بدل دیتی ہے۔ ان میں زیادہ شدت آ جاتی ہے۔ ہوفر اور اوسمنڈ نے جان لیا تھا کہ اگر LSD کے زیر اثر ان کے مریض کسی مذہبی یا روحانی تجربہ سے دوچار ہوں تو ان کے صحت یاب ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ میسلو نے اپنے بعض تجربات میں اسی اصول سے کام لیا۔ وہ جانتا تھا کہ شراب کے عادی افراد عام لوگوں سے زیادہ حساس اور ذہین ہوتے ہیں۔ انہیں مصائب اور تکلیفات زیادہ بد دل کرتے ہیں اس لیے وہ شراب نوشی میں پناہ لیتے ہیں۔ شروع میں تو

شراب کا نشہ انہیں اڑا کر آسمانوں کی سیر کراتا ہے مگر جلد ہی وہ مایوس اور بددل ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت سے نجات پانے کے لیے مزید شراب پیتے ہیں اور مزید بددل ہوتے ہیں۔ بے بسی اور جرم کا احساس اس منفی عمل کو اور پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ میسلو نے اپنے مریضوں سے ان کے شاعری اور پینٹنگ کے جمالیاتی تجربوں کی تفصیل پوچھی جن سے وہ شراب نوشی سے پہلے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر اس نے سیکالین یا LSD کے ذریعے انہیں سکرین پرنٹنگ، موسیقی اور شاعری کی مدد سے بلندیوں کی سیر کرائی جس سے ان میں گہری مسرت اور شادمانی کا احساس پیدا ہوا۔ اس طریقہ سے کتنے ہی مریض صحت یاب ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مریضوں کے اندر پیدا ہونے والی خوشی اور سکون نے ان کی امیدوں کو بیدار کر دیا تھا۔ انہوں نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ ان کا ارادہ مضبوط ہو اور صحت اچھی رہی تو ان کی امیدیں ضرور پوری ہوں گی۔ وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ ''اونچی اڑان کے لیے زیادہ پینا بھی نقصان دہ ہے۔'' انہوں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور شراب ترک کر دی۔ درحقیقت میسلو بھی وہی کر رہا تھا جو میکڈوگل اور ریناڈز نے کیا تھا۔ یعنی ضبط نفس کا جذبہ بیدار کرنا۔

اس تمام عمل میں سے اہم نکتہ جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ان خیالات کا اطلاق صرف مجرموں پر ہی نہیں بلکہ ہر شخص پر ہوتا ہے۔ ہم سب اپنے وقت کا بڑا حصہ ایک ایسی حالت میں گزارتے ہیں جو ہیپنوسس سے مشابہ ہوتی ہے۔ ہم سب اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ بوریت یا بے سمت ہونے کی حالت میں بسر کرتے ہیں میکڈوگل، ریناڈز اور میسلو کی رائے کا اطلاق صرف مجرم پر نہیں بلکہ کمپنی ڈائریکٹر پر بھی ہوتا ہے۔ اس کی تصدیق سائیکوتھیراپٹک میتھڈ (جسے est کہتے ہیں) کے بانی ورنر ارہارڈ نے بھی کی ہے۔ جیسا کہ اس کی سوانح (مصنفہ ڈبلیو ڈبلیو بارٹلے) میں بتایا گیا ہے کہ est کا حاصل 'صحیح شناخت' ہے۔ یہی میکڈوگل کے خیالات کی جان ہے اور اسی خودشناسی کے ذریعہ فرد کی زندگی اور شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ ہم 'حالات کی پیداوار' نہیں ہیں۔ ہم صرف اس وقت ایسا سوچتے ہیں جب ہمارے حالات خراب ہوتے ہیں۔ مایوسی کی اس حالت میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم محض اپنے ذہنی اور جذباتی عمل کی پیداوار ہیں، جیسے حرارت، آگ کی پیداوار ہے۔ ایک اہم امریکی فزیشن ہاورڈ ملر (جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے) کا مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے۔ وہ 'بنیادی تم' اپنی ہی فطرت کو سمجھنے میں ناکام رہتا ہے، وہ دماغ کے کسی کونے میں بے بس بیٹھا رہتا ہے۔ جذباتی اور جسمانی حالتوں کا مشاہدہ اس طرح کرتے ہوئے جیسے وہ موسم کی طرح کنٹرول سے باہر

ہوں۔ جونہی کسی بحران کا احساس ہوتا ہے تو ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی خودی بیدار ہوتی ہے اور شعور کی رہنمائی میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ اس صورتِ حال کا موازنہ کسی بحری جہاز کے کپتان سے کیا جا سکتا ہے جو حافظہ کی خرابی کا شکار رہا ہے اور جو اپنے کیبن میں بیٹھا دیکھ رہا ہے اور حیران ہو رہا ہے کہ جہاز چکر کاٹتے ہوئے جا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاز کے پل پر کوئی شخص موجود نہیں۔ آیئے ہم ان خیالات کو مختصر کر کے دیکھیں۔

جرم منفی رویوں کی پیداوار ہے۔ منفی رویوں کی بنیاد ہمارے دیکھنے اور انتخاب کرنے کا میکانزم ہے۔ ایک شخص جسے ابھی ابھی فائرنگ سکواڈ سے نجات ملی ہے، اپنی تمام حسیات کے دریچے کھول دیتا ہے، اس کی نظر ہر چیز پر ہوتی ہے اور ہر چیز اسے دلچسپ اور دلکش لگتی ہے۔ جیسے کہ امریکی قاتل چارلی برگر نے پھانسی کے تختہ سے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ 'دنیا بڑی خوبصورت ہے۔' دنیا خوب صورت ہے مگر اسے اس کا پتہ بہت دیر بعد چلا تھا۔ اگر پہلے پتہ چلتا تو بہت سے لوگ اس کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ جاتے۔

ایک شخص نے ایک بار جان بوجھ کر چیزوں کی تفصیل (جیسے آسمان نیلا ہے) پر اپنے ذہن کے دریچے بند کر دیے۔ اس نے اپنے آپ کو ایک خطرناک باریک دھاگے کے ساتھ خارجی حقیقت سے جوڑ لیا۔ یہ دھاگا اس کے فوری مقاصد تھے اور اب وہ اپنے سر کے اندر ایک طرح کے غار میں رہتا ہے۔ اس غار کے اندر خارجی دنیا کی بے شمار تصاویر رکھی ہوئی ہیں۔ غار کی دیواروں پر حقیقت کے نقشے آویزاں ہیں۔ ان تصورات کے نقشے کہ زندگی کے مسائل سے کیونکر عہدہ برآ ہوا جائے۔ مذہبی لوگوں کے لیے مذہبی، سیاستدانوں کے لیے سیاسی اور ماہرین نفسیات کے لیے نفسیاتی نقشے ہیں۔ معمولی لوگوں کے نقشے ان کے والدین سے لیے گئے ہیں۔ ان لوگوں سے جو انہیں پسند کرتے ہیں اور خود ان کے تجربات سے وضع کیے گئے ہیں۔ اگرچہ اس آخری قسم کی اہمیت کم ہے۔ جب ایک نئی صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے ایک شخص ان پرانی تصاویر اور اپنے نقشوں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کا رویہ بہتر ہوتا ہے۔

وہ ایسے فوٹوگراف چنتا ہے جو اسے آج کی یاد دلاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر وہ ایک چاند نما چہرہ کے اجنبی سے متعارف ہو رہا ہے جس کا سوٹ سلیٹی اور لہجہ اجنبی ہے تو اس کا حافظہ کئی اجنبیوں کی تصاویر اس کے سامنے لائے گا جن کے چہرے چاند جیسے، سوٹ گرے اور لہجہ غیر ملکی ہوگا۔ اگر ان میں سے اکثر لوگ اسے پسند آئیں تو وہ اپنی اس نئی شناسائی کو خوش آمدید کہنے کے لیے پہلے ہی سے تیار ہو جاتا ہے۔ مگر اسے پورا یقین ہوتا ہے کہ اس کے فیصلہ

کی بنیاد اس کے حالیہ مشاہدات ہیں۔ جب وہ ایک اجنبی سے ہاتھ ملا رہا ہے تو اجنبی مسکراتا ہے اور اپنا سونے کا دانت دکھاتا ہے جس سے اسے ایک ہمسائے کا خیال آتا ہے جس نے اسے سیب چراتے ہوئے پکڑا تھا، تو اس کے دل میں ناقابل بیان نفرت پیدا ہوتی ہے۔

یہ تمام میکانزم لاکھوں برس کے ارتقا کا حاصل ہے اور جاننا آسان ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ 'عادت میکانزم' کی گرفت میں ہیں۔ اپنی عادت کے غلام ہیں۔ ہم ڈائنا سور کی طرح ہیں کہ جن کے جسم اتنے بھاری بھرکم تھے کہ ان کے لیے ہلنا جلنا یا حرکت کرنا ایک عذاب تھا۔ مگر انسانوں کے معاملہ میں روبوٹ (عادت بھرا جسم) ہے جو اتنی وسعت اور بڑائی اپنے اندر لیے ہوئے ہے کہ ہمارے اکثر کام وہ سرانجام دیتا ہے۔ اوسط انسان اپنی عادت بھرے جسم (habit body) کے اندر رہتا ہے جیسے چوہا ونڈمل میں رہتا ہے۔ ہمارے عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارا میکانزم مزید ناکارہ اور بوجھل ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ آزادی اور مسرت کے وہ لمحات کم سے کم تر ہونے لگتے ہیں جو زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بناتے ہیں۔ اسی لیے گرڈجیف کہتا ہے کہ کئی لوگ اپنی جسمانی موت سے بہت پہلے مر جاتے ہیں۔

اس جائزہ کی رو سے نسل انسانی کا مستقبل اگرچہ امید افزا نظر نہیں آتا مگر ڈائنا سور کے ساتھ اس کا موازنہ گمراہ کن ہوسکتا ہے۔ اس مسئلہ کا تعلق انسان کے طویل ارتقائی عمل سے نہیں بلکہ اس کی آج کی زندگی سے ہے۔ جیسا کہ ورڈزورتھ کا کہنا ہے کہ 'بچے بعض اوقات چیزوں کو نورانی ہالے میں دیکھتے ہیں، وہ بلوغت کا دور ہوتا ہے جس کے آتے آتے قید خانہ کے سائے سمٹنے لگتے ہیں' اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ بات اتنی ناگزیر بھی نہیں جتنی کہ ورڈزورتھ سمجھتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ غلط رکاوٹیں ہیں۔ ارتقا کے اس مرحلہ پر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ تسلیم کرے کہ اس کے شعور کی باگ ڈور اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر ہم غیر شعوری طور پر اپنے ذہن کے دریچے بند کر لیتے ہیں تو ہم اپنے شعور کی قوت سے انہیں پھر کھول بھی سکتے ہیں۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ اس کا جواب **Curious Facts** نامی ایک کتاب کے اس پیراگراف میں ہے:

> ''مسز مارفا ڈریو، ایک 51 سالہ گھریلو خاتون نے ایک سے دس لاکھ تک ہر ہندسہ ٹائپ کیا کیونکہ اس کے بیٹے کے استاد نے بچے سے کہہ

دیا تھا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اس کام میں مسز مارفا ڈریو کے پانچ سال اور کاغذ کے 2473 صفحات لگے۔

اس طرح وقت ضائع کرنے کے خیال ہی سے سانس رک جاتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ بے معنی، بے مقصد اور بنجر کوئی اور چیز ہوسکتی ہے؟ کسی شخص کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ایسے لاحاصل بکھیڑے میں الجھے؟ مگر ان تمام سوالات کا جواب بہت سادہ ہے۔ اس معاملے کے پیچھے ایک ٹیچر، ایک اتھارٹی یعنی طاقت اور اختیار کی علامت ہے، جس نے اس کے بیٹے سے کہہ دیا تھا کہ یہ کام ناممکن ہے۔ مسز مارفا نے اس موقع پر فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اس معاملہ میں اتھارٹی کو چیلنج کیے بغیر نہیں رہے گی اور ثابت کرے گی کہ اس کا اندازہ اتھارٹی کے اندازہ سے زیادہ صحیح ہے۔ اس ضد میں آ کر مسز مارفا نے اپنی زندگی کے پانچ سال ضائع کر دیے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مسز مارفا کا ذہنی رویہ پیپزم کے ذہنی رویہ جیسا ہے، یعنی اتھارٹی کو چیلنج کرنا، اس کی مزاحمت کرنا۔ یہی مزاحمت جرم کی خصوصیت ہے جس کی منطق تکلیف دہ حد تک ناقابل فہم ہے۔ اس پروفیسر کی طرح جو مہمانوں کی دیکھ بھال کے بجائے ہپنوسس کے زیر اثر سونے چلا گیا۔ اگر اس خاتون کو یہ اندازہ ہوتا کہ استاد بھی غلطی کر سکتے ہیں تو وہ اپنے پانچ سال ضائع ہونے سے بچا لیتی اور خود پانچ سال کی قید بامشقت سے بچ جاتی۔ مگر یہ جاننے کے لیے اسے اپنا رویہ نہ صرف اتھارٹی کے ساتھ بلکہ خود اپنے ساتھ بدلنا پڑتا۔ معاشرے نے اسے اتھارٹی کے اور نتیجتاً خود اس کی ذات کے مخصوص تصور کا پابند کر دیا تھا۔

انسان نے اشرف المخلوقات کا درجہ اس لیے حاصل کیا ہے کہ وہ روئے زمین پر سب سے زیادہ دوست اور ملنسار، سماجی مخلوق ہے۔ چونکہ وہ سماجی مخلوق ہے اس لیے وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے دوسرے لوگوں کے اشارے کا منتظر رہتا ہے۔ اس کی سماجی ہستی کی تاریخ ہی میں اس کے جرم کا راز پوشیدہ ہے۔

انسان—— ارتقا کے زینہ پر

زیرِ نظر چند سطریں دو مختلف کتابوں سے لی گئی ہیں۔ ان سطروں کا موضوع اذیت پسندی ہے، حقیقی اور خیالی۔

شارکوئی پر ترکوں کے دوبارہ قبضہ کے بعد ہم انور پاشا کی کہانی سن کر سو گئے تھے۔ انور پاشا صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے پرنس جمیل اور سٹاف کے ساتھ سٹیمر میں روانہ ہوا۔ جب وہ محاذ پر پہنچے تو بلغاری ترکوں کو قتل کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔ ان کے کسان بھی ان کے ساتھ چلے گئے تھے۔ چنانچہ ترک وہاں کسے قتل کرتے۔ ایک سفید ریش شخص کو عرشہ پر لایا گیا تا کہ اسے ہراساں کیا جائے۔ کمانڈر انچیف جب اکتا گیا تو اس نے اشارہ کیا کہ اس شخص کو آتش دان میں دھکیل دیا جائے۔ بوڑھا چیختا رہا مگر دونوں افسروں نے اسے اندر دھکیل کر آتش دان کا دروازہ بند کر دیا۔ ہم افسردہ ہو کر وہاں سے جانے لگے تو انور پاشا نے ہمیں روک لیا اور کان لگا کر کوئی آواز سننے لگا، آتش دان سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی تو مسکرا کر بولا۔ ''ان کے سر ہمیشہ اسی طرح اچھلتے ہیں۔''

اس رات وہاں کا تیز چکر لگا کر میں اپنے اپارٹمنٹ واپس آ گئی مگر میں سو نہ سکی۔ پُر تشدد حرکات اور الفاظ سے میں اتنی مشتعل تھی کہ میں نے سوچا کہ مجھے کوئی ایسا جرم کرنا ہے جو صرف میرا ہو۔

دماغ میں برے خیالات کی بھرمار سے تنگ آ کر میں بستر سے باہر نکلی اور سرونٹ کوارٹرز کی طرف چل دی۔ وہاں سے میں نے خدمت گار کے کپڑے اور چوکیدار کا پستول چرایا، ایک فیشن ایبل جنٹلمین لگتی ہوئی میں رات کی تاریکی میں

غائب ہوگئی۔

گلی کے نکڑ پر پہنچ کر میں راستہ سے ایک طرف ہوگئی اور کسی کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ جرم کرنے کے خیال سے میرے رگ و پے میں سنسنی خیز لہریں دوڑ گئیں، ایسی کہ جن کا تجربہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ میرا جسم پسینہ میں بھیگ گیا، میرے اندر جنسی خواہش نے تلاطم برپا کر دیا، میں سلگ رہی تھی، جل رہی تھی اور مجھے اپنے شکار کی تلاش تھی۔

اچانک اپنی شیطانی خواہش کے جواب میں کسی کو میں نے کراہتے ہوئے سنا۔ ایک عورت کی ہلکی دھیمی اور دردناک آواز تھی۔ جس طرف سے آواز آ رہی تھی اس طرف دوڑتے ہوئے میں نے ایک دروازہ کے زینہ پر ایک نحیف لاغر اور سمٹی ہوئی عورت دیکھی۔

''کون ہو تم؟'' میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا

''قسمت کی ماری ایک عورت، اگر تم موت کے فرشتہ ہو تو میں تمہیں گلے لگا لوں گی۔''

''مگر تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' میں نے دیکھا کہ غم کے باوجود، وہ ایک خوش شکل عورت تھی۔

''میرا شوہر جیل بھیج دیا گیا ہے، بچے بھوکے ہیں اور یہ گھر، جس کے زینہ پر میں ہوں، میرا ہے۔ مگر مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔''

پہلا واقعہ ٹی ای لارنس (لارنس آف عریبیا) کی یادداشتوں میں سے ہے جبکہ دوسرا واقعہ داساد کے ایک ناول سے لیا گیا ہے۔ داساد کی بات کو ذرا مختصر کیا گیا ہے کیونکہ اسے رحم کے لیے عورت کی اپیلوں کو طول دینے میں مزا آتا ہے۔ ظلم کی دونوں قسمیں واضح طور پر مختلف ہیں۔ ان کی کوالٹی بھی یکساں نہیں۔ داساد یہ بات صاف کر دیتا ہے کہ اس کی جیولیٹ میں قتل کرنے کے خیال ہی سے شدید جنسی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر انور شاپا کے متعلق شبہ ہوتا ہے کہ کیا اس نے اپنے ظلم سے ایک وحشیانہ لذت کے علاوہ بھی کچھ سیکھا ہے؟ ورنہ انور کا ظلم محض حماقت ہے جو تخیل کے دیوالیہ پن سے پیدا ہوتی ہے۔ داساد کا ظلم شعوری ہے اور تخیل کی کثرت کا نتیجہ ہے۔ اس کی پشت پر قید خانہ کے وہ کئی برس ہیں جب جنسی خواب دیکھنے کے سوا کچھ بھی کرنے کو نہیں تھا۔ اس کے باوجود دونوں مثالوں میں اذیت رسانی کی

بنیاد ذاتی غرور و تکبر ہے۔ ایک اذیت پسند کو بھی اس سے اپنی زَد آوری کا ویسا ہی احساس ہوتا ہے جیسا کہ ایک ''رائٹ مین'' کو ہوتا ہے، جو ڈرا دھمکا کر اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔

تخیل سے یہی محرومی اور خود غرضی جرم کی روحِ رواں ہے۔ حملہ آور جو ایک ضعیف عورت پر ظلم کرتا ہے یا ٹیلی فون توڑ دیتا ہے، اسے ایک بچے کی طرح اپنے مطلب سے غرض ہے۔ بچہ بھی دودھ کے لیے روتا اور چلّا تا ہے۔ فرائیڈ ٹھیک ہی کہتا ہے کہ اگر ''بچہ کے پاس طاقت ہو تو وہ ساری دنیا تباہ کر سکتا ہے۔'' 1961ء میں دو ماہرین جنسیات سیموئیل یوکلسن اور سیم ناؤ نے نیو یارک کے ایک ہسپتال سینٹ الزبتھ میں مجرموں کی ذہنیت کا مطالعہ شروع کیا۔ انہوں نے اس خیال کو اپنے کام کی بنیاد بنایا کہ انسان گہری نفسیاتی پیچیدگیوں اور مسائل کی وجہ سے مجرم بنتا ہے۔ وہ دونوں ماہرین نفسیات ہمدرد اور آزاد خیال تھے، اس لیے جلد ہی اپنے مریضوں میں مقبول ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ اکثر مجرم برے سماجی حالات یا ابتدائی بچپن کے مسائل کی وجہ سے جرم کے راستہ پر چلتے ہیں اور ضروری بصیرت و معاملہ فہمی کے ذریعہ سدھر سکتے ہیں۔ مگر آہستہ آہستہ وہ مایوس ہو گئے۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ ایک قاتل یا زنا کار کے معاملات میں کتنی ہی بصیرت حاصل کر لیں، اس سے ان کے اعمال میں کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ڈاکٹر کے دفتر سے نکلتے ہی وہ اپنے جرم کے راستے پر واپس چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بدلنا نہیں چاہتے۔ دونوں ڈاکٹر اب ان کہانیوں پر بھی شک کرنے لگے جو مجرموں نے اپنے جرائم کا جواز بنا کر سنائی تھیں۔ انہیں اپنے جرائم کا جواز پیش کرنے میں حیرت انگیز مہارت تھی۔ وہ بڑی صفائی کے ساتھ اپنی کہانی کا کوئی ایسا حصہ حذف کر دیتے جس کی وجہ سے ہمدردی کھو دینے کا خدشہ ہوتا۔ مگر اصل مسئلہ مجرم کا کیریکٹر، اس کا کردار ہے۔ جھوٹ ان کی سانسوں میں بسا ہوا تھا، وہ اتنی ہی آسانی سے جھوٹ بولتے جتنی آسانی کے ساتھ سانس لیتے تھے۔ وہ دوسرے لوگوں کو مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایسے لوگ تھے جنہیں ڈیوڈ رائز مین other directed کہتا ہے۔ ان کی مجرمانہ سرگرمیوں کا بڑا حصہ ان کی خودنمائی کی خواہش پر مبنی تھا۔ انہیں اپنے آپ سے جھوٹ بولنا بھی خوب آتا تھا۔ بالخصوص یوکلسن کا یہ مشاہدہ توجہ طلب ہے کہ برنز کی بلی کی طرح اکثر مجرم کان بند کر لینے کی ایک نفسیاتی میکانزم بنا لیتے ہیں۔ اپنے اندر یہ اہلیت پیدا کر لیتے ہیں کہ ناخوش گوار یادوں اور خیالات کو اپنے شعور سے خارج کر دیں اور وہ اعتراف بھی فراموش کر دیں جو انہوں نے ابھی پچھلی میٹنگ میں کیے تھے۔ یوکلسن کہتا ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جرم کی ذمہ داری سے بھی پیچھا چھڑا لیا جائے۔ مختصر

یہ کہ کمزوری، ناپختگی اور خودفریبی مجرم شخصیت کی اہم خصوصیات ہیں۔ بچہ کے ساتھ بدفعلی کے مجرم (جس نے آخر یہ بری عادت ترک کر دی تھی) کے معاملہ میں دونوں ماہرین نفسیات نے مانا کہ کامیابی کسی نفسیاتی بصیرت کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس کے لیے مجرم نے اپنی رائے اور قوتِ ارادی سے کام لیا۔ اس نے جرم کے ایک ایسے پیٹرن کے خلاف شدید مزاحمت کی جس نے اسے مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے جرم کرنا اس لیے چھوڑا کہ اس نے اسے چھوڑنے کا ارادہ کرلیا تھا اور زیادہ تر مجرم اس لیے مجرم بنے رہتے ہیں کہ انہیں مجرم نہ بننے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

جنس اور جرم کا باہمی تعلق بھی ایک اور اہم پہلو ہے۔ ہمارے مشاہدہ میں شامل سبھی لوگ کسی استثنٰی کے بغیر شروع ہی سے جنسی سرگرمیوں میں لگے رہے یا ان کے خواب دیکھتے رہے۔ مجرم دروازوں کی جھریوں سے جھانکتا ہے اور ماؤں، بہنوں، بھابیوں اور دوسری عورتوں کو نہاتے، کپڑے بدلتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک عادی مجرم نے جنسی کھیل چار سال کی عمر میں اس ہمسایہ لڑکی کے ساتھ شروع کر دیا تھا، جو اسے اپنے ساتھ اسکول لے جایا کرتی تھی۔ بڑا ہو کر وہ ایک ایسے گروہ میں شامل ہو گیا جو تنگ و تاریک راستوں سے لڑکیاں پکڑ کر انہیں ریپ کرتا تھا۔

اکثر بچے جنس کے متعلق جاننا چاہتے ہیں جبکہ اس طرف مجرم کا دھیان اسے اوروں کی زندگی اور خلوت کے احترام سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کی جنسیت میں تشدد اور جرائم میں جنس کا رنگ شامل ہوتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جنس جرم ہے اور جرم جنس ہی کی ایک شکل ہے۔ اس تعلق کی عمدہ مثال داساد کی تصنیف کا یہ حصہ ہے ''جیولیٹ کی شدید جنسی خواہش جو جرم کرنے سے پہلے ہے'' اور ویلکسن کا یہ کہنا کہ ہر جرم میں جنس کا ایک کردار ہوتا ہے۔ جرم کرتے ہوئے مجرم معاشرہ پر ایک شرم ناک حملہ کرتا ہے۔ یہ جان کر ہم جرم کی حقیقت کے قریب پہنچ جاتے ہیں جو دراصل انانیت، نادانی اور جنس کا مرکب ہے۔ کسی جانور میں جرم کی اہلیت نہیں ہوتی، اس لیے کہ جنس ان کے لیے کھانے پینے کی طرح ایک فطری عمل ہے۔ ویسے بھی جانور بڑے ہوتے ہی بالغ ہو جاتے ہیں۔ ان میں تکبر بھی نہیں ہوتا، لالچ کے سوا، جانور مجرم کی ہر بنیادی کوالیفیکیشن سے محروم ہوتے ہیں۔

مگر ضروری ہے کہ ان سب باتوں کو صحیح تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے۔ ہم جرمیت criminality کی بات اس طرح کر رہے ہیں جیسے اس کی نوعیت ہر دور میں ایک جیسی رہی

ہو، اور یہ غلط ہے۔ یوکلسن اور سیم ناؤ نے بیسویں صدی کے دوسرے نصف پر ریسرچ کی، اور ہمیں ایچ جی ویلز کی بات یاد رکھنا چاہیے کہ ''دنیا گزشتہ پانچ ہزار برس میں اتنی نہیں بدلی تھی جتنی کہ پچھلے سو سال میں بدلی ہے۔'' زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ قریباً ایک فی صد آبادی کے سوا زندگی نا قابل یقین حد تک سب کے لیے دشوار تھی۔ یہ بھوک، بیماری اور سردی کے خلاف نہ ختم ہونے والی جنگ تھی جیسا کہ ہینری ہیزلٹ نے The Conquest of Poverty میں لکھا ہے ''یونان اور روم کی قدیم دنیا ایک ایسی دنیا تھی جہاں گھروں کی چمنیاں نہیں تھیں۔ سردیوں میں گھر فرش پر لکڑیاں جلا کر یا چولھے کی حرارت سے گرم کیے جاتے تھے جس کی وجہ سے گھر کے در و دیوار میز کرسیاں اور چھتیں دھوئیں سے کالی ہو جاتی تھیں۔ روشنی کے لیے گھروں میں تیل کے لیمپ جلائے جاتے تھے، گھروں کی طرح ان کی بھی چمنیاں نہیں ہوا کرتی تھیں اس لیے تیل اور گرد آلود دھواں پھیل کر گھر کی مختلف چیزوں اور جگہوں پر جم جاتا تھا۔ یونانی گھروں میں نہانے دھونے اور سردی سے محفوظ رہنے کی سہولت نہیں تھی، نہ ہی سیوریج اور صفائی کا انتظام تھا۔''

دو ہزار سال بعد بھی یہی صورت حال بدستور قائم تھی۔ وسطی زمانہ میں مزدوروں کی رہائش کے لیے اذیت ناک گھروندے تھے۔ لکڑی کے تختے جوڑ کر دیواریں کھڑی کی جاتیں جنھیں گھاس پھوس اور گارے سے جوڑ دیا جاتا تھا۔ جھاڑ جھنکار لکڑی کے تختوں اور مٹی سے چھتیں ڈالی جاتیں۔ گھر کے اندر ایک اکیلا کمرہ جس کا کوئی فرش چمنی اور چولھا نہیں تھا، صفائی نہیں تھی، نالیاں نہیں تھیں، گھر کے افراد اور ان کے مویشی ایک ہی چھت تلے جیتے اور مرتے تھے۔

پرمیلی پرنٹس کی کتاب Hunger and History سے اقتباس، ''اور بار بار دنیا ہول ناک قحطوں کی زَد پر ہوتی تھی۔ روم میں 436 Bc کے اندر ایسا شدید قحط پڑا کہ ہزاروں فاقہ کشوں نے دریا میں کود کر جان دی۔ انگلستان میں گیارھویں اور بارھویں صدی کے اندر تقریباً ہر چودہ برس میں ایک بار قحط پڑتا تھا جن میں سے ایک قحط میں بیس ہزار انسان صرف لندن میں جاں بحق ہوئے۔''

ہم اپنی عیش کوش بیسویں صدی میں یہ بھول گئے ہیں کہ ہمارے پیش روؤں، ہمارے بزرگوں نے ہزار ہا سال تک زندگی کیسے بسر کی۔ غربت اور دشواریوں کے ان زمانوں میں یقیناً جرائم بھی ہوتے تھے مگر کم و بیش وہ سارے جرائم ضرورت اور احتیاج کے جرائم تھے۔

جن جرائم کا ذکر یولکسن اور سیم ناؤ نے کیا ہے وہ بنیادی طور پر ایک عیش کوش معاشرہ کے جرائم ہیں۔ وسطی زمانہ کے کسان کے سامنے کوئی چوائس، کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ جاگیر دار کی مرضی کے بغیر اپنا گاؤں بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ موازنہ کریں تو نئے آدمی، یہاں تک کہ بھوکے بھکاری کے سامنے بھی ہزار راستے ہیں اور کریمنلٹی (مجرمیت) کی جان ''آسان راستہ'' کا انتخاب ہے۔ یولکسن اور سیم ناؤ کا مشاہدہ ہے کہ مجرم کی بڑی خصوصیت ایک ہی رات میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ انہوں نے ایک فوجی سپاہی کی مثال دی ہے جس نے کوریا کی لڑائی میں میڈل حاصل کیا تھا اور فوج کی ملازمت کے بعد جسے ایک پیٹرول اسٹیشن لوٹنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اخبارات نے اس واقعہ کو ایک ''جنگی ہیرو'' کی کہانی کے طور پر پیش کیا جسے شہری زندگی کٹھن اور تکلیف دہ لگی تھی۔ سچ یہ ہے کہ اسے کامیابی اور داد و دہش کی عادت پڑ گئی تھی، شہری زندگی اس کے برعکس ثابت ہوئی تو اس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی فوجی تربیت سے لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا کام لے۔ اس کا یہ فیصلہ مجرم کی کوتاہ نظری اور اس کے نتیجہ میں غلط اندیشی کی واضح مثال تھی۔

یولکسن اور سیم ناؤ نے ہمیں آگاہ کیا ہے کہ کریمنلٹی کے پیٹرن عہد بہ عہد بدلتے رہتے ہیں اور یہ کہ انسانی فطرت کی عصری تاریخ کو نظر انداز کر کے اس کے متعلق عام نوعیت کے اندازے لگانا غلط ہے۔ یہ کہنا کہ 'انسانی فطرت نہیں بدل سکتی' محض غلط اندیشی ہے۔ انسانی فطرت نے تقریباً پانچ لاکھ برس پہلے بدلنا شروع کیا تھا۔ جب انسانی دماغ نے کسی انجانی وجہ سے انسانی ضرورت سے بہت زیادہ بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت سے اب تک تبدیلی کا یہ عمل جاری ہے۔

لوئیس ممفرڈ نے اس بیان کو بھی چیلنج کیا ہے کہ ''جنگ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانیت پرانی ہے۔'' اپنی تصنیف 'The City in History' میں اس نے لکھا ہے کہ جب انسانوں نے اندازاً پانچ ہزار قبل مسیح اکٹھے رہنے کے لیے شہروں کا رخ کیا تو جنگ کا آغاز ہوا۔ قدیم انسان نے حملہ آور پارٹیاں اس لیے نہیں بنائی تھیں کہ ''انسانوں کو قتل کرے اور ان کے گاؤں جلا دے بلکہ چند افراد کو پکڑ کر انہیں دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھانا ان کا مقصد تھا۔

جنگ اور جرم کے عذاب میں مبتلا ہونے کے بارے میں ممفرڈ کا اپنا نظریہ کچھ اس طرح سے ہے کہ بارہ ہزار سال پہلے جب قدیم انسان کاشتکار بنا تو اسے زمین اور اس کی

پیداوار پر اپنے انحصار کا اندازہ ہوا۔ پتھر کے زمانہ میں بھی شکاریوں کے دیوتا اور روحیں ہوا کرتی تھیں۔ شکار پارٹی کے روانہ ہونے سے پہلے ان کا پجاری جادو گنڈے کیا کرتا تھا۔ اب جبکہ قدیم انسان نے زمین سے فصلیں اگائیں تو اسے زمین کے زندہ وجود، اس کے ایک عظیم ماں ہونے کا احساس ہوا۔ ایک راہبانہ ذات بن گئی قدیم مندر اور مقدس درختوں کے جھنڈ (یہی زندگی کی توجہ کے مرکز بن گئے) بادشاہ کا انتخاب ایک لیڈر کی حیثیت میں نہیں کیا جاتا تھا بلکہ دیوتاؤں اور انسان کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت سے ہوا کرتا تھا۔ اگر پیداوار نہ ہوتو دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے بادشاہ کو قربان کر دیا جاتا تھا۔ (ممفرڈ کی بحث کے اس حصہ کی بنیاد فریزر کی کتاب 'Golden Bough' ہے)

اب مٹی کے گھروندوں پر مشتمل گاؤں، اس کی گھریلو خانقاہیں اور روحوں کے معالج ایک چیز ہے اور ایک بڑا گاؤں، اس کا شاندار مندر اور دیوتا سمان بادشاہ دوسری چیز ہے۔ وہ پہلے ہی ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ممفرڈ کا خیال ہے کہ شہر اسی طرح بتدریج آباد ہوئے تھے اور اسی طرح اجڑے بھی تھے۔ شہر ایک بار اپنی پوری آن بان کے ساتھ بس گیا، زندگی کے ہر شعبہ میں، عروج اور طاقت کا دور دورہ ہوا تو ساری صورت حال یکسر بدل گئی۔ کسی فرد واحد کو جارحیت کا نشانہ بنانے کے بجائے اجتماعی تباہیوں اور اجتماعی ہلاکتوں کا زمانہ آ گیا۔ زمین کی زرخیزی اور پیداوار میں اضافہ کے لیے جنتر منتر اور انسانی جانوں کی قربانیاں، ایک حقیقت پسندانہ مقصد کے لیے ایک غیر حقیقت پسندانہ راستہ، ساری باتیں ایک قسم کی طاقت اور اس کی نمائش میں بدل گئیں۔ اب یہ اس کمیونٹی کے غضب ناک خدا کے بس میں ہے کہ وہ دوسری کمیونٹی کو جینے دے یا نیست و نابود کر دے۔

ممفرڈ یہ کہنا بھول گیا ہے کہ قدیم جنگیں دیوتاؤں کی بھینٹ کے لیے لوگ تلاش کرنے نہیں بلکہ زمین، (territory) کے لیے لڑی جاتی تھیں۔ جب ممفرڈ 'The City In History' لکھ رہا تھا (جو 1961ء میں شائع ہوئی تھی) اس وقت 'زمین کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ لورنز اور آرڈری نے پہلی دفعہ عام لوگوں کو تمام جانوروں کی اس فطرت سے آگاہ کیا کہ وہ اپنے لیے، اپنے خاندان اور قبیلہ کے لیے زمین چاہتے ہیں جو ان کی ہو اور جہاں سے وہ ہر حملہ آور کو دفع کر سکیں۔ سمیر (عراق) کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پرانی جنگوں کی بنیاد سرحدی تنازعے تھے۔ ایک شہر کو خوراک کے لیے زرعی زمین کی ضرورت تھی اس پر دوسرے شہر نے قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کی سرحد پار کی تو جنگ شروع ہوگئی۔ پرندے

اور جانور مشکل سے ہی زمین کے لیے لڑتے ہیں۔ اگر ایک پرندہ کسی ایسے درخت پر جاتا ہے جس پر کوئی دوسرا پرندہ قابض ہے تو اس کے خلاف غصہ کا شدید اظہار ہی حملہ آور کو وہاں سے بے دخل کرنے کے لیے کافی ہے۔ پرانے کاشت کاروں کے تعلقات بھی کچھ اسی قسم کے تھے۔ مگر ایک بار جب شہروں کے رقبے ہزاروں مربع میلوں تک پھیل گئے تو حملہ آوروں کے لیے سرحدیں عبور کرنا آسان ہو گیا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ انہیں مسلح طاقت کے ذریعہ وہاں سے واپس دھکیل دیا جائے۔ شہروں کے آغاز نے جنگ کو ناگزیر بنا دیا کیونکہ سرحدی تنازعے طیاروں کی گڑگڑاہٹ سے حل نہیں ہوتے۔

مگر یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ہمسائے کے خلاف ہوتے ہی انسان اچانک بے رحم اور ظالم ہو گیا۔ معتبر شہادت کی رو سے ظلم، انسانی رویہ میں خاصی دیر سے آیا۔ مصر اور میسوپوٹیمیا کی قدیم تہذیبوں کے دور میں روز مرہ زندگی کا مکمل ریکارڈ ہمارے سامنے ہے۔ پہلا ریکارڈ وہ پینٹنگز ہیں جو دیواروں پر بنائی گئیں۔ دوسرا تحریر کی صورت میں (جو سمیر میں تقریباً 3500 قبل مسیح کے اندر ایجاد ہوئی) مصر کی وال پینٹنگز میں ظلم اور اذیت کا کوئی منظر نہیں اور قدیم مصری اپنے شکست خوردہ دشمن کے ساتھ فیاضی سے پیش آنے کے لیے مشہور ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں حطی بڑے زبردست اور بہادر لوگ تھے مگر آرکیالوجیکل ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نیک دل اور مہذب تھے۔ عقاد کا سارگن (Sargon of Akkad) پہلا بڑا سلطنت گر، (2300 BC) تھا۔ اس نے اپنے کارناموں اور فتوحات کی لمبی فہرست اپنے بعد چھوڑی ہے مگر بعد کے فاتحین کی طرح اس نے ظلم نہیں کیے، نہ اذیت پسندی کے راستہ پر چلا ہے۔ جیسا کہ سموئیل کریمر 'History Begins at Summer' (نیویارک 1959ء) میں کہا ہے کہ سمیر کی پرانی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے لوگوں کے آدرش اور خیالات بلند تھے۔ قتل کا پہلا مقدمہ سمیر کے اندر تقریباً 1850 قبل مسیح میں شروع ہوا جب Lu Inna نامی، عبادت گاہ کے ایک خادم کو قتل کرنے کے جرم میں تین افراد کو سزائے موت دی گئی۔ فیصلہ میں لکھا تھا ''انہوں نے ایک انسان کو قتل کیا ہے۔ اس لیے وہ زندہ رہنے کا حق کھو بیٹھے ہیں۔''

قدیم تہذیبوں کے ان افراد کے بارے میں ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو دیوتاؤں کے خادم سمجھتے تھے اور خود بادشاہ کی حیثیت بھی ایک خادم سے زیادہ نہیں تھی۔ 'The Martyrdom of Man' کے پہلے حصے میں ون ووڈ ریڈ قدیم فرعونوں کے

متعلق کہتا ہے۔

''اسے ہر قسم کی زیادتی منع تھی۔ اس کی غذا بطخ اور بچھڑے کا گوشت تھا۔ شراب پینے کی حد بھی مقرر تھی۔ قانون کی تلوار دن رات اس کے سر پر لٹکتی رہتی تھی۔ اس کا ہر ذاتی اور اجتماعی فعل قانون کے مطابق ہوتا تھا۔ محل میں آرام کے وقت بھی قانون اس کا پیچھا کرتا یہاں تک کہ اپنی ملکہ سے بغل گیر ہونے کا وقت بھی پہلے سے مقرر ہوتا تھا۔'' اس لیے پرانی تہذیبوں کا رویہ اپنے مفتوح دشمنوں کے ساتھ ہمدردانہ ہوتا تھا۔ ان پر دیوتاؤں کی حکومت تھی اور دیوتاؤں نے انہیں انسانی زندگی کا احترام سکھایا تھا۔ اس کے علاوہ ظلم کے لیے تکبر اور انانیت کا ہونا ضروری ہے۔ مگر جو شخص اپنے آپ کو دیوتاؤں کا غلام سمجھتا ہے وہ اپنی انانیت کو سر اٹھانے نہیں دیتا۔

قبل مسیح کے دوسرے ہزاریے میں حالات بدلنا شروع ہو گئے۔ بادشاہ نے محض دکھاوے کا بادشاہ بننا چھوڑ دیا اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیے۔ جب دوسرے شہر فتح ہونا شروع ہوئے تو بے رحمی کسی حد تک ضرورت بن گئی۔ عقاد کا سارگن خاص طور پر بے رحم نہیں تھا اور شاید یہی وجہ ہو کہ اس کی سلطنت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ اس کے آخری دنوں میں کئی شہر اس کے خلاف بغاوت پر اتر آئے اس کے بعد آنے والے بادشاہوں نے سختی اور رعب داب کی اہمیت محسوس کی۔ حمورابی (1800 BC) کا قانون اپنی انصاف پسندی کے لیے مشہور ہے مگر ان پرانے قانونی ضوابط سے کہیں زیادہ سخت گیر ہے جن کے بعض حصے ہم تک پہنچے ہیں۔ شاہ زمیری لن (حمورابی کے دوست) کے ایک عہدے دار نے بادشاہ کو خانہ بدوشوں کے خلاف لکھا کہ وہ فوج میں شامل ہونے سے انکار کرتے ہیں اس لیے ان میں سے کسی ایک کا سر کاٹ کر مختلف کیمپوں میں گھمایا جائے تا کہ اسے دیکھ کر دلوں میں خوف پیدا ہو اور احکام کی تعمیل جلدی ہو۔ اس کے بعد بادشاہ اپنے مخالفوں کے سر، سر عام کٹواتے رہے۔

اس تھیوری کے لحاظ سے انسان کا جرم کی دنیا میں داخل ہونا ناگزیر تھا۔ پہلے وہ سماجی حیوان بنا، پھر مذہبی حیوان بنا، پھر ایک دیہاتی اور اس کے بعد شہری بنا۔ تب اس کی علاقائیت نے اسے اپنے جیسے ہی انسانوں کو قتل کرنے کے لیے جنگ میں جھونک دیا۔ مگر یہ جائزہ اب بھی ایرک فرام کے اس سوال کا جواب نہیں کہ انسان کیوں واحد مخلوق ہے جو وجہ کے بغیر اپنے ہی جیسے انسانوں کو قتل کرتا ہے اور انہیں اذیت دیتا ہے۔ اگر دو جانور لڑتے ہوں اور

ان میں سے ایک ہار مان لینا چاہے تو اسے پیٹھ کے بل زمین پر لوٹنا اور اپنا پیٹ دکھانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے جانور کے لیے لڑائی جاری رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ انسان واحد مخلوق ہے جو اس تخلیقی میکانزم سے محروم ہے۔

اس تضاد کی عجیب وضاحت ہنگری کے آسکر مارتھ نے ایک کتاب **The Beginning Was the End** میں کی ہے۔ مارتھ کی تھیوری ہمارے بزرگوں میں آدم خوری کی گواہی سے شروع ہوتی ہے۔ جس کی مثال جانوروں میں شاید ہی ملتی ہو۔ اپنی تھیوری کی بنیاد بورنیو، ساٹرا اور نیوگنی کے آدم خوروں پر رکھتے ہوئے مارتھ کا کہنا ہے کہ انسانی مغز کھانے سے انسان کی ذہانت اور جنسی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ کہ ایشیا کے بعض حصوں میں آج بھی بندر کے تازہ مغز کو خاصہ کی چیز کا درجہ حاصل ہے اور ریسٹورانوں میں بآسانی مل جاتا ہے۔ کھانے سے فوراً پہلے جانور کو مار کر اس کا مغز کچا ہی کھا لیا جاتا ہے۔ میرے اپنے تجربہ کے مطابق کھانے کے تقریباً بیس گھنٹے بعد دماغ میں حرارت کا احساس ہوتا ہے۔ قریباً اٹھائیس گھنٹے بعد جسم میں طاقت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور جنسی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ قدیم انسان، دشمن کا دماغ یہ سمجھ کر کھاتا تھا کہ اس میں بھی اپنے دشمن جیسی جرأت اور خوبیاں پیدا ہوسکتی ہیں اور محسوس کرتا ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی ذہانت میں تیزی آئی ہے۔

فی الحال مارتھ کی تھیوری ثابت ہوسکتی ہے نہ رد ہوسکتی ہے کیونکہ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کہ دماغ کھانے سے وہ اثرات ظاہر ہوتے ہیں جن کا الزام وہ عائد کرتا ہے مگر یہ ماننا ہوگا کہ کم از کم یہ اس بات کو سمجھنے کی ایک کوشش تو ہے جس کی وجہ سے انسان کا قاتل انسان بن جاتا ہے۔

کارنرڈ لورنگ کی تھیوری بہت کم آزاد خیال ہے مگر اس پر شدید اعتراض ہوسکتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ فاختاؤں، خرگوشوں اور چکاروں جیسی بے ضرر مخلوق کے پاس امن کا، صلح کا کوئی سفید جھنڈا نہیں ہوتا جس کی مدد لے کر وہ جارحیت کو روک دیں کیونکہ عام حالات میں وہ ایک دوسرے کو کوئی قابل ذکر ضرر نہیں پہنچاتے۔ اس دعوے کی تصدیق کے لیے لورینز بیان کرتا ہے کہ اس نے فاختہ کا جوڑا پنجرے میں رکھا تو دیکھا کہ ایک فاختہ نے دوسری کو چوم چوم کر ادھ مؤا کر دیا ہے۔ آدمی بھی بنیادی طور پر بے ضرر مخلوق ہے۔ اس کے لمبے تیز دانت نہیں نہ تیز خونخوار پنجے ہیں۔ نہ ہی اس کے پاس سیز فائر اور دوستی کے سگنل ہیں۔

ایلین مورگن **The Descent of Woman** ' نامی کتاب میں اس بیان

کو چیلنج کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اب بھی انسان کے شکاری جانوروں جیسے مضبوط دانت ہیں جو کسی زمانے میں آج کی نسبت بہت زیادہ لمبے ہوتے ہوں گے۔ بڑے بندروں کے دانت بھی ایسے ہی ہوتے ہیں اور ان کے پاس دوستی کے اشارے بھی ہیں۔ اس نے اپنی تھیوری کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''انسان نے اپنے ہارے ہوئے دشمنوں کو قتل کرنے میں اپنی ہچکچاہٹ کیونکر ترک کی۔ ایک زمانہ میں جب خشک سالی کی وجہ سے زمین پر غذا کی کمی ہوئی تو ہمارے بزرگوں نے واپس پانی کا رخ کیا۔ (یہ تھیوری پہلے السٹر ہارڈی نے پیش کی تھی) اور اس طرح انسان نے پچھلی ٹانگوں پر سیدھا کھڑا ہو کر چلنا شروع کیا۔ کیونکہ پانی میں سیدھا چلنا آسان ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان نے اپنے جسم کے بالوں سے نجات حاصل کی کیونکہ بال تیرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ مگر مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب پیچھے کے بجائے سامنے سے مباشرت کرنا ایک مجبوری بن گئی۔ ایلین کے مطابق یہ تبدیلی عورت کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی مگر جنھوں نے زندگی کی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ان کی گود میں بچے کھیلنے لگے جبکہ دوسری اس نعمت سے محروم رہیں۔''

'African Genisis' میں رابرٹ آرڈری نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جب انسان نے ہتھیاروں کے ذریعہ قتل کرنا سیکھا تو اس کی زندگی اور زیادہ پرتشدد اور پرخطر ہو گئی۔ اس لیے صرف ماہر قاتل ہی خطرات سے محفوظ رہ سکے۔ بعد میں اس نے اعتراف کیا کہ اس نظریہ سے یہ وضاحت نہیں ہوتی کہ غاروں میں رہنے والے انسانوں نے دوسرے قبیلوں پر جنگ کیوں مسلط کی (ممفرڈ تو یہی کہے گا کہ یہ انسانی قربانی دینے کے لیے چند افراد کو پکڑنے کے واسطے معمولی جھڑپیں تھیں) بعد میں شائع ہونے والی کتاب The Social Contract میں آرڈری نے ایک دوسرا خیال ظاہر کیا کہ جب انسان شکاری نہ رہا اور کسان بن گیا تو اور بھی خطرناک ہو گیا۔ شکار کی عادت بدستور اس کے خون میں شامل تھی۔ اس لیے اس نے جانوروں کو چھوڑ کر جنگ کی صورت میں انسانوں کو شکار کرنا شروع کر دیا۔ مگر یہ خیال بھی ترک کرنا پڑا جب آرڈری کو معلوم ہوا کہ سب سے پرانے شہر جیریکو (6500 BC) میں شہریوں نے شہر کے دفاع کے لیے، بہت بڑی خندق کھودنے کے علاوہ تین دفاعی دیواریں بنائی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ابتدائی زمانہ میں بھی وہ خانہ بدوش کسانوں کے حملہ سے خوف زدہ تھے۔ (حالانکہ کھیتی باڑی کو شروع ہوئے اس وقت تک تقریباً تین ہزار سال ہو چکے تھے) مگر جیریکو کی اس مثال نے ممفرڈ کی اس تھیوری کو رد کر دیا کہ جنگ کا آغاز حریف شہروں کی وجہ سے ہوا

تھا اور شکار ترک کرنے والے شکاریوں کے بارے میں آرڈری کے خیال کی تردید Chon-Kan-Ton کے غاروں سے ملنے والی انسانی کھوپڑیوں نے کر دی ہے کہ انسان پانچ لاکھ سال پہلے بھی خطرناک تھا۔

جنگ کے آغاز کے موضوع پر1972ء میں آرڈری اور لیکی نے ایک مذاکرہ میں حصہ لیا۔ لیکی نے اتفاق کیا کہ جنگ کے آغاز کا امکانی دور چالیس ہزار سال پہلے کا دور ہے مگر اس کے دلائل آرڈری کے دلائل سے مختلف تھے۔ اس کے مطابق Cro-Magnon انسان نے تقریباً چالیس ہزار سال پہلے آگ جلانا سیکھ لیا تھا اس لیے رات ہوتے ہی بستر پر جانے کے لیے مجبور نہیں تھا۔ پہلی بار وہ رات کو مل بیٹھتے اور آپس میں باتیں کرنے لگے تھے۔ بچے بھی ان کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سنا کرتے۔ آہستہ آہستہ کہانی سنانا ایک فن بن گیا۔ ان کی اکثر کہانیاں شکار اور شکاریوں کی باہمی لڑائیوں کے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ پہلی دفعہ آدمی نے 'ہم' اور 'غیر' کے انداز میں سوچنا شروع کیا تھا۔ جنگ انسان کے تخیل پر کیسے چھائی؟ اس کے متعلق لیکی کی اپنی خیالی تھیوری تھی۔

پرانے انسان کی کئی تھیوریوں کی طرح اسے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے نہ رد کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہمارے نقطۂ نظر سے یہ اہم ہے کیونکہ کریمنلٹی کے مرکزی مسئلہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ جس کا مطلب اپنے ساتھی انسانوں کے ساتھ غیریت اور بے تعلقی ہے۔ یہ بے تعلقی جس طرح قدیم انسانوں میں ملتی ہے اسی طرح نئے شہروں کے محروم لوگوں میں عام ہے۔ 'Crowd and Power' میں ایلیین کانیتی نے بیسویں صدی کے شروع میں جنوبی امریکا کے قبائل میں جنگ کی ایک مثال دی ہے۔ Tanlapang قبیلہ کے ایک لڑکے نے اپنے ہمسایہ قبیلہ Pishank کے متعلق تفصیل سے بتایا کہ انہوں نے کس طرح Pishank قبیلہ کو خاک میں ملایا ہے۔ لگتا ہے کہ جھگڑا عورتوں کی وجہ سے شروع ہوا جس میں Talanpang قبیلہ کے کچھ افراد مارے گئے۔ Talanpang کے لوگوں نے سوچ لیا کہ Pishank انہیں تباہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے حملہ کریں۔ ایک رات وہ چپکے سے ان کے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ Pishank کے جوتشی نے انہیں بتا دیا تھا کہ ان کے دشمن حملہ کرنے والے ہیں۔ مگر اس کی بات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حملہ کے وقت Pishank کے تمام افراد چوپال میں تھے۔ حملہ آور چوپال میں داخل ہو کر قتل و غارت کرنے لگے جس کے بعد انہوں نے چوپال کو آگ لگا دی اور بچوں کو آگ میں پھینکنے لگے۔

زمین پر گرے ہوئے پشکئو ایک ایک کر کے کلہاڑے سے کاٹ کر دو ٹکڑے کر دیے گئے۔ عورتوں کو تماشا بنایا گیا۔ یہاں ہم ظلم کے عناصر کو پہلو بہ پہلو کارفرما دیکھتے ہیں۔ (جیسے بچوں کو آگ کے شعلوں میں پھینکنا، انتقام کے لیے جسموں کو کاٹ کر دو ٹکڑے کر دینا اور جنسی لحاظ سے عورتوں کی توہین کرنا)

ابتدا میں اس کہانی سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ اس نوعیت کا تشدد تاریخ کے اسٹیج پر دیر سے آیا۔ یہ لڑائی عورتوں کی وجہ سے ہوئی۔ اگر یہ دو ہمسایہ قبیلے بندر ہوتے تو اس قسم کا جھگڑا نہ ہوتا کیونکہ بندر اپنی جنسی خواہشات اپنے گروپ تک محدود رکھتے ہیں۔ نہ ہی بندر علاقہ کی وجہ سے لڑتے ہیں۔ اگر کوئی سرحدی تنازعہ ہو تو وہ حسب معمول ڈرا دھمکا کر اسے ختم کر دیتے ہیں۔ اگر بات بڑھ جائے تو صلح کے سگنل سے رجوع کرتے یں۔ کوئی زمانہ ایسا ضرور گزرا ہو گا جب ہمارے بزرگوں کا چلن، جنگجو انسانوں کے بجائے امن پسند بندروں جیسا ہوتا ہو گا مگر جب ہمیں **Chan-Tan-Tion** کے غاروں میں انسانی کھوپڑیاں یاد آتی ہیں تو شک پیدا ہونے لگتا ہے کہ وہ واقعہ تو پانچ لاکھ برس پہلے گزرا تھا جبکہ ایک گروپ آج بھی دوسرے گروپ کا نام و نشان مٹانے کے لیے حملہ آور ہوتا ہے یا کم از کم اس کے کثیر افراد کو قیدی بناتا اور قتل کرتا ہے۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں تک آرڈری بغیر کسی معذرت کے اس بات کا قائل رہا کہ آدمی قتل کرنے کی وجہ سے آدمی بنا ہے۔ اسے **the hunting hypothesis** یعنی 'شکار کا مفروضہ' کہتا ہے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ انسان نے اپنی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اس طرح کی ہے کہ بہت پہلے ہی سے اس نے دوسرے انسانوں سے مل کر جنگلی جانوروں کا شکار کرنا سیکھ لیا تھا، جس کے نتیجہ میں اس کی سماجی فطرت نے اس کی 'قاتلانہ فطرت' کے پہلو بہ پہلو پرورش پائی ہے۔ **1960**ء تک اس مفروضہ کو صحیح نہیں سمجھا گیا۔ یہاں تک کہ اس سال لیکی نے کینیا کے اندر فورٹ ٹرنن میں ایک اہم انکشاف کیا کہ انسان کے بہت دور کے قدیم قرابت داروں کی ساڑھے چودہ ملین سال پرانی ہڈیاں ملی ہیں۔ اسے راما پتھیکس کہا جاتا تھا اور لگتا ہے کہ وہ زیادہ تر سیدھا ہو کر چلتا تھا۔ اسی جگہ سے ہرنوں کی سینکڑوں ہڈیاں ملیں۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ قدیم بندر شکاری تھا اور غالباً گروہ بن کر شکار کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے مابین ایک قسم کا سماجی تعاون موجود تھا۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے لاوے سے پتہ چلتا تھا کہ ہڈیوں سے گودا نکالنے کے لیے کوئی آلہ موجود تھا۔ چنانچہ ہم

کہہ سکتے ہیں کہ یہ انسان پہلے سے ہی کسی آلہ کا استعمال جانتا تھا۔فورٹ ٹرنن کی شہادت نے آرڈری کی تھیوری کو اتنا جھٹلا دیا کہ آسٹرالوپتھیکس انسان گوشت خور (اور اسی وجہ سے) قاتل بن گیا۔اس عہد میں خشک سالی تھی۔(تیس لاکھ برس پہلے) جب سبزیاں کم یاب ہو گئیں۔ اس سے آرڈری کی اس تھیوری کو تقویت ملی کہ آدمی اس وجہ سے انسان بنا کیونکہ وہ شکاری تھا۔تقریباً دس ملین برس بعد آسٹرالوپتھیکس آیا۔وہ بڑے بندر جیسا تھا۔اس کا قد تقریباً چار فٹ اونچا اور دماغ کا وزن ایک پاؤنڈ (grams 500 یا 600cc) یعنی جدید آدمی کے دماغ کا تیسرا حصہ تھا۔(ایک چمپنزی کا دماغ بھی 400cc ہوتا ہے) یہ کوئی بڑا قابل ذکر اضافہ نہیں تھا۔مگر اس مخلوق نے مہلک ہتھیاروں کا استعمال سب سے پہلے سیکھا تھا۔اس کے تھوڑے عرصہ بعد آدمی کی ایک اور قسم ظاہر ہوئی جس کا دماغ اس سے بڑا یعنی 700cc تھا اور جو پتھر کے قدیم ہتھیار استعمال کرتا تھا۔اسے 'Homo Habilis' کا نام دیا گیا۔وہ آسٹرالوپتھیکس کی طرح بیس لاکھ برس پہلے بہت سرگرم تھا۔یہ دور بے مثال خشک سالیوں، سیلابوں اور برف کے زمانوں اور مجموعی طور پر انتہائی خراب موسم سے عبارت تھا۔کوئی نہیں جانتا کہ اس کا سبب کیا تھا۔عام خیال یہ ہے کہ قطبی برف ایسے تناسب پر آ گئی تھی کہ خود اپنے ہی بوجھ تلے آ کر ٹوٹنے لگی اور برف کے دیو قامت تودے خط استوا کی جانب لڑھکنے لگے۔مگر انسانی نقطۂ نظر سے برف اور سیلاب اس طویل خشک سالی سے سو بار بہتر تھے جس نے تقریباً بارہ ملین برس تک افریقا کو ویران اور بنجر بنائے رکھا۔یہ دور تھا جب انسانوں نے اچانک عروج کی منزل بڑی تیزی کے ساتھ طے کی اور روئے زمین پر ہر حیوان، یہاں تک کہ اپنے کزن بندر کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔اگلے دس لاکھ برسوں میں وہ مخلوق ظاہر ہوئی جس نے اپنے اسیروں کو غاروں میں قتل کر دیا Homo Erectus کا دماغ آسٹرالوپتھیکس کے دماغ سے دوگنا بڑا تھا جس کے معنی ہیں کہ اس کا دماغ جدید انسان کے دماغ کے دوتہائی سائز تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ آگ استعمال کرتا تھا مگر اسے آگ جلانا نہیں آتی تھی۔یہ بات بذاتِ خود ایک تشکیل شدہ سماجی زندگی کی مظہر تھی۔اس کا مطلب ہے کہ جب شکاری کوئی ایسا درخت دیکھتے تھے جسے آسمانی بجلی گرنے سے آگ لگی ہو تو وہ بڑی احتیاط سے جلتی شاخیں لے جاتے اور ان پر نگران مقرر کرتے کہ وہ بجھنے نہ پائیں۔آدمی آگے کا سوچنا سیکھ رہا تھا، اس لیے ہر ذی روح جانور سے آگے نکل گیا تھا۔اس بات سے کہ Chan-Kan-Tian غاروں سے صرف کھوپڑیاں برآمد ہوئی تھیں، ہم خیال کر سکتے ہیں کہ Homo Erectus جان داروں

کا شکاری تھا اس لیے تشدد کرنے میں اس کی صلاحیت ترقی کر چکی تھی۔

اور انسانی دماغ بدستور بڑھ رہا تھا۔ پانچ لاکھ برس کے اندر پیکنگ مین اور ہم میں ایک اور تہائی کا فرق پڑ گیا۔ انسانی دماغ کی زیادہ افزائش اوپر کے حصے (وہ حصہ جس سے ہم سوچتے ہیں) میں تھی۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ اتنی تیزی کے ساتھ کیوں بڑھا۔ آرڈری نے یہ دلچسپ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا تعلق شاید ایک بہت meteor یا ایک چھوٹے asteroid سے ہوا جو بحیرہ ہند پر قریباً 700000 سال پہلے پھٹا تھا۔ اس کے Tektites نامی ٹکڑے اب بھی 20 ملین سے زیادہ مربع میل پر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس وقت زمین کے قطب پیچھے ہٹے اور جنوب، شمال میں بدل گیا اور اسی طرح برعکس ہو گیا۔ ارضیات کا کوئی ماہر نہیں بتا سکتا کہ زمین کی تاریخ کے کئی گزشتہ مواقع پر یہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا۔ بہرحال آرڈری کا کہنا ہے کہ دھماکہ یا زمین کے قطبوں کی پسپائی یا دونوں دماغ کی بڑائی کا سبب ہیں۔ پسپائی کے زمانہ میں سیارہ عارضی طور پر مقناطیسی میدان سے محروم رہا؛ ہوسکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں زمین پر اچانک کائناتی شعاعوں اور ان تیز رو ذرات کی بھرپور بارش ہوئی ہو۔ اسی طرح زمین کی فضا کے درجۂ حرارت میں بھی اچانک اضافہ ہوا ہو گا۔ یہ دونوں واقعات جینیاتی تغیر کا سبب بن سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ یہی دماغ بڑھانے کی وجہ ہو۔ دوسری طرف یہ تباہ کن تھیوری شاید غیر ضروری ہو کہ اگر انسانی دماغ آسٹرالوپتھیکس اور پہلے ہومو اریکٹس کے درمیانی عرصہ میں (تقریباً دس لاکھ برس) سائز سے دوگنا ہو گیا ہے تو پانچ لاکھ برس کے اندر اس کے سائز میں ایک اور تہائی کا اضافہ حیرانی کی بات نہیں ہو گی۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ 'پیکنگ مین' کا دماغ پہلے ہی آسٹرالوپتھیکس کے دماغ سے بڑا تھا۔ دراصل بعض بڑے مغز کے پیکنگ مین کے مغز آج کے بعض چھوٹے دماغ کے انسان کے مغز جتنے بڑے تھے۔ تو پھر وہ ان سے کیا کرتا تھا؟ بے شک اس نے اپنے لیے گھاس پھوس اور مٹی کے گھر بنائے اور شکار کے لیے بہتر تکنیک ایجاد کی، یہاں تک کہ ہاتھی کو مارنا سیکھ لیا۔ مگر اس کے ہتھیار، جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ محض تین لاکھ برس پہلے ہومو اریکٹس ابھی تک پتھر کے ٹوکے استعمال کر رہا تھا جنہیں وہ بیس لاکھ برس پہلے بھی استعمال کرتا تھا۔ یہ سلسلہ اسی طرح نینڈرتھال تک جاری رہا جو صرف ایک لاکھ سال پہلے منظر پر آیا۔ وہ اب بھی اپنی دبی ہوئی ٹھوڑی اور پیشانی لیے بندر سے پوری طرح مشابہ تھا۔ غاروں میں اس کے رہنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آدم خور بھی تھا۔ وہ روئے زمین سے پچیس تیس ہزار سال پہلے غائب

ہوا۔ جب Cro Magnon جدید انسان کا براہِ راست پیش رو منظر پر ظاہر ہوا۔ آرڈری کو پورا یقین تھا کہ نینڈرتھال کرومیگنن مین کے ہاتھوں غارت ہوا، اور یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ اگرچہ اکثر ماہرین اس سوال کو کھلا چھوڑنے کے حق میں ہیں Cro Magnon پہلی مخلوق ہے جس نے اپنے 'بڑے دماغ' سے کام لیا۔ اس نے اپنے غاروں کی دیواروں پر تصویریں بنائیں، علامتوں اور امیجز کے ذریعہ اظہارِ ذات کیا۔ اسی عرصہ میں اس نے زراعت ایجاد کی اور شہر بنائے۔ جتنی ترقی اس کے بزرگوں نے بیس لاکھ برسوں میں کی تھی اس سے زیادہ ترقی اس نے پچیس ہزار برسوں میں کر لی۔

اسے سمجھانے کے لیے آرڈری نے حسب معمول ایک چونکا دینے والا نظریہ پیش کیا ہے کہ تیر کا ایک خم دار سرا جو باندھا جا سکے نینڈرتھال نسل کی ایک شاخ Aterian کی ایجاد ہے، جو اُن دنوں افریقی صحرا میں رہتا تھا، جب تقریباً چالیس ہزار سال پہلے یہ علاقہ ایک سرسبز و شاداب جنت تھا۔ آرڈری کا کہنا ہے کہ کمان بھی اُنہی کی ایجاد تھی اور قدیم زمانہ میں تیر کمان کی وہی اہمیت تھی جو آج ایٹم بم کی ہے۔ دُور تک مار کرنے والا یہ پہلا ہتھیار تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ شکاری کو اب اپنے قبیلہ کے ساتھ بندھے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب وہ اپنے آپ جا کر شکار کر سکتا تھا۔ ایک بار جب انسان اکیلا شکار کرنے لگا اور اسے اپنے 'ایک فرد' ہونے کا احساس ہوا تو اسے اپنے لیے سوچنے کی عادت پڑ گئی۔ یہ تھیوری زوردار ہے۔ مگر اس پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ کس وجہ سے تیر کمان صحرائی کلچر (جس نے اسے بنایا تھا) سے ماورا نہ پھیل سکے مگر جیسا کہ آرڈری نے بتایا ہے کہ کرومیگنن گوپھن یا غلیل سے واقف تھا جو ایک اور دور مار ہتھیار تھا۔

یہ قیاس بھی شاید 'بڑا دماغ' تھیوری کے لیے غیر ضروری ثابت ہو۔ پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نینڈرتھال بہت کم بندر سے اتنا مشابہ تھا جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے مرنے والوں کو ایک طرح کی رسوم ادا کر کے دفن کرتا تھا۔ شوخ رنگ پھولوں کے بیج ان کی قبروں میں پائے گئے ہیں۔ غالباً لاش ڈھانپنے کے لیے وہ پھول ایک قسم کے پردہ میں پروئے گئے تھے۔ ایک رنگ ساز میٹریل کے ٹکڑے جیسے بعد میں نینڈرتھال استعمال کرتا رہا، ان کی قبروں کے اندر پائے گئے۔ ان میں سے بعض ٹکڑے ایک طرف گرے ہوئے تھے گویا کہ انہیں پنسل کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ بعض اور رنگ بھی تھوڑی تھوڑی مقدار میں پائے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان رنگوں سے وہ جانوروں کی کھالیں رنگا کرتا تھا۔ لگتا ہے کہ نینڈرتھال کی عورتیں

نکمی تھیں کیونکہ غاروں میں گھٹنوں تک جانوروں کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ بہرحال یہ کوئی ایسی وجہ نہیں تھی جس کی بنا پر وہ شوخ وشنگ کپڑے نہ پہنیں۔ نینڈرتھال آدمی کے بارے میں ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اپنے دس لاکھ سال پرانے بزرگوں کی طرح پتھر کے ڈسک بناتا تھا۔ چقماق کی بڑی بیس سینٹی میٹر چوڑی سفید ٹکیہ فرانس کے ایک غار میں پائی گئی۔ دیومالا کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ایسی ڈسک (ٹکیہ) عام طور پر سورج کی علامت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سورج اور چاند کے امیجز بھی ہوں۔ اس کے معنی ہیں کہ نینڈرتھال آدمی اپنی سفا کی کے باوجود کسی قسم کے مذہب کا پیرو تھا اور مذہب بے شک کائنات کے متعلق انسان کے احساس اور اس کے غور وفکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نینڈرتھال آدمی تیر کمان ایجاد کرنے سے پہلے ہی 'ایک فرد' تھا۔

مارتھ کی 'مغز خوری' کی تھیوری سے آرڈری کی تیر کمان تھیوری تک اکثر پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ سب سمجھتے ہیں کہ آدمی بنیادی طور پر ایک کمزور مخلوق ہے۔ جو گھسٹتا اور لڑکھڑاتا ہوا ان انکشافات تک جا پہنچتا ہے جن سے کسی اتفاق یا حادثہ کی وجہ سے اس کے ارتقا کو مدد ملتی ہے۔ آرڈری اور لورینز کہتے ہیں کہ ہتھیاروں کے انکشاف سے ہاتھ اور آنکھ میں بہتر تعاون پیدا ہوا جس سے دماغ بڑا ہو گیا۔ آرڈری ہی کا کہنا ہے کہ دور مار ہتھیاروں کی ایجاد سے 'انفرادیت' پیدا ہوئی۔ 'بڑے دماغ' کے راز پر بات کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہ ایسا ہی ہے کہ پیٹرول سے پہلے ہی کسی نے رولز رائس بنا دی ہو۔ اسی بات سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے حقائق کو محض اوپر تلے کر رکھا ہے۔ فرض کریں کہ یہ اس طریقہ سے ہوا کہ انسان اپنے مسائل کے حل کی تلاش میں ان انکشافات سے دوچار ہوا۔

آیئے، ہم اس دوسرے نقطۂ نظر کا جائزہ غور سے لیں۔ ہم اس جانی پہچانی حقیقت سے بات شروع کرتے ہیں کہ قبل از تاریخ کسی دور دراز مرحلہ پر پندرہ اور پچپن ملین برس پہلے ہمارے قدیم پیش رو درختوں سے اتر کر زمین پر آ گئے کیونکہ انہیں زمین پر رہنا زیادہ فائدہ مند نظر آیا۔ انہوں نے جڑیں کھودیں (جیسے کہ ماڈرن بندر کھودتے ہیں) اور چھوٹے جانور کھائے (ماڈرن بندروں کی طرح) پھر انہوں نے بڑے جانور کھانا شروع کیے، جیسے ہرن وغیرہ جو گھنے جنگلوں یا دلدل میں پھنس جاتے تھے اور ایک وقت آیا جب انہیں احساس ہوا کہ بندر اور گلہریاں کھانے سے بہتر ہے کہ بڑے جانوروں کا شکار کیا جائے۔

سیدھا کھڑا ہونے کے انداز سے ایک اور فائدہ ہوا کہ وہ دور تک دیکھ سکتے تھے۔

اور اس میں شکاری کے لیے بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ایک اور بات کہ دور دیکھنے سے ایک طرح کا اطمینان حاصل ہوتا ہے، ورنہ ایسا کیوں ہے کہ پینورامائی مناظر سے ہم لطف اندوز اور مطمئن ہوتے ہیں اور بہت دیر تک ایک چھوٹے سے کمرہ میں رہنا بھی ہمیں برا نہیں لگتا۔ دور کے امکانات سے ہم میں نجات اور آزادی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جنس اور خوراک کی خواہش بیدار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ لاکھوں برس سے ہمارے بزرگ جب کسی درخت پر جاتے ہیں یا دور کوئی میدان دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں میں شوق اور اُمید کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ ہم آج بھی یہی محسوس کرتے ہیں جب ہم کسی پہاڑی کی چوٹی سے نیچے دیکھتے ہیں، اگرچہ ہمیں کسی شکار کی تلاش نہیں ہوتی۔ ہم اسے اپنا ذوقِ جمال سمجھتے ہیں مگر عجب نہیں کہ اس کی جڑیں ہمارے پیٹ کے اندر، ہماری بھوک میں ہوں۔

اب ہم اس راز کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ پہلے انسان بھیڑیوں کی طرح گروہ بن کر شکار کیا کرتے تھے یہاں تک کہ آرڈری آسٹرالو پتھیکس کو 'بھیڑیا بندر' کہتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ہوا کہ آدمی تو ترقی کر کے اشرف المخلوقات بن گیا اور بھیڑیا، آج تک صرف بھیڑیا ہی رہا ہے۔ کتوں اور بھیڑیوں کا جد امجد تو مارکس زمین پر راما پتھیکس کا ہم عصر تھا۔ اس کے علاوہ انسان اور بندر دونوں چھچھوندر جیسی ایک منحنی مخلوق کی نسل سے ہیں تو پھر ہمارا کزن کیوں ویسا ہی رہا جیسا کہ پندرہ ملین سال پہلے تھے۔ ہمیں ٹھیک ٹھیک سمجھنا ہے کہ ہم نے ترقی کیوں اور کیسے کی؟ کیونکہ ہماری ترقی نارمل نہیں۔ شارک، ڈیڑھ سو ملین برس میں نہیں بدلی۔ یہ اتنی کامیابی کے ساتھ لوٹ مار کرتی ہے کہ اسے کبھی اپنے حربے بدلنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ تبدیلی صرف اس وقت ہوتی ہے جب کوئی مخلوق اپنے آپ کو بدلنا چاہے اور اس کی خاطر کوشش کرے۔ پلیوسین اور پلائسٹوسین دشوار زمانے تھے مگر وہ ساری مخلوق کے لیے یکساں دشوار تھے۔ پھر انسان اور سب کو کیوں پیچھے چھوڑ گیا؟

عجیب بات ہے کہ اکثر ماہرین نے جنس جیسے کھلے امکان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ڈیسمنڈ مورس نے چند صفحات عورت کی اناٹومی (انسانی بدن کے اعضا کی تشریح) کی نشوونما کی نذر کیے ہیں اور ایلین مورگن نے کہا ہے کہ عورت کی چھاتیاں شاید اس لیے بڑی ہوئی ہوں کہ بچے کو ان تک پہنچنے میں آسانی ہو (کیونکہ عورت کے جسم پر بندر جیسے بال نہیں ہوتے کہ بچہ ان سے چمٹ جائے) مگر دونوں نہیں دیکھتے کہ انسانی ارتقا میں عورت کی جنسی تبدیلی واحد اہم

سبب ہوسکتی ہے۔

بندر کی مادہ مہینہ میں صرف ایک ہفتہ کے لیے بندر کی طرف مائل ہوتی ہے۔ مگر عورت نے اپنی تاریخ کے کسی دور میں سیزنل ہونا چھوڑ دیا اور سیزن سے قطع نظر ہر وقت مرد کی طرف مائل ہونے لگی۔ اس کی توجیہہ اس طرح ہوسکتی ہے کہ جب قبیلہ کے مرد دنوں اور ہفتوں تک شکار کرنے میں مصروف رہتے تو واپسی پر وہ عورتوں سے جنسی گرم جوشی کی توقع رکھتے۔ چاہے ان کا سیزن ہو یا نہ ہو۔ اس عرصہ میں وہ عورتیں جنہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا اپنے جیسی اور پیدا کرتی رہیں، جبکہ جانوروں کی مادائیں قدرتی طور پر اس دائرے سے باہر ہوگئیں۔ لیکی کے اس انکشاف سے کہ راما پتھیکس ایک شکاری تھا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی ہماری تاریخ کے آغاز ہی میں رونما ہوچکی تھی۔

جانوروں کے لیے جنس کبھی کبھار کا مشغلہ ہے۔ ان کا حقیقی مسئلہ پیٹ ہے مگر عورت جب ایک بار مستقل طور پر آمادہ ہونے لگی اور بھری بھری چھاتیوں اور دلآویز ہونٹوں کی صورت مرد کی بربادی کے اسباب کرنے لگی تو مرد کو بھی اپنی بہادری اور استادی کی نمائش کا بہانہ مل گیا۔ شناساؤں کے ہجوم میں کسی غیر عورت کی موجودگی نے رقابت اور اشتعال کو ہوا دی ہوگی جو جانوروں کے اور کسی گروہ میں ممکن نہیں۔ اچانک مردوں کو زبردست شکاری بننے کا خیال آ گیا۔ اس صورت میں گوئٹے انسانی ارتقا کی مرکزی صداقت کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''دائمی نسوانیت ہمیں اوپر لے جاتی ہے، اور اوپر۔''

مگر اس قسم کے رومانی جنسی انتخاب سے دماغ کیوں بڑا ہوگیا؟ اس لیے کہ بڑے شکاری کے لیے بڑی ذہانت اور بڑی بہادری درکار تھی۔ اس واسطے دماغ پہلے بڑی ست رفتاری کے ساتھ سائز میں بڑا ہوا۔ یہاں تک کہ راما پتھیکس کے دماغ کو 400cc سے آسٹرلو پتھیکس کے 600cc تک بڑھنے میں دس ملین برس لگے۔ پھر تیز رفتاری کے ساتھ اس طرح بڑھا کہ ہوموار یکٹس کا دماغ دو ملین سے کم برسوں میں 1000cc ہوگیا۔ (رابرٹ آرڈری کہتا ہے کہ اناطول فرانس کا دماغ صرف 1000cc تھا) جس کا مطلب ہے کہ 'پیکنگ مین' پہلے ہی ایک کالج پروفیسر کا دانشور ہمسر تھا، پھر 'برین ایکسپلوژن' کا دور آیا جب اوسط آدمی کا دماغ صرف پانچ لاکھ برس میں ایک تہائی اور بڑا ہوگیا۔

اگر ارتقا کی یہ رومانی داستان صحیح ہے تو ہمیں انسانی دماغ کے اس رفتار سے بڑھنے کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ اس لیے بڑھا ہے کہ جنس نے انسان کو اپنی

ذہانت بروئے کار لانے کے لیے متحرک کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ یہ بات کسی ایسے شخص کے دل میں شک پیدا کر سکتی ہے جو جنسیت کے بارے میں بیسویں صدی کے حوالے سے سوچتا ہے جب مرد کی جنسی علامت، چمڑے کی جیکٹ پہنے، موسیقی کے ساتھ اپنی کمر آگے پیچھے لہرانے والا پاپ سنگر ہے جس کے لیے ذہانت فالتو اور بے مصرف ہوتی ہے۔ مگر پاپ سنگر، ذہانت کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ جبکہ شکاری ذہانت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا اور یہ بات ہم اس وقت مان رہے ہوتے ہیں جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنی دانش، اپنے کرافٹ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور یہ کہ ہوشیاری اور ذہانت انسان کی بنیادی خصوصیت ہے۔ جسے وہ جانوروں کے زندہ بچ نکلنے کی فطری خواہش کے خلاف داؤ پر لگاتا ہے۔

اچھا، تو پھر آرڈری پوچھتا ہے، ''انسان نے اپنے اس بڑھے ہوئے مغز کے ذریعہ کیا کیا ہے؟'' یہ ایک اتفاق ہو یا نہ ہو مگر 'برین ایکسپلوژن' (تقریباً پانچ لاکھ برس پہلے) آخری برفانی عہد کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ اس وقت سے تقریباً دس ہزار سال پہلے تک، برف وقفوں کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہی۔ برف کے عہد میں شکار کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے اس لیے ذہانت اور مہارت کی ضرورت بھی بڑھ جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ مہارت انسان کے ہتھیاروں میں نظر نہیں آتی۔ اس کا سب سے اہم ہتھیار نیزہ، جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ جہاں تک ہوموار یکٹس کا تعلق ہے اس کا سب سے بڑا ہتھیار دستی کلہاڑا تھا جو شاید تقریباً دس لاکھ سال پہلے دریافت ہوا تھا اور جس میں دس لاکھ برس کے اندر کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی۔ مگر کیوں ہوتی؟ جبکہ اس کا مقصد صرف شاخیں کاٹنا، جانوروں کی کھال اتارنا اور کھوپڑیاں کھول کر ان میں سے مغز نکالنا تھا۔ ان میں سے بھی کسی کام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

ایک معتبر شہادت کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ انسان نے ایک نیا ہنر سیکھ لیا تھا۔ یہ تقریباً دو لاکھ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ اور اس کا ثبوت فرانس سے ملا تھا۔ یہ بیل کی پسلی ہے جس پر دنیا کی قدیم ترین نقاشی کندہ ہے۔ یہ کچھ ایسی خیال انگیزی بھی نہیں۔ بس تین محرابی پیٹرن ہیں جن کے بعض حصے ایک دوسرے پر پھیلے ہوئے ہیں، چند لکیریں ہیں اور V جیسے نشان ہیں جو ممکن ہے کہ آشوب زمانہ کے لگائے ہوئے چرکے ہوں۔ اس کا خیال انگیز پہلو یہ ہے کہ یہ فن پارہ **Homo Erectus** کی تخلیق ہے۔ دوسری منقش ہڈیوں کے ملنے میں کم و بیش ایک لاکھ پچھتر ہزار برس لگ گئے جو ہمارے براہِ راست پیش رو دنیا کے پہلے پینٹر **Cro-Magnon Man** کی تخلیق ہے۔

کرومیگنن آرٹ1865ء میں دریافت ہوا جب ایک فرانسیسی وکیل کو ہرنوں اور دوسرے جانوروں کی منقش ہڈیاں ایک قصبہ میں ملیں۔ انہیں1878ء میں پیرس کی ایک نمائش میں رکھا گیا تو ڈان مارسلینو نامی ایک ہسپانوی رئیس نے انہیں دیکھا۔ اس کی جاگیر ایک مقام، جسے ابAltamira کہا جاتا ہے پر واقع ہے۔ وہاں ایک زیرزمین غار اتفاقاً اُس وقت ملا جب ایک شکاری کتا کسی گڑھے میں گرا۔ بھینسے اور جنگلی گھوڑوں کی ہڈیاں وہاں پہلے ہی مل چکی تھیں۔ اب اس نے مزید تلاش کی تو دیکھا کہ دیواریں اور چھتیں بھینسے، ہرن اور جنگلی گھوڑوں کی پینٹنگز سے بھری ہوئی ہیں۔ مگر یہ انکشاف اسے راس نہ آیا۔ ماہرین کی کانگریس نے ان پینٹنگز کو نقلی قرار دیا اور وہ1888ء میں دل گرفتہ مرگیا۔ التامیرا پہلے ہی بھلا دیا گیا تھا۔ جب فرانس کے غاروں میں مزید پینٹنگز ملیں تو بڑی دیر کے بعد التامیرا کی اہمیت کا احساس ہوا اور جبDordogne کے غاروں سے ایسی پینٹنگز ملیں جن کے بعض حصوں پر چاک اور چونے کی تہیں جمی ہوئی تھیں تو ان کی قدامت کے بارے میں رہے سہے شکوک بھی رفع ہوگئے۔

قدرتی بات ہے کہ وکٹورین عہد کے لوگ ان پینٹنگز کو محض قدیم آرٹ کا نمونہ سمجھتے رہے جو 'کرومیگنن مین' کے لیے فرصت کا مشغلہ تھا۔ اس خیال پر شک کرنے والا پہلا شخص فرانسیسی انسٹی ٹیوٹ کا ایک ممبر سائمن رائناک تھا جس نے1903ء میں دعویٰ کیا کہ پینٹنگز ان جادوئی رسوم کا حصہ ہیں جن کے ذریعہ جانوروں کو گھیر کر شکاریوں کے پالے میں لانا ہوتا ہے۔ پتھر کے زمانہ کی ایک مشہور ڈرائنگ (جس کا تعلقDordogne سے ہے) کا موضوع ایک محورِقص بھینسا ہے جس کی ٹانگیں آدمی کی ہیں۔ ظاہر ہے کسی آدمی نے بھینسے کی کھال پہن رکھی ہے۔ ایک اور ڈرائنگ میں آدمی نے ہرن کے سینگ لگائے ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اکثر ماڈرنPrimitives اپنے جادو کے طریقوں میں جانوروں کی تصویریں بھی شامل کرتے ہیں۔ کانگو کے قدیم باشندے جانور کو ریت میں دکھاتے ہیں اور اس کے گلے کو تیر کا نشانہ بناتے ہیں۔ ٹنگواس جانور کی کندہ کاری کرتے ہیں جسے وہ شکار کرنا چاہتے ہیں بعض لوگ لکڑی سے مچھلی بناتے ہیںMask of God اورHunting People جیسی کتابوں میں ایسی درجنوں مثالیں ہیں۔ چنانچہ چند ماڈرن سکالروں کے شک کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ کرومیگنن مین کی اینیمل پینٹنگز کا مقصد محض وہ رسمیں ہیں جو شکار میں کامیابی کی ضمانت ہیں۔ بعض جانوروں کو ایک دوسرے پر بار بار بنایا گیا ہے، جس سے صاف واضح ہے

کہ ایسا کرنا بعض رسوم کا حصہ ہے۔ Le March کی ایک ڈرائنگ میں عورت کا جسم 'ناچتے ہوئے شمن کے ساتھ جڑا ہوا دکھایا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ کسی جادوگر نے اپنی پسندیدہ عورت کو تسخیر کرنے کے لیے اپنے فن سے کام لیا ہے)

1960ء کے عشرے میں الیگزینڈر مارشک نامی ایک سائنسی صحافی داردون کے غاروں سے ملنے والے نوادرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوادرات ہڈیوں اور ہرن کے سینگوں کے ٹکڑوں پر مشتمل تھے جن پر ہلکے نشان، چھوٹے نقطے اور بعض پر متوازی لکیریں تھیں۔ مارشک، خلا کی ریسرچ پر کتاب لکھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ سائنس اور ریاضی کے آغاز پر ایک الگ باب لکھے۔ وہ جس مسئلہ سے نالاں تھا اسے وہ 'A series of suddlies' کہتا تھا یعنی اچانک واقعات کا سلسلہ۔ یونانی سائنس کی ابتدا اچانک ہوئی، علم نجوم اچانک شروع ہوا، عراق سے لکھے ہوئے لفظ کا آغاز اچانک ہوا، زراعت اچانک شروع ہوئی، وغیرہ جبکہ یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ 'کرومیگنن مین' کا دماغ بھی تو آخر آج کے آدمی کے دماغ جتنا تھا اور وہ چالیس ہزار برس سے زمین پر رہ رہا تھا۔ تو کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان انکشافات کی تاریخ پرانی، اتنی پرانی ہو کہ اس کا سلسلہ 'آخری برفانی عہد' سے جا ملے۔ خردبین کے ذریعہ نشان زدہ ہڈیوں کا جائزہ لیتے ہوئے مارشک اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہڈیوں پر نقطے مختلف اوقات پر مختلف آلات کے ساتھ لگائے گئے تھے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ ان پر کسی قسم کے پیغام رقم تھے۔ نقطے سانپ کی لکیر جیسے لہراتے انداز میں تھے۔ ان کے متعلق مارشک کا خیال تھا کہ وہ چاند نکلنے کی مہینہ وار تاریخوں کا حساب تھا۔ مارشک نے درجنوں ہڈیوں کا جائزہ لیا جن میں سے بعض کا تعلق 34000 BC سے تھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمام نقطوں کا حوالہ چاند اور موسم تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ عہد قدیم کا کیلنڈر تھا۔ پتھر کے زمانہ کے آدمی کو کیا پڑی تھی کہ وہ چاند نکلنے کے اوقات کی فکر کرے۔ اسے جانوروں کی موسمی نقل وحرکت کے متعلق جاننا ہوتا تھا۔ یہ کہ بھینسے اور ہرن کی نقل مکانی کب ہوتی ہے اور سامن (مچھلی) دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر کب جاتی ہے 'The Roots of Civilization' نامی کتاب میں ان اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا تھیسس یہ ہے کہ ہمارے کرومیگنن بزرگ، ایک سادہ طرزِ تحریر ایجاد کرنے والے، ایسے قدیم اور فرسودہ بھی نہیں تھے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے۔

اب Pech del Aze سے ملنے والی کندہ ہڈی کی اہمیت کو سمجھنا آسان ہو گیا

ہے۔ اس پر overlap ہونے والی لکیریں بے معنی ہیں۔ عام آدمی کی نظر میں سوچے سمجھے بغیر بے مقصد قلم گھسیٹا گیا ہے۔ لیکن اگر مارشک ٹھیک کہتا ہے تو قدیم آدمی کے پاس بے مقصد ہونے کی فرصت نہیں تھی۔ اس کا فن با مقصد تھا اور اگر کرومیگنن آرٹ کا تعلق بنیادی طور پر مذہبی یا جادوئی رسوم سے تھا تو یہی بات ہوموار یکٹس آرٹ کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ درحقیقت اگر اچانک (یا ناگہانیت) کے متعلق مارشک کی بات ٹھیک ہے تو مذہبی آرٹ کی اوریجن کا سلسلہ کرومیگنن مین کے اعلیٰ ترقی یافتہ آرٹ سے پہلے بہت دُور تک پھیلا ہوا ہے۔

ان سب باتوں سے انسانی ارتقا کے راز کو جاننے کا ایک دلچسپ موقع ہمارے ہاتھ آتا ہے۔ شروع ہی سے ہمیں آرڈرلی کے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ ہوموار یکٹس نے اپنے بڑے دماغ سے کیا کیا؟ یہ کیا ہے کہ اس نے اپنے دماغ سے سائنس کی انتہائی ابتدائی شکل تخلیق کرنے کا کام کیا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ آخر سائنس بھی تو عقل اور استدلال کی مدد سے فطرت کو سمجھنے اور کنٹرول کرنے کی ایک کوشش ہے اور ایک سرگرم شمن بھی (جو تقریبات میں زور شور کے ساتھ اس لیے حصہ لیتا ہے کہ شکار میں کامیابی ہو) اتنا ہی سائنس دان ہے جتنا کہ کوئی ایٹمی سائنس دان جو ذرات کی تلاش میں سرگرداں ہو۔

اس آئیڈیا کو مان لینے میں ہمیں کیا دقت پیش آتی ہے؟ صرف یہ نہیں کہ ہمیں بمشکل یقین آتا ہے کہ بندر سے مشابہ ہوموار یکٹس کے خیالات پہلودار تھے۔ جدید ماہرین بشریات نے انکشاف کیا ہے کہ قدیم لوگوں میں سے اکثر کے خیالات نہایت پیچیدہ ہیں۔ اس لیے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ مذہب بنیادی طور پر انسانی خصوصیت ہے۔ یہ تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی گھوڑے یا گوریلے کے بھی کوئی مذہبی خیالات ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سوال پوچھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کو اسی طرح لیتے ہیں جس طرح کہ وہ ہوتی ہے۔ اور ہوموار یکٹس کی نئی تشکیل اسے آدمی سے زیادہ گوریلا بنا دیتی ہے۔

شاید ہمارا یہ خیال غلط ہو کہ مذہب کا انحصار 'سوال پوچھنے پر ہے Auguste Comte نے کہا ہے کہ 'مذہب' مافوق فطرت ہستیوں کے حوالہ سے دنیا کی طرف سے جواب دہی کی ایک کوشش ہے، مگر یہ تو انیسویں صدی کا خصوصی ریشنلزم ہوا۔ Comte کا خیال ہے کہ قدیم انسان طوفان آتا دیکھ کر پوچھتا ہوگا کہ 'طوفان کیوں آتا ہے' اور جواب ہوگا کہ 'خدا خفا ہے' مگر قدیم لوگ طوفان آنے کی وجہ نہیں پوچھتے بلکہ اس کا سامنا، احساس اور وجدان کے ساتھ کرتے تھے۔

پشا کو قبیلہ کے قتل عام کے بارے میں تامی پینگ کا بیان ایک اہم اشارہ ہے۔ ایک جادوگر جو گھر میں بیٹھا ایک بیمار کو پھونکیں مار رہا تھا، اچانک بولا کہ "لوگ آ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے گھر کے افراد کو خبردار کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر خبردار کیا کہ "لوگ آ چکے ہیں۔" مگر اسے کیونکر پتہ چلا؟ یہ تو خیر ممکن ہی نہیں کہ اس نے دشمن کے آنے کی آہٹ سن لی ہو۔ ان کے پجاری اس لیے پجاری ہیں کہ ان کے پاس 'second sight' (یا جسے سکاٹس Scots محض the sight کہتا ہے) کی نعمت ہے۔ کتاب The Occult کے اندر میں نے ایک کیس کا حوالہ دیا ہے جس کا ذکر ناول نگار نارمن لوئیس نے کیا ہے کہ ایک شخص کو کیسے پتہ چلا کہ گاؤں کے ایک گھر میں کسی شخص کی لاش پڑی ہے۔ پھر فوراً ہی اس نے اس گھر کا پتہ چلا لیا جہاں چھت کے ایک کونے میں مقتول کی لاش چھپائی گئی تھی۔ لیوس کا کہنا ہے کہ ان معلومات کا ذریعہ وہ اعلیٰ ترقی یافتہ حسیات (senses) ہیں جنہیں دنیا کے اس حصہ میں پوری طرح مانا جاتا ہے۔

اگر ہم اس قسم کے حسیاتی ادراک کو نہ مانیں تو بھی قدیم لوگوں کے اس فطری ادراک سے انکار ممکن نہیں جس کے ذریعہ وہ پانی تلاش کرتے ہیں۔ ایک دوشاخہ ٹہنی کے ذریعے زیرِ زمین پانی کو تلاش کرنے کی اہلیت آج اکثر دیہی علاقوں میں عام ہے۔ مگر آسٹریلیا کے قدیم باشندے کسی ٹہنی کے بغیر زیرِ زمین پانی تلاش کر لیتے ہیں۔ پروفیسر Y.Rocord جیسے سائنسدانوں نے اس معاملہ پر ریسرچ کی اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ زیرِ زمین پانی سے زمین کے مقناطیسی میدان میں جو سرسری تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کا اندازہ بھی دوشاخہ چھڑی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ یہ تجربہ منطق سے عاری نہیں لگتا کیونکہ اب یہ بات بالکل ثابت ہو چکی ہے کہ پرندے زمین کے مقناطیسی میدان کی مدد سے نقل مکانی (ہجرت) کرتے ہیں۔ مانچسٹر یونیورسٹی میں ڈاکٹر رابن بیکر کے تجربات سے ظاہر ہے کہ انسانوں پر بھی زمین کی مقناطیسیت کا اثر ہوتا ہے۔ آنکھوں پر پٹیاں بندھے طالب علموں کو 40 میل فاصلہ تک ایک ایک چکر دار راستہ سے دوڑایا گیا اور پھر انہیں 'گھر' کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کہا گیا، 69 فیصد 45 ڈگری قوس میں صحیح تھے جبکہ ان کا تیسرا حصہ 10 ڈگری کے اندر صحیح تھا۔

یہ جان لینا کافی آسان ہے کہ پانی تلاش کر لینے اور 'گھر' کی سمت درست 'اشارہ' کرنے کی اہلیت ہمارے بزرگوں میں لاکھوں برس سے تھی اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ آج بھی یہ خوبیاں ان کے جانشینوں میں کیوں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ مارشک کے بعض سوالات کے

جواب بھی اس میں موجود ہیں۔ وہ پورے یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ ہڈیوں پر کندہ نقطوں کا تعلق چاند طلوع ہونے کے اوقات سے ہے۔ مگر ہمارے بزرگ اس کے طلوع ہونے کے اوقات میں دلچسپی کیوں لیتے تھے؟ اس لیے کہ وہ رات کو نہیں بلکہ دن کو شکار کرتے تھے۔ اگر ان کا مقصد محض یہ اندازہ کرنا تھا کہ بھینسے اور ہرن اپنی سالانہ ہجرت کب شروع کریں گے تو دوسری ہڈیوں پر پائے گئے عمودی نشان لگانے کا مطلب شکار کا شکار ہوگا۔

ہم جانتے ہیں کہ زمین کے مقناطیسی میدان پر سمندر کی لہروں کی طرح چاند کا زبردست اثر ہوتا ہے۔ شاید یہی مقناطیسی اثر ہے جس کی وجہ سے چاند پورا ہونے پر ذہنی مریضوں میں بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ (اور جس کی وجہ سے ہم دیوانگی کی باتیں کرتے ہیں) ورجینیا کے Dr. Leonard Ravitz کی ریسرچ کے مطابق سینہ اور سر کے درمیان برقیاتی پوٹینشل میں فرق ہے اور یہ کہ نارمل لوگوں کی نسبت دماغی مریضوں میں نئے چاند اور چاند پورا ہونے پر اس فرق میں بہت زیادہ کمی بیشی ہوتی ہے۔ ایک جاپانی ڈاکٹر ماکی ڈکاٹا نے 1940ء کے عشرے میں کہا کہ خون جم جانے کی رفتار پر سورج کے داغوں کی حرکت کا اثر ہوتا ہے۔ درختوں کے مقناطیسی میدان پر 1930ء کے عشرے میں سیکسن براور نارتھراپ کے تجربوں سے ظاہر ہوا کہ اس پر بھی سورج کے داغوں کا اثر ہوتا ہے۔ مگر ان کے تجربات میں نہایت اہم تفریق یہ تھی کہ زندہ مادہ کسی نہ کسی طرح اکٹھا رہتا ہے اور ایک مقناطیس سے اس کی شکل بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر سمندری Urchin کے نصف انڈے گرم سوئی کے ساتھ ضائع کر دیے جائیں تو باقی نصف ایک مکمل مگر نصف سائز کے جنین میں پرورش پاتے ہیں۔ (Hans Driesch کا ایک تجربہ جو اس نے بیسویں صدی کے آغاز میں کیا تھا) ہر نصف میں مکمل برقیاتی 'بلیو پرنٹ' کا کل ہوتا ہے۔ مگر حیران کن بات ہے کہ برقی میدان کی جیلی کے سانچے جیسی شکل ہو جو سفید کریم میں بدل کر ایک قلعہ سا بن جاتا ہے۔ (یہی وہ سانچہ ہے جس کے ذریعہ کسی مخلوق کے کھوئے اعضا دوبارہ بنتے ہیں) گویا کہ برقی میدانوں کے ذریعے زندگی کی قوت مادے کو تسخیر کرتی ہے۔

اس لیے اس انکشاف میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ جان دار زمین کے مقناطیسی میدان کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اگر نہ ہوتے تو یہ حیرانی کی بات ہوتی۔ اور چونکہ خلا میں ہمارے ہمسایہ سیاروں اور چاند سورج کی حرکت سے یہ میدان بدلتا رہتا ہے یہ بھی حیرانی کی بات ہوگی اگر ہمارے دور کے کسی پیش رو نے اپنی زمین اور اپنے سر پر آسمان کے ساتھ اپنا

تعلق فطری طور پر محسوس نہ کیا ہو۔ زیر زمین پانی اور اس کے برقیاتی میدانوں سے اپنی حساسیت کو لاکھوں برس پہلے ہمارے بزرگوں نے ضرور بڑھایا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ Pliocene دور کی انتہائی ہلاکت خیز خشک سالیوں میں انہوں نے ایسا کیا ہو۔

ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم انسان کو فطرت کی قوتوں کے متعلق سوال پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کے آس پاس تھیں اور وہ انہیں محسوس کر سکتا تھا۔ بالکل ایک مچھلی کی طرح جو پانی کے دباؤ میں ہر تبدیلی کو اپنے پہلو کے اعصاب کے ذریعہ محسوس کر لیتی ہے۔ اس کا نتیجہ زمین و آسمان کے ساتھ ایک ہونے کا ایک عجیب سا احساس ہوا ہو گا۔ جسے زمانہ ہوا کہ Homo Sapien گنوا بیٹھے تھے۔ قدیم آدمی کا مذہب، کائنات کی وضاحت کرنا نہیں تھا بلکہ اس کی قوتوں کا قدرتی جواب تھا، ان کا سامنا کرنا تھا جیسے جلد دھوپ کی تپش کا سامنا کرتی ہے۔

مگر اب بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ پشانگو جادوگر کو دشمنوں کی آمد کا پتہ کیسے چلا؟ جدید نفسیات اس کی وضاحت شاید ٹیلی پیتھی کے حوالہ سے کر سکے مگر خیال رہے کہ وہ جادوگر خود ایسی وضاحت کو نہیں مانے گا۔ تمام شمن، ساحر اور جادوگر ہمیشہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اپنی طاقت روحوں بالعموم مُردوں کی روحوں سے حاصل کرتے ہیں۔ زمین کی قوتوں کا جواب دینے کے لیے، پانی کی تلاش اور اچھی فصل کی ضمانت کے لیے، یہ شمن کی اہلیت کا لازمی حصہ ہے کہ وہ روحوں کی دنیا سے رابطہ کرے۔ ہم اسے پرانے لوگوں کا وہم سمجھ کر بے شک نظر انداز کر دیں مگر اس طرح ہم پھر ایک اہم نقطۂ نظر انداز کر دیں گے اگر ہم اسے حیات بعد الموت کے مسئلہ کی وضاحت سمجھیں۔ شمن روحوں کو نہیں مانتے۔ روحیں ان کا تجربہ بنتی ہیں۔ یا کم از کم کسی ایسی چیز کا تجربہ جسے وہ روحوں کی دنیا کے طور پر مانیں۔ چنانچہ اس کا کوئی امکان نہیں کہ نینڈرتھال نے مرنے والوں کی تدفین اور اس کی رسمیں اس لیے ادا کی ہوں کہ اسے حیات بعد الموت پر یقین تھا بلکہ وہ اس لیے ایسا کرتا تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ اسے روحوں نے گھیرا ہوا ہے اور ان روحوں میں مرنے والوں کی روحیں اور فطرت کی نہ ٹلنے والی بلاؤں کی روحیں بھی شامل ہیں۔ یہی بات ہوموا ریکٹس کے متعلق بھی صحیح ہے۔ اگر وہ ہڈیوں پر کندہ کاری کرتا رہا یا پینٹنگز بناتا رہا تو اس لیے کہ وہ اس کی مذہبی رسوم کا حصہ تھیں۔ اور اگر اس کے کوئی مذہبی تصورات تھے تو ان کا تعلق یقیناً مرنے والوں کی روحوں اور فطرت کی روحوں سے تھا اور یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ یہ تصورات بعد کی پیداوار ہیں۔ اگر مذہب اور فطری قوتوں کا

ساتھ ہے تو مذہب کا آغاز شاید تاریخ سے پہلے ہوا ہو۔ راما پتھیکس کے پاس 'شکار جادو' کا غالبًا اپنا کوئی بدل ہو۔

اور انسانی یا حیوانی قربانی کا کیا ہو؟ جو ہمیشہ قدیم مذہب کا حصہ رہی ہے۔ قدیم انسان کو اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ انہیں روحوں کی نذر کریں؟ ہم صرف یہاں ایک مانی ہوئی حقیقت کی نشاندہی کر سکتے ہیں کہ جادو کی تاریخ کے ہر دور اور ہر کلچر میں آدمی کو یقین رہا ہے کہ جادو روحوں کی مدد سے کیا جاتا ہے اور قدیم بابل سے جدید برازیل تک یہ بھی اس کا یقین رہا ہے کہ روحوں کی نذر کے لیے قربانی ضروری ہے، جس کی رسوم پورے اہتمام کے ساتھ ادا کی جائیں جیسا کہ میں نے اپنی تصنیف 'Poltergeist' میں بیان کیا ہے کہ ایک جدید برازیلی روحانی انسان (ارواحیت پرست) کا کہنا ہے کہ روحوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ انہیں غذا، شراب، جنس اور عمدہ سگاروں کی آسانیاں حاصل رہیں۔ اس کے عوض وہ انہیں شر پسند بھوتوں کی طرح ڈراتی رہیں گی۔ مغرب میں تو ان خیالات کو واہیات سمجھا جاتا ہے لیکن اگر ہمیں قدیم مذہب کو سمجھنا ہے تو مان لینا چاہیے کہ ایسے خیالات تاریخ کے ہر دور اور ہر کلچر میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ہوموار یکٹس نے چوکاتیئن کے غاروں میں انسانی قربانی دی تھی تو ہمیں کم از کم اس خیال کو تو اہمیت دینی چاہیے کہ جادو ہوموسیپیئن سے بہت پرانا ہے۔

ان سب باتوں سے یہ پہلو واضح ہو جاتا ہے کہ کرومیگنن مین کیوں چاند میں اتنی دلچسپی لیتا تھا اور کیوں علم نجوم ہی کو عراق میں پہلی سائنس مانا گیا۔ یہ ستاروں کی رفتار جاننے کی کوئی دانشورانہ کوشش نہیں تھی۔ نہ زرعی مقاصد کے لیے موسمی کیلنڈر بنانا تھا۔ (کیونکہ اس کے لیے تو مصر میں دریائے نیل ہی کافی تھا) یہ مذہب کا ارتقا تھا، زمین و آسمان کی قوتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا انسانی شعور تھا۔

لگتا ہے کہ کرومیگنن مین نے انسانی قربانی کی رسم جاری رکھی کیونکہ چوکاتیئن کے قریب ان کی بستیوں میں آدم خوری کے نشان پائے گئے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمارے قریبی بزرگ ظلم، جارحیت اور تشدد پر آمادہ رہتے تھے۔ مذہبی قربانی کی روح انکسار ہے۔ اس کا مقام کریمنلٹی (مجرمانہ ذہنیت) کی مخالف انتہا ہے۔ کریمنلٹی جو کبر اور خود پسندی کی پیداوار ہے۔

تاریخ کے ایک مرحلہ پر انسان نے دیوتاؤں کے ساتھ اپنی وابستگی کے اس احساس

سے بیگانہ ہونا شروع کر دیا۔ وَیلز کے مطابق یہ اس وقت ہوا جب اس نے پہلی دفعہ شہروں میں بسنا شروع کیا۔ مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ کہنا ایک حد تک صحیح نہیں۔ ابتدائی شہروں کے تین ہزار برس بعد بھی عراق کا بادشاہ اور اس کی رعایا اپنے آپ کو دیوتاؤں کے غلام سمجھتے رہے۔ History Begins at Summer میں سموئیل نیش کریمر لکھتا ہے کہ ''عراقی مفکرین کو پورا یقین تھا کہ آدمی مٹی سے بنا ہے اور ایک ہی مقصد کے لیے بنا ہے کہ دیوتاؤں کو کھانا پینا اور گھر فراہم کرے۔'' یہ بہت پہلے کی بات ہے جب ان معبد شہروں کے مکین ویلز کے 'ہجوم در ہجوم' میں بدل گئے اور جرم گریز کے بجائے قانون بن گیا۔

یہ کیسے ہوا؟ اس سوال پر ایک الگ باب میں غور کریں گے۔

احساس کا عذاب

1960ء میں ایک دوپہر کے بارہ بجے سے ٹھیک 90 سیکنڈ پہلے ایک نوعمر طالب علم کلاس گوسمن نورمبرگ کے قریب ہرش ہروچ میں واقع ایک بلاک کے اندر آیا۔ وہ ایک خاموش سنجیدہ نوجوان تھا جو اپنے شناساؤں میں صوفیانہ مزاج میں اپنی دلچسپی کی وجہ سے جانا جاتا تھا۔ اس کا خواب کسی چھوٹے سے خاموش گاؤں میں پادری بننا تھا جہاں وہ بھلائی کے کسی کام میں اپنی زندگی وقف کر سکے۔

اس نے بے سوچے سمجھے ایک فلیٹ کے دروازے پر دستک دی تو ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔ اس وقت بارہ بجنے میں تیس سیکنڈ باقی تھے۔ گوسمن نے نوجوان سے کہا، ''سر، میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، خیال رہے میں اسے دہراؤں گا نہیں۔'' ''کون سا سوال؟'' ''تمہارا روپیہ یا تمہاری جان؟'' اسی وقت مقامی گرجوں کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں جو کانوں کو بہرا کرتے ہوئے دوپہر ہونے کی خبر دے رہی تھیں۔ گوسمن نے جیب سے ریوالور نکالا اور نوجوان کے دل میں گولی مار دی۔ نوجوان کی منگیتر (جو حیران ہو کر دیکھ رہی تھی) نے چلّانا شروع کر دیا۔ گوسمن نے اس کے سر میں گولی ماری۔ اس سے پیشتر کہ گھنٹیوں کی آوازیں بند ہوں وہ مڑا اور گھر روانہ ہو گیا۔ گھر جا کر اس نے اپنی ڈائری میں قتل کا واقعہ لکھا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے ایک ایک سیکنڈ کا خیال رکھا تو چرچ کی گھنٹیوں کے شور میں گولی چلنے کی آواز دب گئی اور وہ بالکل پُرسکون اور بےفکر رہا۔

گوسمن نے اگلے سات برس میں چار مزید قتل کیے۔ ان میں سے ایک بنک ڈائریکٹر تھا جس کی دراز میں سے اس نے ہزار مارک نکالے۔ یہ قتل بھی عین دوپہر کو ہوا۔ پھر ایک بنک کے چوکیدار کو گولی مار دی جب وہ اپنی جیب سے چشمہ نکال رہا تھا۔ اور مزید اسلحہ

حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک گن شاپ کی بیوہ مالکہ اور اس کے 29 سالہ بیٹے کو گولی مار دی۔ اس کا اگلا جرم اس کا انجام تھا۔ جولائی 1947ء میں اس نے ایک ڈیپارٹمنٹ سٹور کے اندر ایک خاتون سے اس کا ہینڈ بیگ چھین لیا۔ اس نے شور مچایا تو گوسمن نے اس پر فائر کر دیا۔ مگر نشانہ خطا ہو گیا اس نے سٹور کے ایک افسر پر بھی فائر کیا جو اس کا پیچھا کر رہا تھا، مگر گولی اس کے بریف کیس پر لگی۔ جب اسے زمین پر گرا لیا گیا تو اسے خیال آیا ''یہ کیا بکواس ہے یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔''

اس نے ایک اور فائر کر کے اس افسر کو مار دیا، جس نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ آخر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ گوسمن نے یہ قتل کیوں کیے؟ بے شک کوئی ماہر نفسیات اس کی جذباتی اور ذہنی الجھنوں کا پتہ چلا سکتا ہے جن کی وجہ سے وہ جرائم کی طرف راغب ہوا۔ (وہ اپنے باپ، ایک فوجی کپتان کی یادوں کا بہت احترام کرتا تھا جسے امریکیوں نے جنگ کے اختتام پر گولی مار دی تھی) مگر جرائم کا اصل محرک اس کی خود پسندی اور خود نمائی تھی۔ اسے اپنے کمزور اور بے مایہ ہونے کا شدید احساس تھا اور وہ اس اذیت ناک احساس سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ صرف سوچتا ہی نہیں، عمل کرنا بھی جانتا ہے۔ اس کے جرائم اس کی اعلیٰ حیثیت منوانے کی بالارادہ کوشش تھی اور جیسا کہ بعض جوڑے آئینہ میں اپنی جنسی حرکات دیکھ کر ان سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اسی طرح گوسمن بھی اپنے جرائم کو حقیقت کا زاویہ دینے کے لیے ان کی تفصیل اپنی ڈائری میں لکھتا تھا۔ جیل کے اندر اس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ ''ایک مجرم کی حیثیت سے راسکالنی کوف (دستوئیفسکی کے ایک ناول کا کردار) اور مجھ میں بڑا فرق ہے۔ جب تک جج مجھے جہنم واصل نہیں کرتا میں اپنے آپ کو مجرم نہیں سمجھتا۔ جبکہ راسکالنی کوف ہمیشہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتا تھا۔'' دلچسپ تبصرہ! جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی موجودہ حالت بھی اسے اس کی 'غیر حقیقت پسندی' سے رہائی نہیں دلا سکتی۔ ''کیا بکواس ہے۔ ایسا یقیناً نہیں ہو سکتا۔'' جج نے بالآخر اسے جہنم واصل کیا، اسے عمر قید کی سزا ہوئی جس سے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

گوسمن کے کیس میں ہمیں جرم اور شناخت کے اندر کھلا تعلق نظر آتا ہے۔ اگر گوسمن میں حیوانوں جیسی سیدھی سادی سمجھ ہوتی تو وہ جرم کرنے کی اہلیت سے محروم ہوتا۔ اکثر نوجوان شناخت کے احساس کو گہرا کرنا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں بلکہ ان کی تقلید کرنا چاہتے ہیں جن کی شخصیت مضبوط اور شناخت مسلم ہوتی ہے، جو اپنی صلاحیتوں سے واقف

ہوتے ہیں۔ (کوئی شک نہیں کہ اپنے باپ کے لیے گوسمن کی چاہت اسی بنیاد پر تھی) نت نئے نرالے کپڑوں سے لے کر 90 میل فی گھنٹا کی رفتار سے گاڑی چلانے تک دراصل اپنی پہچان کرانے کے لیے اکثر نوجوانوں کی سرتوڑ کوششیں ہیں، مگر یہ کسی کتے کا مسئلہ نہیں ہوسکتا کیونکہ کتا خود پسند نہیں ہوتا اس لیے وہ جرم نہیں کرسکتا۔ جرم بنیادی طور پر ''میں'' کا مسئلہ ہے۔ ''میں'' نے فلاں کے منہ پر مکا مارا۔ ''میں'' نے بنک کلرک سے روپیہ چھینا۔ ''میں'' نے فائر کیا۔

یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ یہ ''میں'' نہ ہوتو کوئی جرم نہیں ہوسکتا۔ اگر تمہارا کتا کسی بھیڑ کا پیچھا کرے اور تم اسے مارو تو آئندہ وہ ایسا کرنے سے باز رہے گا۔ اپنی مرضی سے بھی باہر گھومتے ہوئے وہ یاد رکھے گا کہ بھیڑوں کا پیچھا نہیں کرنا ہے۔ مگر ایک چور جس نے پانچ برس جیل میں گزار دیے ہوں اور جسے بدترین قسم کی سزا دی گئی ہوئی تو بھی وہ کوئی ''کھڑکی کھلی'' دیکھ کر ساری سزائیں نظر انداز کر دے گا۔ مسئلہ سزاؤں کا نہیں، جرم کا بھی نہیں، بلکہ ایک تیسرا عنصر، اس کی اپنی شخصیت پرستی کا، اپنی انانیت کا عنصر منظر میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر اچانک اس کے سامنے کسی واردات کا موقع آتا ہے تو وہ اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ''اس بار میں شاید بچ جاؤں۔'' اگر بچ جائے تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو داد دیتا ہے، ''یہ میں نے کیا ہے۔'' خود پرستی کا یہی احساس پہلے قتل کے بعد گوسمن کی ڈائری کا موضوع بنا ہے۔ جب آدمی پہلی دفعہ اس قسم کی خود پسندی (جو خود آگاہی کی ایک قابل قبول قسم ہے) کا اہل ہوا تو اس میں جرم کرنے کی اہلیت بھی آ گئی۔ یہ کہ ایسا کب ہوا؟ اس سوال کا جواب شاید نہ دیا جا سکے مگر ایک چونکا دینے والی اور متنازع تھیوری سامنے آئی ہے۔ پرنسٹن کے ڈاکٹر جولین جیمز نے اپنی تصنیف The Origin of Consiousness میں اس کا ذکر کیا ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کے خلاف ایک جیسے اشتعال انگیز ریویو لکھے گئے، یہ سمجھنا آسان ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ جیمز کے مطابق پرانا عہد نامہ اور ''ایپک آف گلگامش'' اور ''ایلیڈ اینڈ اوڈیسی'' کے مصنف خود پسندی جیسے جذبہ سے بالکل محروم تھے۔ ان کی آگہی کا رخ خارجی دنیا کی سمت میں تھا اور ان میں اپنے اندر دیکھنے کی خواہش نہیں تھی۔ وہ ہومر کے کرداروں کے متعلق کہتا ہے ''ہم ان کے ہیروز تک پہنچنے کے لیے ان کی خوف ناک آنکھوں کے پیچھے، ان کے دماغوں کے اندر جگہ نہیں بنا سکتے۔ ایلیڈ کے کرداروں میں ہم جیسی داخلیت نہیں تھی۔ انہیں دنیا کے متعلق اپنی آگہی سے واقفیت نہیں تھی۔ ان کے دماغ میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں سے

وہ اپنے اندر کے جذبات و خیالات کا مشاہدہ کرتے۔ ہمارے لیے یہ ایک پریشان کن بات ہے کیونکہ ہم کوئی فیصلہ کرتے ہوئے اپنے اندر جھانکنے کے عادی ہیں۔ میں ٹرین سے جاؤں؟ یا بس سے جاؤں؟ ہم اپنے آپ سے پوچھتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے کسی اور سے پوچھیں۔ سمجھ نہیں آتی کہ ہم اس کے بغیر کوئی فیصلہ کیونکر کر سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بس آتی دیکھ کر اگر میں راستہ سے ہٹ جاؤں تو کسی تذبذب کے بغیر لپک کر اپنی جگہ واپس آ جاتا ہوں مگر یہ تو ایک سیدھا سا فیصلہ ہے۔ ٹرین یا بس پکڑنے کا فیصلہ کرنے کے لیے مجھے اپنے دماغ میں ان کا تصور لانا ہوتا ہے اور ان دونوں کا آپس میں موازنہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے مجھے اپنے اندر دیکھنا ہوتا ہے اور یہ تو سوچنا بھی ممکن نہیں کہ اس عمل سے گزرے بغیر حضرت سلیمان یا یولیسس نے اپنے فیصلے کیے ہوں گے۔

جیمز کے مطابق اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایسی 'آوازیں' سنتے ہیں جو انہیں فیصلہ کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ آوازیں، جو اُن کے اندر سے آتی ہیں۔ جیمز کو اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب اسے بھی اسی قسم کا تجربہ ہوا۔ ''ایک دوپہر میں فلسفیانہ مایوسی سے نڈھال صوفہ پر پڑا ہوا تھا کہ اچانک مکمل سکوت کے عالم میں ایک زوردار، صاف اور بلند آواز میرے دماغ کے بالائی دائیں حصہ سے آئی۔ ''جو جان چکے ہو اس میں جاننے والے کو شامل کرو۔'' میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ ہیلو؟ کہتے ہوئے میں نے جاننا چاہا کہ کمرے میں کون ہے؟ آواز بالکل صاف اور ایک خاص سمت سے آئی تھی۔ یہ ایک سمعی سراب تھا۔ اس تجربہ کے بعد جیمز نے اس موضوع کا مطالعہ شروع کر دیا تو اسے معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی ایک بڑی تعداد سمعی سراب سے دوچار ہو چکی ہے اور انجیل اور ایلیڈ جیسے قدیم ٹیکسٹ میں تو جیمز نے کسی قسم کے مشاہدۂ نفس کا شائبہ بھی نہیں پایا جبکہ سمعی تجربہ کی لاتعداد مثالیں ہیں جو خدا کی آواز یا خداؤں میں سے کسی ایک کی آواز سمجھی گئی۔

اپنی بحث کے اس حصہ کی تائید میں جیمز نسبتاً ایک نئے ڈسپلن **'Split** برین ریسرچ' (منقسم دماغ کے شعبہ) کا ذکر کرتا ہے جس کی بنیاد رابرٹ سپیری (**1950**ء) کے انکشاف پر تھی اور جس کے لیے اسے نوبیل پرائز دیا گیا تھا۔ دماغ دو نصف حصوں میں بٹا ہوا ہے جو گویا آئینہ میں ایک دوسرے کا عکس لگتے ہیں۔ دماغ کا انسانی حصہ (جیسا کہ ہم نے گزشتہ باب میں دیکھا ہے) وہ حصہ ہے جو کھوپڑی کے اوپر والے حصہ پر دباؤ ڈالتا ہے اور **Cerebrem** کہلاتا ہے۔ یہ اخروٹ کے دو ٹکڑوں جیسا لگتا ہے جو درمیان سے اعصاب

کے ایک پل کے ذریعہ جڑ جاتا ہے۔

1930ء کے عشرے میں معلوم ہوا کہ اس پل کو جدا کر کے مرگی کے دَوروں پر قابو پایا جا سکتا ہے اور اس طرح 'برقی طوفان' کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیلنے سے روکنا ممکن ہوتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مریض کو اس سے قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا اور وہ حسب معمول اپنی مصروفیات جاری رکھ سکتا ہے۔ یہ سپیری کا کمال تھا کہ اس نے انکشاف کیا کہ سپلٹ برین (**Split Brain**) کے مریض درحقیقت دو شخصیتوں میں بدل جاتے ہیں۔ لیکن وہ بدستور اتنے مکمل تعاون کے ساتھ کام کرتے رہتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب ان پر تجربے کیے جائیں جن کی وجہ سے تعاون کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط سے ہم جانتے ہیں کہ بایاں دماغی حصہ ہمارے بولنے اور (استدلال) کی قوتوں کو کنٹرول کرتا ہے جبکہ دائیں کا تعلق وجدان، اور پیٹرن کے علاوہ شکلیں پہچاننے سے ہے۔ ایک مریض جس کے دماغ کا بایاں حصہ مجروح ہو، ہکلاتا ہے یا ٹوٹی پھوٹی زبان میں بات کرتا ہے۔ مگر موسیقی کے فن سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اور جس مریض کے دماغ کی دائیں طرف مجروح ہو تو وہ بالکل صاف بات کر سکتا ہے مگر ایک سادہ سا پیٹرن نہیں بنا سکتا۔ عجیب بات ہے کہ دماغ کی بائیں طرف جسم کے دائیں حصہ کو اور دائیں طرف بائیں حصہ کو کنٹرول کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص **Split Brain** مریض کے بائیں ہاتھ میں ایک چابی دیتا ہے (اور اسے دیکھنے بھی نہیں دیتا) تو بھی وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔ پھر بھی وہ اس کا نام نہیں بنا سکتا۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ تم اپنے بائیں ہاتھ میں کیا لئے ہوئے ہو؟ تو وہ جواب نہیں دے سکتا کیونکہ یہ 'تم' نامی شخص بائیں دماغ میں رہتا ہے اور اسے کوئی پتہ نہیں کہ اس کے بائیں ہاتھ میں کیا ہے۔

آنکھوں کا معاملہ ہو تو پیچیدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ ہر آنکھ کے آدھے حصہ کا تعلق بائیں دماغ اور آدھے کا تعلق دائیں دماغ سے ہوتا ہے۔ اگر مریض سے کہا جائے کہ وہ توجہ کے ساتھ صرف ایک طرف دیکھے اور اسے کوئی چیز دکھائی جائے تو وہ چیز صرف آنکھ کے دائیں یا بائیں حصہ کو نظر آئے گی۔ اگر سپلٹ برین مریض کو ایک سنگترہ دائیں دماغ کے ساتھ، جبکہ ایک سیب بائیں دماغ کے ساتھ دکھایا جائے اور اسے کہا جائے کہ جو اس نے ابھی دیکھا ہے اسے بائیں ہاتھ سے لکھے تو وہ سنگترہ لکھے گا اگر اسے کہا جائے کہ وہ بتائے کہ اس نے ابھی

ابھی کیا لکھا ہے تو اس کا جواب سیب ہو گا۔ جب ایک سپلٹ برین مریضہ کو دماغ کے دائیں حصہ کے ذریعہ ایک بے ہودہ تصویر دکھائی گئی تو وہ شرما گئی۔ اس سے شرمانے کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا، ''پتہ نہیں۔''

چنانچہ یہ اس کی واضح شہادت ہے کہ ''تم'' بائیں دماغ کو روکتا ہے اور یہ کہ دائیں طرف کا آدمی ایک اجنبی ہے اور اگرچہ اس پر بات ہو سکتی ہے کہ ہم میں سے اکثر اس ذیل میں نہیں آتے کیونکہ ہم ''سپلٹ برین مریض'' نہیں ہیں مگر یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہو گا۔ ورنہ 'سپلٹ برین مریض' جان جائیں گے کہ ان کے رابطہ کا پل توڑ دیا گیا ہے۔ وہ جان جائیں گے کہ وہ اپنے 'دوسرے نصف' سے کاٹ کر الگ کر دیئے گئے ہیں۔ درحقیقت انہیں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپریشن سے پہلے ہی وہ سپلٹ برین تھے۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو ہم سب سپلٹ برین مریض ہیں۔ جب مجھے وجدان کا احساس ہوتا ہے تو وہ ذات کے اس دوسرے مدار سے چل کر میرے بائیں دماغ، میرے شعور اور بیدار نفس میں چلا جاتا ہے۔ (جسے لاشعور کی گزرگاہ کہتے ہیں)

جیمز کا خیال ہے کہ سمعی سراب کی ابتدا دائیں دماغ سے ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہومر کے ہیرو جب کسی دیوتا کی آواز سنتے (جس کے ذریعہ انہیں بتایا جاتا تھا کہ مخصوص حالات میں انہیں کیا کرنا ہے) وہ دائیں دماغ سے بلند ہوتی اور لاؤڈ سپیکر کی طرح بائیں دماغ میں سنی جاتی تھی۔ یہ ہم پہلے سے ہی جانتے ہیں کہ مصر و عراق کے قدیم بادشاہ اپنے آپ کو دیوتاؤں کی آواز سمجھتے تھے۔ جس سے جیمز کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

جیمز کو یقین ہے کہ انسان نے آج کی طرح ستر ہزار سال پہلے بھی خطرہ اور ''روٹی'' جیسی چیخوں سے زبان کو ترقی دی ہے۔ اس نے پندرہ اور پچیس ہزار سال پہلے کے درمیانی عرصہ میں سیدھے سادھے فقرے بولنا سیکھے۔ اس کے پاس زبان تھی، مگر خود آگاہی نہیں تھی۔ چنانچہ اگر کسی شخص کو ڈیم بنانے کا حکم دیا جاتا تھا تو اس کے پاس یہ یاد رکھنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اسے کیا کرنا ہے؟ اپنے آپ کو یاد دلانا خود شناسی کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ اس حکم کا یہ سادہ سا لفظ 'ڈیم' دیر تک بے شک دہراتا جائے مگر اس کا بایاں دماغ اسے فراموش نہ کرنے میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔ اکثر لوگ صبح چھ بجے جاگ جانے کا ارادہ کر کے سوتے ہیں اور صبح ٹھیک چھ بجے جاگ جاتے ہیں کیونکہ ان کے دائیں دماغ نے گھڑی کے الارم کا کام کیا ہے۔ چنانچہ قدیم شکاری کا دایاں دماغ ڈیم کا لفظ دہراتا تھا یہاں تک وہ صحیح مقام پر

پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ یہ آواز اس طرح سنتا تھا جیسے وہ اس کے سر کی بائیں طرف سے اوپر ہوا میں سے آتی ہو۔

جیمز کا کہنا ہے کہ زراعت کے آغاز یعنی تقریباً 10,000 قبل مسیح کے بعد ایسا ہوا تھا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب انسان نے بڑے گروہوں میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ نہیں کہ غاروں میں شکاریوں کا چھوٹا سا گروہ بن کر رہے مگر دو سو انسانوں کو گاؤں کے تقریباً پچاس گھروں میں رہتے ہوئے ایک لیڈر کی، ایک بادشاہ کی ضرورت تھی۔ بادشاہ مر بھی جائے تو اس کی رعایا اس کی آواز سنتی رہتی تھی اور سمجھتی تھی کہ وہ اب بھی زندہ ہے، وہ ایک دیوتا ہے۔ جیمز کہتا ہے کہ اس طرح انسان نے خداؤں کو ماننا شروع کیا۔ خدا دوہرے دماغ کی افزائش کا ناگزیر نتیجہ تھے۔

چنانچہ جیمز کے مطابق وہ قدیم تہذیبیں دماغ کے دوحصوں والی تھیں۔ لوگ اپنے اعمال کے ذمہ دار نہیں تھے، وہ خداؤں کی آواز پر عمل کرتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ خودشناسی بڑھنے لگی۔ اس کے کئی اسباب تھے، مگر سب سے اہم 'لکھے ہوئے لفظ' کی ایجاد تھی۔ (3000 سال قبل مسیح سے کچھ پہلے) لکھنا، جس کا مقصد اطلاع کو جمع کرنا ہے، اس نے آدمی کو ایک قسم کی پیچیدگی میں دھکیل دیا کیونکہ جونہی میں انفارمیشن جمع کرنا شروع کرتا ہوں میں چاہوں کہ نہ چاہوں مزید پیچیدہ ہو جاتا ہوں۔ اس کی ایک واضح مثال لائبریری ہے۔ چاہے میں کتابیں اس لیے جمع کروں کہ میں حقیقی دنیا سے بھاگنا چاہتا ہوں مگر جونہی میری کتابوں کی تعداد بڑھ جائے گی مجھے انہیں سلیقہ سے رکھنا ہے، ان کے لیے بک شیلف بنانے ہیں اور ان کی ترتیب کے لیے کوئی طریقہ کرنا ہے۔ اس سے تھکن بھی ہوسکتی ہے لیکن میں چاہوں گا کہ ان پر گرتا پڑتا نہ پھروں اور انہیں دوستوں میں بانٹ کر ان سے جان نہ چھڑاؤں تو مجھے لائبریرین بننا ہوگا اور لائبریرین شپ کے اصول بھی سیکھنا ہوں گے، میں چاہوں کہ نہ چاہوں مجھے اپنے آپ کو منظم کرنا ہوگا۔

اس طرح لکھنے میں ترقی سے نئے مسائل اور نئی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ جن سے دہرے دماغ کی اہمیت کم ہوئی۔ (اپنی کتاب 'Starseekers' کے پہلے باب میں اس بات پر میں نے تبصرہ کیا ہے کہ عظیم اہرام (تقریباً 2500 BC) اور سٹون ہینجز جیسی عظیم یادگاریں کمپیوٹر کے طور پر بنائی گئی تھیں جن کا مقصد ستاروں کے ذریعہ اوقات کار مرتب کرنا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے ہزاریئے قبل مسیح کا دَور ایسی ہمہ گیر اور روح فرسا تباہی اور عذاب کا

زمانہ تھا جس کی کوئی مثال اس سے پہلے تاریخ میں نہیں ملتی۔ کئی تہذیبیں مٹ گئیں۔ دنیا کی نصف آبادی پناہ گزین ہوگئی۔ کبھی کبھار کی وقتی لڑائیاں، تابڑ توڑ اور تباہ کن جنگوں میں بدل گئیں۔ یہاں تک یہ ستمگر ہزاریہ اپنے سیاہ اور خونی انجام کو پہنچا۔ تقریباً 1500 قبل مسیح میں سانتورینی کے آتش فشاں نے بحیرہ روم کا سارا علاقہ تباہ کر دیا۔ پھر 1150 اور 1250 قبل مسیح کے درمیانی عرصہ میں یہی علاقہ سمندری قزاقوں اور حملہ آوروں کی آماجگاہ بن گیا۔ وہ ''بحری لوگ'' (The Sea People) کے نام سے جانے جاتے تھے۔ انہوں نے زخم خوردہ تہذیب پر شارک کی طرح بڑھ بڑھ کر حملے کیے اور اسے تہس نہس کر دیا۔ اس پرآشوب دور میں دقیانوسی خیالات اور بچوں جیسی ذہنیت کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ تہذیب کی از سرنو تعمیر کے لیے صلاحیت اور سفاکی کے نئے معیار کی ضرورت تھی۔ یہ تشدد، شب خون جیسے ماہرانہ جواب کا تقاضا کرتا تھا۔ کسی حملہ آور کے پاؤں تلے کچلا جانے اور اپنی بیوی کو ریپ ہوتے دیکھنے والا شخص اگر اپنی آوازوں کا حکم مانے تو آنکھ جھپکنے میں قتل کر دیا جائے۔ مگر وہ جو نفرت کو پُرکاری کے ساتھ چھپا سکے، سینہ میں انتقام کی آگ سلگتی ہو مگر ظاہر نہ کرے اور ٹھیک وقت پر ٹھیک وار کرے، وہی زندہ رہ سکتا تھا۔

جیمز کہتا ہے کہ اس ذہنی تبدیلی کے پہلے آثار، 1230 قبل مسیح کے آس پاس عراق میں پائے جاتے ہیں۔ ظالم حکمران توکلتی نینورا نے پتھر کی قربان گاہ بنوائی، جہاں دیوتا کے خالی تخت کے سامنے بادشاہ گھٹنوں کے بل موجود ہے۔ ایک اور جگہ بادشاہ کو دیوتا سے باتیں کرتے دکھایا گیا ہے۔ اب بادشاہ اکیلا ہے۔ دیوتا غائب ہے۔ اسی زمانہ کے خط میخی متن کی دو سطریں ہیں:

> ''وہ کہ جس کا کوئی خدا نہیں، وہ جب راستہ پر چلتا ہے تو دردسر اس کے سر کو ٹوپی کی طرح ڈھانپ لیتا ہے۔''

دردسر ذہنی تناؤ کا، اپنے وجدانی وجود سے رابطہ ٹوٹ جانے کا نتیجہ ہے۔ جب آدمی پریشان ہوتا ہے تو وہ اپنے مسائل غصہ کے ذریعہ حل کرتا ہے اور جیمز کے مطابق یہی وہ موقع ہوتا ہے، جب ظلم تاریخ کا عنوان بن جاتا ہے۔ اور تقریباً اسی دور کی اشوری تصویروں میں ہم پہلی دفعہ دیکھتے ہیں کہ مردوں عورتوں کے جسموں میں کیل گاڑے جاتے ہیں اور بچوں کے سر تن سے الگ کیے جاتے ہیں۔

تو پھر خود آ گاہی اور جرم کے بارے میں انتہائی متنازعہ بیان جیمز کی خوش خیالی ہے۔ اس بیان پر ایک کھلا اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ سوچنا عملی طور پر ناممکن ہے کہ عقاد کا سارو گن اور حمورابی جیسے پہلو دار انسان خود آ گاہی سے محروم ہوں۔ جیمز کہتا ہے کہ آ گہی اتنی اہم، اتنی ضروری بھی نہیں جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ پیانو بجانے والا شخص ایک انتہائی مشکل اور پیچیدہ کام کرتا ہے۔ مگر اس کا خیال کہیں اور، موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی طرف ہوتا ہے۔ اگر اسے اپنی انگلیوں کا احساس ہو تو وہ برا پیانو بجاتا ہے۔ مگر یہ مثال غلط ہے۔ انسان کو پیانو آہستہ آہستہ، بتدریج اور پورے شعور کے ساتھ سیکھنا ہوتا ہے۔ صرف اسی صورت میں وہ اسے ایک خود کار عمل میں بدل سکتا ہے۔ اگر اسے شعور نہ ہوتا تو وہ پیانو سیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا کیونکہ دوسرے کسی پیچیدہ فن کی طرح یہ فن بھی اپنے آپ پر تنقید کا تقاضا کرتا ہے۔

جیمز کی تھیوری کے اس پہلو پر اور بھی اعتراض ہیں۔ نیویارک سٹیٹ یونیورسٹی کے پروفیسر گارڈن گیلپ نے یہ جاننے کے لیے تجربات کا ایک سلسلہ شروع کیا کہ کیا جانوروں میں بھی خود آ گاہی ہوتی ہے۔ کئی مختلف نسلوں کے جانور، آئینہ کے ساتھ ایک پنجرے میں رکھے گئے پھر ہر جانور کو بے ہوش کر کے اس کا چہرہ سرخ پینٹ میں رنگا گیا۔ جب جانور جاگا تو یہ جاننا آسان ہو گیا کہ کیا وہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر پہچان سکے گا کہ اس کا چہرہ رنگا گیا ہے۔ چمپینزی اور اورنگ اوٹنگ نے اپنے چہرے کا جائزہ بالکل اسی طرح لیا جس طرح کوئی انسان ایسے حالات میں لیتا۔ دوسرے کسی جانور نے اس میں دلچسپی نہیں لی۔ اکثر دوسرے جانور آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر یہی سمجھتے رہے کہ وہ انہی جیسا کوئی اور ہے۔ کبھی تو وہ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے اور کبھی حملہ کرتے۔ ان میں کئی تو ایسے تھے جن کا رویہ آئینہ سے شناسائی کے برسوں بعد بھی یہی رہا اور وہ کبھی اپنے آپ کو پہچان نہ سکے۔

اہم بات یہ ہے کہ گوریلے بھی ان میں سے تھے جو اپنے آپ کو پہچان نہ سکے۔ اہم اس لیے کہ چمپینزی اور اورنگ اوٹنگ کا تعلق گوریلوں سے قریبی ہے۔ مگر بنیادی فرق یہ ہے کہ چمپینزی اور اورنگ اوٹنگ کی نسبت گوریلے کا مغز بہت کم ایک طرف جھکا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ابھی سپلٹ ہو کر دو نیم نہیں ہوا، شاید یہی وجہ ہے کہ گوریلے میں خود آ گاہی نہیں ہوتی۔

گیلپ کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ کوئی جان دار خود اپنی توجہ کا مرکز بن جائے تو وہ 'اپنے ہونے' کے متعلق بھی سوچ سکتا ہے اور اگر تم 'اپنے ہونے' پر سوچ سکتے ہو تو 'اپنے نہ ہونے' پر بھی سوچ سکتے ہو۔ ہم پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ نینڈرتھال اپنے مرنے والوں کو اہتمام

کے ساتھ دفن کیا کرتا تھا۔ جس کا مطلب ہے کہ اپنی فنا سے باخبر تھا۔ چنانچہ وہ خودشناس تھا۔ جیمز کا کہنا ہے کہ آدمی نے10,000 قبل مسیح کے بعد کسی وقت دیوتاؤں کو ایجاد کیا تھا۔ جب اس نے 'آوازیں' سننا شروع کی تھیں، مگر نینڈرتھال کی تراشی ہوئی ڈسک، سیاروں اور مجسموں سے ظاہر ہے کہ وہ سورج اور چاند کی پرستش کیا کرتا تھا۔ اگر چوکوتیئن کے غاروں کی کھوپڑیاں قربانی کی رسم پر گواہ ہیں تو انسان کا مذہبی شعور پانچ لاکھ برس پرانا ہے۔

ان سب باتوں کے بعد جیمز کی تھیوری کی شاید ہی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہو۔ غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تھیوری صحیح نہیں۔ جیمز کے نقطۂ نظر سے، اور یہ افسوس کی بات ہے، انسان کے شعور کی جڑیں 'دو نیم دماغ' کے دونوں حصوں کی علیحدگی میں ہیں۔ اسے وہ اپنی تھیوری کا حاصل سمجھتا ہے حالانکہ یہ پہلو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت جیمز کا حقیقی کارنامہ اس کی یہ نشان دہی ہے کہ انسان نے اپنے احساسِ اجنبیت کی موجودہ شکل اپنی تاریخ کے آخری کسی دور میں وضع کی ہے۔ اور ایک دفعہ جب یہ نشان دہی ہوگئی تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ اس کی سپلٹ برین ریسرچ سے کوئی مطابقت نہیں بلکہ اس کے اور کئی دلچسپ نتائج ہیں۔ اگر کوئی شخص بھیڑ بھاڑ میں ڈرائیونگ جیسا اہم کام توجہ سے کر رہا ہو تو electroencephalograph مشین بتا دیتی ہے کہ اس کا مغز آپس میں مل کر کام نہیں کر رہا اور تمام کارکردگی بائیں طرف سے ہو رہی ہے۔ جب ایک یوگی گیان دھیان میں چلا جاتا ہے تو اس کے مغز کا پیٹرن Synchronize ہو جاتا ہے۔ یعنی دونوں اطراف سے مل کر کام کرنے لگتا ہے اور یہ بات ہم اپنے آپ میں بھی اس وقت پاتے ہیں جب ہم پرسکون اور آرام کی حالت میں ہوتے ہیں ہمیں حقیقت کا واضح شعور ہوتا ہے اور ہم اپنے آس پاس کی دنیا کو بہتر طور پر محسوس کر سکتے ہیں۔ جتنا ہم زندگی کے بوجھ تلے دبتے ہیں اسے محسوس کرتے ہیں اتنا ہی حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں۔ ایک عجیب طرح سے ہم خارجی حقیقت کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور وہ ہمارے لیے خواب بن جاتی ہے۔

اس ناخوشگوار اثر کے باوجود ڈی سینکرونائیزیشن ایک قابل لحاظ ارتقائی کارنامہ ہے۔ ایک گوریلا ڈی سنکرونائز نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ زندگی کے مجموعی عمل سے اپنی توجہ نہیں ہٹا سکتا۔ انسان کا بھی اس وقت یہی مسئلہ ہوتا ہے جب اسے الکوحل کے زیر اثر تجریدی نثر یا ریاضی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ شعور کو ڈی سنکرونائز کرنے سے ہماری دانشورانہ توانائی میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ واگنر (Wagner) نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "آرٹ زندگی کو کھیل بنا

دیتا ہے اور ہمیں مشترکہ انجام سے بچا لیتا ہے۔'' سچ یہ ہے کہ تخلیقی کوشش میں اتنی جان ہوتی ہے کہ وہ ہمیں زندگی کی آلائشوں سے آزاد کر دیتی ہے اور ہمارا ذہن مادہ پرست دنیا پر عقاب کی طرح منڈلاتا رہتا ہے۔

انسانی تاریخ میں کبھی ایسا وقت بھی آیا ہو گا جب ہم میں ڈی سنکرونائز ہونے کی طاقت نہ ہو۔ جب ہم ہمیشہ، ہر وقت نشہ میں ہوں۔ جب اس نشہ میں بدمست ہونے کا پرسکون ہونے کا، وابستگی کا، دنیا کے ساتھ دوستی کا احساس ہو مگر اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ ہم میں اپنی 'آج' سے بھاگ جانے کی سکت نہیں اور نہ ہی ہم فطرت کا اشارہ سمجھنے سے گریز کر سکتے ہیں۔

یہ کامن سینس کی بات ہے کہ انسانی مغز اس وقت ڈی سنکرونائیز ہونا شروع ہوا جب ہم نے اپنی بولنے کی صلاحیت بڑھائی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ بائیں جانب زخم خوردہ مغز والے بچے زبان سیکھنے کے لیے اپنا دایاں مغز استعمال کر سکتے ہیں مگر صرف سات سال کی عمر تک ایسا ہو سکتا ہے جب مغز کے دونوں نصف، مہارت حاصل کرنے لگتے ہیں۔ اگر ہمارے دور کے بزرگ، سات سال سے کم عمر کے بچوں کی طرح تھے تو بولنے کے لیے ڈی سنکرونائزیشن ضروری نہیں۔ یہ سوچنا آسان ہے کہ پہلے کسان یا شہر بنانے والوں کے 'اکہرے دماغ تھے۔ آخر کوئی شہر ایک چیونٹی کے ٹھکانے یا بھڑ کے چھتہ سے مختلف تو نہیں۔ مگر شہر نے جنگ ناگزیر بنا دی۔ رابرٹ آرڈری، ماہر حیوانات سی، آر کارپینٹر کا واقعہ سناتا ہے کہ وہ **350** بندر ہندوستان سے ایک جزیرے پر لے گیا تاکہ ان کا جائزہ ایک محدود ماحول میں لے سکے۔ زمین پر تو بندر ایک درخت یا درختوں کے جھنڈ کو اپنی **territory** علاقہ بنا لیتے ہیں۔ جہاز پر یہ ممکن نہیں تھا۔ بندروں کو نئے کھانے کی عادت ڈالنے کے لیے بھوکا بھی رکھنا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بندر مائیں اپنے بچوں سے کھانا چھین لیتیں اور ان کے شوہروں نے بدمعاش بندروں سے اپنی بیویوں کو بچانا چھوڑ دیا۔ بچے زیادہ مرنے لگے۔ مگر جزیرہ پر پہنچتے ہیں بندروں نے اپنی اپنی جائداد (**territory**) الگ بنا لی۔ اور ایک دفعہ پھر بندروں نے اپنی بیویوں کا اور ماؤں نے اپنے بچوں کا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ انسانوں کے معاملہ میں بھی یہی ہوا کہ جب شہر کی منصوبہ بندی کے ماہرین مشترکہ دروازوں پر مشتمل بڑے فلیٹ بنانے لگے تو لوٹ مار کی وارداتیں بڑھنے لگیں اور عمارتوں کے بعض خوبصورت حصے گرانے پڑے۔ **territory** سے جو سبق ہم نے سیکھا بعض ماہرین اسے آزمانے لگے۔ انہوں نے اونچے

فلیٹس کے بجائے انفرادی فرنٹ گارڈن پر مشتمل چھوٹے گھر بنائے تو جرائم کی رفتار ڈرامائی طور سے فوراً رک گئی۔

پہلے قصبوں اور شہروں میں لوگوں کی اپنی انفرادی جگہ (territory) ہوا کرتی تھی۔ مگر جب شہروں میں دیواریں بنیں، آبادی بڑھی اور اس تیزی اور کثرت کے ساتھ بڑھی کہ اپنی انتہاؤں سے آگے نکل گئی تو اس کا حشر بھی کارپینٹر کے بندروں اور اونچے بڑے فلیٹس کے مکینوں جیسا ہوا کہ لوٹ مار اور بے مہار جارحیت عام ہوگئی۔ پہلے پہل تو مذہبی احکام کی سخت گیری کی وجہ سے جرائم میں اضافہ نہ ہوا مگر BC 300 کے بعد ان کا اثر زائل ہونا شروع ہوگیا۔ اتفاق سے یہ وہی زمانہ تھا جب لکھنے میں ترقی ہوئی۔ انسان ایک ایسی مخلوق بن گیا جیسی کہ آج ہمارے سامنے ہے، جنگجو، تشدد پسند اور اپنے جیسے انسانوں کو قتل کرنے والا۔

اب جیمز کے کہنے کے مطابق شہر کے ابتدائی مکینوں کے خالص علاقائی (territorial) تنازعوں اور دوسرے ہزاریئے BC کے اختتام پر روز افزوں خون آشام درندگی میں فرق ہے۔ مصر کے بادشاہ نارمر کی مشہور تصویر (Palette) اسے دشمن کی سر بریدہ لاشوں میں کروفر سے ٹہلتے ہوئے دکھاتی ہے۔ اس پر 1,20000 قیدی' کندہ ہے۔ ایک اور تصویر نارمر کو ایک قیدی کے بال پکڑے ہوئے دکھاتی ہے۔ اس نے ایک لاٹھی اپنے سر سے اوپر اٹھا رکھی ہے تاکہ قیدی کا سر توڑ دے۔ ضروری نہیں کہ دشمنوں کے سر فی الواقع کاٹے گئے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تصویر محض ایک علامت ہو، ان دشمنوں کی علامت جن کے سر میدان جنگ میں کاٹے گئے جیسے چینی غاروں کی کھوپڑیاں جو قربانی کی رسم کا حصہ تھیں۔ چنانچہ دانستہ ظلم کی کوئی شہادت موجود نہیں۔

بارہ سو برس سے زیادہ عرصہ کے بعد، حمورابی کے دور تک عقاد کے سارا گون کی سلطنت عروج اور زوال دونوں سے دوچار ہو چکی تھی اور خداؤں کا زمانہ ختم ہو رہا تھا۔

جیمز اس یادگار پتھر کا ذکر کرتا ہے جس پر حمورابی کے مشہور قوانین لکھے گئے ہیں۔ وہ اس کے بلند بانگ تعارف میں (خاتمہ) پر اپنی رائے دیتا ہے جس میں حمورابی نے اپنی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ان دونوں کے تقریباً ایک جیسے قوانین کے لہجے بالکل مختلف پرسکون اور ریشنل ہیں۔ جس کی وجہ سے جیمز کو یقین ہے کہ حمورابی دوہرے دماغ کا ایک مالک تھا اور اس نے اپنے دماغ کے دائیں حصہ کی ہدایت کے ذریعہ قوانین بنائے تھے۔ جس کے متعلق اسے یقین تھا کہ وہ ہدایت دیوتا مردک کی آواز میں تھی۔ اس کی وضاحت اس

طرح ممکن ہے کہ حمورابی کے قوانین کئی ابتدائی قوانین کا مجموعہ تھے اور انہی کی تراکیب اور لہجے اخذ کیے گئے تھے مگر تعارف اور اختتامیہ کے بلند بانگ لہجہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بادشاہ اپنے آپ کو مردوک کے ترجمان (ماؤتھ پیس) سے بہت زیادہ سمجھتا ہے۔

حمورابی کے یادگاری پتھر کا زمانہ 1750 قبل مسیح ہے۔ اس کے بعد 'تاریک زمانے' آئے جبکہ بحیرہ روم کی آدھی آبادی پناہ گزین بن گئی۔ مصری آرٹ پر جنگ کے مناظر چھانے لگے۔ 'The First Great Civilization' میں ژاکیتا ہاکر نے ان قیدیوں کی نجات کا حوالہ دیا ہے جو کئی طریقوں سے اذیت اور ذلت میں مبتلا تھے اور ایک منظر فرعون رامسیس کے زمانہ کا ہے، جس نے 1100 قبل مسیح سے کچھ عرصہ پہلے حکمرانی کی۔ اس منظر میں ہم کٹے ہوئے انسانی ہاتھوں کے ڈھیر دیکھتے ہیں۔ جیمز کے مطابق اس وقت تک دوہرے انسانی مغز کا دور ختم ہو چکا تھا اور وہ ڈی سینکرونائز ہو گیا تھا۔ اسی زمانہ میں اشوری بادشاہ تگلاتھ پلیسر نے اور قوانین بنائے جو حمورابی کے قوانین کی ضد تھے۔ (یاد رہے کہ حمورابی کے قوانین پرانے قوانین سے زیادہ سخت تھے) اس کے کارنامے مٹی کی ایک بڑی تکون سے جانے جاتے ہیں جس پر وہ بڑے مبالغہ آمیز انداز میں درج ہیں۔ اس کے قوانین کئی ستم گر تختیوں کے ایک مجموعہ کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ سکالر اس کی پالیسی کو ہیبت اور دہشت کی پالیسی کہتے ہیں۔ اور بے شک وہ ایسی ہی تھی۔ اشوری، درندوں کی طرح بے ضرر معصوم دیہاتیوں پر جھپٹے۔ ہزاروں کو قتل کرنے کے بعد جو بچے انہیں قیدی بنا لیا۔ دوسری تصویروں میں اجڑے شہر اور زندہ جلتے ہوئے ان کے مکین دکھائے گئے ہیں۔ اس کے قوانین ایسی بدترین خون ریز سزاؤں کی بنیاد بنے جن سے دنیا کی تاریخ ابھی تک نا آشنا ہے۔ ظلم کچھ تو ڈی سینکرونائزیشن کا نتیجہ ہے جیسے ٹریفک کی بھرمار میں ڈرائیور اپنے حواس کھو دیتا ہے اور کچھ ہزار سال کی مشقت اور تشدد کا قدرتی حاصل ہے۔

اور یہ ہلاکت خیز تشدد تاریخ کا پیٹرن بھی بدل دیتا ہے۔ اب وحشیانہ ظلم کا انجام ظلم کی اتنی ہی وحشیانہ تباہی ہے۔ بیسویں صدی نے یہ پیٹرن نازیوں کے عروج و زوال میں دیکھا ہے پہلے ہزار یہ قبل مسیح میں پہلی دفعہ یہ پیٹرن اشوری سلطنت کے بننے اور ٹوٹنے میں ظاہر ہوا۔ اشوریوں نے عراق کی تاریخ میں ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک اہم کردار ادا کیا۔

تگلاتھ پلیسر کے قتل (1077 قبل مسیح) کے ساتھ اس کا پہلا عظیم دور ختم ہوا۔ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ تک جسے تاریک عہد کہا جاتا ہے، اسور یہ زوال کی حالت میں تھا۔

911 قبل مسیح میں اس نے اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ جیمز لکھتا ہے ''اسوریوں نے مریضانہ ذہنیت اور سفاکی کے ساتھ قتل و غارت اور لوٹ مار کرتے ہوئے اپنی پچھلی سلطنت، اس سے آگے، اور آگے مصر کا راستہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ سرسبز وشاداب دریائے نیل تک جا پہنچے۔ مگر اس وقت تک ذہنیتیں بدل چکی تھیں۔ انسان کو اپنا اور اپنی دنیا کا شعور حاصل ہو چکا تھا۔ اس وقت سے لے کر610 قبل مسیح میں اپنے آخری زوال تک انہوں نے ایسی شقاوت کے ساتھ فتوحات اور حکمرانی کی کہ نازی بھی شرما جائیں۔ برٹش میوزیم میں اسورک بل کے زمانے کی (تختیاں) تصویریں ہیں جن میں اسیروں کو ٹارچر ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ انہیں ننگا کر کے زمین پر لٹایا اور باندھا گیا ہے۔ بعض زندہ اسیروں کی کھال کھینچی جا رہی ہے۔ کوئی ہیں کہ جن کے کان اور زبانیں کاٹی جا رہی ہیں۔ کئی شرمناک تصویریں منظر عام سے ہٹا کر تہہ خانہ میں چھپا دی گئی ہیں۔ جب سیناچرب نے689 BC میں بابل پر حملہ کیا تو اس نے وہاں کے باشندوں کو اتنی کثرت کے ساتھ قتل کیا کہ گلی کوچوں میں ان کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ شہر کو بالکل تباہ کر کے اس نے کھنڈر بنا دیا اور ایک نہر کا رخ اس طرف موڑ دیا کہ بربادیوں کے نشان دھل جائیں۔ آٹھ برس بعد اس کے بیٹوں نے اسے نینوا کے ایک عبادت گھر میں قتل کر دیا۔ ساتویں (قبل مسیح) کے وسط تک اشوریوں کی جنگی صلاحیت اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ اپنی مثال آپ بن گئے۔ تگلاتھ پلیسر نے بغاوت کچلنے کا نیا طریقہ ایجاد کیا۔ اس نے باغیوں کو دور دراز علاقوں میں اجتماعی طور سے جلاوطن کر دیا۔ اس سے اسے کوئی غرض نہیں تھی کہ راستہ میں کتنے جلاوطن بھوک پیاس سے یا تھک کر مر گئے۔ ایک سال (744 قبل مسیح) میں پینسٹھ ہزار لوگ جلاوطن کیے گئے۔ روم و ایران کی طرح کئی بڑی قومیں اپنی کمزوری اور کاہلی کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ مگر اشوریوں نے یہ غلطی نہیں کی۔ وہ رعایا پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے ہر ظلم اور زیادتی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور ان کی یہی اہلیت ان کے زوال کا سبب بنی۔ ساری قومیں باہمی تعاون کے لحاظ سے کوئی شہرت نہیں رکھتیں، وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے پر ہمیشہ آمادہ رہتی ہیں مگر اسوریوں کے ظلم وستم نے ان کے دشمنوں کو آخرکار متحد ہونے پر مجبور کر دیا۔654 BC کے قریب ایسورانی پال کو بابلیوں اور چھ دوسری قوموں کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جن کی قیادت اس کا اپنا بھائی، بابل کا بادشاہ کر رہا تھا۔ اشوریوں کی عسکری قوت حرکت میں آئی اور دشمن کو بھوکا رکھ کر شکست اور اطاعت پر مجبور کر دیا، بادشاہ نے اپنے آپ کو محل میں آگ لگا کر خودکشی کر لی۔ ایسور بنی پال

اپنے معمول کے اذیت ناک حربوں کے ذریعہ باغیوں سے نمٹتا رہا۔BC 639 تک اس کے تمام دشمن مجبور ہو کر اس کے مطیع و فرمانبردار بن گئے اور ایلام (Elam) صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ نینوا کے اندر اپنے عظیم الشان محل میں رہتے ہوئے ایسور بنی پال چاہتا تھا کہ تمام دنیا اس کے قدموں پر جھک جائے اور اس کی فتح یاد رکھے۔ مگر اس سے بحیرۂ روم کی پوری دنیا میں نفرت اور غصہ کی آگ بھڑکنے کا ڈر تھا اور وہی ہوا کہ جب اسور بنی پال مر گیا تو انہوں نے پھر بغاوت کا علم لہرایا اور اس بار وہ کامیاب ہو گئے۔ اشوریوں سے بھی وہی سلوک کیا گیا جو انہوں نے باغیوں سے کیا تھا۔ ان کے دشمنوں کی رہنمائی بابل کا بادشاہ نبو پولسر کر رہا تھا۔ جس نے اشوریوں کو اس طرح نیست و نابود کیا گویا کہ وہ طاعون کے چوہے تھے۔ یہ کام انہوں نے اس تندہی سے کیا کہ اپنی عظمت رفتہ کو یاد کرنے والا کوئی اشوری باقی نہ رہا۔ دو سو سال بعد سائرس کے یونانی (کرائے کے) فوجی پسپا ہوتے ہوئے دجلہ کی وادی تک چلے گئے تھے۔ جب وہ نینوا اور کالا (Kalah) سے گزرے تو ان دو عظیم سنسان شہروں کے اسرار ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ دونوں شہر اپنے زبردست دفاعی حصار کی وجہ سے ناقابل تسخیر لگتے تھے۔ مقامی کسانوں سے اتنا پتہ چلا کہ دونوں شہر خداؤں نے اپنی براہِ راست مداخلت کے ذریعہ سنسان اور ویران کیئے ہیں۔ وہ فاتحین جنہوں نے برسوں سے مشرق وسطیٰ کو دہشت زدہ کر رکھا تھا اب ان کی داستان بھی داستانوں میں نہیں۔

اس تمام روئداد میں یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اسوریوں نے انتشار اور بربادی کا مقابلہ ایسے فاتحین بن کر کیا جن کے ثانی تاریخ میں بہت کم ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ڈاروِن کے 'Fittest' تھے مگر فنا ہو گئے۔ 'باقی' نہ رہ سکے۔ حالانکہ ڈاروِن کے اصول کی رُو سے انہیں باقی رہنا تھا۔ کوئی وجہ ہے کہ جس کی بنا پر انسانی تاریخ ڈاروِن کو ایک بار نہیں بار بار رَد کرتی ہے۔

اسوریوں کے زمانہ سے لے کر نازیوں تک تاریخ کے ہر دور میں ایسے لوگوں کی بہتات رہی ہے جو سفا کی کی حد تک کارآفرین و کارساز تھے مگر جو بالآخر ناکام ہوئے۔ یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کیونکہ اب ہم جرائم کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ مجرم ایک ایسا شخص ہوتا ہے جسے ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ اسے کیوں نہ حاصل کرے، جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چاہے اس کے لیے اسے چوری یا قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اگر اسے کسی پیچیدہ اور نازک مسئلہ کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اسے فوراً زور بازو سے حاصل کرنے پر تیار ہو

جاتا ہے۔ عام طور پر اسے عارضی کامیابی بھی حاصل ہو جاتی ہے مگر اس عارضی کامیابی سے بھی خرابیاں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ کارل پنیزم جیسے انفرادی مجرم کی صورت میں وجہ بالکل ظاہر ہے۔ جہاں تک اسوریوں، ہن اور وینڈل جیسی قوتوں کا تعلق ہے، پیچیدگی شاید بڑھ جائے مگر بات ایک ہی ہے، مجرمانہ تشدد پر اصل اعتراض معاشرہ کو نقصان پہنچانے کا نہیں بلکہ یہ کہ مجرمانہ تشدد مجرم کا مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ کج فہمی ہے، غلط اندازہ ہے کیونکہ جرم کے ذریعہ مقصد حاصل کرنا بائیں دماغ کا طریقہ ہے۔ اسے مقصد حاصل کرنے میں کسی اصول، کسی قدر کی پروانہیں ہوتی اور مقصد بھی کسی نہ کسی طرح اس کوشش میں کہیں کھو جاتا ہے۔

یہ وہ متضاد حقیقت تھی جس نے پروفیسر ٹوائن بی کو حیران کیا۔ جس نے بتایا کہ مئی **1912**ء کی ایک شام کو وہ کس طرح اس حقیقت سے باخبر ہوا۔ ٹوائن بی نے ایک دن مسترا کی ویران شہر پناہ میں گزارا جہاں سے سپارٹا کے میدان صاف نظر آتے ہیں۔ سو سال سے مسترا ایک خوشحال شہر تھا، یہاں تک کہ **1821**ء کی ایک صبح غول در غول حملہ آور شہر میں داخل ہوئے۔ اس کے شہریوں کا قتل عام کیا اور شہر کو برباد کر کے اسے کھنڈر بنا دیا۔ اس بے معنی اور بے مقصد قتل عام اور تباہی کا خیال کرتے ہوئے ٹوائن بی، انسانی معاملات میں گناہ، حماقت اور جرائم کے دخل سے بہت دل گیر ہوا۔ انسان کیوں وہ واحد جان دار ہے جو اپنی خاطر اپنے ہم جنسوں کی تباہی میں خوش محسوس کرتا ہے؟ یہ سوال ہے جو آٹھ ہزار صفحات پر مشتمل ٹوائن بی کی 'اے سٹڈی آف ہسٹری' کے ہر صفحہ پر پھیلا ہوا ہے۔

اچھا ہے کہ احساس و بیداری کا منظر سپارٹا کا بالائی میدان تھا کیونکہ اشوریوں کی طرح سپارٹن بھی ظلم کی ناکامی کی مثال تھے۔ آٹھویں صدی **BC** میں لکیڈیمون (سپارٹا اس کا دارالحکومت ہے) کو احساس ہوا کہ ان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ان کا ملک بہت چھوٹا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ہمسایوں **Messinians** کے علاقہ میں حملہ کر کے داخل ہو گئے۔ سولہ برس تک **Messinians** شیروں کی طرح لڑے مگر سپارٹن آخر میں فتح یاب ہوئے۔ مگر **Messinians** کو حملہ آوروں کے خلاف سخت غصہ اور نفرت تھی۔ انہوں نے ایک سو سال بعد غیر ملکی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے بڑی دلیرانہ کوشش کی۔ یہ جنگ اور بھی خونریز تھی اور بیس برس تک جاری رہی۔ جنگ کے اختتام تک دونوں فریق تھک چکے تھے مگر سپارٹن کامیاب ہوئے۔ انہوں نے ہلاکت خیز انتقام لیا اور اتنے ظلم کیے کہ سپارٹا کو زندہ کھنڈر

بنا دیا۔ ادھر طویل جنگ کی اذیت نے سپارٹن کو یہ ارادہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ آئندہ وہ کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اس لیے انہوں نے لکیڈ یمون کو ایک بڑا فوجی کیمپ بنا دیا۔ فوجی ڈسپلن اور زندگی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ لکیڈ یمون کو فولادی ہاتھوں میں ہونا تھا اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو فولادی انسانوں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔

میسنیا کو دو یکساں حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر حصہ کا مالک ایک سپارٹن رئیس کو بنایا گیا۔ مقامی لوگ غلام بن گئے، جن کا فرض آقاؤں کی خدمت کرنا تھا۔ اگر ان کے کسی بچے میں ذرا سی ذہانت بھی پائی جاتی تو اسے فوراً قتل کر دیا جاتا۔ سپارٹا والوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر اپنی آنے والی نسل کو بلاؤں سے محفوظ رکھیں گے۔ ان کے اپنے تمام بچے، لڑکے اور لڑکیاں شروع ہی سے فوجی تربیت حاصل کرتے اور سات برس کی عمر میں گھروں سے رخصت ہو کر فوجی تربیت کے مراکز میں چلے جاتے تھے۔ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی ایک جیسی تربیت دی جاتی۔ کھیلوں کے مقابلوں میں وہ لڑکوں کے برابر رہتیں، یہاں تک کہ برہنہ ہو کر وہ ان سے کشتیاں لڑتیں۔ سپارٹا میں سب سے بڑی خوبی سخت کوشی اور مصائب برداشت کرنے کی صلاحیت بن گئی۔ وقت آنے پر مرد فوج میں شامل ہو جاتے ان کی کوئی گھریلو زندگی نہیں تھی، بارکوں میں رہتے اور میس میں کھا پی لیتے۔ لڑکا بیوی کے ساتھ سہاگ رات بسر کرنے کے بعد بارک میں واپس چلا جاتا۔ یہ بتانے کے لیے کہ وہ ایک سپاہی کی بیوی ہے عورت اپنے بال چھوٹے رکھتی اور مردانہ لباس پہنتی۔ اگر اس کے شوہر میں صحت مند بچے پیدا کرنے کی اہلیت نہ ہوتی تو یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ کہ وہ کوئی بہتر مرد تلاش کر کے اپنی بیوی کو دے جو بستر پر اس کی جگہ لے۔ اگر شوہر اس پر رضامند نہ ہوتا تو بیوی اپنی مرضی سے کسی بہتر مرد کا انتخاب کر سکتی تھی۔ جو شخص میس میں اچھی طرح کھانا نہ کھاتا تا اسے سزا دی جاتی کہ وہ گھر کے عیش و آرام میں توانائی ضائع کر رہا ہے۔

یہ سب کچھ آرویل کے ناول 1984ء اور اس سے بھی زیادہ **Wagner's Ring** کے جن کی طرح لگتا ہے جس نے اپنے بھائی کو خزانہ کے لیے قتل کیا اور خود اژدھا بن کر اپنی باقی عمر خزانہ کی چوکیداری میں ضائع کر دی۔ تمام سپارٹن ہیلن کی دنیا کے اژدھا بن گئے۔ جب انہیں اپنے ایتھنز کے ہمسایوں کے متعلق احساس ہوا کہ روز بروز ان کی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے تو انہوں نے ایتھنز فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک جنگ کے بعد جو ستائیس برس جاری رہی وہ ایک بار پھر فتح یاب ہوئے۔ پھر بھی وہ 'ہیلن کی دنیا' کے لیڈر بننے

پر تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو سختیوں اور جدوجہد کے لیے تیار کیا تھا، کامیابی نے انہیں کمزور کر دیا۔ بعض سپاہی جو انہوں نے مقبوضہ کالونیوں پر حکومت کرنے کے لیے بھیجے تھے، عیاشی کی وجہ سے بدنام ہوئے اور جو سپارٹن ملک میں رہے وہ اپنی خشک مزاجی اور دقیانوسیت سے چمٹے رہے۔ ٹوائن بی نے ان کا موازنہ ایسے سپاہیوں سے کیا ہے جو ہمیشہ پریڈ کی حالت میں تنے ہوئے ہوں اور آنکھ نہ جھپکیں، مکڑی چاہے ان پر جالا بن جائے۔ سپارٹن، اسوریوں کی طرح کسی عظیم تباہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے روحانی دیوالیہ پن کی وجہ سے تاریخ سے معدوم ہوئے۔

یہاں ہم جیمز کی بصیرت اور اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ سپارٹن یقینی طور پر بائیں دماغ کے مالک تھے۔ انہوں نے ایک چیز اور صرف ایک چیز پر اپنا دماغ جمائے رکھا گویا کہ اس ایک چیز کے علاوہ کسی اور چیز کا کہیں وجود ہی نہ تھا۔ **Messinians** جنگ سے پہلے سپارٹن آرٹ اور میوزک کی اپنی روایات تخلیق کر رہے تھے۔ چھٹی صدی بی سی کے وسط میں یہ سلسلہ بالکل ختم ہو گیا اور پانچ سو سال تک دوبارہ شروع نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ مقدونیہ کی دوسری جنگ میں سپارٹا کے فوجی نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ سپارٹا کے آدرش کی بے مائیگی کی ایک علامت ان کی اس رسم میں دیکھی جا سکتی ہے جس کی بنا پر وہ لڑکوں کو مجبور کرتے تھے کہ اپنی سخت کوشی ثابت کرنے کے لیے وہ دیوی کی قربان گاہ پر جائیں اور کوڑوں کی مار سہتے ہوئے مر جائیں۔

مغز کا بایاں حصہ اتنا اہم ہے کہ یہ حصہ ہماری فطری امنگوں پر بھی حکمرانی کر سکتا ہے (اس سے پتہ چلتا ہے کہ بلیوں اور کتوں کے بھی کیوں دو الگ میدان ہوتے ہیں) تمام جان داروں کو اپنا ارادہ (دماغ) بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ سپارٹا نے تخلیق کو خلافِ قانون قرار دیا اور اپنی قوم کو منکرین کی صف میں کھڑا کر دیا۔ بایاں دماغ ہماری توانائیوں کو پہاڑی ندی کی طرح تنگ اور تیز لہروں میں بدل دیتا ہے۔ دایاں دماغ انہیں پھیل کر ایک بڑا دریا بننے میں مدد دیتا ہے۔ دایاں ہمیں اس قابل بھی بناتا ہے کہ ہم اپنے آس پاس دیکھیں اور سوچیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور آگے ہمیں کہاں جانا ہے۔ جبکہ بایاں آسانی کے ساتھ خود اپنے ہی وسوسوں کا شکار ہو کر آگے بڑھنے سے گھبراتا ہے اور سمت بدلنے کی تمام صلاحیت کھو دیتا ہے۔ اس کے دو نتائج ہوتے ہیں۔ استوریوں کی طرح اپنے آپ کو برباد کر لینا یا سپارٹا کی طرح رفتہ رفتہ ہلاکت کی طرف بڑھتے رہنا۔

اس کے دو ہزار برس بعد شرلک ہومز بھی اسی مسئلہ سے دو چار ہوا۔ اپنے ابتدائی دنوں میں ہومز بھی کوکین یا مارفین کے ذریعہ اپنی بوریت دور کیا کرتا تھا جب 'In the Sign of Four' میں واٹسن اس سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے پاس اس وقت کوئی کام ہے؟ تو ہومز جواب دیتا ہے کہ 'نہیں' اس لیے کوکین کھاتا ہوں۔ میں دماغی کام کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، یہاں زندہ رہنے کے لیے کیا رکھا ہے؟ یہ کہ بس کھڑکی میں کھڑے رہیں۔ دنیا اتنی بنجر، بے کیف اور بے مایہ کبھی نہیں تھی۔ دیکھو کہ زرد دھند کس طرح بل کھاتی ہوئی، نیچے بھورے رنگ کے گھروں پر چھائی ہے۔ اس سے بڑھ کر مایوس کن منظر کیا ہوگا اور ڈاکٹر ہم طاقت کا کیا کریں جب اسے آزمانے کے لیے کوئی میدان نہیں۔ جب کانن ڈائل نے The Sign of Four لکھی اس وقت کوکین کو نشہ آور سمجھا جاتا تھا۔ (فرائیڈ کی اصلی شہرت مارفین کے عادی لوگوں کا علاج کوکین سے کرنے کی وجہ سے تھی) مگر ہومز کو اس کی روز افزوں کامیابی نے اس لعنت سے محفوظ رکھا۔ اس مثال سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ کی نوعیت، تین ہزار سال میں بھی رامسس سوم کے زمانہ سے لے کر اب تک نہیں بدلی۔ انسان نے اپنے آپ کو تمام مخلوق سے برتر ثابت کر کے اپنا شرف حاصل کیا ہے۔ اس نے خشک سالیاں، برفانی عہد، قحط اور بھونچال دیکھے ہیں۔ اپنی شناخت کے شعور کو بائیں مغز تک محدود رکھتے ہوئے، وہ اپنی تاریخ اور ارتقا کے سفر کے دوران سب سے عجیب اور سب سے اذیت ناک مرحلوں سے گزرا ہے۔ (اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم جیمز کی بات مانیں کہ نہ مانیں کہ ایسا کب ہوا؟ اصل بات یہ ہے کہ ایسا ہوا ہے، اس سے شاندار نتائج حاصل ہوئے، فطرت سے ایک نئی ناآشنائی کے ساتھ انسان نے اسے تنقیدی نظر سے دیکھنا اور سمجھنا شروع کیا۔ تیسری صدی قبل مسیح میں ایراتھینز نامی ایک یونانی فلسفی نے (جو اسکندریہ میں رہتا تھا) سنا کہ شہر سینی (جدید اسوان) نامی ایک کنواں ہے جس کے اندر گرمیوں کی دوپہر کے وقت سورج کا عکس نظر آتا ہے۔ جس کا صاف مطلب ہے کہ سورج بالکل سر پر ہوتا ہے۔ اور اگر سینی میں کوئی مینار ہو تو اس کا سایہ نہیں ہوگا۔ مگر دوپہر کو گرمیوں کے وسط میں وہاں سکندریہ کے لوگوں کے سائے ہوتے تھے۔ ایراتھینز نے ایسے ہی ایک سائے کو ناپا اور حساب لگایا کہ سورج کی کرنیں 7½ ڈگری کے زاویہ سے مینار پر پڑتی ہیں اور اگر زمین گول ہے (ایک روائتی تصور جس کا تعلق شاید قدیم مصر سے ہے) تو سینی سے اسکندریہ کا فاصلہ زمین کے محیط کا 7½ ہوگا۔ چونکہ یہ فاصلہ پانچ سو میل ہے تو اسیراتھینز کے حساب سے زمین کا محیط 24000

میل ہونا چاہیے۔ جدید پیمائش کے لحاظ سے خط استوا پر 24860 میل ہے، یعنی ایراتھنیز کا حساب ناقابل یقین حد تک صحیح تھا۔ اسکندریہ کے ایک اور یونانی ایرس کارتھنیز نے زمین سے سورج کا زاویہ ناپا جبکہ چاند سیدھا سر پر تھا جو پورے چاند کا نصف تھا۔ پھر علم مثلث کے ذریعہ چاند سورج کے سائز اور ان کے اور زمین کے درمیان فاصلے کا حساب لگایا۔ اس کا حساب ایراتھنیز کے حساب جتنا صحیح نہیں تھا، کیونکہ ٹھیک ٹھیک یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ 'چاند کب آدھا ہوتا ہے۔ مگر اس نے اندازہ لگا لیا کہ چاند زمین سے 56000 ہزار میل اور سورج دس لاکھ میل دور ہے۔ اس کے ہمعصر اس انکشاف پر سخت حیران ہوئے ہوں گے۔ اکارس (Icaris) کی کہانی سے انہیں پتہ چلا تھا کہ اگر انسان بہت اونچا اڑے، یہاں تک کہ سورج کے قریب چلا جائے تو اس کے بازو پگھل جاتے ہیں۔ اب ایرس کارتھنیز ان سے کہہ رہا تھا کہ انسان ایک ہزار میل اونچا اڑے تو بھی بمشکل اور شاید ہی سورج کے قریب ہو سکے گا اور یہ کہ سورج چونکہ زمین سے بہت بڑا ہے تو ممکن ہے کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہو۔

ان اہم انکشافات سے انسان کے نئے دُہرے دماغ کے اثر کا اندازہ ہوتا ہے۔ بہت پہلے دور کے کسان چاند اور سورج میں دلچسپی لیا کرتے تھے مگر وہ زاویے ناپنے اور فاصلوں کے حساب کرنے جیسے بور کرنے والے کام کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پھر بھی یہ دُہرے دماغ کے نہایت اہم نتائج تھے۔ اس کا مطلب ہوا کہ لوگ بعض اوقات بوریت سے بچنے کے لیے بور کرنے والے کام کرتے ہیں، ایک خوشگوار تضاد جس سے ہم سب واقف ہیں اور جس کا حاصل وہ دریافت ہے جو ہمیں حساب اور پیمائش کے ذریعہ فطرت کی دنیا پر نئی برتری دیتی ہے۔

مگر یہ ایک اور ذہنی تبدیلی تھی جس نے بنی نوع انسان پر پہلے بھی بڑے گہرے اثرات مرتب کیے اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ جب ایک انسان بائیں دماغ کے گہرے اور غیر مطمئن شعور سے دوچار ہوتا ہے تو شعور کے سلسلہ میں اس کی طلب اور بڑھ جاتی ہے اور وہ زیادہ شعور اور احساس کی خواہش کرتا ہے۔ جیسے کوئی بھوکا روٹی کے خواب دیکھتا ہے۔ وہ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر، اکائی بن کر چاہتا ہے کہ حقیقت کے ساتھ اس کا فوری رابطہ ہو۔ اسی کو رومان کہتے ہیں، نئے آسمانوں کی تلاش اور نامعلوم کی آرزو۔

مختصر یہ کہ بایاں دماغ شعور کی لپیٹ میں آجانے سے انسان خوابوں کا خوگر ہو جاتا ہے۔ جب کسی خواب دیکھنے والے کے ہاتھ فوج کی کمان آجائے تو اس کا نتیجہ خوفناک ہو سکتا

ہے۔ تقریباً 763 قبل مسیح میں 'فلپ آف مقدونیہ' نام کا ایک پندرہ سالہ شہزادہ یونانی جنرل پیلو پیڈس (Pelopidas) کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اسے یرغمال کے طور پر تھیبس بھیج دیا گیا تا کہ وہ اپنے بڑے بھائی الیگزنڈر کے اچھے رویہ کی ضمانت بنے۔ تھیبس کے مقابلہ میں مقدونیہ بہت پسماندہ تھا۔ فلپ یونانیوں کا کلچر اور اس کی آب و تاب دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک ذہین نوجوان تھا، اس کا بڑا بھائی پرڈی کس (Perdikkas) افلاطون کے ساتھ خط کتابت کیا کرتا تھا اور خود وہ ادب، فلسفہ، آرٹ اور علم الکلام کے مطالعہ میں مصروف رہتا تھا۔ الیگزنڈر کے قتل کے بعد فلپ مقدونیہ واپس آیا تو مقدونیہ اسے غیر مہذب اور بہت پسماندہ لگا۔ جب الیگزنڈر کا جانشین پرڈی کس بھی قتل ہو گیا تو فلپ نے تخت پر قبضہ کر لیا اور مقدونیہ کو ایک اور یونان بنانے کا کام شروع کر دیا۔ وہ پیدائشی سپاہی تھا۔ چنانچہ جلد ہی اس نے فوج کو ایک بے ہنگم ہجوم سے زبردست جنگجو قوت بنا دیا، جو اشوریوں اور سپارٹنز کی ہمعصر تھی۔ اس نے اپنے ملک کے پہاڑی قبائل کو زیر کیا اور پھر اپنی بڑائی کے نشہ میں سرشار، ڈینیوب سے ہیلسپونٹ تک کے ملکوں کو فتح کرنے چلا۔ یہ عقاد کے سارگن کی طرح سلطنت تعمیر کرنے کی کوشش نہیں تھی، نہ اپنے لوگوں کے تحفظ اور ان کی باہمی رقابتیں ختم کرنے کا مسئلہ تھا۔ جنگ کا رومان اس جنگ کی بنیاد تھی۔ یہ جنگ برائے جنگ تھی۔ شان و شوکت کے لیے اور جنگ کرنے کی خوشی حاصل کرنے کے لیے جنگ تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یونانیوں کی ستائش حاصل کرنے کے لیے تھی۔ ازمنہ وسطیٰ کے کسی سردار کی طرح فلپ اپنی لیڈی کی عزت کے لیے لڑ رہا تھا اور جب وہ شمال اور مشرق کی سرزمین فتح کر چکا تو جنوب کی طرف بڑھا اور یونان میں داخل ہو گیا جہاں اس نے خود لیڈی ہی کو تسخیر کر لیا۔ تھیبس پر مقدونی فوجوں کا قبضہ ہو گیا، ایک فتح جس کے نتائج تھیبس کے لیے خوف ناک تھے۔ ایتھنز جس نے فلپ کے خلاف مزاحمت کی قیادت کی تھی اسے یقین تھا کہ زندگی کے آخری سانس تک لڑنا ہوگا مگر فلپ کا سلوک نہایت شریفانہ تھا، اسے انتقام نہیں لینا تھا وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ اسے یونانی مان لیا جائے۔

دو سال بعد 46 برس کی عمر میں فلپ قتل ہوا اور اس کا بیس سالہ بیٹا سکندر اس کی جگہ بادشاہ بنا۔ یہ دیکھ کر کہ انہیں اس لڑکے سے کوئی خطرہ نہیں، یونانیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگلے سال سکندر کی موت کی افواہوں سے تھیبس میں بغاوت ہو گئی۔ سکندر ان پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا۔ جب تھیبس کے لوگوں نے دیواروں کے اوپر سے مخالفانہ نعرے لگائے تو وہ

طوفان بن کر شہر میں داخل ہو گیا اور شہر کے تمام مکینوں کو قتل کر دیا۔ اپنے باپ کے برعکس اسے تھیبس سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ مگر ایک لحاظ سے وہ اپنے باپ جیسا رومان پسند اور بڑے خواب دیکھنے والا تھا۔ وہ **Hellispont** سے نکلا اور ایرانی فوج پر فوری حملہ کر کے اسے شکست دی۔ اس نے انہیں سوچنے اور تیار ہونے کی مہلت نہ دی۔ ایرانی بادشاہ دارا ایک اور فوج مقابلہ پر لے کر آیا تو سکندر نے اسے بھی اتنی ہی آسانی کے ساتھ ہرا دیا۔ اپنی فتح کے بعد سکندر دارا کے خیمہ میں گیا۔ شاہی حمام میں نہایا، پھر ایک ریشمی صوفہ پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹا اور شراب کا جام اٹھایا، ''تو بادشاہت اسے کہتے ہیں۔'' وہ شام میں اور شام کے بعد مصر میں داخل ہوا۔ جہاں اس نے سکندریہ نامی شہر کی بنیاد رکھی۔ وہ واپس گیا اور ایک دفعہ پھر دارا کو شکست دی اور بابل میں داخل ہو گیا۔ وہ دارا کی خواتین کے ساتھ نرمی سے پیش آیا اور ان میں سے ایک کے ساتھ شادی کر لی، پھر وہ اپنی نو تسخیر سلطنت میں پانچ سال تک گھومتا رہا۔ آخر اس کی فوج نے گھر واپس جانے کی درخواست کی تو سکندر نیم دلی سے بابل واپس آیا۔ وہ اب اپنے خوابوں کی دنیا تلاش کر رہا تھا۔ وہ افریقا پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے بخار نے آ لیا اور وہ بتیس سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

جدید ریسرچ سے تاریخ میں ایک اور نکشاف ہوا ہے کہ سکندر کی موت شراب سے ہوئی۔ گویا کہ زنجیر کی ایک گم شدہ کڑی ملی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سکندر انتہا پسند تھا۔ کئی بار اس نے کئی شہروں میں قتل عام کا حکم دیا یہاں تک کہ آخری عورت اور آخری بچہ بھی زندہ نہ رہے۔ اس کے باوجود وہ سخی اور دلیر تھا، جب اس کا دوست ہیاسٹین مرا تو اس کا غم قابل دید تھا۔ مگر اس نے اس ڈاکٹر کو بھی سولی دینے کا حکم دیا جس نے اس کا علاج کیا تھا۔ اپنے منہ بولے بھائی کلائی ٹس (**Kleitus**) کے ساتھ تکرار کے بعد اس نے ایک سپاہی سے برچھی چھینی اور اس کے جسم کے پار کر دیا۔ اسے جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے برچھی اپنے گلے میں مارنے کی کوشش کی۔ سخاوت، جذباتیت اور نشہ میں غضب ناک ہونے سمیت یہ شرابیوں سے منسوب انتہائیں ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی شراب نوشی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ میں بٹا ہوا تھا اور بائیں دماغ کے شعور کی تنگ نظری سے بچنے کی سخت کوشش کرتا تھا۔ اگر احمق ہوتا تو زیادہ خوش ہوتا مگر اس کا تعلق دانشور رومان پرستوں کے خاندان سے تھا۔ اس کا باپ تھیبس میں فلسفہ پڑھا کرتا تھا اور جب بیٹے کے لیے استاد کے انتخاب کا وقت آیا تو اس نے افلاطون کے شاگرد ارسطو کو چنا۔ مگر جذباتی اور بے ہنگم ہونے کی وجہ سے فلپ کی طرح

سکندر بھی فلسفہ کی دل نوازیوں سے فیض یاب نہ ہو سکتا تھا۔ ایک بنجر، اداس اور بے فیض دنیا سے بچنے کے لیے شراب سکندر کے واسطے شرلک ہومز کی کوکین تھی۔ سکندر کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ نئی دنیاؤں کی تسخیر کے لیے بے تاب رہتا تھا، شاید صحیح نہ ہو مگر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نامعلوم تک پہنچنے کا عزم رکھتا تھا۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بوریت یک دماغی کیفیت کا لازمی شاخسانہ ہے۔ بوریت اپنے آپ میں مر جانے کا احساس ہے۔ یہ اپنی فطرت اور احساسات سے رابطہ ختم ہونا ہے۔ EEG مشین سے ظاہر ہوا ہے کہ جب ہم بور ہوتے ہیں تو دایاں دماغی حصہ حرکت میں آ جاتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب دماغ سست ہونے لگتا ہے۔ رابرٹ آرنسٹوائن کا کہنا ہے کہ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص حساب جیسا دماغی کام کرتا ہے، دراصل یہ ہر ایسا کام کرتے ہوئے ہوتا ہے جس میں ہمیں دلچسپی نہ ہو۔ اگر دایاں دماغ زیادہ سست ہو جائے تو سو جاتا ہے۔ ماہر نفسیات ابراہم میسلو نے ایک لڑکی کا ذکر کیا ہے جو مایوس تھی اور جسے زندگی کے بے معنی ہونے کا احساس تھا۔ اسے پتہ چلا کہ لڑکی سوشیالوجی پڑھنا چاہتی ہے۔ مگر مالی پریشانیوں کی وجہ سے اسے ایک اکتا دینے والا کام کرنا ہوتا ہے۔ جب میسلو نے اسے مشورہ دیا کہ وہ نائٹ سکول میں داخلہ لے اور سوشیالوجی کی تعلیم جاری رکھے تو اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔ بوریت کی وجہ سے اس کا دایاں مغز زیادہ تر سست اور کاہل رہتا تھا مگر جونہی اسے اُمید کی کرن نظر آئی وہ پھر کام پر لگ گیا۔

'دوسرے نفس' کا کام انسانی زندگی میں تیسری جہت، حقیقت کا اضافہ کرنا ہے۔ اگر دماغ تجزیوں، پیچیدہ مسائل یا لاحاصل کاموں میں بہت الجھ جاتا ہے تو دایاں دماغ انگڑائیاں لیتا ہے اور مایوسی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگتا ہے اور حقیقت، غیر حقیقت ہو جاتی ہے۔ ایسا ہو تو اچانک کوئی دلچسپ کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ بچہ ٹیلی وژن لگا لیتا ہے، عورت نئے کپڑے خریدنے چلی جاتی ہے اور مرد لان میں کام کرنے کے بجائے مچھلیاں پکڑنے چلا جاتا ہے۔ سکندر نقشہ دیکھتا ہے اور نئی فتوحات کی تدبیریں کرنے لگتا ہے، مگر فتوحات میں بھی بوریت کے لمحے آتے ہیں۔ لانگ مارچ، بارش، آندھی، طوفان۔ جب کوئی واقعہ نہیں ہوتا جونہی اسے بوریت ہونا شروع ہوتی، سکندر میدان جنگ میں ہوتا۔

سکندر کے معاملہ میں کم از کم ہم نے ایرک فرام کے سوال کا جواب دے دیا ہے کہ کیوں انسان وہ واحد مخلوق ہے جو اپنی نسل کو ٹارچر کرتا ہے اور قتل کرتا ہے۔ جارحیت بھی

الکوحل کی طرح دائیں اور بائیں میں ایک نیا توازن پیدا کرتی ہے۔ یہ ہمیں ہمارے سفاکانہ استدلال سے بچاتی ہے۔ وجدانی لمحات کا احساس پیدا کرتی ہے اور اسے پہچان کر ہم تمام کریمنلٹی کی ایک بنیادی وجہ بھی جان لیتے ہیں۔ ایک اکتایا ہوا بچہ بڑی آسانی کے ساتھ شرارت کا کوئی موقع تلاش کر لیتا ہے کوئی بوریت کا مارا ہوا لڑکا فون خراب کر دیتا ہے یا گھر کے پودے نوچنے لگتا ہے۔ بایاں دماغ تنہا بالغوں کو بھی احتجاج یا بغاوت کے نرالے انداز اپنانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اکتایا ہوا بزنس مین اپنی سیکرٹری سے معاشقہ پر تیار ہو جاتا ہے جسے وہ بالکل پسند نہیں کرتا، بوریت کی وجہ سے امیر گھر کی عورت کسی سٹور سے کوئی چیز چرا سکتی ہے۔ دوستوئیفسکی نے ایک پورا ناول' The Possessed' ایک ایسے شخص کے متعلق لکھا ہے جو کسی ظاہری وجہ کے بغیر مجرمانہ حرکتیں کرتا ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ میں نہیں جانتا کہ میں اپنی طاقت کا کیا کروں۔ اسی وجہ سے ژید کا ایک کردار ایک اجنبی کو ٹرین سے دھکا دیتا ہے۔ سارتر کی 'ایج آف ریزن' میں بورس نامی ایک اسٹوڈنٹ محض تفریح کے لیے دکانوں سے چوری کرتا ہے۔

مگر جب ہم ادب سے حقیقت کی دنیا میں آتے ہیں تو کوئی شخص جرم محض اس لیے نہیں کرتا کہ وہ بور ہو گیا ہے۔ یہ گوسمن، بریڈی، تھرن مین کے جرائم بلکہ جان ہیگ جیسے اٹھائی گیرے کے جرائم کی بھی وضاحت نہیں۔ جرم کی بنیاد ایک طرح کی خود آگاہی اور اپنی غلطیوں کا شعور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سکندر اعظم کے قتل عام جرم نہیں کہلا سکتے۔ جب سکندر نے ہندوستان کے کسی شہر کے ہر شہری کے قتل کا حکم دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان یونانیوں کی نسل سے تھے جنھوں نے ڈیڑھ سو سال پہلے اپالو کے عبادت گھر کے خزانے ایرانی بادشاہ کیخسرو کو دے دیئے تھے۔ سکندر اپنے آپ کو خدائی انصاف کا ذریعہ سمجھتا تھا اور اگرچہ تمام قتل اذیت پسندانہ لذت کے ساتھ ہوئے پھر بھی انہیں جرم نہیں کہہ سکتے۔ پرانی دنیا ان ظالموں سے بھری تھی جو لذت کے لیے قتل کرتے تھے۔۔ پلوٹارک ایک الیگزنڈر آف تھیسلی کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ لوگوں کو زندہ دفن کرتا تھا اور بعض دفعہ انہیں درندوں کی کھالیں پہنا کر کتوں کے آگے ڈال دیتا تھا۔ اسی قاتل نے دو دوست شہروں کے شہریوں کو اکٹھا کیا اور انہیں گھیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، مگر وہ یہ ظلم کرنا بھی اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس کے پاس جرم اور ضمیر کا کوئی تصور نہیں تھا۔ مزے کی بات ہے کہ وہ ظالم اپنی بیوی کے اشارے پر مارا گیا۔

مگر کلوس، گوسمن اور بریڈی کو جرم کرتے ہوئے معاشرہ کے خلاف اپنے جرم کا

احساس تھا۔ اپنی تمام شیخی اور اکڑ کے باوجود انہیں احساس تھا کہ وہ غلط کام کر رہے ہیں۔ ان کا ذہنی رویہ ظالموں سے اتنا ہی مختلف تھا جتنا کہ طالب علم کا ہیڈ ماسٹر کے رویہ سے ہوتا ہے اور اسی سے ہم سمجھ جاتے ہیں کہ جرم وہاں ہوتا ہے جہاں اتھارٹی ہوتی ہے اور جرم کے ذریعہ اتھارٹی کو چیلنج کرنا ہوتا ہے۔ ان قدیم شہروں میں جہاں بادشاہ اپنے آپ کو خداؤں کا غلام سمجھتا تھا جرم کا شاید کوئی وجود نہیں تھا۔ جرم کرنے کے لیے چوری اور قتل کرنے کے لیے ایک فرد کو خداؤں کی مرضی کے خلاف بغاوت کرنا پڑتی تھی۔ ایک دینی حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے ایسا کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ یہ اس وقت ہوا جب بادشاہ ظالم ہو گئے۔ انہوں نے خداؤں کے نام پر اقتدار حاصل کرنے کے بجائے اپنے نام پر حاصل کیا۔ یہی وہ نفسیاتی وجوہات اور حالات تھے جن میں جرم کا آغاز ہوا۔ جرم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اتھارٹی کو تسلیم بھی کرے اور اس سے برگشتہ بھی ہو۔ جرم اپنی بنیادی فطرت کے لحاظ سے آمریت کے خلاف ہے۔ اتھارٹی کے خلاف اس کی برگشتگی کیونکر تشکیل پاتی ہے، اس کی جھلک ہم نیچے کہانی میں دیکھ سکتے ہیں۔ (حوالہ لڈووچ کینڈی کی کتاب **A Book of Railway Journeys**)

ایک انگریز لارڈ رسل ایک اجنبی کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔
جونہی ٹرین اسٹیشن سے باہر نکلی، غیر ملکی نے اپنا بیگ کھولا، اس میں سے جوتے نکالے اور اس کے تسمے کھولنے لگا۔ ”اگر تم ایسا کرو گے،“ گریٹ وکٹورین جج نے اعلان کیا، ”تو میں تمہارے جوتے ٹرین سے باہر پھینک دوں گا۔“
اجنبی نے کہا کہ میں وہی کروں گا جو اپنے ملک میں کرتا ہوں، یہ میرا حق ہے۔ مگر کسی کو کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔
یہ کہہ کر اجنبی نے جوتے نیچے رکھے تو لارڈ رسل نے انہیں کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

عظیم برطانوی سلطنت کے ممتاز شہری کی حیثیت سے وہ سمجھتا تھا کہ اسے حق حاصل ہے کہ وہ کسی غیر ملکی کو جوتے نہ اتارنے کا حکم دے۔ انگریز صدیوں سے تمام دنیا میں یہی کچھ کرتے رہے ہیں۔
یہ واقعہ پڑھتے ہوئے خیال آتا ہے کہ اگر اجنبی لارڈ رسل کا گلا پکڑ کر کھڑکی سے

باہر پھینک دیتا تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہوتا۔ ایسے برخود غلط احمق لوگ اشتعال کا باعث بنتے ہیں۔اس سے احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہر اتھارٹی تشدد کی مستحق ہے اور تشدد ہی ہر جرم کی بنیاد ہے۔ یہی احساس تھا جس کی بنا پر کرام ویل نے کنگ چارلس کا سر قلم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہر جرم ایک طرح سے اتھارٹی کے خلاف ایک فرد کی بغاوت ہے۔

اس نوعیت کا جذبہ اتھارٹی کے ہر مخالف کو متاثر کرتا ہے جو ہم سب میں رہتا ہے۔ یہ روسو سے مارکس تک بائیں بازو کے تمام سیاسی مفکروں کی بنیاد ہے۔مگر اس سے پیشتر کہ ہم جرم کو اتھارٹی کے خلاف احتجاج کا جائز طریقہ سمجھیں، ہمیں جان لینا ہے کہ آمریت دشمنی بچپن کی روایت ہے جیسے ہم لطائف کے ایک مجموعہ 'Children's Humour' میں صاف دیکھ سکتے ہیں۔ان سے ہمیں بچوں کی ذہنی دنیا کی نئی تشکیل میں مدد ملتی ہے جسے ہم میں سے اکثر بڑی آسانی کے ساتھ بھلا چکے ہیں، وہ دنیا جو ایک رینگنے والے کیڑے کے نقطۂ نظر سے دیکھی گئی ہو۔تفریح کے متعلق بالغوں کے اپنے عجیب خیالات ہیں کہ تفریح سے مراد کیا مذہب، سیاست یا کھیل ہے۔مگر ہر بچہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ تفریح سے کیا مراد ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تفریح سے مراد وہ ہنگامے ہیں جن کی توقع ہم سے نہیں کی جاتی۔جنہیں بڑے لوگ 'شرارت' کہتے ہیں۔اسی لیے ضد کی بنا پر اکثر بچے ظالمانہ حرکتیں کرتے ہیں، جیسے تتلی کے پر نوچ لینا یا بلی پر جلتی دیا سلائیاں پھینکنا۔اس طرح چھوٹے پیمانے پر وہ سکندر اعظم بن سکتے ہیں تا کہ اذیت دینے کے لیے ایسے کام آزادی کے ساتھ کر گزریں جو نہیں کرنا چاہئیں۔ بچے کی دنیا بڑوں کی مرضی، ان کی اتھارٹی سے تشکیل پاتی ہے، وہی اس کی حدیں متعین کرتے ہیں اور انہی کی یہ خفیہ خواہش ہوتی ہے کہ اتھارٹی کی تحقیر ہو۔

مگر بڑوں نے کیا واقعی اپنے یہ طور طریقے بدلے ہیں، کسی مسخرے کو صرف یہ کرنا ہے کہ ایک جانے پہچانے سیاستدان کے متعلق کوئی توہین آمیز بات کہے تو قہقہوں اور تالیوں کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ چاہے کوئی ہنسی کی بات ہو کہ نہ ہو، بس اتنا ہے کہ سیاستدانوں کی کردار کشی اور اتھارٹی کی تضحیک ہو۔ مارکس برادرز، لینی بروس اور سپائک ملی گن جیسے کامیڈین ہر انتشار کو ایک خوبی بنا کر پیش کرتے ہیں، اس لیے دانشوروں کے کامیڈین سمجھے جاتے ہیں کیونکہ ایک بھلے مانس مسخرے کی سیدھی سادی بے ضرر کامیڈی کی نسبت ان کی کامیڈی میں توہین اور تضحیک کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ بہر حال جو بھی اس قسم کے مزاج یعنی مارکس برادرز کی فلمیں وغیرہ ٹیلی ویژن پر عام دیکھتا ہو فوراً سمجھ جاتا ہے کہ وہ تنقید کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

پہلے پانچ منٹ کے بعد ہی اتھارٹی کی نافرمانی اور کردار کشی جیسے عامیانہ موضوعات سنجیدگی کی جگہ نہیں لے سکتے، نہ بہت دیر تک اپنی دلچسپی قائم رکھتے ہیں۔ جب گروچو گاتا ہے کہ ''جو کچھ بھی ہے میں اس کے خلاف ہوں'' تو ہم صرف اس وقت تک اس سے خوش ہوتے ہیں جب تک کہ ہم غور نہیں کرتے۔ لاقانونیت اس وقت بھلی لگتی ہے جب قانون کا تحفظ حاصل ہو۔

یہی غلط اندیشی دا ساد کی تصنیف کو بے اثر کرتی ہے۔ The 120 Days of Sadism' کے ہیرو سکول کے لڑکے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہر وہ چیز اچھی ہو سکتی ہے جس سے منع کیا جائے۔ کتاب میں کہیں ایک طوائف اپنے ایک گاہک کا ذکر کرتی ہے جو اسے اس کے پاؤں دھونے نہیں دیتا اور میل جب انگلیوں میں جمع ہو جاتا ہے تو اسے چاٹ لیتا ہے۔ ویسے تو اس حرکت سے گھن آتی ہے مگر Curval ایسا نہیں سمجھتا۔ وہ میل جمع ہوتے ہی چاٹ لیتا ہے۔ (مزے کی بات ہے کہ Curval لارڈ چیف جسٹس ہے اور سیاستدانوں کا مذاق اڑانے میں دا ساد کا ہمسر ہے) مگر ایک اوراوباش شخص ایک اہم بات کہتا ہے۔ ''اک ذرا اکتاہٹ ہو تو یہ تمام بدنامیاں گہرے معنی اختیار کر لیتی ہیں۔ تسکین انہیں انسپائر کرتی ہے۔ عامیانہ ماحول میں دم گھٹنے لگتا ہے، خیالات الجھتے ہیں اور ہمارے وسائل کی بے مائیگی، صلاحیتوں کا فقدان اور ہماری روح کی کرپشن ہمیں اس ذلت آمیز انجام تک لے جاتی ہیں، اس سے بے خبر ہو کر اس نے ابھی اپنے فلسفہ پر بڑی شدت کے ساتھ تنقید کی ہے۔ دا ساد اس کی بے راہروی کا حال بیان کرنے لگتا ہے کہ ایک عمر رسیدہ جنرل کس طرح ایک بوڑھی عورت کے زخموں سے لذت حاصل کرتا ہے جسے چوری کے جرم میں کوڑے مارے گئے تھے۔

چنانچہ اتھارٹی کے خلاف یہ بے بنیاد غصہ جرم کی بنیاد ہے۔ بچہ قدرتی طور پر مجرم ہے کہ وہ اتھارٹی کی دنیا میں رہتا ہے۔ جس دنیا کی حدیں دور دور ماں باپ سے اسکول ماسٹر اور پولیس مین سے وزیراعظم تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بڑا ہو کر وہ چھوٹے بھائی بہنوں کو اپنی اتھارٹی کے ماتحت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے بچے پیدا ہونے کے بعد وہ بڑوں کے پاور اسٹرکچر میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ اگرچہ وہ قانون اور اتھارٹی کی ضرورت کا قائل ہو جاتا ہے مگر اس کے جذبات اس کے استدلال (ریزن) کا ساتھ نہیں دیتے اور بدستور اتھارٹی کے خلاف ہیں۔ اس لیے جب کوئی کامیڈین اتھارٹی کا مذاق اڑاتا ہے تو دل کھول کر ہنستے ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کے دل و دماغ میں کھلی آویزش نہیں ہوتی، دماغ نظم و قانون کا ساتھ دیتا ہے

جبکہ دل آمریت کے خلاف ہوتا ہے۔ داساد نے دونوں کو ایک کرنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ دماغ سے دل کے لیے جواز مہیا کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ داساد مجسم انتشار ہے۔ وہ اپنی بحث کو بے معنویت (Absurdity) کی حد تک لے گیا ہے۔

پھر بھی یہ داساد ہی ہے جو اپنی بصیرت سے ہمیں اس جان لیوا سوال کا جواب تلاش کرنے میں مدد دیتا ہے کہ انسان ہی کیوں وہ واحد مخلوق ہے جو اپنے جیسے انسانوں کو ٹارچر کرتا ہے اور قتل کرتا ہے؟ دراصل داساد خود اپنی ذات میں کریمنلٹی (مجرمیت) کا نصاب ہے، ایک ادارہ ہے۔ انسانوں کے بارے میں اس کی رائے مادی اور مایوس کن ہے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا اور بیسویں صدی کے آخر میں جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار دیکھتا تو حیران ہوتا کہ اس کا اندازہ کس قدر صحیح تھا۔ داساد کے خیال میں فطرت کے ہاتھوں انسان کی تخلیق ایک حادثاتی امر ہے۔ انسان کے بس دو مقاصد ہوتے ہیں زندہ رہنا اور اپنی خواہشات پوری کرنا۔ یہ صورت حال ایسی ہے جس میں مفاد کا تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بھوکا شیر گوشت مانگتا ہے، بے چارہ ہرن اس کا نوالہ نہ بنے تو کیا کرے۔ انسانوں کے اپنے شیر اور ہرن ہوتے ہیں۔ وہ جن کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور وہ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ جن کے پاس ہوتا ہے وہ اپنی خواہشات پوری کرنے میں ساری دولت اور سارا زور لگا دیتے ہیں مگر دوسروں کو تلقین کرتے ہیں کہ ڈاکہ اور قتل اخلاق اور مذہب میں حرام ہیں۔ مگر جلد یا بدیر جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ اخلاقی قوانین دولت مندوں کی ایجاد ہیں تو وہ بھی جو چاہتے ہیں اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جرائم کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔

داساد کہتا ہے کہ انسان کی بنیادی خواہش خدا بننا ہے اور اگر کوئی انسان خدا بن سکتا ہے تو پھر وہ جو چاہے کرے گا، لوگوں سے گن گن کر پرانی دشمنیوں کے بدلے گا۔ جسے ناپسند کرتا ہے اسے جینے نہیں دے گا۔ جو چیز کبھی میسر نہیں تھی اسے بہرطور حاصل کرے گا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر طریقہ سے اپنی جنسی خواہشات پوری کرے گا اور ہو سکا کہ تو دن میں سو بار کرے گا۔ کیا کوئی شخص ایمان سے کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اور اگر کرے گا تو بات صاف ہو گئی کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک مجرم ہے مگر سزا کا خوف اسے اپنی خواہشات پوری کرنے نہیں دیتا۔

اگر ہم داساد کے ان مادیت پسندانہ خیالات سے اتفاق کریں جو درحقیقت کتنے ہی جدید سائنسدانوں اور فلسفیوں کا مسئلہ بھی ہیں تو ہم اس کے دلائل آسانی کے ساتھ رد نہیں کر

سکتے۔ پھر بھی اس ایک پہلو پر بات ہوسکتی ہے کہ ہر عارضی خواہش کی تکمیل مسرت کی ضمانت نہیں۔خواہش گھاٹے کا سودا ہوتی ہیں جو شخص خواہش پیدا ہوتے ہی اس کی تسکین کا سامان کر سکتا ہے وہ شاید آخرکار بوریت سے تنگ آ کر خودکشی کر لے گا یہ داساد کا اپنا مسئلہ بھی تھا۔ ایک دولت منداور خوش شکل نوجوان کی حیثیت سے اس نے جنسی زندگی کے سارے انداز اور رنگ دیکھے۔ درمیانی عمر کے بعد وہ باقی زندگی 'ممنوعات' کے لیے ترستا رہا جن میں 'جنسی نشاط' سرفہرست تھی۔ جتنا وہ اس کا پیچھا کرتا اتنا وہ اس سے دور بھاگتی۔ گمراہیاں اور محرومیاں اس انتہا پر پہنچ کر وحشیانہ بلکہ مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں۔

جب ہم اس لا انتہا پسپائی کا جائزہ لیتے ہیں تو سیدھے سادے تجربہ کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے۔ داساد کا کہنا ہے کہ تجربہ حسیات کو اسی سیدھے سادے انداز میں مطمئن کرتا ہے جس طرح روٹی سے پیٹ کی تسکین ہوتی ہے۔ جب پیٹ خالی ہو تو روٹی سے وہ بھر جاتا ہے، یہ ایک سیدھا سا جسمانی اصول ہے۔ تو بھی یہ میرے لیے رغبت کا، بوریت کا، بلکہ قے کر دینے کا باعث ہوسکتا ہے مگر اس کا انحصار میری ذہنی حالت پر ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اچھے ہاضمہ کا پچاس فیصد تعلق ذہنی کیفیت سے ہوتا ہے اور جنس کا معاملہ ہو تو یہ تعلق پچاس فیصد سے بھی بہت بڑھ جاتا ہے۔ ذہنی حالت ٹھیک نہ ہو تو جنسی تسکین ایک خواب بن جاتی ہے۔ داساد کا یہ کہنا کہ اگر ہم میں کوشش کرنے اور تلاش کرنے کی جرأت ہو تو ایک بھرپور جنسی تجربہ ممکن ہے، محض ایک وہم ہے۔

داساد کی بات کا جواب ہم کیر کے گور کے ان الفاظ میں دیکھ سکتے ہیں۔

> ''بوریت کی تاریخ دنیا کے آغاز سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ دیوتا بور ہوئے تو انہوں نے انسان پیدا کیا، آدم اکیلے بور ہوئے تو حوا پیدا کی گئی، اس طرح بوریت دنیا میں آئی اور آبادی بڑھنے کے ساتھ بڑھتی گئی۔ آدم اکیلا بور ہوا تھا پھر آدم اور حوا اکٹھے بور ہوئے۔ آدم حوا، ہابیل اور قابیل کا خاندان بور ہوا۔ دنیا کی آبادی بڑھی تو لوگوں کے ہجوم بور ہوئے۔ اپنی توجہ ہٹانے کے لیے انہیں ایک ایسا بلند و بالا مینار بنانے کی سوجھی جو آسمانوں کو چھو سکے۔ مینار کی تعمیر کا خیال ہی بور کرنے والا تھا کیونکہ بلند و بالا مینار بوریت کی بالادستی کا ثبوت تھا۔''

یہ خیال غلط ثابت ہوا ہے کہ توجہ کا مرکز بدلنے سے، کسی دلچسپ سرگرمی میں حصہ لینے سے بوریت ختم ہو جاتی ہے۔ داساد کی کتاب، سیکس کا مینارِ بابل ہے۔ بوریت سے نجات

کے لیے مصروفیات میں گردش کا طریقہ اپنانا ہوتا ہے۔ مختلف کاموں میں نئی ترتیب پیدا کر کے انہیں باری باری کرنا ہوتا ہے۔ جیسے کسان سال بھر بدل بدل کر فصلیں بوتا ہے اور اکتاہٹ کا نام نہیں لیتا، نہ زمین بنجر ہوتی ہے۔ یہی limitation ہے یعنی اپنی صلاحیتوں اور کوتاہیوں سے باخبر ہونا۔ Limitation کا اصول ہی دنیا میں بچت اور تحفظ کا واحد ذریعہ ہے۔ توانائی کو بچانے اور محفوظ رکھنے سے پیداوار اور ایجاد کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اسی وجہ سے عمر بھر کے لیے قید تنہائی کاٹنے والا قیدی کوئی ایجاد بھی کر سکتا ہے اور محض ایک مکڑی کی حرکات سے لطف اندوز بھی ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی اسکول کی زندگی یاد کر سکیں کہ تتلی پکڑ کر اسے اخروٹ کے چھلکے میں بند کر دینے میں کتنا مزا تھا اور چھت سے ٹپکتے ہوئے بارش کے قطروں کی آواز میں کتنی موسیقی تھی۔

قید تنہائی کا اسیر اپنی تنہائی میں دراصل کیا کرتا ہے؟ بارش کی آواز سنتے ہوئے سکول کا لڑکا کیا کرتا ہے؟ یہی کہ کوئی امید نہ ہونے کی وجہ سے اس کی حسیات مدھم ہو جاتی ہیں۔ حسیات کے مدھم ہونے سے ادراک کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے، وہ اپنی توجہ بہتر طور پر فوکس کر سکتا ہے۔ جیسے کوئی سائنسدان مائیکروسکوپ کے ذریعہ سلائیڈ پر فوکس کرتا ہے۔ سکول کا لڑکا بھنورے پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے۔ دا ساد بگڑا ہوا بچہ ہے، اسے اپنی توجہ فوکس کرنے کی بڑی جلدی ہوتی ہے۔ بے صبری کے ساتھ اسے فوکس کرتا ہے اور پھر حیران ہوتا ہے کہ تجربہ ناکام کیوں ہوا۔ راجر سپیری نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ دایاں مغز یعنی وجدانی حصہ، بائیں کی نسبت سست رفتاری سے کام کرتا ہے۔ بایاں دماغ یعنی 'تم' وہ حصہ ہے جو دنیا سے نمٹتا ہے اور ہمیشہ جلدی میں ہوتا ہے۔ دایاں معمول کے مطابق اپنی ہی رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں حصوں میں کبھی رابطہ نہیں ہوتا۔ ہر وقت 'تم' بے چین، تھکا ہوا اور ٹینشن کی حالت میں ہوتا ہے۔ دونوں میں خلیج بڑھتی ہے اور زندگی غیر حقیقت کا رنگ اختیار کرنے لگتی ہے کیونکہ حقیقت کے تیسرے زاویہ کا تجربہ مہیا کرنا دائیں مغز کا کردار ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ دونوں نصف پہلو بہ پہلو قدم ملا کر چلیں۔

چنانچہ جب قیدی تتلی پر نظریں جماتا ہے یا سکول کا لڑکا بھنورے پر فوکس کرتا ہے تو وہ بائیں کی رفتار کم کر رہا ہے۔ تاکہ اس کی رفتار دائیں مغز جتنی ہو جائے۔ ایسے ہو جانے سے تجربہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ درحقیقت وہ بٹن دبا کر شعور کو بائیں مغز: 'فکر کے انداز' سے دائیں مغز: 'احساس کے انداز' میں بدل دیتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ الکوحل کیونکر بعض

اوقات وہ سکون انگیز لمحات مہیا کرتا ہے جن میں کھو کر ہم اپنے حال میں مست رہنے لگتے ہیں۔ وہ بائیں دماغ کی مجنونانہ دوڑ روک دیتا ہے اور اسے پرسکون ہو جانے کی ترغیب دیتا ہے۔ داساد جان گیا تھا کہ سیکس سے بھی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے مگر سیکس ہو کہ الکوحل، ہمیشہ کام نہیں آتے۔ ہو سکتا ہے کہ بایاں دماغ اپنی رفتار کم کرنے سے انکار کر دے۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جرم انسانی ارتقا کا رُوڑا کوڑا ہے۔ انسان میں پیش بینی کی صلاحیت ہوتی ہے اور اسی پیش بینی کے ذریعہ وہ اپنی آنے والی زندگی میں جھانکتا ہے کہ اسے تحفظ، مسرت اور آرام کیونکر حاصل ہو۔ انہیں حاصل کرنے کا سادہ طریقہ لوٹنا مارنا ہے، مجرم بننا ہے اسی طریقہ کی وکالت داساد کرتا ہے۔

اگر جیمز کا کہنا درست ہے تو اس کا اطلاق ہمارے بزرگوں پر نہیں ہوتا کیونکہ ان کے دائیں اور بائیں مغز میں ابھی رابطہ ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ تہذیب کی پیچیدگیوں کا تقاضا تھا جس کی وجہ سے انسان کو خود مختار بایاں دماغ بڑھانا پڑا جس سے کہ کریمنلٹی ممکن ہوئی۔

ہم نے پہلے ہی دیکھ لیا ہے کہ داساد کی اپروچ، مجرمانہ اپروچ اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس کی خام خیالی ہی اس کی شکست ہے۔ غصہ سے بدحال ایک جنونی انانیت پرست اپنے حقیقت کے شعور کو خود ہی تباہ کر دیتا ہے۔ (پینزم اس کی ایک مثال ہے) جس کا انجام اس کی اپنی بربادی ہے۔ اگر خوش قسمت ہو، تو اپنی غلطیوں کا بروقت احساس کر کے راستہ بدل لیتا ہے۔ (کتنے ہی ولیوں نے زندگی گنہگاروں اور متکبر لوگوں کی حیثیت سے شروع کی مگر انہیں اپنی غلطیوں کا اندازہ جلد ہو گیا)

ہر انسان میں ایک مجرم چھپا ہوتا ہے۔ بیکر کہتا ہے کہ ہر بچہ جنونی اور خودسر ہوتا ہے۔ اگر ہم میں تھوڑے سے افراد پینزم اور داساد کے راستہ پر چلتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں (جیسا کہ داساد سمجھتا ہے) کہ ہم سوسائٹی اور قانون سے ڈرتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی **limitation** (حدود) سے واقف ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ اتنی پرانی ہے جتنی کہ انسانی تاریخ پرانی ہے۔ **limitation** کا اصول اس امر کا اعتراف ہے کہ انسانوں کی خوشی کا انحصار سیلف ڈسپلن (ضبطِ نفس) پر ہے۔ اس کا ذکر ہندوؤں کی مذہبی کتابوں (**100** قبل مسیح)، اہرام اور عراق کی ابتدائی تحریروں میں موجود ہے۔ آدمی جرائم پیشہ جانور ہو سکتا ہے مگر وہ مذہبی جانور بھی ہے اور مذہب، مجرمیت (کریمنلٹی) سے بہت پرانا ہے۔

جرم کو مجموعی ارتقائی پیٹرن کا حصہ جان کر سمجھا جا سکتا ہے۔ انسان نے زندگی کا

ذریعہ سمجھتے ہوئے اپنے 'منقسم شعور' کو بڑھایا، ایک لحاظ سے وہ جانور رہتے ہوئے زیادہ خوش تھا، اس لیے کہ جانور کا شعور سادہ اور بھرپور ہوتا ہے۔ (ہم الکوحل کے اثر سے اس کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔حرارت اور حقیقت کا وہ اچانک احساس) مگر اس وجدانی شعور کی ایک بڑی خرابی اس کا بہت محدود، بہت تنگ ہونا ہے۔ یہ ہمیں موجودہ لحہ میں قید کر دیتا ہے، چنانچہ اس قید سے بچنے کے لیے انسان کو بایاں دماغ بڑھانا پڑا۔اس میں یہ طاقت، تجرید کی طاقت ہے کہ ہر لحہ کی حد توڑ دے، اس سے ماورا ہو جائے اور حقیقت کو علامت اور آئیڈیا میں بدل دے۔نقشہ بنیادی طور سے بایاں مغز بناتا ہے۔

خیال کرو کہ ایک نوعمر لڑکا ایک بڑے مگر قدیم شہر میں آتا ہے۔اپنے کام کے سلسلہ میں اسے سارا شہر گھومنا ہے۔ چاہے وہ اپنا راستہ پوچھتا پھرے یا کسی مقامی شخص کو اپنا گائیڈ بنائے، ان میں سے کوئی طریقہ پوری طرح مؤثر نہیں ہوسکتا۔اگر وہ چاہتا ہے کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے تو اس کے لیے اسے ایک نقشہ کی ضرورت ہے۔اگر نقشہ نہیں ہے تو اسے خود بنانا ہوگا۔ایک دفعہ نقشہ بن جائے تو وہ شہر بھر میں کسی قدیم ترین مکین کی طرح مزے سے گھومتا پھرے گا۔ بلکہ کئی مکینوں سے زیادہ شہر کو جان لے گا جن کی شہر سے واقفیت صرف ان کے اپنے علاقہ تک ہے۔

پھر بھی وہ ایک اور معنی میں شہر کو بالکل نہیں جانتا۔ وہ شہر کو نہیں جانتا، شہر کی تجرید کو جانتا ہے۔ایک نقشے کو جانتا ہے جس میں 'حقیقت' کے چند منتخب حصوں نے جان ڈالی ہے۔ یہ انسان کی موجودہ حالت ہے، دراصل وہ اس لیے اپنی ابتدائی زندگی کا بڑا حصہ سکول میں گزارتا ہے کہ اسے اس دنیا کا نقشہ معلوم ہو جس میں وہ رہتا ہے۔مگر جب وہ سکول چھوڑ کر جاتا ہے تو اس دنیا کی حقیقت سے متعلق اس کا علم ادھورا ہوتا ہے اور جدید زندگی اتنی پیچیدہ اتنی کنفیوز کرنے والی ہے کہ نقشہ کے کئی بہت بڑے حصوں کا نامعلوم اور نادریافت رہ جانا لازمی ہے۔ ایک وحشی جس نے اتنے ہی سال شکار کرنے میں گزارے ہوں، قدرتی بات ہے کہ دنیا کے متعلق اس کا نقطۂ نظر محدود ہوگا مگر جیسا بھی ہوگا اس میں حقیقت کی جھلک نظر آئے گی۔ایک لحاظ سے نئے انسان نے بڑے خسارہ کا سودا کیا ہے، اس نے ایک نقشہ حاصل کیا ہے اور نقشہ کے سوا کچھ نہیں حاصل کیا۔

نقشہ کا تصور جرم کے مسئلہ کی وضاحت کرتا ہے۔ ایک شخص جس کا تعلق حقیقی دنیا کے ساتھ واجبی سا ہے، نقشہ پر نظر ڈالتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس کے سامنے کئی شارٹ کٹ

ہیں۔ ڈاکہ دولت کا شارٹ کٹ ہے، ریپ جنسی تسکین کا شارٹ کٹ ہے، تشدد اپنی مرضی پوری کرنے کا شارٹ کٹ ہے۔ بے شک ان میں سے ہر شارٹ کٹ میں خرابی ہے مگر حقیقی دنیا میں ان کا سامنا کیے بغیر وہ اس خرابی سے بے خبر رہتا ہے۔ چنانچہ جرم انسان کے سب سے بڑے ارتقائی کارنامہ، اس کی نقشے بنانے کی اہلیت کا حاصل ہے۔قسمت سے یہ کوئی دائمی ہزیمت یا مستقل صورت حال نہیں۔ یہ ایک حقیقی دنیا اور ایک غیر حقیقی نقشہ میں انتخاب کا مسئلہ بھی نہیں۔ سچ ہے کہ شہر کا پرانا باشندہ شہر کو کسی نقشہ نویس سے کئی درجہ بہتر جانتا ہے۔لیکن اگر نقشہ نویس شہر کو جاننے پر تل جائے تو وہ شہر کے قدیم ترین باشندے کی نسبت شہر کو بہت جلدی جان لیتا ہے۔اپنے نقشہ کی مدد سے وہ شہر کو برسوں کے بجائے ہفتوں میں جان سکتا ہے۔ نقشے بنانے کی صلاحیت، اپنا دماغ استعمال کرنے کی اہلیت سے انسان کو حقیقت پر برتری حاصل کرنے کی جو قوت حاصل ہوتی ہے، ہزیمتیں اور پسپائیاں اس کے سامنے بے حقیقت ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم جرم کی تاریخ کے اہم حصہ ''تخلیق اور تہذیب'' کی طرف متوجہ ہوں آیئے ان نکات پر ایک نظر ڈال لیں جن پر اب تک بحث ہو چکی ہے۔

لاکھوں برس پہلے اپنی آمد کے ساتھ ہی انسان نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ زمین پر قدم رکھنے والی سب سے افضل مخلوق ہے۔ روز اوّل ہی سے زندہ رہنے کے لیے انسان کو صرف اپنی ذہانت پر بھروسا کرنا پڑا۔ مگر پھر بھی ارتقا کا عمل راما پتھیکس سے آسٹرالو پتھیکس اور ہومو اریکٹس تک ایک بڑے اور پیچ وخم کھاتے ہوئے دریا کی طرح تھا۔ انسان نے اس لیے ترقی کی کہ اس نے ہتھیاروں اور آلات سے کام لینا سیکھ لیا تھا۔ مگر ترقی کی رفتار تیز نہ ہو سکی کیونکہ اس نے ابھی تک ترقی کے سب سے بڑے ذریعہ، اپنے دماغ سے کام لینا نہیں سیکھا تھا۔

ہومو اریکٹس کے ساتھ دریا ایک وادی میں داخل ہوا اور ایک تیز رفتار ندی بن گیا۔

اور پندرہ لاکھ برس بعد ارضیاتی وقت کے مطابق ہمیں بیسویں صدی کے تقریباً قریب لے آتا ہے۔ نینڈرتھال اور کرومیگن انسان آیا اور دریا گویا کہ گھاٹی میں اچانک داخل ہو کر تند و تیز دھارا بن گیا۔ زراعت کے شروع ہونے سے رفتار میں ایک بار اور تیزی آئی مگر شہر بسنے سے گھاٹی مزید تنگ ہو گئی اور تیزی خطرہ بن گئی۔

یہ ناممکن ہو گیا کہ اب ارتقا کا سفر تیز ہو سکے۔ مگر Mycenae اور قدیم Crete کی تہذیبوں اور شہر آباد کرنے کے درمیان کسی عرصہ میں یہ تیزی آ کر رہی اور منہ زور تیزی

نے انسان میں مزاحمت اور خطرہ کا ایک نیا احساس بیدار کر دیا۔ پوری رفتار سے تنگ دیواروں میں سے گزرتے ہوئے پانی سے انسانی جسم لڑتے رہے۔ مگر ڈوبتے انسانوں کی چیخ و پکار پانی کے شور میں دب گئی۔ جو شخص تختہ پر سوار، پانی کی طوفان خیز لہروں سے زندگی اور موت کی جنگ پوری طاقت سے لڑ رہا ہو اس کے پاس کسی سے ہمدردی کا وقت نہیں ہوتا۔

جب انسان کے عزم وارادہ میں اضافہ ہوا تو اس کی سنگدلی بھی بڑھ گئی۔ تنگ نظری اور تنگ دلی اس کی عادت بن گئی۔ جب بھی اسے طغیانیوں سے محفوظ کوئی گوشہ امن ملا تو سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا کیا کرے اور اس سے کیونکر لطف اندوز ہو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کیوں پرامن سبزی خور نہیں رہا، جیسا کہ لیکی اور فروم نے بیان کیا ہے۔ مگر کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان جانوروں کو قابل رشک سمجھے جو اب بھی دریاؤں میں بے حقیقت تنکوں کی طرح بہہ رہے ہیں۔ کیونکہ اس نے وہ صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لی ہے جو ہر خطرہ، ہر مصیبت اور تشدد پر بھاری ہے۔ جب اس نے دماغ سے کام لینا سیکھ لیا تو رہنمائی کی اس اہلیت نے اسے پہلی دفعہ ایک ایسی مخلوق بنا دیا جو صحیح معنوں میں تخلیقی اور ایجاد پیشہ ہے۔ اس نے اپنی تمام طاقت ریسرچ اور انکشافات میں صرف کی ہے مگر طاقت کا معاملہ یہ ہے کہ جب کبھی اس کا راستہ روکا گیا یا جب کبھی ضبط نفس کے نہ ہونے کی وجہ سے انسان اسے کنٹرول نہ کر سکا تو انتشار اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ جرم تخلیق کا منفی پہلو ہے۔

تمام تاریخ میں سینا چیرب سے لے کر ہٹلر تک تمام ظالموں نے خود اپنے آپ کو تباہ کیا ہے۔ اپنی پر تشدد ذہنیت کی وجہ سے وہ برے رہنما ثابت ہوئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے جرائم انسانی تاریخ پر چھائے ہوئے ہیں مگر جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ اچھے رہنماؤں نے ہی بنی نوع انسان کی کہانی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

دوسرا حصہ

تاریخ کی مجرمانہ آؤٹ لائن

قزاق اور مہم جُو

جب ہم جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کی شکایت کرتے ہیں تو ایسے شہریوں کی طرح بات کرتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ قانون کی حفاظت میں ہیں۔

اگر ہم پچھلے تین ہزار سال کی تاریخ سمجھنا چاہیں تو ہمیں اپنے تخیل سے مدد لینی پڑے گی۔ اور یہ قانون کی ''حفاظت'' کی خوش فہمی سے نجات حاصل کرنا ہو گی۔ قدیم یونان میں مسئلہ صرف ان لیٹروں کا نہیں تھا جو سڑکوں پر خطرہ بنے ہوئے تھے نہ محض ان قزاقوں کا معاملہ تھا جو سمندروں میں منڈلاتے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی عام شہری جب جی چاہے لٹیرا یا بحری قزاق بن جاتا تھا۔ اور یہ بات خلاف معمول نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اوڈیسی میں یولیسس بڑے فخر سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح ٹرائے سے واپس آتے ہوئے اس کا جہاز تھریس کے ساحل پر جا رکا اور وہ ایک ایسے شہر کے قریب جہاز سے اترے جس شہر کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ انہوں نے تمام مردوں کو قتل کیا اور سامان کے ساتھ عورتوں کو بھی اٹھا کر لے آئے۔ تھریس کے ساتھ یونان کی جنگ نہیں تھی۔ بس ایک وہ غیر محفوظ شہر تھا جس کا کوئی دفاعی حصار نہیں تھا اور جو کسی کی بھی ہوس رانی کا شکار ہو سکتا تھا۔ جنگ میں تھکے ہوئے یونانیوں نے اک ذرا آرام کے لیے اسے ریپ کرنا ضروری سمجھا۔ یہ صورت حال آنے والے تین سو برس تک موجود رہی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں بحیرۂ روم کے کئی شہر اور گاؤں سرحدوں اور ساحلوں سے دور، ملک کے اندر بسائے گئے۔

ایک اور بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انگلستان جیسے قانون کا احترام کرنے والے ملک میں بھی یہی صورت حال تھی۔ ''بلیک ڈیتھ'' (طاعون کی وبا) کے وقت سے ذرا پہلے (جیسا کہ لیوک اوون نے اپنی کتاب ''ہسٹری آف کرائم ان انگلینڈ'' 1873ء میں بتایا ہے) ''گھروں

کو روز بروز آگ لگا دی جاتی تھی۔ مردوں عورتوں کو یرغمال بنا کر ان سے تاوان کی رقم وصول کی جاتی، تاوان دے کر بھی اگر کوئی فرد کسی خوفناک انجام سے بچ جاتا تو اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کرتا اور اس کا تعلق جنگ کے دَور یا سماجی انتشار کے دنوں سے نہیں۔ جے ایف نکلس اور جان ٹیلر کے مطابق انگلستان انتہائی خوشحال اور دولت مند تھا۔ پھر بھی لٹیروں کے گروہ، چھوٹی فوج کی طرح تھے۔ وہ اکثر شہر کے میلوں ٹھیلوں پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑتے جہاں ہر شخص خود کو محفوظ سمجھتا تھا۔ وہ شہر پر قبضہ کر لیتے اور گھروں کو لوٹ کر انہیں آگ لگا دیتے۔ (کیونکہ شہری ان کا مقابلہ منظم ہو کر کرنے کی بجائے انہیں من مانی کرنے دیتے تھے)1347-48ء میں برسٹل پر ایک لٹیرے نے قبضہ کر لیا جو بندرگاہ پر لنگر انداز جہازوں کو لوٹتا تھا، جن میں بادشاہ کے حکم پر بننے والے جہاز بھی شامل ہوتے تھے۔ وہ ایک فاتح کی طرح اپنے احکام جاری کیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھی شہر میں جہاں چاہتے تھے اور جسے چاہتے لوٹتے اور قتل کرتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ کو تھامس اور لارڈ برکلے کو امن قائم کرنے کے لیے بھیجنا پڑا۔ جب ایک تاجر کے متعلق پتہ چلا کہ اس کے پاس ملکہ فلپا کے ہیرے ہیں تو ڈاکوؤں کے ایک گینگ نے اس کا گھیراؤ کر لیا، جب اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی تو اسے ہیرے ڈاکوؤں کو حوالے کرنا پڑے۔ عدالتیں بے بس تھیں۔ جب ایک بدنام لٹیرے کو ونچسٹر کے قریب ایک عدالت میں پیش کیا گیا تو غنڈوں کا گینگ عدالت کے باہر منتظر رہا اور عدالت سے آنے والے ہر شخص پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں مقدمہ منسوخ کر دیا گیا۔

چار صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہی حال تھا۔ ڈاکٹر جانسن کے زمانہ میں لیٹروں کے گینگ رات کو گھروں پر حملہ آور ہوتے اور بعض اوقات انہیں جلا بھی دیتے۔ لندن کے Corvent Garden میں چاقوؤں سے مسلح گینگ خوشحال گھرانوں کی پارٹیوں پر حملہ کر دیتے اور ہورلیس والپول کو ہائیڈ پارک میں ایک ڈاکو نے گولی مار دی۔ کسانوں کی فصلیں ان کے کھیتوں سے مسلسل لوٹی جاتی تھیں۔ سبزیاں اور پھل بھی ڈاکو لے جاتے تھے۔ یہاں تک گیہوں کے خوشے بھی دن دیہاڑے ان کی ٹہنیوں سے کاٹ لیے جاتے۔ ڈاکو بڑی دلیری سے لوٹ کا اناج مل مالکوں کے پاس لے جاتے تاکہ وہ اسے پسوا دیں اور ہر چند کہ مل مالکان کو معلوم ہوتا کہ ڈاکو چوری کا اناج پسوانے لائے ہیں مگر وہ انکار نہ کرتے کہ کہیں ان کی ملوں کو آگ نہ لگا دی جائے۔ اس صورت حال کا ذکر میجر آرتھر گرفتھ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور کیلو چینرنی کے مطابق ملکہ وکٹوریا کے لندن میں ڈاکو دن دیہاڑے راہ گیروں کو لوٹتے

اور بعض اوقات متمول علاقوں کو اپنی سرگرمیوں کا میدان بنا لیتے۔ بچے بھی محفوظ نہیں تھے۔ زیادہ تر عورتیں انہیں بہلا کر ایک طرف لے جاتیں اور ان کے کپڑے چرا لیتیں۔

ہمیں یہ بات حیران کرتی ہے کہ اوپر سے نیچے تک تمام سوسائٹی ایسے اصولوں پر عمل کرتی رہی ہے جو مغربی دنیا کے نئے شہری کی نظر میں انتہائی ظالمانہ ہو سکتے تھے۔ بچوں اور حیوانوں کے لیے ہمارا موجودہ تردّد کسی وکٹورین کی رائے میں مضحکہ خیز ہوتا۔ جبکہ ڈاکٹر جانسن اسے خطرناک جذباتیت کہہ کر رد کر دیتا۔ بوسویل اپنی کتاب 'Life of Johnson' میں کہتا ہے کہ ''جب 1780ء میں Tyburn سے جان چھڑانے کی بات ہو رہی تھی جہاں سزائیں عام لوگوں کے لیے چھٹیاں بن گئی تھیں اور بچوں کو چوری کے الزام میں پھانسی دے دی جاتی تھی جانسن نے بیزاری سے کہا 'سزائیں اور پھانسیاں تماشائی جمع کرنے کے لیے دی جاتی ہیں، اگر تماشائی نہ آئیں تو سزاؤں کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔'' اس دَور کے متعلق لکھتے ہوئے جرم وسزا کا ایک انگریز مؤرخ کہتا ہے:

> ''شرابی ماں باپ اور نرسیں بچوں کو بھوکا رکھتے، انہیں جیب کتروں کے پاس بھیج دیا جاتا، انہیں طوائفیں بننے پر مجبور کیا جاتا جبکہ کئی لڑکیاں بارہ برس کی ہوتیں۔ جنسی بیماریاں انہیں چاٹ لیتیں۔ انہیں بھیک مانگنے پر بھی مجبور کیا جاتا۔ اس مقصد کے لیے انہیں معذور اور اپاہج بنا دیا جاتا تاکہ دیکھنے والوں کو ان پر رحم آئے مگر شاید ہی ان پر کبھی رحم آتا ہو، رحم اب تک ایک بیش قیمت اور غیر معمولی جذبہ تھا۔ بے باپ کے بچے سڑکوں پر مرنے کے لیے چھوڑ دیئے جاتے یا کوڑے کے ڈھیروں پر اور نالیوں میں پھینک دیے جاتے۔ جانوروں کو آپس میں لڑانا اور انہیں ٹارچر کرنا محبوب مشغلہ تھا۔''

اور صرف جانور ہی نہیں تھے کہ جن کی جان عذاب میں تھی۔ انگلینڈ کے دل میں غیر ملکیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اکثر ان کا مذاق اڑایا جاتا، ان پر کیچڑ اور پتھر پھینکے جاتے۔ ایک پرتگالی کا کسی انگریزی ملاح سے جھگڑا ہو گیا تو اس کے کان کیل سے دیوار میں ٹھونک دیئے گئے۔ جب اس نے کان بڑی اذیت کے ساتھ دیوار سے چھڑا لیے تو ہجوم نے اسے چاقوؤں سے زخمی کر کے مار ڈالا۔ سٹاکس (لکڑی کے فریم) میں قید مجرموں کو اکثر پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا مگر یہ درندگی نچلے طبقوں تک محدود نہیں تھی۔

Mohocks نامی ایک سوسائٹی کا مقصد ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کو اذیت دینا تھا۔ اس کے اکثر اراکین امیر زادے تھے، جن کی فرصت کے اوقات ایذا رسانی کے لیے

وقف تھے۔ وہ عمر رسیدہ عورتوں اور طوائفوں کو تار کول کے بیرل میں سر کے بل کھڑا کرتے تا کہ ان کی ٹانگوں میں تلواریں چبھو سکیں۔ ان کی آنکھیں نکال کر اور ناک کاٹ کر ان کی صورتیں بگاڑ دیتے۔ اپنا یہ خوف ناک کھیل کھیلنے سے پہلے وہ خوب شراب پیتے تا کہ نشہ میں دھت ہو جائیں اور آدمیت کا شائبہ بھی ان کے قریب نہ پھٹکے۔ کئی Mohock ایک اور اذیت پسند جماعت Bold Bucks کے رکن بھی تھے۔ Bold Bucks کے ہر ممبر کے لیے خدا کے وجود سے انکار لازمی تھا اور ایک خاص ڈش کھانی بھی ضروری تھی۔ Bold Bucks کے کالے کرتوتوں کا تعلق سیکس سے تھا۔ ریپ کی سزا ملنی ناممکن تھی، کیونکہ رضامندی کی عمر بارہ برس تھی اور اسی لیے وہ کھل کر دیدہ دلیری سے کیا جاتا تھا۔ 1875ء میں رضامندی کی عمر بڑھا کر تیرہ برس کر دی گئی۔ اس سے پچاس برس پہلے بچوں کو بھی پھانسی دی جاتی تھی اور انہیں جمع کر کے نوآبادیوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ (بلکہ ایسے بچوں کے لیے ایک جیل جہاز Prison Ship بھی تھا جو 1844ء تک اس مقصد کے لیے استعمال ہوتا رہا تھا)، 1801 میں ایک بچے کو چمچہ چرانے کی وجہ سے پھانسی دی گئی۔ 1808ء میں آٹھ اور بارہ برس کی دو بہنوں کو Lynn میں پھانسی دی گئی۔ 1831ء میں تیرہ برس کے ایک لڑکے کو ایک مکان کو آگ لگانے کے الزام میں پھانسی دی گئی۔ 1833ء میں نو برس کے ایک لڑکے کو سزائے موت دی گئی (مگر بعد میں اسے معافی مل گئی) اس نے کسی دکان سے دو چار پاؤنڈ مالیت کے رنگ چرا لیے تھے۔ بے گھر بچے آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیے جاتے۔ ٹوبیاس نے انسپکٹر جیل کی ایک رپورٹ برائے 1836ء کا حوالہ دیا ہے جس میں بچوں کے سیکشن کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ چوبیس بچوں میں سے سات نے اپنے مالکوں کو لوٹا ہے، ایک نے اپنے باپ اور دوسرے نے خالہ کی چوری کی ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں لوگوں کا ضمیر بیدار ہونا شروع ہوا۔ اس کی بڑی وجہ ڈکنز اور وکٹر ہیوگو کے ناول تھے۔ دلچسپ بات ہے کہ اس تمام تبدیلی کے لیے صرف لوگوں کے تخیل سے مخاطب ہونا تھا۔ سرعام سزاؤں کے خاتمہ پر ڈاکٹر جانسن کا حوالہ دینے سے پہلے بوسویل کا کہنا ہے ''اس کا احساس ایسا شدید تھا اور وہ دردناک شاعری سے اتنا متاثر ہوتا تھا کہ جب وہ ڈاکٹر بیٹی کی 'Hermit' میری موجودگی میں پڑھ رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سرعام سزاؤں کے متعلق ایک نظم شاید Tyburn کے متعلق ڈاکٹر جانسن کی رائے بدل دیتی۔

جب 1862ء میں Sioux انڈین قبیلہ نے لوٹ مار کی کیونکہ ان کی زمین کے سلسلہ میں ان کے ساتھ دغابازی کی گئی تھی تو اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بچوں کی مظلومیت نمایاں کی گئی۔

"اس واقعہ کا ہیرو گیارہ سال کا لڑکا مارٹن تھا، جو اپنے پندرہ مہینہ کے بھائی کو پیٹھ پر لاد کر پچاس میل تک لے گیا مگر اس کے بعد سردی، تھکاوٹ اور بھوک کی وجہ سے مر گیا۔ مسٹر ایسٹلک مارا جا چکا تھا جبکہ اس کی بیوی گولی لگ جانے کی وجہ سے زخمی اور بے بس پڑی تھی۔ اس کے دو چھوٹے بیٹے فریڈرک اور فرینک اس کے پاس تھے۔ دو حملہ آوروں نے انہیں دیکھ لیا اور ان کی ماں کے سامنے انہیں مار مار کر ہلاک کر دیا۔ کئی دوسرے بچوں کو بھی مارا پیٹا گیا اور پھر انہیں بھوک اور سردی سے مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔"

انتشار اور بدامنی کے نتیجہ میں امریکیوں نے طے کر لیا کہ انڈین قبائل کو ان کے گھروں اور زمینوں سے نکال دیا جائے اور عجائب گھروں میں ہانک کر، جو بچ گئے ہیں، انہیں وہاں کی زینت بنا دیا جائے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے مگر یہ ریڈ انڈین تھے جو تاریخ کی مار برداشت کر رہے تھے کیونکہ وہ وقت سے پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ اب بھی صدیوں پرانے انداز سے جی رہے تھے۔ وہ اب بھی ظلم کو بہادری سمجھتے تھے۔ جیسا کہ فرانس پارکمین نے لکھا ہے:

"دشمن کے ساتھ انتہائی سختی سے پیش آنا ان کی نظر میں بہادری کی روایت تھی۔ رحم بزدلانہ کمزوری تھی جس سے ان کا وقار مجروح ہوتا تھا۔ اس میں داد پانے کا شوق اور تضحیک کا خوف بھی شامل ہو گیا، جو رحم اور ہمدردی کے تمام جذبوں پر غالب آ گیا۔"

"ریپ آف نانکنگ" کی طرح ہم بہادروں کی روایتی ذہنیت کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس کا بنیادی نکتہ جان ڈوئیل انڈریو نے پارک مین پر اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے۔ "انڈین قبائل کے مظالم اس دور کے مہذب لوگوں کے خیالات و اعمال سے اتنے مختلف نہیں تھے جتنے کہ آج ہیں۔ ڈوئیل اس سے پہلے زمانہ کے انڈینز کی بات کر رہا ہے جن کے مظالم ان کے سفید فاتحین کے مظالم سے مختلف نہیں تھے۔ پارک مین ان انگریز آبادکاروں کے قتل کی بات کرتا ہے جو فرانسیسیوں کے تنخواہ دار تھے۔ ایک سو چار افراد (جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے) کو کلہاڑوں سے مارا گیا، گولیوں کا نشانہ بنایا گیا یا دوسرے اذیت ناک

طریقوں سے قتل کیا گیا۔ قتل و غارت کے ختم ہونے پر ایک پادری نے کہا کہ فرانسیسی انڈینز کو ملازمت دیتے تھے کیونکہ سفید فام سپاہیوں کے مقابلہ میں ان کی تنخواہیں کم ہوا کرتی تھیں۔ اور انہیں ان کے طریقوں پر اعتراض نہیں تھا۔ ایک فرانسیسی پادری نے بتایا کہ ''جو شخص ان کے سامنے آتا تھا وہ اسے قتل کر دیتے تھے۔ عورتوں کو برا بھلا کہنے کے بعد انہیں جلا دیتے تھے'' پارک مین بھی کہتا ہے کہ فرانسیسی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ انہیں ٹارچر کریں گے اور زندہ جلا دیں گے قیدیوں کو انڈینز کے حوالے کر دیتے تھے۔

مگر یہ مینے سوٹا میں Sioux بغاوت سے ایک صدی پہلے کی بات ہے اور انگریز بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ انہی ظالمانہ طریقوں سے پیش آتے تھے۔ انگلستان کی الزبتھ اوّل کے زمانہ سے سپین کے ساتھ وقتاً فوقتاً جنگ رہتی تھی اور حکومت قزاقوں کی حوصلہ افزائی کرتی تھی کہ سپین کے جہازوں پر حملے کریں اور انہیں لوٹیں اور ایسے جہاز پر سوار کسی بھی شخص کا قتل ہونا کوئی خلاف معمول بات نہیں تھی۔ خود انگلستان میں ساحلی بستیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی کہ وہ غیر ملکی جہازوں کو جھوٹی روشنیاں دکھا کر پہاڑیوں پر لے جائیں تاکہ وہ ان سے ٹکرا کر برباد ہو جائیں۔ 'In Roots of Evil' کے چالیسویں صفحہ پر ایک شکستہ جہاز کے کپتان کی کہانی ہے جو جدوجہد کرتا چیشائر کے ساحل پر پہنچا مگر اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے ننگا کر دیا گیا۔ دیہاتیوں نے اس کی انگوٹھیاں لینے کے لیے اس کی انگلیاں کاٹ دیں اور ایک ملاح کی بالیاں لینے کی خاطر اس کے کان دانتوں سے کاٹ لیے۔ چونکہ حملہ آور برطانوی یا غیر برطانوی جہاز میں تمیز نہیں کرتے تھے اس لیے آخر کار 1753ء میں اسے سخت جرم قرار دیا گیا۔

کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ ہم جان سکیں کہ قزاقی اور ڈاکہ زنی کب یورپ میں عام ہوئی۔ مگر یہ غالباً تیسرے ہزاریہ قبل از مسیح کے آخر کا زمانہ تھا جو غالباً سارگن کے عقاد کا قریبی زمانہ بھی تھا۔ (2350 قبل مسیح) پہلے چار دیواری والے شہروں کا آغاز Saragon سے چھ سو سال پہلے ہوا جس کا مطلب ہے کہ جنگ گریز کے بجائے اصول بن رہی تھی۔ Gordon Childe اپنی تصنیف 'What Happened in History (p. 154)' میں کہتا ہے کہ اس دور کی قبروں سے دھات کے کئی ہتھیار برآمد ہوئے۔ قبریں ایجین جزائر میں تھیں۔ اس لیے شک ہوتا ہے کہ ان جزائر کے مکینوں نے اپنی آمدنی میں لوٹ کے مال کا اضافہ کرتے ہوئے قزاقی میں پرامن تجارت کو شامل کر لیا۔ بحیرہ روم میں یہ عمل بعد کے کئی

ادوار تک جاری رہا۔ سارگن کی بڑی جنگوں سے اس سارے علاقہ کا نظام تہ و بالا ہو گیا ہو گا اور قزاقی و تشدد اور ڈاکہ زنی کے نشان باقی رہ گئے ہوں گے۔ جب چھوٹے شہر اور قبائل ایک بڑی سلطنت میں ڈھل گئے تو شناخت کا سوال پیدا ہوا، جس سے خود غرضی اور بے رحمی میں اضافہ ہوا۔ بدنصیب دیہی آبادی سے زندہ رہنے کے لیے جو ہوسکتا ہے وہ کرتی ہے۔ اور جب بادشاہ شہروں کو تباہ کرتے ہیں تو ان کے سپاہیوں کو لوٹنے اور ریپ کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ ایسے میں بعض افراد روزی کمانے کے زیادہ پرتشدد طریقے سوچتے ہیں۔ امالودین کہتا ہے، ''اس وقت مہذب دنیا کے دور دراز علاقوں میں وسیع رابطے اس خواہش کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان کو میسر دولت سے اپنا حصہ حاصل کیا جائے اور اس میں کوئی رکاوٹ ہو تو اس کا مقابلہ کیا جائے۔''

بدقسمتی سے ہم بحیرہ روم میں قزاقی اور ڈاکہ زنی کے آغاز کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ توسی ڈائڈس یونانی مؤرخ پانچویں صدی قبل مسیح کے آخر میں لکھتا ہے کہ ایک ہزار سال سے بھی پہلے معاملہ کی کیا صورت تھی۔

> ''قدیم زمانہ میں ساحلوں اور جزیروں کے رہنے والے یونانیوں اور وحشیوں کا سمندر کے ذریعہ آپس میں میل جول بڑھا تو انہوں نے قزاقی کا ارادہ کیا۔ وہ بڑے طاقت ور سرداروں کے ماتحت تھے جنہوں نے دولت حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا، اسی کے ذریعہ وہ اپنے غریبوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ وہ بے در و دیوار قصبوں اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے دیہات پر ٹوٹ پڑتے، انہیں لوٹتے اور اسی لوٹ پر گزارہ کرتے کیونکہ اس وقت تک یہ پیشہ قابل عزت سمجھا جاتا تھا۔ آج بھی اس پیشہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی دولت پر فخر کیا جاتا ہے۔ یہ بات مین لینڈ کے بعض قبائل کے عمل اور قدیم شاعروں کے شعروں سے ثابت ہوتی ہے، جن کے کلام میں سفر سے نئے واپس آنے والوں کے متعلق سوال کیے جاتے ہیں، ان کا انتظار ہوتا ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ بحری قزاق ہیں یا نہیں۔ سمندر کے علاوہ زمین بھی لٹیروں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ اب بھی ہیلیاس کے بعض حصوں میں ان کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ ان قبائل میں ہتھیار باندھنے کا فیشن ان کی قدیم راہزنی کی عادات کی یادگار ہے۔ قدیم زمانہ میں تمام یونانی ہتھیار باندھتے تھے کیونکہ ان کے گھر غیر محفوظ اور بے در و دیوار ہوا کرتے تھے۔''

اس نے اس زمانہ کا ذکر کیا ہے جب مقامی سردار سمندر میں گھومتے ہوئے بے در و

دیوار دیہات کو لوٹتے اور ان کے بعض افراد کو غلام بنا کر لے جاتے۔ قزاقی قابل عزت تھی کیونکہ اسے جنگ کا درجہ دیا جاتا تھا اور اس میں بلا امتیاز قتل اور ظلم روا رکھنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ورنہ قزاقی نہ برداشت کی جاتی اور نہ ہی اسے قابل عزت سمجھا جاتا۔ یہ لوگ سادہ، صاف گو اور تشدد پسند بھی تھے۔ مگر اذیت پسند نہیں تھے۔ توسی ڈائڈس ایتھنز کی حفاظت کے خیال سے انہیں ''وحشی'' کہتے ہوئے انیسویں صدی کا کوئی نیویارکر لگتا ہے جو ''وحشی مغرب'' (امریکا کا مغربی علاقہ) کی بات کرتا ہو۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کریٹ کے بادشاہ مائنوس نے بحیرہ روم کا اکثر علاقہ فتح کیا تھا اور اسی نے قزاقوں کو وہاں سے نکالا تھا۔ یہ مائنوس وہی بادشاہ تھا جس کے متعلق خیال تھا کہ بھول بھلیاں اسی نے تعمیر کیا تھا اور جس کی بیوی ایک بیل کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی جس سے پنوٹار پیدا ہوا۔ چونکہ مائنوس زیس دیوتا اور یوروپا کا بیٹا سمجھا جاتا ہے اس لیے انیسویں صدی کے مؤرخ اسے محض ایک متھ سمجھتے ہیں۔ مگر 1900ء میں آرتھر ایونز نامی ایک انگریز نے کریٹ میں **Knossos** کے مقام پر کھدائی شروع کی تو ایک بہت بڑے محل کی دیواریں ظاہر ہونے لگیں۔ اس کی دیواروں کے سائز اور اس کی بیش قیمت زیبائشوں سے واضح ہو گیا کہ یہ عظیم محل کسی عظیم تہذیب کی یادگار ہے۔ مگر حیرانی کی بات ہے کہ سمندر سے قریب ہونے کے باوجود اس کا کوئی دفاعی حصار نہیں تھا، حفاظتی دیواریں نہیں تھیں۔ جس کا مطلب ہے کہ اس کے مکین قزاقوں سے بالکل خوف زدہ نہیں تھے؟ ایک بہت بڑے بحری بیڑے کے کھنڈروں نے یہ الجھن سلجھا دی۔ کریٹ کو قزاقوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ محل کے کمرے اور راستے اتنے کنفیوز کرنے والے تھے کہ ایونز کو شک ہونے لگا کہ شاید اس نے بھول بھلیاں لیجنڈ کا اصل دریافت کر لیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کریٹ اور مائنوس والوں کے ذہنوں پر بیل چھائے ہوئے تھے۔ دیواروں کی تصویروں میں لڑکے اور لڑکیاں بیل پر سوار دکھائے گئے تھے اور محل کی چھت پر سینگوں کی مانند دو مڑے ہوئے پتھر لگائے گئے تھے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ بادشاہ مائنوس کا وجود تھا۔

اور یہ کہ لیجنڈ کی بنیاد حقیقت پر ہوتی ہے۔ مائنوس کے متعلق یونانی مؤرخ پلوٹارک ہمیں زیادہ بتا سکتا ہے کہ مائنوس کا بیٹا یونانیوں کے ہاتھوں کیسے قتل ہوا، اور ایک شدید جنگ کے بعد مائنوس ہر نو سال بعد سات لڑکوں اور سات کنواریوں کا خراج لینے پر راضی ہوا۔ یہ **Minotaur** کی بھینٹ چڑھائے جاتے تھے۔ جو بھول بھلیاں میں رہتا تھا۔ ہیرو **Theseus** ایتھنز کے بادشاہ کا بیٹا کریٹ جاتا ہے اور **Minotaur** کو قتل کر دیتا ہے۔

ایونز کا کہنا ہے کہ یونانی یرغمالی غالباً بیل دیوتا پر قربان کیے جاتے تھے۔ یا گلیڈ یئٹروں کی طرح بیلوں سے لڑائے جاتے تھے۔ اسی ہیرو Theseus نے اپنے ابتدائی برسوں میں ایتھنز کے آس پاس کی سڑکوں کو مجرموں سے پاک کیا تھا کیونکہ اس وقت سڑک کے ذریعہ ایتھنز جانا نہایت خطرناک تھا۔ کوئی علاقہ ڈاکوؤں اور قاتلوں سے محفوظ نہیں تھا۔ ان میں ظلم اور ہوس میں اندھی Phea نام کی ایک عورت بھی ڈاکو تھی، تاریخ کی پہلی کریمنل عورت، اس کی گندی زندگی اور عادتوں کی وجہ سے اسے سورنی کا نام دیا گیا تھا۔ Theseus نے Scion نامی ایک اور ڈاکو کو بھی قتل کیا تھا جو لوگوں سے اپنے پاؤں دھلواتا تھا اور پھر لات مار کر انہیں اُس چٹان سے سمندر میں گرا دیتا، جس کا نام اس کے نام پر تھا۔ پلوٹارک نے مائنوس کے زمانہ کے ایک اور اساطیری ہیرو 'جیسن' کا ذکر کیا ہے جسے سمندروں کو قزاقوں سے پاک کرنے کا کام دیا گیا تھا۔ ہر چند کہ ایسی کوئی صورت نہیں کہ ہم حقیقت کو افسانہ سے الگ کر سکیں، اس کے باوجود 1600 قبل مسیح کے آس پاس مائنوس نامی بادشاہ کا ہونا صاف ظاہر ہے۔ اور یہ کہ اس وقت تک قزاقی اور ڈاکہ زنی بحیرہ روم میں عام تھی۔ ناسس خود 1380 قبل مسیح کے آس پاس حملہ آوروں اور قزاقوں کے ہاتھوں تاراج ہوا۔ ان دنوں زندہ رہنا بہت مشکل تھا، وہی زندہ رہے جو مجبوراً سفاک اور بے رحم بنے۔

خیال رہے شروع کے قزاق چور اچکے نہیں تھے۔ وہ ان سے مختلف تھے جو بعد میں بحیرۂ روم فتح کرنے آئے تھے۔ پہلے قزاق اپنے آپ کو بہادر سمجھتے تھے۔ اتنا ہے کہ وہ بآسانی دولت مند بننا چاہتے تھے۔ تہذیب پھیل رہی تھی۔ بحیرۂ روم خوشحال، اور زیادہ خوشحال ہو رہا تھا۔ قزاقوں کی سمجھ میں کوئی وجہ نہ آئی کہ وہ اس دم بہ دم بڑھتی ہوئی بے شمار دولت میں سے اپنا حصہ کیوں نہ لیں، چاہے وہ اوروں کی ملکیت ہو۔ بحیرہ روم میں وہ دور معاشی ترقی اور معاشی سرگرمیوں کا دور تھا۔

ناسس کی شکست کے بعد اکاین نام کے لوگ کہیں شمال سے مائسینا آئے اور اپنے لیے قلعہ بنانا شروع کر دیا، وہ شمال سے کسی طرح یونان میں در آئے تھے۔ مائسینا کی دفاعی فصیلیں بڑے بڑے بھاری پتھروں سے بنائی گئیں۔ اتنے بھاری کہ مستقبل کے یونانی انہیں ہلانا دیوؤں کا کارنامہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اسے سائیکلوپین کہتے تھے۔ مائسینا بھی ناسس کی طرح خوشحال ہو گیا۔ اگامنن وہ بادشاہ جس نے ٹرائے پر حملہ میں یونانیوں کی قیادت کی مائسینا کا بادشاہ بنا۔ قریباً 1184 قبل مسیح میں ٹرائے کو شکست ہوئی اور مائسینا گھر واپس گیا

جہاں اس کی بیوی کلوٹمنس اور اس کے عاشق نے اسے قتل کر دیا۔ بہرحال اگاممنن کی بادشاہت زیادہ عرصہ قائم نہ رہی۔ ڈورین نام کے حملہ آور ڈینیوب سے آئے اور ایک اور بڑی تہذیب فنا ہوگئی۔

اگلے تین سو سال 'سیاہ دور' کے نام سے جانے جاتے ہیں وہ سیاہ دور نہیں جس میں وحشیوں کے نئے حملوں کا آغاز ہوا۔ جیسا کہ روم کے زوال کے بعد یورپ میں ہوا، بلکہ اس لیے سیاہ دور کہ تین سو سال پر پھیلے ہوئے اس زمانہ کی کوئی تاریخ نہیں۔ بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ مائنوس اور اکاین جیسی بڑی بادشاہتیں نہیں تھیں۔ چند چھوٹے ملک تھوڑے سے چھوٹے شہر اور چھوٹے قصبے تھے جن کے اردگرد دیواریں تھیں۔ کسان بھی ان چھوٹے شہروں کے قریب آ کر بس گئے تھے۔ سمندروں میں قزاقوں کی کثرت تھی، حالانکہ ایک عرصہ سے لوٹ مار کی آمدنی بہت کم ہو گئی تھی اور یہ قزاق اکلیس اور یولیسس کی طرح بہادر سردار نہیں تھے۔ بلکہ فاقہ مست بونے تھے۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں کے پاس دولت مند بننے کے مواقع نہیں ہوتے، اکثر لوگ نیم فاقہ کش تھے۔ گوشت صرف چھٹیوں میں ملتا تھا۔ باقی سال پھل تھے اور زیتون اور جو کے دلیے پر گزارہ تھا۔ مگر قزاق اس اناج پر عیش کرتے جو بے چارے غریب دیہات موسم سرما کے لیے جمع کر کے رکھتے تھے۔ ایک اور اہم مقصد ریپ تھا جیسا کہ این کے سینڈرس ایک قدیم دور کے متعلق لکھتا ہے۔ ''ہیرو کا سارا مقصد مال غنیمت ہے۔ چاندی، سونا، تانبا، گھوڑے، مویشی، بھیڑیں اور عورتیں، سب سے بڑھ کر خزانے اور عورتیں۔'' (The Sea People P.186) اور جب خزانے کم ہوئے تو پھر عورتیں اور زیادہ ریپ۔ چھوٹی کمیونٹی اخلاقی معاملات میں زیادہ حساس ہوتی ہے۔ اس کے افراد چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹیاں شادی سے پہلے تک دوشیزہ رہیں۔ لڑکوں کی بات دوسری ہے۔ چنانچہ ریپ قزاقی کا لازمی حصہ رہا۔ جب عورتیں ہاتھ لگ جاتیں تو انہیں غلاموں کی طرح بیچا بھی جاتا تھا۔ کیونکہ اس دور میں اور صدیوں تک آنے والے دور میں مہذب زندگی کی بنیاد غلامی پر تھی۔

ہومر کے بعد کا عہد، یقیناً جیمز کے دوہرے مغز، کی شکست کا زمانہ ہے اور چاہے ہم اس کی آمد شعور والی بات مانیں کہ نہ مانیں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑھتی ہوئی انفرادیت پسندی کا عہد تھا۔ عام طور سے اس کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ چھوٹے شہروں اور دیہات کے لوگ بادشاہوں اور سرداروں سے تنگ آ چکے تھے۔ اس لیے معتبر شہریوں کی کونسل کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر کونسل بھی چند امرا پر مشتمل ہوتی تھی اور یہ بات شہریوں کی

برداشت سے باہر تھی، جس سے شر پسندوں کو ارسٹوکریسی (امرا کی حکومت) کی مخالفت کا موقع مل گیا۔ انہوں نے چاقوؤں اور لاٹھیوں سے مسلح اپنے حامی اکٹھے کیے اور ڈکٹیٹر بن کر لوگوں پر مسلط ہو گئے۔ مگر یونانی انفرادیت پسند تھے، انہوں نے آخرکار آمروں سے نجات حاصل کی اور اس کا نتیجہ 'دنیا کی پہلی جمہوریت' کی صورت ظاہر ہوا۔

اس نظریہ کے مطابق انفرادیت پسندی ناسس اور مائناس جیسے بڑے شہروں کے نہ ہونے اور ان کی جگہ چھوٹے قصبوں اور گاؤں کے ہونے کا نتیجہ ہے۔ مگر قصبے اور دیہات 6000 قبل مسیح سے ہیں۔ انہوں نے بادشاہوں اور مذہبی رہنماؤں کی حکومت خوشی سے قبول کی تھی۔ یونان میں نئی انفرادیت پسندی ایک نئے شعور کا پیدا ہونا تھا۔ وہی شعور جس سے جلد ہی فلسفہ اور سائنس پیدا ہوئے۔ نہ ختم ہونے والی سختیوں اور خطرات میں سے زندہ بچ کر آنے والوں کی ایک نئی نسل پیدا ہوئی، چھوٹی خوف زدہ قومیتوں پر مشتمل جو باقی دنیا کو شک کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس کے عزم اور بیداری نے اسے لیفٹ بریز (بائیں مغز والی) بنا دیا تھا۔

سچ یہ ہے کہ آمروں کی حکمرانی نے یونانیوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔ آمر کا مطلب محض حکمران یا بادشاہ تھا۔ اس میں ظلم شامل نہیں تھا، مگر ہیروڈوٹس کہتا ہے:

> ''بہترین انسان کے پاس بھی طاقت ہو تو اس کے سوچنے کا انداز بدل جائے گا۔
> وہ اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر مغرور اور حاسد بن جاتا ہے اور یہ دو برائیاں اس
> پر ہر برائی کا دروازہ کھول دیتی ہیں۔''

ہم پہلے ہی الیگزینڈر آف پیری جیسے آمر کا سامنا کر چکے ہیں، جو لوگوں کو زندہ جلا دیتا تھا اور کتوں کے ذریعہ ان کا شکار کرتا تھا۔ ایک اور آمر ایکراگس (سسلی) اپنی اس گھناؤنی عادت کی وجہ سے بہت بدنام تھا کہ وہ اپنے ناپسندہ لوگوں کو تانبے کے بیل میں روسٹ کرتا تھا۔ اس کا پہلا شکار وہ کاری گر تھا جس نے تانبے کا بیل بنایا تھا۔ جب اس کا تختہ الٹ دیا گیا تو اس کا اپنا بھی یہی انجام ہوا۔

آمروں کے خلاف ہیروڈوٹس کی بداعتمادی کا اظہار اس بھیانک کہانی کی وجہ سے بھی ہوتا ہے جس کا تعلق میڈیا کے حکمران ایستیاگس (چھ سو سال قبل مسیح) سے ہے۔ ایک خواب کے ذریعہ یہ جان کر کہ اس کا پوتا اس سے تخت چھین لے گا ایستیاگس اپنے پوتے کو ہرپاگس نامی ایک ملازم کے حوالے کرتا ہے تاکہ وہ اسے قتل کر دے۔ اس بچے کا نام سائرس

تھا۔ بچے کو قتل کرنے کے خیال سے خوف زدہ ہو کر ملازم اسے ایک چرواہے کے سپرد کر دیتا ہے جس کا اپنا بچہ حال ہی میں فوت ہوا تھا۔

جب سائرس دس برس کا ہوا، وہ پہچانا گیا۔ اس کے ساتھ کھیلنے والوں نے اسے بادشاہ بنایا اور بادشاہ نے ایک درباری کے بچے کو اس لیے مارا کہ اس نے بادشاہ کا حکم نہیں مانا تھا۔ بات ایستیاگس تک پہنچی تو اس نے سائرس کو بلایا اور دیکھا کہ سائرس کی شکل اس کی شکل سے ملتی ہے۔ چرواہے سے پوچھ گچھ کی گئی تو اصل بات ظاہر ہو گئی۔ ہرپاگس کو کھانے پر بلایا گیا اور کہا گیا کہ اپنا تیرہ سالہ واحد بچہ محل بھیجے۔ لڑکے کو مار کر اس کے ٹکڑے کیے گئے جنہیں روسٹ کیا گیا۔ ہرپاگس کھانے کے لیے بیٹھا اور اپنے ہی بیٹے کو کھایا۔ کھانے کے بعد اسے ایک ٹوکری دی گئی جس میں اس کے بیٹے کی انگلیاں، پاؤں اور سر تھا۔

ہرپاگس کا ردِعمل آمریت کے خلاف جذبہ کو مزید تقویت دیتا ہے۔ وہ آمر کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ ''بادشاہ جو کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔'' اسے اس بدترین غلامی کی ایسی عادت ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے اس کے بیٹے کا گوشت کھلایا گیا ہے وہ اپنے جذبات ظاہر نہیں کرتا اور ایستیاگس کو اس اندھی غلامی پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ ہرپاگس کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔ یکا یک ہمیں اس فرق کا خیال آتا ہے جو اس ایرانی بادشاہ کو دو ہزار سال پہلے کے مصری اور عراقی بادشاہوں سے الگ کرتا ہے۔ بادشاہ جو خود کو دیوتاؤں کا غلام سمجھتے تھے اور جو دوسرے لوگوں کی طرح قانون کی حکمرانی کا احترام کرتے تھے، ضروری نہیں کہ ایستیاگس ایک ظالم شخص ہو، اس کی انانیت تھی جو نافرمانی کے خیال سے مجروح ہوئی اور اس نے ایک 'مناسب سزا' کسی اشتعال کے بغیر سوچی۔

اور ایک بار پھر ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس قسم کا ظلم 'منقسم شعور' کا نتیجہ ہوتا ہے، ایک ایسے شخص کا ظلم جو اکیلا کھڑا ہے اور جو دیوتاؤں کی آواز نہیں سنتا مگر اسی 'منقسم شعور' کی بدولت فیثا غورس، سقراط، افلاطون، ارسطو اور ایراتوستنیز جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ اسی 'منقسم شعور' نے دنیا کو جمہوریت جیسا سیاسی نظام دیا ہے۔ جس میں انسان اکیلا کھڑا ہوتا ہے۔ خداؤں کی رضا سے متحد نہیں ہوتا۔ مگر اسی جمہوریت نے سقراط پر خداؤں کی توہین کا الزام لگا کر اسے زہر کا پیالہ پینے کو دیا ہے۔ اپنی خامیاں ظاہر کی ہیں اور بتایا ہے کہ ایک ہزار چھوٹی انائیں مل کر بھی ایک چھوٹی انا بنتی ہے، بائیں مغز کا شعور انسان کو جنونی بنا دیتا ہے۔ جنون سے اندھاپن، تنگی ظلم اور حماقت تو پیدا ہوتی ہے، مگر یہ جنون سائنس اور فلسفہ کو بھی جنم دیتا ہے۔ انہی دو انتہاؤں

کا نام تاریخ ہے اور انسانی تہذیب کی کہانی، تخلیق اور جرم کی کہانی ہے۔
اس کتاب کا تعلق ویسے تو جرم سے ہے مگر ہم تخلیق کو نظر انداز کر دیں تو نہ صرف جرم کو سمجھنے میں ناکام ہوں گے بلکہ تاریخ کے شعور سے محروم ہو جائیں گے۔ وہ یونانی جنہوں نے کریٹ پر حملہ کیا اور مائسینا کی تعمیر کی ان میں مہم جوئی کی تڑپ بھی تھی وہ سمجھتے تھے کہ فتوحات کے بغیر زندگی ایک بوجھ ہے۔ اس ترنگ میں آ کر وہ دشمنوں کو قتل کرتے اور ان کی عورتوں کو ریپ کرتے تھے اور شہروں کو لوٹ کر برباد کر دیتے۔ یہ اتنے ظالم نہیں تھے جتنا کہ لڑکوں کی طرح قزاقی کا کھیل کھیلتے تھے مگر چار سو سال بعد جب ایک نابینا شاعر ہومر نے اس کے کارنامے گا کر سنائے تو ان کے سننے والے خود فراموش ہو کر ان کی داستانوں میں کھو گئے۔
دراصل وہ قدیم ہیروؤں سے زیادہ اڈونچر کی ان داستانوں سے لطف اندوز ہوتے تھے کیونکہ روزمرہ کے مسائل کا سامنا کرنے کی نسبت گزری ہوئی زندگی کو یاد کر کے خوش ہونا زیادہ آسان ہے۔ یہ گیتوں اور داستان گوئی کی محبت اس حد تک بڑھ گئی کہ ایتھنز کے پہلے بڑے آمر پسس ٹراٹس (528-561 قبل مسیح) کے دورِ حکومت میں ڈایونیسیس دیوتا کا میلہ موسیقی کے مقابلہ میں بدل گیا۔ ایک روز ایک گانے والے نے گیت کے مصرعوں سے اس طرح بیگانگی ظاہر کی گویا کہ کوئی اور نہیں وہ خود ان اساطیر کا ہیرو ہے۔ مگر جلد ہی اس کے سننے والے پیش کش کے اس انداز کو زیادہ ڈرامائی اور دلچسپ سمجھنے لگے۔ اس سے وہ اپنے آپ کو ٹرائے کی شکست، اگامیمنن کے قتل اور اوڈیپس کے المیہ میں شریک جاننے لگے۔ اس نئے انداز کے مصنف تھیسپس نے ڈراما کی ابتدا کی اور سو سال بعد ایک بہت بڑا تھیٹر (جس میں بارہ ہزار تماشائی سما سکتے تھے) بنایا گیا۔ ایکٹر اونچی ایڑیوں والے جوتے پہن کر چلتے تا کہ ان کا قد اونچا لگے اور لکڑی کے ماسک پہن کر بولتے کہ ان کی آواز دور تک جا سکے۔ ان اداکاروں نے ماضی کے عظیم ڈراما کو نئی زندگی دی۔ ہال میں خاموشی اس قدر مکمل ہوتی تھی کہ تماشائی ہر لفظ آسانی سے سن سکتے تھے۔ اس سنہرے دور کے اندر سائنس، شاعری اور فلسفہ نے بھی خوب ترقی کی۔ انسان حقیقت کی دنیا اور خیال کی دنیا میں بیک وقت رہتے ہوئے گرتے پڑتے آخرکار اپنی بے مثال اور ناقابل یقین دنیا تک پہنچ گیا۔ یہ ایسی بات تھی جو سپارٹا والوں کی سمجھ میں نہ آ سکی اور انہوں نے غلط راستہ اختیار کیا۔ سکندر اعظم کو دنیا کی تسخیر پر آمادہ اس کے تخیل نے کیا۔ سارگن اور مائناس کی طرح سیاسی حقیقت پسندی کی وجہ سے اس نے ایسا نہیں کیا، وہ پہلا ہیرو تھا جسے بطور ہیرو اپنے کردار کا شعور تھا، اس نے سٹیج پر فاتح کا کردار ایک ایکٹر کی طرح

ادا کیا۔

اب ایک لحاظ سے، اس دور کے قزاقوں اور ڈاکوؤں کا تعلق بدستور ٹرائے کی جنگ کے ابتدائی دَور سے تھا۔ خیال رہے کہ جرم ابھی اذیت پسندی کے دور میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اگر کسی قزاق یا ڈاکو کے مظالم قابل بیان ہوتے، کسی کو ان کا علم ہوتا تو کہیں لکھے جاتے۔ ان میں مبالغہ بھی ہوتا کیونکہ ہماری طرح ہمارے پیش روؤں کو بھی سنسنی خیز کہانیوں سے بڑا لگاؤ تھا اور ابھی ان کا جی خوف ناک کہانیوں سے بھرا نہیں تھا۔ 400 قبل مسیح میں سپارٹا کے ہاتھوں ایتھنز کی شکست کے بعد سمندروں میں قزاق اور سڑکوں پر ڈاکو واپس آ گئے تھے۔ اتنے برسوں کی جنگ کے بعد سڑکیں آوارہ اور بھٹکتے ہوئے سپاہیوں سے بھری ہوئی تھیں جنہیں لوٹ مار کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا تھا۔ (ان میں سے دس ہزار سپاہی سائرس اعظم کے ایک وارث سائرس نے اپنی فوج میں رکھ لیے تھے۔ جس سے ہماری ملاقات اس کے بچپن میں ہو چکی ہے اور جو قتل ہونے سے پہلے شان دار فتوحات حاصل کر چکا تھا۔ جنگ میں اس کے قتل کے بعد فوج لڑتی ہوئی سمندر کے راستے واپس ہوئی تو اسیریا والوں کے برباد شہروں اور ان کے کھنڈروں سے گزری جن کے نام بھی دنیا بھلا چکی تھی) اپنے ناول The Golden Ass میں اپولیس تین سو سال بعد لکھتے ہوئے ان ڈاکوؤں کا ذکر کرتا ہے جو ہیرو کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ (جو خچر بن چکا ہے) وہ تلواروں اور کلہاڑوں سے مسلح گھر کے صحن اور اس کمرے میں داخل ہوتے ہیں جہاں قیمتی سامان ہے، کسی کو قتل کیے بغیر وہ صرف سامان لوٹتے ہیں جتنا کہ لوٹ سکتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ کچھ سامان وہ ہیرو پر بھی لاد دیتے ہیں۔ اپنے ڈاکوؤں والے غار میں جا کر وہ گرم پانی سے نہاتے ہیں، کھانا کھانے لگتے ہیں جسے شراب میں نہا کر ایک بوڑھی عورت نے تیار کیا ہوتا ہے۔ ہنستے گاتے اور پھکڑ بازی کرتے ہیں۔

کھانے کے بعد ڈاکوؤں کا سردار ایک لمبی تقریر کرتا ہے جس میں اپنے گروہ کی بہادری ثابت کرتے ہوئے لوٹ کے مال کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ ان کے پہلے سردار نے ایک گھر کے دروازہ میں سوراخ کر کے اپنا ہاتھ اس میں سے اندر کر دیا تھا کہ ہینڈل تلاش کرے۔ مگر گھر کے مالک نے ہتھوڑا اور کیل لے کر اس کا ہاتھ دروازہ میں ٹھونک دیا جسے چھڑانے کے لیے زور لگاتے ہوئے کہنی تک اس کا بازو الگ ہو گیا۔ فرار ہوتے ہوئے وہ دوسروں سے پیچھے رہ گیا۔ چونکہ گرفتاری کی صورت میں اسے پھانسی کا خطرہ تھا، اس لیے اس نے اپنی تلوار سے خودکشی کر لی۔ اس کے ساتھیوں نے بڑے دکھ کے ساتھ اسے کپڑے میں

لپیٹا اور دریا میں بہا دیا۔

ایک اور ڈاکو ایک بڑھیا کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ بڑھیا کا گلا گھونٹنے کے بجائے وہ اس کا سامان اٹھا کر کھڑکی سے باہر نیچے اپنے ساتھیوں کی طرف پھینکنے لگا۔ آخر میں جب وہ بستر پھینکنے لگا تو بڑھیا نے جھانسا دیا کہ اس نے سارا سامان اپنے ہمسایوں کے گھر پھینک دیا ہے۔ اس کی تصدیق کرنے کے لیے ڈاکو نے جھک کر کھڑکی سے باہر جھانکا تو بڑھیا نے اسے دھکا دے کر کھڑکی سے باہر گرا دیا۔ نیچے پتھر پر گر کر ڈاکو کی پسلیاں ٹوٹ گئیں اور کھانس کھانس کے اس نے جان دے دی۔ باقی ڈاکو اس کا بدلہ لینے اوپر نہیں گئے بلکہ انہوں نے اسے بھی ڈاکوؤں کے سردار کی طرح دریا میں بہا دیا۔

پھر ڈاکوؤں نے ایک خوب صورت لڑکی کو پکڑا۔ ''ریپ کا کوئی خطرہ نہیں،'' وہ اس سے کہتے ہیں کہ ''تم بالکل محفوظ ہو مادام، تمہیں تکلیف دینے یا تم سے بدتمیزی کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' یہ سچ ہے کہ اپولس کے ڈاکوؤں کا انداز ڈرامائی ہوتا ہے مگر انہیں سفاکانہ حقیقت پسندی سے خوشی نہیں ہوتی اور یقین نہیں آتا کہ اس نے جان بوجھ کر تصویر میں رنگ آمیزی نہ کی ہو، ادھوری رہنے دی ہو۔

اپولس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکو اپنے آپ کو ایڈونچرر (مہم پسند) سمجھتے ہیں، اور بہترین زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ بوڑھی عورتوں کے گلے دباتے ہیں، گردنیں کاٹتے ہیں، ضرورت ہو تو ٹارچر بھی کرتے ہیں، مگر پکڑے جائیں تو پھانسی لگتے ہیں۔ دراصل اس دور میں قزاقی اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں ہمیں وحشی مغرب کی مسلسل یاد دلاتی ہیں۔ ان کی عزت میں کمی بیشی نہیں ہوئی، ویسی ہی ہے جیسی کہ ان کے پرانے بھلے وقتوں میں ہوا کرتی تھی۔ ایک مؤرخ لکھتا ہے۔

> ''جب سٹی سٹیٹ نے مزید طاقت حاصل کر لی تو اسے لٹیروں سے نمٹنے کا طریقہ بھی آ گیا۔ اس نے پہاڑوں میں ان کی کمین گاہوں کا پتہ چلا کر انہیں وہاں سے نکال دیا۔ یہ غار 'لائم سٹون غار' کہلاتے تھے اور یونان میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ بعض اوقات مخفی دشوار اور تنگ پہاڑی راستوں سے ہوتے ہوئے ڈاکو ان وسیع ہالوں میں چلے جاتے تھے جہاں پرانے زمانے کے ڈاکو رہتے تھے اور جنہوں نے وہاں قربان گاہیں بھی بنا رکھی تھیں۔ اب وہ تنہائی پسند لوگوں کا مسکن تھا، چرواہے بھی کبھی کبھار اپنی بھیڑوں بکریوں کے ساتھ وہاں آ جاتے، تمباکو نوشی کرتے آپس میں گپ بازی ہوتی اور لمبی تان کر سو جاتے۔ سمندری قزاقوں

کو بھی اپنی پرانی پناہ گاہیں چھوڑنا پڑیں۔ خلیج کے سامنے کا کوہستانی جزیرہ اور چھوٹی کشتیوں کے لیے اس کا چھوٹا سا راستہ، اس کے مشہور چشمہ کا صاف شفاف پانی جو جاڑوں میں نہایت کارآمد ہوتا جب چوٹیوں پر برف جم جاتی، سب مل کر شہریوں کے لیے ایک نئی تفریح گاہ بن گئی۔ ایسے میں صرف شوریدہ سر مجرم ہی مزاحمت کرتے اور آگے اس علاقہ سے دور چلے جاتے جہاں قانون فی الحال ان کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ مجرموں اور شریف شہریوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔"

ایتھنز کے سنہرے دَور سے صدیوں بعد بحیرہ روم میں تہذیب کی بتدریج ترویج اور پھیلاؤ سے اڈونیچرز کا پیشہ ناممکن ہو گیا۔ یونانی اپنی تہذیب ہر طرف پھیلا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے فنون وحشی قبائل میں پہنچائے جو وتیلیو نامی جزیرے کے سرسبز میدانوں میں رہتے تھے۔ وتیلیو ایک لفظ جس کا پہلا اور آخری حرف بعد میں ترک کر دیا گیا اور وہ اٹلی کہلانے لگا۔ وہ قبائل اپنے ملک **Latium** کے نام پر **Latin** (لاطینی) کہلاتے تھے۔ انہوں نے اپنا شہر نیچی پہاڑیوں پر **900** سال قبل مسیح آباد کیا تھا۔ انہوں نے بہت کچھ **Eruscans** نامی ایک پراسرار ایشیائی قبیلہ سے سیکھا تھا جو ان کا ہمسایہ تھا اور جس نے ایک دفعہ ان کے ساتھ پہاڑیوں والے شہر کو فتح کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ تاریخ سے اس طرح پراسرار طریقہ سے غائب ہوئے جس طرح کہ پراسرار طریقہ سے ظاہر ہوئے تھے۔

یہ شہر مستقبل کے ہزار برس تک انسانی ترقی کا ذریعہ رہا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے ترقی کہا جائے کہ نہ کہا جائے، اگر کوئی خدا، انسانی تاریخ کی رفتار دیکھ سکتا تو شہر بنانے سے مصر عقاد، اسیریا، مائسینیا اور مقدونیہ جیسی عظیم الشان سلطنتیں بنانا تو شاید وہ محسوس کرتا کہ انسانی ارتقا کا سفر کٹھن تو ہے مگر جاری ہے اور 'دوہرے شعور' کا جوا اپنی بہار دکھا رہا ہے۔

رومنوں کی آمد سے تاریخ غلط راستہ پر چل نکلی۔ ہر بات جو دوہرے شعور کی وجہ سے غلط ہو سکتی تھی غلط ہو کر رہی اور جب وہ **500** عیسوی کے قریب منظر سے ہٹے تو انہوں نے تہذیب اور کریمنلٹی کا دوہرا ورثہ اپنے پیچھے چھوڑا۔

ایک یادگار شہر

روم کے یہ شہری سپارٹا والوں کی طرح منظم، باعمل اور جذبات سے عاری تھے۔ مگر وہ یونانی کلچر اور اس کی گہرائی سے بہت مرعوب تھے۔ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے یونانی دیوتا اپنائے یعنی زیس روم آ کر جوپیٹر اور ایروس کیوپڈ بن گیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی تاریخ کا ایک حصہ اپنانے پر یونانیوں کو داد بھی دی۔ ان کا کہنا تھا کہ روم کا بانی ٹروجن شہزادہ Aneas تھا جو ٹرائے کی شکست کے بعد یونان سے بھاگ گیا تھا۔ ابتدائی رومن تاریخ کا ایک اور پہلو بھی ہے جیسا کہ ون ڈوریڈ کہتا ہے کہ مفرور غلاموں اور مجرموں نے مل کر ایک قصبہ آباد کیا۔ اسے اچھی طرح پختہ اور مضبوط کیا اور مفرور غلاموں کے علاوہ جرائم پیشہ افراد کے لیے پناہ لینے کی جگہ بنا دی۔ چنانچہ ستم زدہ غلام، چور، ڈاکو اور قاتل روم کا رخ کرنے لگے اور شہر پناہ شہر کارزار بن گیا۔ اس کے ہمسائے خوف اور دہشت کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ چونکہ اس شہر میں عورتیں نہیں تھیں اس لیے وہ ایک قریبی قبیلہ Sabine کی عورتیں اٹھا لاتے۔ ڈاکوؤں، غلاموں اور قاتلوں کے ہاتھوں روم کے بننے کی یہ دلچسپ کہانی، روم کے ضمیر میں ایک مہلک خرابی، بے مثال بے حسی اور لکیر کے فقیر ہونے کی عادت پر دلالت کرتی ہے۔ روم نے تخیل کی دنیا میں سانس لینا کبھی نہیں سیکھا۔

یہ روم کی مادہ پرستی ہے کہ جس کی وجہ سے تاریخ عالم کے ہر شہر کی نسبت روم کے اندر زیادہ جرائم، زیادہ تشدد کا دور دورہ رہا ہے۔ عام لوگوں اور امرا کے درمیان ابتدائی کشمکش سے لے کر آگسٹس کے دور میں اس کے زوال تک روم کی کہانی اس کے اخلاقی دیوالیہ پن کی کہانی ہے۔ رابرٹ گریوز ان لوگوں میں سے تھا جنہیں سب سے پہلے اس کہانی کی سنسنی خیزی کا احساس ہوا تھا۔ اس کے ناول 'کلاڈیئس' اور 'کلاڈیئس دی گاڈ' متواتر سازش، قتل، اوباشی

اور جنسی گمراہی کا تاثر دیتے ہیں۔ آگسٹس، تبریکس اور کیلی گلا کے دور میں زندگی شکاگو میں الکپون کے دور کی زندگی سے کتنی زیادہ اذیت ناک ہوگی۔ اگر انسانی ارتقا کو محض مادی سطح تک محدود کر دیا جائے تو اس سے کتنی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ روم اس کی عبرت ناک مثال ہے۔

مگر یہ بھی سچ ہے کہ مادی سطح پر روم کی کارکردگی نظر انداز نہیں ہوسکتی۔ اس کے انجینئروں نے سکاٹ لینڈ سے افریقا تک سڑکیں بچھائیں، آب رسانی کا بندوبست کیا اور یونانی تہذیب کے تصورات رومی فوجوں نے لاکھوں میل دور تک پہنچائے۔ مگر خود روم میں اقتدار کی جنگ متواتر جاری تھی۔ یونانیوں نے انتخابات کا جمہوری سسٹم ایجاد کیا تھا۔ یہ رومنوں کا کمال تھا کہ انہوں نے انتخاب کا قاتلانہ سسٹم ایجاد کیا۔ انہوں نے قتل کو سیاسی حربہ بنایا۔ اکثر مؤرخ اس کا رشتہ 133 قبل مسیح میں ہونے والے ٹریبیون (لوگوں کے نمائندے) کے قتل سے جوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک سو سال بعد آگسٹس نے اسے روک دیا تھا۔ درحقیقت اس کا سلسلہ ری پبلکن روم میں (جمہوری) دور سے شروع ہوا اور اس کا زوال (پانچویں صدی عیسوی) تک جاری رہا۔ اس وقت تک یہ ایسی روایت بن گئی تھی جو کبھی کبھار کے وقفوں کے ساتھ عہد بہ عہد جاری رہی۔ یہاں تک کہ Popes کی تاریخ I Claudius کی کہانی بن گئی۔

روم کی اصلی تاریخ اس دَور سے شروع ہوتی ہے جب اریسکن فاتحین میں سے آخری حکمران کو روم سے نکالا گیا۔ (509 BC) تب روم ایتھنز کی طرح ایک جمہوریہ بن گیا۔ جب ایتھنز ایرانی حملہ آوروں سے زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا، روم تاریخ کی پہلی ہڑتال (494 BC) کے ذریعہ اپنی مخصوص اور یکجہتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ طبقاتی ناانصافی سے تنگ آ کر تمام عوام روم سے نکل کر ٹائبر روانہ ہوگئے اور اعلان کیا کہ وہ ایک نیا شہر بسائیں گے، اگر ان کے حقوق انہیں نہ دیئے گئے۔ شہر سے مزدوروں کی اجتماعی ہجرت کا مطلوبہ اثر ہوا اور امرا عوام کو ان کے اپنے نمائندوں کے انتخاب کا حق دینے پر مجبور ہوگئے۔ مگر جب BC 486 میں طبقہ امرا میں سے ایک (پیٹریشن) سپوریس کیسیس نامی شخص نے عام لوگوں کا زمین پر حق تسلیم کرنے کی تجویز پیش کی تو امرا ایک ہوکر اس کے خلاف کھڑے ہوگئے۔ اس پر آمر بننے کا الزام لگایا اور مار دیا۔ BC 440 میں ایک دولت مند نے قحط کے زمانہ میں اپنے اناج کی قیمت کم کر دی تاکہ عام لوگوں کا بھلا ہو تو فوراً ایک ڈکٹیٹر کا تقرر ہوا جس نے اسے قتل کروا دیا۔ لوگوں کے جذبات ٹھنڈے کرنے کے لیے مقتول کا اناج ان میں مفت تقسیم کر دیا گیا۔

کسی نے اس کا انتقام لینے کی بات کی تو اسے خاموشی سے مروا دیا گیا۔ روم بدمعاشوں کی حکومت کے آداب سیکھ رہا تھا، مگر اتنا ہے کہ اس کے نظم ونسق میں بظاہر لوگوں کا خیال رکھا جا رہا تھا۔ مارکس منیلیس قومی ہیرو تھا، جس نے BC 390 میں دارالحکومت کو گال قوم کے ہاتھوں محفوظ رکھا۔ یہ دیکھ کر کہ بہادر سابق سپاہی قرضہ کی وجہ سے جیل بھیجے جا رہے ہیں، اس نے اپنی جیب سے قرضے ادا کر کے انہیں آزاد کروانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر امرا نے اس پر آمر بننے کا الزام لگایا اور لوگوں کو مشتعل کیا کہ وہ اسے موت کی سزا دیں۔ آخرکار منیلیس کو پہاڑی سے گرا دیا گیا۔

غالباً یہ گال قوم کا قبضہ ہی تھا جس نے رومنوں کو ایک نئے اتحاد میں پرو دیا تھا۔ اب ان کی توسیع پسندی کا دائرہ صدی بہ صدی پھیلتا گیا اور روم کی حکمرانی اٹلی کے چپہ چپہ پر قائم ہوگئی۔ مفتوح علاقوں کے لوگوں کو روم نے محض اپنی رعایا نہیں بنایا بلکہ رائے دہی کے تمام حقوق کے ساتھ انہیں اپنی شہریت کا درجہ دیا۔ ان میں سے بہتوں نے روم کا دشمن بننے کے بجائے روم کا شہری بننا پسند کیا۔

اس موقع پر بحیرۂ روم کی قزاقی نے اپنا فیصلہ کن کردار تاریخ میں ادا کیا اور رومنوں کو دنیا کی تسخیر کا راستہ دکھایا۔ بحیرۂ روم میں ایک ہی شہر کارتھیج تھا جو روم کی طاقت کا ہمسر تھا۔ کارتھیج (آج کا ٹیونس) شمالی افریقا میں واقع تھا۔ اس کا آغاز ایک تجارتی مرکز کے طور پر ہوا تھا جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے نئے ہانگ کانگ کی سطح پر آ گیا تھا، یہاں تک کہ کئی قومیتوں کا مرکز بن گیا۔ مگر بحیرۂ روم میں چونکہ صرف قزاق ہی نہیں تھے بلکہ اور کئی لٹیرے بھی تھے، وہ یونانی، شامی، مقدونی، رومی، لیڈیا اور ایٹرسکن کا ٹھکانہ بھی تھا۔ کارتھیج بحری طاقت بھی بن چکا تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے کارتھیج نے یونانی جنرل پوروز (اپی اس کا بادشاہ 272-282) کے خلاف روم سے اتحاد کر لیا مگر جب پوروز ان کے درمیان سے ہٹ گیا تو دونوں اتحادی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

کارتھیج نے اپنی جنگیں کرائے کے سپاہیوں کی مدد سے لڑیں۔ انہی میں ایک اطالوی قبیلہ بھی شامل تھا۔ کام نہ ہو تو یہ سپاہی ہمیشہ عوام کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔ سائرا کیوس (سسلی میں) کے خلاف جنگ کے بعد گھر واپس جاتے ہوئے ان کرائے کے سپاہیوں کو ایک چھوٹا سا یونانی قصبہ میسانا (جدید میسینا) بہت پسند آیا۔ اور قصبہ نے بھی میزبانی کا فرض خوب ادا کیا۔ آدھی رات کو وہ جاگے، انہوں نے قصبے کے مرد قتل کر دیے، جبکہ عورتیں گرفتار کر لیں۔

ایڈونچرر ہوتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ تجارت اور کھیتی باڑی کے بجائے قزاقی ان کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ آئندہ پچیس برس تک وہ زیادہ تر سائرا کیوس اور کارتھیج سے آنے والے جہاز لوٹتے ہوئے اس علاقہ کے لیے لعنت بنے رہے۔

اٹلی کے قریب واقع ایک مقام ریج یم میں مقیم اسی قبیلہ کی ایک اور رجمنٹ نے سنا تو نقالی کا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے بھی اپنے میزبانوں کے گلے کاٹے اور شہر پر قبضہ کرنا چاہا مگر وہ رومی فوج کا حصہ تھے، اس لیے رومیوں نے ان کے خلاف فوج بھیجی۔ فوج نے شہر کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا اور باغیوں کا قتل عام شروع ہوگیا جس میں چار سو باغی مارے گئے۔ رومی فوج کو یونانی حکمران ہیرو کی مدد بھی حاصل ہوگئی۔ جس نے مسانا سے قزاقوں کا نام و نشان مٹا دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ کارتھیج نے اس فیصلہ کو پسندیدگی سے دیکھا اور مدد بھیجی۔ مسانا کے قزاقوں نے بڑی بے حیائی کے ساتھ روم سے مدد چاہی۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ رومن سینٹ کی مخالفت کے باوجود انہیں مدد حاصل ہوگئی۔ سینٹ کی رائے میں یہ بے معنی بات تھی کہ ریج یم کے باغیوں کی سرکوبی کے بعد قزاقوں کی مدد کی جائے۔ مگر عام لوگوں نے لوٹ کھسوٹ اور فتح کے لالچ میں سینٹ کے فیصلہ کو رد کر دیا۔ ایک جرمن تاریخ دان مومسن کے الفاظ میں ''دنیا کی تاریخ میں یہ لمحہ انتہائی گہری معنویت کا حامل تھا۔'' کیونکہ یہ لمحہ رومن سلطنت کی طرف پہلا قدم تھا۔ ایچ، جی ویلز اپنی کتاب 'آؤٹ لائن آف ہسٹری' میں کہتا ہے ''اس طرح تباہ کن اور لاحاصل جنگوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے نوع انسان کی تاریخ پر سیاہی پھیر دی۔'' اس کے خیال میں یہ فیصلہ روم کی تاریخ میں اخلاقی موڑ تھا۔ ''یہ روم میں ظلم، قتل، برائی اور غداری کے دور کا آغاز تھا، جس نے روم کو زوال کی علامت بنا دیا۔''

بات اتنی سیدھی سادی بھی نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ روم گویا کہ وکٹوریائی عہد کے میلوڈراما کا ایک کردار ہے جو غلط موڑ مڑتا ہے اور بدی اور بربادی کی نذر ہو جاتا ہے۔ روم کا المیہ اس سے کہیں زیادہ پیچ دار تھا۔ رومن سمجھ دار اور باعمل تھے، ان میں یونانیوں جیسی دانشوری اور گہرائی نہیں تھی اور سکندر کے برعکس انہیں اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ کسی سادہ و خوش مزاج دیہاتی لڑکے کی طرح وہ زندگی میں خوشی اور آسانی کے خواہش مند تھے۔ پہلی پیونک جنگ پچیس برس جاری رہی اور جس نے روم کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا، انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے اندر آہنی عزم، شدید وطن پرستی اور سب سے بڑھ کر جارحیت جیسی نئی خصوصیات پیدا کریں۔ قومیں افراد کی طرح ہوتی ہیں ایک بار ان میں یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں تو پھر ان

سے منحرف نہیں ہوتیں۔

1935ء میں 'No Mean City' نامی ناول (مصنفہ اے میکارتھر) شائع ہوا۔ اس کا موضوع گلاسگو کے تنگ و تاریک علاقے تھے۔ عنوان کا تعلق سینٹ پال کے 'I am a citizen of nomean city' سے تھا۔ ناول ایک سادہ اور عام نوجوان جونی سٹارک کی کہانی ہے جسے زبردستی اپنے دفاع کا طریقہ سکھایا جاتا ہے اور اس میں اسے ایسی کامیابی حاصل ہوتی ہے کہ وہ 'ریز رکنگ' کہلانے لگتا ہے، حالانکہ ایسی کامیابی بذات خود ایک دھوکا ہے، اس ایکٹر کی طرح جو اپنے ایک مخصوص کردار سے بچ نہیں سکتا۔ وہ اپنے امیج کی نوعیت سے مجبور ہے کہ تشدد اور جارحیت پھیلاتا رہے۔ کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ وہ ایک زرخیز فضا میں سانس لے سکے۔ بالآخر وہ ایک سڑک پر لڑتے ہوئے مارا جاتا ہے۔ جونی سٹارک سلطنت روم کی علامت ہے۔

بحیرۂ روم کا 'ریز رکنگ' بننے میں روم کو کچھ دشواریاں بھی پیش آئیں۔ روم اور کارتھیج طاقت کے لحاظ سے ایک جیسے تھے۔ جنگ جاری رہی اور چوبیس برس بعد دونوں ملک تھک گئے۔ کارتھیج نے امن قائم کرنے کی کوشش کی مگر جنگ میں روم کے دو لاکھ آدمی مارے گئے اور پانچ سو جہاز تباہ ہوئے تھے۔ جب کارتھیج کے جنرل ہملکر نے سپین فتح کیا تو روم نے خطرہ محسوس کیا کہ اس کا پرانا دشمن پھر سرگرم ہو گیا ہے۔ چنانچہ دونوں حریف جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

اس مرتبہ ہملکر کے بیٹے ہنی بال نے پہل کی اور کوہ الپس (Alps) پار کر کے اٹلی پر حملہ کر دیا۔ برسوں اسے متواتر کامیابیاں ہوتی رہیں، رومی فوج کو اس نے پے در پے شکستیں دیں یہاں تک کہ جنوبی اٹلی کے اکثر علاقہ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ مگر رومنوں کی مزاحمت ناقابل تسخیر تھی۔ ان کا جنرل Fabias (جس کے نام پر فیبین سوسائٹی کا نام پڑا) بیک وقت جنگ سے بچتا بھی رہا اور حملہ آوروں کا پیچھا بھی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ رومن فوج جنگ کو واپس افریقا میں لے گئی اور کارتھیج ایک بار پھر امن کی اپیل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ روم نے سپین پر قبضہ کر لیا اور کسی کی شرکت کے بغیر بحیرۂ روم کا مالک بن گیا۔

اس المیہ کا آخری حصہ نصف صدی بعد دیکھنے میں آیا جب کارتھیج کی حیثیت ایک بے ضرر میونسپلٹی جیسی رہ گئی، ایک شہر کہ جس کی کوئی سلطنت نہیں تھی اور روم کے ساتھ امن معاہدہ کی وجہ سے فوج رکھنا ممکن بھی نہیں تھا۔ مگر کئی مقبوضہ قوموں کی طرح اس نے حیرت انگیز

لچک اور زندگی کا مظاہرہ کیا اور جلد ہی پہلے کی طرح خوشحال ہو گا۔ اب روم کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے دشمن کو خاک وخون میں تڑپتا دیکھے۔ ایک پرانا سیاستدان Cato سینٹ میں اپنی ہر تقریر (موضوع چاہے کوئی بھی ہو) اس نعرے پر ختم کرتا تھا کہ ''کارتھیج کو تباہ کردو'' مگر کوئی بہانہ نہیں ملتا تھا۔ کارتھیج اب واقعی بے ضرر تھا۔ کوئی بہتر بہانہ مل نہ سکا تو انہوں نے ایک واہیات بہانہ بنالیا۔ کارتھیج کے ہمسایے اور روم کے اتحادی نومیڈیا نے کارتھیج پر حملے شروع کر دیے۔ جس کی وجہ سے کارتھیج کو مسلح ہونا پڑا۔ روم نے اسے معاہدہ کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا اور دھمکی آمیز رویہ اختیار کر لیا۔ کارتھیج نے فوراً معافی چاہی اور مکمل اطاعت کا وعدہ کیا۔ ایک لمحہ کے لیے رومنوں کو خیال آیا کہ وہ اپنی جنگ اور لوٹ مار سے محروم رہ جائیں گے چنانچہ انہوں نے حکم دیا کہ کارتھیجین اپنا شہر خالی کر دیں اور دس میل دور اندر چلے جائیں۔ یقیناً یہ اس شہر کو تباہ کرنے کا منصوبہ تھا جس کی تجارت کا انحصار سمندر پر تھا۔ اس کا مطلوبہ اثر ہوا کارتھیجین خفا ہو گئے اور روم کو اعلانِ جنگ کرنے کا بہانہ مل گیا۔

رومنوں کی ابتدائی نسل ہوتی تو کارتھیج کی فتح آسان معاملہ تھا مگر آخری پیونک جنگ کے بعد دنیا بدل گئی تھی۔ روم میں دولت کی کثرت تھی اور عیش و آرام کے نت نئے طریقے اختیار کیے جاتے، جیسے دودھ سے نہایا جاتا تھا۔ سیاسی کرپشن زوروں پر تھی۔ مگر سیاستدان 'عوام کو بھی تفریح اور خوشامد کے ذریعہ کرپٹ کرتے۔ کونسل کے امیدوار کو گلیڈیئٹر جیسا شو کرنا پڑتا تھا جس پر ہزاروں پاؤنڈ خرچ ہو جاتے، شو جتنا شان دار ہوتا اس کے منتخب ہونے کے چانس اتنے ہی بڑھ جاتے۔ قدیم رومن سال بھر میں ایک تہوار مناتے تھے اب درجنوں منائے جاتے۔ دانش وَر یونانی مصنفوں کو پڑھتے افلاطون کے حوالے دیتے اور لڑکوں کی محبت کا ذوق پیدا کرتے۔ رئیس طرح دار لڑکے نیم عریاں لباس پہنتے اور اپنے نسوانی طرز کے بالوں پر فخر کرتے۔ محض نصف صدی میں روم ہم جنس پرستی کا مرکز بن گیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کارتھیج پر پہلا حملہ ناکام ہو گیا۔ بلکہ بڑی تباہی کا سبب بنا۔ دفاعی لائنوں سے زور دار جوابی حملہ ہوا، اس کے علاوہ بیماری کی وجہ سے رومنوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ جنگ کا دوسرا سال بھی اتنا ہی برا تھا، رومن اپنی طاقت نواحی شہروں پر حملوں میں ضائع کر رہے تھے۔ آخر رومنوں نے ایک نوجوان جنرل Scipico کی تقرری کی۔ Scipico اسی شخص کا پوتا تھا جس نے پچھلی جنگ میں کارتھیج کو شکست دی تھی۔ قسمت نے بھی کارتھیج کا ساتھ چھوڑ دیا۔ Scipico نے کارتھیج کے سپلائی کے راستے بند کر دیے تو لوگ فاقوں مرنے

لگے۔ وہ رومن قیدیوں کو فصیلوں پر لے آئے، انہیں اذیتیں دے کر مارا اور ان کی لاشیں محاصرین پر نیچے گرادیں۔ کارتھیجین ہمیشہ کی طرح اندرونی جھگڑوں میں الجھ کر آپس میں لڑنے لگے۔ سڑکوں پر اپنے ہی لوگوں کو پھانسی کی سزا دیتے اور آگ سے بھڑکتی ہوئی بھٹیوں میں اپنے بچے ڈال کر دیوتا کی نذر اتارتے تا کہ تباہی سے بچ جائیں۔

جب رومنوں نے پھر حملہ کیا تو شہر فتح ہو گیا۔ وہ لوگوں کو مارتے کاٹتے، گھروں کو جلاتے ہوئے شہر کے اندر چلے گئے۔ لوگوں نے ہر کوچہ و بازار میں حملہ آوروں کا جم کر مقابلہ کیا۔ مگر وہ ان کے مقابلہ میں بہت کمزور تھے۔ زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکتے تھے پھر بھی رومنوں کو شہر پناہ تک پہنچتے ہوئے چھ روز لگ گئے۔ شہر پناہ ایک چٹان تھی جس کی چوٹی پر ایک عبادت گھر تھا۔ یہاں بچے کھچے کارتھیجوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ معبد میں فوج سے بھاگے ہوئے نو سو رومن تھے جنہیں اپنی فوج سے رحم کی امید نہیں تھی۔ انہوں نے معبد کو آگ لگا دی اور اس کے شعلوں میں جل کر مر گئے۔ قیدیوں کو غلاموں کی منڈی میں نیلام کر دیا گیا اور کارتھیج خس و خاشاک بن گیا۔ سینٹ نے حکم دیا کہ کارتھیج کا کوئی پتھر بھی کھڑا نہ رہے اس کا سر بھی جھکا دیا جائے۔ جب شہر خاک میں مل کر خاک ہو گیا تو اس پر ہل چلائے گئے۔ جولیس سیزر نے جب ایک اور کارتھیج بنایا تو اس کے لیے زمین کا انتخاب کہیں اور کیا یہ سرزمین جس نے اتنے اندھیر دیکھے تھے، منحوس قرار دے دی گئی۔

اسی سال 146 قبل مسیح میں رومنوں نے ان یونانیوں کے باہمی جھگڑے میں مداخلت کی جو خود کو روم کا اتحادی سمجھتے تھے۔ انہوں نے شہر کورنتھ کا بھی وہی حال کیا جو کارتھیج کا کیا تھا۔ شہر کو مٹی میں ملا دیا اور شہریوں کو غلام بنا کر بازار میں بیچ دیا۔

چند برس بعد جب مغربی سپین کے ایک صوبے لوسی تانیا نے رومنوں کے قبضہ کے خلاف بغاوت کی تو اس کے شہر نومنتیا کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ شہری قتل کر دیے گئے یا غلام بنا کر بیچ دیئے گئے۔ ان میں سے دہشت گردی کا ہر فعل غیر ضروری تھا مگر روم کی طاقت اور ڈسپلن میں جو کمی تھی اسے وہ تشدد سے پوری کر رہا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ روم مجرب، کاہل اور ظالم بن رہا تھا۔ پرانے دَور کے رومیوں نے خطرہ سے خبردار کیا مگر ان کے اکثر ہم وطن ان کی بات نہ سمجھ سکے۔ روم نے سارے بحیرۂ روم پر قبضہ کر لیا تھا، بلکہ سکندر اعظم کا مقدونیہ بھی اس نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ ہر طرف دولت کا سیلاب تھا ہر شخص اس سے سیراب ہو رہا تھا۔ عوام کو کھیل تماشے دکھا کر مطمئن

کیا جاتا جن میں قیدی اپنی زندگی کے لیے بھوکے شیروں اور چیتوں سے لڑتے تھے۔ لوگوں کو امرا کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت سے غرض نہ تھی جب تک کہ انہیں کھیل تماشے دکھا کر بہلا نہ دیا جاتا۔ روم میں سب کے لیے سب کچھ تھا۔

ٹائبیس جیسے لوگوں کی پریشانی سیپیو کا ایک اور پوتا اور اس کا بھائی تھا اور یہ کہ دولت اکثر چند کرپٹ افراد کے ہاتھوں میں جارہی تھی۔ روم کی عظمت چھوٹے کاشتکاروں کی وجہ سے تھی جو اپنی زمین کے آپ مالک بھی تھے۔ ممکن ہے ان کے پاس چند غلام بھی ہوں مگر ان کے ساتھ گھر کے افراد جیسا سلوک ہوتا تھا۔ مارکس میٹیلیس کے زمانہ کی طرح سپاہی جنگ سے واپس آ رہے تھے اور مقروض ہونے کی وجہ سے انہیں جیل بھیجا جا رہا تھا۔ چھوٹے کاشتکاروں کی زمینیں بڑے جاگیردار ہضم کر رہے تھے۔ اپنی بڑی بڑی زمینوں پر وہ مویشیوں کا کام بحیرۂ روم کے قزاقوں سے خریدے ہوئے غلاموں سے لیتے تھے جس سے پیداوار کی لاگت کم ہو جاتی تھی، اس طرح سستا اناج چھوٹے کاشتکاروں کے لیے مشکلات پیدا کر دیتا تھا اور ان کا کام بند ہو جاتا تھا۔ بڑے زمینداروں کے کھیتوں میں ہر طرف زنجیروں میں جکڑے ہوئے غلام ہوا کرتے تھے۔ جن کی پہچان کے لیے ان کی پیشانیاں گرم لوہے سے داغ دی جاتی تھیں۔ اگر وہ بھاگ سکتے تو بھاگ بھی جاتے تھے۔ بھاگ جانے کے بعد وہ ادھر ادھر لوٹ مار کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ پھر پکڑے جائیں اور اذیت کی موت مارے جائیں۔ 134 قبل مسیح میں جب سسلی کے غلاموں نے بغاوت کی تو ان میں سے ستر ہزار غلاموں نے جزیرہ پر قبضہ کر لیا۔ رومنوں نے بالآخر ان سب کو قتل کر دیا۔ ایک خوش باش اور خوشحال ملک جرم اور اذیت کی سرزمین بن رہا تھا۔

سسلی میں غلاموں کی بغاوت کے سال ٹائبیرس گراکس لوگوں کا نمائندہ منتخب ہوا تھا۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ قانون کے ذریعہ زمین کی حد مقرر کرے جو کسی ایک خاندان کی ملکیت ہو۔ اس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ بے گھر سپاہیوں کو زمین دی جائے۔ یہ بات دوسرے سینیٹر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس کی مخالفت پر اتر آئے، بازاروں میں اس کا پیچھا کیا اور مار مار کر ہلاک کر دیا۔ دس سال بعد اس کا بھائی گائیس انہی مقاصد کی خاطر، ایسے ہی حالات میں قتل ہوا۔

رومن اپنی خودستائی کے ذریعہ تشدد میں مبتلا ہو رہے تھے، جرم کی کھائی میں گر رہے تھے، ایک مرتبہ کوئی قوم یا کوئی فرد گرنا شروع کر دے تو اسے روکنا ناممکن ہوتا ہے۔ رومن تخیل

سے محروم اور کم نظر لوگ تھے، وہ سمجھ نہیں سکے کہ اگر ایک بار نظریہ ضرورت کے تحت قتل کا جواز مہیا کر دیا جائے تو قتل عادت بن جاتا ہے اور اس کے بعد بیماری کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اس بیماری کو روم لانے والا شخص مجرم نہیں تھا بلکہ رومنوں کی ہر خوبی کا مالک تھا۔ میریس ایک غریب کھیت مزدور کا بیٹا تھا۔ اس نے فوج میں شہرت حاصل کی۔ ایک امیر زادی سے شادی کی اور لوگوں کا ترجمان، ٹریبون منتخب ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا تھا کہ جوگورتھا نامی ایک افریقی جنرل نے بغاوت کر دی۔ گوریلا جنگ میں اپنی مہارت کی وجہ سے جوگورتھا نے چار برس روم کی طاقت کا مقابلہ کیا تھا۔ آخر میریس اپنی قسمت آزمانے روانہ ہوا۔ اس نے طاقت کے بجائے سازش کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا۔ جوگورتھا کے سسر کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا جس نے اسے دھوکے سے ایک بڑے ذہین افسر لکی سلا کے ہاتھوں گرفتار کرا دیا۔ میریس نے جوگورتھا کو پا بہ زنجیر روم واپس لانے کا وعدہ پورا کر دیا۔ غضب ناک ہجوم نے جوگورتھا کے ہیرے موتی اور کپڑے نوچ لیے، اس کے کانوں سے ہیرے اس بے دردی سے لوٹے کہ ہیروں کے ساتھ اس کے کان بھی اکھڑ گئے۔ جوگورتھا کو ایک سرد خانہ میں پھینک دیا گیا اور چند روز بعد قتل کر دیا گیا۔ اس کامرانی سے میریس کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوا۔

روم کو بے شک میریس کی ضرورت تھی۔ وحشی حملہ آور، جن میں جرمن بھی شامل تھے (جرمن پہلی دفعہ تاریخ میں نمودار ہوئے تھے) شمال سے آنا شروع ہوئے۔ ایک پوری رومن فوج ان کے ہاتھوں ماری گئی۔ ہنی بال کے بعد یہ شکست بڑی خوف ناک تھی۔ میریس کو ان سے مقابلہ کے لیے فوراً بھیجا گیا۔ خوش قسمتی سے وحشیوں نے اپنی فوجوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ میریس نے ٹیوٹن فوج کو واپس **Aixen** صوبہ میں دھکیل دیا جہاں انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ پھر اس نے دوسرے حصہ کمبری پر حملہ کیا اور انہیں ملان کے قریب سائی میں شکست فاش دی۔

ایک بار پھر وہ روم کا ہیرو بن گیا۔ وہ مسلسل چھٹی بار کونسل منتخب ہوا۔ یہ ایک شان دار مگر غیر قانونی عمل تھا کیونکہ دونوں منتخب ہونے والے کونسل روم کے گورنر ہوا کرتے تھے جن میں سے ہر کونسل صرف ایک سال کے لیے یہ فرض ادا کر سکتا تھا۔ اس نے دو سیاسی منافقوں سے دوستی کی اور قدامت پسندوں کا تختہ الٹ کر خود روم پر حکومت کرنے کا ارادہ کیا۔ بدقسمتی سے اس میں سیاسی رہنما بننے کی صلاحیت واجبی سی تھی۔ سیاسی آداب سے ناواقف اور مزاج

کے لحاظ سے اکھڑ تھا۔ اس نے ایک ہی وقت میں دونوں فریقوں کے ساتھ ساز باز کرنے کی کوشش کی اور اس عرصہ میں اپنے دوستوں اور حامیوں سے محروم ہو گیا۔ ''انقلاب'' کی منصوبہ بندی ناکام ہو گئی، فسادات شروع ہو گئے اور میریس ایک کونسل کی حیثیت سے مجبور ہو گیا کہ اپنے پرانے ساتھیوں سے مقابلہ کے لیے فوج بلائے۔ انہوں نے **Capitol** میں پناہ لی، جہاں ہجوم نے انہیں ہلاک کر دیا اور روم کا 'نجات دہندہ' سیاسی معنوں میں اچانک ایک کہانی بن گیا۔ یہ سب کچھ روم کے اندر اس کی فاتحانہ واپسی کے بعد ایک دو مہینوں میں اتنی جلدی ہوا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہمی تو وہ پہلے ہی تھا اب شکی اور بدمزاج بھی ہو گیا۔

مگر قدامت پرست بھی اپنی حد سے بڑھ گئے تھے۔ صرف روم میں ہی نہیں بلکہ پورے اٹلی میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ عوام کو ایسے رہنماؤں کی تلاش تھی جو انہیں دولت مندوں کے ظلم سے بچائیں مگر جوں ہی ایک رہنما ملا اسے قتل کر دیا گیا۔ مگر جب ایک اور لیفٹیننٹ **Drusus** کے ساتھ یہی سلوک ہوا تو اٹلی میں سول وار شروع ہو گئی۔ اب پھر میریس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسے اور اس کے پرانے ماتحت سلا (اب اس کا دشمن) کو فوجوں کی کمان دی گئی اور وہ ان کے قتل عام کے لیے روانہ ہو گئے جو کبھی ان کی کمان میں لڑے تھے اور جن میں زیادہ تر اٹلی کے وہ باشندے تھے کہ جو سمجھتے تھے کہ انہیں روم کا شہری بننے کا حق حاصل ہے۔ اس مرحلہ پر بحیرۂ اسود کے علاقہ کے متھر یڈاٹس نامی ایک بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ وہ سلطنت حاصل کرنے کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہ دے۔ اس نے شام اور ایشیائے کوچک پر حملہ کیا اور خفیہ احکام جاری کیے کہ مقبوضہ شہروں کے تمام رومنوں کو ہلاک کر دیا جائے۔ وقت آنے پر ایک لاکھ سے زیادہ رومن مرد، عورتیں اور بچے گلیوں میں گھسیٹ کر قتل کر دیے گئے۔

اس خبر نے روم کو ہلا کر رکھ دیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ رومنوں کے ساتھ مویشیوں، کارتھیج اور کورنتھ کے باسیوں جیسا سلوک ہو سکتا ہے۔ دولت مند زیادہ خوف زدہ تھے، ان کی آمدنی پر برا اثر پڑ سکتا تھا۔ خزانہ اچانک خالی ہو گیا۔ سینٹ نے فیصلہ کیا کہ اطالویوں کے گلے کاٹنے کے بجائے ان کے مطالبے پورے کر دیے جائیں اور پھر انہیں متھر یڈاٹس سے لڑنے بھیجا جائے۔ چنانچہ اطالویوں نے رومی شہریت حاصل کر لی۔

شاید یہ سمجھا جائے کہ ایشیائی خطرہ کے پیش نظر روم کے اندرونی جھگڑے ختم ہو گئے ہوں مگر رومن آپس میں لڑنے کے عادی ہو گئے تھے۔ پہلے تو میریس اور سلا، دونوں نے اپنے آپ کو متھر یڈاٹس کا فاتح سمجھا۔ سینٹ نے امیر زادے سلا کے حق میں فیصلہ دیا۔ متھر یڈاٹس

نے سلپھی سیس نامی ایجی ٹیٹر کا تعاون حاصل کیا جس نے براہِ راست عوام سے اپیل کی۔ عوام نے نہ صرف اسے فوجوں کی کمان کے لیے منتخب کیا بلکہ سلا کی تلاش میں نکلے کہ اس کی دھجیاں اڑائی جائیں۔ سلا کو روم سے بھاگنا پڑا مگر وہ بھاگ کر اپنے ان سپاہیوں کے پاس گیا جنہوں نے بغاوت رفع کرنے میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے روم کی طرف مارچ کیا تو ایک شدید جنگ کے بعد اس بار میریس سمیت روم سے بھاگنا پڑا۔ دوست گرفتار ہو کر مارا گیا جبکہ میریس افریقا فرار ہو گیا۔ اس لڑائی سے فارغ ہو کر سلا روم کی قسمت کا مالک بن گیا، میریس کے دو چار حامیوں کی گردنیں اڑائیں، چند قوانین بنائے اور آخر متھریڈاٹس سے لڑنے روانہ ہو گیا۔

جونہی وہ روم سے روانہ ہوا، میریس فوراً روم واپس آ گیا۔ وہ حسد اور نفرت کی آگ میں جل رہا تھا۔ سلا سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ سلا کی طرح اس کی بھی ایک وفادار فوج تھی۔ اس نے روم میں ظلم اور دہشت کا ایسا بازار گرم کر دیا جو شاید ہی کبھی کسی بڑے شہر نے دیکھا ہو۔ اس نے روم کے گیٹ بند کروا دیئے اور اپنے 'دشمن' کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ دشمن سے مراد ہر وہ شخص تھا جس کے خلاف اس کے دل میں نفرت اور کینہ تھا، ایک وہمی اور خبطی کو تو آدھی دنیا سے عداوت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان چند دنوں میں روم کے ہزاروں ممتاز اور چیدہ لوگ قتل کر دیے گئے۔ سڑکوں پر لوگ میریس کو دیکھتے ہی فوراً سلام کرتے، اگر میریس کسی سلام کرنے والے سے منہ پھیر لیتا تو وہ اس کا دشمن سمجھا جاتا۔ چنانچہ میریس کے آدمی اسے وہیں اسی جگہ ہلاک کر دیتے۔

میریس گویا کہ پاگل ہو گیا تھا وہ اپنے توہمات کا اسیر تھا۔ ہر چند کہ وہ ہر رات بے تحاشا شراب پیتا تھا مگر سو نہیں سکتا تھا۔ ساتویں دفعہ منتخب ہونے کے بعد اسے بخار ہوا اور وہ بخار کی حالت میں مر گیا تو تمام اٹلی نے سکھ کا سانس لیا۔

مگر پھر بھی قتل و غارت سے نجات نہیں ہوئی۔ متھریڈاٹس کو امن پر مجبور کر کے جب سلا روم واپس آیا تو میریس کے جتنے حمایتی اسے مل سکے انہیں قتل کر دیا۔ خون ریزی اور دہشت کا ایک اور دور شروع ہو گیا۔ ہزاروں افسر اور سینیٹر قتل کر دیے گئے۔ جلد ہی قتل کی نوعیت سیاسی نہ رہی۔ جیسا کہ ہر آمر نے جان لیا ہے کہ خالص سیاسی قتل اور ناپسندیدگی کی بنا پر قتل میں تمیز کرنا بہت مشکل ہے۔ کچھ عرصہ بعد یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ ناپسندیدہ ہونے کی وجہ سے ہی قتل کیا جائے اگر کوئی شخص صاحب جائداد ہے اور اپنے کسی دوست کے لیے اس کی

جائداد پر قبضہ ضروری ہے تو اسے راستہ کی رکاوٹ سمجھ کر راستہ سے ہٹانا ضروری ہو جاتا ہے۔ سلا نے آغاز تو روم کے حریت پسند کی حیثیت سے کیا تھا مگر اس کا انجام روم کے پہلے ڈکٹیٹر کے طور پر ہوا۔

آخر میں وہ اپنے نام کی رعایت سے خوش قسمت سلا ہی ثابت ہوا۔ اس کا انجام ان لوگوں جیسا نہیں ہوا جن سے لوگوں کو خوف اور نفرت تھی۔ وہ حکومت کی ذمہ داریوں سے آزاد ہو کر اپنے گھر چلا گیا اور اپنے بستر پر سکون کے ساتھ فوت ہوا۔ ایک پرانے سپاہی کی حیثیت سے سیاست اس کے لیے بوریت تھی اور شاید وہ ان زوال آمادہ رومنوں کو اپنے وقت کی قیمت بھی نہیں سمجھتا تھا۔ سلا تیسری پیونک جنگ کے دنوں میں پیدا ہوا تھا جب روم ابھی جمہوری، آزاد اور قابل فخر تھا۔ اب پرانی نسل ختم ہو چکی تھی ۔ ان میں سے اکثر موت کے ہاتھوں مارے گئے اور بہتیرے میریس کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ باقی بھیڑیں رہ گئی تھیں۔ روم کا حقیقی زوال شروع ہو چکا تھا۔

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ روم کے بڑے مسائل اس وقت پیدا ہوئے جب اس نے بحیرۂ روم فتح کرنا شروع کیا اور دنیا کا امیر ترین شہر بن گیا۔ مگر مسئلہ اس سے گہرا تھا۔ 264 قبل مسیح میں جب کارتھیج کے ساتھ پہلی جنگ ہوئی ہندوستان میں اشوک کی بادشاہت قائم ہوئی اور تمام سلاطین کی طرح اس نے بھی اپنی حیثیت بطور سلطان منوانے کے لیے جنگ شروع کی۔ جنگ کامیابی کے ساتھ جاری تھی کہ اشوک کے دل میں خونریزی سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ (دُنیا کے) ایک دوسری طرف مذہبی طرز کی حکومت قائم کرے گا۔ مہاتما گوتم بدھ کے مذہب اور تعلیمات نے اس پر گہرا اثر کیا تھا کہ صرف انسان کی خواہشات ہی اس کے دکھ اور اذیت کا سبب بنتی ہیں۔ ان سے نجات علم کی روشنی میں زندہ رہنے اور اعتدال کے راستے پر چلنے میں ہے۔ سکندر اعظم کی سلطنت کی طرح اشوک اعظم کی سلطنت بھی خوب پھیلی مگر اس کا سبب تشدد نہیں، انسان دوستی اور امن تھا۔

یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ باطنی دانش علم، نجات اور بصیرت کی تلاش مہذب دنیا میں کم وبیش ایک ہی وقت (پانچویں صدی قبل مسیح) میں الگ الگ مقامات پر ہوئی۔ یونان میں سقراط، ایران میں زرتشت، مصر میں موسیٰ، چین میں لاؤ تزے اور ماؤ تزے، ہندوستان میں گوتم بدھ، جین ازم کا بانی مہاویر اور مہا بھارت کا لیجنڈری مصنف ویاس اس کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ بڑے خیالات ایک قسم کی ٹیلی پیتھی کے ذریعہ

اس وقت بنی نوع انسان میں پھیل جاتے ہیں جب وہ اس کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ یہ تمام راہنما اس بنیادی نکتہ پر متفق ہیں کہ اگرچہ ہماری خواہشات فطری طور پر غذا، سیکس، خوشی اور تحفظ کے ذریعہ اپنی تسکین چاہتی ہیں مگر ہم مادی دنیا سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوتے۔ ہمیں کچھ اور . . کسی گہری چیز کی تلاش رہتی ہے۔ ایک شرابی کی طرح جو ہمیشہ پیاسا ہوتا ہے مگر کوئی ایسی شراب نہیں ملتی جو اس کی پیاس مٹا دے۔ سقراط کے خیال میں یہ علم کی پیاس ہے۔ بدھ کی نظر میں امر ہونے کی تڑپ ہے اور یہودی پیغمبر سمجھتے ہیں کہ خدا کی جستجو ہے، پھر بھی سب کی مشترکہ بصیرت کی رو سے یہ باطنی امن کی خواہش ہے، اپنے اندر جھانکنے کی آرزو ہے اور یہ کہ مادی دنیا میں الجھ جانا ہمارے کسی کنفیوژن کا نتیجہ ہوتا ہے۔

رومن اس بصیرت سے بالکل محروم تھے۔ ان کی بے پایاں قوت ان کے سیلف کنٹرول اور سیلف ڈسپلن میں ظاہر ہوئی۔ انہیں علم دانش کی آرزو نہیں تھی۔ نہ وہ صوفیوں کی طرح دوام کے متلاشی تھے۔ ساری قدیم قوموں کی طرح انہیں مذہب پر پورا یقین تھا مگر اس یقین کا مصرف توہمات، خداؤں کے حضور قربانیاں اور شگون تھے۔ ہماری رائے میں ان باتوں کا مذہب سے شاید ہی کوئی تعلق ہو۔ جیسے عیسائیت میں بری نظر سے بچنے کے لیے اشاروں سے اپنے آپ پر صلیب بنانا مذہب کے لحاظ سے بے معنی ہے۔

اپنی ارتقائی یا صوفیانہ شکل میں مذہبی عقیدت شاید لیفٹ برین شعور کی **limitation** سے بچنے کی کوشش لگے۔ تمام مخلوق میں صرف انسان نے ہی شعور کی اس منقسم شکل کو ترقی دی ہے تاکہ وہ مخصوص اور ممتاز بات پر توجہ دے سکے۔ ہمیں ایسے مسائل اور پیچیدگیوں سے نمٹنے کے لیے اسے سیکھنا پڑا جو دوسری کسی بھی مخلوق کو خون کے آنسو رلا دیتے۔ اس بڑی اہلیت کی قیمت، اس کے دردسر، اس کے ٹینشن اور فریب بھی بڑے ہیں۔

مختلف وجوہات کی بنا پر یورپ کے لوگوں نے مشرق برصغیر اور چین کی نسبت لیفٹ برین شعور کو تیزی سے ترقی دی ہے۔ اس کی وجہ مشرق میں دیر سے ہونے والی ترقی بھی ہو سکتی ہے۔ 2 ہزار سال قبل مسیح تک چاول چین میں نہیں تھا۔ جس سے ایک زرعی انقلاب نے بڑی کمیونٹی کا وجود ممکن بنا دیا۔ شانگ کے دور میں بھی (جو1500 قبل مسیح کے قریب شروع ہوتا ہے) چین چھوٹے دیہات اور چھوٹے کھیتوں کا ملک تھا۔ اس کی وسعت کا مطلب تھا کہ سرحدی حملوں سے دور اس ملک کے رہنے والے امن میں رہتے ہیں۔ تیسری صدی قبل مسیح تک شی ہوانگ نے عظیم دیوار بنانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ شاید انہی وجوہات کی بنا پر ہی1500

قبل مسیح کے آس پاس آریاؤں کی آمد کے بعد بھی ہندوستان بنیادی طور پر رائٹ برین کلچر رہا۔ عجیب اتفاق ہے کہ لیفٹ برین کے ساتھ ہندوستان کا پہلا رابطہ اس وقت ہوا جب 327 BC میں سکندر اعظم، نے حملہ کیا۔ (اگر چہ ایرانی دوسو سال پہلے شمال مغربی ہندوستان کو اپنا صوبہ بنا چکے تھے) سکندر کی فتوحات کا سلسلہ بمشکل ہی دریائے سندھ سے آگے گیا ہو گا۔ سکندر کی موت سے پیدا ہونے والی بے چینی چندر گپت کے ماتحت ہندوستان کی پہلی سلطنت کی بنیاد بنی۔ اشوک اس کا پوتا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ اشوک نے سلطنت کے تصور کو بالکل نئے معنی دیئے تھے۔

غالباً یہ بحیرۂ روم میں زراعت کی ترقی کا پہلا دور تھا جس کے دوران میں کسان اس قابل ہوئے کہ ایک وسیع آبادی کی ضروریات پوری کر سکیں۔ شاید اسی وجہ سے روز افزوں ترقی میں اور زیادہ تیزی آئی اور اسی لیے اکثر حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ رومنوں نے چند صدیوں میں ہی سیدھی سادی زراعت سے عظیم الشان سلطنت تک کا سفر طے کر لیا تھا۔ جبکہ اس منزل تک آنے میں ہندوستان اور چین کو ہزاروں برس لگے۔ بحیرۂ روم ڈارون کی تعلیمات کا پرتو تھا جہاں کامیابی ہر قیمت پر حاصل کی جاتی تھی۔ یونانیوں کا مسئلہ کائنات، فطرت، انسان اور انسان کا مقدر تھا۔ مگر پیلوپنیسیا جنگ کی اذیتوں نے یونانیوں کو رومنوں کی طرح ظالم اور بے درد بنا دیا تھا۔ رومن، جنہوں نے بعد میں کارتھیج تباہ کیا تھا جب Melos نے 428 قبل مسیح میں آزادی کی خواہش کی تو یونانیوں نے ان کے مرد قتل کر دیے اور بچوں اور عورتوں کو غلام بنا کر بازاروں میں بیچ دیا۔ Thucydides کا کہنا ہے کہ یونانیوں کی مصیبت یہ تھی کہ وہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ آج نئے لیڈر منتخب کیے جاتے تو کل انہیں قتل کر دیا جاتا۔ بحیرۂ روم میں زندہ رہنے کے لیے فلسفیانہ مزاج کی گنجائش نہیں تھی۔

رومنوں کے متعلق یہ کہنا ممکن نہیں تھا کہ ان میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ ایک بار وہ فیصلہ کر لیتے تو پھر اس پر قائم رہتے تھے اور جب روم Etrusceans اور گال قوم کے ساتھ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا تو اسی خوبی نے روم کو عظمت کا درجہ دیا۔ ایٹرسکن بھی فلسفی تھے، ان میں مشرقی مزاج کی جھلک تھی۔ تاریخ نے انہیں بھلا دیا۔ روم ایک تندرست وتوانا کسان کی طرح، اس کی شان دار سادگی لیے اپنی مختصر سی تلوار سے دشمنوں کے گلے کاٹتا رہا۔ کارتھیج کی دولت نے اسے لالچ میں دیوانہ بنا دیا تھا۔ رومن اپنے سونے کے بستر اور کھانے کی میز کو سب سے بڑھ کر اہمیت دینے لگے تھے۔ جس تخیل نے انہیں بڑا

بنایا تھا، اس کے نہ ہونے سے وہ کوتاہ نظر اور ظالم بن گئے۔ ایسے وقت جب رومن یونانیوں سے متاثر ہو سکتے تھے، بڑے سوالات اور بلند خیالات کے متعلق سوچ سکتے تھے، وہ اپنی آج کے تقاضوں سے آگے نہ دیکھ سکے۔ آگسٹس، کلاڈئیس، ہاڈرئین اور مارکس اوریلیئس جیسے شہنشاہوں کے باوجود روم کا زوال اس کا عروج نہ بن سکا۔

روم کی باقی کہانی روم کے مجرمانہ تشدد کی کہانی ہے۔ یہ کہانی 78 قبل مسیح میں سلا کی موت کے فوراً بعد شروع ہوئی۔ اٹلی کی سڑکوں بلکہ خود روم کی سڑکوں پر ہر طرف ڈاکو ہی ڈاکو تھے اور قتل زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ سمندر، اچانک قزاقوں سے بھر گئے۔ مومسین اسے 'قزاقوں کا سنہرا دور' کہتا ہے۔ خرابی اتنی بڑھ گئی کہ مصر اور افریقا سے درآمد کیے جانے والے اناج کا صرف تیسرا حصہ روم کی بندرگاہوں پر پہنچتا تھا۔ قزاقوں کے جہاز ہلکے اور تیز رفتار تھے۔ وہ دور رہ کر مال بردار جہازوں کا پیچھا کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے پورٹ تک آ جاتے اور پہرے داروں کو قتل کر کے جہاز لوٹ لیتے تھے۔ جہاز میں سوار عورتوں اور مردوں کو بھی لوٹ کا مال سمجھ کر آپس میں بانٹ لیا جاتا، تاکہ انہیں غلاموں کی طرح بیچ سکیں۔ یونانی جزیرہ غلاموں کی منڈی بن گیا جہاں ہزاروں غلام ہر روز بکتے تھے۔ قزاق جلد ہی اتنے مال دار اور طاقت وَر بن گئے کہ بندرگاہوں سے ان کی حفاظت کے لیے 'غنڈہ ٹیکس' کا مطالبہ کرنے لگے۔ صوبہ سلیشیا (اب شمالی ترکی) قزاقوں کا مضبوط اڈہ بن گیا۔ روم انہیں جرائم پیشہ بنانے کا ذمہ دار تھا۔ شکست خوردہ کورینتھ اور کارتھیج کے شہریوں کی ایک بڑی تعداد اس کے سوا روزی کمانے کا کوئی اور طریقہ نہیں جانتی تھی۔

سلا کی موت کے پانچ سال بعد، رومی فوج کا ایک مفرور سپارٹکس نامی ایک گلیڈئیٹر چند غلاموں کے ساتھ ماؤنٹ وسودیس پر چھپ گیا۔ جب اور غلاموں کو ان کا پتہ چلا تو وہ بھی آ کر ان میں شامل ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اب پکڑے گئے تو انہیں اذیتیں دے کر مار دیا جائے گا۔ اس لیے وہ ان رومی فوجوں کے ساتھ بڑی بے جگری سے لڑتے جو انہیں پکڑنے کے لیے بھیجی جاتی تھیں۔ انہیں اس سلسلہ میں فتوحات بھی حاصل ہوئیں۔ رومن اس پر حیران رہ گئے، وہ سمجھتے تھے کہ ان کی فوجیں ناقابل تسخیر ہیں۔ مزید خرابی یہ تھی کہ ان کے پاس کوئی ایسا لائق جنرل نہیں تھا جسے وہ بغاوت کچلنے کے لیے بھیجتے۔ ان کا بہترین آدمی پومپئی سپین میں ایک اور باغی سے لڑ رہا تھا۔ آخر رومنوں نے **Crassus** نامی ایک لکھ پتی، ایک موقع پرست (جس نے سزا یافتہ سینیٹروں کی زمینیں بیچ کر دولت جمع کی تھی) کو بغاوت رفع

کرنے کے لیے مقرر کیا۔

کراسس خوش نصیب تھا۔ مسلسل کامیابیوں نے غلاموں کو خونخوار درندوں میں بدل دیا تھا جن کا واحد مقصد قتل اور ریپ تھا۔ ایک چھوٹی سطح پر سپارٹکس کے ساتھی روم کی تاریخ دہرا رہے تھے کہ اپنے عزم وارادہ کے زور پر روم نے کامیابی حاصل کی اور کامیابی نے اسے گمراہی اور ظلم کے راستہ پر ڈال دیا۔ انتقام اور دولت کے نشہ میں دھت غلاموں نے اٹلی چھوڑ دینے کے متعلق سپارٹکس کے مشوروں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ حد سے بڑھ کر عیش وعشرت میں مگن تھے۔ سپارٹکس کا مشورہ ماننے کے بجائے انہوں نے روم کی اعلیٰ تربیت یافتہ فوج پر حملہ کر دیا جس نے ان کے پرخچے اڑا دیئے۔ سپارٹکس جنگ میں مارا گیا اور اس کے چھ ہزار ساتھیوں کو روم جانے والی سڑکوں پر پھانسی دی گئی۔

پومپئی مفروروں کو مارنے کاٹنے کے لیے سپین سے بھاگم بھاگا آیا۔ وہ کراسس سے پہلے روم پہنچ گیا۔ اسے فتح کا ایوارڈ دیا گیا جبکہ کراسس کو اپنے اعزاز میں ایک پریڈ پر صبر کرنا پڑا۔

یہ پومپئی، افریقا میں ایک ابتدائی فتح کے بعد 'عظیم' کہلاتا تھا۔ وہ میریس اور سلا ہی کی قسم کا سپاہی تھا، ایک شان دار جنرل، ایک ایمان دار انسان اور واجبی سا سیاستدان۔ سپارٹکس پر اپنی 'فتح' کے دو سال بعد وہ کونسل کے انتخاب کے لیے کھڑا ہوا تو امرا نے اسے کم عمر (وہ چھتیس سال کا تھا) کہہ کر رد کر دیا۔ اس نے اپنی سائڈ بدل کر 'عوام کی پارٹی' میں شمولیت اختیار کر لی، کراسس جس کا سرکردہ رہنما تھا۔ اسی طرح ایک نوجوان جولیس سیزر، میریس کا بھتیجا بھی اس کے رہنماؤں میں سے تھا۔ جولیس سیزر کی خوبیاں اتنی نمایاں تھیں کہ ڈکٹیٹر سلا مشکل سے ہی اسے اس کے بائیسویں برس میں قتل کرنے سے باز رہا۔ اپنے انکل میریس کی طرح سیزر فتح و کامرانی کے خواب دیکھتا تھا۔ یہ انوکھی تکون، خود پسند جنرل، نیک لکھ پتی اور ایک تیکھا نوجوان دانشور، ایک ایسے معاہدہ میں منسلک ہوئے جس نے انہیں روم کی قسمت کا مالک بنا دیا۔

سپارٹکس سے جنگ کے دوران میں قزاق ہمیشہ سے زیادہ دلیر اور رومن بددل ہو گئے تھے۔ ان کا نصف اناج لوٹ لیا جاتا۔ ساحلی شہروں پر اتنے حملے اور ان حملوں میں اتنی لوٹ مار ہوتی کہ ان کے مکینوں کو ملک کے اندرونی علاقوں میں پناہ لینا پڑتی۔ قزاق جہاں چاہتے خشکی پر اتر جاتے اور اس وقت تک وہاں بھٹکتے رہتے جب تک کہ تاوان وصول کرنے

کے لیے کسی کو اغوا نہ کر لیتے۔ جب وہ کسی گاؤں یا شہر کو لوٹ لیتے تو ساحل سمندر پر آرام کرتے اور خوشیاں مناتے مگر یولیسس کے برعکس انہوں نے شاید ہی کبھی دشمن فوج کا سامنا کیا ہو۔ رومن سخت بے بسی کے عالم میں تھے، بحیرۂ روم میں قزاقوں کے کئی جہاز تھے اور کوئی نہایت طاقت وَر فوج بھی ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

68 قبل مسیح میں پومپئی اور اس کے حامیوں نے روم کے لوگوں کو آمادہ کیا کہ کچھ بھی ہو اس صورتِ حال پر قابو پانا ہے۔ اگلے سال پومپئی نے ایک لاکھ بیس ہزار جوانوں اور 270 جہازوں پر مشتمل فوج بنائی۔ جنگ کے اخراجات کے لیے تقریباً ساٹھ لاکھ پاؤنڈ جمع کیے گئے۔ اسے قزاقوں کے مضبوط اڈوں کا پتہ تھا۔ ان پر بیک وقت حملہ کرنا تھا تاکہ قزاق ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکیں۔ یہ کام مکمل کرنے کے لیے اسے تین برس دیئے گئے۔ اس نے اتنا اچانک اور اتنا شدید حملہ کیا کہ آدھا کام تو اس نے پہلے چالیس دنوں میں ختم کر لیا۔ رومن بحری جنگ کے ماہر نہیں تھے مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ جونہی رومن منظر پر آئے قزاق اپنے اڈوں کی طرف بھاگے۔ رومن سپاہی ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں ساحلوں سے باہر نکال دیا۔ وہ قاتل اور لٹیرے تربیت یافتہ رومن فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ جب پتہ چلا کہ پومپئی ہتھیار ڈالنے والوں کو معاف کر دے گا، تو ہزاروں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ پونٹس کا متھریڈاٹس (جو سلیشیا کے قزاقوں کی مدد کیا کرتا تھا) مایوسی کے ساتھ قزاقوں کے اڈے تباہ ہوتے دیکھتا تھا۔ بیس ہزار قزاق گرفتار ہوئے، دس ہزار مارے گئے اور ان کے تمام اڈے اور شپ یارڈ تباہ کر دیے گئے۔ قیدیوں کو پھانسی دینے کے بجائے پومپئی نے انہیں ایسے شہروں میں آباد کر دیا جو قزاق خالی کر گئے تھے۔ اسے امید تھی کہ اگر موقع ملے تو ان میں سے اکثر حلال کی روزی کمانے لگیں گے۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ پومپئی نے تین مہینوں میں بحیرۂ روم میں قزاقی کا خاتمہ کر دیا۔

اس فتح کے بعد روم والوں کو یقین آ گیا کہ پومپئی کو آگے بڑھنے سے روکنا ممکن نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے فوج دے کر ایشیائے کوچک رخصت کیا کہ متھریڈاٹس کو ختم کرے جس کی شرارتیں اب اور بڑھ رہی تھیں کہ اس نے اپنے داماد تگرانیس کو اکسایا کہ شام اور کریمیا پر قبضہ کر لے۔ پومپئی نے تگرانیس کو گرفتار کر لیا اور متھریڈاٹس کا پیچھا کریمیا کی طرف کیا جہاں اس نے اپنے بیٹے کی بغاوت کی خبر سن کر خودکشی کر لی۔ پومپئی آگے بڑھا اور یروشلم فتح کر لیا۔ اسی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔ پومپئی نے اپنے طریقہ سے سکندر اعظم جیسے

کارنامے سرانجام دیے تھے۔

اس عرصہ میں پومپئی کا اتحادی جولیس سیزر سپین میں اپنا نام پیدا کر رہا تھا۔ سیزر ہونہار نوجوان تھا مگر کسی کو یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ایک عظیم قومی رہنما بنے گا۔ سیزر بانکا سجیلا نوجوان تھا، خوشبوئیں لگاتا، شعر کہتا اور مردوں عورتوں دونوں سے عشق بازی کرتا تھا۔ وہ 1890's کے آسکر وائلڈ سے بڑی حد تک مشابہ تھا۔ موسمسین اسے روم کا واحد تخلیقی جینئس کہتا تھا۔ مگر اکثر رومنوں کی طرح سیزر میں جینوئن تخلیق کار بننے کے لیے تخیل کی کمی تھی۔ اس میں رومنوں جیسی رعونت بھی تھی۔ نوجوانی میں اسے قزاقوں نے پکڑ لیا تو انہوں نے 20 ٹیلنٹ (چار ہزار پاؤنڈ) بطور تاوان طلب کیے۔ سیزر نے اتنے حقیر مطالبہ کو اپنی توہین سمجھا اور غصہ میں آ کر کہا کہ وہ پچاس ٹیلنٹ ادا کرے گا۔ تاوان کی رقم کا انتظار کرتے ہوئے وہ ان کے درمیان اس طرح رہا گویا کہ وہ اس کے نوکر ہیں۔ اس نے انہیں کہا کہ جب تک وہ نیند سے بیدار نہ ہو، سب خاموش رہیں۔ وہ ان کے کھیلوں میں حصہ لیتا، انہیں بٹھا کر اپنے شعر سناتا اور ناکافی داد ملنے پر برا بھلا کہتا بلکہ انہیں بتا دیتا کہ وہ آزاد ہو کر انہیں سولی پر لٹکا دے گا۔ وہ اسے بگڑا ہوا بچہ سمجھ کر اس کا مذاق اڑاتے مگر تاوان ادا کر کے سیزر جوں ہی آزاد ہوا اس نے ایشیائے کوچک کی ایک بندرگاہ سے کئی جہاز لیے اور واپس آ کر قزاقوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے انہیں صلیب پر چڑھایا مگر انسانی ہمدردی کے خیال سے ان کے جسموں میں کیل گاڑنے سے پہلے ان کے گلے کاٹ دیئے۔

سیزر سپین سے واپس آیا تو اسے aedile (تقریبات کا انچارج) بنا دیا گیا اس نے کراسس سے ایک بڑی رقم لے کر چند شاندار شو پیش کیے۔ ایک شو میں گلیڈیئٹرز کے 320 جوڑوں نے کام کیا تھا۔ جس سے سیزر کو لوگوں میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی لیے کراسس اس سے دوستی چاہتا تھا۔ جب 62 قبل مسیح میں پومپئی اپنی فتوحات سے واپس آیا، جولیس سیزر اس وقت تک ایک ایسی طاقت بن چکا تھا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ سینٹ نے پومپئی کو سرزنش کر کے اس سے اپنی بے زاری کا اظہار کیا (کیونکہ وہ 'عوامی پارٹی' میں شامل ہوا تھا) سیزر نے اتحاد کی خواہش کی۔ وہ روم کا مقبول ترین جبکہ کراسس امیر ترین شخص تھا۔ پومپئی ان کا سب سے بڑا ہیرو تھا۔ تینوں متحد ہو کر جو چاہتے کر سکتے تھے۔ سینٹ کو لوگ نظر انداز کر دیتے۔ سپارٹکس کی شکست کے بعد پومپئی اور کراسس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے، اب دونوں کو اتحاد میں بھلائی نظر آئی۔ اپنے دوستوں میں وہ حاکموں کی تکون کے

نام سے جانے گئے جبکہ دشمنوں میں 'سہ سمتی عفریت' مشہور ہوئے۔

اگلے سال 59 قبل مسیح میں سہ سمتی عفریت کو پہلی کامیابی حاصل ہوئی کہ امرا کی زبردست مخالفت کے باوجود سیزر کونسل منتخب ہو گیا۔ جس کے بعد سیزر نے پومپئی کی خواہش پر سپاہیوں کو زمینیں دیں۔ پومپئی اور کراسس نئے قوانین نافذ کرنے والے کمیشن کے سربراہ مقرر کیے گئے۔ تینوں اتحادی درحقیقت روم کے حکمران تھے۔

اس طرح ایک نئے عہد کا آغاز ہو سکتا تھا۔ تینوں ذہین تھے، کسی کی ذہنیت آمرانہ نہیں تھی۔ تینوں مل کر ملک میں خوشحالی اور روشنی کا ایک نیا دور لا سکتے تھے۔ مگر روم کی قسمت میں ایک اور ایتھنز بننا نہیں تھا۔ وہ سیاسی جوڑ توڑ میں بہت دور چلا گیا تھا۔ سیزر جلد ہی آئے دن کی غیبت اور اندرونی خلفشار سے اکتا گیا اور مہم جوئی اور فتوحات کی تلاش میں گال کی سمت روانہ ہو گیا۔ آئندہ پانچ برس میں دونوں اسے حاصل ہو گئے۔ جب اس کی فوجوں نے گال کو رائن Rhine سے شمالی افریقا تک زیر کر کے چینل عبور کیا اور نصف برطانیہ فتح کر لیا۔ روم میں پومپئی اور کراسس نے اس کی فتوحات کو ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا۔ کراسس نے اپنے آپ کو شام میں فوج کا کمانڈر مقرر کر لیا۔ اور سیزر سے بازی لینے کی کوشش میں روم سے روانہ ہو گیا۔ مگر اس کا انجام تباہی اور ہلاکت تھا۔ اس نے ایسا کام کرنے کی کوشش کی جس کا وہ اہل نہیں تھا۔ اس کی فوج قتل ہو گئی اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ جب امرا نے پومپئی کو روم کا واحد کونسل بننے کی دعوت دی تو وہ سیزر کے ساتھ غداری پر تیار ہو گیا۔

جب سیزر کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی فوج چھوڑ دے اور روم واپس آئے تو وہ سمجھ گیا کہ حالات خطرناک ہو چکے ہیں۔ ہمیں یہ بات شاید احمقانہ لگے کہ جس شخص نے آدھا یورپ فتح کر لیا تھا اسے کسی کا ڈر ہو، مگر سیزر جانتا تھا کہ اس کی فتوحات نے صرف حسد پیدا کیا تھا۔ اور تمام معمولی لوگوں کی طرح رومنوں کو غیر معمولی سے نفرت تھی۔ عظمت سے دشمنی تھی۔ سیزر نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی فوج اس دریا Rubicon کے کنارے لے گیا جو فرانس کو اٹلی سے الگ کرتا تھا۔ جب سینٹ نے اسے حکم دیا کہ اپنی فوج منتشر کر دے ورنہ اسے لوگوں کا دشمن سمجھا جائے گا تو اس نے فوج کو دریا پار کرنے کا حکم دے دیا۔

پومپئی یونان بھاگ گیا، سیزر فاتحانہ انداز سے روم داخل ہوا اور کونسل بن گیا۔ تب سیزر یونان گیا اور پومپئی کی اعلیٰ درجہ فوجوں کو پراسولس کے مقام پر شکست دی۔ پومپئی مصر روانہ ہوا مگر جونہی اس نے ساحل پر قدم رکھا، اسے پیٹھ میں چھرا مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ مصر کو

شکست خوردہ جرنیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پومپئی کی موت سے بے خبر سیزر نے مصر میں اس کا پیچھا کیا۔ جہاں وہ نوعمر بادشاہ ٹولمی اور اس کی بہن کلوپیٹرا کے جھگڑے میں الجھ گیا۔ سیزر نے کلوپیٹرا کی طرف داری کی اور ٹولمی Ptolemy کی فوجوں کو شکست دی۔ کلوپیٹرا مصر کی ملکہ بن گئی اور سیزر واپس روم سدھارا جہاں عوام نے اس کا عظیم الشان استقبال کیا۔ اس کی گاڑی پر تحریر تھا "میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کیا"۔ میریس اور سلا کے برعکس اس نے اپنے تمام دشمنوں کو معاف کر دیا۔ یہ اس کی غلطی ثابت ہوئی، انہوں نے اسے 15 مارچ 44 قبل مسیح کو سینیٹ میں چھرا مار کر قتل کر دیا۔

عجیب بات ہے کہ رومن اپنے اتنے بڑے آدمی کو قتل کر دیں جس کا پہلے کوئی ثانی نہیں ہوا اور جس نے انہیں ماضی کی دولت اور عظمت واپس لا کر دی۔ مگر روم گٹر بن چکا تھا، ہر چند کہ سیزر نے انہیں دولت اور سلطنت واپس دی مگر انہیں ان کے اپنے ظلم اور کمینگی سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

جنہوں نے شیکسپیئر پڑھا ہے وہ سب کہانی کا دوسرا حصہ جانتے ہیں۔ مارک انٹونی کا زور بیان جس نے روم کے ہجوم کو قاتلوں کے خلاف کر دیا، انٹونی اور سیزر کے بھتیجے اور وارث اوکٹیویس کے درمیان رسہ کشی، مصر میں کلوپیٹرا کے ساتھ انٹونی کی عشق بازی اور اس کا اپنی بیوی اوکٹیویا (اوکٹیویس کی بہن) کو چھوڑ دینا اور آخر میں ان سب کا انٹونی اور کلوپیٹرا کی خودکشی کی صورت میں افسوس ناک انجام۔ مگر اتنا تو ہوا کہ اوکٹیویس روم کا حاکم بن گیا اور شہنشاہ آگسٹس کے نام سے اس نے دانش مندی کے ساتھ روم پر چالیس برس سے زیادہ حکومت کی۔

رومی مؤرخ سوئٹونیس سیزر کے سکینڈل بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ آگسٹس کی ذاتی زندگی عامیانہ تھی۔ اس کے متعلق ایک درجن یا اس سے زیادہ کہانیاں سنانے کے بعد وہ اپنا فیصلہ سناتا ہے کہ رومنوں کا اخلاقی معیار گرا ہوا تھا۔ ایک کہانی میں بتایا گیا ہے کہ جولیس سیزر نے جنسی تعلق کے بدلے اوکٹیویس کو اپنا وارث بنایا تھا کہ یہ اوکٹیویس عورتوں کا شوقین تھا۔ ایک بار وہ شوہر کے سامنے اس کی بیوی کو میز سے اٹھا کر بیڈ روم میں لے گیا۔ کچھ دیر بعد اسے واپس لایا تو وہ شرما رہی تھی اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور یہ کہ بڑھاپے میں بھی کم و بیش اس کی یہی عادت تھی۔ پھر بھی اصولی طور سے اسے قدیم رومی قدروں پر یقین تھا اور چاہتا تھا کہ ان پر عمل کیا جائے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیٹی جولیا

(شہنشاہ ٹائبیریس کی بیوی) اس کی طرح جنسی تعلقات میں انتہا پسند ہے اور اپنے شوہر کے سپاہیوں بلکہ غلاموں کو بھی جنسی تعلق پر مجبور کرتی ہے تو اسے اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے اسے ہمیشہ کے لیے جلاوطن کر دیا۔

اگر آگسٹس بذاتِ خود (اس کی بیٹی سے قطع نظر) اس قسم کی مثال قائم کرتا تو باقی روم سے کیا توقع رکھ سکتا تھا۔ آگسٹس نے روم کی دولت روم کی نئی تعمیر پر خرچ کی، راستے راہزنوں سے پاک کیے، شہر کی پہلی پولیس فورس قائم کی اور پہلا فائر بریگیڈ بنایا، اس نے The Art of Love' لکھنے پر اووڈ کو دیس نکالا دے دیا اور ورجل پر انعامات کی بارش کی، جس نے کھیتوں کھلیانوں کے بارے میں لکھا اور روم کے ماضی کو پکارا کہ پلٹ آئے۔ مگر روم کے لوگوں کا ہجوم تفریح مانگتا تھا۔ آگسٹس انہیں خوش رکھنے کے لیے چھٹیوں کی تعداد لگاتار بڑھاتا رہا یہاں تک کہ سال بھر میں چھٹیوں کی تعداد بالآخر 117 ہو گئی۔ وہ انہیں شان دار شو دکھاتا اور تفریح مہیا کرتا تھا۔ دولت کی اس ریل پیل میں رومن امرا بسیار خوری اور سیکس کو اپنی تفریح کا ذریعہ بناتے۔ قوانین کی مدد سے آگسٹس نے صورتِ حال بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس نے کھانے کے ساتھ شراب پینے کی ایک رضا کارانہ حد بھی مقرر کی۔ جب وہ آخر 14 عیسوی میں فوت ہوا، آگسٹس اس وقت تک روم میں امن اور خوش حالی لا چکا تھا۔ مگر روم کی مایوس کن اور ناقابل اصلاح کریمنلٹی کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

اس کا جانشین، پہلے شوہر سے لیویا کا بیٹا ٹائبیریس ایک تلخ مزاج، تنہائی اور داخلیت پسند شخص تھا۔ جب وہ شہنشاہ بنا اس کی عمر چھپن برس تھی۔ اوائل عمر میں وہ ایک بہادر سپاہی لگتا تھا۔ اس کی شادی وپسانیہ، اپنی محبوبہ سے ہوئی تھی۔ اس کی سوتیلی بہن جولیا (آگسٹس کی بیٹی) کو اس سے گہری محبت ہو گئی۔ آگسٹس نے اسے حکم دیا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے اور جولیا سے شادی کرے۔ رومن ارسٹوکریسی میں اس قسم کے انتظامات عام تھے، جہاں سیاسی عہد ناموں پر شادیوں کی مہر لگائی جاتی تھی۔ ٹائبیریس سے جو کہا گیا تھا اس نے وہی کیا۔ اس کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا مگر جولیا کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ رہے جس کے جنسی تقاضے اس کے بس سے باہر تھے۔ تقریباً پچیس برس کی عمر میں وہ اپنی مرضی سے جلاوطن ہو کر جزیرہ رہوڈز چلا گیا یا شاید جولیا کے کہنے پر اسے آگسٹس نے جلاوطن کیا ہو۔ اس نے سات برس جلاوطنی میں گزارے۔ مگر جب واپس آیا تو اس نے اسیریا کی بغاوت دبا کر اپنی شان دار سپہ گری کا ثبوت دیا۔ اس کی سخت گیری نے اسے اپنے سپاہیوں میں نامقبول کر

دیا۔ مگر وہ کہا کرتا تھا کہ ''جب تک وہ میرا حکم مانتے ہیں، انہیں مجھ سے نفرت کرنے دو۔''
جولیا نے آگسٹس کو تین نواسوں کا تحفہ دیا کہ شاید ٹائبیریس کی نسبت شاہی تاج پر ان کا حق ہو، مگر ان میں سے دو پراسرار حالات میں مر گئے۔ شاید انہیں لیویا نے قتل کیا ہو اور تیسرا آگسٹس کی موت کے فوراً بعد قتل ہو گیا۔ اس طرح ٹائبیریس 14 عیسوی میں روم کا حکمران بن گیا۔

شہنشاہ کی حیثیت میں بھی وہ ڈسپلن کے معاملہ میں اتنا ہی سخت گیر تھا جتنا کہ جنرل ہونے کی حیثیت میں تھا۔ زنا کے خلاف قوانین بنا کر اس نے روم کی اخلاقی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی۔ سوتونیس ہمیں روم کے اس دور کی اخلاقی جھلک اس طرح دکھاتا ہے کہ جب ایک رومن سردار نے عہد کیا کہ اس کی بیوی کچھ ہی کرے وہ اسے طلاق نہیں دے گا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی اس کے بیٹے کے ساتھ بستر میں سوئی ہوئی ہے۔ جس کے بعد ٹائبیریس نے اس سردار کو اس کے عہد سے آزاد کر دیا۔ اچھے گھروں کی عورتوں نے طوائفوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکنا شروع کر دیا۔ ایسے تمام مجرم جلاوطن کر دیے گئے۔ اس نے لوگوں کی تفریحات اور عیاشیاں کم کر کے انہیں اپنا دشمن بنا لیا۔ سوتونیس کہتا ہے کہ ٹائبیریس کی سخت گیری میں اس کی اذیت پسندی پوشیدہ تھی۔

اپنی حکومت کے پہلے دس بارہ برس ٹائبیریس اپنے پیش رو آگسٹس کے راستہ پر چلتا رہا۔ اس کی فوقتاً فوقتاً سختیوں کو اس کے فوجی مزاج کا شاخسانہ سمجھ کر معاف کیا جاتا رہا۔ مگر اس کے قابل اعتماد مشیر اس کے حفاظتی دستہ کے کمانڈر سیجانس نے اسے روم سے کیپری چلے جانے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں لوگ ٹائبیریس کو اتنا ناپسند کرنے لگے تھے کہ اس کا روم میں رہنا بے کار تھا۔ (اصل میں سیجانس خود شہنشاہ بننا چاہتا تھا) اس طرح ٹائبیریس نے اپنے آپ کو تمام پابندیوں سے آزاد کر لیا اور ان تمام جنسی گمراہیوں میں مبتلا ہو گیا جو نوجوانی میں اس کا شعار رہا تھا۔ سوتونیس مزے لے لے کر ان کمروں کا ذکر کرتا تھا جو ٹائبیریس کی ان واہیات تصویروں اور مجسموں سے آراستہ تھے جن میں وہ عورتوں اور لڑکوں کے ساتھ عیاشی کرتا دکھایا جاتا ہے۔

سیجانس کو اب روم میں پورا اختیار حاصل تھا۔ وہ اپنا وقت سرداروں پر الزام لگانے، انہیں قتل کرنے یا خودکشی پر مجبور کر دینے میں گزارتا۔ 23 عیسوی میں اس نے ٹائبیریس کے بیٹے Drusus کو بیماری کے بہانے زہر دے کر مار دیا۔ مگر وہ ٹائبیریس جیسے شکی مزاج شخص

کو دھوکا نہ دے سکا۔ اسے گرفتار کر کے اس پر سازش کا الزام لگایا گیا۔ قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کوڑے پر پھینک دی گئی جہاں وہ تین دن پڑی سڑتی رہی۔ سیجانس کے بچے بھی قتل کر دیے گئے۔ چودہ برس کی ایک بیٹی تھی جسے کنواری ہونے کی وجہ سے رومن قانون کا تحفظ حاصل تھا، جلاد نے اسے قتل کرنے سے پہلے ریپ کر کے قانونی سقم دور کر دیا۔ یہ افواہ سن کر کہ اس کے بیٹے Drusus کو قتل کیا گیا تھا، ٹائبیریس نے دہشت کا ایک نیا دور شروع کر دیا جو چھ سال بعد اس کی موت تک بے دریغ جاری رہا۔ معمولی بہانوں پر مقدمے بنائے جاتے اور شہریوں کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ جب آخر 78 سال کی عمر میں وہ اپنے سب سے بڑے خوشامدی کے ہاتھوں گلا گھونٹنے سے مارا گیا تو روم کے لوگ خوشی سے پاگل ہو گئے۔

مناسب ہو گا اگر ہم یہ بتاتے چلیں کہ بعض مؤرخ سمجھتے ہیں کہ سوتونیس اور تیسی تس کی طرف سے لگائے گئے جنسی گمراہی کے الزام محض گپ ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ دارالحکومت کی کرپشن اور برائی سے تنگ آ کر ٹائبیریس کیپری چلا گیا تھا کیونکہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات سچ ہو سکتی ہے مگر جن لوگوں کو خواہ مخواہ قتل کیا گیا ہے ان کی تفصیل غلط نہیں ہو سکتی۔ بات یہ ہے کہ ٹائبیریس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ روم کی تاریخ کا ناگزیر باب تھا۔ جب اس نے مصیبتوں اور چیلنجوں کا سامنا کیا وہ قابل تحسین تھا۔ مگر جب اس نے وہ کیا جو چاہتا تھا تو اپنی جذباتیت اور بوریت کا شکار ہو گیا۔ یہ ثابت قدمی، فورس 'C' کا نہ ہونا تھا جس نے اسے کریمنل بنا دیا۔ تخیل کے فقدان، مذہبی یا فلسفیانہ خیالات کی کمی کی وجہ سے رومن اپنے جوہر صرف عملی مسائل میں دکھا سکتے تھے۔ کامیابی نے انہیں ان کی بدترین خرابیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

یہ اس شخص کیلی گلا کے بارے میں اور بھی آشکارا ہے جسے ٹائبیریس نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ وہ پچیس برس کا تھا جب اس نے اقتدار سنبھالا۔ اس نے فوراً ہی لوگوں پر دولت نچھاور کر کے اپنی مقبولیت میں اور اضافہ کر لیا۔ اس نے گلیڈیئٹروں کے مقابلے بھی شروع کر دیئے۔ دراصل اسے دولت لٹانے کا خبط تھا۔ اس کے جہاز تین میل (جن پر مٹی اور لکڑی کے تختے بچھے تھے) تک دوہری قطار میں لنگر انداز تھے۔ جس پر کسی ستم ظریف نے کہا تھا کہ شہنشاہ بننے کے بجائے یہ امکان زیادہ ہے کہ کیلی گلا خلیج Baiae پر چلے مگر اس کے جوتے نہ بھیگیں۔

جلد ہی پتہ چل گیا کہ طاقت کے نشہ میں وہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ خدا ہے اور جوپیٹر نے اپنا گھر اس کے ساتھ شیئر کرنے کو کہا ہے۔ اس نے اپنی تین

بہنوں کے ساتھ اس بنا پر حرام کاری کی کہ ایسا کرنا خدا کے لیے جائز ہے اور یہ کہ جوپیٹر اپنی بہن جیونو کے ساتھ سویا تھا۔ اس نے ٹائبیریس کے قانونی بہانوں سے بے نیاز ہو کر قتل کا بازار گرم دیا۔ ایک دن جب وہ ایک گلیڈ یئٹر کے ساتھ لکڑی کی تلوار سے لڑ رہا تھا، گلیڈیئٹر جان بوجھ کر گر گیا کیلی گلا نے خنجر نکال کر اسے مارا اور ہلاک کر دیا۔ پھر چاروں طرف خون آلودہ خنجر دکھاتے ہوئے دوڑا کہ میں جیت گیا ہوں۔

ایک دفعہ جب وہ ایک عبادت گھر میں قربانی کے موقع پر مہمانِ خصوصی تھا اور اسے ایک جانور کو ہتھوڑا مار کر تقریب کا افتتاح کرنا تھا تو اس نے ہتھوڑا گھما کر اس پجاری کے سر میں دے مارا جس نے قربانی کے جانور کا گلا کاٹنا تھا۔ پجاری چوٹ لگنے سے بے ہوش ہو گیا اور کیلی گلا کی نظر میں یہ ایک مذاق تھا۔ ایک دعوت میں اس نے اچانک ہنسنا شروع کر دیا اور جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو اس کا جواب تھا کہ ''یونہی مجھے خیال آیا کہ میرے ایک اشارے پر تم سب کی گردنیں کٹ سکتی ہیں۔'' جب اسے بتایا گیا کہ سرکس کے جانوروں کو کھلانے والا گوشت مہنگا ہو گیا ہے تو اس نے حکم دیا کہ سرکس کے درندوں کو مجرم کھلا دیئے جائیں کہ یہی بچت کا طریقہ ہے۔ اس کے سامنے مجرموں کی قطار لگی ہوئی تھی اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ سب کو قتل کر دو۔ وہ کہتا تھا کہ ''روم گردنوں کا شہر ہے جو میرے حکم پر کٹنے کی منتظر ہیں۔'' جب اس کے پاس دولت ختم ہونے لگتی تو وہ دولت مندوں پر مختلف الزام لگا کر ان کی دولت اپنے قبضہ میں لے لیتا۔ سزا دینے کے لیے اس کا بہترین طریقہ ''ہزار زخموں کی موت'' کہلاتا تھا۔ جس میں سینکڑوں زخم لگائے جاتے تھے۔

حیرت کی بات ہے کہ کیلی گلا اتنا عرصہ شہنشاہ کی حیثیت میں زندہ رہا، اس کی ایک وجہ جرمن سپاہیوں پر مشتمل اس کا حفاظتی دستہ بھی ہے۔ ایک روز وہ اکھاڑے میں ٹہل رہا تھا کہ شاہی دستہ کے ایک افسر نے اسے کاٹ کر گرا دیا اور اس کی رانوں کے اندر خنجر سے گہرے زخم لگائے۔ باقی سپاہیوں نے محل جا کر اس کی بیوی قتل کر دی اور اس کی بچی کو دیوار سے مار کر اس کا سر توڑ دیا۔

محل کے پہرہ داروں نے ایک پردے کے پیچھے کیلی گلا کے چچا کلاڈیئس کو ڈھونڈ لیا۔ کلاڈیئس ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ وہ اس لیے اتنا عرصہ (پچاس برس) زندہ رہا کہ اسے ہر کوئی 'بے ضرر احمق' سمجھتا تھا۔ گارڈ اسے چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے اسے شہنشاہ بنا دیا، سچ یہ ہے کہ کلاڈیئس شان دار شہنشاہ ثابت ہوا۔ قتل ہونے سے پہلے تیرہ برس تک اس نے

آگسٹس کی طرح انصاف اور تدبر سے حکومت کی۔

رابرٹ گریوز کے دو ناولوں میں کلاڈئیس بارہ مشہور ترین سیزروں میں سے ایک بتایا گیا ہے۔ گریوز اسے مہربان اور نفیس آدمی کہتا ہے۔ ملازموں اور بیویوں کے فریب میں آ جانے والا مگر تیز فہم اور نیک نیت شخص۔ ویسے تو وہ بہت حد تک سچ ہے مگر پوری بات سمجھنے کے لیے ہمیں سوتونیس کی نسبتاً کم جانب دارانہ رائے پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ سوتونیس کہتا ہے کہ اس کے ظلم اور سنگ دلی کی مثال یہ ہے کہ وہ مجرموں کا ٹارچر ہونا بڑے شوق سے دیکھتا تھا جیسے کسی شخص کو کوڑے مار کر مار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ اذیت پسندی اسے اپنے خاندان سے ورثہ میں ملی تھی۔ اس کا چچا ٹائبیریس بھی ان میں شامل ہے۔ کیلی گلا اور ٹائبیریس کی طرح اس پر بھی جنسی جنون سوار تھا۔ اس لیے عورتوں کے ساتھ اس کے عیش کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ اگر ارینا (اکھاڑے) کے ساز و سامان میں کوئی کمی رہ جاتی تو اس کمی کے لیے ذمہ دار شخص کو وہ شیروں کے ساتھ لڑنے کا حکم دیتا تھا۔ سوتونیس نے چند ایسے افراد کی یہ فہرست تیار کی ہے جو کلاڈئیس کے حکم پر مارے گئے۔ گریوز اس کی صفائی میں کہتا ہے کہ کلاڈئیس اپنی بیوی میسیلینا اور کئی سازشیوں کا فریب خوردہ تھا۔ مگر سوتونیس کا کہنا ہے کہ اس کی دو بھتیجیاں کسی ثبوت کے بغیر قتل کر دی گئیں۔ انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس لیے کلاڈئیس کو بے قصور سمجھنا مشکل ہے۔ جب اسے میسیلینا کی جنسی گمراہیوں کا پتہ چلا تو اس نے اسے اس کے شریک کار مجرموں سمیت قتل کر دیا۔ کلاڈئیس نے جب اپنی بھتیجی اگریپینا (کیلی گلا کی بہن اور اپنے بھائی جرمانیکس کی بیٹی) سے شادی کا فیصلہ کیا تو خاص اس مقصد کے لیے اُس قانون کو بدل دیا جو اس ناجائز شادی کے راستہ میں حائل تھا۔ اگریپینا بھی ملک لیویا کی طرح ایک اور منصوبہ ساز تھی۔ اس نے کلاڈئیس کو آمادہ کیا کہ وہ اس کے بیٹے نیرو (جو اس کے پہلے شوہر سے تھا) کو اپنا کر اسے اپنا وارث قرار دے۔ لیکن جب اسے شک ہوا کہ کلاڈئیس اپنا ارادہ بدلنے والا ہے تو اس نے اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اس طرح کلاڈئیس کا مختصر مگر مجموعی طور پر خوشحال دورِ حکومت ختم ہو گیا۔

اگرچہ کلاڈئیس تمام سیزروں میں سے بہتر سیزر تھا۔ مگر انصاف سے دیکھیں تو وہ بھی ایک خوف ناک ظالم تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی ابتدائی زندگی کی ذلتوں اور مصیبتوں نے، ٹائبیریس اور کیلی گلا کے ہاتھوں جان جانے کے خوف نے اس کے مزاج میں نرمی پیدا کر دی۔ مگر میریس، سلا، ٹائبیریس اور کیلی گلا کی طرح طاقت کے نشہ میں بدمست ہو کر اس نے

اپنی بدترین برائیاں ظاہر کر دیں۔ کلاڈیئس دور کے ایک واقعہ کے نتائج بہت اہم تھے۔ 43 عیسوی میں اس نے برطانیہ پر حملہ کیا۔ جولیس سیزر کے زمانہ سے روم کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات دوستانہ تھے، مگر وہ روم کے زیر اثر نہیں تھا، کلاڈیئس کی فتح کے بعد وہاں رومی اثرات پھیلنے لگے۔ کلاڈیئس نے اس عمل کو تیز کرنے کے لیے برطانوی سرداروں کو بڑی بڑی رقمیں دیں۔ اسکول میں تاریخ کی کتابوں کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ رومن جیسے بھی تھے، ان میں چاہے کتنی ہی خامیاں تھیں مگر انہوں نے دنیا میں تہذیب پھیلائی ہے۔ لیکن بودیکا Boudica ہمیں یاد دلاتا ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں ان کی رعایا انہیں نازیوں جیسا ظالم اور سفاک سمجھتی تھی۔ دنیا پر انہوں نے جو بھی عنائتیں کی ہوں انسانی ارتقا کے نقطۂ نظر سے رومن بندر کے ہم سفر تھے۔

نیرو سے کونسٹن ٹائن تک

شہنشاہ نیرو کی ذات میں ہمیں کریمنلٹی کے بنیادی مسائل کی پوری جھلک نظر آتی ہے۔ میرلیس خبطی ٹائبرلیس اذیت پسند اور کیلی گلا پاگل تھا۔ نیرو ان میں سے کسی جیسا نہیں تھا۔ جب وہ سترہ برس کی عمر میں شہنشاہ بنا تو وہ ایک قسم کا نوجوان لگتا تھا جو فنون کا دلدادہ تھا اور جسے چاہے جانے کا شوق بھی تھا۔ اس کی ٹانگیں پتلی، لمبی اور پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ چہرے پر بے نیازی اور خود پسندی کی جھلک تھی۔ (آخر وہ کیلی گلا کی بہن کا بیٹا تھا، اس طرح ہم اسے کیلی گلا کا بیٹا بھی کہہ سکتے ہیں) اور اپنے آپ کو مرکز کائنات سمجھتا تھا۔

بچپن ہی سے اسے داد پانے کا شوق تھا۔ خاص طور پر جب اس نے سرکس میں ٹرائے پر ایک ڈراما میں حصہ لیا تو ہجوم نے دیکھا کہ ان کے شہنشاہ کو اپنے لیے تالیاں بجوانے کا کتنا شوق ہے۔ اپنی حکومت کے آغاز میں اس نے اعلان کیا کہ وہ اپنے عظیم دادا آگسٹس کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ اس نے لوگوں کو انعام و اکرام اور تحفے دیئے۔ ان کے لیے شان دار کھیلوں اور مقابلوں کا اہتمام کیا۔ چونکہ اسے خون دیکھنے سے نفرت تھی اس لیے مقابلوں میں کسی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں تھی، یہاں تک کہ مجرموں کو بھی معاف کر دیا جاتا تھا۔ ڈراما، کھیلوں اور گھوڑا سواری پر زور تھا۔ نیرو گھوڑوں کو بہت چاہتا تھا، موسیقی کا بھی عاشق تھا اور اس کے کوئی جنگی عزائم نہیں تھے۔ وہ نہایت روادار فرماں روا لگتا تھا۔

اس کی نخوت بے جا مگر بے ضرر تھی۔ اس نے گانے اور **Lyre** بجانے میں تربیت حاصل کی تھی۔ اس کی آواز ہلکی تھی اس لیے اسے کہا گیا تھا کہ اگر وہ اسے زوردار بنانا چاہتا ہے تو سیدھا لیٹ جائے اور سینہ پر بھاری بھرکم پتھر رکھے تاکہ سانس لینے کے اعصاب مضبوط ہوں۔ وہ اس تجویز پر باقاعدگی سے عمل کرتا تھا۔ پھر اس نے اپنے مہمانوں کے سامنے گانا

شروع کیا اور ان کی حوصلہ افزائی سے اتنا خوش ہوا کہ اسٹیج کا رخ کیا۔ شاید محتاط ہونے کی وجہ سے اس نے روم کے بجائے نیپلز کا انتخاب کیا۔ اس کے گانے کے دوران میں زلزلہ نے اسٹیج کو ہلا کر رکھ دیا مگر وہ گاتا رہا۔ جب روم والوں نے اس کے گانے کے متعلق سنا تو اس کا گانا سننے کے لیے انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ نیرو نے اعلان کیا کہ وہ بعد میں محل کے باغ میں گائے گا مگر جب اس کے محافظوں نے فوراً گانا سنانے کی درخواست کی تو ازراہ کرم فوراً اس نے ان کی بات مان لی۔ داد ملی تو اس نےLyre بجانے کے پبلک مقابلے میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، اس کی باری آئی تو نیرو نے انتہائی طویل وہ پیرا گایا جو گھنٹوں جاری رہا۔ جلد ہی نیرو مختلف المیہ ڈراموں میں باقاعدگی سے حصہ لینے لگا۔ کئی مہذب رومنوں کی طرح وہ یونان کو موسیقی اور ڈراما کا گھر سمجھتا تھا۔ Lyre مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے وہ بار بار وہاں جانے لگا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر مقابلہ وہی جیتتا تھا۔ کیونکہ یونانی ہمیشہ اسے ڈنر کے بعد گانے کے لیے کہتے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ ''صرف یونانی میرے جینئس کو سمجھنے کے اہل ہیں۔''

نیرو کی ماں اگریپنا اس کے لیے ایک اور مسئلہ تھی۔ وہ نیرو سے صرف 22 برس بڑی تھی اور نیرو کے لیے جنسی کشش رکھتی تھی۔ جب نیرو شہنشاہ بنا تو اگریپنا (جو کلاڈیس کے آخری ایام میں حقیقی شہنشاہ تھی) کو یہی توقع تھی کہ اس کے اختیارات میں کمی نہیں ہو گی۔ پہلے تو نیرو نے اسے وہی کرنے دیا جو وہ چاہتی تھی اور اپنے قدم جماتا رہا مگر جلد ہی اس کے ان طریقوں سے بیزار ہونے لگا جن سے وہ حکومت چلاتی تھی۔ اس کی حکومت کے ابتدائی سکّوں پر اسے اپنی ماں کا سامنا کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ ایک سال کے اندر انہیں اسی سمت میں دکھایا گیا مگر اس طرح کہ نیرو کا سر اگریپنا کے سر پر تقریباً چھا گیا تھا۔ اگریپنا کو ان حرکتوں پر غصہ تو آیا مگر اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ حکومت کے اختیارات نیرو کے پاس ہیں اس لیے خوشامد اور شفقت کے ذریعہ اس کا دل جیتنے کی کوشش کرنے لگی۔ جب نیرو کا معاشقہ ایک Acte نامی عورت کے ساتھ شروع ہوا تو اگریپنا نے پہلے تو شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی مگر جب نیرو کے نوجوان چالاک دوستوں نے نیرو کو معاشقہ جاری رکھنے پر زور دیا، تو اس نے بھی اس سازش کی حمایت کا فیصلہ کر لیا۔ چونکہ نیرو شادی شدہ تھا اور اسے اپنا معاشقہ لوگوں سے چھپانا تھا اس لیے ماں نے اپنا بستر اور بیڈ روم بیٹے کے حوالے کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے نیرو کو اپنے ساتھ مباشرت کی اجازت بھی دے دی۔ مگر ناجائز جب ناجائز نہ رہا تو اپنی کشش کھو بیٹھا اور نیرو جنسی تسکین کے دوسرے ذرائع کی طرف لوٹ آیا۔ ماں بیٹے کے

تعلقات ایک بار پھر کشیدہ ہو گئے۔ نیرو جانتا تھا کہ کلاڈئیس کو زہر دے کر مارنے میں اس کی ماں کا ہاتھ ہے اس لیے ڈرتا تھا کہ کہیں اس کا انجام بھی کلاڈئیس جیسا نہ ہو۔ بہرحال اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس سے نجات حاصل کی جائے۔

ایسے میں نیرو کے ایک پرانے استاد نے اسے اگریپنا سے نجات کی ترکیب بتائی۔ اسے بحری جہازوں کے ایک بیڑے کا کمانڈر بنایا گیا تو اس نے بتایا کہ ایک ایسی کشتی بنانی کوئی مشکل نہیں جو سمندر میں جا کر ٹوٹ جائے۔ چنانچہ خلیج نیپلز پر Baiae کے مقام پر منروا کے تہوار میں نیرو نے اپنی ماں کو شرکت کی دعوت دی۔ ایک شام پہلے انہوں نے Bauli کے مقام پر (جو Baiae سے دُور نہیں تھا) مل کر کھانا کھایا۔ پارٹی کا اہتمام نیرو کے ایک لکھ پتی دوست Otho نے کیا تھا جو اس کے اور Acte کے درمیان رابطہ کا ذریعہ تھا۔ اس موقع پر نیرو اپنی ماں کو خصوصی توجہ کے ساتھ پیش آتا تھا، اس کے رویہ میں مہربانی اور رحم کی جھلک بھی تھی تا کہ اسے کوئی شک نہ ہو جب وہ اسے کہے کہ اسے بحری سفر کرنا ہے جبکہ وہ خود خشکی کے راستے سفر کرے گا۔ جہاز اگریپنا کو لے کر Baiae روانہ ہو گیا۔ جہاز کافی بڑا تقریباً بیس یا پچیس فٹ لمبا تھا۔ وہ ایک خاموش تاروں بھری رات تھی، اگریپنا اپنی دوست ایسیردنیا کی گود میں پاؤں رکھے بیٹھی تھی اور اچھے موڈ میں تھی۔ ایک اشارے پر جہاز کی چھت اچانک گر گئی۔ اگریپنا کی ایک دوست بوجھ تلے دب کر مر گئی جبکہ اگریپنا اور ایسیردینا محفوظ رہیں۔ جہاز کو ٹوٹ کر بکھر جانا تھا مگر ایسا نہ ہوا۔ جہاز میں سوار عملہ کے لوگ جو سازش میں شامل تھے انہوں نے اپنا بوجھ ایک طرف ڈال کر جہاز الٹانے کی کوشش کی۔ اس وقت تک واضح ہو چکا تھا کہ یہ اگریپنا کے قتل کی کوشش ہے۔ اگریپنا کو بچانے کے لیے ایسیردینا نے مدد چاہی۔ 'مجھے بچاؤ میں شہنشاہ کی ماں ہوں'؛ جس پر عملہ نے اسے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ کنفیوژن سے فائدہ اٹھا کر اگریپنا اپنے زخمی کندھے کے باوجود تیر کر کشتیوں تک پہنچ گئی تو ایک کشتی اسے واپس Bauli لے گئی۔

وہاں سے اس نے نیرو کو پیغام بھیجا کہ دیوتاؤں کی عنایت سے وہ ایک خطرناک حادثے میں زندہ بچ گئی ہے۔ یہ ایک خطرناک غلطی تھی۔ اسے جلدی سے روم واپس پہنچ جانا چاہیے تھا اور اپنے قتل کی کوشش کو خبر کی صورت ہر طرف پھیلا دینا چاہیے تھا تا کہ اگر نیرو اسے دوبارہ قتل کی کوشش کرتا تو اس کے لیے ذمہ دار سمجھا جاتا۔

جب نیرو کو پیغام ملا تو اس نے سوچنے میں دیر نہیں کی۔ اسے یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس

کی اپنی زندگی خطرہ میں ہے اور اس کی ذمہ دار اس کی ماں ہے۔ اس نے زمین پر ایک تلوار گرائی اور شور مچا دیا کہ اسے قتل کرنے کے لیے آدمی بھیجا گیا ہے۔

اگر یپینا کو ڈبونے کی خبر باؤلی میں پھیل چکی تھی۔ لوگ ساحل سمندر پر جمع ہو گئے مگر فوج نے انہیں منتشر کر دیا۔ اس عرصہ میں نیرو نے اپنے پرانے استاد کو دو آدمیوں کے ساتھ بھیجا کہ اس کی ماں کو قتل کر دیں۔ وہ بزور اس کے بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ وہ سمجھی کہ اس کی خیریت پوچھنے آئے ہیں۔ جب ان میں سے ایک شخص نے اس کے سر پر وار کیا تو اصل وجہ اس کی سمجھ میں آئی۔ Tacitus کہتا ہے کہ جونہی دوسرے حملہ آور نے اپنی تلوار میان سے نکالی اگر یپینا نے اپنا پیٹ آگے کر دیا کہ اس پر مارو جس نے نیرو کو جنم دیا ہے۔ اگر یپینا کے ٹکڑے کر دیے گئے۔

نیرو اب حالت خوف میں تھا، اسے خطرہ تھا کہ بات لوگوں تک پہنچ گئی تو وہ بغاوت پر اتر آئیں گے۔ اسے اک ذرا تسلی ہوئی جب اس کے باڈی گارڈرز نے اس کے بچ جانے پر اسے مبارک باد دی۔ اسے شاید پہلی دفعہ احساس ہوا کہ ایک شہنشاہ کی حیثیت سے جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔ پہلے تو اس نے سینیٹ کو خط لکھا کہ ماں نے اس کی جان لینے کی کوشش کی اور یہ کہ احساس جرم کی وجہ سے اس نے خودکشی کر لی۔ پھر وہ جلدی سے Bauli گیا یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ اس کی ماں واقعی ہلاک ہو چکی ہے، اسے ہر وہ ثبوت بھی مٹانا تھا جس سے پتہ چلے کہ اس کی ماں خودکشی سے نہیں مری۔ کہتے ہیں کہ وہ لاش دیکھ کر بھی اس کے حسن سے متاثر ہوا۔ اگرچہ خون سے اس کی نفرت کی وجہ سے ضروری نہیں کہ یہ سچ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر یپینا کی لاش جلا کر راکھ کر دی گئی تھی۔ پھر بھی نیرو کو روم واپس جانے اور سینیٹ اور لوگوں کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ وہ مارچ 59 عیسوی (جب قتل ہوا) سے لے کر ستمبر تک روم سے دور رہا۔ آخر وہ جب روم واپس پہنچا تو یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ روم کو ایک ماں کے معمولی قتل سے کیا صدمہ ہونا تھا کہ اس نے تو قتل کی بڑی بڑی وارداتیں دیکھی تھیں۔

ماں کی سرزنش سے آزاد ہو کر نیرو عیاشیوں میں ڈوب گیا۔ وہ اپنی شامیں Otho جیسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ریستورانوں میں گزارنے لگا تھا۔ دکانیں لوٹتا، رات کی تاریکی میں مسافروں پر حملے کرتا۔ اب اسے خون سے گھن بھی نہیں آتی تھی، یہاں تک کہ مزاحمت کاروں کو چھرا گھونپ دیتا۔ اس کی دعوتیں اور جشن رات بھر جاری رہتے۔

ماں کی موت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ ایک اور محبت میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی نئی محبوبہ اس کے دوست اوتھو کی بیوی Poppaea تھی۔ پہلے تو دونوں اس کی محبت میں شریک رہے، پھر نیرو اس خیال سے حسد کرنے لگا کہ اس کی محبوبہ اپنے شوہر کے ساتھ سوتی ہے۔ اوتھو کو شاید زہر دے کر مار دیا جاتا مگر نیرو کے اتالیق سینیکا (ایک ممتاز ڈراما نگار اور فلاسفر) نے اسے آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے سابق دوست کو گورنر بنا کر پرتگال بھیج دے۔ اس کے بعد جلد ہی Poppaea حاملہ ہو گئی جس سے نیرو بہت خوش ہوا، وہ ہمیشہ اپنا وارث چاہتا تھا۔ Poppaea کے ساتھ شادی میں صرف ایک رکاوٹ اس کی بیوی اوکٹویا تھی جس سے اس کی شادی بچپن میں ہو گئی تھی۔ وہ کلاڈیس اور میسلینا کی بیٹی تھی اور ابھی بمشکل جوان ہوئی تھی۔ اس کا چلن بے داغ تھا، اس لیے اس کے خلاف الزام تراشے جانے تھے۔ گارڈ کے کمانڈر کو اس کے غلاموں کے ٹارچر کا کام دیا گیا تا کہ وہ اوکٹویا کے خلاف جھوٹے الزام لگائیں جو طلاق کا جواز بن سکیں۔ ایسے میں روم کے عوام، سمجھ میں نہ آنے والے عوام، اچانک اوکٹویا کی حمایت پر تیار ہو گئے اور محل کے باہر احتجاج اور مظاہرے کرنے لگے۔ اوکٹویا کے خلاف مزید شہادت کے لیے نیرو کے دوست انیکائس (جس نے جہاز بنا کر دیا تھا) نے لوگوں کے سامنے بیان دیا کہ وہ اوکٹویا کے ساتھ سویا تھا اور یہ کہ اوکٹویا نے بچہ ضائع کر دیا تھا۔ اوکٹویا کو طلاق ہو گئی اور اسے جلاوطن کر کے ایک جزیرہ میں بھیج دیا گیا اور حکم ملا کہ خودکشی کر لے۔ جب اس نے احتجاج کیا تو نیرو کے آدمی نے اسے باندھ کر اس کی خون کی رگیں کاٹ دیں۔ موت کا عمل تیز کرنے کے لیے اسے بھاپ میں رکھا گیا۔ Tacitus کا کہنا ہے کہ Poppaea کو اوکٹویا کی موت کا یقین دلانے کے لیے اس کا سر کاٹ کر بھیج دیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ اینٹی کلائمکس کے طور پر Poppaea نے نیرو کو ایک بیٹی کا تحفہ دیا۔

اگلے سال 64 عیسوی میں روم آگ سے جل کر تباہ ہوا جو ایک ہفتہ تک بھڑکتی رہی۔ یہ افواہ بالکل غلط تھی کہ یہ آگ نیرو نے لگوائی تھی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ جب روم جل رہا تھا، اس وقت وہ مضطرب اور بے چین تھا۔ اس نے اپنا وائلن لیا اور (ٹرائے کی شکست) The Fall of Troy نامی گیت (جس کی دُھن اس نے خود بنائی تھی) گاتا رہا۔ جب آگ اتنے عرصہ تک بھڑکتی رہی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ نیرو اتنے لمبے عرصہ تک بے پروا ہو کر وائلن بجاتا رہے اور گیت گاتا رہے۔ مگر جب یہ افواہ لوگوں میں پھیلی تو اس کی پہلے سے بڑھتی ہوئی بدنامی میں اور اضافہ ہوا۔ جب پبلک عمارتوں کو گرانے سے آگ رفع ہوئی تو نیرو نے

قابل ستائش کام کیا۔ اس نے امدادی انتظامات کیے اور Ostia سے بھاری مقدار میں اناج منگوایا اور اس کی قیمت کم کر دی۔

نیرو کو کیا ضرورت تھی کہ وہ آگ لگواتا؟ مؤرخ کہتے ہیں کہ اسے شہر کے درمیان ایک صاف بڑے رقبہ کی ضرورت تھی جہاں وہ اپنا نیا محل بنانا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نیرو نے گولڈن ہاؤس کے نام سے اپنا ایک عظیم الشان محل بنایا۔ اس نے روم کے کئی علاقوں کو از سرِنو تعمیر کیا۔ مگر آگ کی ذمہ داری بدستور اس پر عائد رہی اور نیرو قربانی کے بکرے ڈھونڈنے لگا۔ اس میں کوئی مشکل نہیں تھی کیونکہ روم عیسائیوں سے بھر چکا تھا۔ ٹیسی ٹس کہتا ہے کہ ان کا پیغمبر عیسیٰؑ ٹائبیریس کے دور میں پونٹی اس پلیٹ کے ہاتھوں مارا گیا تھا) بدنام اور بدقماش، عیسائیوں کی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ رومن عیسائیوں کو کچھ تو اس وجہ سے ناپسند کرتے تھے کہ ان کا تعلق یہودیوں سے تھا اور یہودی مذہبی لحاظ سے متعصب اور فتنہ پرداز تھے، جن کی شرانگیزی ہمیشہ جاری رہتی تھی۔ ٹیسی ٹس یہ بھی کہتا ہے کہ عیسائیوں کو نسل انسانی سے نفرت تھی۔ رومنوں کو یہ اجنبی مذہبی فرقہ جسے دنیا کے جلدی خاتمہ پر ایمان تھا، ضرور پاگل لگتا ہو گا۔ اگر عیسائیوں کو دنیاوی چیزوں سے نفرت تھی تو عجب نہیں کہ آگ انہوں نے ہی لگائی ہو۔ اور یہ بات رومنوں کو اور بھی بری اور غیر معتبر لگتی تھی کہ عیسائی اپنے مذہب کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے انہیں موت سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ چنانچہ عیسائیوں کا قتل عام بڑی شدت کے ساتھ شروع ہو گیا۔ ان پر تارکول لگا کر انہیں کھمبوں سے باندھ دیا جاتا اور آگ لگا دی جاتی کہ تاریکی میں زندہ مشعلیں لگیں۔ انہیں جانوروں کی کھالیں پہنا کر ان پر کتے چھوڑ دیئے جاتے جو ان کی بوٹی بوٹی کر دیتے۔ وہ اکھاڑے (ارینا) میں جنگلی درندوں کے سامنے ڈال دیئے جاتے اور ایک بہت بڑی تعداد میں صلیب پر لٹکائے جاتے۔ مگر نیرو کا اندازہ غلط تھا۔ روم کے لوگ خون کے اتنے پیاسے بھی نہیں تھے وہ اتنے خون خرابے اور ٹارچر سے تنگ آ گئے اور نیرو کی مقبولیت کا گراف کچھ اور نیچے گر گیا۔

نیرو کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی رائے کے مقابلہ میں کسی کی رائے، یہاں تک کہ لوگوں کی رائے کو بھی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک اچھا شہنشاہ ہے جو ہمیشہ لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ جہاں تک اس کے خون کا پیاسا ہونے کا تعلق ہے اسے احساس تھا کہ اس پر یہ الزام افسوس ناک حد تک غلط ہے۔ 61 عیسوی میں شہر کا نگران اپنے ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ قانون کے مطابق اس چھت تلے موجود تمام غلاموں، ہر مرد، عورت اور

بچہ (جو تعداد میں چار سو تھے) کو قتل کی سزا دینی چاہیے تھی۔ لوگوں نے بدنصیب غلاموں کے حق میں احتجاج، فساد اور مظاہرے کیے۔ نیرو نے اپنی لفظی آزاد خیالی کی بنا پر اس معاملہ میں لوگوں کی حمایت کی مگر سینیٹ کا خیال کچھ اور تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر غلاموں کے ہاتھوں قتل برداشت کر لیا جائے تو وہ سب کے سب اپنے بستروں میں قتل کیے جائیں گے۔ چنانچہ اس راستہ پر احتیاطاً سپاہی کھڑے کر دیے گئے جس راستہ سے گزر کر چار سو مرد عورتوں اور بچوں کو مقتل جانا تھا۔ لوگوں نے اس کا الزام نیرو پر لگایا۔ نیرو کو لگا کہ وہ ایک ایسا ولی ہے جسے غلط سمجھا گیا ہے۔ اس نے اس کا اثر زائل کرنے کے لیے مزید روپیہ خرچ کیا، اور زیادہ کھیلوں اور زیادہ تفریحوں کا اہتمام کیا۔ اور اپنا زیادہ وقت پیٹرونیئس جیسے چیدہ خوشامدیوں میں گزارنے لگا۔ مگر پیٹرونیئس بھی آخرکار نیرو کی نظروں سے گر گیا جب Tigglineus نے اس پر نیرو کے خلاف سازش کا الزام لگایا اور پیٹرونیئس نے اپنی رگیں کاٹ کر خودکشی کر لی۔

65 عیسوی میں Poppaea مر گئی۔ وہ حاملہ تھی جب نیرو نے غصہ میں آکر اسے ٹھوکر ماری۔ اس کی موت نے نیرو کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی تدفین پر بے تحاشا روپیہ خرچ کیا گیا اور اس کے Goddess ہونے کا بھی اعلان ہوا۔ اب نیرو کی نظر انتخاب Sportus نامی ایک خواجہ سرا پر پڑی جو Poppaea سے مشابہ تھا۔ سکٹونیئس کا کہنا ہے کہ نیرو نے سپورٹس کو لڑکی بنانے کی کوشش میں خواجہ سرا بنا دیا تھا۔ نیرو زنانہ کپڑوں میں اسے شادی کی ایک تقریب میں لے گیا اور اسے بیوی کی طرح اپنے ساتھ رکھا۔

رومی شہنشاہوں کی عادت تھی کہ جب چاہا کسی کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ نیرو کے لیے اس راستہ پر چلنا آسان تھا۔ 65 عیسوی میں اس کے قتل کی ایک نیم دلانہ سازش (جس کا لیڈر اونچے طبقہ کا ایک شخص تھا) نے اسے بڑوں کے نقش قدم پر چلنے کا موقع دے دیا۔ اس معاملہ میں Petronius اور نیرو کا استاد Seneca بھی ملزموں میں سے تھے۔ نیرو کو کلاڈئیس کی طرح انسانوں کو مرتے ہوئے دیکھنے سے کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ انہیں خودکشی کا حکم دیتا تھا۔ جلد ہی اس سے اختلاف کرنے والے سینیٹر بھی ہٹ لسٹ میں شامل ہو گئے۔ یہی ٹاتیبریس اور کیلی گلا کی روایت تھی۔ اب سینیٹ کو احساس ہونے لگا کہ نیرو سے نجات پانا اپنی جان بچانا ہے۔

اس عرصہ میں نیرو اپنی عظیم الشان تعمیراتی سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ وہ روم کو نئے سرے سے بنا سنوار رہا تھا۔ اس کی سڑکیں چوڑی ہو رہی تھیں اور عمارتیں سنگ مرمر اور پتھر

سے بنائی جا رہی تھیں۔ اس کے اپنے گولڈن ہاؤس کا آرکیڈ ایک میل لمبا تھا، کمروں میں سونا اور جواہرات لگے ہوئے تھے۔ چھتیں پیچھے جھکی ہوئی تھیں کہ خوشبو چھڑکی جا سکے یا پھولوں کی بارش ہو سکے۔ (پھول روم میں اعلیٰ حیثیت کی علامت تھے۔ ایک دولت مند نے اپنی ایک دعوت کے لیے کئی ہزار پاؤنڈ پھولوں پر خرچ کیے تھے) گیٹ پر نیرو کا بارہ منزلہ سر بہ فلک مجسمہ کھڑا تھا۔

67 عیسوی میں اس کے عہد حکومت کے بارھویں سال میں نیرو کئی کھیلوں اور مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے یونان روانہ ہوا۔ یونان میں رہتے ہوئے وہ اپنے خلاف خیالی سازشوں کے خوف میں مسلسل مبتلا رہا۔ اسی خوف کے عالم میں اس نے اپنے سب سے بڑے جنرل گاربولو کو بلایا اور اسے خودکشی کا حکم دیا۔ مرتے ہوئے گاربولو بڑبڑایا، ''مجھے صلہ مل گیا۔'' کسی وجہ کے بغیر نیرو نے **Rhine** میں اپنی فوجوں کی وفاداری پر بھی شک کیا اور ان کے کمانڈر دونوں بھائیوں کو بلایا۔ ان سے ملے بغیر اور انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیئے بغیر اس نے انہیں خودکشی کرنے کا حکم دیا۔

مگر واپسی کے راستے پہلے ہی بند ہو رہے تھے۔ **Judea** میں رومی چیف ایڈمنسٹریٹر عبادت گھروں کو مجبور کر رہا تھا کہ ٹیکس کے بقایا جات کی بھاری رقم ادا کریں اور جب اس نے اپنے آدمیوں کو یروشلم کے بعض حصوں میں لوٹ مار کے لیے بھیجا تو یہودی دہشت پسندوں نے بغاوت کر دی اور یروشلم کی رومی آبادی قتل کر دی۔ شام کے گورنر نے یروشلم پر دوبارہ قبضہ کی کوشش کی مگر اسے شدید نقصان کے بعد واپس جانا پڑا۔ نیرو نے **Vespasian** نامی ایک درمیانی عمر کے جنرل کو بغاوت کچلنے پر مقرر کیا۔ پھر مارچ 68 میں اسے خبر ملی کہ گال کے گورنر گالیس ونڈکس نے بھی اس کی عیاشیوں کی مذمت کرتے ہوئے بغاوت کر دی ہے۔ اسے سپین کے گورنر گالبا اور نیرو کے کسی زمانہ کے دوست اوتھو گورنر پرتگال کی حمایت حاصل تھی۔ ان خبروں سے نیرو بدحواس ہو گیا اور اس کے محافظوں پر صاف واضح ہو گیا کہ ان کا ذہنی مریض شہنشاہ اس صورتِ حال سے ہرگز نہیں نمٹ سکتا۔ ایک روز وہ دو دوستوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ڈائننگ روم سے نکل گیا اور انہیں کہنے لگا کہ میں گال جا کر باغی فوج کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا اور پھوٹ پھوٹ کر روؤں گا تاکہ انہیں میرے غم کا اندازہ ہو۔ پھر کہنے لگا کہ میں فتح کا گیت گاتے ہوئے سپاہیوں میں جا کر ٹہلوں گا جس کی دھن اسی وقت بناؤں گا۔ دراصل نیرو کو ونڈکس کی یہ بات کھا گئی تھی کہ نیرو کو ستار بجانا نہیں آتا۔

8 جون کو پتہ چلا کہ شمالی اٹلی کی فوج باغیوں سے مل گئی ہے۔ نیرو کے لیے یہ آخری تنکا تھا۔ اس نے مصر بھاگ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سکیم پر وہ کئی سال سے غور کر رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر اس کے پاس تاج وتخت نہ رہا تو وہ اپنے آرٹ کے سہارے جی سکتا ہے۔ اس نے گولڈن ہاؤس میں رہنا ترک کیا اور **Servilian** گارڈنز کے اندر اپنی قیام گاہ میں چلا گیا تاکہ وقت آنے پر بندرگاہ اوشیا (**Osia**) چلا جائے جہاں جہاز اس کے منتظر کھڑے تھے۔ مگر کچھ دیر سو کر وہ جاگا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ اس کے محافظ ڈیوٹی پر حاضر نہیں تھے۔ اس نے سوچا کہ شاید میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ دراصل گارڈ کا کمانڈر گالبا کا ساتھ دینے لگ گیا تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو بھی رشوت (**750** پاؤنڈ فی کس) کے عوض گالبا کی حمایت کرنے کے لیے کہا۔ نیرو نے جلدی سے کئی دوستوں کے دروازوں پر دستک دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ گھر واپس آیا تو دیکھا کہ اس کے باڈی گارڈ فرار ہو گئے ہیں اور جاتے ہوئے اس کے کپڑے اور زہر کا ڈبہ بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ ایک نزدیکی فوجی کیمپ سے چیخنے چلانے اور ہنگامہ آرائی کی آوازیں آئیں تو وہ سمجھ گیا کہ بغاوت زوروں پر ہے۔ اپنی 'بیوی' سپارٹس سمیت چار ساتھی لے کر وہ ایک آزاد کیے ہوئے غلام **Phaon** کے گھر روانہ ہوا۔ وہاں وہ رینگتا ہوا تہہ خانہ کے اندر چلا گیا اور اپنی قبر کھودنے کا حکم دیا۔ اسے بار بار ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگے۔ ''میں نہ ہوا تو آرٹ کا کیا ہوگا؟'' پھر خبر آئی کہ سینیٹ نے اسے عوام دشمن قرار دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قدیم رواج کے مطابق اسے کوڑے مار مار کر مار دیا جائے۔ اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ پہلے وہ خودکشی کرے، اس نے تاخیر کی تو اسے قتل کر دیا۔ ''میری زندگی کتنی غلیظ اور گھناؤنی ہو گئی ہے،'' جب اس نے ٹاپوں کی آواز سنی تو اس نے تلوار کی نوک گلے پر رکھ دی۔ اس کے ایک ساتھی نے اپنا ہاتھ تلوار پر رکھ کر اسے دبا دیا۔ جب ایک کمانڈر اسے گرفتار کرنے آیا وہ اس وقت مر رہا تھا اور جب اس نے اپنے لبادے کے ساتھ اس کا بہتا ہوا خون روکنے کی کوشش کی تو نیرو بڑبڑایا، ''تم کتنے وفادار ہو،'' اور مر گیا۔

نیرو سے ملنے والا سبق بہت سادہ ہے کہ کریمنلٹی بنیادی طور پر بچپنا ہے۔ وہ خصوصی طور پر کوئی برا آدمی نہیں تھا۔ اس میں وہ نفرت نہیں تھی جو الیگزینڈر آف فیرا سے لے کر کارل پیزرم تک تمام حقیقی مجرموں کی خصوصیت ہے۔ وہ ہوش سنبھالنے سے پہلے سیزر بن گیا تھا، اس لیے داخلیت پسند اور صرف اپنی ذات میں کھویا ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے سامنے دوسرے لوگوں بلکہ ساری دنیا کی کوئی اہمیت نہیں۔ اسی لیے وہ جو چاہتا جھپٹ لیتا تھا، جب

کوئی اس کا راستہ روکتا تو وہ اسے مار کر راستہ صاف کر لیتا تھا۔ جیسے چوہے کو بلی مار دیتی ہے اسی طرح اسے یہ ایک بالکل قدرتی بات لگتی تھی۔

نیرو میں ہم انسانی ترقی کا بنیادی مسئلہ دیکھ سکتے ہیں کہ حالات اور ضرورت کا بوجھ ہٹتے ہی انسان بگڑ جاتا ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر تہذیب کا تصور ہی اپنی شکست آپ ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد ہمیں احتیاج سے نجات دلانا ہے۔ یہ ایک شیطانی چکر نظر آتا ہے۔ انسان اپنے مسائل حل کرنا تو جانتا ہے مگر انہیں حل کر کے صرف اپنی کاہلی اور بچپنے کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں تقریباً ہر بڑا فلاسفر زندگی کا تاریک پہلو دیکھتا آیا ہے۔

یہ سچ ہے مگر پورا سچ نہیں۔ ہم انسانی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ انسان وجدانی طور پر اس کا اہل ہے کہ وہ کریمنلٹی کا رجحان روک سکے۔ اس کی بنیاد میں وجدانی طور پر یہ یقین کارفرما ہے کہ ذاتی انا اور ذاتی مفاد کی تنگ و تاریک دنیا ہی تمام دنیا نہیں بلکہ کوئی چیز عظیم تر اور دلچسپ ترین اس سے ماورا موجود ہے۔ کائنات کے متعلق یہ دلچسپی، یہ وارفتگی تمام شاعری، موسیقی، سائنس، فلاسفی اور مذہب میں قدرتی طور پر پائی جاتی ہے۔ جب ہم کسی بڑے آدمی، کسی سکندر یا کسی فریڈرک II کے متعلق پڑھتے ہیں کہ وہ دنیا سے اکتا کر مایوسی میں مر گیا تو خیال آتا ہے کہ ان کے قد آور کارناموں نے انہیں تھکا کر دیکھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا ہوگا۔ ان کی حسیات کو بے حس کر دیا ہوگا۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں انہوں نے کوئی غلط قدم اٹھایا ہوگا۔ جب فاتحین اور مجرم دنیا پر اپنا عذاب مسلط کر کے منظر سے رخصت ہو جاتے ہیں تو زندگی کی لہر ایک طوفان کی صورت آتی ہے اور بربادی کا ہر نشان اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے اور دنیا ایک بار پھر تازہ دم ہو جاتی ہے۔

اگر ہم دنیا میں عیسائیت کے پھیلنے کی وجہ جاننا چاہیں تو اس نکتہ کو سمجھنا ضروری ہے، عیسائیت سے پہلے دنیا میں درجنوں بلکہ غالباً سینکڑوں مذاہب تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں دنیا بھر کے اندر مذاہب کی بھرمار تھی مگر عیسائیت جیسی مقبولیت کسی کو حاصل نہ ہوئی، نہ کوئی مذہب اس جیسی تیزی کے ساتھ پھیلا۔ اس کی بنیادی وجہ رومی مادیت کے خلاف عیسائیت کا ردعمل تھا۔ بالکل جس طرح ایک مایوس شخص کو کسی پر امید انسان اور ایک آئیڈیلسٹ کو کسی مادہ پرست کے ساتھ جینا پڑے۔ رومنوں کا مذہب مضحکہ خیز حد تک لکیر کا فقیر تھا۔ مثلاً وہ سمجھتے تھے کہ سینیٹ میں دیا ہوا ان کا ایک ووٹ ان کے آنجہانی شہنشاہ کو دیوتاؤں کے دربار میں پہنچا دے گا (یہ سچ ہے کہ ایسا کرنا کیتھولک چرچ کے اس طریقہ سے

اتنا مختلف نہیں کہ کسی کے ولی ہونے کا سرکاری طور سے اعلان کرنا) رومن مذہب اور یجنل بھی نہیں تھا، وہ سارا قدیم یونان سے لیا گیا تھا۔ رومن ادب، رومن آرٹ، رومن فلسفہ سب سطحی تھا۔ رومن کلچر میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی صاحب تخیل کو متاثر کرے، جبکہ عیسائیت انسانی زندگی میں گہرے معنی تلاش کرنے کی تڑپ تھی۔

عیسیٰؑ، 10 قبل مسیح کے آس پاس آگسٹس کے دورِ حکومت کے تقریباً بیسویں برس پیدا ہوا تھا۔ پومپئی نے 63 قبل مسیح میں یہودیوں پر اپنی حکومت قائم کی تھی جسے یہودی نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔Crassus نے ان کی عبادت گاہ لوٹی تھی۔ رومنوں نے Herod کوJudea پر حکومت کرنے کے لیے مقرر کیا۔Herod آخری رومی شہنشاہوں کی طرح ظالم اور سفاک تھا اور یونانی سدوسیوں کے علاوہ تمام مذہبی حلقوں کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اس عظیم ہستی، مسیحا کا انتظار روز بروز زیادہ ہو رہا تھا جس نے آ کر یہودیوں کو غلامی سے چھڑانا تھا۔

عیسیٰؑ کی ابتدائی زندگی کے حالات عیسائیوں نے اتنے مسخ کر دیے ہیں کہ ایک معلم اور ایک پیغمبر کی حیثیت سے ان کی مختصر سی زندگی کے چند برسوں کی صاف اور واضح تصویر بنانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ان کے جسمانی خدوخال بھی بدل دیئے گئے تھے۔1920ء کے عشرہ میں رابرٹ آئزلر نے اپنی کتاب The Messiah Jesus and John the Baptist میں انہیں نئی تشکیل دی تھی۔ اس میں جن دستاویزات سے اس نے مدد لی ان میں عیسیٰؑ کی گرفتاری کے لیے ایک نوٹس بھی تھا، جس پر غالباً پونٹیس پلیٹ نے دستخط کیے تھے اور جس میں عیسیٰؑ کا سراپا کچھ اس طرح بیان کیا گیا تھا:

> ''اس دور میں بھی ساحرانہ قوتیں رکھنے والا ایک آدمی (اگر اسے آدمی کہنے کی اجازت ہو) ظاہر ہوا ہے۔ جسے بعض یونانی خدا کا بیٹا جبکہ اس کے ماننے والے سچا پیغمبر کہتے ہیں اور یہ کہ وہ بیماروں کو صحت اور مُردوں کو زندگی دیتا ہے۔ اس کی صورت آدمی جیسی ہے۔ معمولی شکل و صورت کا آدمی، جھکی کمر، گہرا رنگ، چھوٹا قد (تقریباً پانچ فٹ) لمبی ناک، لمبا چہرہ، جڑی ہوئی ڈراؤنی بھویں، سر پر تھوڑے سے بال اور ان کے درمیان مانگ اور چھوٹی داڑھی۔''

عیسیٰؑ کی یہ اصلی تصویر، جھکی کمر، لمبی ناک، چھدری داڑھی تقریباً گنجا سر، بعد کے عیسائیوں نے بدل کر اس طرح کر دی: کھردری جلد، درمیانہ قد چھ فٹ اونچا، اچھی صحت، مقدس چہرہ، خوش نما ناک، کالی بھنویں، خوب صورت آنکھیں جو دیکھنے والوں کو متاثر کریں۔

اخروٹ جیسا رنگ گھنگھریالے بال، صاف ستھری داغوں اور جھریوں کے بغیر پیشانی، خوب صورت سرخ نیلی آنکھیں، بالوں کے رنگ سے ملتی جلتی مختصر داڑھی، باوقار ہاتھ اور بازو۔

اور یہی ہوتا رہا، ایک مختصر سے بے جاہ وحشم انسان کو ہالی وڈ کے فلم اسٹار میں بدلنا، اسی لیے عیسیٰؑ کے متعلق عیسائیوں کی کسی اہم ترین دستاویز کو بھی مکمل طور سے ماننا مشکل ہو جاتا ہے۔

اگر رومنوں کو ان کی فتوحات اور کامیابیوں نے بگاڑ دیا تھا تو یہودی اپنی ناکامیوں کی وجہ سے سنبھل گئے تھے۔ ان دنوں بحیرۂ روم اس آگ میں جل رہا تھا جو نیل ڈیلٹا کے قریب واقع گوشن کے عبرانیوں نے لگائی تھی جنہیں مصریوں نے غلام بنایا تھا۔ جنگ ٹروجن کے زمانہ میں حضرت موسیٰؑ انہیں مصر سے باہر لے گئے تھے اور وہ ایک عرصہ تک جزیرہ نمائے سینائی میں مصیبتیں سہتے ہوئے بھٹکتے رہے تھے۔ مصیبتوں نے ان کے مذہبی شعور کو گہرا کر دیا تھا اور وہ اس ایک خدا کے بندے بن گئے جس کے قوانین کی بنیاد مذہبی آدرش تھے۔ سنہرا بچھڑا پوجنے کی کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے کسی زمانہ میں اکثر سامی قوموں کی طرح وہ بھی مشرک تھے اور کئی خداؤں کو پوجتے تھے۔ جوشوا کی قیادت میں انہوں نے کنعان کی سرزمین پر فتوحات حاصل کیں اور کنعانیوں کے کئی طریقے اپنا لیے۔ پھر منکرین کے خلاف خطرناک اور لمبی جدوجہد کرنا پڑی جن پر بالآخر حضرت داؤدؑ نے 1000 قبل مسیح کے قریب فتح پائی مگر حضرت سلیمانؑ کی موت (930 قبل مسیح) کے بعد حالات اتنے خراب ہوئے کہ دو صدیاں فتنہ وفساد اور سول وار میں گزر گئیں۔

آٹھویں صدی قبل مسیح میں غلامی کے بعد 705 قبل مسیح میں اسرائیل کی بادشاہت ختم ہوئی۔ نینوا کی تباہی (612 قبل مسیح) کے بعد مشرق وسطیٰ میں بابل کی بالادستی قائم ہوگئی اور یہودی ایک بار پھر غلامی میں دھکیل دیئے گئے۔ تباہ حال یروشلم واپس جانے کی اجازت انہیں اس وقت ملی جب ایران کے سائرس نے 538 قبل مسیح میں بابل فتح کر لیا۔ مگر دو سو سال تک انہیں ایران کا غلام رہنا پڑا۔ ایرانی یہودی نہمیا کی رہنمائی میں انہوں نے یروشلم کی دیواریں از سر نو تعمیر کیں اور حضرت موسیٰؑ کے قدیم مذہبی اصولوں کی طرف لوٹ آئے۔ 332 قبل مسیح میں سکندر اعظم کے ہاتھوں ایران کی حکمرانی ختم ہوئی اور نو برس تک یہودی اس کے زیر تسلط رہے۔ اس کی موت کے بعد ان پر مصر کی غلامی پھر مسلط ہوگئی۔ سکندر کے ایک جنرل سلیوکس نے ایک سلطنت فتح کر کے وہاں اپنے خاندان کی حکومت قائم کر دی۔ اس طرح

198 سے 168 قبل مسیح تک وہی یہودیوں کے حکمران تھے۔ اسی سلسلہ کے ایک بادشاہ انٹیوکس کی کوشش سے ہی جوڈیا میں یہودی مذہب پر پابندی لگی۔ جس سے جوڈاز میکابس کی بغاوت اور سیاسی آزادی کا ایک مختصر دور ممکن ہوا۔ مگر ایک صدی سے بھی کم عرصہ کے بعد پومپئی نے یوروشلم فتح کرلیا اور یہودی رومنوں کے غلام ہو گئے۔

اس طرح کئی صدیوں کی جنگ، اذیتوں اور غلامی کی وجہ سے یہودی ان کے عادی ہو گئے۔ مصائب کی کثرت نے ان کے مذہبی شعور کو اور گہرا کر دیا۔ ظاہر ہے اس کی وجہ سے وہ امن پسندی، رحم، ہمدردی اور کمزوروں کی حمایت پر زور دینے لگے اور اس کے عوض دوسری دنیا کے اجر پر تکیہ کرنے لگے۔ ولی عقیبہ کے مطابق مذہب کا نچوڑ ہمسایہ کی محبت ہے، جبکہ ربی **Hillel** کا کہنا ہے کہ یہودیت کا مرکزی پیغام ہے، ''دوسروں سے وہی سلوک چاہو جو تم ان سے کرتے ہو۔''

حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں جوڈیا کے اندر تین بڑے مذہبی فرقے تھے۔ سدوسی جو قدامت پسند تھے۔ زیلاٹس جو انقلابی تھے اور فیریسی جو اعتدال پسند تھے۔ ایسی نیز نامی ایک اور طاقت وَر گروہ تھا، جسے عیسائی فرقہ کو یکر کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے جدید ایسی نیز کی طرح اپنی آبادیاں الگ بنائی تھیں جہاں وہ پارسائی اور پرہیز گاری کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں اس راست بازی کی تعلیم ان کے رہنما نے دی تھی جس کی جان بدی کی قوتوں نے لی۔ **1947**ء میں بحیرۂ مردار کے ساحلوں سے متصل غاروں میں سے (جہاں ایسی نیز کبھی رہتے تھے) جو مذہبی دستاویزیں برآمد ہوئیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایسی نیز اپنے آپ کو خدا کے برگزیدہ بندے سمجھتے تھے۔ یہ کہ انہوں نے بپتسمہ کے ذریعہ نئے اراکین کا اضافہ کیا تھا اور نئے عہد نامہ کے **Last Super** کی طرح نشستوں کی درجہ بندی کی تھی۔ جان بیپٹسٹ یقینی طور پر ایک ایسی نی تھا اور ڈیڈسی کی دستاویزات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عیسیٰؑ پر ان کا گہرا اثر تھا۔

اس لیے آج جو اصول ہم عیسیٰؑ سے منسوب کرتے ہیں، یہودی دنیا ان سے صدیوں پہلے واقف تھی۔ یہودیت میں اپنے دشمنوں سے نفرت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ نزرتھ سے تعلق رکھنے والے اس بڑھئی کے بیٹے نے (جس نے اپنی عمر کے اٹھائیسویں برس تبلیغ شروع کی تھی) ایک قدم اور آگے رکھا اور اعلان کیا کہ ہمیں اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرنی چاہیے اور اگر کوئی ہمارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دینا چاہیے۔

رومیوں کے قبضہ کے دوران میں یہ بات محض حماقت لگتی، جیسے 1939ء میں کوئی انگریز مذہبی لیڈر ہٹلر کا مقابلہ کرنے سے روک دیتا۔ یہ امن پسندی 20 عیسوی، ٹائبریس کی حکومت کے چھٹے سال میں بالکل بے معنی سمجھی جاتی۔ اس کے باوجود کہ عیسیٰؑ کا ذاتی کرشمہ ناقابل تردید تھا، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ عیسوی عہد کے وطن پرست یہودی امن پسندی کے اس تصور کو قبول کرتے؟ عصری دستاویزات سے جواب ابھرتا ہے کہ عیسیٰؑ نے پیش گوئی کی تھی کہ بہت بڑی تباہ کن تبدیلی، بلکہ دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔ خدا کی بادشاہت آنے کو ہے، جنگیں اور جنگوں کی افواہیں ہوں گی، قحط اور زلزلے ہوں گے، مردے زندہ کئے جائیں گے، سورج تاریک ہو گا اور چاند خون کا لوتھڑا بن جائے گا۔ ستارے آسمان سے ٹوٹ کر گر جائیں گے اور یہ سب کچھ آنے والی صدیوں میں نہیں بلکہ ان لوگوں کی زندگیوں میں ہو گا جو اس وقت زندہ ہیں۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ اہل ایمان آنے والی کل کی فکر نہ کریں۔

سدوسی اور فیریسی، سبھی اس پیغمبر کے خیالات کے خلاف تھے۔ زیلاٹس روم کی تباہی چاہتے تھے، اس لیے انہیں خدا کی بادشاہت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس طرح تو حقیقی جدوجہد سے توجہ ہٹ سکتی تھی۔ سدوسیوں کا رجحان ہیلنی یونان کی طرف تھا اور وہ حیات بعدالموت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان کی نظر میں حضرت عیسیٰؑ اجڈ اور ضدی تھے۔ فیریسی ٹمپل پارٹی تھی اور ان کا مقصد ہر چھوٹی بڑی رسم کی پابندی تھا۔ عیسیٰؑ نے ان کے متعلق وہی خیال کیا جو مارٹن لوتھر نے بعد میں کیتھولک چرچ کے متعلق کیا تھا اور ان پر غیر ضروری تنقید کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کو زندگی بھر میں بمشکل چند افراد کی حمایت حاصل ہوئی۔ وہ ایک عمومی بلکہ نامقبول پیغمبر رہے۔ اگر وہ ستر برس زندہ رہتے اور ان کی موت بستر پر ہوتی تو شاید اب تک دنیا انہیں بھلا چکی ہوتی۔

چار برس بعد عیسیٰؑ یروشلم میں داخل ہوئے اور اپنے مسیحا ہونے کا اعلان کیا، جس کا انتظار صدیوں سے تھا۔ اچانک ان سے یہودی اسٹیبلشمنٹ کو خطرہ محسوس ہوا اور وہ انہیں گرفتار کر کے بڑے پادری کے سامنے لے گئے۔ تاریخ نے کائفس کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں کیا مگر جو کچھ بعد میں ہوا اس کا الزام اسے نہیں دیا جا سکتا۔ جب عیسیٰؑ سے مسیحا ہونے کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب اثبات میں دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ چھوٹے قد کا بے دیوار و دَر آدمی اپنی کبڑی کمر اور بے ہنگم داڑھی کے ساتھ یہودیوں کی نجات کا باعث بن سکتا ہے۔ اس نے عیسیٰؑ کو کاذب اور کافر قرار دیا اور Pilate کے پاس بھیج دیا تاکہ رومنوں کو خطرہ

کا اندازہ ہو۔ مگر Pilate ایک مہذب رومن تھا۔ اس نے عیسیٰؑ سے جب یہی سوال پوچھا کہ کیا تم مسیحا ہو؟ تو انہوں نے محتاط انداز میں اتنا کہا کہ "یہ تم نے کہا ہے۔" Pilate برسوں سے یہودیوں کے کبھی ختم نہ ہونے والے مذہبی جھگڑوں سے تنگ آ چکا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ یا تو سارے یہودی پاگل ہیں ورنہ وہ کم از کم بدامنی اور گمراہی تو ضرور پھیلاتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اسے کائفس پر بھی غصہ تھا کہ وہ اسے ایک معصوم اور بے ضرر شخص کا جلاد بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے عیسیٰؑ کو آزاد کرنے کی کوشش کی کیونکہ موسم بہار کے ہر جشن پر ایک سزا یافتہ مجرم رہا کر دیا جاتا تھا، مگر لوگوں نے جو کسی بھی رومی ہجوم کی طرح شور وغل کرتے تھے عیسیٰؑ پر ایک قاتل برابس کو ترجیح دی اور اسے Pilate کی اجازت سے آزاد کر دیا گیا۔ اس سے Pilate کو فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ کتنے ہی باغیوں کو موت کی سزا دے چکا تھا۔ دراصل دونوں میں سے عیسیٰؑ ہی کو مصلوب ہونا تھا۔ چنانچہ روم کے ہاتھوں ہزاروں مصلوب ہونے والوں کی طرح حضرت عیسیٰؑ کو بھی مصلوب کر دیا گیا۔

تو پھر انہوں نے دنیا کو تسخیر کیسے کیا؟ اس کی وجہ بھی آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں۔ سب سے اہم وجہ شاید یہ ہے کہ ان کی موت کے بعد جلد ہی ان کے حواریوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے انہیں زندہ دیکھا ہے اور چھوا بھی ہے۔ ایک مورخ سکونفیلڈ نے (1966ء) میں لکھا کہ شاید عیسیٰؑ کو ایسی کوئی دوا دی گئی تھی جس سے لگا کہ وہ مر گئے ہیں مگر وہ پھر بڑے نارمل طریقہ سے زندہ ہو گئے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب عیسیٰؑ کو صلیب سے اتارا گیا تو وہ ابھی زندہ تھے۔ رشوت کی ایک معقول رقم ایک رومی کمانڈر پر جادو کی طرح اثر کر سکتی تھی۔ ایک اور متنازعہ کتاب میں (1922ء) ہنری لنکن نے بھی دوا کا مفروضہ پیش کیا ہے اور اس نے ایک خفیہ رسم کا ذکر کیا ہے کہ عیسیٰؑ شادی شدہ تھے اور میری کے ساتھ جوڑیا سے چلے گئے تھے اور انہوں نے باقی زندگی گال میں بسر کی جہاں ان کی نسل سے لوگ میروونجی بادشاہ بنے۔ (اس کا کہنا ہے کہ اس انکشاف سے Rennes-le-Chateau کا راز آشکارا ہوتا ہے اور یہ کہ کس طرح ایک غریب کیتھولک پادری رات ہی رات میں دولت مند بن گیا) یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی توجیہہ آسان بھی ہو سکتی تھی اور یہ کہ دوبارہ زندہ ہونے کی کہانی عیسیٰؑ کے پیروؤں کی اختراع تھی۔ کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ عیسیٰؑ کے معجزانہ طور پر زندہ ہونے کی کہانیاں ان کے مصلوب ہونے کے ساتھ ہی عام ہو گئی تھیں۔

عیسیٰؑ کے متعلق ایک بات تو یقینی ہے کہ انہیں بیماروں اور معذوروں کو ٹھیک کرنے

کی قوت حیرت انگیز طور پر حاصل تھی۔ جوزفس کا کہنا تھا کہ وہ جادوگر ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم اس قوت کو جادوگری سے منسوب کریں یا اسے شفا دینے والی ایک بھرپور روحانی قوت سمجھیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ بیماروں کو شفا دیتی ہے اور معذوروں کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ عیسیٰؑ نے اپنی اس صلاحیت کو ترقی دے کر درجۂ کمال تک پہنچایا تھا۔

حیرت انگیز باتوں سے زیادہ کوئی اور بات تیزی سے نہیں پھیلتی۔ اسی لیے صلیب پر عیسیٰؑ کی موت نے انہیں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ اس ابتدائی دور میں ان کے پیروؤں کے دو الگ الگ گروہ تھے۔ نسورین جو حقیقی پیرو تھے اور جنہیں یقین تھا کہ عیسیٰؑ ایک سیاسی مسیحا ہیں جو یہودیوں کو آزادی دلائیں گے۔ جو ابھی زندہ ہیں اور مناسب وقت پر ظاہر ہو کر اپنے وعدے نبھائیں گے۔ (کنگ آرتھر نے بعد میں برطانیہ کے اندر ایسے ہی خیالات پھیلائے تھے۔ چھ سو سال بعد بھی کئی لوگ ابھی ان کے منتظر تھے) وہ کسی طرح بھی یہ نہیں سمجھتے تھے کہ عیسیٰؑ خدا ہیں کیونکہ ایسا سمجھنا تو یہودیوں کی مذہبی تعلیمات کے خلاف ہوتا۔ دوسرا گروپ جو عیسائی کہلاتے تھے پال کے بھی اتنے ہی پیرو تھے جتنا کہ عیسیٰؑ کے تھے۔ عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کے چند برس کے اندر سینٹ پال (جو نسوریوں سے سخت نفرت کرتا تھا) میں اچانک تبدیلی آئی۔ پال نے مسیح کا ایک نیا تصور ایجاد کیا جو نسوریوں کے تصور سے زیادہ انوکھا اور پراسرار تھا۔ پال کا عیسیٰؑ خدا کا بیٹا تھا، جسے زمین پر اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ انسانوں کو آدم کے نتائج سے بچائے۔ انسانوں کو بس یہ کرنا ہے کہ عیسیٰؑ پر ایمان لائیں اور نجات پائیں اور جب دنیا عیسیٰؑ کے کہنے کے مطابق آئندہ چند برسوں میں ختم ہو تو یہ عیسائی زمین پر رہیں گے جو بہشت میں بدل جائے گی۔

نسوریوں اور کرسچین دونوں کو ایک دوسرے سے سخت نفرت تھی اور اس نفرت کا انداز یہودیوں کے مذہبی تنازعوں جیسا تھا۔ ایک تاریخی حادثہ کی وجہ سے پال کے تصور کی جیت ہوئی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نیرو کی حکومت ختم ہونے سے پہلے ہی یہودیوں نے بغاوت کر دی تھی اور نیرو کو مجبور ہو کر بغاوت فرو کرنے کے لیے اپنے جنرل کو بھیجنا پڑا مگر نیرو کی خودکشی کے اگلے سال روم میں چار شہنشاہوں نے حکومت کی۔ پہلا شہنشاہ اسپین کا گورنر گالبا تھا جس نے بغاوت میں **Vindex** کا ساتھ دیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے باڈی گارڈز کو اس کے کنجوس اور سخت گیر ہونے کا اندازہ ہو گیا اور انہوں نے اسے قتل کر دیا اور نیرو کے دوست پرتگال کے گورنر **Otho** کو شہنشاہ بنا دیا۔ اتنے میں جرمن سپاہیوں نے اپنے جنرل

Vitellius کو شہنشاہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس نے روم آ کر Otho کو شکست دی اور Otho نے خود کشی کر لی۔Vespasian ابھی بحیرۂ روم کے دوسرے کنارے پر تھا۔ اس کے سپاہیوں نےVespasian کی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔ اس نے مصر پر قبضہ کیا اور روم کو اناج کی سپلائی بند کر دی۔ جب رومی فوجوں نے ڈینیوب سے روم کا قصد کیا اور آ کر وٹیلیس کو قتل کر دیا توVespasian کے شہنشاہ بننے کی باری آ گئی۔ سینیٹ نے اسے 70 عیسوی میں روم کا شہنشاہ مقرر کر دیا۔ اس نے اپنے بیٹے ٹائیٹس کو یہودیوں کی بغاوت کچلنے کے لیے بھیجا اور ٹائی ٹس نے یہ کام روایتی رومی سفا کی اور شقاوت کے ساتھ سرانجام دیا۔ چھ مہینوں کے محاصرے کے بعد ٹمپل جلا دیا گیا۔ انتہا پسندوں نے دس لاکھ سے زیادہ یہودی قتل کیے اور ٹمپل کے خزانے واپس روم لائے گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں نسورین بھی تھے۔ چنانچہ صرف پال کے کرسچین (جو بکھرے ہوئے تھے) باقی بچے تھے جو عیسیٰؑ کے ماننے والے تھے۔

جو نسورین زندہ بچے ہوں گے انہوں نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ پال کی یہ عیسائیت عیسیٰؑ کی تعلیمات کی بھونڈی اور توہین آمیز نقالی ہے اور یہ بات غلط نہیں۔ عیسیٰؑ چاہے قومیت کے لحاظ سے یہودی تھے یا نہیں، (اور گلیلی میں یہودیوں سے زیادہ عرب رہتے تھے) مذہب کے لحاظ وہ یقیناً یہودی تھے۔ اس لیے وہ اپنے خدا ہونے کی خبر سن کر کانپ گئے ہوں گے۔ کسی کی توہین کا یہ انداز رومیوں کی خصوصیت تھی۔ پلیٹ کی اجازت سے اس کے سپاہیوں نے آگسٹس کی خدانما تصویر لے کر یروشلم کے بازاروں میں گشت کی تھی تا کہ یہودیوں کی دل آزاری ہو مگر ایک اور لحاظ سے پال کی عیسائیت عیسیٰؑ کے خیالات کی صحیح عکاسی تھی۔ برنارڈ شا نے ایک بار کہا تھا کہ عیسیٰؑ اپنی زندگی کے آخری ایام میں حواس کھو بیٹھے تھے۔ شا کا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے آپ کو صرف ایک اخلاقی معلم اور اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ عیسیٰؑ نے کبھی اپنے مشن کی ایسی ریشنل توجیہہ کی ہو۔ ان کا یہ بیان کہ وہ گناہوں کو معاف کر سکتے ہیں ظاہر کرتا ہے کہ خدا کے ساتھ ان کا کوئی براہ راست رابطہ تھا۔ عیسائی اسے سچ سمجھتے ہیں مگر انہیں یہ بھی یقین تھا کہ دنیا ختم ہونے کو ہے اور اگر اسے بھی وہ خدا کا پیغام سمجھتے تھے تو عیسیٰؑ غلطی پر تھے۔

لگتا ہے کہ پال عیسیٰؑ کا موازنہ مشرقِ وسطیٰ کے ان کئی خداؤں سے کرتا تھا جو مرے اور مر کر زندہ ہوئے۔ جیسے اوسِس، مصر کا ادسِرس، بابل کا تموز۔ ان دنوں یہ کہانیاں عام

تھیں۔ پال بھی یہودی تھا اور یہودی عیسیٰؑ کے زمانہ کے اندر اس سوال میں الجھے ہوئے تھے کہ اگر خدا محبت ہے تو اس نے یہ ذلت اور اذیت کیوں بنائی ہے۔ پادریوں کے پاس اس کا ایک ہی جواب تھا کہ آدم نے گناہ کیا تھا، اس لیے انہیں جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ اب پال نے ایک اشارے سے یہودیت میں ایک نئے زاویہ کا اضافہ کر دیا تھا۔ صرف ایک روایتی نجات دہندہ خدا نہیں بلکہ وہ ہے جو گناہ اور ذلت کے قدیم مسائل حل کرنے آیا ہے۔ عیسیٰؑ نے بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ دنیا ختم ہونے کے بعد اس کے ماننے والے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

عیسائیت کے اس نئے تصور نے یہودیوں اور غیر یہودیوں کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ یہ جاننے کے لیے کہ انسان کے زوال سے پال کا کیا مطلب تھا کسی شخص کو بھی ٹائبرلیس، کیلی گلا اور نیرو کے روم کی طرف دیکھنا کافی تھا۔ یہ جنسی جنونی اور بدمست شرابی اس بات کا زندہ ثبوت تھے کہ کہیں کوئی بہت بڑی خرابی پیدا ہو چکی ہے اور رومی بیاہتا عورتوں نے جب محض عیاشی کے لیے طوائف بننا شروع کیا تو پتہ چلا کہ حوا بھی آدم سے پیچھے نہیں رہی تھی رومنوں کی بربریت، رومنوں کی غلیظ مادیت اور رومنوں کی وحشیانہ جنس پرستی سے دنیا گھناؤنی ہو چکی تھی۔ ایسے میں عیسائیت نے دل کی گہرائیوں میں گھر کر لیا۔ اس نے بے معنی زندگی کو معنی اور مقصد دیا۔ سنجیدگی اور تدبر سے نوازا۔ اس نے زور آوروں کو آگہی کی نئی بلندیوں سے روشناس کیا۔ کمزوروں کے لیے صلح اور امن کا پیغام تھا، تھکے ہارے لوگوں کو آرام اور انکسار کرنے والوں کو انعام دیا۔ اس کا وعدہ تھا کہ سیزر نہیں رہے گا اور اس کے ساتھ اس کی آمریت اور ظلم بھی مٹ جائے گا۔

پہلے تو ایسا لگا کہ وعدہ پورا ہونے کو ہے۔ کوئی شک نہیں کہ نیرو، سیزروں میں سے آخری سیزر تھا اور اس کے دور میں روم کے اندر طاعون پھیل گیا۔ طاعون کے بعد قیامت خیز آگ بھڑکی۔ 79 عیسوی میں دسوویس کے آتش فشاں نے پومپیائی اور ہرکولینم جیسے شہروں کو خاک میں ملا دیا۔ کئی دن ہر طرف تاریکی چھائی رہی۔ مگر غنیمت ہے کہ ان شہروں کے اکثر مکین تباہی سے بچ گئے۔ لیکن ایک مؤرخ پلینی نے اس المیہ کو جاننے کی کوشش میں اپنی جان گنوا دی۔

یقین نہیں آتا مگر روم نے اب بھی اپنا سبق نہیں سیکھا تھا کہ قطار میں لگے ہوئے شخص کو اس لیے سیزر بننے دیا کہ اس کی باری تھی۔ یہ پاگل ڈکٹیٹروں کو جنم دینے کا یقینی اور آسان نسخہ تھا۔ اس پر ایک بار پھر عمل ہوا۔ جب نیک طینت ٹائیٹس کا انتقال ہوا (اس نے

صرف دو سال حکومت کی تھی) اس کا بدخواہ اور حاسد بھائی Domitian اس کا جانشین تھا۔ اس کا مزاج ٹائبریس جیسا تھا مگر جلد ہی وہ اس سے بھی برا ہو گیا۔ رائن کے سپاہیوں کی ناکام بغاوت کے بعد اس نے انہیں ٹارچر کرنے کا ایک نیا طریقہ نکالا تھا کہ ان کے جسموں کے نازک اور حساس حصوں کے نیچے آگ کے شعلے بھڑکائے جاتے (لگتا ہے کہ Domitian ہم جنس پرست اذیت پسند تھا) جس کے بعد ان کا قتل عام کیا جاتا اور پھر وہی ظلم و ستم کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ جب اسے شک گزرتا کہ اس کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں وہ پاگل معمولی باتوں پر سینیٹروں کو قتل کروا دیتا اور درباریوں کو سولی پر لٹکا دیتا۔ (ایک تماشائی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے درندوں کے سامنے محض اس لیے ڈال دیا گیا کہ اس نے کوئی ہلکا سا مذاق کیا تھا) جتنا اس کا تشدد بڑھا اتنا ہی اس کے خلاف سازشوں میں بھی اضافہ ہوا۔ بلکہ ہم پہلے سیزروں کی نسبت اس کے جرائم سے کم واقف ہیں کہ جب تک سوتونیس اس تک پہنچے (دومیتن بارہ سیزروں میں سے آخری سیزر تھا) وہ سیزروں کے مظالم اور جرائم کی فہرستیں بناتا ہوا تھک چکا تھا۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ دومیتن بدترین سیزروں سے بھی بدتر سیزر تھا۔ اس کا پاگل پن اس حد تک بڑھا کہ وہ اپنے آپ کو لارڈ گاڈ کہلوانے پر اصرار کرنے لگا۔ اس نے سونے سے اپنے بے شمار بت بنوائے اور اپنی کامیابی کی یادگاریں تعمیر کیں۔ انصاف سے دیکھا جائے تو ایک جنرل کی حیثیت سے اس نے جرمنوں اور Dacians کے خلاف نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں اور چونکہ وہ اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا تھا اس لیے اس نے عیسائیوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی، کیونکہ عیسائی اس کی خدائی کو سلام کرنے سے انکار کی جرأت رکھتے تھے۔ مسلسل قتل و خون ریزی نے دومیتن کا قتل ناگزیر بنا دیا۔ آخر کار وہ 96 عیسوی میں اپنی حکومت کے پندرھویں برس میں قتل ہو کر رہا۔ اس کے قتل کی روئداد سچی اور معتبر ہے۔ نجومیوں نے اس کے قتل کی پیش گوئی کی تھی بلکہ یہ بھی بتا دیا تھا کہ قتل دن کے پانچ بجے ہوگا۔ صبح ہوتے ہی اس نے اس جرمن کو موت کی سزا دی جس نے خونریزی کی پیش گوئی کی تھی۔ دومیتن نے اپنی پیشانی پر ایک پھنسی کو دبایا تو اس سے خون بہنے لگا، ''تو یہ خون ہے، جسے پیش گوئی کے مطابق بہنا تھا۔'' اس نے اپنے اس خادم سے وقت پوچھا جو سازش میں شریک تھا۔ ''چھ بجے ہیں۔'' یہ سن کر دومیتن نے سکون کا سانس لیا اور نہانے چلا گیا۔ راستہ میں اسے بتایا گیا کہ ایک شخص ایک اور سازش کی خبر لے کر آیا ہے۔ دومیتن جلدی سے واپس ہوا۔ قاتل سازشیوں کی فہرست لیے اس کا منتظر تھا۔ اس نے فہرست پڑھنی شروع کی تو قاتل نے اس پر خنجر سے حملہ کر دیا۔

دومیتن زخمی ہو کر بھی اس سے لڑنے لگا۔ دومیتن نے قاتل سے خنجر چھیننے کی کوشش کی تو اس کی انگلیاں ہڈیوں تک کٹ گئیں۔ پھر اس نے قاتل کی آنکھیں نوچنے کی کوشش کی تو قاتل اس پر متواتر وار کرنے لگا، یہاں تک کہ دومیتن گر کر مر گیا۔ اس کی موت سے ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی اور تمام پبلک مقامات سے اس کا نام مٹا دیا گیا۔

بالآخر روم نے بھی یہ سبق سیکھ لیا کہ طاقت ایک آمر کو جنونی قاتل بنا دیتی ہے اور یہ کہ شہنشاہ کا انتخاب وراثت یا حالات پر نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ اس کا انتخاب سمجھ اور احتیاط سے کرنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ **Nerva** کو جب سینیٹ نے شہنشاہ منتخب کیا تو اس کی عمر ستر برس تھی۔ دو برس بعد اس کا انتقال ہو گیا مگر اپنے جانشین کے طور پر اس نے **Trajan** نامی ایک بڑے ذہین جنرل کا انتخاب کیا جو دوسرا جولیس سیزر ثابت ہوا۔ اپنے انیس سالہ دورِ حکومت میں اس نے **Dacian** سے ڈینیوب کے شمال اور مشرق تک فتح کیا اور رومی سلطنت کی حدیں دور تک پھیلا دیں۔ مگر وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ روم کی افرادی قوت پھیلا کر اس نے اپنے جانشینوں کے لیے ایک اہم مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ ایک مسئلہ جو تقریباً چار سو سال بعد صرف سلطنت کی تباہی سے حل ہوگا۔

تاہم اس کے جانشین، اس کے کزن ہیڈرین نے مسئلہ کا اندازہ کر لیا اور اپنی مشرقی سرحدوں کی وسعت کم کرتے ہوئے اپنی حکومت شروع کی۔ اس سے مطلوبہ مقصد پورا ہو گیا اور ہیڈرین کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ گھوم پھر کر سلطنت کے حالات کا جائزہ لے سکے۔ اب سڑکیں اور راستے محفوظ تھے۔ سمندروں کو قزاقوں سے نجات مل گئی۔ ہیڈرین نے مصر سے سکاٹ لینڈ تک کا دورہ کیا۔ سڑکیں، پل، تھیٹر اور عبادت گھر تعمیر کیے۔ بلکہ نئے شہر بھی بسائے۔ کنکریٹ دستیاب ہونے کی وجہ سے اس کے انجینئروں نے اور زیادہ تیزی اور اہلیت کے ساتھ تعمیری کام مکمل کیے۔

ہیڈرین کو ایک دلچسپ خیال سوجھا کہ 'کونسلر آف اولڈ' کی طرح دو شہنشاہ مل کر حکومت کریں کیونکہ مارکس اوریلیس اور لوسس ورسس دونوں نوعمر تھے اس لیے جب ہیڈرین کی صحت خراب ہونے لگی تو اس نے ایک نگران شہنشاہ انٹونیس مقرر کر دیا۔ پرانا زمانہ ہوتا تو یہ قتل اور آمریت کا یقینی موقع تھا مگر ہیڈرین کا انتخاب اچھا تھا۔ انٹونیس نے امن اور سلامتی کے ساتھ تیئس برس حکومت کی اور ہیڈرین کے خدا ہونے کا اعلان کیا۔

161 عیسوی میں جب دو کونسل شہنشاہوں نے حکومت سنبھالی تو امن کا دور ختم ہو

گیا۔ تقریباً نصف صدی تک روم نے ایک سنہری دور دیکھا تھا، اب پھر وحشی سرحدوں پر حملہ آور تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روم کا واحد فلسفی شہنشاہ مارکس اوریلیس (اس کا ساتھی شہنشاہ آٹھ برس بعد مر گیا تھا) اپنا وقت فوجیں منظم کرنے اور اپنی سلطنت کے دور دراز علاقوں کی طرف مارچ کرنے میں صرف کرتا تھا۔

مارکس اوریلیس ایک صابر اور متوکل شخص تھا۔ ایسے لوگ زندگی کو ایک کٹھن سفر سمجھتے ہیں جس کے دوران اکثر لوگ برباد ہو جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں تباہی سے بچنے کا واحد ذریعہ استدلال اور ضبط نفس ہے۔ اس قسم کی زندگی بسر کرنے کا شہنشاہ کے پاس معقول جواز تھا۔ اسے میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے خیمہ میں بیٹھ کر اپنے مشہور افکار بھی قلم بند کرنے ہوتے تھے۔ اس کی بیوی فاسٹینا بے وفا تھی۔ اس کا بیٹا کموڈس بگڑا ہوا نوجوان تھا جو روم کا بدترین شہنشاہ ثابت ہوا۔ ایک موقع پر کموڈس کو اپنی ساری دولت خرچ کر کے سرکاری خزانہ کا خسارہ پورا کرنا پڑا۔ جب وہ 59 برس کی عمر میں فوت ہوا رومن سلطنت کو سنبھالا دینے کا کام ابھی باقی تھا۔ پھر بھی اس کے افکار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صبر وسکون کے ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں جا کر انسان جان لیتا ہے کہ زندگی کے ہر راز کا راز داں خود دماغ ہے اور وہی ہر مسئلہ کا حل ہے۔ رومی شہنشاہوں کی ہلاکت خیز تاریخ میں وہ روشنی کا مینار ہے۔

اگر مارکس اوریلیس نے جان بھی لیا تھا کہ اس کا بیٹا ظالم اور بدمعاش ہے تو بھی اسے شہنشاہ بننے سے روکنے میں دیر ہو چکی تھی۔ باپ کے مرتے ہی کموڈس نے شمال میں قبائلیوں کے خلاف جنگ وہیں چھوڑی اور عیش وعشرت کے لیے روم بھاگا۔ اس نے روم کا نام بدل کر کموڈیانا اور اپنا نام ہرکولیس رکھ لیا اور روم کی خوں چکاں تاریخ کے ہر برے شہنشاہ کا طریقہ اختیار کیا۔ نیرو اگر مال پرست تھا تو کموڈس اپنے آپ کو کھلاڑی سمجھنے لگا۔ اس کی سب سے بڑی خوشی اکھاڑے میں مخالف کھلاڑیوں سے مقابلہ تھا جن کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی جاتی تھی اور جنہیں وہ بڑی آسانی کے ساتھ تلوار کی نوک پر رکھ لیتا۔ وہ ڈینگیں مارا کرتا کہ اس نے کئی مخالفوں کو صرف اپنے بائیں ہاتھ سے مارا ہے۔ شاید وہ پاگل بھی تھا۔ وہ ہرکولیس جیسا لباس پہن لیتا اور لوگوں کو مارنے لگتا۔ ایک ناکام قاتلانہ حملے کے بعد وہ اور بھی بدحواس ہو گیا اور کئی سینیٹروں کو قتل کروا دیا۔ آخرکار جب یہ واضح ہو گیا کہ کسی کی زندگی اس کے ہاتھوں محفوظ نہیں تو اس کی اپنی محبوبہ نے اسے زہر دے دیا۔ بارہ برس کے مختصر عرصہ میں اس نے ان تمام اچھے کاموں پر پانی پھیر دیا جو پچھلے چار شہنشاہوں نے کئے تھے اور اس طرح روم کو دیوالیہ کر دیا۔

کموڈس غالباً روم پر نازل ہونے والی سب سے بڑی لعنت تھی۔ یہ نہیں کہ وہ کیلی گلا اور نیرو سے بھی برا تھا، بلکہ یہ کہ اس کی وجہ سے سلطنت کے زخموں سے روم کا خون بہہ رہا تھا۔ اس لیے روم کوئی اور پاگل برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی روم کا شہری ہونا فخر کی بات تھی، اب اس کے معنی ان جرنیلوں کا خراج ادا کرنا تھا جو اقتدار کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ جب کموڈس فوت ہوا، چار ایسے ہی شہنشاہ بننے کے امیدوار اقتدار حاصل کرنے کے جتن کر رہے تھے۔ ستم یہ ہے کہ اس دوڑ میں جیتنے والا سیورس کارتھیج کا رہنے والا تھا۔ سفاک اور ظالم مگر شان دار سپاہی، جس نے روم کی فوجی عظمت کو نئی زندگی دی۔ کئی سینیٹروں کو قتل کیا مگر خود تیرہ برس کی حکمرانی کے بعد فطری موت مرا۔ اس نے اپنے دو بیٹوں کو نصیحت کی کہ متحد رہیں، سپاہیوں کو تنخواہ دیں اور باقی سب بھول جائیں۔ بیٹوں نے اس کی نصیحت کی پروا نہ کی اور ایک دوسرے کے قتل کی کوشش میں لگ گئے۔ بڑا بھائی غداری کے فن سے زیادہ واقف تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو ماں کے گھر آنے کی دعوت دی اور اسے ماں کے بازوؤں میں قتل کر دیا۔ کراکلا نے بیس ہزار ایسے افراد کو قتل کر دیا جنہیں وہ اپنے بھائی کا حامی سمجھتا تھا اور اس شدت کی دہشت گردی شروع کی جو میریلس کی یاد تازہ کرتی تھی۔ وہ اپنی بدخوئی اور کینہ توزی میں کئی شہنشاہوں پر سبقت لے گیا۔ جب وہ اسکندریہ گیا جس کے شہریوں کے خلاف اس کے دل میں شدید نفرت تھی، اس نے شہر کے اکثر نوجوانوں کو کسی تقریب کے بہانے پریڈ گراؤنڈ بلایا جہاں اس کے سپاہیوں نے انہیں گھیر کر قتل کر دیا۔ اس کا صرف یہ کام قابل تحسین تھا کہ اس نے سلطنت کے تمام آزاد شہریوں کو رومی شہریت کا درجہ دیا۔ مگر شاید یہ کام بھی اس نے اس لیے کیا ہو کہ ٹیکس دہندوں کی تعداد بڑھ جائے۔ جب کراکلا اپنے افسروں کے ہاتھوں مارا گیا تو سینیٹ سے تلوار کی نوک پر اس کے خدا ہونے کا اعلان کروایا گیا۔

اس کے بعد 'فوجی شہنشاہ' چکرا دینے کی رفتار سے آئے اور گئے، ان میں سے اکثر قتل ہوئے۔ ان میں سے ایک ہیلیو گلابس (22-218عیسوی) لوگوں کو یاد تھا جس کا نام مخصوص برائیوں کا عنوان بن گیا تھا۔ دراصل وہ سائیکی کے لحاظ سے عورت اور جسم کے لحاظ سے مرد تھا یعنی مرد کے روپ میں عورت تھی۔ جب پندرہ سال کی عمر میں وہ شہنشاہ بن گیا تو اس نے ڈاکٹر کی تلاش کی جو آپریشن سے اس کی جنس بدل دے۔ مگر آخر اس نے خصی ہونے کا ارادہ کر لیا اور زوٹکس نامی ایک مشٹنڈے غلام سے شادی کر لی۔ شہزادی (اسے شہزادی کہلانے پر اصرار تھا) نے اس کے بعد شہر کی طوائفوں کی سرپرست بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے

سب طوائفوں کو بلایا اور ان کے سامنے اپنی تقریر میں جنسی گمراہی کے ہر طریقہ کا ذکر کیا۔ طوائفوں میں دلچسپی کی اصل وجہ ان کا پیشہ اپنانا تھا۔ ایک دفعہ وہ ایک قحبہ خانہ میں چلا گیا تمام طوائفوں کو وہاں سے باہر کیا اور ان کا کام خود سنبھال لیا۔

اس کے چار سال بعد اس کے سپاہیوں نے طے کیا کہ انہیں حقیقی شہنشاہ کی تلاش ہے۔ 222 عیسوی میں اسے باتھ روم میں قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش دریا میں پھینک دی گئی۔

اس ہلکی سی تفریح کے بعد روم میں پھر وہی قتل اور سازش کا بازار گرم ہو گیا۔ ستر برس میں ستر سے زیادہ شہنشاہ یا شہنشاہیت کے امیدوار تھے۔ اتنی بڑی تعداد کی وجہ فوج کا اقتدار تھا، صرف فوج ہی اصلی طاقت تھی۔ اگر سپاہیوں کو شہنشاہ ناپسند ہوتا تو وہ اسے قتل کر دیتے تھے۔ اس عرصہ میں وحشیوں کا خطرہ بھی بڑھنے لگا۔ ایک ایرانی بادشاہ نے حکمران خاندان کا تختہ الٹ دیا اور ساسانی بادشاہوں کے ایک نئے سلسلہ کی ابتدا کی۔ جب روم کی مشرقی سرحدوں کو ساسانیوں سے خطرہ تھا، شمال سے جرمن اور گوتھ آنے شروع ہو گئے۔ شام میں پالمیرا کی حسین ملکہ زینوبیا نے بغاوت کر دی جسے دبانے میں تین سال لگ گئے۔ آخر اسے سنہری زنجیروں میں جکڑ کر روم لے جایا گیا۔ جہاں اس نے ایک سینیٹر سے شادی کی اور رومن شہری کی حیثیت سے وفات پائی۔ برطانیہ میں حملہ آوروں نے ہیڈرین کی دیوار کے بڑے حصے گرا دیئے۔ سلطنت کی سڑکوں پر ڈاکو اور لٹیرے پھر دندنانے لگے۔ کھیت بنجر ہو گئے۔ طاعون پندرہ سال تک ساری سلطنت میں پھیلا رہا۔ روم کے پاس اپنے لوگوں کے لیے اناج نہ رہا۔ چینیوں کے برعکس کہ جنہوں نے اپنی زمین نہروں سے زرخیز کر لی تھی۔ اٹلی کی غذائی پیداوار ہمیشہ ناکافی رہی۔ اٹلی درآمدات کا سخت محتاج رہا۔ آخر شہنشاہیت کے امیدواروں کے ہجوم میں سے ایک شخص Diocletian نکلا جس نے 284 عیسوی میں روم کی حکومت پر قبضہ کیا اور اکیس برس حکمران رہا۔ اس نے بڑی سختی سے روم کی ہر خرابی کی نشان دہی کی اور اسے دور کیا۔ اکثر رومنوں نے تباہ ہونے پر اس کی سخت گیری کو ترجیح دی۔ اس نے انہیں اس طرح نچوڑا کہ پہلے کسی نے نہیں نچوڑا تھا۔ اس کی فوجیں سلطنت میں پھیل گئیں مگر وہ جہاں بھی رہتی تھیں، وہاں کے لوگ انہیں کھانا پینا مفت فراہم کرتے تھے۔ جہازوں پر بھی سفر کا فوج سے معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔ ٹیکس اتنے زیادہ تھے کہ بزنس مین اپنا بزنس اور کسان کھیت چھوڑ گئے۔ یہاں تک کہ اس نے انہیں ریٹائر ہونے سے باز رکھنے کے لیے قوانین بنائے۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ سلطنت اب بہت بڑی اور غیر منظم ہے اس نے حکومت میں اپنی

مدد کے لیے تین اور 'سیزر' مقرر کیے بڑا پارٹنر اس کا ایک قابل اعتماد افسر میکس میلین تھا جسے میلان سے مغرب کا علاقہ حکومت کرنے کے لیے دیا گیا۔Diocletian کونکومیڈین سے مشرق میں ایشیائے کوچک کی ذمہ داری دی گئی، ایشیائے کوچک جسے اس نے چھوٹا روم بنا دیا تھا۔اس کے داماد گالیسیس نے بلقان کا اختیار سنبھالا۔ جبکہ میکس میلین کا داماد گال کا حاکم بنا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ سلطنت متحد رہے گی توDiocletian ریٹائر ہو گیا اور میکس میلین سے بھی اس نے ریٹائر ہونے کو کہا تو سلطنت فوراً منتشر ہونا شروع ہو گئی۔

جانشینی کا مسئلہ آئندہ برسوں میں بھی طے نہ ہو سکا۔ مقابلہ گلیریس (جو میکس میلین کا بیٹا تھا) اور کونسٹن ٹائن میں تھا۔ جب برطانیہ میں کلرس کا انتقال ہوا تو کونسٹن ٹائن کی شہنشاہ کی حیثیت سے اس کے باپ کے سپاہیوں نے پذیرائی کی۔ آخر کونسٹن ٹائن نے اٹلی پر حملہ کیا۔میلون پل پر اس نے اپنے مدمقابل کے ساتھ لڑائی میں اسے ہلاک کیا اور اس کی لاش دریائے ٹبر کی نذر کی۔ بارہ برس کی خانہ جنگی کے بعد آخر کونسٹن ٹائن رومی سلطنت کا واحد حکمران بن گیا۔

اور یہاں ہم ایک اہم سوال سے دوچار ہوتے ہیں، تاریخ کے پاس جس کا کوئی جواب نہیں۔ کونسٹن ٹائن بھی ایک ایسا ہی ناپسندیدہ کردار تھا جیسے کہ روم کی تاریخ کے باقی کردار تھے۔ انہی کی طرح سفاک اور ظالم تھا۔ اس کی بس ایک مثال کافی ہو گی۔ جب اس نے اپنی بیوی فاؤسٹا سے نجات چاہی تو اسے اس کے باتھ روم میں بند کر دیا جہاں وہ دم گھٹ کر مر گئی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس نے سینٹ پال کے انداز سے عیسائیت قبول کی تھی۔ اس نے الزام لگایا کہ میلون پل کی جنگ میں اس نے آسمان میں صلیب دیکھی تھی اور یہ الفاظ کہ ''اس کے ذریعہ تم فتح پاؤ گے''۔ کونسٹن ٹائن جنگ میں ایک برچھی لے کر گیا جو صلیب بن گئی تھی اور فتح یاب ہوا۔ اس وقت سے عیسائیت رومی سلطنت کا مذہب بن گئی اور عیسائیت اس وقت سے کونسٹن ٹائن کی شکر گزار ہے۔ سوانح نگار رقمطراز ہے کہ کونسٹن ٹائن نے نشان کے لیے واقعی خدا سے دعا کی تھی جو اسے صلیب کی صورت دے دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کونسٹن ٹائن موت کے بستر پر عیسائی ہوا تھا۔ قتل، لوٹ اور غداری سے عبارت ایک زندگی اپنا آپ ثبوت ہے کہ عیسائیت کی روح نے اسے چھوا بھی نہیں تھا۔

تو پھر کونسٹن ٹائن نے عیسائیت کو سلطنت کا سرکاری مذہب بنانے کا فیصلہ کیوں کیا۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اس نے واقعی بادلوں کی کوئی ایسی صورت بنتی

دیکھی ہو جسے اس نے کوئی مخصوص نشان یا اشارہ سمجھا ہو۔ رومن ویسے بھی شگونوں کے قائل تھے۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ وہ اپنی ماں ہیلینا کے زیر اثر ہو جو ایک برطانوی شہزادی تھی (یا گبن کے مطابق ایک ہوٹل والے کی بیٹی تھی، جو کبھی عیسائی ہوئی تھی اور اس نے بعد میں ارضِ مقدس کی زیارت کی تھی اور وہ صلیب تلاش کر لی تھی جس پر عیسیٰؑ مصلوب ہوئے تھے۔ یہ محض ایک اتفاق ہوسکتا ہے ورنہ کونسٹن ٹائن جوانی کے آغاز میں شاید ہی اپنی ماں سے کبھی ملا ہو، وہ اقتدار کی کشمکش میں بہت مصروف تھا اور ایسا شخص نہیں تھا جو کسی صورت میں بھی اپنی ماں کے خیالات سے متاثر ہوسکتا ہو یا وہ سیزر گلیریس کی بیماری اور موت سے ڈر گیا ہو جس نے عیسائیوں پر بہت ظلم کروائے تھے اور جو سمجھتا تھا کہ اس کی بیماری اس کے مظالم کی سزا ہے اور اسی خوف میں مبتلا رہ کر مر گیا تھا۔ مگر زیادہ امکان یہ ہے کہ کونسٹن ٹائن نے سوچا ہو کہ ایک زبردست فاتح ہو کر وہ اگر اقلیتی مذہب (رعایا میں سے صرف دس فیصد عیسائی تھے) کی پذیرائی کرے تو اسے ڈرامائی مقبولیت ہوگی۔

جواب کچھ بھی ہو، یہ نہیں ہوسکتا کہ عیسائیت اس لیے پھیلی ہو کہ کونسٹن ٹائن اس کی صداقت پر ایمان لے آیا تھا۔ ایک مؤرخ کی حیثیت سے یوسی بیئس بددیانت یا احمق تھا جب اس نے لکھا، ''جب میں نے اس پاکیزہ روح کو ہر دنیاوی آلائش سے پاک ہمیشہ دمکتے ہوئے تاج میں خدا کے ساتھ اکائی بنتے دیکھا تو خاموش و ساکت رہ گیا۔ کیونکہ یہ تو ہوسکتا ہے کہ شہزادی ہیلینا نے اپنے بیٹے کے جرائم کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ارضِ مقدس کی زیارت کی ہو جبکہ خود کونسٹن ٹائن کو اس کی پروا نہیں تھی۔

جب 326 عیسوی میں کونسٹن ٹائن اپنا دارالحکومت روم سے بازنطین لے گیا تو دراصل وہ روم کو عیسائیوں کے حوالے کر رہا تھا۔ وہ شہر جو مادیت اور تشدد کی آماج گاہ تھا محبت اور نجات کا گہوارہ بن گیا۔ کونسٹن ٹائن نے اپنا تاج پوپ کے حوالے کر دیا۔ آنے والے دَور میں یہ سوال پریشان کرتا رہا کہ ہارا کون اور جیت کس کی ہوئی؟

سلطنت روم کا خاتمہ

313 عیسوی میں عزت و احترام حاصل کرنے کے بعد پہلے سال ہی عیسائیوں نے بچوں کی طرح لڑنا شروع کر دیا۔ جھگڑے کی وجہ Diocletian کے مظالم کے زمانہ میں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ سمجھوتا تھا، جس کے لیے ایک پارٹی دوسری پارٹی کو معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ عیسائیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی مقدس کتابیں حکومت کے حوالے کر دیں۔ جنھوں نے انکار کیا انہیں اپنی جان دینی پڑی۔ بعض افراد نے کوئی سی کتابیں مذہبی کتابوں کے طور پر پولیس کو دیں یہ جانتے ہوئے کہ پولیس اَن پڑھ ہوتی ہے۔ ایک بشپ نے میڈیکل نصاب کی کتابیں انہیں دے دیں۔ چند افراد نے اپنی مقدس کتابیں ایک خاص مدت کے لیے دیں۔ یہ سمجھوتے اب غصہ و نفرت کا سبب بن گئے۔ سمجھوتا نہ کرنے والے Donatist کہلاتے تھے، جو چاہتے تھے کہ سمجھوتا کرنے والوں کو سزا دی جائے اور چرچ سے نکالا جائے۔ کونسٹن ٹائن حیران تھا کہ یہ محبت اور معافی کی تلقین کرنے والے کس طرح ایک دوسرے کے درپے آزار تھے۔ وہ خود اس جھگڑے میں الجھ گیا، جب اس نے حکم دیا کہ ضبط شدہ چرچ عیسائیوں کو واپس کیا جائے۔ اب عیسائیوں کے دو گروہوں میں سے ہر گروہ چرچ پر اپنے حق کا دعوے دار تھا۔ بشپ آف روم نے سمجھوتا نہ کرنے والوں کی مخالفت کی اور یہی فیصلہ کونسل آف بشپس نے دیا جن کی میٹنگ 314 عیسوی میں Arles کے اندر ہوئی۔ غضب ناک ہو کر Donatists نے ان کا فیصلہ رد کر دیا اور اپنے مخالفوں کے قتل پر تیار ہو گئے۔ کونسٹن ٹائن کو بڑی دیر سے سمجھ آئی ہو گی کہ یہودیوں کی طرح یہ عیسائی بھی جھگڑالو اور مفسد تھے۔ اور یہ کہ رومیوں کی سادہ اور سہل دہریت پر ان کے مذہب کو ترجیح دے کر اس نے بڑی غلطی کی ہے۔ ممکن ہے کہ اپنی عیسائی رعایا کے ایک دوسرے پر غرانے اور جھپٹنے کا یہ منظر ہو جس سے تنگ آ کر اس نے

بازنطین بھاگنے کا فیصلہ کیا ہو۔ مگر امن کے سلسلہ میں اس کی امید پھر بھی پوری نہ ہوئی۔ یونانی چرچ بھی بری طرح مختلف پارٹیوں میں بٹا ہوا تھا کیونکہ Arius نامی پادری سے یہ بات ہضم نہ ہوسکی کہ عیسیٰ درحقیقت خدا ہے، جس نے یہ کائنات پیدا کی ہے۔ اور یہ کہ اس کا من سینس سے اسکندریہ کا بشپ برہم ہو گیا۔ Arius نے مؤرخ یوسی بیئس سے وضاحت چاہی جو سمجھتا تھا کہ کونسٹن ٹائن تمام اخلاقی برائیوں سے آزاد ہے۔ اس تنازع نے اتنی شدت اختیار کی کہ خصوصی کونسل آف بشپس بلانی پڑی۔ اس کونسل نے Arius کے خلاف اور اس خیال کے حق میں کہ ''عیسیٰ خدا ہے'' فیصلہ دیا۔ ایک ایسا خیال جو عیسائیت کے بانی کے ہوش اڑا دیتا۔ یا وہ شاید اپنی حس مزاح کی وجہ سے مسکرا دیتا۔ اس فیصلہ سے Arius اور اس کے حامیوں کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ جانتے تھے کہ کامن سینس اس کے ساتھ ہے چاہے مخالف کچھ بھی کہیں۔ مگر مخالفوں نے اب Arius کو خودغرض قرار دیا۔ (جو عیسائیوں کی نظر میں سخت توہین آمیز تھا) اور اسے کمیونین سے الگ کر دیا۔ جب Arius فوت ہوا تو اس کے سب سے بڑے مخالف اتھانیسس نے مشہور کیا کہ اس پر آسمان سے قہر نازل ہوا، یعنی بجلی گرنے سے اس کی موت واقع ہوئی۔

اور جب عیسائی آپس میں لڑتے مرتے رہے تو رومی شہنشاہوں نے بھی یہی روش اختیار کی۔ کونسٹن ٹائن بپتسمہ کے فوراً بعد 337 عیسوی میں مر گیا تھا۔ یہ حقیقت کہ اس کے وارث عیسائی ہو چکے تھے انہیں وراثت طے کرنے کے روایتی رومی ہتھکنڈوں سے نہ روک سکی۔ کونسٹن ٹائن نے اپنے جن دو بھتیجوں کو وارثوں میں شامل کر لیا تھا، انہیں قتل کر دیا گیا اور اس کے تین بیٹے مل کر حکومت کرنے لگے۔ ان میں سے ایک بیٹے نے بازنطین (اب قسطنطنیہ) میں اقتدار سنبھالا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے قرابت داروں کا خوف دور کیا اور ان کے تحفظ کی ذاتی ضمانت دی۔ اس کا دوسرا کام ان کے خلاف سازش کا منصوبہ تیار کرنا تھا۔ نکومیڈیا کا بشپ بھی سازش میں شریک ہو گیا۔ اس نے ایک دستاویز پیش کی جس میں کونسٹن ٹائن نے الزام لگایا تھا کہ اس کے بھائیوں نے اسے زہر دیا ہے۔ سپاہیوں کو جب یہ دستاویز دکھائی گئی تو انہوں نے جا کر کونسٹن ٹائن کے دو بھائیوں، سات بھتیجوں اور کئی رشتہ داروں کو قتل کر دیا۔ صرف Gallus اور Julian نامی دو بچے خاندان میں سے باقی رہ گئے۔ اس عرصہ میں کونسٹن ٹائن کے دوسرے دو بھائیوں نے لڑائی شروع کر دی۔ ایک بھائی نے دوسرے کو قتل کیا اور قاتل ایک باغی سردار کے ہاتھوں مارا گیا، جو تخت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ کونسٹن ٹینٹس باغی

سردار کو قتل کر کے سلطنت کا واحد حکمران بن گیا۔ اسی دوران شاید اپنے جرم کا احساس کرتے ہوئے اس نے Gallus کو اپنا شریک سیزر بنایا مگر جلد ہی پچھتا گیا اور اسے گرفتار کر کے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

کونسٹن ٹینئس کے کزن Julian نے شہنشاہ بننے کی کوئی خواہش کبھی ظاہر نہیں کی۔ وہ کتاب کا کیڑا تھا لیکن پھر بھی وہ گرفتار ہونے سے بچ نہ سکا۔ گرفتار کر کے اسے میلان میں سات مہینے رکھا گیا جہاں اس کی جان مسلسل خطرہ میں تھی۔ مگر وہ اتنا بے ضرر تھا کہ کونسٹن ٹینئس نے اسے ایتھنز جانے کی اجازت دے دی۔ وہاں جا کر وہ فلسفہ میں ڈوب گیا اور ایک عام طالب علم کی طرح رہنے لگا۔ کونسٹن ٹینیس کو بالآخر اسے گال اور شمالی ملکوں کا سیزر بنانا پڑا۔ وہاں جولین نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک پیدائشی سپاہی ہے اور فرانسیسی اور جرمن قبائل کے خلاف بعض اہم فتوحات بھی حاصل کیں۔ مگر جب اسے شک ہوا کہ کونسٹن ٹینیس کی نیت خراب ہو رہی ہے اور ہٹ لسٹ پر اگلا نام اس کا ہے تو اس نے لڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی فوج لے کر جنوب کی جانب چلا گیا۔ مگر لڑائی کی نوبت نہ آئی، کونسٹن ٹینیس لڑائی سے پہلے مر گیا اور کتاب کا کیڑا جولین، اپنے پیش رَو کلاڈیس کی مثال، روم کا شہنشاہ بن گیا۔

عیسائیوں کے ساتھ جولین کا رویہ دوستانہ نہیں تھا۔ اپنے خاندان کے قتل میں بشپ آف نکومیڈیا کا کردار اسے یاد تھا۔ سیاست دان کے بجائے ایک فلسفی کی نظر سے اس نے جان لیا تھا کہ عیسائیت کو سرکاری مذہب کا درجہ دے کر کونسٹن ٹائن نے غلطی کی تھی۔ ثبوت یہ تھا کہ اب بھی جب کبھی موقع ملتا وہ ایک دوسرے کو کافر کہتے اور قتل کرتے تھے۔ سیزروں کی طرح طاقت ان کے لیے بھی خطرناک ثابت ہوئی تھی۔ ہمسایہ سے پیار کا سبق وہ بھول چکے تھے، ان کی شر انگیزی یہودی انتہا پسندوں سے بھی سوا تھی۔ 366 عیسوی میں پوپ کے انتخاب کے سلسلہ میں وہ ایک چرچ کے اندر آپس میں لڑ پڑے تو اس لڑائی میں 137 افراد ہلاک ہوئے۔ ایک مؤرخ کا کہنا ہے کہ ''درندے بھی انسانوں کے ایسے دشمن نہیں ہوتے جیسے کہ نفرت میں اندھے ہو کر اکثر عیسائی ہو جاتے ہیں۔'' جولین نے سوچ لیا کہ توازن قائم کرنے کے لیے اس سے جو ہو سکا وہ کرے گا۔ اس کا ارادہ عیسائیوں کو کچلنے یا مارنے کا نہیں تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ عیسائی لڑنا جھگڑنا بند کریں اور عیسائیوں جیسا رویہ اختیار کریں۔ اس نے کئی بشپ بلائے جو آپس میں الزام تراشی کرتے تھے اور انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ اس نے 'دہریوں' کے حقوق بحال کیے، جنہیں جلاوطن کیا گیا تھا انہیں وطن واپس آنے کی اجازت

دی۔ اس نے عیسائیوں سے وہ رعایتیں واپس لے لیں جو انہیں ٹیکس وغیرہ کے سلسلہ میں دی گئی تھیں۔ اس نے بت پرستوں کی عبادت گاہیں کھلوا دیں اور اُن کے پادریوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے مذہبی رواداری کا وہ دور واپس لانے کی کوشش کی جو کونسٹن ٹائن کی غلط بخشی اور عیسائیوں کی شرانگیزی سے پہلے موجود تھا۔

اس صورت حال سے عیسائی سخت برہم ہوئے۔ انہوں نے فوراً جولین کو بے دین قرار دے دیا۔ عیسائی لکھاریوں نے اس کی شدید مذمت کی۔ ان میں گریگوری آف نازیان جولین کے سکول کے زمانہ کا دوست بھی تھا۔ جس کی جولین نے مدد کی تھی مگر گریگوری اس کی مہربانی کی جھوٹی وجوہات بیان کر رہا تھا۔ بلکہ اس نے جولین پر الزام لگایا کہ وہ عیسائیوں کو شہادت کے اعزاز سے محروم کرنے کے لیے انہیں قتل نہیں کرتا۔

بدقسمتی سے مارکس اوریلیس کی طرح یہ فلسفی شہنشاہ بھی گھر رہ کر اپنا ادبی کام جاری نہ رکھ سکا۔ وحشی اب تک سرحدوں پر خطرہ بنے ہوئے تھے۔ اسے شہنشاہ بنے ہوئے ابھی دو برس ہوئے تھے کہ ایران میں ایک کامیاب مہم سے واپسی پر نیزے کے زخم سے فوت ہو گیا۔ عیسائیوں نے سکھ کا سانس لیا اور پھر آپس میں لڑنے جھگڑنے اور ایک دوسرے کو مارنے میں لگ گئے۔

تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ جولین کی رواداری سے حالات اور خراب ہو گئے۔ دہریوں کو گھر واپس آنے کی اجازت دے کر اس نے **Anti Arians** کا اقتدار بحال کر دیا۔ کونسٹن ٹینیس نے **Arius** کی حمایت کی تھی) اور آخر **Nicene** کے نظریہ کو (کہ عیسیٰؑ خدا اور خالق ہیں) نتیجتاً تسلیم کر لیا گیا اور جھگڑے اور فساد جاری رہے۔ **Reade** کا کہنا ہے کہ:

> ”سارے بشپ جاہل اور توہم پرست تھے۔ مگر ایک جیسا سوچ نہیں سکتے تھے اور اختلاف پیدا کرنے کے لیے وہ اس کی وضاحت کرتے جس کا کبھی کوئی وجود نہ تھا اور اگر وجود تھا تو اس کی وضاحت کبھی نہ ہو سکی۔ وہ جنت کی منظر کشی کرتے۔ پیچیدہ اور گہرے مذہبی مسائل پر بے تکان بولتے۔ انجم و افلاک کے اسرار کی وضاحت کرتے۔ خدائی فطرت اور معجزوں کے تجزیے پوری جاہلیت کے ساتھ کرنا ان کا معمول تھا۔ وہ صرف '1' کو '3' اور '3' کو '1' نہیں کہتے تھے بلکہ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ اُن کا یہ حساب صحیح ہے۔ مگر ان کے باہمی فساد کے باوجود بت پرست ان کے حملوں سے محفوظ نہیں تھے۔ شہنشاہ تھیڈوسیس جو اسپینی تھا اور جس نے 379 میں اقتدار سنبھالا، اس نے فرمان جاری کیا کہ اس کی تمام رعایا کیتھولک عیسائی

کہلائے اور باقی جنہیں ہم پاگل سمجھتے ہیں اپنے ملحدانہ خیالات کی ذلت اٹھائیں گے۔ ان پر خدا کا عذاب نازل ہوگا اور ہم بھی ان سے بدلہ لیں گے۔ ایک غیر عیسائی لکھاری نے اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''ہر شے خدا کی ذات سے معمور ہے، ہم سب ایک سے ستارے دیکھتے ہیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم علم کے کس سسٹم کے ذریعے سچ کی تلاش کرتے ہیں۔ اتنے عظیم راز تک پہنچنے کا واحد ایک رستہ نہیں۔ مگر عیسائی بالکل قائل نہیں ہوئے۔''

یہ کہنا صحیح نہیں کہ عیسائیت کی جیت انسانی فطرت کے بعض بدترین عناصر کی جیت تھی۔ بدترین عناصر آخر دو ہزار سال سے من مانی کر رہے تھے، ان جنگوں کے زمانہ سے جنہوں نے بحیرۂ روم کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور وہ اپنی من مانی عیسائیت کی وجہ سے نہیں بلکہ عیسائیت کے باوجود کرتے رہے تھے۔ عیسائی شہنشاہ تھیڈوسیس کا رویہ بالکل دوسرے 'رائٹ مین' جیسا تھا جنہوں نے طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس کے حکم سے ہلکی سی روگردانی اسے غصہ سے پاگل کر دیتی تھی۔ Antiock کے لوگ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے اور ان کی وجہ سے پریشان تھے۔ گورنر نے ان کی شکایت کی بنا پر ان سے باغیوں جیسا سلوک کیا۔ جس سے عوام میں غصہ اور بے چینی پھیل گئی۔ چنانچہ انہوں نے شہنشاہ اور اس کے خاندان کے مجسمے گرا دیئے۔ فوج نے امن قائم کر دیا مگر شہنشاہ کا غصہ رفع نہ ہوا۔ اس نے اعلان کیا کہ Antiock اب ایک شہر نہیں بلکہ گاؤں ہے۔ وہاں اناج کی تقسیم روک دی اور حکم دیا کہ شہریوں کی کثیر تعداد کے معائنے ٹارچر کے ذریعے کیے جائیں۔ ان میں سے اکثر کو ہلاک کر دیا گیا۔ مگر ایک جج معافی کی درخواست کرنے قسطنطنیہ گیا اور دیکھا کہ شہنشاہ پہلے ہی معاملہ کو بڑی حد تک بھلا چکا ہے۔ اپنے آپ کو اپنی سخاوت کی داد دیتے ہوئے شہنشاہ نے معافی کی درخواست منظور کر لی اور شکر گزار لوگوں نے پھر اس کے سینکڑوں مجسمے کھڑے کر دیئے۔

تھیسالونیکا (یونان) کے شہری کم نصیب تھے۔ ان کے ایک پسندیدہ رتھ بان نے ایک غلام لڑکے کے ساتھ ہم جنسی کی، جس کی وجہ سے اسے جیل جانا پڑا۔ اس وقت لوگ حکومت سے اپنی بعض شکایات کی وجہ سے پہلے ہی مشتعل تھے۔ جب ان کا پسندیدہ رتھ بان سرکس میں آیا تو انہوں نے بغاوت کر دی اور ایک کمانڈر اور چند افسروں کو قتل کر دیا۔ شہنشاہ کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی مگر یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ سب لوگ جیل میں بند کر دیے جائیں۔ اس لیے شہر کے سات ہزار افراد کو سرکس کے کھیلوں میں آنے کی دعوت دی گئی۔ ان کے آنے کے بعد دروازے بند کر لیے گئے اور سپاہیوں کو قتل عام کا سگنل دے دیا گیا۔ تین گھنٹوں تک یہ خونی

کھیل جاری رہا اور تمام افراد قتل کر دیے گئے۔

میلان کا بشپ امبروز اس قتل عام کی خبر سن کر لرز گیا۔ تھیڈوسیس میلان میں تھا، کہ میلان بھی سلطنت کا ایک دارالحکومت تھا۔ امبروز نے اسے خط لکھا کہ ایک روح نے اسے حکم دیا ہے کہ اگر بادشاہ لوگوں کے سامنے معافی نہ مانگے تو اسے چرچ سے نکال دیا جائے۔ بادشاہ حکم کی تعمیل کے لیے چرچ گیا تو امبروز سے اس کی ملاقات ہوئی جس نے بتایا کہ اسے پبلک کے سامنے معافی مانگنی ہے۔ شہنشاہ سے یہ توقع رکھنا زیادتی تھی۔ چنانچہ وہ کچھ عرصہ چرچ سے دور رہا۔ مگر آخر امبروز جیت گیا اور شہنشاہ نے مجبور ہو کر شاہی لباس اتارا اور لوگوں کے سامنے معافی مانگی۔

یہ واقعہ یقیناً خیر کی اس طاقت کی ایک ڈرامائی مثال ہے جو عیسائیت کے اثر سے ایک ظالم میں پیدا ہوتی ہے، مگر جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو یہ محض خیر و شر کی جنگ نہیں لگتی۔ قتل عام سے کچھ دیر پہلے شہنشاہ نے سنا کہ ایرانی سرحد پر واقع ایک قصبہ کے عیسائی انتہا پسندوں نے یہودیوں کے ایک سینی گاگ کو جلا دیا ہے۔ قصبہ کے بشپ (جس نے انہیں یہ کرنے کی اجازت دی تھی) کو حکم دیا گیا کہ وہ چرچ کے فنڈ سے یہودیوں کو تاوان ادا کرے۔ اس پر امبروز نے شہنشاہ کو ایک خصوصی خط لکھا کہ یہودیوں کو برداشت کرنا عیسائیوں کو فنا کرنا ہے اور یہ کہ اگر اس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو تباہ ہو جائے گا۔ جب شہنشاہ چرچ آیا تو امبروز تمام آداب نظر انداز کر کے شہنشاہ سے براہِ راست مخاطب ہوا۔ شہنشاہ نے اپنے منصفانہ فیصلہ کے خلاف اس کی بات مان لی۔

اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ چرچ سے خارج کرنے کا واقعہ محض پارسائی کا معاملہ نہیں تھا۔ یہودیوں کے تاوان کے سلسلہ میں امبروز کا رویہ غلط تھا جبکہ شہنشاہ کا فیصلہ منصفانہ اور ذمہ دارانہ تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امبروز ایک اور 'رائٹ مین' تھا اور جب دو 'رائٹ مین' آمنے سامنے ہوں تو کمزور کو راستہ چھوڑنا پڑتا ہے۔

عیسائیوں کی تنگ نظری کے اس واقعہ اور دوسرے واقعات سے یہ سبق سیکھنا آسان ہے کہ انسان کے مجرمانہ رجحان عیسائی شہنشاہوں اور پادریوں کے دور میں بھی اسی آسانی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں جس طرح کہ یونانی آمروں اور رومی سیزروں کے زمانہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بلکہ عیسائیوں کے دور میں ان کا اظہار زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مگر یہ غلط ہے اور عیسائیت کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس لیے کہ عیسائیت کا سب سے بڑا اخلاقی اصول اپنے

آپ پر تنقید، اپنا تجزیہ ہے . . ہندوازم اور بدھ ازم کی طرح عیسائیت بھی سمجھتی ہے کہ انسان کا ایک بڑا مسئلہ اس کی انا، اس کی خود پرستی ہے جو علم اور روشنی کے راستہ کی دیوار ہے۔ جب چرچ بنا تو سچے مذہبی لوگوں نے پوچھنا شروع کر دیا کہ کیا عیسیٰؑ واقعی یہی چاہتے تھے؟ قدیم عیسائیوں کا ذوق وشوق، اذیت کے ذریعہ نجات کا وہ روح پرور یقین صبح کی شبنم کی طرح اڑ گیا تھا۔ چنانچہ مذہب کے دیوانوں نے وہی کیا جو وہ یروشلم میں عیسیٰؑ سے پہلے کر چکے تھے۔ وہ صحرا کی تنہائی میں چلے گئے، عظیم ترکِ دُنیا تحریک شروع ہوئی۔ وہ پہلے 285 عیسوی میں شروع ہوئی تھی جب سینٹ انتھونی صحرا میں چلا گیا تھا۔ اس لیے کہ بنجر علاقے بلاؤں کے مسکن، روح کی نادیدہ جنگ میں مصروف ولیوں کے لیے بہترین مقام سمجھے جاتے تھے اور پھر ایک صدی بعد جب چرچ مفاد پرستوں کے لیے مفاد کا ذریعہ بن گیا تو درویش صفت لوگ گروہ در گروہ صحراؤں میں چلے گئے۔ وہ نوکیلے پتھروں پر سویا کرتے۔ اپنے آپ کو کوڑوں سے مارتے۔ جوئیں ان کی گنجلک داڑھیوں میں رینگتی رہتیں مگر وہ داڑھی نہ کھجاتے کہ جوئیں ماری نہ جائیں۔ بعض سینٹ سائمن کی طرح اونچے مقامات پر برسوں بیٹھے رہتے۔ اپنے آپ کو چٹانوں کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیتے۔ وہ بھی تھے جو شتر مرغ کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑے رہتے۔ بعض اتنے خوش قسمت تھے کہ انہوں نے اپنے مذہب کے لیے اذیتیں برداشت کیں۔ سینٹ پنوتیس (جو صحرا میں سینٹ انتھونی کے ساتھ رہتا تھا) نے اپنی ایک آنکھ نکال دی۔ بعض اپنے آپ کو اذیتیں دیتے۔ اسکندریہ کی مشہور طوائف طائیس کو سینٹ پنوتیس نے عیسائی بنایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اپنے گناہوں کے کفارہ کے لیے وہ تین برس قید میں گزارے۔ اپنے ناول طائیس میں اناطول فرانس نے اس واقعہ کا مذاق اڑایا تھا کہ دنیا ترک کرنے والے جاہل اور تنگ نظر ہوتے ہیں جو انسانی جسم اور اس کے جنسی پہلو سے نفرت کرتے ہیں۔ فرانس کی رائے میں پنوتیس خود ملحد ہو گیا ہے اور طائیس کو گناہوں کی دنیا میں واپس لانا چاہتا ہے۔ مگر فرانس کی رائے سطحی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ عیسائی کیوں سیکس کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انسانی جرائم کو سمجھنے کے لیے یہ سوال نہایت اہم ہے۔

شروع سے ہمیں جان لینا چاہیے کہ یونانی، اسیرین، پرشین، رومن وغیرہ ابتدائی تہذیبوں میں عورت کو ایک گائے کی طرح گھریلو جانور سمجھا گیا ہے۔ برنارڈ شا نے کہا ہے کہ انسان نے عورت کی اجازت کے بغیر تہذیب بنائی ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ عورت کی گھریلو مشقت اس کی بنیاد ہے۔ لگتا ہے کہ ابتدائی تہذیبوں میں عورت کا تصور زیادہ مثالی

(آئیڈیلسٹک) تھا۔ اگر وینس کا مجسمہ اس کی گواہی سمجھی جائے تو وہ اسے ارضی دیوی ماں کی تجسیم کے طور پر دیکھتے تھے۔ مگر جب انسان گھر بنا کر رہنے لگا تو عورت کو بوجھ اٹھانے والے جانور کا درجہ دیا گیا۔ پانی لانا، فصلوں کی دیکھ بھال اور بچے پیدا کرنا عورت کا مصرف سمجھا گیا۔ تہذیب نے ترقی کی تو اس کا فائدہ مردوں نے اٹھایا۔ کھیل تماشے، تفریح کلب اور درس گاہیں سب اس کے تصرف میں رہے۔ عورت گھر پر رہی اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ اس سے یونانی، رومی اور مشرقی تہذیبوں میں ہم جنسی کے واقعات کی کثرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مرد مل جل کر اپنا وقت گزارتے تھے، اکٹھے کھاتے پیتے اور تفریحات کرتے تھے۔ کبھی دل میں محبت کا جذبہ بیدار ہوتا تو نوجوان کی نظر کسی حسین لڑکی کے بجائے لڑکے پر جا ٹھہرتی تھی کیونکہ حسین لڑکی کو دیکھنے اور ملنے کا اسے موقع نہیں ملتا تھا۔ ہماری ملی جلی سوسائٹی میں ہر روز مردوں اور عورتوں کو آپس میں ملنے اور ایک دوسرے کو جانچنے کا موقع ملتا ہے۔ ایان بریڈی ایک ہی دفتر میں چھ مہینے مائرا ہنڈلی کے ساتھ کام کرتا رہا، چونکہ وہ روز ایک دوسرے کی صحبت میں رہتے تھے اس لیے انہیں آپس میں محبت ہوگئی تھی۔ قدیم روم میں اسٹاک کلرک اور سٹینوگرافر دونوں مرد ہوا کرتے تھے۔

مگر تہذیب کی روز افزوں ترقی سے فرصت میسر ہوئی ہے تو یہ ممکن نہیں رہا کہ عورت اب بھی غلام بن کر گھر کے کام کرتی رہے۔ وہ میزبان بن جاتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ آگسٹس اپنی میزبان کو اس کے شوہر کے سامنے بیڈ روم بھیجتا ہے۔ عورتیں نظر آئیں تو مرد ان کے آس پاس منڈلانے لگتے ہیں اور ان کی ایک جھلک دیکھنے کو ترستے ہیں۔ عورتوں کی آزادی کا دور روم سے شروع ہوا، ٹائبریس کو امیرزادیوں کے خلاف حکم جاری کرنا پڑا ''جو کھیل کھیلنے'' میں مصروف ہو کر گھریلو زندگی سے اپنی بوریت کا اظہار کرتی تھیں۔ آگسٹس کی **Livia** سے کلاڈیئس کی سیلیبیا، نیرو کی پیاپا، مارکس اوریلئس کی فاؤسٹا، ملکہ تھیوڈرا (ایک ہوس پرست طوائف جو بعد میں شہنشاہ جسٹینین پر چھائی رہی) تک ہر ملکہ شہنشاہ کو اپنی انگلیوں پر نچاتی رہی۔

رومی سلطنت کے اندر چوتھی صدی عیسوی میں عورت کا تصور ہیجان خیز اور شہوت انگیز تھا۔ وہ ابھی دانتے اور پیٹرارک کی آئیڈیل عورت نہیں بنی تھی مگر اس نے آدھا رستہ طے کر لیا تھا۔ اسکندریہ کی طائیس جیسی طوائفیں دولت مند ہو سکتی تھیں کیونکہ مردوں نے حسین لڑکوں کے بجائے عورتوں کے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے۔

چنانچہ عیسائیوں کا جنسی خواہشات سے انکار رومیوں کی جنس پرستی کے خلاف محض ایک ردعمل سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل تھا، یہ جان لینا تھا کہ جب مرد کسی عورت میں دلچسپی لیتا ہے تو اس عورت کا ایک جھوٹا امیج بھی دل میں بسا لیتا ہے۔ اس کی مثال وہ گھٹیا پورنوگرافی (ننگی تصویریں) ہے جو مردوں کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اس میں تمام جسمانی تفصیلات موجود ہوتی ہیں مگر 'دو شخصیتوں' کا ملاپ کہیں نہیں ہوتا۔

عورت اس معاملہ میں اپنی ذاتی پسند پر زیادہ زور نہیں دیتی۔ فطری طور پر اس کی توجہ ایک شوہر، ایک محافظ کی تلاش پر رہتی ہے۔ مرد مطمئن نہ ہو تو دوسرے رستے تلاش کرتا ہے مگر عورت، ایک مرد سے وابستہ رہتی ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ شاید وہ کسی خوش باش، اور گرم جوش مگر ناموزوں مرد کی محبت میں مبتلا ہو جائے اور اسے اس مرد کی فطری آوارگی کا سامنا کرنا پڑے۔ اس طرح یہ معاملہ عورت کے لیے بالکل ذاتی معاملہ بن جاتا ہے۔ مرد کی نسبت عورت کی جنسی بے اطمینانی حقیقت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

سیکس کے بارے میں عیسائیوں کے رویہ کی بنیاد جنسی رشتوں کی اسی غیر حقیقت پسندی پر تھی۔ وہ سیکس کو عیاشی کے بجائے بالکل محدود ذاتی معاملہ سمجھتے تھے جس کا مقصد خاندان کا قیام اور اس کی افزائش تھی۔

اگر ہم سیکس کے میکانزم پر غور کریں تو اس میں عیاشی اور گمراہی کا انحصار 'ناجائز' کی اہمیت بڑھا چڑھا کر بیان کرنے پر ہے اور مبالغہ آمیزی کی یہی عادت جرم کی بنیاد ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ شروع کے عیسائیوں کا مقصد سیکس اور جرم اور ان کی خرابیوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ وہ انسان کو ایک روح جیسا سمجھتے تھے جو مادہ پرستی کے شکنجے میں آ گیا ہے۔ جیسے تاریکی روشنی پر غالب ہو۔ (بعض اس حد تک گئے کہ انہوں نے ایرانی پیغمبر مانی کا کہا مان لیا کہ ''تمام مادہ بدی ہے'') ایک بڑے مذہبی عالم **Origen** کا دعویٰ تھا کہ دراصل ''خدا نے فرشتوں کے لیے روح کی ایک بستی بسائی تھی مگر حسب معمول بستی میں فرشتوں کے کرنے کا کوئی کام نہیں تھا۔ بیکار بیٹھے اونگھتے رہتے تھے۔ اس لیے خدا نے مادہ تخلیق کیا کہ فرشتے اس کے ساتھ لڑنے جھگڑے میں مصروف رہیں۔ ایک طرح کے جمنیزیم میں، جہاں ورزش اور کھیل ہوتے ہیں۔ جو لوگ دنیا ترک کر دیتے ہیں ان کا کام خود اذیتی نہیں بلکہ واپس روح کی سمت سفر کرنا ہے۔ اس وجہ سے عیسائیت اپنی تمام خامیوں کے باوجود انسانی تاریخی کا بڑا اہم سنگ میل تھی۔ پیگن ازم (بت پرستی) عام سطح پر مقبول تھا۔ اگر 100 عیسوی کے آس پاس تم

روم کے شہری ہوتے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ تم Osiris یا تموز کی پرستش کرو۔ متھرا یا شہنشاہ کی عبادت کرو، انہوں نے اپنے کئی خدا ملا کر ایک خدا بنا لیا تھا تا کہ ایک کیلٹ، ایک مصری اور بابلی سب جا کر روم کے ٹمپل میں عبادت کریں۔ بت پرستوں کا کوئی ایسا بڑا الہامی صحیفہ نہیں تھا جو ''مکالمات افلاطون'' یا انجیل کا ثانی ہوتا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عوامی سطح پر اپنی مقبولیت میں عیسائیت بت پرستوں سے آگے نہیں تھی۔ مگر عیسائیت میں راہب تھے، بڑے بڑے ولی اور مفکر تھے۔ اور ان کی بصیرتوں سے چرچ مالا مال تھا۔ افلاطون نے کہا تھا کہ اچھی ریاست کا حکمران فلسفی بادشاہ ہوگا۔ عیسائیت ریاست کے اندر ایک ریاست تھی۔ اور اگر اس کے حکمران ولی اور فلسفی نہیں تھے تو بھی اس کی ترقی میں فلسفیوں اور ولیوں نے ایک بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ رومی سلطنت کے ہلاکت خیز بحران کے بعد انسان نے یہی ایک بڑا قدم اٹھایا تھا۔

اس سے پیشتر کہ ہم روم کے زوال کی کہانی مکمل کریں ضروری ہے کہ رومی سلطنت کے آس پاس واقع باقی وسیع خطہ زمین پر ایک نظر ڈال لیں۔ زمین کے بڑے حصہ پر اب بھی جنگل اور صحرا تھے۔ بحیرۂ روم خود بھی بہت بڑا صحرا تھا، جس میں چند ندیاں اور نالے تھے۔ یہاں تک کہ تقریباً پانچ لاکھ برس پہلے بحیرۂ اٹلانٹک پہاڑوں کی دیوار چیر کر آج کے اسپین سے لے کر شمالی افریقا تک پھیل گیا۔ اس عظیم دریا نے سارے علاقہ کو ایک خاموش اور پرسکون سمندر میں بدل دیا جس نے بعد میں یونانیوں اور رومیوں کو سیراب کیا۔ اسی زمانے عراقیوں نے لکھنا ایجاد کیا۔ سمارا میں ہر طرف گھاس تھی اور شاداب جنگل تھے جہاں ہاتھی اور گینڈے آ کر گرمی سے نجات پاتے تھے اور اس کی ندیوں میں نہاتے تھے۔ اگرچہ پچھلے سات ہزار برس سے موسم بدل رہا تھا مگر Sargon کے زمانے تک صحرا بن رہا تھا۔ خانہ بدوشوں نے بھی اسے صحرا بننے میں پوری مدد دی اور اس علاقہ میں گھاس کی آخری سبز پتی کو بھی روند کے دم لیا۔

جنوب میں افریقا کی ان دیکھی ان جانی زمین تھی جہاں اب بھی پتھر کے زمانہ کے لوگ رہتے تھے۔ شمال میں جرمنی تھا اور اس کے گھنے تاریک جنگل تھے۔ جن کا سلسلہ روس کے اندر جاتا تھا۔ جنوب مشرق میں ہندوستان تھا جس کا مذہب امن اور غور و فکر تھا۔ ہندوستان نے ملایا، سیام اور انڈوچائنا تک اپنے ہمسایوں کی تہذیب بھی کی مگر مشنریوں اور تاجروں کے ذریعہ، نہ کہ فوجوں اور خراج لینے والوں کے زور سے۔

مشرق میں چین تھا جو ایک ان جانا ملک تھا۔ اگرچہ وہ بھی مقامی لڑائیوں میں الجھا

رہا مگر وہ عظیم الشان ملک اپنے مغربی ہمسایوں سے زیادہ پرامن تھا۔ چاؤ خاندان نے تقریباً 1000 قبل مسیح میں اسے فتح کیا تھا۔ وہ وحشی جنگجو تھے اور اپنے پیش رو Shang خاندان کے نقش قدم کی پیروی کرتے تھے۔ 500 قبل مسیح کے بعد بڑی نہروں کی مدد سے ملک کی زمین زرخیز ہو گئی۔ چھوٹے فارم بڑے کھیتوں کھلیانوں میں بدل گئے۔ سات سو برس بعد چاؤ سلطنت اقتدار کی جنگ میں ٹوٹ کر بکھر گئی اور شی ہوانگ آخر اس کی قسمت کا مالک بن گیا۔

رومی سلطنت کے برعکس یہ براعظم اندرونی بغاوتوں اور دشمن قوموں کا نشانہ نہیں تھا۔ شمالی سرحد کے ساتھ خانہ بدوش دشمن قبیلے موجود تھے مگر چین (جس کا نام چی ان صوبہ پر تھا) اتنا وسیع تھا کہ اس کے اندر بہت دور تک آنا خانہ بدوشوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ شمالی سرحدوں کے باشندے بھی خانہ بدوشوں کی طرح سخت جان اور باہمت تھے۔ اس لیے جبکہ رومی سلطنت لڑائیوں کے عذاب میں مبتلا تھی چین اپنے ہمسایہ جاپان کی طرح سکھ چین کے دور میں تھا۔ اس کی نہروں اور چاول کی فصلوں سے زمین دار دولت مند ہو گئے تھے۔ ٹھیک ہے کہ وہ عہد وسطیٰ کے سرداروں کی طرح آپس میں لڑتے بھی تھے۔ دراصل گریٹ لارڈ آف چی ان کے آنے سے پہلے چین ازمنہ وسطیٰ کے انگلستان اور فرانس سے بہت مشابہ تھا۔

شی ہوانگ نے چینی سلطنت قائم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے خانہ بدوش قبائل کو دور رکھنے کے لیے ''عظیم دیوار'' کی تعمیر کا حکم دیا جس کی لمبائی قریباً دو ہزار میل تھی۔ اس نے سڑکیں بنائیں اور ڈاک کا نظام رائج کیا۔ اس نے معیاری ایک جیسا طرز تحریر بنانے کا حکم دیا۔ اس نے جاگیرداروں کو دارالحکومت میں آباد ہونے پر آمادہ کیا۔ وہ ایک قسم کا چینی آگسٹس یا چینی کونسٹن ٹائن تھا۔ چونکہ وہ سمجھتا تھا کہ شہنشاہ کے حکم کے سامنے سب کو جھک جانا چاہیے اس لیے اس نے کنفیوشس کی تمام کتابیں جلانے کا حکم دیا کیونکہ کنفیوشس کا کہنا تھا کہ بادشاہ خدا کے حکم سے حکومت کرتا ہے۔ جب وہ 207 قبل مسیح میں فوت ہوا تو بغاوت کے بعد ظالم چی ان کا دور ختم ہوا اور اس کی جگہ نسبتاً رحم دل ہان خاندان نے لی۔ ان کی رحم دلی کی وجہ سے انہیں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ جنگجو شہنشاہ وُو (190-87) نے نہ صرف شمال کے وحشی حملہ آوروں کو اپنی سرحد سے دفع کیا بلکہ جا کر ان پر حملہ کر دیا۔ چینیوں میں یہ وحشی ہیونگ نو کے نام سے جانے جاتے تھے جبکہ مغرب میں ہن کہلاتے تھے۔ پرانے زمانہ میں جب ان وحشی گھوڑا سواروں نے جنگ اور بھوک کے مارے مغرب کا رخ کیا تو ان کا مقابلہ

مغرب کے اپنے ہنوں یعنی سیتھین سے ہوا۔ یہ وحشی بحر اسود کے شمال میں ڈینوب اور ڈان کے درمیان (اَب یوکرین) رہتے تھے۔ ہیروڈوٹس ان کے ظلم وستم کی کہانیاں سن کر اتنا حیران ہوا کہ ان کی حقیقت جاننے کے لیے خاص طور سے وہاں گیا۔ اس نے ان کا اس طرح ذکر کیا کہ وہ لوگ اپنے دشمنوں کی کھالیں ادھیڑ کر ان سے اپنے لباس بناتے تھے۔ ان کی کھوپڑیوں کے پیالے بناتے تھے۔ کبھی جی چاہے تو ان پیالوں میں ان کا خون پیتے تھے۔ غلاموں کی آنکھیں نکال لیتے تھے کہ وہ بھاگ نہ جائیں اور ہر سال کم از کم ایک ہزار انسانوں کی جان لینا مردانگی سمجھتے تھے۔ ایرانی ان سے دہشت زدہ تھے اس لیے ان کے بادشاہ دارا نے ان وحشیوں کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی مگر ناکامی ہوئی۔ اتنے میں ڈینیوب سے آنے والے سرمارٹین نے سیتھین کو جنوب کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ سرمارٹین جنہوں نے فلپ آف مقدونیہ کے ہاتھوں شکست کھائی تھی اور جنہیں بالآخر روم کے پرانے دشمن متھراڈس نے کچل دیا تھا (مگر پارتھین کے قریبی لوگ ہمیشہ کی طرح شر انگیزی کرتے رہے) اور خوف ناک لڑاکوں کی یہ نسل، منگولیا کے ہن آخر مغرب کی سمت چلے گئے۔ یہ چین کی کم و بیش پرامن توسیع تھی جو آخر رومی سلطنت کے زوال کا باعث بنی۔

مگر روم کو صرف مشرق سے ہی خطرہ نہیں تھا۔ ہر طرح کے وحشی حملہ آور مغرب سے بھی آ رہے تھے۔ سویڈن میں گوتھ لینڈ کے جنگلی جنوب میں بحیرہ اسود کی طرف جا کر بحری قزاق بن گئے تھے۔ 251ء میں انہوں نے نے ''ہیرک شہنشاہ'' دیسیس کے خلاف جنگ کی تھی اور اسے ہلاک کر دیا تھا۔ تقریباً اسی وقت ایک جرمن قبیلہ فرینک (جس نے بعد میں اپنا نام فرانس کو دیا) رائن عبور کر کے گال میں داخل ہو گیا۔ جبکہ ایک دوسرے قبیلہ السیس نے ڈینیوب پر حملہ کر دیا۔ 376 میں وسی گوتھ یا مغربی گوتھ نے ڈینیوب عبور کیا۔ رومی فوج کو شکست دی اور شہنشاہ ویلنس کو قتل کر دیا۔ مگر ان کا مقصد ملک گیری نہیں تھا، وہ ہنوں سے بھاگ رہے تھے اور رومی سلطنت کے اندر پناہ کی تلاش میں تھے۔ ان کا مقصد پورا ہو گیا تو ان میں سے اکثر لوگ دوسرے کئی وحشی اور وینڈل نامی قبیلہ کے افراد رومی سلطنت کے محافظ بن گئے۔ مگر وینڈل قبیلہ کی ایک جرمن شاخ 406 میں گال میں داخل ہوئی۔ پھر پائرینیس کے پار اسپین گئی اور اپنی حکومت وہاں قائم کی۔ تیس برس بعد انہوں نے سمندر پار کیا اور کارتھیج پر قبضہ کر لیا۔ 407 میں حملہ آوروں کو روکنے کے لیے رومیوں کو برطانیہ سے اپنی فوجیں بلانا پڑیں۔

ان میں سے نہایت قابل ذکر الیرک نامی ایک گوتھ تھا۔ اس نے رومن کمانڈر بننے کی درخواست کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ اب رومی سلطنت کے دو شہنشاہ تھے، تھیڈوریس اعظم کے دو بیٹے، روم میں ادنوریس اور قسطنطنیہ میں ارکیڈیس، دونوں زیادہ زور دار کیریکٹر کے مالک نہیں تھے۔ اسٹیلی کو نامی ونیڈل جنرل ادنوریس کا حامی تھا بلکہ اس نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ کچھ عرصہ تک Alaric نے ارکیڈیس کا ساتھ دیا مگر وہ ان دونوں بودے رومنوں کی بے مائیگی سے تنگ آ گیا اور اپنے طور پر حملے شروع کر دیے۔ اس نے تھریس اور داچیا میں لوٹ مار کی اور یونان میں داخل ہو گیا۔ جہاں اس نے اپنے پیچھے ظلم کی خونی یادیں چھوڑیں۔ ایک قدیم مؤرخ نے تباہ حال ایتھنز کو ایک ایسی لہولہان خالی چمڑی سے تشبیہ دی ہے جس کا جسم اسے چھوڑ گیا ہو۔ گبن کہتا ہے کہ اس کے آدمیوں نے مردوں کو قتل کیا، گاؤں جلائے مویشیوں اور ان کی تمام حسین عورتوں کو ہانک کر لے گئے۔ اسٹیلی کو نے تیزی سے یونان کا رخ کیا اور آخر گوتھوں کو پہاڑ کے دامن میں جا لیا۔ انہیں پانی کی سپلائی روک دی گئی۔ جونہی وہ پیاس سے بے حال ہوئے اسٹیلی کو سمجھا کہ وہ اب دم لے سکتا ہے اور کھیل تماشا دیکھنے ایک پبلک تقریب میں چلا گیا۔ (گبن نے ننگے ڈانس کا اضافہ کیا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کنوارے مؤرخ کو ریپ اور ننگے ناچوں کا ذکر مریضانہ حد تک اچھا لگتا تھا) اسٹیلی کو کے سپاہی لوٹ مار کی تلاش میں ادھر ادھر ہوئے تو Alaric رومی صفیں چیر کر تیس میل دور چلا گیا اور وہاں سے کورنتھ جا پہنچا۔ جب تک اسٹیلی کو کو واقعہ کی سمجھ آئے Alaric اس کی پہنچ سے باہر جا چکا تھا۔

پانچ برس بعد 402 میں اسٹیلی کو نے اٹلی پر گوتھوں کا ایک حملہ ناکام بنایا اور 406 میں اس نے فلورنس پر حملہ آور وحشیوں کو شکست دی۔ ان کارناموں کے بعد اسے شک وشبہ سے بالا سمجھنا چاہیے تھا مگر ادنوریس کا دربار حسب معمول سازش کی آماج گاہ تھا۔ افواہ پھیلی کہ اسٹیلی کو نے گوتھوں کے ساتھ ساز باز کر رکھی ہے۔ ادرنوریس احمق اور کمزور تھا، اس نے یہ افواہ دلچسپی اور توجہ سے سنی۔ اپنی فوج کے وحشی سپاہیوں سے اسے سخت نفرت تھی اور ایک کٹھ ملا کی طرح وہ خفا تھا کہ ان میں اکثر اب بھی خدا کو نہیں مانتے۔ اسٹیلی کو اور اس کے وحشی ساتھیوں کو برطرف کرنا خطرہ کی بات تھی۔ مگر ایک رومی شہنشاہ کی بے مروتی کے سامنے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ایک روز ادرنوریس کے اشارے پر رومی سپاہیوں نے پادیا میں اسٹیلی کو کے کئی دوست قتل کر دیے۔ اسٹیلی کو کو اب بھی شہنشاہ کی غداری سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے ایک چرچ میں پناہ لی۔ مگر جان بخشی کے جھوٹے وعدہ پر اسے چرچ سے باہر بلا کر قتل کر دیا گیا۔ اس

وقت نیرو کے جنرل کاربولو کی طرح شاید وہ بڑبڑایا ہو کہ ''میرے ساتھ یہی ہونا تھا۔'' ایک اشارہ اور ہوا اور سارے اٹلی میں وحشیوں اور ان کے بیوی بچوں کی لاشیں بچھ گئیں۔ یہ فیصلہ احمقانہ ہی نہیں مجرمانہ بھی تھا کیونکہ وحشی روم کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کر چکے تھے۔ اب **Alaric** کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے گوتھ لشکر کے ساتھ روم روانہ ہو گیا۔

رومنوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہے تھے۔ بھلا یہ کوئی ماننے والی بات تھی کہ ایک وحشی شاہی دارالحکومت کے لیے خطرہ بنے۔ انہیں اس وقت اپنی تباہ حالی کا یقین آیا جب **Alaric** نے شہر کے لیے دانہ پانی کی سپلائی بند کر دی۔ رومنوں نے غضب ناک ہو کر اسٹیلیکو کی بیوہ کو انتقام کا نشانہ بنایا اور اسے **Alaric** کے ساتھ ساز باز کرنے کا ذمہ دار قرار دیا، سینیٹ کے حکم پر اسے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ پھر فاقوں کی وجہ سے ان کا قہر ان پر اس طرح نازل ہوا کہ ان کی ہمت جواب دے گئی۔ محاصرۂ کارتھیج کے ساڑھے پانچ سو سال بعد رومن اپنے کیے کی سزا بھگت رہے تھے۔ دولت مندوں نے جینے کا سامان کر لیا جبکہ غریب ہزاروں کی تعداد میں ہلاک ہوئے۔ وہ مجبور ہو کر آدم خوری پر بھی اتر آئے، لاشوں کی سڑاند سے شہر میں طاعون پھیل گیا تو **Alaric** سے اس کے مطالبات پوچھے گئے۔ وہ ڈھیروں سونا چاندی اور (گوشت محفوظ کرنے کے لیے) سیاہ مرچوں پر راضی ہو گیا۔

مگر روم کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ ادنوریس اور اس کے درباری رونا منتقل ہو گئے۔ شہنشاہ اسے نسبتاً محفوظ دارالحکومت بنانا چاہتا تھا کیونکہ وہ جوہڑوں، تالابوں اور جھاڑ جھنکار سے گھرا ہوا تھا۔ مذاکرات جاری تھے کہ **Alaric** نے ایک بار پھر روم کا محاصرہ کر لیا اور اس کے بعد رونا کی طرف مارچ کیا۔ ادنوریس نے اپنے بعض ساتھیوں کو **Alaric** پر اچانک حملہ کے لیے جانے دیا اور **Alaric** کے ہوش سنبھلنے سے پہلے واپس آنے کا حکم دیا۔ یہ آخری تنکا تھا۔ الیرک نے غضب ناک ہو کر ایک بار اور روم کا محاصرہ کر لیا اور اس دفعہ شہر میں داخل ہو گیا۔ یہ **410** عیسوی کے وسط اگست کا زمانہ تھا اور چھ صدیوں میں پہلا موقع تھا کہ حملہ آور شہر کے اندر داخل ہوئے تھے۔ اچانک حملہ کا غصہ دل میں لیے الیرک کے سپاہی روم کے شہریوں پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے لاتعداد قتل اور ریپ کیے۔ گبن کہتا ہے کہ بے درد سپاہیوں نے قیدی عورتوں کو ان کے ایما اور مرضی کے بغیر اپنی جنسی تسکین کا ذریعہ بنایا اور پھر وہی جنسیاتی بحث کہ کیا زیادتی کے بعد بھی لڑکی کو باعصمت اور دوشیزہ سمجھا جائے۔

ادنوریس کو مرغ پالنے کا شوق تھا۔ 'روما' نامی ایک مرغا خاص طور سے اس کا منظور

نظر تھا۔ رونا میں اس کے ایک خواجہ سرا نے اسے خبر دی کہ 'ہم نے روم کھو دیا ہے' تو ادنوریس بے چین ہو کر بولا 'ناممکن' ابھی تو وہ میرے ہاتھ سے دانہ کھا رہا تھا۔ جب اسے بتایا گیا کہ خواجہ سرا کا مطب روم شہر ہے، روم نامی مرغا نہیں تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

چھ روز بعد گوتھ روم سے چلے گئے اور روم کے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ نوار پر قبضہ کرتے ہوئے وہ جنوب کی سمت روانہ ہو گئے۔ **Alaric** کا بیڑا شمالی افریقا چلا گیا مگر قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ انہیں سمندری طوفان نے آ لیا، جس سے سب منتشر ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد الیرک فوت ہو گیا۔

یہ روم کے مصائب کا آغاز تھا، انجام نہیں تھا۔ مگر ایک سلطنت کے دارالحکومت کی حیثیت سے، اس کے بقیہ پینسٹھ برسوں کی کہانی اس کے ماضی سے مختلف نہیں۔ ادنوریس کا جانشین شہنشاہ ویلنٹینین بھی ایک کاہل اور ظالم شخص تھا۔ بدنصیبی سے اس کے طویل دورِ حکومت میں وینڈل اسپین عبور کر کے شمالی افریقا آئے اور رومی صوبہ کو جی بھر کر تباہ کیا۔ ویلنٹینین کی بہن کو جو اپنی ہوس ناکیوں کی وجہ سے بدنام ہو گئی تھی قسطنطنیہ بعض مقدس ماؤں کی نگرانی میں بھیج دیا گیا جہاں بور ہو کر اس نے ہن سردار اٹیلا کو خط لکھا کہ وہ آ کر اسے بچائے۔ اٹیلا ان منگولوں کی نسل سے تھا جنہیں شمالی چین سے نکالا گیا تھا۔ ہنوریا یقیناً نہیں جانتی تھی کہ اٹیلا چھوٹے قد اور بندر کی شکل کا تھا جو ایڑیوں کے سہارے بیٹھتا تھا۔ اسے ہنوریا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی کئی درجن بیویوں کا شوہر تھا۔ مگر بلیک میل کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ اس نے ویلنٹینین سے اس کی بہن کا رشتہ مانگا اور جہیز میں آدھی سلطنت طلب کی۔ ویلنٹینین نے حقارت کے ساتھ انکار کر دیا تو اٹیلا نے جنگ کا اعلان کیا۔ اٹلی کی خوش قسمتی سے اس نے گال کو فتح کرنا آسان سمجھا۔ وہ شہر پر شہر فتح کرتا ہوا یورپ کی طرف بڑھا۔ اگر وہ فرانس فتح کر لیتا تو آج غالباً انگریزوں اور فرانسیسیوں کی آنکھیں چندھی اور رنگ پیلے ہوتے۔ مگر ایک رومی جرنیل نے کیلون میں اسے شکست دی۔ اب اٹیلا نے واپس اٹلی کا رخ کیا۔ جہاں ویلنٹینین نے مجبوراً رشوت دے کر اسے دفع کیا۔ جس کے بعد وہ جلد ہی ایک حسین دوشیزہ کے ساتھ دست درازی کرتے ہوئے دل کی شریان پھٹنے سے مر گیا۔

ویلنٹینین بھی آخر اپنے ایک **Maximas** نامی جنرل کے ہاتھوں قتل ہو گیا جس کی بیوی کو اس نے ریپ کیا تھا۔ میکسی میس سے اس کی ملکہ **Eudoxia** کے ساتھ شادی کرنے کی غلطی ہو گئی۔ **Eudoxia** کو اس سے اتنی نفرت تھی کہ اس نے جنوبی افریقی وینڈلوں کو

پیغام بھیجا کہ وہ آ کر اسے بچائیں، حالانکہ ہنوریا کی مثال اس کے سامنے تھی۔ ونڈل آ گئے اور انہوں نے روم میں لوٹ مار شروع کر دی اور جب Eudoxia ہاتھ پھیلائے ان کے استقبال کے لیے بڑھی تو انہوں نے اس کے زیورات نوچ لیے اور اسے اور اس کی دو بیٹیوں کو اٹھا کر شمالی افریقا لے گئے۔

درحقیقت یہ روم کا خاتمہ تھا، اگرچہ وہ اور بیس برس شہنشاہوں اور شہنشاہیت کے دعوے داروں کے درمیان لڑکھڑاتا رہا۔ ان میں سے آخری شہنشاہ ایک لڑکا رومولس تھا۔ اس وقت رومی سلطنت واقعی کئی وحشیوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان کا شمار رومی سپاہیوں میں ہوتا تھا۔ جب انہوں نے شہنشاہ کے باپ سے سلطنت میں حصہ مانگا تو اس نے صاف انکار کر دیا جس کی وجہ سے انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ نوعمر سیزر صرف گیارہ مہینوں کے بعد شہنشاہیت سے الگ ہو گیا۔ روم یا ردینا میں وہ آخری رومی شہنشاہ تھا۔ اس کے بعد پوپ ہی آج تک روم کا مالک ومختار رہا۔

مگر قسطنطنیہ کی کہانی جاری رہنی چاہیے کہ اس کے ہزار سالہ واقعات یورپ میں آئندہ آنے والے دور کا پیش خیمہ تھے۔

جسٹینین 527 عیسوی میں شہنشاہ بنا مگر وہ کیلی گلا کے دور سے اب تک سب سے بدترین حکمران ثابت ہوا۔ جتنے لوگوں کو تمام رومن شہنشاہوں نے قتل کیا تھا کم وبیش اتنے ہی لوگوں کو اس اکیلے نے قتل کروایا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اذیت پسند تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرا کونسٹن ٹائن سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے تمام بت پرستوں کو مجبور کیا کہ وہ عیسائی ہو جائیں، جنہوں نے انکار کیا وہ قتل ہوئے اور کثرت سے قتل ہوئے کیونکہ اکثریت نے انکار کیا۔ اس نے اپنے پیچھے نفرت کی یادیں ورثہ میں چھوڑیں جن سے مسلمانوں کا رستہ ہموار ہوا۔ یورپین تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اس ناکارہ، ظالم اور ناپسندیدہ شخص نے اڑتیس سال حکمرانی کی۔ اتنے طویل عرصہ تک حکومت کرنے میں اس کا کوئی کمال نہیں تھا، اس کی کامیابی کے پیچھے اس کی بیوی تھیوڈورا تھی جو کسی زمانہ میں طوائف تھی۔

تھیوڈورا سے اس کی ملاقات شہنشاہ بننے سے چار برس پہلے ہوئی۔ تھیوڈورا سرکس کے جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والے ایک شخص کی بیٹی تھی۔ وہ اور اس کی دونوں بہنیں اسٹیج پر اداکاری کے جوہر دکھاتی تھیں اور اعلیٰ درجہ کی طوائفیں تھیں۔ تھیوڈورا کو بچپن سے اپنے پرستاروں کو لبھانے کے گر آتے تھے۔

جسٹینین فوراً ہی اس پر جان دینے لگا۔ شہنشاہ بن کر اس نے قانون میں تبدیلی کی تاکہ اس سے شادی کر سکے۔ اس کی پسند شان دار تھی۔ تھیوڈورا مضبوط کردار کی تیز فہم عورت تھی۔

جسٹینین کی حکومت شروع ہونے سے پہلے ہی تقریباً ختم ہوگئی۔ قسطنطنیہ کھیلوں کا دیوانہ تھا، اور اس کے دو گروپ آج کل کی فٹ بال کی ٹیموں کی طرح سبز اور نیلے گروپ کہلاتے تھے۔ دونوں ٹیمیں عیسائیوں کے احمقانہ تنازعوں میں بھی مخالفانہ کردار ادا کرتی تھیں۔ اس سوال پر کہ عیسیٰؑ کی شخصیت میں انسانی فطرت اور خدا یکجا یا الگ تھے (صحیح مسیحی روایت کے مطابق) تلواریں میان سے باہر آ جاتیں اور وہ ایک دوسرے کا خون کر دیتے تھے۔ 532 میں انہیں پولیس نے حکم دیا کہ وہ آپس میں لڑنا جھگڑنا بند کر دیں۔ مگر اس کے جواب میں فسادات شروع ہوگئے۔ اور آدھا قسطنطنیہ جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ جسٹینین بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر تھیوڈورا نے اسے بزدل کہہ کر بھاگنے سے انکار کر دیا۔ جسٹینین کے ایک جنرل بیلی سیریس نے اپنی فوج کے ساتھ کوچہ و بازار میں جا کر تیس ہزار انسانوں کی جان لی اور امن بحال کر دیا۔

بدقسمتی سے جسٹین پر اپنے جنرل کے اس سیدھے اور سادہ انداز کا گہرا اثر ہوا جو اس نے سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا اور یہی انداز اس نے تمام سلطنت میں آزمانا چاہا۔ اس نے بیلی سیویئس کو شمالی افریقا بھیجا کہ وینڈلوں کو عیسائی بنائے جو یہ سچ ہے کہ پہلے ہی عیسائی تھے۔ اگرچہ Arian کے کہنے سے ہوئے تھے۔ چونکہ بیلی سیویئس اپنے عہد کا سب سے بڑا ملٹری جینئس تھا اس لیے اس نے انکار کرنے والوں کا مکمل صفایا کر کے یہ حکم بڑی خوبی سے پورا کیا۔ پھر اسے گوتھوں کو عیسائی کرنے بھیجا گیا۔ کیونکہ گوتھ بھی ایرین تھے۔ اس میں اسے پانچ برس لگ گئے جبکہ گوتھ آبادی کے لحاظ سے آدھے رہ گئے۔ جب تک جسٹین عجیب الجھن میں گرفتار ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ بیلی سیویئس اس کا تخت غصب کرنا چاہتا ہے۔ ایک شک، جس کی کوئی بنیاد نہیں تھی کیونکہ بیلی سیویئس دل و جان سے اس کا وفادار تھا۔ اس لیے جب اسے ایرانی بادشاہ خسرو سے لڑنے کے لیے بیلی سیویئس کو شام بھیجنا پڑا تو اس نے اس کی فوجوں کی تعداد انتہائی کم کر دی کہ اسے ایک شکست خوردہ جرنیل کی حالت میں دیکھ سکے۔ بیلی سیویئس پھر بھی کامران و فتح یاب آیا تو اس نے بیلی سیویئس کو ریٹائر کر کے گمنامی کی ذلت آمیز موت مارنے کی کوشش کی۔ چونکہ بیلی سیویئس کی بیوی عیاش تھی اس نے

شوہر کے لے پالک بیٹے کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر لیے تھے۔ وہ اس صورت حال پر پریشان تھا کہ جسٹین نے مجبور ہو کر اسے ریٹائرمنٹ سے واپس بلا لیا تاکہ ہنوں کو مار کر انہیں فرار ہونے پر مجبور کر دے۔ اس فتح کے بعد جسٹین نے اسے کسی خود ساختہ الزام پر گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ یہ کہانی ان دونوں کی موت پر ختم ہوئی ورنہ نہ جانے کب تک اپنے آپ کو دہراتی رہتی۔ کیونکہ بیلی سیویئس ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو تجربہ سے سیکھتے ہیں۔ جونہی جسٹین قبر میں اترا اس کی سلطنت تنکوں کی طرح بکھر گئی۔

یہاں ایک بار پھر ہمیں انسانوں کے اس عجز کا اعتراف کرنا چاہیے جس کا مظاہرہ وہ ان حالات سے نمٹنے میں کرتے ہیں جو ان کی فکر سے ماورا ہوتے ہیں۔ جسٹین برا آدمی نہیں تھا۔ سلطنت کی از سرِ نو تعمیر و ترقی، قوانین کی اصلاح اور انتظامیہ کی بہتری میں اس کے کردار نے مؤرخوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے جسٹین 'اعظم' کے نام سے یاد کریں۔ مگر جب ہم اسے ایک انسان کی حیثیت میں دیکھتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ انسانی تاریخ بنیادی طور پر کیوں انسانوں کے جرائم اور ان کی حماقتوں کی چارج شیٹ ہے۔ اتنی عظیم سلطنت کو جسٹین کے سپرد کرنا ایک ناسمجھ نوعمر لڑکے کو ایف 16 طیارے کا پائلٹ بنانے کے مترادف تھا۔

رومی سلطنت کا بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ تھا۔ وہ اپنے زور سے آگے بڑھی تھی جیسے برف کا گولہ پہاڑی سے لڑھکتا ہوا نیچے گرتا ہے۔ رومیوں کو حملہ آوروں نے سپاہی بنا دیا تھا۔ مگر ری پبلک بننے کے بعد خود غرضی اور ناانصافی کا زور ہو گیا۔ اٹلی کے ساحلوں سے آگے اس کی توسیع مجرمانہ جارحیت تھی۔ پھر بھی روم ترقی کرتا رہا جس کا سبب اس کی مخصوص قابلیت، ڈسپلن نافذ کرنے کی اہلیت تھی۔ وحشی، گوتھ، ونڈل اور ہن اس اہلیت سے محروم تھے اور اس کے نہ ہونے سے وہ تاریخ کے صفحات سے اتنی جلدی معدوم ہو گئے۔ رومی شہنشاہوں کی ناکامی بذاتِ خود روم کی ناکامی تھی۔ ان کی اکثریت فرعون مزاج اور طاقت کے نشہ میں مدہوش تھی۔ حکم دینے کی عادت روم کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ ابتدا میں روم اس لیے خوف و خطرہ سے آزاد تھا کہ اس کا ہر شہری رومی ہونے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ مگر عیسائیوں کے زمانہ سے یہ احساس کم ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ شہریوں کو سلطنت بلکہ اپنے شہر کے معاملات پر بھی اختیار نہ رہا۔ رسوخ حاصل کرنے کے لیے لڑتے مرتے اس تک پہنچنا ہوتا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تھیسالونیکا کے شہری اور قسطنطنیہ کے 'گرین' اور 'بلیو' رتھ ریس کے لیے بے چین کیوں رہتے تھے، اس لیے کہ وہی ان کی فالتو طاقت کے اظہار کا ایک ذریعہ تھا۔ رعایا سے بچوں جیسا

سلوک کیا جاتا تھا اور وہ بھی بچوں کی طرح پیش آتے تھے۔ جسٹین اور تھیوڈورا نے اچھے بچوں کی طرح، روم کی سلطنت کو بچوں کا کھیل بنا دیا اور تہذیب کے لیے یورپ کی سب سے بڑی کوشش تاریک زمانوں (ڈارک ایجز 10-5 صدی) کی تاریکیوں میں کم ہوگئی۔

یورپ کا بحران

یہ جاننے کے لیے کہ اس ہزار سالہ رومی سلطنت کے دَور میں ہماری زمین پر کیا گزری ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ہم کسی دوسرے سیاّرے سے آئے ہیں اور 500 قبل مسیح میں سطح زمین پر چکر لگا رہے ہیں۔ خلا سے ہزار میل کے فاصلے پر اس کی نیلی سبز دھند اور اس کے سمندر دلکش لگتے ہیں، مگر برف سے ڈھکی ہوئی قطبی چوٹیاں ہمارے زمانہ کی نسبت بڑی ہیں۔ درحقیقت گزشتہ چند صدیوں میں ایسا ہوا ہے کیونکہ ہمارے سیارے کا موسم ہر ہزار برس بعد بدلتا رہتا ہے۔Minos بادشاہ کے زمانہ میں بھی یہ اتنا گرم تھا جتنا کہ آج ہے۔ ہزار سال بعد یہ سرد و تر ہو گیا۔ ہمارے خلائی مسافر پچاس میل سے بھی انسانی آبادی کے آثار نہیں دیکھ سکیں گے۔ سردی تہذیب کو وادیوں میں لے گئی ہے۔ اونچے درّے بند ہیں اور گزشتہ برفانی عہد کی طرح گلیشیئر ایک بار پھر نمایاں ہونے لگے ہیں۔ اس زمین کے بڑے حصہ میں جنگلات ہیں، جیسے روس میں وسیع جنگلات ہیں، جو اب بھی قبل از تاریخ کے Auroch نامی دیوہیکل بیل کو چھپائے ہوئے ہیں مگر جنگل سمٹ رہے ہیں۔ ان کی جگہ دلدلیں لے رہی ہیں۔ خلائی جہاز آسٹریلیا جیسے براعظموں کے چاہے کتنے ہی چکر لگاتا، اسے شترمرغوں کے سوا زندگی کا کوئی نشان نہ ملتا۔

امریکا پر ان کی پرواز نیچی ہوتی ہے اور وہ بڑی محنت سے انسانی زندگی کے آثار تلاش کرتے۔ دراصل ہن نسل کی لڑی کے منگول دو تین ہزار سال پہلے امریکی براعظم میں آ گئے تھے۔ جب روس کو الاسکا سے ملانے والا خشکی کا پل (اب آبنائے Bering) موجود تھا۔ منگول آہستہ آہستہ جنوب میں چلے گئے۔ ایری زونا کی سرسبز و شاداب پریریز پر وہ بھینسے اور ہرن کا شکار کرتے ہیں۔ جنوب میں اور آگے بڑھ کر یوکتان کے جنگلوں میں جا کر وہ Maya

تہذیب کا آغاز کرتے ہیں۔

اگر خلائی مہمان مغرب میں چلے جائیں تو ان کا گزر جاپان کے جزیروں پر ہوگا جہاں سائبیریا سے اتر کر آنے والی ایک نسل آباد ہے۔ جاپانی بھی اتنے قدیم ہیں جتنے کہ امریکی انڈین ہیں۔ وہ درخت کی چھال اور جانوروں کے چمڑوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اور ان کا گزارہ شکار، ماہی گیری اور معمولی زراعت پر ہوتا ہے۔ چین، پہلی نظر میں ایک اور ویران وغیر آباد براعظم لگتا ہے کیونکہ اس کا رقبہ بہت زیادہ اور آبادی بہت کم ہے۔ اس کا سب سے بڑا تہذیبی مرکز مشرق بعید کے اندر آبنائے شانٹنگ میں ہے اور اس کا دارالحکومت **Anyang** زرد دریا کے ایک موڑ پر ہے جہاں اونچے طبقے لکڑی کے گھروں میں رہتے ہیں اور ریشم اور اون پہنتے ہیں۔ مگر چینیوں کی غالب اکثریت غریب کسانوں اور کاشتکاروں پر مشتمل ہے جو غربت اور مسکنت کی حالت میں مٹی کے گھروں میں رہتے ہیں جن کی اونچائی سطح سیلاب سے ذرا ہی زیادہ ہوتی ہے۔ نہروں نے ابھی چینی زراعت میں انقلاب برپا نہیں کیا اس لیے فضا سے چین کی خال خال فصلوں کا نظارہ مشکل ہے۔ درمیانی عمر کا کاردنگ نامی ایک فلاسفر جسے کنفیوشس کہا جاتا ہے، ابھی ابھی ایک دانا حکمران کی تلاش میں چلا ہے جو اس کے خیالات پر عمل کرے۔ مگر جسے پائے بغیر وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔

ہندوستان بھی تہذیب کے تقریباً اسی دور میں ہے۔ اس کے ایسے حصے بھی ہیں جہاں زندگی پتھر کے زمانہ سے آگے نہیں بڑھی۔ شمال میں آریہ اپنا مذہب اور کلچر لے کر آئے ہیں۔ عبادت گاہوں کی تعداد اعلیٰ ترقی یافتہ زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ دراصل گوتم بدھ زندہ ہے اور اسے اپنے ہمعصر چین کے کنفیوشس کی نسبت (اگرچہ دونوں میں کوئی نسبت نہیں) بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہے اور اس کا ترکِ دنیا کا فلسفہ اس غربت زدہ سرزمین کے حالات کے عین مطابق ہے۔ ایک اور عظیم رہنما مہاویر گھوم پھر کر زندگی کے اصول سمجھا رہا ہے۔ جو زندگی کے مکمل احترام کے بارے میں عیسیٰ کے خیالات سے بہت قریب ہیں اور جن کی تبلیغ عیسیٰ پانچ سو سال بعد کرے گا۔ جب خلائی مسافر وادیٔ سندھ کے پہلو بہ پہلو مغرب کی سمت جاتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ یہاں انسان اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے مقابلہ میں فتوحات کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایرانی بادشاہ دارا ہندوستان کے اس حصہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ مغرب میں بحیرہ کیسپین کا رخ کریں گے تو انہیں ایک عظیم تہذیب کے پہلے آثار بڑے شہر، ان کی فصیلیں، عبادت گاہیں اور محل نظر آئیں گے۔

پرسی پولس، ایرانی سلطنت کے چار دارالحکومت ہیں۔ اس کے شہروں اور صوبوں کو آپس میں ملانے کے لیے سیدھی، صاف اور بڑی سڑکیں ہیں۔ جہاں چند میل کے ہر فاصلہ پر ڈاک خانے ہیں۔ مگر آج سے صرف دس برس بعد 490 قبل مسیح میں یونانی میراتھن کی جنگ سے اس عظیم سلطنت کی توسیع روک دیں گے اور جب خلائی مہمان تہذیب کے اصل مرکز بحیرۂ روم کی طرف آئیں گے تو ایتھنز کو اس کے سنہرے دَور میں، اور سپارٹا کو طاقت کے عروج پر پائیں گے۔ رومن ری پبلک ابھی وجود میں آئی ہے اور اس کے پرانے دشمن اور ہمسایے ایٹرسکن اس کی جان کے درپے ہیں۔ یہ نئی جمہوریت صحت مند، توانا اور نئے آدرشوں کی امین ہے، جن میں سے اکثر اس نے یونان سے لیے ہیں۔ ابھی اسے قتل، جنگ اور غداری کی کئی صدیاں دیکھنی ہیں۔ بحیرۂ روم کے اُس پار کارتھیج پہلے ہی ایک بحری قوت ہے اور کئی جنگوں میں کامیابیاں حاصل کر چکا ہے۔ اس وقت وہ بحیرۂ روم میں بالادستی کا سب سے بڑا امیدوار ہے۔ دارا مغرب میں یہاں تک اندر آیا نہ کبھی آئے گا مگر اس نے مصر فتح کر لیا ہے اور بابل میں جلاوطنی سے ابھی واپس یروشلم آنے والے یہودی بھی اس کی رعایا ہیں۔

جہاں تک شمالی یورپ کے ممالک کا تعلق ہے ان پر اب جنگجوؤں کی Celts نامی ایک پراسرار نسل کی حکومت ہے جو اپنے انداز سے رومیوں اور یونانیوں کی ہمسر ہے۔ وہ آرٹسٹ، صوفی اور فطرت کے پرستار ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ جنگلوں میں پریوں کا بسیرا ہے۔ رومنوں کے برعکس اس زورآور نسل میں خواب دیکھنے کی صلاحیت بھی ہے اور اسے اداس ہونا بھی آتا ہے۔ اس وقت وہ جرمنی، فرانس اور انگلستان کے حکمران ہیں۔ افسوس کہ وہ لکھنا نہیں جانتے، اسی لیے ہم ان کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔

500 قبل مسیح میں دنیا کا یہی منظر تھا۔ وہاں جانے والے سائنس دان اسے ایک پُرجوش اور حیرت افزا مقام پائیں گے۔ اگر وہ اس کے متعلق ایک رپورٹ مرتب کریں تو وہ کچھ اس طرح سے ہوگی۔

بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس زمین پر سر اٹھا کر چلنے والی مخلوق تیز تر ترقی کے دَور میں داخل ہوگئی ہے۔ ہم یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں، کیونکہ بتدریج اور قدم بہ قدم آگے بڑھنے والوں کی تعداد اب بھی بہت زیادہ ہے اور ان کی زندگی کا انداز بہت پرانا ہے۔ پھر بھی ان کے مفکر اور فلسفی اپنے خیالات کے لحاظ سے حیرت انگیز حد تک بلند سطح پر ہیں۔ یہ بات اس وجہ سے اور بھی اہم ہے کیونکہ ان کی تکنیکی کارکردگی اپنے سائز کے باوجود

غیر اطمینان بخش ہے اور سائنس میں ان کی بصیرت تقریباً صفر ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی کے شدید مسائل کی وجہ سے ارتقا کی رفتار تیز ہوئی ہے۔ جارحیت اور دانشورانہ بصیرت اس کی دو سمتیں ہیں۔ جارحیت کا مطلب ہے کہ ان کے اعلیٰ مہذب طبقے تقریباً ہمیشہ جنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ تاہم ان کے مفکر بصیرت اور خود آگہی کے اہل ہیں۔ دیکھنا ہے کہ کون سی سمت دوسری سمت کو زندگی سے باہر کرتی ہے۔ ہمارے ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ اسے ان کی جارحیت کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ کہ زمین کے تمام مکینوں کے دماغ دو حصوں میں ہیں تا کہ ہر شخص ذاتی تنقید کے ذریعہ اپنے رویہ پر نظر رکھ سکے۔ زندگی کے مسائل انسان کو اس سے بھی آگے لے گئے ہیں کہ وہ اپنے دماغ کا ایک حصہ دنیاوی خطرات کا جائزہ لینے کے لیے وقف کر دے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ امن وسکون ہو تو بھی وہ خطرہ کی گھنٹی بند کرنا بھول جاتا ہے اور صرف ٹینشن سے نجات کے لیے کسی چیلنج کی تلاش میں رہتا ہے جو جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

مسئلہ اور بھی گمبھیر ہو جاتا ہے اگر روبوٹ کے انداز کا کوئی طریقہ اختیار کیا جائے جس کے ذریعہ انسان اپنے ماضی کے تجربات کا اندازہ کر سکے۔ بدقسمتی سے وہ اپنے مہذب ہونے کے سلسلہ میں اتنا پُر اعتماد ہے کہ اپنے میکانکی ردِعمل کے رحم وکرم پر ہے اور اس سے وجدانی طور پر آگاہی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ایک مشین سمجھنے لگتا ہے۔ خود پرستی کی اس گری ہوئی ذہنیت کے ساتھ اگر خود نمائی کا جذبہ بھی شامل ہو جائے تو یہ برخود غلط مخلوق کسی بڑی سے بڑی مصیبت میں مبتلا ہو سکتی ہے۔

اب ہم سوچتے ہیں کہ یہ مہم ایک ہزار سال بعد زمین پر واپس آ جاتی ہے۔ جہاں نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ موسمی لحاظ سے اب خشک آب وہوا کا سامنا ہے جبکہ پہلے موسم ایسا نہیں تھا۔ جو زمینیں پہلے سرسبز تھیں اب زرد ہو گئی ہیں۔ بلکہ بعض علاقے صحرا بن گئے ہیں۔ پچھلے پانچ سو سال میں بحر کیسپین کی سطح کئی فٹ نیچے گری ہے اور اب وہ سمٹ کر چھوٹا ہو گیا ہے۔

اب ہمارے سیاح آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کا جائزہ لیتے ہیں۔ جہاں تقریباً کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جنوبی امریکا میں تہذیب ڈرامائی انداز میں پھیلی ہے، جنوبی امریکا کے شمالی حصہ میں اب Mayan نے ایک طرح کی سلطنت بنائی ہے۔ پیرو میں اِنکا سمیت تین بڑے کلچر ہیں۔ مگر ان کا معیار تین ہزار سال پہلے کے قدیم مصر وعراق جیسا ہے اور شمالی امریکا کے انڈین اب بھی پتھر کے زمانہ کے شکاری ہیں۔

جاپان میں تہذیب سست روی سے مگر مستقل طور پر ترقی کر رہی ہے۔ جاپانی امن دوست لوگ ہیں۔ ان کے زرعی طریقے روز بروز بہتر ہو رہے ہیں۔ وہ کپڑا بنانا بھی سیکھ گئے ہیں، اس لیے اب کھالیں نہیں پہنتے۔ سماجی معاملات میں وہ پہلے ہی سخت گیر ہیں۔ وہ اپنے بڑے لوگوں کو مٹی کے اونچے ٹیلوں میں دفن کرتے ہیں۔ ان پر چین کا بہت گہرا اثر ہے اور وہ اپنے چینی ہمسایہ سے سیکھنا چاہتے ہیں۔ مقامی جنگیں بھی ہوتی ہیں اور جنوبی جزیرے کیوشو کے ایک بڑے پرنس نے Nara کو اپنا دارالحکومت بنایا ہے، مگر یہ قوم تشدد کے ہاتھوں کبھی پارہ پارہ نہیں ہوگی۔ انہیں فطرت سے عشق ہے اور ان کا سادہ مذہب شنتو بنیادی طور پر فطرت کی پرستش ہے۔ ہر شخص اپنا مقام جانتا ہے اپنے امرا اور حکمرانوں کے لیے ان کے دل میں بڑی عزت ہے۔ ہماری سروے ٹیم کا نفسیاتی ماہر شاید سمجھے کہ ان کی تہذیب کی پرامن نشوونما اس لیے ہو کہ جاپانی دماغ کی تقسیم مغربی دماغ کی تقسیم سے کم ہو۔ اس کا بایاں نصف لگتا ہے کہ نہ صرف وجدان اور پیٹرن بلکہ آئیڈیا اور لفظ کو بھی مرتب کرتا ہے۔ جس سے اب بھی جاپانیوں میں پہلے انسانوں جیسی وحدت اور یکسانیت موجود ہے۔ شاید اسی لیے وہ ایجاد میں چینیوں سے پیچھے ہیں اور اپنے سیماب صفت ہمسایوں کی ایجادات پر حیران ہیں۔

چین میں گزشتہ ایک ہزار برس میں ڈرامائی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ دیوار چین شمال سے ہونے والی ممکن جارحیت کے خلاف بنائی گئی ہے۔ شہروں کے گرد فصیلیں بنانے کی وجہ ایک دوسرے کا خوف ہے۔ دیوار کے باوجود شمال سے منگول حملہ آور آئے ہیں اور انہوں نے لاتعداد لوگوں کو جنوب کی طرف دھکیل دیا ہے۔ ان پناہ گزینوں کی وجہ سے یہ ملک اس وقت بحران میں ہے۔ جاپانیوں کی طرح چینی بھی اپنی روایات کا احترام کرتے ہیں اور عمل کرنے سے پہلے سو بار سوچتے ہیں۔ بدھ ازم ہندوستان سے آیا ہے اور تاؤ ازم یا کنفیوشس ازم کی طرح مقبول ہے۔ اس لیے نہیں کہ چینی زندگی کا تاریک پہلو دیکھتے ہیں۔ زندگی کے متعلق ان کا رویہ پُرسکون اور فلسفیانہ ہے۔ نہ وہ اس سے بہت توقعات وابستہ کرتے ہیں اور نہ ہی ناامید ہوتے ہیں۔ چونکہ بدھ ازم کا تعلق بنیادی طور پر غور وفکر سے ہے اس لیے چینی وجدانی باعمل لوگ ہیں۔ انہوں نے چینی کے برتن اور کاغذ ایجاد کر لیے ہیں اور آنے والی چند صدیوں میں پرنٹنگ اور گن پاؤڈر ایجاد کریں گے۔

جنوب میں ان کا ہمسایہ ہندوستان نسبتاً امن اور سکون سے رہتا ہے۔ اگرچہ اسے بھی منگول حملہ آوروں کی وجہ سے بڑی مصیبت اور دکھ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ نصف صدی پہلے

اس کے بادشاہ سکندا گپتا نے ہنوں کو شکست دے کر انہیں ہندوستان سے باہر نکال دیا تھا۔ گپتا خاندان کے دور (320ء) میں آرٹ اور ادب نے خوب ترقی کی۔ یہ ہندو سطح زمین پر بہت بڑے روحانیت پرست ہیں۔ چینیوں کی طرح وہ بھی وجدانی طور پر سمجھتے ہیں کہ بائیں دماغ کی طرح دائیں کو بھی اپنے اظہار کا پورا موقع ملنا چاہیے۔ چنانچہ گیان دھیان ہندوؤں کی روز مرہ زندگی کا حصہ ہے۔ مگر یہ روحانیت غریبوں کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ وہ وقت بھی آتا ہے جب روحانیت خطرناک حد تک بے عملی اور جمود بن جاتی ہے۔

ہمارے سیاح اب مغرب میں ایران کے اوپر پرواز کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ عظیم ملک آج بھی اتنا ہی عظیم ہے جتنا کہ ہزار سال پہلے دارا کے دور میں تھا۔ ساسانیوں کے عہد میں (جس کا آغاز اردشیر نے 226ء میں کیا) ملک آمادہ جنگ اور خوشحال رہا۔ جب سے اردشیر برسر اقتدار آیا روم کے ساتھ اس کی سات جنگیں ہو چکی ہیں اور تین ابھی ہونی ہیں۔ ایرانیوں نے عیسائیوں کو اپنی سلطنت میں عبادت کی اجازت دے کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ عیسائیوں سے زیادہ روادار ہیں۔ مگر اس وقت ملک مذہبی اختلافات کی زد میں ہے جس کا باعث ایک ممتاز مذہبی شخصیت مزدک، اس کا مذہبی کٹر پن اور اس کے اشترا کی خیالات ہیں اور جس کے مقلدین کی تنگ نظری نے ایک خانہ جنگی کو جنم دیا ہے۔

ایک بار اور بحیرہ روم کی طرف چلیں۔ عظیم الشان قسطنطنیہ، اس کی فصیلیں، اس کی بلندیاں اور اس کی شاندار پوزیشن جو باسفورس کے سامنے ہے۔ 500ء کے اس سال قسطنطنیہ پر انیس تاسیس کی حکومت ہے۔ امن اور خوش حالی ہے۔ بحیرہ روم کے ان تمام ملکوں سے رومی سڑکیں گزرتی ہیں۔ سمندر میں اب بھی رومی اور بازنطینی جہاز ہر طرف نظر آتے ہیں۔ مگر روم پر ایک وحشی گوتھ تھیوڈورک کی حکومت ہے، جس سے اطالویوں کو بڑی نفرت تھی۔ آخری رومی سلطان نوعمر بادشاہ رولس سے پچیس سال پہلے جرمنوں نے اقتدار چھینا تھا۔ تھیوڈورک نے جرمنوں کے لیڈر کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا اور اس کے سپاہیوں کے قتل عام کا حکم دے دیا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام علاقہ ایک طاقتور سلطنت کے زیر اثر رہا ہے۔ اس کے دور میں وہ لوگ پیدا ہوئے کہ انجینئر نگ میں جن کے کارنامے صدیوں زندہ رہیں گے (کتنی نئی تعمیرات کے بارے میں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں؟) سپین یونان اور افریقا میں ہر چیز ان کی یاد دلاتی ہے۔ مگر اب وہ وینڈلوں، ہنوں اور گوتھوں کی طرح فنا ہو چکے ہیں۔ بحیرۂ روم کے پاس صرف ان کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔

Celts کا بھی نام ونشان نہیں رہا۔ انہیں بھی وحشیوں نے سکاٹ لینڈ اور ویلز کے دور دراز علاقوں میں دھکیل دیا ہے۔ اگر چہ ان کا آخری (برطانوی نژاد) جنرل آرٹوریس (بعد میں کنگ آرتھر) انہیں آئندہ نصف صدی تک انگلستان سے دُور رکھے گا۔ جبکہ باقی یورپ میں وحشی رومی سلطنت کی باقیات پر قبضہ کیے ہوئے ہیں اور روم کی شان وشوکت اور بے کراں وسعت سے وہ بے چین اور پریشان بھی ہیں۔

سائنس دانوں کی رپورٹ

ارتقا کے متعلق ہمارا پہلا خیال درست ثابت ہوا ہے۔ یہ انتہائی مہذب لوگ خارجی دنیا سے اس طرح مرعوب ہوئے ہیں کہ انہیں اپنی باطنی دنیا کا ہوش نہیں رہا، نہ ان میں اس سے فیض پانے کی اہلیت ہے۔ اگرچہ انہیں احساس ہے کہ اس سے باخبر ہونا تھا اسی لیے مضطرب اور بے چین رہتے ہیں۔ ہماری ریسرچ سے ثابت ہوا ہے کہ دولت رومنوں کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ ایک بار جب انہیں دولت اور آرام ملا اور باہر سے کوئی خطرہ نہ رہا تو وہ کاہل اور کرپٹ ہو گئے۔

خوش نصیبی سے رومنوں کی مادہ پرستی کا ایک زور دار ردِعمل ہوا کہ سلطنت میں عیسائیوں کا غلبہ ہو گیا جنہیں اپنی ضائع ہونے والی صلاحیتوں کا گہرا احساس ہے۔ بہرحال اپنی ذات سے باہر ایک خدا، ان کا سادہ سا مذہب اور موت کے بعد جزا اور سزا کا نظام بالآخر ایک مخالف ردِعمل کا باعث بنے گا اور ایک بار پھر باطنی وسائل کو توجہ حاصل ہو گی۔

انسانی ارتقا کے اس مرحلہ پر یہ مرکزی مسئلہ تھا۔ انسان مادی دنیا میں اس طرح بھٹک رہا تھا جیسے ٹرین چلی جاتی ہے اور پلیٹ فارم پر انسان تنہا اور پریشان کھڑا رہ جاتا ہے۔ قدرتی طور پر وہ جانتا ہے کہ اسے کہیں جانا ہے۔ کہیں جانے کے اسی باطنی تقاضے نے انسان کو زمین پر سب سے ترقی یافتہ مخلوق بنایا ہے مگر اس سے انسان کی تاریخ کا ایک بڑا تضاد (پیراڈوکس) پیدا ہوا ہے۔ ایک تضاد جسے آرنلڈ ٹائن بی نے 'اسٹڈی آف ہسٹری' میں جاننے کی کوشش کی ہے۔ کہ انسان اپنے کمال پر ہوتا ہے جب وہ تاریخ کا مقابلہ کرتا ہے، مگر اس وقت بدترین ہوتا ہے جب کامیابی اسے آرام کا موقع دیتی ہے۔ ہیرودتس بیان کرتا ہے کہ چند ایرانی اپنے بادشاہ سائرس کے پاس آئے اور درخواست کی کہ 'فاتح ہونے کے بعد ہمیں کسی زیادہ آرام دہ اور خوشگوار ملک میں چلا جانا چاہیے،' تو سائرس نے جواب دیا کہ نرم ملک نرم

شہری پیدا کرتے ہیں۔ ٹائن بی نے ایک پورا باب (PP 31-73 of Vol-1) اس نرم اور سخت ماحول کا فرق جاننے کے لیے وقف کیا ہے اور بتایا ہے کہ سخت ماحول میں بڑائی اور نرم ماحول میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ چین میں تہذیب کے لیے دریائے یانگتسی پر حالات زرد دریا کی نسبت زیادہ سازگار تھے جو اکثر یخ بستہ یا سیلاب کی حالت میں رہتا تھا۔ پھر بھی چینی تہذیب نے یانگتسی کے بجائے زرد دریا کے کنارے جنم لیا۔ جنوبی امریکا میں **Andes** کی تہذیب شمالی صحرا میں پیدا ہوئی، اس شاداب حصہ میں نہیں پیدا ہوئی جسے سپین والے والا پرائزو یعنی ''وادی بہشت'' کہتے ہیں۔

مگر یہ محض انسانی خصوصیت نہیں۔ شراب کے تمام شوقین جانتے ہیں کہ دنیا کی بہترین شراب ان علاقوں سے آتی ہے جہاں انگور کو موسمی حالات سے لڑنا پڑتا ہے۔ بوردیو میں انہیں گہری کھائیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ شیمپین میں سردی کا سامنا ہوتا ہے۔ اچھی زمین اور اچھے موسم **Rhone** وادی اٹلی یا جنوبی افریقا میں تیز شراب پیدا ہوتی ہے مگر وہ کیریکٹر سے محروم ہوتی ہے۔ جانوروں کی طرح پودے بھی میکانکی ہوتے ہیں۔ زمین کے اندر گہری جڑیں ان کی عادت اور زندگی کا یقین دلاتی ہیں۔ مگر ان کے جمود کا باعث بھی ہوتی ہیں۔ عادت کی وجہ سے وہ صرف اتنی ہی کوشش کرتے ہیں جتنی کہ ضروری ہو۔ روئے زمین پر انسان واحد جانور ہے جس کے اندر کہیں جانے کی، آگے بڑھنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے جبکہ دوسرے اکثر جانور عادت کے پابند ہوتے ہیں۔ مگر انسان عادت کے علاوہ دماغ کا بھی پابند ہوتا ہے۔ خارجی مسائل کا سامنا کرتے ہوئے وہ دنیاوی مسائل پر ضرور توجہ دیتا ہے۔ جب کبھی ان مسائل سے اسے نجات ملتی ہے تو وہ سکھ کا سانس لیتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ صرف باہر ہی نہ دیکھتا رہے اپنے اندر بھی جھانکے اپنے باطن پر بھی ایک نظر ڈالے، ایسی نظر جو کاروبارِ دنیا تک محدود نہ ہو بلکہ اس کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد، کوئی بڑا خواب ہو۔

صاف بات ہے کہ انسان کے سامنے کوئی بڑا مقصد ہو تو وہ اپنے کمال پر ہوتا ہے، نہ ہو تو ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ اسی لیے بہت سے لوگ ریٹائر ہونے کے بعد جلد مر جاتے ہیں۔ ہمارے روز مرہ کے فرائض اتنے حقیر اور معمولی ہوتے ہیں کہ وہ ہماری بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔ ہنسی خوشی زندگی گزارنا سیکنڈ کلاس لوگوں کا شیوہ ہے۔ فطری طور پر ہم جانتے ہیں کہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے زندہ رہنا ہی حقیقی زندگی ہے اور یہی وہ

احساس ہے کہ جس نے دنیا کو بدل دیا ہے۔

آیئے اعلیٰ مقصد کی اس معجزہ آفرینی کو ہم سب سے بڑے صاحب بصیرت انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دیکھیں۔

بحیرۂ احمر کے مشرقی ساحل سے چند میل دُور، سعودی عرب کے پہاڑوں میں ایک ریتلی اور دشوار گزار وادی ہے جس کے اندر ایک چشمہ ہے۔ چونکہ اس کا پانی نیچے زمین میں سے آتا ہے اس لیے یہ چشمہ کبھی خشک نہیں ہوتا۔ رومنوں کے افریقا جانے سے بہت پہلے سے عام لوگ اور کارواں اس مقام پر آرام کے لیے ٹھہرتے تھے۔ چشمہ کا پانی آب زمزم کہلاتا ہے اور چونکہ بیماریوں کو شفا دینے کی شہرت اسے حاصل تھی اس لیے زائرین اکثر یہاں اپنے بیمار لے کر آتے تھے۔ اس پر ایک عبادت گھر تعمیر کیا گیا جس کی ایک دیوار میں ایک مقدس سیاہ پتھر لگایا گیا تھا۔ روایت ہے کہ خدا کا یہ گھر، یہ کعبہ حضرت ابراہیم نے تعمیر کیا تھا۔ ڈیوڈرس سیکولس (مؤرخ) کا کہنا ہے کہ یہ سن پچاس قبل مسیح میں موجود تھا۔ اس مقدس دیوار کے گرد ایک شہر مکہ بس گیا تھا۔

جسٹنین کے دور میں، دوسری قدیم قوموں کی طرح عرب بھی کئی خداؤں کی پرستش کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ وہ اللہ کو کائنات کا خالق مانتے تھے، مگر کئی جھوٹے خداؤں کو اس کا شریک بناتے تھے۔ جسٹنین کی موت کے کوئی پانچ چھ برس بعد مکہ کے ایک غریب گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کے والد اس کی پیدائش سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ بچہ ایک صحرائی خانہ بدوش قبیلہ سے تعلق رکھنے والی خادمہ کے حوالہ کر دیا گیا۔ چھ سال کی عمر میں بچہ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور بچہ جس کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھا، اپنے دادا کے سائے میں پرورش پانے لگا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا سو سال کے تھے اور اپنے پیارے اور حسین پوتے پر جان دیتے تھے۔ مگر صرف دو سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا اور قبیلہ کے سردار ابو طالب کے گھر پرورش پانے لگے۔

ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات کم ہیں مگر غالباً وہ بھیڑ بکریاں چراتے تھے اور اپنے چچا کے ہمراہ تجارت کے لیے دور دراز کے سفر پر بھی جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران شام میں ان کی ملاقات ایک راہب سے ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر چودہ برس تھی۔ راہب نے ان سے عیسائیت کا ذکر کیا۔ انہیں عیسائیت اور یہودیت کے بنیادی اصولوں سے پہلے ہی واقفیت حاصل تھی۔ خود کعبہ میں ابراہیم علیہ السلام، حضرت مریم اور ان کے بچہ

عیسیٰ کی تصویر موجود تھی۔ نوجوانی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک خوشحال خاتون خدیجہ کے نمائندے اور منتظم بنے جو اُن سے عمر میں پندرہ سال بڑی تھیں۔ انہوں نے پچیس برس کی عمر میں ان سے شادی کر لی۔ ان کی پچیس سالہ ازدواجی زندگی باہمی محبت اور خوشی سے گزری۔

دونوں مذہب میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ رمضان (جسے عرب مقدس مہینہ سمجھتے تھے) میں دونوں صحرا سے متصل ایک غار میں چلے جاتے اور اپنا وقت عبادت میں گزارتے۔ تاریخ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے جاننے کے لیے ہمیں ان سے پہلے عربوں کی حالت کا جائزہ لینا ہے۔ جب وہ مختلف متحارب بدو قبائل پر مشتمل اور ایک دوسرے کی جان کے درپے تھے۔ سارے حجاز میں ہلاکت خیز انتشار کا عالم تھا۔ عرب اپنی زندگی ایک دوسرے کو قتل کرنے اور قتل کا انتقام لینے میں بسر کرتے تھے۔ نفرت، جہالت اور انتقام کی وجہ سے شروع ہونے والی جنگوں میں وہ اپنی پوری زندگیاں جھونک دیتے تھے۔ انہوں نے 'خون کا بدلہ خون' کا قانون رائج کیا ہوا تھا۔ مگر وہ اس کے بے معنی اور لاحاصل ہونے سے بے خبر تھے کہ وہ ان کی ہلاکت اور بربادی کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔

مگر عربوں کی بہادری اور جنگی مہارت میں کوئی شک نہیں۔ ایرانی اور رومی دونوں اپنی جنگیں لڑنے کے لیے ان کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سلوسڈ کے زمانہ، تقریباً 200 قبل مسیح سے وہ آپس میں برسر پیکار تھے اور جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے کفار پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے، قسطنطنیہ کا نیا رومی شہنشاہ ہریکلیس ایرانی بادشاہ خسرو دوم کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ 626 میں جنگ احد کے بعد ایرانیوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا مگر انہیں پسپا ہونا پڑا۔ اگلے سال خسرو خود اپنے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کا جانشین جلد ہی طاعون سے مر گیا۔ پھر پانچ سال تک ایرانی اقتدار کی جنگ لڑتے رہے اور شاہی تخت کے لیے قتل و سازش کا سلسلہ حسب معمول جاری رہا۔ تاریخ یقیناً اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ جب رومی اور ایرانی آپس میں لڑ کر کمزور اور بدحال ہو رہے تھے، عرب اپنے آپ کو مضبوط سے مضبوط تر بنا رہے تھے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اب تاریخ نے اپنا جانا پہچانا انداز بھی دہرایا۔ انؐ کی رحلت کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ انؐ کے جانشین ہوئے۔ وہ پہلے خلیفہ تھے۔ جب فاتحین کو دم لینے کی فرصت مل جاتی ہے تو وہ اپنی کامیابیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ آپس میں لڑتے ہیں یا نئی فتوحات کا ارادہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے آپس میں لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اکثر لوگوں کا

خیال تھا کہ خلافت کے لیے علیؓ زیادہ موزوں تھے۔ مسلمان دو فریقوں میں تقسیم ہو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حامی سنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامی شیعہ کہلانے لگے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی خانہ بدوش اطاعت گزار قبیلے سمجھے کہ انؐ کی رحلت کے بعد انؐ کی اطاعت کے فرض سے وہ آزاد ہو گئے ہیں۔ اس لیے خلیفہ اوّل کو ان سے جنگ کا رستہ اختیار کرنا پڑا۔ یہ صرف سیاسی نہیں بلکہ مذہبی فیصلہ تھا۔ اگر عرب متحد نہ رہتے تو کمزور ہو جاتے، جس کی وجہ سے فتوحات کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ چنانچہ دو برس کی سخت جدوجہد کے بعد باغی قبائل نے اطاعت اور فرمانبرداری قبول کر لی۔ اسی اثنا میں ابوبکر رضی اللہ عنہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور خلافت کی ذمہ داری حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنبھال لی۔ ان کی سامنے بھی یہی دو راستے تھے کہ اسلامی سلطنت کو وسعت دیں یا سمٹنے اور سکڑنے کی پالیسی اختیار کریں۔ انہوں نے پہلے رستہ پر چلنے کا فیصلہ کیا اور اس میں کامیابی کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دیں۔

ان کے راستہ میں دو بڑے دشمن روم و ایران حائل تھے۔ مسلمانوں کے ایک بڑے جنرل خالد (جو سیف اللہ کے لقب سے مشہور تھے) نے بازنطینیوں کو دمشق کے قریب شکست دے کر 635 میں شام فتح کر لیا۔ تین سال بعد یروشلم فتح ہوا۔ 637 میں عراق پر فتح حاصل ہوئی جس پر اُس وقت ایران کا قبضہ تھا۔ 641 میں میسوپوٹیمیا اور 642 میں مصر فتح ہوا۔ سولہ سالہ جدوجہد کے بعد ایران بھی اسلامی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ مفتوحہ ممالک کے لوگوں نے عربوں کو خوش آمدید کہا۔ وہ دور دراز کے حاکموں کو ٹیکس ادا کرتے تنگ آ چکے تھے، عرب کم از کم ان کے ہمسایے تو تھے۔ اسکندریہ کی فتح اور بازنطینیوں کے جنگی جہازوں کا بیڑہ دیکھ کر عربوں کو احساس ہوا کہ ان کی فوجی قوت ہنوز نامکمل ہے۔ چنانچہ انہوں نے جنگی جہازوں کا اپنا بیڑا بنایا اور 655 میں بازنطینی بیڑے کو غرقِ آب کیا۔

اب ایک آخری مرحلہ، قسطنطنیہ باقی رہ گیا تھا۔ 673ء میں عربوں کے بیڑے نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ مگر کونسٹن ٹائن اور اس کے جانشینوں کی بنائی ہوئی دفاعی فصیلیں ناقابل شکست ثابت ہوئیں۔ چنانچہ عرب اُس وقت کا انتظار کرنے لگے جب فاقوں سے تنگ آ کر شہر کے لوگ ہتھیار ڈال دیں۔

اس موقع پر محض ایک ایجاد 'گریگ فائر' نے تاریخ کا رخ پھیر دیا۔ 'گریگ فائر' کا بانی شام سے آنے والا کالی نیکس نامی ایک شخص تھا۔ وہ مسلمانوں پر عیسائیوں کو ترجیح دیتا تھا۔ اس لیے وہ شام سے قسطنطنیہ چلا آیا۔ اسے کیمسٹری اور آتش گیر مادوں سے شغف تھا۔ اس

نے مختلف کیمیائی مادوں کی آمیزش سے ایک شعلہ پیدا کیا جس کا بجھنا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ خفیہ فارمولا اب لاپتہ ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ چٹانی تیل اور تارکول آتش گیر تھے جن سے شعلہ پیدا ہوسکتا تھا، جبکہ قلمی شورہ کا کام آکسیجن کے ذریعہ شعلہ کو زندہ رکھنا تھا۔ جب خام چونے میں پانی شامل کیا جائے تو سخت حدت پیدا ہوتی ہے۔ کم وبیش انہی اجزا پر 'گریگ فائر' کا پراسرار فارمولا مشتمل تھا۔ عربوں نے دیکھا کہ بازنطینی جہاز ان کی طرف اژدہوں کی طرح آگ اگل رہے ہیں۔ ایسی آگ جو پانی پر گر کر بھی بھڑکتی رہتی تھی۔ اگر کالی نیکس شام ہی میں رہتا اور اپنی ایجاد عربوں کے حوالے کر دیتا تو ان کی فتوحات کا سلسلہ روکنا محال ہوتا۔ بازنطینیوں نے اس کے ذریعے عرب نیوی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

عرب نیوی پانچ سال تک واپس آتی رہی مگر انہیں 'گریگ فائر' کا راز معلوم نہ ہوسکا اور قسطنطنیہ ناقابل تسخیر رہا کہ سمندر کے راستہ اس کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ توپوں اور گن پاؤڈر کی ایجاد میں مزید کئی صدیاں لگ گئیں، جن کی وجہ سے قسطنطنیہ کا دفاعی حصار ٹوٹ گیا۔

677 عیسوی میں عرب جنگ سے فارغ ہوئے۔ مگر بازنطینی نیوی نے عرب بیڑے کو شدید نقصان پہنچایا۔ تمام یورپ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب تک لگتا تھا کہ عربوں کا راستہ روکنا ممکن نہیں۔ ان کے قتل وتشدد کی کہانیوں سے لوگ خوفزدہ تھے۔ یہ کہانیاں مبالغہ آمیز تھیں کیونکہ عرب فاتح کی حیثیت سے جہاں بھی گئے انہوں نے انصاف اور رواداری سے حکومت کی۔

بدقسمتی سے عرب فتوحات مسلمانوں کا اندرونی خلفشار دُور نہ کرسکیں۔ خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ 644ء میں شہید کر دیے گئے۔ بارہ برس بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور 661ء میں حصرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اس طرح خلفائے راشدین کا دور ختم ہوا۔

680ء میں حضرت معاویہ کی موت کے بعد ان کا بیٹا یزید تخت نشین ہوا جسے اس پوزیشن کا اہل نہیں سمجھا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بیٹے حسن رضی اللہ عنہ چند برس پہلے پُراسرار حالات میں انتقال کر چکے تھے۔ لوگوں کو یقین تھا کہ انہیں حضرت معاویہ نے زہر دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دوسرے بیٹے حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کے مخالفوں نے خلیفہ بنانے کے لیے کوفہ آنے کی دعوت دی مگر یزید کی فوج نے انہیں گھیرے میں لے کر شہید کر دیا۔ 680ء میں خاندانِ علی رضی اللہ عنہ کے تمام اراکین کو شہید کر دیا گیا۔ مگر قاتلوں کے ہاتھوں سے ایک بیمار بچہ زین العابدین بچ گیا، جس نے انقلاب کا سفر جاری رکھا۔

قدیم روم کی طرح اسلام بھی خون ریز اندرونی اختلافات کا شکار ہوگیا۔ حضرت معاویہ اور ان کے بیٹے یزید نے امیہ خاندان کی بادشاہت قائم کی مگر اس سے اختلافات اور خونریزی میں اور اضافہ ہوا۔ صرف دو سال کے بعد یزید مرگیا اور اس کا بیٹا بھی جلد ہی فوت ہوگیا۔ امیہ نے معاویہ کے ایک کزن مروان کو تخت نشین کیا مگر مصر و شام اور عراق میں اس کی زبردست مخالفت جاری رہی۔ 684ء میں دونوں حریفوں کی فوجوں میں ہلاکت خیز جنگ ہوئی جس کے بعد مروان نے اقتدار حاصل کرلیا۔ مگر یہ ایک تباہ کن تنازع کا آغاز تھا، جس نے آخرکار بنوامیہ کا اقتدار ختم کر دیا۔ امویوں کا دور جاہ پرستی اور کرپشن پر مبنی سمجھا گیا، جو مجموعی طور سے ایک حقیقت ہے۔ اس اثنا میں عربوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ اگرچہ رفتار محاصرۂ قسطنطنیہ سے پہلے کی رفتار سے کم تھی مگر یہ سلسلہ بہرکیف جاری تھا۔ 711ء میں وہ اسپین پہنچے جبکہ ان کا ایک حصہ ہندوستان میں تھا۔ 713 میں وہ اچانک چین جا پہنچے۔ 715 تک عرب اسپین کے مالک و مختار تھے۔ شمال میں ان کا مارچ جاری تھا کہ تو ور پر 732ء میں چارلس مارتیل نے ان کا راستہ روکا۔ مسلمان پائرونیز کی طرف پیچھے ہٹے، جس کے بعد انہوں نے یورپ کا رخ نہیں کیا۔ Tour کی جنگ یورپ کے لیے اتنی ہی فیصلہ کن تھی جتنی کہ 451ء میں شالون کی جنگ اٹیلا کے لیے تھی۔

عیسائی بجا طور پر عربوں سے خوف زدہ تھے۔ انہوں نے بڑے توہین آمیز انداز میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بگاڑا۔ ہم اس بات پر شاید حیران ہوں کہ ایک عظیم مذہبی تحریک جس کا مقصد ہی خدا کی رضا کے سامنے سر جھکانا ہے، اپنے ماننے والوں کو سکھائے کہ وہ تلوار اور آگ کے زور سے اپنے اصول اَوروں پر مسلط کریں، یہ محض خام خیال ہے۔ انسان اپنے پہلو میں کانٹا لے کر پیدا ہوا ہے۔ ایک دائمی چبھن کسی انجانے راستہ پر چلنے کی کبھی نہ مٹنے والی لگن یا کم از کم یہ احساس کہ کوئی مقصد، کوئی منزل اس کے سامنے ہے، اسی لیے انسان کھیتوں میں گائے کی طرح منہ مارنے کے بجائے سختیاں سہتا ہے، اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے۔ اسی لیے اس کے بچے کھلونوں کے لیے مچلتے ہیں اور اس کے بڑے کلر ٹیلی ویژن، وڈیو ریکارڈر اور تیز رفتار کاروں جیسے بڑے کھلونے مانگتے ہیں۔ جب وہ جمع ہوتے ہیں، بالخصوص محروم طبقوں کے لوگ، تو وہ کچھ پانے اور حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

توسیع پسندی تاریخ کا بنیادی قانون ہے۔ یہ بات افسوسناک مگر مانی ہوئی حقیقت ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ انسان پیدائشی غاصب ہے۔ جب کوئی قوم دوسرے ملک پر قبضہ

کرنے کے لیے اس پر حملہ کرتی ہے تو دراصل وہ ایک غاصب کا کردار ادا کرتی ہے۔ عربوں کے پاس بت پرستوں کو خدا پرست بنانے کا جواز بھی نہیں تھا کیونکہ ایرانی اور اسپینی بھی ان کی طرح خدا کو مانتے تھے۔ بات یہ ہے کہ مذہب نے عربوں کو صرف متحد کیا تھا باقی کام تاریخ نے کیا۔

چنانچہ عرب میں رومیوں اور ایرانیوں کی طرح سارے بحیرۂ روم میں گھوڑے دوڑاتے رہے۔ اور پھر جیسا کہ کئی تہذیبوں کے ساتھ ہوا تھا کہ تاریخ مفتوحہ قوموں کے حق میں فیصلے دینے لگی یا کم از کم ان کے نقصان کا ازالہ کرنے لگی۔

معمول کے قتل و غارت کے بعد عباسیوں نے امویوں کی جگہ لی، عباسیوں کا تعلق قبیلہ بنو ہاشم سے تھا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے۔

خلیفہ المنصور خاندان عباسیہ کا آگسٹس تھا۔ اس نے اپنا نیا دارالحکومت عراق کے اندر الف لیلوی شہر بغداد میں بنایا۔ بغداد جلد ہی تاریک زمانوں کا روم بن گیا۔ اب وہاں روم جیسی رونق اور سونے چاندی، ہیروں جواہرات اور مخمل و کمخواب کی بھر مار تھی۔ اس نے علم و فضل کے عالمی مرکز کی حیثیت سے سکندریہ کی جگہ بھی لے لی۔ 765ء میں ایک روز المنصور کو پیٹ کے درد کی شکایت ہوئی تو ڈیڑھ سو میل دور سے آ کر ایک عیسائی درویش نے اس کا علاج کیا۔ خلیفہ کے کہنے پر اس نے بغداد میں ایک ہسپتال بھی قائم کیا۔ جنڈی شاپور کی خانقاہ سے خلیفہ کئی کتابیں بھی بغداد لایا۔ جو یونانی علم نجوم، فلسفہ اور قدیم سائنس کی کلاسیک پر مشتمل تھیں۔ عربوں کو علم نجوم میں خصوصی دلچسپی تھی کیونکہ وہ اس کی مدد سے مکہ کی سمت جاننا چاہتے تھے، اس لیے کہ تمام مساجد کا رخ اسی طرف ہونا تھا اور اس کی طرف منہ کر کے مسلمان دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھتے تھے۔ کمپاس ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔ مگر تولمی نامی ایک یونانی ماہر نجوم نے ایک آلہ اصطرلاب بنالیا تھا جس کے ڈائیل سے ستاروں کی سمت متعین کی جاتی تھی۔ اب المنصور کو کافروں کی سائنس کا اندازہ ہوا اور یونانی کتابیں عربی میں ترجمہ ہونے لگیں۔ آٹھ برس بعد ہندوستان سے آنے والا ایک سیاح علم نجوم پر مزید کتابیں اور ہندسہ لکھنے کا ایک نیا انداز لایا جو لاطینی انداز کی نسبت آسان تھا۔ یہ ہمارا عدد کو پہلے اور دس کو دوسرے کالم میں لکھنے کا انداز تھا۔ ہم اب بھی عربی ہندسوں (Numerical) کی بات کرتے ہیں حالانکہ انہیں انڈین نیومیریکلز کہنا زیادہ صحیح ہے، مگر اس انداز کو یورپ میں عرب ہی لے کر آئے تھے۔

عربوں نے علم نجوم و ریاضی ہی میں از سرِ نو دلچسپی پیدا نہیں کی بلکہ یورپی دانش پر فکر

وتدبر کے نئے دروازے کھول دیے۔ قدیم یونانی یورپ میں دانشورانہ جرأت کی آخری مثال تھے۔ اس میں رومیوں کا حصہ بے شک کم ہو مگر انجینئرنگ ان کے جینئس کا کمال ہے۔ 410ء میں روم پر جب Aleric کا قبضہ ہوا تو بشپ آگسٹائن آف ہپو (بعد میں سینٹ آگسٹائن) نے انسانی کارناموں کی بے مائیگی پر 'دی سٹی آف گاڈ' کے نام سے ایک لمبا وعظ کیا کہ زمینی شہروں کی تباہی ناگزیر ہے جبکہ عیسائیوں کا مقصد خدا کا شہر بنانا ہے۔ اس نے عیسائیوں کو سائنس اور دانش ورانہ تحقیق سے باز رہنے کی تاکید کی۔ سیکھنے اور علم حاصل کرنے کے نام پر تجربات کی رائگاں خواہش۔ 'دی سٹی آف گاڈ' انجیل کے بعد سب سے مقبول کتاب ثابت ہوئی، ازمنہ وسطیٰ میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب۔ چرچ نے سائنس کی مذمت میں اس کی مکمل تائید کی۔ المنصور سے پانچ سو سال بعد بدنصیب روجر بیکن، ایک بے مثال سائنسدان کو اس لیے جیل میں ڈال دیا گیا کہ اس نے اپنی تصنیف میں کوئی نئی بات کہی تھی، کوئی نیا خیال پیش کیا تھا، کیونکہ چرچ کا ایمان تھا کہ سائنس اور فلسفہ پر ارسطو حرفِ آخر تھا۔

مگر عربوں جیسے ان صحرانشینوں کے لیے علم نجوم، سائنس، میڈیسن، فلکیات اور فلسفہ کا مطالعہ ایک نیا حیات آفریں تجربہ تھا۔ وہ دیوانہ وار اس پر جھپٹ پڑے اور اسے حرزِ جاں بنا لیا۔ ان کے ریاضی دان ریاضی میں کھو گئے اور ہر چند کہ چرچ ایجاد کے خلاف تھا مگر اسے ماننا پڑا کہ فلکیات پر تولمی کی تصنیف 'Almagest' علمی میدان میں اس کا ایک شاندار کارنامہ تھا۔ (ویسے تو اس کی بات نا سمجھی پر مبنی تھی کیونکہ اس کے خیال میں زمین کائنات کا مرکز ہے اور اسی غلط مفروضہ کی بنیاد پر اس نے اپنا سارا حساب لگایا تھا۔ بہرحال اس کی وجہ سے یورپ نے ایک بار پھر فلکیات کے متعلق سوچنا شروع کر دیا) عربوں نے سکندریہ کی لائبریری جلائی تھی مگر انہوں نے یورپ میں علم کی نئی تڑپ پیدا کر کے اس کی تلافی کر دی۔

775ء میں المنصور کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے المہدی نے علم وفن، تعلیم اور سائنس کی سرپرستی جاری رکھی۔ اس نے دس برس حکومت کی۔ پھر الف لیلیٰ ہزار داستان کے شہرت یافتہ ہارون الرشید کا دور آیا۔ اس کی حکومت کا زیادہ عرصہ بازنطینیوں کے ساتھ ایک طویل جنگ کی نذر ہو گیا، جو بالآخر اپنے زخم چاٹتے ہوئے پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے اور ہارون کے بیٹے مامون کے بیس سالہ عہد حکومت کے ساتھ عرب تاریخ ازمنہ وسطیٰ میں اپنے انتہائے کمال پر پہنچی۔ مامون عربوں کی اس بدلتی ہوئی خواہش کا مظہر تھا جس کے زیر اثر ان کے اندر ملک گیری کی جگہ علم کی تڑپ لے رہی تھی۔ اس نے دو رصد گاہیں اور ایک 'بیت الحکمت' تعمیر

کیا۔ اس نے اہرام کو جاننے کی کوشش بھی بالخصوص اس وقت کی جب اسے معلوم ہوا کہ ان میں ستاروں کے قدیم نقشے موجود ہیں۔ اس کے اہل کاروں نے اندر داخل ہو کر اہرام کے کئی رستے اور بادشاہ و ملکہ کے چیمبر دریافت کر لیے مگر انہیں کہیں ستاروں کے نقشوں کا پتہ نہ چلا۔ پھر بھی اس کے سکالروں نے زمین و آسمان کے اوّلین نقشے بنا لیے۔ (جو بدنصیبی سے لاپتہ ہیں)

ڈارک ایجز کے ہمہ جہت بحران کی ذمہ داری عربوں پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ اس کی سیدھی سادی وجہ روم کا زوال ہے جس نے یورپ کو وحشیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ان وحشیوں میں سے اکثر بنیادی طور سے خانہ بدوش تھے جو شہر فتح کر لینے کے باوجود وہاں مستقل طور پر رہنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اناج اور سامان کی صورت میں اپنی روزی لوٹتے اور سمیٹتے ہوئے شہر شہر اور ملک ملک گھومنے میں راحت محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے کہیں مستقل طور پر قدم جمانے اور انتظام و انصرام سنبھالنے کی پروا کبھی نہیں کی۔ فرینک بادشاہوں (فرینک ایک جرمن قبیلہ تھا) میں سے پہلا بادشاہ کلووس 481ء میں پندرہ سال کی عمر میں اپنے قبیلہ کا لیڈر بنا۔ اس نے گال Gaul پر حملہ کیا اور کیتھولک عیسائی بن گیا۔ برگنڈین اور رومی مقبوضہ گال کو شکست دے کر اس نے پیرس کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اس کا سلسلہ اس کے دادا میدووچ کے نام پر میروونجین کہلایا مگر اس کے وارثوں کو جلد پتہ چل گیا کہ طاقت اور دولت کے بغیر بادشاہ بننا مشکل کام ہے۔ شاندار رومی سول سروس کے بغیر ملک کو چلانا اور ٹیکس وصول کرنا ممکن نہیں تھا۔ دوسری بہترین صورت یہ تھی کہ مقامی امرا سے معمولی فوجی امداد کا وعدہ لے کر ان میں جاگیریں بانٹی جائیں۔ مگر اس کے معنی یہ ہوتے کہ مقامی امراء چھوٹے چھوٹے مقامی بادشاہ بن جائیں اور مرکزی حقیقی بادشاہ کو صرف اپنی جاگیر اور ٹیکسوں پر گزارہ کرنا پڑے۔ مقامی امراء ٹیکس ادا کرنے پر آمادہ ہوتے تو بھی دولت کی معمولی اور ناکافی گردش کی وجہ سے ٹیکس کا نظام ناقابل عمل تھا۔ امراء انڈوں اور بند گوبھی کی صورت میں ٹیکس ادا کرتے تھے۔ بادشاہ بیل گاڑی میں سوار کر سیر کے لیے جاتا جسے اس کے کسان چلاتے۔ چنانچہ تاریک دَور میں سارا یورپ سترھویں صدی کے آئرلینڈ کی طرح مفلس، بنجر اور گنوار تھا۔

دراصل آئرلینڈ ساتویں صدی عیسوی میں باقی یورپ کے اکثر حصوں سے بہت آگے تھا۔ پانچویں صدی میں پیٹرک نامی ایک برطانوی آئرش قزاقوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور ان کی عجیب زبان سیکھی۔ آئرلینڈ جا کر اس نے تمام ملک کو عیسائی بنایا۔ آئرش (جو

Celts تھے) چند صدیاں بعد کے عربوں کی مثال جوش وخروش کے ساتھ علم حاصل کرنے لگے اور ان کی خانقاہیں اور عبادت گھر چوٹی کی یونیورسٹیاں بن گئیں۔ یورپ بھر میں یہ چھوٹی یونیورسٹیاں علم وفضل اور کتابوں کے مراکز کی حیثیت اختیار کر گئیں اور انہوں نے علم کی شمع جلائے رکھی۔ اب جبکہ رومی شہنشاہ قسطنطنیہ میں تھا پوپ عملاً مغرب کا شہنشاہ بن گیا۔ اس نے Clovis جیسے حکمرانوں کو اکسایا جنہوں نے چرچ اور مذہب کے نام پر ملک گیری کی اور کئی بشپ اور راہب زمینوں کے مالک بن گئے۔ تاریک دَور میں یہ راہب اور پادری ان مٹھی بھر لوگوں میں سے تھے جنہیں ہر روز پیٹ بھر کر کھانا اور شراب کا ایک گلاس نصیب ہوتا تھا، ورنہ تاریک دَور میں زندگی اتنی کٹھن اور دشوار تھی جتنی کہ میسوپوٹیمیا میں شہر بساتے وقت تھی۔ اکثر لوگ فاقہ زدہ اور بے جان ڈھانچوں کی طرح تھے۔ بچے پیدائش سے پہلے یا فوراً بعد مر جاتے تھے۔ رہی سہی کسر ڈاکو اور لٹیرے نکال دیتے۔ کسی کو رومیوں کا زمانہ یاد آتا تو ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتا۔

یہ تاریخ کا اصول ہے، ''پھیلو یا مٹ جاؤ''۔ اس نے میرونجین کو برباد کیا۔ Clovis نے اپنی حکومت چار بیٹوں میں بانٹ دی جو ایک غلطی تھی۔ مورس بشپ کہتا ہے، بادشاہت کئی چھوٹی وراثتوں میں بٹ جاتی اگر بیماری وارثوں کا راستہ روک نہ دیتی اور انہیں Clovis کے پاس پہنچنے دیتی۔ مگر ان ناتواں بادشاہوں کے پاس پھیلنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ اپنے مختار کاروں پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کرنے لگے، یہاں تک کہ اصلی طاقت ان کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ 656ء میں ان میں سے ایک مختار کار نے ڈیگوبرٹ نامی ایک نابالغ وارث کو اغوا کیا اور اسے آئرلینڈ بھیج دیا۔ وہیں اس کی پرورش ہوئی جبکہ اس عرصہ میں مختار کار کا بیٹا تخت پر قابض ہوا۔ ڈیگوبرٹ فرانس واپس آیا اور اپنا تخت حاصل کر لیا۔ مگر جلد ہی شکار کے دوران میں ایک درخت کے سائے میں سوتا ہوا مارا گیا۔ مارتیل (جس نے فرانس میں عربوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کیا تھا) مختار اعلیٰ تھا، اس کے بیٹے پیپاں نے پوپ سے پوچھا کہ کیا حکومت نکمے اور نااہل ہاتھوں میں ہونی چاہیے؟ پوپ نے جواب دیا، ''نہیں۔'' چنانچہ پیپاں نے انتخابات کرائے اور حکومت پر قبضہ کر لیا۔ پوپ کا احسان چکانے کے لیے اس نے اپنی فوج کے ذریعے اٹلی جا کر وحشی لومبارڈز کو پے در پے شکستیں دیں جو پوپ کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ پھر مفتوحہ علاقے اس نے پوپ کے حوالے کیے جو Papal States کی نہ صرف بنیاد بنے۔ بلکہ آنے والی صدیوں میں چرچ کی بے اندازہ طاقت اور دولت کا ذریعہ بھی ثابت ہوئے۔

تاریخ کا یہ اصول ''وسعت، اور زیادہ وسعت'' پیپاں کی سمجھ میں آ چکا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کی سرحدیں Pyrenees تک وسیع کر لیں۔ اس کا بیٹا چارلس بھی تاریخ کا یہ سبق سیکھنے میں اس سے پیچھے نہیں رہا تھا جو 768ء میں تخت نشین ہوا اور بیالیس برس حکومت کی۔ وہ شارلیمین چارلس دی گریٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ ایک قومی الجثہ چھ فٹ چار انچ کا دیو قامت شخص جو اٹیلا کی طرح عورتوں کا شوقین تھا۔ وہ توسیع پسندی کا اصول اتنی اچھی طرح سمجھا کہ اس کی زیادہ زندگی جنگوں میں گزر گئی۔ اس نے سیکسن لومبارڈز اور اسپین میں عربوں کے خلاف فوج کشی بھی کی۔ شمال مشرقی جرمنی کے Saxons کو زیر کرنا خصوصی طور پر مشکل تھا۔ وہ خدا کے منکر تھے اور انسانوں کی قربانی اب بھی جائز سمجھتے تھے۔ اکثر وحشیوں کی طرح وہ اپنا وقت لوٹ مار میں صرف کرتے تھے۔ کبھی وہ لوٹ مار کرتے ہوئے شارلیمین کے شمالی علاقہ میں جا نکلتے۔ شارلیمین کو Saxons کے معاملہ میں کم و بیش ویسا ہی تجربہ ہوا جیسا کہ رومنوں کو اپنے جرمن بزرگوں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ وہ انہیں شکست دیتا، مفتوحہ علاقوں میں چھاؤنیاں قائم کرتا اور انہیں خراج دینے پر مجبور کرتا۔ جونہی وہ واپس جاتا Saxons اس کے سپاہی قتل کر دیتے اور بعض کو اپنے خداؤں پر قربان کرتے، جس کے بعد وہ پھر واپس آتا اور انہیں دردناک سزائیں دیتا۔ جب بیس برس تک یہی کچھ ہوتا رہا تو آخرکار اس نے ہر اس Saxon لیڈر کو قتل کیا جو اس کے ہاتھ لگا اور سارے قبیلہ کو اپنے علاقہ میں بھیج دیا۔ جب اس نے قبیلہ والوں سے پوچھا کہ وہ عیسائیت یا موت میں سے کسے پسند کریں گے تو ایک انگریز راہب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ لوگوں کو عیسائی بنانے کا یہ کوئی طریقہ نہیں۔ مگر شارلیمین ٹھیک اور راہب غلط تھا۔ Saxons عیسائی ہو گئے۔

اگر ہم شارلیمین کا موازنہ کانسٹنٹائن اور جسٹنین جیسے اس کے نامور پیش رووں کے ساتھ کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ارتقا کے ناگزیر عمل نے ان سے اونچے درجہ کا ایک آدمی پیدا کیا ہے۔ وہ لاطینی اور یونانی دونوں زبانیں جانتا تھا۔ اس نے اپنی مادری زبان کو بنانے سنوارنے کا کام کیا تھا۔ اسے موسیقی اور کتابوں کا شوق تھا۔ اس کا دربار سکالروں اور آرٹسٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بھاری بھرکم، گرم جوش اور متواضع تھا۔ لوگوں کو کھانے کی دعوت دے کر خوش ہوتا تھا۔ اس نے اعلان کیا ہوا تھا کہ انصاف حاصل کرنے کے لیے ہر شخص اس کے پاس آ سکتا ہے۔ گھر پر ہوتا تو اپنی مملکتوں کا دورہ کیا کرتا۔ مقامی حکومتیں منظم کرتا، تعلیم میں سرگرمی سے حصہ لیتا اور راہبوں اور ننوں (nuns) کے لیے نئی قیام گاہیں بنواتا۔ مگر عجیب

بات ہے کہ اس کا دارالحکومت کہیں نہیں تھا۔ وحشیوں کی روایت اپناتے ہوئے وہ آوارہ گردی کو ترجیح دیتا تھا۔

جب شارلیمین شمال میں شہنشاہ کی ذمہ داریاں سنبھال رہا تھا، پوپ بدستور روم میں کئی مسائل سے دوچار تھے۔ ترقی پذیر بازنطینی سلطنت اور نئی فرینکش سلطنت کے درمیان سینڈوچ ہو کر وہ غیر اہم لگتے تھے، اور واقعی غیر اہم تھے۔ پوپ لیو سوم ایک کمزور شخص تھا اس لیے سابق پوپ کے عزیز و اقارب اس کے ساتھ تحقیر سے پیش آتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سینٹ پیٹر کی جگہ کے لیے وہ بہتر امیدوار لا سکتے تھے۔ 799ء کے اندر انہی میں سے بعض شرپسندوں نے لیو کو سڑک پر پکڑ لیا اور اس کی آنکھیں نکالنے اور زبان کاٹنے کی دھمکی دی۔ پوپ نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی تو انہوں نے اس کی آنکھوں پر تلوار کا وار کیا جو زندگی بھر اس کی بھنووں پر ایک زخم کی صورت میں موجود رہا۔ بالآخر شارلیمین کے چند آدمیوں نے مداخلت کی تو پوپ اپنے نہایت طاقتور اتحادی کی پناہ میں چلا گیا مگر شارلیمین کو یہ صورت حال ناگوار لگی۔ وہ جنگوں سے اکتا چکا تھا اور سمجھتا تھا کہ پوپ اس کا اہل نہیں کہ اس کے لیے لڑا جائے۔ بہرحال اس نے محافظوں کی معیت میں لیو Leo کو روم واپس بھیجا۔ شرپسندوں کو جلاوطن کر کے امن بحال کیا۔ شکر گزاری کے طور پر لیو نے 800ء میں کرسمس کے موقع پر شارلیمین کو مغرب کے شہنشاہ کا اعزاز سینٹ پیٹرز چرچ میں دیا۔ نابالغ رومولس کی برطرفی کے تین سو سال بعد شارلیمین پہلا رومی شہنشاہ بنا۔ مگر اسے یہ ذمہ داری ایک بوجھ لگی۔ وہ شمال واپس گیا، چودہ برس اور حکومت کی اور اپنے پسندیدہ مقام آشین میں جا کر فوت ہوا۔

شارلیمین کے مرتے ہی اس کی سلطنت بکھرنے لگی۔ نااہلی اور مسلسل بےعملی کی یہ حالت ٹالسٹائی کی اس بات کی تردید ہے کہ بڑے آدمی تاریخ کا رخ نہیں موڑتے، کوئی حکمران مرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی سلطنت بھی ٹوٹنے لگتی ہے۔ وجہ تقریباً ایک ہوتی ہے۔ وارثوں کے باہمی جھگڑے، نئے مفتوحہ علاقوں کو بغاوت کا موقع مل جانا اور کمزوری کا بحران کی شکل اختیار کر لینا۔ شارلیمین نے جن تین بیٹوں کو اپنی سلطنت بانٹنے کے لیے نامزد کیا تھا، ان میں سے دو تو جانشینی سے پہلے مر گئے تھے۔ مگر اس کے نالائق بیٹے لوئی نے چار بیٹوں میں بادشاہت تقسیم کر دی اور یہ تقسیم اس وقت ہوئی جبکہ اسے اتحاد کی ضرورت تھی۔ یورپ ایک بار پھر ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

شارلیمین کی موت سے پہلے ہی سرحدوں پر نئے خطرے نمودار ہو گئے تھے۔

غلاموں کے جنگجو بلقان سے ہوتے یونان میں داخل ہو گئے اور عرب جنوب سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں سپین سے نکالنے کی کوشش شارلیمین کی سب سے ناکام کوشش ثابت ہوئی اور شمال سے نئے وحشیوں میں سے انتہائی ظالم وحشی Viking آ گئے۔ ہنوں کے بعد وہ سب سے خطرناک حملہ آور اور لڑاکے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح لڑتے تھے اور پاگل پن کے لیے ان کے پاس ایک لفظ تھا 'Berserk'۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لڑائی سے پہلے کوئی دوا بھی لیتے تھے۔ Saxons کی طرح وہ اپنے دشمنوں کو اپنے شمالی خداؤں پر قربان بھی کرتے تھے۔ The blood eagle نام کی ایک گھناؤنی رسم تھی، جس کے مطابق ایک زندہ شخص کی پسلیاں آری سے کاٹ کر اس کے پھیپھڑے باہر نکال لیے جاتے اور انہیں باز کے بازوؤں کی طرح پھیلا دیا جاتا تھا۔ ان ظالموں میں رحم اور ضمیر کا شائبہ بھی نہ تھا۔ ممکن ہے کہ زندگی کی سختیوں نے انہیں اتنا بے رحم بنا دیا ہو۔ جدید معیار کے لحاظ سے ان کے لمبے تنگ جہاز گشتی کشتیوں سے شاید ہی کچھ بڑے ہوتے تھے۔ وہ کھلے ہوتے تا کہ ضرورت کے وقت تیس پینتیس افراد کھلے آسمان تلے سو سکیں۔ کمپاس ایجاد نہیں ہوا تھا، اس لیے بادل ہوں تو وہ اپنے اندازے سے راستہ تلاش کرتے۔ جب وہ ساحل سے قریب کوئی بستی دیکھتے تو اس کے مکینوں کو بے دریغ قتل کرتے۔ آبرو ریزی کرتے، اندھا دھند لوٹتے، مارتے اور ان کے گھروں کو آگ لگا دیتے۔ گویا کہ اپنی مصیبتوں کا بدلہ وہ ان بے بسوں سے لے رہے ہیں۔ ان کی بہادری کے متعلق ہمارا روائتی تصور یکسر بدل جائے اگر ہم بستی کے ہر بچے بڑے اور عورتوں کی مسخ شدہ لاشیں اور ان کے جل کر راکھ ہونے والے گھر دیکھیں۔ آج کی طرح ان دنوں بھی ان کے ہاتھوں برباد ہونے والی قومیں انہیں طاعون کے جراثیم سمجھتی تھیں۔ مگر اس وقت تک کوئی ڈی ڈی ٹی ایجاد نہیں ہوئی تھی جسے چھڑک کر انہیں ہلاک کر دیا جاتا۔ کہتے ہیں کہ شارلیمین سمندر میں وائیکنگ کے سیاہ بادبان دیکھ کر رو دیا تھا۔ اس نے ان کے خلاف دفاعی حصار تعمیر کیے۔ مگر جب تک Viking یورپ کے لیے اذیت بنیں وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اور اس کے وارث اتنے بودے اور کمزور تھے کہ وہ ان کے ظلم کے خلاف کوئی مؤثر مزاحمت اور مدافعت نہ کر سکے۔

اور Viking کو مجرم کس نے بنایا؟ خود سوال میں جواب کا اشارہ موجود ہے۔ ان ڈاکوؤں کے پیش رو کسان تھے جو شمال کی سرد اور ویران زمینوں پر گزارہ کرتے تھے۔ زمین کے جس حصہ پر ممکن ہوتا وہ کاشت کرتے، مگر زمین کاشت کے قابل نہ تھی۔ ان کی خاص

خوراک ہرن کا گوشت تھا۔ گھریلو ہرنوں کے علاوہ، وہ جنگلی ہرن بھی پکڑ لیتے۔ جب وہ کھیت اپنے بچوں میں بانٹتے تو زمین کی کمی سے فصل کی پیداوار ممکن نہ ہوتی۔ چونکہ وہ دریائی راستوں والے ملک میں رہتے تھے اس لیے سمندر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ تاجر بن گئے۔ مگر قزاقوں کا خطرہ ہمیشہ لگا رہتا۔ چنانچہ وہ خوب مسلح ہو کر رہتے۔ تقریباً ایک عشرہ کے اندر انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے مال دار فرینکش ہمسایوں کو لوٹ سکتے ہیں۔ یورپ کی بدقسمتی کہ 'Viking کا سال' وہی سال تھا جب شارلیمین شہنشاہ بنا تھا۔ ان نام نہاد بہادروں کا انحصار ''مارو اور بھاگو'' کی ترکیب پر تھا۔ قدم جما کر مقابلہ کرتے تو مار کھاتے۔ مگر ان کی تیز رو کشتیاں فوج کی آمد سے پہلے انہیں خطرہ سے باہر لے جاتیں۔ فوج کمزور ہوتی تو وہ حملہ کر دیتے۔ نویں صدی کے وسط میں وہ انگلستان کے ساحل پر اترے اور یارک کو جلا کر خاک کر دیا۔ اور نارتھمبرین کے بادشاہ کو اپنی روایتی قربانی کی سزا دی۔ یہی ایسٹ انجلز کے بادشاہ کے ساتھ ہوا۔ 870ء میں انہوں نے West Saxons پر حملہ کیا اور Ridgwhy سے رج وے تک بڑھتے چلے گئے جہاں ایک بڑا سفید گھوڑا Celts نے ٹرف کے اندر کاٹا تھا۔ الفرڈ بادشاہ کے چھوٹے بیٹے نے ان پر اچانک حملہ کر دیا۔ رات ہونے تک سفید گھوڑا وائکنگ کے خون میں رنگا گیا اور زمین ان کی لاشوں میں چھپ گئی۔ مگر Wessex کے لوگوں کے پاس کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ وہ کسان تھے جنہیں حملہ آوروں سے لڑنے کے لیے اپنی زمین چھوڑنا پڑی۔ چنانچہ گتھرم نامی اپنے لیڈر کی کمان میں ان کی فوجیں Wessex میں داخل ہو گئیں اور الفریڈ (اب بادشاہ) کو سمرسٹ میں آلٹرکینی کے آس پاس ایک دلدلی علاقہ میں پناہ لینا پڑی۔ اگر اس وقت الفریڈ ہمت ہار دیتا تو آج نئے انگلستان اور امریکا کی زبان ڈینش ہوتی اور انگلستان سکنڈے نیویا کی آؤٹ پوسٹ ہوتا۔ درحقیقت الفریڈ نے ایک قلعہ بنا لیا تھا جہاں سے وہ حملہ آوروں پر حملے کرتے، اس نے ہم وطنوں کو دشمنوں کے خلاف اس کا ساتھ دینے کی دعوت دی اور 878ء میں Edington (سفید گھوڑے سے قریب) کے مقام پر اس کی فوج نے دشمنوں پر حملہ کیا اور انہیں فیصلہ کن شکست دی۔

پھر وہی ہوا جو ایسے مواقع پر ازمنہ وسطیٰ میں ہوا کرتا تھا۔ الفریڈ جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ انگلستان میں رہیں گے۔ لڑائی کے تین ہفتوں بعد گتھرم اپنے سربرآوردہ ساتھیوں کے ہمراہ آلٹرکینی آیا اور الفریڈ کا منہ بولا بیٹا بن گیا۔ دعوتیں ہوئیں اور جب وہ وہاں سے رخصت ہوا تو وہ الفریڈ کا اتحادی اور دوست بن چکا تھا۔ ڈین واپس ایسٹ اینگلیا گئے اور کسانوں کے طور پر

زمین میں اپنا حصہ لیا۔ ان کا علاقہ ڈین لا کہلایا اور الفریڈ اپنی نیوی بناتا رہا۔ اس نے شہروں کے مضبوط دفاع کا خیال رکھا اور جنوبی انگلستان کا شارلیمین بن گیا۔

'دعوت اور منہ بولا بیٹا' ایک لحاظ سے اس کہانی کا فیصلہ کن موڑ ہے، ایک ذاتی تعلق کا آغاز کہ جس نے مجرموں کو اچھے شہری بنا دیا۔ تمام مجرموں کی طرح وائیکنگ بھی ان لوگوں کی ہستی سے منکر تھے جو ان کے ہاتھوں مارے جاتے تھے تا کہ یہ ظاہر کر سکیں کہ اخلاقی قوانین کا کوئی وجود نہیں تھا، یا کم از کم ان کا اطلاق ان اجنبیوں پر ان ہرنوں کی طرح نہیں ہوتا جنہیں وہ مار کر کھاتے تھے۔ جب اجنبی اپنے بن گئے تو آبرو ریزی اور لوٹ مار کا دور ختم ہوا۔

911ء میں چارلس سمپل آف فرانس کو مجبوراً یہی نسخہ آزمانا پڑا۔ وائکنگ 845ء، 851ء، 861ء، اور 885ء میں پیرس کو تین بار لوٹتے اور دو بار آگ کی نذر کرتے ہوئے سین تک پہنچ گئے تھے۔ 885ء میں انہوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ پیرس نے محاصرہ کا سامنا Odo (کاؤنٹ آف پیرس) کی سرکردگی میں کیا۔ شہر کی سپلائی بند ہونے سے حالات اتنے خراب ہوئے کہ امرا کو کتے بلیاں اور چوہے کھانے پڑے۔ آخرکار بادشاہ موٹا چارلس ایک بڑی فوج کے ساتھ منظر میں داخل ہوا مگر بزدلی کی وجہ سے وائیکنگ کے ساتھ لڑنے سے ڈرتا تھا۔ اس لیے اس نے انہیں ڈینگلڈ دے کر خرید لیا۔ وائیکنگ نے دولت سمیٹی اور باقی ملک کو لوٹنے اور جلانے میں لگ گئے۔ ڈینکوں نے خفا ہو کر چارلس کو برطرف کیا اور Odo کو بادشاہ بنا دیا۔ مگر اسے بھی ڈینگلڈ کے توہین آمیز مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا۔ اس کے جانشین چارلس سمپل نے ان کے لیڈر Rollo کو اس زمین کی پیش کش کی جسے آج ہم نارمنڈی کہتے ہیں ۔ نارمن (دراصل نارمنز) انہی کے وارث تھے جنہوں نے 1060ء میں ولیم نارمنڈی کے زیر کمان انگلینڈ پر حملہ کیا۔ حیرت ہے کہ انہی وائیکنگز کو آج ہم روسیوں کے نام سے جانتے ہیں ۔ وہ شمال کی سمت لڑتے رہے اور تجارت بھی کرتے رہے۔ 850ء میں Rurick نامی ایک وائکنگ Norgord کا حاکم بن گیا۔ روس کے رہنے والے ایشیائی اور منگول تھے۔ آرام پسندی اور اونگھتے رہنا ان کی عادت تھی۔ وائکنگ خون کے ساتھ ایشیائی نسل کی آمیزش سے ترچھی آنکھوں اور رخساروں کی اونچی ہڈیوں والے روسی پیدا ہوئے۔

اس عرصہ میں یورپ کے اندر اپنی برتری کے لیے لڑنے والوں نے بحران پیدا کیے رکھا۔ سلاو کی سلطنت اپنے بادشاہ ساو یا تو پلک کی حکمرانی میں جرمنی سے کارپاتھین تک وسیع ہو گئی۔ آرنلف نامی ایک جرمن نے ایک روسی قوم کارنجین کی مدد سے سلاووں کا مقابلہ کیا مگر یہ

اس کی غلطی تھی کیونکہ Magyars بھی وائیکنگز کی طرح درندے اور لٹیرے تھے۔ وہ بے مثال سوار تھے اور دوڑتے ہوئے گھوڑے پر بیٹھ کر بھی ٹھیک نشانہ لگا سکتے تھے۔ Vikings کی طرح وہ ظالم اور تباہ کن تھے۔ انہی کی طرح گاؤں جلا دیتے اور دہشت گردی کی خاطر کھڑی فصلوں کو آگ لگا دیتے۔ جب وہ کسی گاؤں پر حملہ آور ہوتے تو تمام مردوں کو قتل کر دیتے۔ بچوں کے ہاتھ پاؤں توڑ دیتے اور عورتوں کو مویشیوں پر لاد کر ریپ اور قتل کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے۔ یہ مگیار تھے جنہوں نے ساویا تو پلک کی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ انہوں نے 899ء میں اٹلی پر حملہ کیا اور شہنشاہ بیرنگر نے پندرہ ہزار لشکریوں کے ساتھ جب ان کا پیچھا کیا تو اسے شکست دی۔ تاوان جنگ وصول کیا اور ایک سال مزید لوٹ مار کرتے رہے۔

جنوب میں مسلمانوں کی طرف سے خطرہ بدستور موجود تھا۔ وہ سسلی پر قبضہ کر چکے تھے۔ عباسی سلطنت اگرچہ بکھر رہی تھی مگر مسلمان سمندر میں سفر کرنا سیکھ چکے تھے۔ 846ء میں وہ روم بھی جا پہنچے۔ انہوں نے پروونس کے ساحل پر اپنا اڈہ بنا لیا اور الپائن کے دروں کے لیے خطرہ بن گئے۔ عربوں نے سسلی کے قزاقوں سے بھی زیادہ سمندر کو خطرناک بنا دیا اور روم و بازنطین کے مابین تجارت عملی طور پر ناممکن بنا دی۔ شمالی اٹلی میں قزاقوں نے اپنا ایک مضبوط اڈہ قائم کر لیا تھا۔ وہ جب چاہتے روم سے الپس Alps تک کھلے عام قزاقی کرتے۔ آخر کار پوپ پال X نے کئی سرداروں اور بادشاہوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور بازنطینی بیڑے کے ذریعہ دریا کے دہانے کو محفوظ بنا لیا۔ انہوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا اور عربوں کو چن چن کر قتل کیا۔ یورپ بھر کے سرداروں اور بادشاہوں کے لیے یہ اطمینان کا لمحہ تھا۔ شاید وہ Slavs اور مگیار یا وائیکنگز کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنے کا خواب دیکھتے ہوں۔ درحقیقت جرمنی کے شہنشاہ Otto نے 955ء میں لیک فیلڈ کی جنگ میں ان کا صفایا کیا۔ اب Magyar نے فیصلہ کیا کہ وہ پُر امن کسانوں اور گھوڑے پالنے والوں کی طرح اس زمین پر آباد ہو جائیں جسے آج ہم ہنگری کہتے ہیں۔

اسی لیے جب ہم زمانہ وسطیٰ کا خیال کرتے ہیں تو ہمارا دھیان قلعوں، میناروں، قلعہ بند شہروں اور دفاعی حصاروں کی طرف جاتا ہے۔ دفاعی حصار اور دیواریں حملہ آوروں سے بچنے کا واحد ذریعہ تھے۔ مگر جب وائیکنگ، مگیار اور سلاو کھیتی باڑی میں لگ گئے تو حملوں اور حملہ آوروں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا، گو نارمنوں نے تمام بحیرۂ روم میں اپنے حملے جاری رکھے، اگرچہ انگلستان میں فاتح ولیم کے بادشاہ بننے کے بعد وہ بھی پر امن ہو کر کہیں آباد ہو گئے۔

عرب بھی پسپا ہو رہے تھے۔ سن 1000ء تک (جب عیسائی سمجھتے تھے کہ دنیا ختم ہونے کو ہے) سپین میں ان کی طاقت ختم ہو رہی تھی۔ 1034ء بازنطینی بحری بیڑے نے شمالی افریقا میں مسلمانوں کے مضبوط علاقوں پر حملہ کیا۔ مگر عربوں کے اس زوال سے بازنطین کوئی خصوصی فائدہ نہ اٹھا سکا۔ جب بغداد کی اہمیت کم ہو گئی تو مشرق سے یورپ جانے والے تجارت کے راستے اسے بائی پاس کرنے لگے۔ چونکہ بازنطین بغداد جانے والے تجارتی راستہ پر تھا اس لیے اسے بھی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ ترکوں کی صورت میں ایک نئی طاقت بازنطین کی مشرقی سمت سے نمودار ہونے لگی۔ ترک تیزی کے ساتھ بحیرۂ روم کے وائیکنگ یا ہن بننے لگے۔ اس کی وجہ ہمیشہ کی طرح، بڑھتی ہوئی آبادی تھی۔ ترک ایک سخت جان خانہ بدوش قوم تھی جن کے پاس چند قصبے تھے۔ مگر دسویں صدی کے آخر میں انہوں نے اپنے ایرانی آقاؤں سے نجات حاصل کر لی اور سن ایک ہزار تک ترکستان پر 'فاتح اور طاقتور' (جیسا کہ عمر خیام کی رباعیات میں اس کا ذکر ہوا ہے) محمود حکومت کرنے لگا جس نے اپنی سلطنت ہندوستان تک وسیع کی۔ 1030ء میں محمود کی موت کے بعد سلجوق نامی ایک قبیلہ نے برسر اقتدار آنے کی کوشش کی۔ انہوں نے بغداد پر قبضہ کیا، یونانیوں نے آرمینیا چھینا اور سارے ایشیائے کوچک پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اور جو زمین کبھی ہیلن آف ٹرائے کا گھر تھی اب ترکی کہلانے لگی۔ بازنطینیوں کے ساتھ ترکوں کا تصادم ناگزیر تھا۔ چنانچہ 1071ء میں ترکوں نے بازنطینیوں کو آرمینیا کی جنگ میں فیصلہ کن شکست دی۔ بازنطینی بادشاہ رومانس اسی سال پہلے گرفتار ہوا پھر تاوان دے کر رہا ہوا، مگر بالآخر مارا گیا۔ ترک لیڈر الپ ارسلان بھی اگلے سال قتل ہو گیا۔ اس وقت تک یروشلم دمشق اور انٹیوک پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ بازنطینی بادشاہ مائیکل چہارم نے ترکوں کو اپنے دروازہ پر دیکھا تو روم میں پوپ سے مدد کے لیے فریاد کی۔ اس عرصہ میں سپین پر مسلمانوں نے ایک بار اور حملہ کر دیا جس سے عیسائیوں کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی کہ عرب میدان سے بھاگ رہے ہیں۔

یورپ میں یہ خبر دو افراد لے کر آئے۔ (کیونکہ ان دنوں خبروں کا نظام اتنا ناقص تھا کہ اس کے ذریعہ یہ خبر شاید دو برس میں یورپ پہنچتی) پہلا شخص خود پوپ اربن دوم تھا جبکہ دوسرا شخص ایک فرانسیسی تھا۔ جس نے 1095ء میں فرانس پہنچ کر کئی بشپوں کو کلیمنٹ میں ملنے کی دعوت دی اور ایک بڑے میدان میں جمع ایک بہت بڑے مجمع کو عیسائیوں پر ترکوں کے دل خراش مظالم کی داستانیں سنائیں۔ سچ یہ ہے کہ ان داستانوں میں کوئی صداقت نہیں تھی۔

ترکوں نے شاید ہی کبھی عیسائیوں کے ساتھ بدسلوکی کی ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ یروشلم کے زائرین کے لیے مشکلات پیدا ہو گئی تھیں ۔ جب پوپ نے صلیبی جنگ کا اعلان کیا تو لوگوں نے گھٹنوں پر گر کر جان و مال خدا کے راستہ میں وقف کرنے کا عہد کیا۔

جنگ کا پروپیگنڈہ کرنے والا دوسرا شخص ایک غلیظ اور جوئیں پڑا راہب پیٹر تھا۔ پستہ قد اور کالے بالوں والا شخص جو گدھے پر سوار گھومتا تھا مگر جس کی کرشماتی صلاحیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ صلاحیت جو لوگوں کو سیلاب کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے اور جو ہٹلر کا سب سے بڑا کمال تھا۔ زندگی کٹھن اور اذیت ناک تھی، اس لیے لوگ اسے بڑی دلچسپی کے ساتھ سننا چاہتے تھے۔ ہر روز سولہ گھنٹے ہل چلانے میں جتے رہنے کی نسبت ارض مقدس کی زیارت کرنا قابل فخر بات تھی۔

اس کے بعد جو ہوا وہ ایک المناک کھیل تھا۔ ان بے چارے کسانوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ انہیں کس سے لڑنا اور کیوں لڑنا ہے۔ بس ان کے دماغ میں ایک دھندلا سا خیال تھا کہ سارے اجنبی کافر ہوتے ہیں ۔ رائن لینڈ میں ہزاروں لوگ کسی کاؤنٹ ایمک کا ساتھ دینے جمع ہو گئے جس نے دعویٰ کیا تھا کہ ایک صبح وہ جاگا تو اس کے جسم پر صلیب کا نشان بنا ہوا تھا۔ کاؤنٹ ایمک نے سوچا کہ درندگی گھر سے شروع ہونی چاہیے۔ اس نے **Spier** کے یہودیوں پر حملہ کا حکم دیا۔ یہودیوں کو اپنی جان کے خوف یا عورتوں کے ریپ کی وجہ سے عیسائی بننا تھا۔ وہ **Worms** گئے اور دو دن یہودیوں کو قتل کرتے رہے۔ پھر **Rhine** جاتے ہوئے انہیں جو یہودی ملا، اسے قتل کر دیا اور سمجھ لیا کہ انہوں نے اپنے عیسائی ہونے کا فرض ادا کر دیا ہے۔ ہنگری میں دوسرے کروسیڈرز نے بادشاہ سے نیک چلنی کے وعدہ پر ملک سے گزرنے کی اجازت لی۔ شاید اس لیے کہ دیہات کو لوٹیں ۔ خوف پھیلانے کے لیے انہوں نے ایک ہنگرین لڑکے کو سولی پر چڑھا دیا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ اگر وہ اس کی قلمرو میں سے گزرنا چاہتے ہیں تو انہیں عارضی طور سے غیر مسلح ہونا ہوگا، جس پر ہنگری کی فوج نے ان کا قتل عام شروع کیا۔ خود ایمک کو ہنگری میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ کروسیڈر اس وقت تک فوج سے لڑتے اور قتل ہوتے رہے جب تک بھاگ نہیں گئے۔ جبکہ ایمک **Emich** فرار ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔

اگست **1096**ء میں راہب پیٹر کی فوج قسطنطنیہ پہنچ گئی۔ فوج نے راستہ میں ہنگری کے ایک قصبہ کو لوٹا اور اس کے چار ہزار مکینوں کو قتل کر دیا۔ شہنشاہ **Alexius** نے اس بے ہنگم

فوج کی حرکت پر مایوسی کا اظہار کیا اور سمجھ گیا کہ پوپ نے کروسیڈ کی دعوت دے کر غلطی کی ہے۔اس کے مہمانوں نے جب لوٹ مار شروع کی تو ایلکسی اُس نے انہیں جتنا جلدی ہو سکا جہاز کے ذریعہ باسفورس کے پار بھیج دیا۔ دشمن کے علاقہ میں جاتے ہی انہوں نے سوچا کہ یہ کافروں کو عیسائی بنانے کا وقت ہے۔ انہوں نے یونانی عیسائیوں کے کئی دیہات پر حملہ کیا اور لوگوں کو ٹارچر کرنے اور بچوں کو آگ پر بھوننے لگے۔ ایک اور گروپ نے ایک قلعہ پر قبضہ کر لیا اور اسے کھانے کے سامان سے بھرا ہوا دیکھ کر خوش ہو گئے۔ دیہات پر حملوں کے لیے یہ انہیں ایک آئیڈیل جگہ ملی ۔ ترکوں کے ایک فوجی دستہ نے انہیں محاصرہ میں لے لیا اور انہیں احساس دلایا کہ ان کے لیے پانی کا واحد ذریعہ قلعہ کے نیچے ایک چشمہ ہے۔ آخرکار کروسیڈرز کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے گھوڑے کا خون یا ایک دوسرے کا پیشاب پئیں ۔ دوسرے کروسیڈر جو یونانی عیسائیوں کا مذہب بدلوانے میں کامیاب ہو گئے اور جو اپنے ساتھیوں کا بدلہ لینے گئے تھے انہیں ایک وادی میں گھیر کر مار دیا گیا۔ بیس ہزار فوج میں سے صرف تین ہزار سپاہی لڑتے مرتے ایک ویران قلعہ میں پناہ گزین ہوئے اور محاصرہ کرنے والے ترکوں کا مقابلہ کرتے رہے جبکہ ایک یونانی مدد حاصل کرنے کے لیے قسطنطنیہ گیا۔ شہنشاہ نے مدد بھیج کر انہیں بچایا مگر جب وہ قسطنطنیہ آئے تو ان کے ہتھیار ان سے لے لیے گئے۔ پہلی صلیبی جنگ کا بالآخر یہ انجام ہوا۔

اب ظاہر تھا کہ جنگ کے لیے بہتر اور نسبتاً زیادہ منظم فوج کی ضرورت تھی۔ اگلے سال گاڈفرے کی سرکردگی میں ایک فوج قسطنطنیہ پہنچی۔ سختی، مصیبت اور خشک سالیوں کے مارے ہوئے کروسیڈر شہر کی شان وشوکت اور اس کی چکا چوند روشنیاں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اور سمجھے کہ اس کے مکین ضرور کمزور اور کرپٹ ہوں گے۔ اس سے پیشتر کہ وہ لوٹ مار شروع کریں ان کے لیڈروں نے انہیں سمجھا بجھا کر اس سے باز رکھا۔ بڑے اشتعال اور بحث و تمحیص کے بعد انہوں نے شہنشاہ سے وفاداری کی قسم کھائی جس کے بعد انہیں باسفورس کے پار بھیجا گیا۔ مسلسل جھڑپوں اور گرمی و پیاس سے ہلاکتوں کے بعد شام سے ہوتے ہوئے انہوں نے انٹیوک کا محاصرہ کیا اور سات ماہ کے بعد اس میں داخل ہو گئے۔ کروسیڈرز نے ہر اس ترک کو قتل کیا جو شہر میں موجود تھا۔ یہاں تک کہ ان کی تیس ہزار فوج صرف بارہ ہزار رہ گئی۔ اس کے بعد وہ یروشلم پہنچے۔ جولائی کی سخت گرمی میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کے میناروں سے لٹک کر وہ دیواروں پر پہنچے اور شہر میں داخل ہو کر قتل عام شروع کر دیا۔ ایسا قتل

عام جو سات روز جاری رہا، انہوں نے کسی کو معاف نہیں کیا۔ شہر کے یہودیوں نے اپنے سینی گاگ میں پناہ لی تو انہوں نے ہر سنی گاگ کو آگ لگا کر ان کے ساتھ تمام یہودیوں کو بھی جلا دیا۔ جیسا کہ ایک مورخ طنزاً کہتا ہے، ''افسوس کی بات ہے کہ عیسائیت کی اعلیٰ اخلاقیات کی تصدیق کے لیے ہفتہ سے بھی کم عرصہ میں ستر ہزار انسان قتل کیے گئے۔''

تاریخ کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس پہلی صلیبی جنگ میں کامیابی دراصل یورپ کی تباہی تھی۔ اس سے عیسائیوں میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ ارضِ مقدس کو 'پوپ سٹیٹ' بنایا جا سکتا ہے، جس کے نتیجہ میں اگلے دو سو برسوں کے اندر آٹھ مزید صلیبی جنگیں لڑی گئیں جو اکثر ذلت آمیز شکست پر ختم ہوئیں۔ پہلی صلیبی جنگ جیسی کامیابی کبھی نصیب نہ ہوئی مگر اس سے متاثر ہو کر مزید جنگیں لڑی گئیں۔ جب **1144**ء میں ترکوں نے ایڈیسا **Edessa** پر قبضہ کیا تو فرانس کے لوئیس ہفتم نے دوسری تباہ کن صلیبی جنگ لڑی جس میں عیسائیوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک بہادر عرب صلاح الدین نے جہاد کا اعلان کیا اور **1187**ء میں عیسائیوں سے یروشلم واپس لے لیا۔ تیسری صلیبی جنگ اسے حاصل کرنے میں ناکام ہوئی مگر انگلینڈ کے کنگ رچرڈ اوّل کو ایک ایسا معاہدہ کرنے میں کامیابی ہوئی جس کی رُو سے عیسائی مقدس **Sepulchre** جا سکتے تھے جس کی سہولت انہیں پہلی صلیبی جنگ سے پہلے کھلے عام حاصل تھی۔ تمام صلیبی جنگوں سے بڑھ کر افسوس ناک اور بے معنی **1212**ء میں بچوں کی صلیبی جنگ تھی۔ سٹیفن نامی ایک بارہ سالہ چرواہا فرانس کے کنگ فلپ کے پاس گیا اور اسے ایک خط دیا جس کے متعلق اس کا دعویٰ تھا کہ حضرت عیسیٰ کا لکھا ہوا ہے جو اس وقت میرے پاس آئے جب میں اپنی بھیڑیں چرا رہا تھا۔ فلپ کو شک گزرا (کیونکہ خط جدید فرانسیسی میں لکھا ہوا تھا) کہ لڑکا جھوٹا ہے۔ بہرحال فلپ نے اسے دفع کیا۔ مگر سٹیفن ہمت نہیں ہارا۔ وہ کہتا پھرا کہ سمندر سوکھ جائے گا اور بچے خدا کی مدد سے عرب فوج کو شکست دیں گے۔ بارہ برس سے کم عمر کے تیس ہزار بچے **Vendome** میں جمع ہوئے اور سٹیفن کے خوش رنگ چھکڑے کے پیچھے فاتحانہ انداز سے مارسلز روانہ ہوئے۔ گرمی بہت تھی، بعض تو راستہ میں پیاس سے تڑپ کر مر گئے۔ جو بخیریت پہنچے وہ سمندر کو سوکھتا ہوا دیکھنے کے لیے اس کی طرف دوڑے مگر جب کچھ نہ ہوا تو ان کا اعتماد سٹیفن سے اٹھ گیا اور وہ افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے گھروں کو واپس چلے گئے۔ بہت سے کسی معجزہ کی امید پر وہیں موجود رہے۔ دو دنوں کے بعد دو سوداگر آئے اور انہیں فلسطین لے جانے کے لیے جہازوں میں سوار کیا۔ سات جہاز بچوں کو لے کر

روانہ ہوئے مگر بچے ہمیشہ کے لیے لا پتہ ہو گئے۔ اٹھارہ سال بعد ان کے ساتھ جانے والے ایک راہب نے بتایا کہ ان میں سے دو جہاز سمندری طوفان میں تباہ ہو گئے، جبکہ بقیہ پانچ جہازوں میں سوار بچے عرب اور فرانسیسی بردہ فروشوں کی ملی بھگت سے سکندریہ اور بغداد کی غلام منڈیوں میں بک گئے۔ جرمن لڑکیوں لڑکوں پر مشتمل ایک کروسیڈ نسبتاً خوش نصیب تھا۔ اس کی قیادت ایک لڑکا نکولس کر رہا تھا۔ بیس ہزار میں سے پندرہ ہزار بچے اٹلی جاتے ہوئے مر گئے کیونکہ سمندر یخ بستہ تھا، باقیوں کو پوپ نے گھر واپس جانے کی ہدایت کی۔ واپسی پر زندہ بچنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ خود نکولس لا پتہ ہونے والوں میں سے تھا۔ جب وہ واپس آئے تو ان کے غضبناک والدین نے نکولس کے باپ کی گرفتاری کا مطالبہ کیا جسے گرفتار کر کے پھانسی کی سزا دی گئی۔ والدین کی اس مجرمانہ حماقت کی وجہ سے کہ انہوں نے بچوں کو جانے کی اجازت دی، اس کہانی نے انسان کی مجرمانہ تاریخ میں جگہ پائی ہے۔

بچوں کے کروسیڈ نے ایک اور کروسیڈ کی بنیاد رکھی۔ ''بچے بھی ہمیں شرم دلاتے ہیں ''، پوپ نے اعلان کیا۔ چنانچہ ایک بڑی فوج مصر روانہ ہوئی۔ اس نے یروشلم کی سپردگی سمیت عربوں کی شاندار شرائط رد کر دیں۔ چونکہ عیسائی دولت بھی حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے سلطان کو لڑنے پر مجبور کیا۔ سلطان کی فوج ان کی فوج سے طاقتور ثابت ہوئی۔ اس لیے عیسائی سلطان کی شرائط پر یورپ واپس چلے گئے۔ چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں صلیبی جنگ بھی اسی طرح ناکام ہوئی۔ صلیبی (کروسیڈر) ارض مقدس تو کیا فتح کرتے انہوں نے ڈینیوب کی سرزمین پر ترکوں کے قدم جما دیئے۔

عرب ایک اور طرح سے بھی فتح یاب ہوئے۔ یہ جاہل کسان اور اتنے ہی جاہل امرا جو 1096ء میں اپنے گھروں سے روانہ ہوئے تھے جب تک وہ کافروں کے خلاف نہیں لڑے انہوں نے کبھی اپنے دیہات کی دیواروں سے باہر بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر اب وہ جان رہے تھے کہ مسلمان بھی اتنے ہی باعزت اور ملنسار ہیں جتنے کہ اچھے عیسائی ہوا کرتے ہیں۔ بلکہ بہتوں سے زیادہ دوست اور خوش اطوار ہیں۔ دیہات کے ہزاروں بدچلن گنواروں کے لیے یہ صلیبی ایک طرح کی یونیورسٹی تھے۔ ان کا خاتمہ ہوتے ہی یورپ زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔

قاتل اور فاتح

ستمبر 1298ء میں نویں صلیبی جنگ ختم ہونے کے بعد وینس اور Genoa کے دو مخالف تجارتی بیڑوں میں جنگ ہوئی۔ اس کا انجام وینس کی ذلت آمیز شکست اور اس کے فلیٹ (جنگی بیڑے) کے کپتان کی خودکشی پر ہوا، جس کا فلیٹ گرفتار کر لیا گیا اور جو بنچ سے سر ٹکرا کر مر گیا تھا۔ پکڑے جانے والے ملاحوں میں مارکو پولو نامی ایک شخص تھا جسے جنوا کی جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہاں اس کی ملاقات رستسیانو سے ہوئی جو جیل کی کوٹھڑی میں اس کا ساتھی تھا۔ رستسیانو وہاں کسی پہلی لڑائی کے زمانہ سے قید تھا۔ رستسیانو لکھاری تھا اور اس کا پسندیدہ موضوع رومانس تھا۔ جب مارکو پولو نے اسے چین، قبلائی خان کی سرزمین کے سفر کی کہانیاں سنائیں تو اس نے مارکو پولو سے انہیں لکھنے کی التجا کی۔ چنانچہ مارکو پولو نے اپنے سفرنامہ کے نوٹس notes منگوائے اور رستسیانو کی مدد سے اپنے سفر کی داستان لکھی۔ جیل سے جاتے ہوئے وہ سکرپٹ اپنے ساتھ لے گیا۔ ہر چند کہ تصویر اچھی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور کتاب ہاتھوں سے نقل کی گئی تھی، پھر بھی وہ اٹلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑھی جا رہی تھی۔

افسوس کی بات ہے کہ اسے تعلیمی مقاصد کے لیے نہیں پڑھا گیا۔ مارکو پولو کے سفر پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ اس کے ہمعصروں نے کتاب کو ایک ناول سمجھا اور وہ مارکو پولو کو طنزاً ''مارکو ملین'' کہلانے لگے کیونکہ اس کی کتاب میں بے شمار دولت اور ناقابل یقین فاصلوں کے حوالے دیئے گئے تھے۔ پچیس سال بعد بستر مرگ پر پڑے ہوئے مارکو پولو سے اس کے دوستوں نے التجا کی کہ وہ اب بھی اپنے جھوٹ کا اعتراف کر لے۔ ''میں نے جو دیکھا اس کا آدھا بھی نہیں بتایا،'' مارکو نے بگڑ کر کہا۔ اسی لیے اس کے بعد کھیل تماشوں میں کوئی شخص مسخرا

بن کر مارکو کی نقل اتارتا ہوا بے تحاشا جھوٹ بولتا۔ غرضیکہ مارکو کا سچ پہچاننے میں انسان کو کئی صدیاں لگ گئیں۔

مارکو کی تقریباً ایک ناقابل یقین کہانی کا تعلق ایک گمراہ کن شخصیت، پہاڑ کے بوڑھے سے ہے۔ اس کا نام علاؤالدین تھا اور وہ ایران میں رہتا تھا۔ اپنے لوگوں میں وہ پیغمبر مشہور تھا۔ وہ ایک وادی کے سرے پر ایک قلعہ میں رہتا تھا۔ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ اس وادی کو جنت نظیر بنا سکے۔ اس کے باغ میں کئی محل اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت تھے۔ اس میں شراب، دودھ اور پانی کی نہریں تھیں۔ اس کے پویلین جوان حسین رقاصاؤں اور تماشائیوں کے لیے وقف تھے۔

اگر وہ بوڑھا شخص کسی کو قتل کرنا چاہتا تو اپنے کسی مرید کو جنت انعام دینے کے وعدہ پر اسے قتل کرنے کا حکم دیتا۔ مارکو پولو نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ایسا کیوں کرتا تھا۔ حکم کی تعمیل میں مرید اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا کیونکہ وہ تو پہلے ہی جنت کا مزا چکھ چکا ہوتا تھا۔ عیار بوڑھا تمام زیر تربیت قاتلوں کو نشہ دے کر بے ہوش کر دیتا اور انہیں باغ میں لے جاتا جہاں ہوش میں آتے ہی وہ اپنے آپ کو حسین لڑکیوں کے درمیان پاتے جو انہیں پھل، شراب اور اپنا آپ پیش کرتیں۔ چند دنوں بعد کسی نوجوان کو پھر بے ہوش کر کے قلعہ میں پہنچا دیا جاتا۔ اب وہ جنت کے لیے بے تاب ہو کر اپنی جان خوشی سے قربان کر دیتا۔ مستقبل کے ان قاتلوں کو حشیشین کہا جاتا۔ اس لفظ سے علاؤالدین کی اصلیت کا پتہ چلتا ہے۔ قلعہ کے ہونے میں کوئی شک نہیں، اسے الموت یعنی 'شاہین کی آنکھ' کہتے تھے اور ایران کے کوہ البرز پر واقع تھا۔ قلعہ کے نیچے وادی میں ایک باغ تھا۔ کیونکہ البرز کی ایک چھوٹی سی دراڑ میں سے ایک سرسبز جگہ اور پانی کا ایک چشمہ نظر آتا تھا۔ اس بوڑھے شخص کا نام حسن بن صباح تھا اور اسی کے ذریعے لفظ **assasin** یورپین لغت میں شامل ہوا تھا۔ یہ حشیشین سے لیا گیا ہے۔ حشیش، جسے حسن بن صباح کے مرید قتل کرنے اور قتل ہونے کے لیے پیتے تھے۔

حسن بن صباح جدید تہران سے قریب ایک قصبہ رے کے اندر تقریباً 1030ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا تعلق ایک شیعہ گھرانے سے تھا اور وہ مذہب میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ وہ اسماعیلیوں میں شامل ہو گیا جو شیعوں کے ساتھ اپنا رشتہ توڑ چکے تھے۔

عباسی قدامت پسند مسلمان تھے اور انہوں نے شیعہ خلیفہ کی حمایت کے وعدے پر مقبولیت حاصل کی تھی۔ مگر اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ سن ایک ہزار تک شیعہ اور سنی، قدامت پسند

مسلمان، آپس میں سخت مخالف نہیں تھے۔ حقیقی مخالفت اسماعیلیوں کی جانب سے آئی جنہوں نے اپنا الگ سلسلہ فاطمیہ قائم کرلیا، جس کا خلیفہ بھی ان کا اپنا تھا۔ حسن بن صباح کی پیدائش تک لگتا تھا کہ اسماعیلی مسلمانوں کی پاور گیم میں جیت جائیں گے مگر یہ سلجوقی ترکوں کے منظر پر آنے اور عباسیوں کی حمایت کرنے سے پہلے کی بات تھی۔

حسن تقریباً تیس برس کا تھا جب اس نے اطاعت کا حلف اٹھایا۔ چار برس بعد اسے اسماعیلی اصولوں کی تبلیغ کے لیے گھر چھوڑنا پڑا۔ اسی عرصہ میں وہ نوتعمیر اسماعیلی دارالحکومت قاہرہ جا پہنچا۔ وہاں وہ خلیفہ کے بڑے بیٹے اور ولی عہد نزار کا حامی بن گیا۔ سیاسی اور مذہبی سازشوں کی وجہ سے وہ جلد ہی وہاں سے نکال دیا گیا۔ اس کا ایک سوانح نگار کہتا ہے کہ اسے سزائے موت دی گئی۔ مگر اس کے قتل سے ذرا پہلے شہر کا ایک مینار گر گیا، جسے بدشگونی سمجھ کر اسے مارنے کے بجائے جلاوطن کر دیا گیا۔ جس جہاز کے ذریعے اسے نکالا گیا وہ سخت طوفان میں گھر گیا۔ حسن عرشہ پر پُرسکون کھڑا رہا اور اعلان کیا کہ اپنا مشن پورا کرنے سے پہلے وہ نہیں مرسکتا۔ جہاز تو شام جا کر تباہ ہو گیا مگر حسن محفوظ رہا۔ آخرکار 1081ء میں وہ ایران واپس آیا۔ اس وقت تقریباً چالیس برس کی عمر میں اپنے تباہ حال چہرے، سلگتی آنکھوں اور پُراعتماد لہجے کی وجہ سے وہ متاثر کرتا تھا۔ اگلے نو برس وہ قریہ قریہ گھوم کر اپنے عقائد کی تبلیغ کرتا رہا اور اس نے اپنے ماننے والوں کا ایک بڑھتا ہوا ہجوم اکٹھا کرلیا۔ 1090ء میں الموت آیا اور اعلان کیا کہ وہ اسی قلعہ کی تلاش میں تھا۔ اگرچہ سیاسی سازشوں کی وجہ سے نزار فاطمی خلیفہ نہ بن سکا، جیسا کہ امکان تھا۔ مگر حسن کو ایک مضبوط مرکز کی آرزو تھی جہاں سے وہ اپنی مہم چلا سکے۔

اسے اپنے مقصد میں کامیابی بڑی آسانی کے ساتھ ہوئی۔ قلعہ کا مالک ایک قدامت پسند مسلمان تھا۔ حسن کے وعظوں سے گردونواح کے دیہات اس کے ہم نوا بن گئے۔ اس کے مبلغوں نے قلعہ کے ملازموں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ حسن بھیس بدل کر خفیہ طور سے 'شاہین کی آنکھ' کے اندر پہنچ گیا۔ ایک صبح قلعہ کے مالک کو بیدار کرکے بتا دیا گیا کہ قلعہ اب اس کی ملکیت نہیں۔ اسے معقول معاوضہ دے کر ادب کے ساتھ قلعہ سے رخصت کر دیا گیا۔

حسن ایک پُراسرار اور سخت گیر سربراہ کی طرح حکومت کرتا رہا۔ اس کے مرید شاید ہی اسے کبھی دیکھ پاتے تھے۔ اس کا ایک بیٹا شراب پیتے ہوئے پکڑا گیا تو اسے قتل کر دیا گیا۔

وہ کفایت شعار تھا، کتابیں لکھتا رہا اور بغداد میں عباسیوں کا تختہ الٹنے کی سازشیں کرتا رہا۔ پہلا مقصد سلجوقی ترکوں کی اہمیت کم کرنا تھا، جو ان کے حامی اور اب ایران کے حکمران تھے۔ آہستہ آہستہ حسن نے اپنی مذہبی سلطنت کو وسعت دی۔ وہ اتنا ہی اچھا جنرل تھا جتنا اچھا کہ پیغمبر تھا۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار ترکوں کے خلاف ایرانیوں کی نفرت تھی۔ اس کے مبلغوں نے نواحی دیہات پر اپنا اثر قائم کر لیا۔ اس نے جنوب مشرق میں کوہستان تک اپنا دائرہ اثر پھیلا لیا تھا اور ایک بغاوت میں ترکوں کا تختہ الٹ دیا۔ ترکوں نے الموت میں اسے گھیر لیا۔ مگر الموت ناقابل تسخیر تھا، جیسا کہ وہ جانتا تھا۔

ایک جنرل کی حیثیت سے اس کا بڑا مسئلہ ترکوں کی نسبت تعداد میں اس کے فدائیوں کی قلت تھی۔ 1092ء میں اس کا حل اسے یہ سوجھا کہ اپنے فدائیوں کی مکمل اطاعت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے دشمنوں کو ایک ایک کر کے مارے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سلجوقیوں نے اپنا اقتدار اس وقت قائم کیا جب انہوں نے 1071ء میں بازنطینیوں کو مینز یکرٹ کی جنگ میں شکست دی۔ مگر ان کا لیڈر الپ ارسلان ایک سال بعد فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا ملک شاہ تخت نشین ہوا۔ ملک کا وزیراعظم نظام الملک اسکول میں حسن بن صباح کے ساتھ پڑھا تھا۔ شاعر اور ریاضی دان عمر خیام بھی سکول میں ان دونوں کا ساتھی تھا۔ نظام نے عمر کو کیلنڈر پر نظر ثانی کرنے کا کام دیا۔ عرب کرانیکل کے مطابق جب 1073ء میں نظام وزیر بنا تو حسن اور عمر ملازمت کے لیے اس کے پاس آئے تو حسن کو دربار میں کوئی عہدہ دے دیا گیا، مگر اقتدار کے لیے اس کی ہوس جلد ظاہر ہو گئی جس پر نظام نے اسے ملازمت سے الگ کر دیا۔ ایسا ہو سکتا ہے کیونکہ 1073ء میں حسن ابھی قاہرہ نہیں گیا تھا۔

بیس برس بعد نظام، حسن کا نہایت خطرناک دشمن اور اس کی موت کا خواہشمند تھا۔ 1092ء کے رمضان میں نظام دربار کا کام ختم کر کے اپنے گھر جا رہا تھا کہ اچانک ایک صوفی، ایک مقدس آدمی آگے بڑھا اور ایک خنجر کپڑوں سے نکال کر نظام کے دل کے اندر اتار دیا۔ چند لمحوں بعد نظام کے محافظوں نے اسے بھی قتل کر دیا۔ جب حسن کو خبر ملی تو وہ خوشی سے بولا کہ اس شیطان کا قتل مسرت و عیش کی ابتدا ہے۔

عین ممکن ہے کہ جب حسن نے نظام کے قتل کا منصوبہ بنایا ہو تو ایک غدار کی ہلاکت کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہ ہو۔ مگر اس کے قتل کے بعد اسے پتہ چلا کہ اپنی طاقت بڑھانے

کے لیے اس کے پاس ایک بے خطا ذریعہ موجود ہے۔ اس معاملہ میں مارکو پولو غلطی پر تھا کہ قتل کے لیے اسے اپنے مریدوں کو بہشت کی جھلک دکھانی ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے پیغمبر پر اپنی جانیں نچھاور کرنے کے لیے خوشی سے تیار تھے۔

حسن کے فدائی، قاتل یا اسماعیلی پہلے دہشت پسند تھے۔ اپنے دشمنوں کے لیے وہ جرائم پیشہ اور قاتل تھے جو سماج کو الٹ دینا چاہتے تھے جبکہ اپنے دوستوں کی نظر میں وہ ایک مختصر مگر اعلیٰ تربیت یافتہ فوج تھے جو ظلم کے خلاف صرف اس واحد ہتھیار سے لڑتے تھے جو انہیں دستیاب تھا۔ آنے والے دنوں میں ان کے ہاتھوں مارے جانے والوں کی تعداد اور بڑھ گئی۔ ہر وہ شخص ان کی ہٹ لسٹ پر ہوتا جو ان کے عقائد کے خلاف اعلانیہ کوئی بات کہتا۔ چاہے وہ کوئی جنرل، گورنر، شہزادہ یا مذہبی مخالف ہو۔ ایک شخص کو انہوں نے اس وقت چھرا گھونپ دیا جب وہ مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے رکوع کی حالت میں تھا اور اپنے محافظوں میں گھرا ہوا تھا۔ حسن کا ایک بڑا مخالف گہری نیند سے جاگا تو اس نے اپنے سر کے قریب ایک خنجر زمین میں گڑا ہوا پایا اور ایک تحریر کہ ''یہ خنجر اتنی آسانی کے ساتھ تمہارے دل میں بھی اتر سکتا تھا۔'' اس کے بعد اس مخالف نے حسن کے ساتھ اپنے تعلقات درست کر لیے۔

ان کامیابیوں سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حسن ایران کا والی یا شاید قاہرہ میں نیا خلیفہ بن گیا ہوگا۔ اب جو بھی ہو رہا تھا اس کے خلاف ہو رہا تھا۔ جب خلیفہ کا انتقال ہوا تو نزار کا چھوٹا بھائی اور حسن کا اتحادی تخت نشین ہوا۔ نزار اور اس کے باہمی جھگڑوں میں بہت لوگ مارے گئے۔ اسماعیلی نئے ترک سلطان کی فوجوں میں گھس آئے۔ محض اپنے دفاع کے لیے سلطان نے نیم دلی اور شک کی حالت میں حسن سے ایک اتحاد قائم کر لیا تھا۔ مگر اب اس نے اسماعیلیوں کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ جب حسن کے ایک اہم مرکز پر قبضہ کر کے اسماعیلی لیڈر کی کھال اس کے جیتے جی کھینچی گئی تو یہ کھلا اعلان جنگ تھا۔ ایک ایسی جنگ جس میں حسن کو بہرحال ہارنا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری تیس برس میں اس نے اپنی سلطنت کو گرتے ہوئے دیکھا۔ قتل اور ہلاکت کی کارروائیاں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ شام اور مصر بھی اس کی دسترس سے محفوظ نہ رہے۔ مگر اس کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ دراصل وہ ساری عرب دنیا سے لڑ رہا تھا۔ قتل کی آخری وارداتوں سے اس کی ناکامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ **1121**ء میں حسن آخرکار الفضل سے اپنا انتقام لینے میں کامیاب ہو گیا۔ الفضل وہی وزیر تھا جس نے نزار کے خلیفہ بننے کے امکانات کو ختم کیا تھا۔ نیا خلیفہ اس کے قتل کی خبر سن کر خوش ہوا کیونکہ وہ اس کے

ناقابل برداشت طریقوں سے تنگ آ گیا تھا۔ اس نے حسن کو خط کے ذریعہ اس کے ساتھ اپنا اتحاد یاد دلایا۔ حسن جیسے خونخوار شخص کو ایک خط لکھنا مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ پھر بھی حسن پُرسکون رہا۔ ایک طرح سے یہ اس کا اعترافِ شکست تھا۔ مگر اتحاد کی تجدید کبھی نہ ہوئی۔ نئے وزیر نے سلطان کو قائل کر لیا کہ حسن کی ہٹ لسٹ پر اگلا نام اس کا ہے۔ مگر یہ بات غلط تھی حسن کو کیا پڑی تھی کہ وہ اس شخص کو قتل کرے جو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ مگر اس سے خلیفہ کا ارادہ بدل گیا۔ حسن تین سال بعد 1124ء میں فوت ہوا۔ اس کی عمر اس وقت نوے سال تھی۔

حسن کی سب سے بڑی غلطی نظام الملک کا قتل تھا۔ اس سے اس کی زندگی کا رخ بدلا تھا۔ کیونکہ جو شخص چھپ کر وار کرتا ہے اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ زہریلے سانپ کی طرح اس سے خوف آتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دہشت گردی بذاتِ خود اپنا زوال ہے۔ سانپوں میں زہر اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ان کا کوئی دفاع نہیں ہوتا۔ جس نے کبھی سانپ رکھے ہوں جانتا ہے کہ سانپ دوست اور بے ضرر مخلوق ہے۔ وہ پہلے وار نہیں کرتا۔ وہ اس وقت وار کرتا ہے جب اس پر کسی کا پاؤں آئے یا اسے ڈرایا جائے۔ اس لیے انسان سانپوں کا خوف نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جب کسی پر 'خطرناک' اور 'ناقابل اعتماد' کا لیبل لگ جائے تو وہ اپنا مقصد جائز ذریعہ سے حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر وہ سیاستدان ہے تو اپنی ناکامی کا خود ذمہ دار ہے۔ قاتلوں کی کہانی کا سبق طاقت کیسے حاصل نہ کرنا ہے۔

مگر قاتلوں کی کہانی کا سبق 'مقاصد اور ذرائع' کے سوال سے آگے جاتا ہے اور ہمیں موقع دیتا ہے کہ کریمنلٹی کی بنیادی نوعیت سمجھ سکیں۔ حسن ہر لحاظ سے 'رائٹ مین' تھا۔ اس کے مذہبی خلوص پر شک نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی بے راہ رَوانا نیت سے مذہب کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اسے ذاتی طور سے اپنے سچا ہونے کا یقین تھا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ اس یقین کا نتیجہ (یا خمیازہ؟) تھا۔ اس کے مخالف غلطی پر تھے اور مارے جانے کے قابل تھے۔ یہ بات بحث طلب ہے کہ نزار یا اس کے چھوٹے بھائی کے خلیفہ بننے سے کوئی معمولی سا فرق بھی پڑتا۔ یا اگر کوئی شخص اپنے بت کو یہوواہ، خدا یا اہورامزدا سمجھتا تو اس سے بھی کیا فرق پڑتا۔ مگر یہ بھی کوئی ایشو نہیں۔ ایشو یہ ہے کہ انسان ایسی آزادی حاصل کرنے کا اہل ہے جو اسے اس کی روزمرہ کی مصروفیتوں اور پابندیوں سے آزاد کر دے اور جو ان سے ماورا ہو۔ اور یہ کہ صوفی، پیغمبر شاعر اور آرٹسٹ، سائنسدان اور فلسفی کسی نہ کسی حد تک تمام اسی کی تلاش میں رہتے ہیں۔

اس آزادی، اس ماورائیت کی سب سے بڑی دشمن انا اور اس کے گھٹیا مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ جس میں انا نہ ہو وہ شخص احمق لگتا ہے۔ انا کا دوسرا نام شخصیت ہے اور شخصیت آرٹسٹوں، ولیوں اور فلسفیوں کا مؤثر حربہ ہے۔ شخصیت کے بغیر سینٹ فرانسس، بیتھوون یا افلاطون، دنیا کو بہت کم متاثر کرتے۔ مگر شخصیت خطرناک ہے، کہ ہر وقت سب سے اوپر جانا چاہتی ہے اور ہر وقت ہم اس بیزاری اور مایوسی کا عذاب سہتے ہیں جو شخصیت نے ہم پر مسلط کی ہے۔

اور یہی تاریخ کی بنیادی تھیم، اس کا مستقل پیٹرن ہے۔ تہذیب انسان کی مذہبی لگن سے پیدا ہوئی ہے۔ کیونکہ پہلے شہر عبادت گاہوں کے گرد آباد ہوئے۔ انسانی تاریخ میں مذہب سب سے غالب تھیم رہی ہے۔ اگر چہ ہر اہم مذہبی تحریک نے اپنے اراکین کے باہمی جھگڑوں کی وجہ سے اپنی نوعیت بدلی ہے۔ شہروں کے وہ پرانے مکین کھیتی باڑی میں مگن اور اپنے خداؤں کی پرستش کرتے ہوئے کیوں امن اور خوشحالی سے نہیں رہ سکے؟ کیونکہ تمام مویشیوں کی طرح ان کا مسئلہ بھی تحفظ تھا۔ جلد یا بدیر کسی معمولی سی بات پر ان میں کوئی جھگڑا پیدا ہو جاتا تو تمام شہری چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے، گویا کہ ان سب کی توہین ہوئی اور وہ اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ رابلے اس کا مذاق اڑاتا ہے، جب ایک چرواہے اور بیکر میں کیک کے جھگڑے پر ایک جنگ چھڑ گئی۔ ایسے موقع پر ہمدردی کا جذبہ اور رابطہ کی انسانی اہلیت عذاب جان بن جاتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص جھگڑے کی وجہ بننے والی ذلت کو براہِ راست اپنی ذلت محسوس کرتا ہے۔ ایک زخم خوردہ انانیت کا مداوا بہت مشکل ہوتا ہے۔ نئی نفرت پرانی نفرت میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے اور ہر فریق طے کر لیتا ہے کہ دوسرے فریق کی انتہائی ذلت ہی سے اس کی عزت وابستہ ہے۔

قاتلوں کی مثال بے شک ایک خصوصیت لیے ہوئے ہے۔ مگر عیسائیت کی تاریخ میں ایسی ہزار مثالیں ہیں۔ جونہی پیپاں نے پوپ کو طاقت کا مرکز فراہم کر کے اسے پہلی پاپائی سٹیٹ کا تحفہ نذر کیا۔ پوپ کسی بھی شہنشاہ کی طرح تشدد پر آمادہ ہو گیا۔ اڑھائی سو برس بعد جرمنی کا شہنشاہ Otto مقدس رومی سلطنت قائم کرنے نکلا تو پوپ کے ساتھ براہِ راست اس کا تصادم ہوا، جس میں پوپ کو شکست ہوئی اور Otto نے اسے برطرف کر کے اس کی جگہ اپنا آدمی مقرر کیا۔ اس کے جانشین اور پوپ کے مابین اقتدار کی جنگ جاری رہی۔ سو سال بعد گریگری نامی ایک پوپ تخت نشین ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ پوپ کو نہ صرف عیسائیوں کا روحانی

بلکہ دنیاوی رہنما بھی ہونا چاہیے اور اسے شہنشاہ کے تقرر کا اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ بجائے اس کے شہنشاہ کسی کو پوپ مقرر کرے وہ کسی بھی کیتھولک ملک کے قوانین میں مداخلت کر سکے اور اس کا حکم ہر بادشاہ یا شہنشاہ کا حکم منسوخ کر سکے۔ اس نے تمام یورپی درباروں میں قاصد بھیج کر انہیں اس نئے قانون سے آگاہ کیا۔ جرمنی کا رومی شہنشاہ ہنری ششم اس اطلاع پر سخت خفا ہوا۔ اس نے Worms میں جرمنی کے تمام بشپ بلائے اور گریگری کو اطلاع دی کہ اسے برطرف کر دیا گیا ہے۔ جس پر گریگری نے اس کے خلاف زمانہ وسطیٰ (صلیبی جنگوں سے پہلے) کا نہایت مؤثر حربہ 'مکمل بائیکاٹ' استعمال کیا، جس کے ذریعہ چرچ، ملزم کے ساتھ ہر طرح کا تعلق ختم کرنے کا حکم دیتا تھا اور یہ اس دور کی بدترین سزا تھی جس کا اختیار چرچ کو حاصل تھا۔ لوگوں کے ذہنی عجز کا یہ عالم تھا کہ ہر عیسائی کو یقین تھا کہ سزا یافتہ ہمیشہ جہنم میں جلایا جائے گا اور اسے ہر طرح کے عذاب کا سامنا ہوگا اور یہ کہ گنہگار کو گناہ کے بوجھ سے صرف چرچ نجات دلا سکے گا اور وہی اسے جنت میں بھیجے گا۔ یہ محض مذہبی، فلسفیانہ قیاس آرائی نہیں تھی بلکہ پانی کے گیلا ہونے کی طرح ایک سیدھی سادی حقیقت تھی اور چونکہ پادری لوگوں کو ہمیشہ جہنم کے گوناگوں عذابوں سے ڈراتے رہتے تھے اس لیے لوگ جہنم کے عذاب سے بُری طرح خوفزدہ تھے اور پادریوں کے شکرگزار تھے کہ وہ انہیں اس عذاب سے بچا لیں گے۔ ایک ایسے بادشاہ کے ماتحت رہنا جس کا بائیکاٹ کیا گیا ہو شیطان کے زیرِ حکومت زندگی گزارنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ امرا نے ہنری کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ ہنری کے لیے اب ایک ہی صورت تھی کہ وہ پوپ سے معافی چاہے۔ گریگری Parma کے قریب کینوسا کے ایک قلعہ میں جنوری گزار رہا تھا۔ ہنری معافی کا طلب گار ہو کر ننگے پاؤں ایک زائر کی صورت وہاں گیا۔ پوپ نے تین دن اسے برف میں انتظار کرایا، تب کہیں اسے اندر آنے دیا اور اس کی جان چھوڑی۔ اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے پوپ نے ایک ڈیوک کی حمایت کی جس نے ہنری سے بغاوت کی تھی۔ یہ حد سے بڑھنے والی بات تھی۔ ہنری نے جنگ میں ڈیوک کو قتل کر دیا اور اپنی فوج کے ساتھ روم کی طرف مارچ کیا۔ گریگری بھاگ کر Salerno چلا گیا جہاں جلاوطنی میں اس کی موت ہوئی۔ ہنری نے اس کی جگہ اپنا پسندیدہ پوپ مقرر کیا۔

اس تمام تشدد میں کسی کا بھلا نہ ہوا۔ جب ہنری روم کی طرف بڑھا تو گریگری نے اپنے ایک نارمن حامی جیسکا سے مدد طلب کی جو سسلی کو عربوں سے آزاد کرنے میں لگا ہوا تھا۔

جیسکا بہت بڑی فوج لے کر روانہ ہوا۔ جب رومیوں نے ایک پوپ مخالف فساد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تو روم ایک بار اور لٹا۔(1084ء) اس بار یہ بھیانک کام جیسکا کی فوج نے کیا، وہی معمول کا خون خرابہ، ریپ اور لوٹ مار، شہر کا ایک بڑا حصہ جلا کر خاک کر دیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں گریگری کے خلاف اتنی نفرت پیدا ہوئی کہ وہ بزور جلاوطن کیا گیا۔

اس فتنہ وفساد کی بازگشت ایک صدی جاری رہی۔ ہر پوپ کو ہوش آ گیا کہ اس کی روحانی طاقت دینی کاموں تک محدود رہنی چاہیے۔ جرمنی کے شہنشاہ ٹھیک کہتے تھے کہ دینی معاملات ان کا میدان ہے۔ ہوئنسٹافن خاندان کے دَور میں حالات اور بھی بگڑ گئے۔ فریڈرک اوّل (باربروسا) نے اٹلی کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی کوشش کی اور شاید کامیاب بھی ہو جاتا اگر تیسری صلیبی جنگ میں انگلستان کے کنگ رچرڈ کے ساتھ مارا نہ جاتا۔ اس کے پوتے فریڈرک دوم نے (دنیا کا عجوبہ کہلانے والا، کیونکہ وہ اپنے زمانہ میں دنیا کے سب سے بڑے اسکالروں میں سے تھا) پوپ کو طاقت سے محروم کرنے کی بڑی کوشش کی، اس کوشش میں دو دفعہ اس کا مکمل بائیکاٹ ہوا اور کرائسٹ دشمن کہلایا۔ مگر 1250ء میں بخار سے مر گیا۔ اس کا بیٹا Conrad ان دنوں فوت ہوا جب وہ اٹلی پر حملہ کر رہا تھا۔ اب پوپ نے سسلی فرانس کے چارلس انجو کے حوالے کیا۔ سسلی والے بادشاہ کو کچھ ایسا پسند نہیں کرتے تھے مگر فرانسیسیوں کو اور بھی زیادہ ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے سٹافر کے ایک جانشین کی حمایت میں بغاوت کر دی۔ چارلس نے جنگ جیت لی۔ Conrad کے ایک پوتے نے اپنی وراثت واپس لینے کی کوشش کی مگر اسے بھی شکست ہوئی۔ اسے بازار میں لا کر لوگوں کے سامنے اس کا سر کاٹا گیا۔ اس حرکت سے پورا یورپ کانپ گیا اور سسلی میں باغی سختی کے ساتھ کچل دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے انہیں فرانسیسیوں سے ہمیشہ کے لیے نفرت ہوگئی۔ مگر بدترین حالات 1282ء میں ایسٹر کے موقع پر سسلی میں رونما ہوئے۔ وہاں لوگ بغاوت پر تیار تھے۔ بادشاہ کے آدمی جزیرے کا دورہ کر کے اناج کے تمام ذخیروں پر قبضہ کر رہے تھے تا کہ قسطنطنیہ پر حملے کے دوران کام آئے۔ 'ہولی سپرٹ' کے چرچ کے اندر عبادت میں شامل ہونے کے لیے لوگ چرچ کے سامنے جمع تھے۔ چند فرانسیسی افسر چوک میں شراب پیتے اور خوشیاں مناتے ٹہل رہے تھے۔ ہجوم نے انہیں گھورا مگر ان کے خلاف کچھ نہ کیا۔ لیکن ایک سارجنٹ نے ایک خوبصورت شادی شدہ عورت کے ساتھ بدتمیزی کی کوشش کی، جس پر اس کے خاوند نے اپنا چاقو نکال کر سارجنٹ کو مار دیا۔ سارجنٹ تو مر گیا مگر دوسرے فرانسیسیوں نے تلواریں نکال لیں۔ لوگوں

نے بھی اپنے خنجر اور چھرے نکال لیے اور منٹوں میں تمام فرانسیسی ہلاک کر دیے۔ سسلی والوں کو احساس ہوا کہ اب انہیں مزید قتل کیا جائے گا۔ وہ ''فرانسیسی مردہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے شہر میں پھیل گئے۔ فرانسیسیوں کو سڑکوں پر قتل کیا گیا، پھر فرانسیسیوں کے رہائشی علاقوں میں جا کر ان کے بچے اور عورتیں قتل کیں۔ گویا وہ دُنیا سے فرانسیسیوں کا نام و نشان تک مٹانا چاہتے تھے۔ وہ خانقاہوں میں بھی داخل ہو گئے اور تمام غیر ملکیوں کو گھسیٹ کر باہر لے آئے اور ciciri بولنے کا حکم دیا۔ (ایک لفظ جس کا تلفظ فرانسیسیوں کے لیے مشکل تھا) جو شخص ہکلایا اسے ذبح کر دیا گیا۔ فرانسیسی سپاہیوں کو قتل کرنا اور بھی آسان تھا کیونکہ ان میں سے اکثر سارا دن شراب کے نشہ میں دھت رہتے تھے۔ اس رات دو ہزار مرد، عورتیں اور بچے قتل کیے گئے۔ فرانسیسی جھنڈے کی جگہ جرمن شہباز نے لے لی۔ جرمن حکمران تھے تو سسلی والے ان سے نفرت کیا کرتے تھے۔ گورنر جان بچانے کے لیے ایک قریبی قلعہ میں چلا گیا۔ وہ ہتھیار ڈالنے کی بات کر رہا تھا کہ کسی نے اسے تیر مار کر ہلاک کر دیا۔ باقیوں کو قتل کیا گیا۔ پالرمو شہر نے اپنے خود مختار (پنچائیت) ہونے کا اعلان کر دیا۔ دوسرے قصبوں نے بھی یہی کیا جب انہوں نے اس قتل عام کی خبر سنی اور فرانسیسیوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ چارلس کو مجبوراً قسطنطنیہ کے خلاف جنگ کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ میسنا کے شہریوں (ان پُرانے قزاقوں کی نسل جنہوں نے سولہ سو سال پہلے تمام مردوں کو قتل کر کے عورتوں سے شادی کر لی تھی) نے جزیرے پر دوبارہ قبضہ کرنے کی ہر فرانسیسی کوشش ناکام کر دی۔ آخر اقتدار ایک ہسپانوی کے حوالے کیا جو سٹافر کا رشتہ دار تھا اور اس طرح سو سالہ پرانے مسئلہ کا ایک تکلیف دہ حل میسر ہوا۔

لیکن ایک لمحہ کے لیے ہم گزشتہ پیچیدگیوں، علاقائی دعوؤں اور نہ ختم ہونے والے مسائل پر نظر ڈالیں اور معاملہ کی تہہ تک جانے کی کوشش کریں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ روحانی تسلط اور شہنشاہوں کے مابین کوئی نظریاتی جدوجہد نہیں تھی۔ جھگڑے کی بنیادی وجہ ہی قاتلوں کے عروج و زوال کی بنیادی حقیقت تھی۔ اپنی بے مہار انانیت کی وجہ سے وہ اسے مقصدی یا روحانی ایشو قرار دیتے تھے ورنہ سیدھی سی بات ہے کہ وہ اپنے جذبات کے ہاتھوں بے بس تھے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عیسائیوں کو اس مسئلہ کا پورا احساس تھا۔ وہ انانیت، تکبر اور خود پرستی کے خطرات سے پوری طرح واقف تھے۔ کونسٹن ٹائن کے زمانہ سے چرچ دنیاوی اقتدار کی خرابیوں سے آگاہ کر رہا تھا اور مثالیں دے کر سمجھایا جا رہا تھا کہ عیسائیوں کو دنیاوی

آلائش ترک کرکے رہبانیت اختیار کر لینی چاہیے اور صحرائی راہبوں کی طرح جینا چاہیے۔ یہی لوگ تھے جنہیں بعد میں ولایت کا درجہ ملا۔ دسویں صدی میں پاپائیت اپنے انتہائی گھٹیا درجہ تک گر گئی۔ پچاس برس پاپائیت دلالی کے نام سے جانی گئی۔ پوپ کا عہدہ با قاعدہ بیچا اور خریدا جاتا تھا۔ پوپ سرجئس سوم نے میروزیا نام کی ایک عورت داشتہ کے طور پر رکھی ہوئی تھی۔ میروزیا نے پورا خیال رکھا کہ اس کا ناجائز بیٹا John XI پوپ بن جائے۔ اس کے ایک اور ناجائز بیٹے نے اسے اور پوپ کو جیل میں ڈال دیا۔ مگر اس عرصہ میں اس کا پوتا پوپ John XII بن گیا (وہی جس نے پہلے Otto سے مدد مانگی اور پھر اسے دھوکا دیا اور برطرف ہوا) ان سب باتوں کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ فرانس میں ایک نیا راہبانہ سلسلہ قائم کیا گیا جس کا مقصد روحانیت کے نئے مدارج طے کرنا تھا۔ مگر یہ خیال بھی رکھا گیا کہ ایک راہب کا فرض صرف آلوؤں کی کاشت نہیں بلکہ عبادت اور غور وفکر کرنا ہے اور مسیحی تصورات کو عام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ جونہی پوپ کا انتخاب جرمنی کے شہنشاہوں کے ہاتھوں میں آیا یورپ بھر میں ایک نئی مذہبی اصلاحی تحریک کا دَور شروع ہو گیا۔

اور اب ہمیں ایک نئے تضاد کا سامنا ہے جب ایبٹ آف کلونی نے اصرار کیا تھا کہ راہب کو اپنی صلاحیتیں عبادت، غور وفکر اور پڑھنے لکھنے کے لیے وقف کر دینی چاہئیں تو وہ اس حقیقت کا اعتراف کر رہے تھے کہ انسانی عروج کا انحصار انسان کی باطنی ترقی کی صلاحیت پر ہے۔ ہلاکت خیز تشدد اور طاقت کی بھوکی انانیت کا یہی ایک صحیح جواب ہے۔ جب انسان کسی ذہنی یا روحانی مسئلہ میں کھو جاتا ہے تو اس کی انانیت سکھ کا سانس لیتی ہے اور سو جاتی ہے۔

اس کے باوجود چرچ ذہنی فکر وعمل کے سخت خلاف تھا کہ وہ انسانوں کو ظالم اور گنہگار سمجھتا تھا جن کی واحد امید خدا کا فضل وکرم ہے ورنہ نجات کی کوئی اور صورت نہیں۔ پوپ اور بشپ دانشورانہ قیاس وخیال کو وقت کا زیاں کہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان اس طرح اپنی اہلیتوں پر فخر کرنے لگتا ہے اور نجات سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اس طریقہ سے چرچ کو لوگوں پر اپنا اثر زائل ہو جانے کا خطرہ ہو۔ چرچ کو واقعی یقین تھا کہ مسیح کا پیغام زندگی کے ہر مسئلے کا حل ہے۔ آدم کے گناہ کی وجہ سے انسان کی حالت ابتر ہے اور وہ مصیبت اور موت کا شکار ہے۔ مگر خدا کے بیٹے نے صلیب پر جان دے کر آدم کے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ چرچ عیسیٰ نے اس لیے قائم کیا ہے کہ ہر انسان کی نجات یقینی ہو اور ہر

انسان جنت میں جائے۔ کتاب کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ فلسفہ اور سائنس دونوں سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ دراصل ان سے انسان میں یہ تکبر پیدا ہوتا ہے کہ اخلاقیات کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر صحیح ہے اور اس طرح وہ روح کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔

چنانچہ چرچ ایک ہاتھ سے دیتا اور دوسرے ہاتھ سے لے لیتا ہے۔ انسان کو روحانی زندگی بسر کرنی چاہیے مگر کسی طور بھی اپنے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی ذہن نے ایک ہزار سال کا عرصہ ضائع کر دیا۔ جب گیارھویں صدی میں چرچ نے عربوں کے ذریعہ ارسطو کے خیالات سے ایک بار پھر رجوع کیا تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی اور انہوں نے فرطِ مسرت میں اسے اعزازی عیسائی ہونے کا درجہ دے دیا۔ کیونکہ اس نے فزکس سے اخلاق تک ہر بات کو وضاحت سے بیان کر دیا اور اس کی تصانیف نے کسی کو قیاس آرائیوں میں الجھنے کا جواز یا موقع نہ دیا۔ اب ہر سوال کا جواب انجیل میں یا ارسطو کی تحریروں میں مل جاتا ہے۔ ارسطو مادی دنیا جبکہ انجیل روحانی دنیا کی وضاحت کرتی تھی۔ اب جاننے کے لیے کیا باقی رہ گیا تھا؟ اگر پیٹر ایبلارڈ جیسے بندر صفت فلسفیوں کے لیے اب بھی طبع آزمائی کی کوئی گنجائش باقی رہ گئی تھی تو وہ دو دُنیاؤں کے باہمی ملاپ کی وضاحت کر سکتے تھے اور یہ کہ خدا نے دُنیا کو بالکل اس طرح بنا کر کہ جیسی وہ ہے، ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

وسطی دُنیا (ازمنہ وسطیٰ) ایک جگہ ٹھہری ہوئی دنیا تھی۔ لوگ جہاں پیدا ہوتے وہیں ٹھہرے رہتے۔ وہ کہیں نہیں جاتے تھے کیونکہ کہیں اور جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ سفر کرنا ویسے بھی بہت مشکل تھا کیونکہ دولت گردش میں تقریباً بالکل نہیں تھی۔ بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کو کبھی کبھی سونے چاندی سے واسطہ پڑتا۔ اپنے قلعہ میں مزارع انہیں زمین سے اگنے والی ہر چیز لا دیتے۔ گوشت وغیرہ انہیں اپنے مویشیوں سے مل جاتا۔ عام لوگ خود اپنے کپڑے بناتے، اپنے گھر کے انڈے اور سبزیاں کھاتے، گھر کا دودھ پیتے۔ مگر صلیبی جنگوں نے سب کچھ بدل دیا۔ اگر کسی صلیبی کو ارضِ مقدس جانا ہوتا تو اسے سونے کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر کے انڈوں اور بند گوبھیوں کے ذریعہ سفر خرچ پورا کرتا۔

اٹلی میں بلاشبہ بہت سونا تھا۔ بازنطین کے علاوہ اٹلی ایک بہت بڑا کاسموپولیٹن شہر تھا جہاں دنیا بھر کے لوگ رہتے تھے۔ پوپ کی ملکیت بہت بڑی اور بہت زیادہ زمینیں ہوا کرتی تھیں۔ اتنی بڑی کہ اس کے مزارع پیداوار میں سے اس کا حصہ پیداوار کی صورت ادا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہیں سونے میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ جب صلیبیوں نے اٹلی کو اپنا راستہ

بنایا تو انہوں نے اٹلی کے بینکنگ سسٹم سے فائدہ اٹھایا۔ بنک ایک میز تھا جس کے پیچھے سودخور لیٹر آف کریڈٹ یا سونا دینے کے لیے تیار بیٹھا ہوتا تھا۔ جو گروی یا ان دستاویز کے عوض دیا جاتا تھا جن میں سود کے ساتھ اصل واپس کرنے کا وعدہ لکھا جاتا تھا۔ بعض صلیبی راستہ سے گزرنے کے عوض اپنے سپاہی یا گھوڑے بنک کے حوالے کر جاتے کہ جو کام چاہے ان سے لے۔ چوتھی صلیبی جنگ میں صلیبیوں نے سب سے پہلے شہر زادا پر حملہ کیا اور اسے وینس کو واپس کیا۔ پھر قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے وہاں لوٹ مار کی اور لوٹ کا نصف مال وینس کو دیا۔ اٹلی کے وہ شہر بہت مال دار ہو گئے جو ان کے راستہ پر واقع تھے۔ مگر یہ بات کسی پوپ کے فائدے کی نہیں تھی۔ اس لیے کہ دولت سے عیش اور فرصت حاصل ہوتی ہے اور فرصت ہو تو نئے خیالات جاننے اور نئی دنیائیں دیکھنے کے لیے سفر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شہنشاہ فریڈرک دوم نے اپنا بچپن اور شباب سسلی میں گزارا تھا۔ وہیں اس میں علم حاصل کرنے اور آزاد خیالی کا شعور پیدا ہوا تھا۔ سسلی وہ جزیرہ تھا جہاں عرب اور عیسائی دو سو سال سے امن اور دوستی سے رہے تھے۔ اس لیے جب پوپ نے اس کا بائیکاٹ کیا تو وہ پریشان نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ نجات کے لیے چرچ کی کوئی اہمیت نہیں، اور اگر ہے تو وہ تمام اعلیٰ درجہ کے ذہین مسلمان تو جہنم میں گئے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔

اور اب ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حالات میں کون سی غیر معمولی تبدیلی آنے والی ہے۔ فریڈرک کا شک کسی پوپ کے اندھے یقین سے اتنا ہی دُور تھا جتنا کہ ممکن تھا۔ فریڈرک کی ابتدائی زندگی میں اس کا گارڈین ایک نہایت متعصب شخص پوپ انوسنٹ تھا۔ اسے اپنے روحانی مشن پر بڑی شدت سے یقین تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا ایک اہم کام کافروں کو کچلنا ہے۔ اسے کیتھر نامی فرقہ سے بہت نفرت تھی جو چرچ کی کرپشن کے خلاف اصلاحی تحریکوں میں سے تھا۔ کیتھر صدی کے آخری دور کے کویکرز سے مختلف نہیں تھے۔ ان کی عبادات سادہ اور زندگیاں صوفیانہ تھیں۔ ایرانی پیغمبر مانی کی طرح انہیں یقین تھا کہ روحانیت نیکی اور مادیت (دنیا) بدی ہے، کیونکہ دنیا بدی سے پیدا ہوئی ہے۔ عیسیٰ کا جسم ممکن نہیں تھا اس لیے اس کا مصلوب ہونا ایک سراب ہے۔ یہ اصولی اختلافات ہمیں بے ضرر نظر آتے ہیں مگر ان سے بھی نرالے خیالات ایک درجن جدید عیسائی فرقوں کے ہیں جو انوسنٹ کے نزدیک جہنم جانے کی ضمانت ہیں۔ تولوز اس کفر کا مرکز تھا۔ پوپ نے اس کے حکمران کاؤنٹ ریمنڈ کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس نے اس کفر کے خاتمہ کے لیے اپنے نمائندے بھیجے۔ مگر ریمنڈ کے سپاہیوں نے انہیں

قتل کر دیا۔ دو دن پوپ کی حالت غصہ میں ایسی رہی کہ اس کے گلے سے آواز باہر نہیں آتی تھی۔ (رائٹ مین ہونے کی یقینی علامت) جب اس کی حالت سنبھلی تو اس نے ملحدوں اور کافروں کے خلاف کروسیڈ کا نعرہ لگایا۔ عیسائیوں کے خلاف کروسیڈ کی بات پہلے کبھی کسی نے نہیں سنی تھی۔ فرانس کے بادشاہ نے اس سے اپنی لاتعلقی ظاہر کر دی مگر چند سرداروں نے اسے ایک شاندار کھیل سمجھا۔ اس لیے بھی کہ اس کروسیڈ کی مدت صرف چالیس روز تھی۔ انہوں نے بزیئر کا محاصرہ کر لیا اور اس ٹاؤن کے بیس ہزار افراد قتل کر دیے حالانکہ وہ سب کیتھر نہیں تھے۔ تولوز سمیت ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کا یہی حال ہوا۔ کروسیڈ برسوں جاری رہا اور **1243**ء میں قلعہ مونٹ سینگر کے محاصرے اور ان دو سو افراد کے زندہ جلا دینے پر ختم ہوا جنہوں نے اپنے مذہب سے توبہ نہیں کی۔ چرچ نے کیتھر فرقے کو اس طرح قتل عام کے ذریعہ ختم کیا جس طرح نازیوں نے یہودیوں کو ختم کیا۔

تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ انوسنٹ جیسا شخص نوجوان فریڈرک کا اتالیق (گارڈین) ہوا اور ممکن ہے کہ اس تنگ نظر اور متعصب بوڑھے سے براہِ راست تعلق کی بنا پر فریڈرک کو یقین ہو گیا ہو کہ صرف چرچ ہی نجات کا راستہ نہیں، محض وہی سچ کا خزینہ نہیں۔ فریڈرک نئے ذہنی رویوں کی پہلی علامت تھا۔ وہ نشاۃ ثانیہ کے قافلے کی پہلی صدا تھا۔ اس کے اور پوپ کے رویوں میں آگ پانی کا بیر تھا۔ جلد یا بدیر کوئی دھماکہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ جان کر اطمینان ہوتا ہے کہ جب فریڈرک نے اقتدار سنبھالا تو اس نے کافروں کو جلانے سے صاف انکار کر دیا اور پادریوں کو ٹیکس معاف کرنے کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔ بلکہ ان پر سول عدالتوں میں مقدمہ چلانے کے سلسلہ میں عدالتوں کے اختیارات بحال کر دیے۔

1216ء میں یہ لڑائی انوسنٹ کی موت کے ساتھ ختم ہو گئی۔ مگر دس سال بعد فریڈرک اور گریگوری نہم میں اتنی ہی ہلاکت خیز لڑائیاں ہوئیں مگر حقیقی جدوجہد انسانی ارتقا کے دو مختلف دھاروں، مذہبی آمریت اور سائنسی انکوائری میں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بدھ ازم، عیسائیت اور اسلام جیسے بڑے مذاہب کے سہارے انسان اس بے روح مادیت سے بہت آگے نکل چکا تھا جو روم کا زوال بنی تھی۔ ہر مذہب پہاڑی ندی کی طرح شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ گدلے دریا میں بدل جاتا ہے۔ کیتھر فرقے کے خلاف 'کروسیڈ' سے پتہ چلتا ہے کہ عیسائیت کیسے ایک بند گلی میں داخل ہوئی اور مذہب سے آمریت بن گئی۔ انوسنٹ سوم پہلا پوپ تھا جس نے کفر ختم کرنے اور باغیوں کو آگ میں جلانے کے لیے محتسب مقرر کیے۔

ایک اور پیورسٹ سینٹ فرانسس آف اسیسی اس گروہ سے وابستہ رہا، اگرچہ یہ معاملہ بہت نازک تھا۔ چنانچہ بعد میں اس کے بعض پیرو مارسیلز میں کافروں کی طرح زندہ جلا دیئے گئے۔ مگر سینٹ فرانسس سے متعلق ایک کہانی سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کے آخری دَور میں کیا ہو رہا تھا۔ فرانسس برناڈون، اسیسی کے ایک امیر تاجر کا بیٹا تھا۔ اس کا تعلق چرچ کے خلاف صف آرا ہونے والی نئی نسل سے تھا۔ لیجنڈ کہتی ہے کہ اسے ایک حسین عورت سے محبت ہو گئی۔ مگر جب وہ اس سے بے تکلف ہونے لگا تو اس نے اپنا لباس ہٹا کر اسے دکھایا کہ اس کی ایک چھاتی کینسر کی وجہ سے ختم ہو چکی ہے۔ اس سے اسے انسانی خواہشوں کی بے ثباتی کا احساس ہوا اور وہ اپنے مشن کے ایک قدم اور قریب آ گیا۔ ہمیں یہ بات بہت آسان نظر آتی ہے مگر یہ ایک کایا کلپ، ایک انقلاب تھا جس نے اس کی حالت یکسر بدل دی۔ وہ آوارگی چھوڑ کر کوئی ایسا مقصد تلاش کرنے لگا جس کے ذریعے وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ وہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ کسی بہترین معالج سے کینسر کے معاملہ پر بات کر لے۔ مگر اس نے آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کو ترجیح دی۔ اور تارک الدنیا جوگیوں کا راستہ اختیار کیا۔ اور اس کی یہی ذہنیت دولت سے اس کی بجا نفرت میں بھی کارفرما تھی۔ جب اس کے نادار باورچی عطیے لے کر آئے تو وہ انہیں اپنے منہ میں رکھ کر لائے اور کوڑے کے ڈھیر پر حسب ہدایت پھینک دیا تا کہ انہیں یاد رہے کہ دولت کی حیثیت کوڑ کباڑ سے زیادہ نہیں۔ اس کی بات ہماری سمجھ میں آتی ہے اس کا باپ غالباً دولت کا بہت بڑا پجاری تھا۔ جبکہ وہ خود دولت سے اپنی نفرت کو دوسری انتہا پر لے گیا۔ دولت کی گردش وہ سب سے بڑا واحد فیکٹر ہے جس نے انسان کے دماغ کو عہد وسطیٰ کے جمود اور گھٹن سے آزاد کیا۔ فرانسس کا دل اپنی صحیح جگہ پر تھا۔ یہ اس کا دماغ تھا جسے معائنے کی ضرورت تھی۔

جب پوپ لوگوں کو مذہب باہر کر رہے تھے تو محتسب مشتبہ کافروں کو اذیتیں دے رہے تھے اور فرانسس کے نادار باورچی سڑکیں ناپ رہے تھے۔ اس وقت حقیقی اور معنی آفریں تبدیلیاں کسی اور سطح پر ہو رہی تھیں۔ نئی ایجادات کے ذریعے انسانی زندگی بدل رہی تھی۔ پرانا ہل ایک نوکدار لکڑی تھی جو ایک فریم کے ذریعہ بیل کے پیچھے باندھی جاتی تھی۔ پھر بیل زمین کھودتا ہوا آگے بڑھتا تھا۔ زمانہ وسطیٰ میں کسی کو خیال آیا کہ چھرا زمین کو گہرائی میں کھودے گا، صرف زمین کاٹنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا اگر ایک مڑا ہوا تختہ چھرے کے پیچھے ہو تو چھرا زمین کو کھود کر دو نیم کر دے گا اور زمین پر کنارے بن جائیں گے، جن میں سے گزر کر پانی پورے

کھیت کو سیراب کر دے گا اور کھیت گیلا ہو تو بھی اس میں ہل چل سکے گا۔

نئے ہل (جس کے آگے پہیے لگے ہوتے تھے) کے ساتھ یہ خرابی تھی کہ جو پٹی بیل کے سینہ کے گرد باندھی جاتی تھی اس سے بیل کا دم گھٹتا تھا۔900ء کے قریب کسی نے سوچا کہ ایک نیا فریم بوجھ کو سینہ سے کندھوں پر منتقل کر دے گا۔ ان دو تبدیلیوں نے زراعت کی دُنیا میں انقلاب برپا کر دیا اور دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے خوراک مہیا کی۔ جنگ کے علاوہ زراعت کے لیے بھی گھوڑوں کی تربیت کی گئی۔ مگر اس سے ایک اور مشکل کا سامنا ہوا کہ اتنا بڑا بوجھ کھینچنے سے گھوڑوں کے سم پھٹ جاتے تھے۔ ان کے لیے نعل بننے سے یہ مسئلہ حل ہوا۔ تقریباً اسی زمانہ میں گھوڑے کا کالر یورپ آیا۔

ابتدا میں سمندری تاجروں کا بڑا مسئلہ ہوا کے صحیح سمت میں چلنے کا انتظار تھا۔ بحیرۂ روم میں ہوا چھ مہینے ایک سمت اور چھ مہینے دوسری سمت میں چلتی تھی۔ کارتھیج نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور سازگار موسم میں سمندری سفر کیے۔ پرانے بادبان کینوس کی چوکور پٹیوں سے بنائے جاتے تھے۔ عربوں نے تکونی بادبان بنانا شروع کیا، جو متحرک بوم کے ساتھ فکس ہوسکتا تھا اور گھومتے ہوئے ہوا کا رخ جاننے میں مدد دیتا تھا تا کہ جہاز غلط سمت میں نہ جائے۔ جہاز رانوں نے یہ قابل ستائش کارنامہ سرانجام دیا کہ وہ ہوا کے مخالف جا سکتے تھے۔ تکونا بادبان صلیبی جنگوں کے زمانہ میں آیا اور اس میں شک نہیں کہ اس سے تجارت میں اچانک ڈرامائی اضافہ ہوا۔

صحیح سمت میں چلنے کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ فرانس آف اسیسی کی ولادت سے پہلے 1180ء میں ایک انگریز راہب کو کہیں سے ایک مقناطیسی سوئی ملی جو کارک پر چلتی اور ہمیشہ ایک ہی سمت میں اشارہ کرتی تھی۔ سو سال بعد ہسپانوی بادشاہ (جس نے ستاروں کا چارٹ بنوایا تھا) الفانسو نے حکم دیا کہ اس کے تمام جہازوں میں مقناطیسی کمپاس Compass ہونا چاہیے۔ کسی جہاز ران کو جہاز چلاتے ہوئے ستاروں پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ شارلیمین کے زمانہ میں کسی کو خیال آیا کہ پسائی کرنے والے گول پتھر کو ہینڈل لگایا جائے۔ جس سے وہ پتھر چاقو، ہل اور درانتی وغیرہ تیز کرنے کے کام آیا۔ اس سے لوگوں نے پہیے کی طاقت سے کام لینے کے نئے طریقے سوچے۔ پن چکی رومنوں کے دَور سے موجود تھی۔ پہیہ میں لگے ہوئے چھوٹے ڈبے، بالٹیاں یا لکڑی کی چپٹی تختیاں جن میں سے پانی گرتا اور پہیہ گھومتا رہتا تھا، بالٹیاں ایک مالا کی طرح کنوئیں کے اندر جاتیں اور وہاں سے پانی لے کر اوپر آتی تھیں۔

رومن گیئرز کے متعلق بھی جانتے تھے کہ اگر پہیے کے نوک دار کیل یا تار اپنے محیط سے باہر نکلے ہوں تو وہ دوسرے پہیے کے کیلوں پر اپنا اثر ڈال سکتا ہے۔ اگر پہیے 90 ڈگری کے زاویہ پر ہوں تو دوسرے پہیے سے پیسنے والے پتھر جیسا کام لیا جا سکتا ہے کہ وہ اناج کے دانوں کو پیس کر آٹا بنا دے گا، اس کی طاقت کا دارومدار پہیے کے سائز پر ہے۔ پہیہ کو اپنے سائز کے مطابق طاقت کی ضرورت ہوگی۔ سن 900ء کے قریب پہیوں میں نئی دلچسپی سے پتہ چلا کہ اگر لیور کو ڈرائیو شفٹ میں لگا دیا جائے تو وہ پمپ کا کام دے سکتا ہے اور پمپ کے زور سے آرہ اور ٹرپ ہیمر چل سکتے ہیں۔ اس سے گنا بیلنا، سن کوٹنا، آٹا پیسنا آسان ہو سکتا ہے۔ بلکہ پمپ کے ذریعے تیز ہوا دینے سے بھٹی کی آگ مزید بھڑک سکتی ہے۔

ایجادات کے سلسلہ میں چرچ کا بھی ایک کردار ہے۔ راہبوں کو رات بھر عبادت کے لیے جاگنا پڑتا تھا۔ وقت بتانے کا ایک طریقہ بالٹی کے نیچے چھوٹا سا سوراخ کرنا اور بالٹی کو پانی سے بھرنا تھا۔ بالٹی سے ٹپکنے والے پانی کی تفصیل بالٹی پر لکھی جاتی تاکہ ٹپکنے والے پانی کا صحیح اندازہ ہو۔ خالی بالٹی کو ایک طرف لیور پر جھکا کر گھنٹی بجا دی جاتی۔ مارکو پولو کے آنے تک ڈائل اور سوئیوں والے اعلیٰ درجہ کے واٹر کلاک بن چکے تھے۔ یہ جاننے میں کچھ وقت لگا کہ پانی کا استعمال غیر ضروری تھا۔ پہیہ چلانے کے لیے دھاگے پر سکہ کا بوجھ کافی تھا اور رفتار کو کنٹرول کرنے کے لیے دوسرے پہیہ پر گیئر لگانا تھا۔ جب تک پڑھے لکھے اطالویوں میں مارکو پولو کی سرگزشت سے سنسنی پیدا ہو، یہ نیا کلاک اس سے پہلے رواج پا چکا تھا۔

مگر یہ ناممکن ہے کہ انسان کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دے اور اس پر خوش نہ ہو، اپنی ہمت اور تخلیقی لگن پر فخر نہ کرے۔ خوش نہ ہو کہ اس کی امید اور لگن اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے راستہ سے دیواریں ہٹ جائیں گی۔ اور اس کا ہر آنے والا کل اس کے ہر گزرے ہوئے کل سے اچھا ہوگا۔ وسطی زمانوں کا اختتام اسی احساس اور امید پر ہوا تھا۔ ہم اس کے بعد آنے والے دَور کو نشاۃ ثانیہ یعنی قدیم علم کا نیا جنم کہتے ہیں۔ دراصل یہ ایک نئے عہد، ایک نئی دنیا کا آغاز تھا۔

جن نئی دریافتوں کا انسان کے مستقبل سے گہرا تعلق تھا ان میں سے اکثر دریافتیں تباہی پھیلانے والی تھیں۔ بارود 1000ء کے آس پاس چین میں ایجاد ہوا تھا اور اس سے آتش بازی کا کام لیا جاتا تھا۔ مگر اس واقعہ کا مقصد تباہی پھیلانا نہیں تھا۔ اس کی ایجاد کا واقعہ دلچسپ ہے۔ اس کی ایجاد ایک عجیب طریقہ سے ہوئی۔ فارم کی دیواریں اکثر مٹی سے بنائی

جاتی تھیں۔ مٹی کو سخت کرنے کے لیے اس میں مویشیوں کا گوبر ملایا جاتا تھا۔ دیوار پر لوگوں کے پیشاب کرنے سے سفید لکیریں بن جاتی تھیں۔ یہ پوٹیشیم تھا۔ کسی نے اس مادہ کو لے کر جلتی ہوئی آگ پر پھینکا تو آگ اور بھڑکی، جس سے آکسیجن پیدا ہوئی۔ اگلا قدم غالباً کسی چینی کیمسٹ نے اٹھایا۔ (کیونکہ چینی پانچویں صدی قبل مسیح سے نیم جادوئی دوائیاں بنانے میں لگے ہوئے تھے) اس نے دیکھا کہ ایک خاص مقدار میں سلفر نائٹریٹ اور کوئلہ کا پاؤڈر ملا کر ایک تیز شعلہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر انہیں ایک کیپسول یا ٹیوب میں بند کیا جائے تو وہ پھٹ جائے گا۔ جوزف نیڈلہم نے اپنی کتاب میں چین کے اندر کیمیکل تجربات کی تفصیل بیان کی ہے۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کا انکشاف کیسے ہوا؟ چنانچہ چینیوں نے گن پاؤڈر (بارود) بنایا اور چنگیز خان کے لشکروں کو اس کا پتہ چل گیا اور وہ اسے مغرب کی طرف لے آئے جب انہوں نے 1218ء میں خوارزمی سلطنت پر حملہ کیا۔ 1250ء تک عربوں نے پہلی بندوق بنا لی تھی۔ اس طرح ایٹم بم کی طرح انسان کی سب سے خطرناک ایجاد 1300ء کے قریب یورپ پہنچ چکی تھی جس نے وسطی زمانوں کی رہی سہی یادوں کو بھی خاک میں ملا دیا۔

جو شخص گن پاؤڈر غالباً مغرب لانے کا ذمہ دار ہے اسے ایک مؤرخ نے ''تاریخ کا سب سے طاقتور اور خون کا پیاسا فاتح'' لکھا ہے۔ منگول تیموجن، جو تاریخ میں چنگیز خان ہے 1167ء کے اندر چین کے شمال میں واقع ایک بنجر صحرائی علاقے میں پیدا ہوا۔ منگول شمالی امریکا کے ریڈ انڈین قبائل سے مختلف نہیں تھے۔ بہت سے جدا جدا قبیلے جو اکثر آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ تیموجن ایک نامور سردار یسوگی کا بیٹا تھا۔ وہ اس وقت دھوکے سے مارا گیا جب وہ اپنے بیٹے کی منگنی Borte (یا Bertha) نامی ایک لڑکی کے ساتھ کر کے واپس آ رہا تھا۔ یسوگی کے قبیلہ کو موقع مل گیا کہ وہ بیوہ (جو خوش قسمتی سے مضبوط کردار کی عورت تھی) اور اس کے بچوں (نو برس کے تیموجن سمیت) کو قبیلہ سے نکال دے۔ برسوں وہ جنگلوں صحراؤں میں بھٹکتے رہے۔ جس سے وہ سخت جان اور بے رحم ہو گئے۔ اپنی نوعمری میں تیموجن نے مچھلی پر جھگڑتے ہوئے اپنے ایک بھائی کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس کے قبیلہ نے انتقام سے خوفزدہ ہو کر اسے قید کر لیا۔ مگر یہ تیموجن کی جرأت تھی کہ وہ ان کی قید سے فرار ہو گیا۔ ان مشکلات میں سے وہ ایک نڈر سردار بن کر ابھرا، جس کی طاقت اور دہشت کی وجہ اس کی جنگی مہارت اور اس کی دُور تک دیکھنے کی صلاحیت تھی۔

گھاس کے میدان جنگجو سرداروں اور خوانین کے گڑھ تھے۔ تیموجن نے اپنے باپ

کے پرانے دوست طغرل کی حمایت حاصل کر لی جو ایک قبیلہ کا خان تھا۔ (اپنے دو بھائیوں کو قتل کرنے کے بعد اسے یہ حیثیت حاصل ہوئی تھی) اور ایک صبح جب آوارہ گرد گھوڑ سواروں نے تیموجن کے کیمپ پر حملہ کر کے اس کی بیوی برتھا کو اغوا کر لیا تو طغرل نے دوستی کا حق ادا کیا اور اس کے آدمیوں نے مجرموں کا پتہ لگانے میں تیموجن کا ساتھ دیا۔ جن پر تیموجن نے رات کو اچانک حملہ کیا۔ تیموجن کو جب پتہ چلا کہ برتھا حاملہ ہے تو اس نے غضبناک ہو کر بچوں عورتوں سمیت تمام دشمنوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ مگر بچے کو اس نے اپنے بیٹے کی طرح پالا۔

اس فیصلے نے اسے ہر دلعزیز بنا دیا اور وقت آنے پر قبیلہ کا سردار منتخب ہوا۔ اس سے اس کا بھائی جموکا خفا ہو گیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ قبیلہ کی سرداری کا وہ زیادہ اہل ہے۔ تیموجن اس کے ساتھ جنگ میں فتح یاب ہوا مگر ایک مقام پر اسے سخت شکست ہوئی جس کے بعد جموکا نے اس کے ستر ساتھی کھانے کے برتنوں کے اندر زندہ ابال دیئے۔ بعد میں دوسرے کئی وحشیانہ مظالم کی طرح یہ ظلم بھی تیموجن (چنگیز خان) کے نام لکھا گیا۔

بارھویں صدی کے آغاز تک چین میں سنگ خاندان کی حکومت رہی۔ جس کا پہلا شہنشاہ **Tai Tsu** ملک کا زیادہ حصہ متحد کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سنگ شہنشاہ بغاوت کے ڈر سے مختصر فوجیں رکھتے تھے۔ مگر یہ اور بھی برا ہوا، کیونکہ وحشیوں نے حملے شروع کر دیے جن کے سردار منگول تھے۔ جب چن سنہرے نامی مانچوریا کے خانہ بدوشوں نے سنگ شہنشاہوں کو دھکیل کر جنوب کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تو سنہرے شہنشاہوں نے پیکنگ میں اپنا دربار لگایا۔

سنہرے شہنشاہ اس نئے اور طاقتور خان کے متعلق جانتے تھے۔ انہوں نے تاتاریوں کے خلاف خان کے ساتھ اکا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنگیز خان اس خبر سے بہت خوش ہوا کیونکہ تاتاری اس کے دائمی دشمن تھے۔ وہ اور طغرل اچانک ان کے عارضی قلعہ پر حملہ آور ہوئے اور اس کے محافظوں کو قتل کر دیا۔ منگولوں میں اس کے پرانے دشمنوں نے مل کر سوچا کہ اس سے پیشتر کہ چنگیز خان بہت زیادہ طاقتور ہو، اسے ختم کر دینا چاہیے۔ مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ ایک طوفان (جو منگول مؤرخ کہتے ہیں کہ قبیلہ کے جادوگر لائے تھے) کے دوران ایک زبردست جنگ میں اس نے اپنی دشمن فوج کو شکست دی اور اس کے تمام سردار مار دیے۔ یہ شکست اس کہانی کا موضوع ہے جس میں چنگیز کے کردار کی ایک جھلک موجود ہے۔ دشمن فوج کا ایک سردار میدان جنگ سے بھاگا مگر اپنے ملازم (جو چنگیز خان کا حامی بن گیا تھا) کے

ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ چنگیز خان کے پاس آتے ہوئے اس نے اپنے مالک کو آزاد کر دیا۔ پھر چنگیز خان کے پاس جا کر اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور معذرت کی کہ وہ اپنے آقا کو قید کر کے اس کے سامنے نہ لا سکا۔ ''اگر تم لاتے تو میں تمہیں موت کی سزا دیتا۔'' چنگیز خاں نے کہا اور ہمیشہ کے لیے اسے اپنا بااعتماد ملازم بنا لیا۔

اب اس نے تاتاریوں کا رخ کیا اور انہیں ایک فیصلہ کن جنگ میں شکست دی۔ (1202ء) اس نے تمام قیدیوں کو قتل کر دیا مگر کسی تاتاری سردار کی دو حسین بیٹیاں بیویاں بنا لیں۔ دنیا کے اکثر تاتجین کی طرح اسے بھی خوب صورت عورتوں کا بہت شوق تھا۔

1206ء کے موسم بہار میں چنگیز خان نے منگولیا کے تمام قبیلے دریائے Onon کے قریب جمع کیے۔ وہاں ایک بار پھر اس کے تمام منگولیا کے خان ہونے کا اعلان ہوا اور آخر کار درجنوں جنگجو قبیلے ایک حکمران کے تحت متحد ہو گئے۔ اب وہ دنیا فتح کرنے کے لیے تیار تھے۔

مگر وہ کس طرف آگے بڑھیں، شمال میں سائبریا تھا، الطائی پہاڑوں کے دوسری طرف وسیع اور بنجر زمین تھی۔ جنوب مغرب میں ایرانی سلطنت تھی۔ جس کے حکمران اس وقت سلجوقی ترک تھے۔ جنوب میں چین، جس کے شمالی نصف پر سنہرے شہنشاہ حکمران تھے اور جو چنگیز خان کا پہلا نشانہ تھا۔ مگر فی الحال وہ شہنشاہوں پر حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ اس نے اپنا رخ شمالی چین کے صرف ایک حصہ کی طرف موڑ لیا جو شہنشاہوں کے تسلط میں نہیں تھا۔ ایک زرخیز صوبہ جسے اب Kansee کہتے ہیں، جس پر تنگٹ Tungut نامی نیم تبتی لوگ حکومت کرتے ہیں چنگیز خان نے ان پر حملے شروع کر دیے۔ اس کی فوجوں نے ہر طرف دہشت گردی کا سماں پیدا کر دیا۔ چین اور ایران کے درمیان تجارتی راستہ سلک روڈ ان کے رحم و کرم پر تھا۔ ان کے خطرہ سے شمال مغربی چین کی اقتصادی زندگی مفلوج ہو کر رہی گئی۔ چار برس بعد خوف و ہراس کی اس زندگی سے تنگ آ کر تنگٹ نے امن کی التجا کی۔ چنگیز خان کی خدمت میں انہوں نے رشوت کے طور پر اپنی ایک شہزادی پیش کی۔ نازک خدوخال کی تنگٹ Tungut لڑکیاں منگولوں کے لیے خاص طور سے پُرکشش تھیں۔ کچھ کمیاب سفید اونٹوں کے علاوہ بہت زیادہ خراج بھی ادا کیا گیا۔ تب کہیں جا کر خان اعظم نے امن کی درخواست منظور کی۔

اب اس نے سنہرے شہنشاہوں کی طرف نظر کی۔ پرانا سنہرا شہنشاہ، چنگیز خان کا

پہلا اتحادی مر چکا تھا اور اس کے جانشین کو وہ پاگل سمجھتا تھا۔ 1211ء میں چنگیز خان نے شمالی چین پر حملے شروع کیے مگر اس کا دفاع مضبوط تھا اور چنگیز خان کے اکثر حملے ناکام ہوئے۔ پھر خطائی نامی ایک محکوم قبیلہ نے اپنے چینی آقاؤں کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کیا۔ وہ منگول تھے اور چنگیز خان نے اپنی فوج کے ایک لیفٹیننٹ جیبی کی کمان میں انہیں امداد بھیج کر خوشی محسوس کی۔ انہوں نے منچوریا کے ایک شہر لیو یانگ کو گھیرے میں لے لیا۔ جیبی نے اس مخصوص حکمت عملی سے کام لیا جس کی بدولت منگولوں کو آئندہ بھی کئی کامیابیاں ہوئیں۔ انہوں نے پسپائی کا بہانہ کر کے مزاحمت کاروں کو آرام کا موقع دیا اور پھر پلٹ کر اچانک حملہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا اور خطائی چنگیز خان کے اطاعت گزار بن کر اقتدار میں آئے۔

اب منگولوں نے شمالی درّوں کے راستے لڑتے ہوئے چین میں داخل ہونا شروع کیا۔ وہ شہر پر شہر تسخیر کرتے چلے گئے۔ انہوں نے ایک زبردست حملہ کر کے دیوار چین پر قبضہ کر لیا۔ خانہ بدوشوں کی پُرکاری تعداد کا بدل ثابت ہوئی۔ وہ درّے میں داخل ہونے کے لیے ایسے راستہ پر پہنچ جاتے جہاں دشمن نسبتاً محفوظ ہوتا۔ فرار ہونے کا بہانہ کرتے اور پھر اچانک پلٹ کر دشمن کو ملیا میٹ کر دیتے اور پھر خان اعظم کا انعام، پیکنگ کے بلند و بالا میناروں کا منظر اور زرد دریا تک پھیلا ہوا وسیع میدان، چاول اور باجرہ مکئی کے شاندار کھیت، ان صحرا نشین وحشیوں کی نظر میں یہ زمین پر جنت کا نظارہ تھا۔ وہ خوشی کے مارے فصلوں کو روندتے، کھلیانوں میں آگ لگاتے گزر جاتے۔ شہر بہ شہر محاصرے اور لوٹ مار ان کا معمول بن گیا۔ شان تنگ صوبہ کے شہر شی نان میں (سلک کے لیے مشہور) وہ محلات، بڑے فوارے، نہریں، باغات اور بدھ کے مجسمے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مگر منگولوں کو محلات کے ساتھ ایک ہی سلوک کرنا آتا تھا کہ انہیں جلا دیں۔ تقریباً ایک سال تک وہ چین کو لوٹتے اور جلاتے رہے، یہاں تک کہ گولڈن شہنشاہ نے ایک بھاری رشوت ادا کی۔ مگر جب چنگیز نے سنا کہ گولڈن شہنشاہ نے جنوب میں اور آگے جانے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ جلدی سے چین واپس آیا، پیکنگ پر قبضہ کیا اور اس کے محل جلانے لگا۔ شاہی محل ایک مہینہ سلگتا رہا۔

اب یہاں ہنوں، ونڈلوں اور چنگیز خان کی ذہنیت کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ پرانے درباریوں میں سے ایک درباری یلوئی چتسائی ابھی پیکنگ میں تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، اونچا قد خوبصورت چھوٹی داڑھی، گہری بھرپور آواز اور خوشگوار انداز۔ اس کی خوبیوں نے چنگیز خان کو جیسے مسحور کر دیا ہو، چنگیز خان نے جب اسے بتایا کہ "اب وہ پہلے آقا کی اطاعت سے آزاد

ہے،'' تو اس نے جواب دیا کہ ''اپنے پہلے آقا کے خلاف سوچنا اس کی نافرمانی کے مترادف ہے۔'' وہ جلد ہی خان کا سب سے بڑا مشیر بن گیا۔ گھوڑے پر سوار وہ دہشت گرد تھے مگر اپنے خیموں کے اندر منگول نیک خو اور امن پسند تھے۔ چتسائی نے جب محسوس کیا کہ وہ آزادی اور اعتماد کے ساتھ بات کرسکتا ہے، اس نے چنگیز سے کہا کہ شہروں اور فصلوں کو آگ لگانا بُری پالیسی ہے، بہتر ہے کہ انہیں ہاتھ لگائے بغیر سالانہ ٹیکس وصول کیا جائے۔ یہ بات چنگیز خان کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے چتسائی کے مشورہ پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ منگولوں نے لوٹنا اور جلانا بند کر دیا، بالخصوص اس وقت جب چنگیز خان موقع پر موجود نہ ہو۔ مگر وہ صرف اس وقت ایسا کرتے تھے جب کچھ اور کرنے میں ان کا فائدہ نہ ہو۔

اب شمالی چین فتح ہو چکا تھا اور جنوبی چین، سنگ شہنشاہوں کی پناہ، تکلیف دہ حد تک دُور لگتا تھا۔ چنگیز خان نے مغرب کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اس لیے کہ خبر آئی تھی کہ اس کا ایک مطیع بادشاہ ایک شہزادے کچلگ نے قتل کر دیا ہے۔ اس نے جیبی کو اسے قتل کر دینے کے لیے کہا اور جیبی نے بالکل وہی کیا جو اسے کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ منگولوں کے حملہ کی خبر سنتے ہی کچلگ بھاگ گیا۔ جیبی نے قدموں کے نشان ڈھونڈنے کے سلسلہ میں اپنی تمام خانہ بدوشانہ مہارت سے کام لیتے ہوئے اس کا پیچھا کیا۔ اوپر پامیر پہاڑوں میں اسے جا لیا اور اس کا سرتن سے الگ کر دیا۔ چنگیز خان کو معلوم ہوا کہ اب وہ ایک نئے ملک کا حکمران ہے، جس کے ہر کونے میں ترک مسلمان آباد ہیں اور جو اس کی آمد سے بہت خوش ہیں کیونکہ کچلگ ان کا دشمن تھا۔

اس ملک میں سلجوقیوں کی نہیں بلکہ ترکوں کی حکومت تھی جن کا تعلق ترکستان کے خیوا علاقے سے تھا۔ خوارزم کے ان سلاطین نے حال ہی میں گنگا سے دجلہ تک اپنی فتوحات کا سلسلہ وسیع کیا تھا اور اب اسے مستحکم کر رہے تھے۔ چنگیز نے جو اُن کے متعلق سنا اُس سے وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ ان سے جنگ نہیں چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی اتنے علاقے فتح کر چکا تھا کہ ان کا نظم و نسق اس کے لیے دشوار تھا۔ ترک سلطان محمد نے دوستانہ تعلقات بڑھانے کی نیت سے اپنا ایک سفیر بھی بھیجا تھا۔ چنگیز نے جواب میں تین سفیر بھیجے، اس پیغام کے ساتھ کہ ''ہم آپس میں تجارتی تعلقات بڑھانے کے یکساں طور پر خواہش مند ہیں اور تمہیں میں ہمیشہ اپنے بیٹے کی طرح سمجھوں گا۔'' سلطان محمد کو یہ بات بُری تو لگی مگر اس نے پیغام کا دوستانہ جواب دیا۔ چنانچہ چنگیز نے بیش قیمت مال و دولت (سب لوٹا ہوا) کے ساتھ ایک کاروان ترکستان بھیجا

تا کہ سامان خریدے۔ کاروان جب ایک سرحدی شہر پہنچا تو شاید رابطہ کی کمی، یا پھر ان نو دولتیے وحشیوں سے نفرت کی بنا پر گورنر نے مال ضبط کر لینے کا حکم دیا اور تمام منگول قتل کر دیے، جن کی تعداد ایک سو تھی۔

جب چنگیز خان نے خبر سنی تو غصہ کے مارے اس کا بُرا حال ہوا مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پا کر ایک اور سفیر سلطان کے پاس بھیجا کہ اوترار کے گورنر کو اس کے حوالے کیا جائے۔ سلطان محمد نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی، غلطی جس نے یورپ کے دروازے 'پیلی تباہی' پر کھول دیئے۔ اس نے سفیر کو قتل کر دیا۔

اس رائٹ مین جیسا غصہ کسی کو نہیں آتا جس کی توہین کی گئی ہو اور چنگیز خان کے رائٹ مین ہونے میں کوئی شک نہیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم اس خوفناک انتقام کی وضاحت کر سکیں جو اس نے اپنے ایک سفیر اور ایک سو آدمیوں کے قتل کا لیا۔ وہ اپنی تمام فوجوں کے ساتھ ترکستان میں داخل ہو گیا۔ اس سے پیشتر کہ اس کا غصہ کم ہوا ایک اور واقعہ سے اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ تنگت چین کے پہلے لوگ تھے جنہوں نے چنگیز خان کی اطاعت قبول کی تھی۔ اب اس نے جنگ کی تیاری کی تو ان سے سپاہیوں کا ایک دستہ طلب کیا۔ ان کے ایک احمق وزیر نے بدترین حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا جواب کچھ اس طرح دیا ''اگر جنگ کے لیے تمہاری فوج کافی نہیں تو بہتر ہے کہ جنگ نہ کرو۔'' غصہ سے چنگیز خان کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر اس نے عارضی طور پر اپنا انتقام رہنے دیا۔

سچ یہ ہے کہ ترکوں کی فوج منگولوں کی فوج سے بہت بڑی تھی۔ وہ چاہتے تو منگولیا پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیتے۔ مگر اب ان کے سلطان کو اندازہ نہیں تھا کہ منگول کہاں سے حملہ آور ہوں گے، اس لیے اسے ایک طویل سرحد پر اپنی فوجیں مختلف سٹیریٹیجک مقامات پر متعین کرنا پڑیں۔ اوترار پر حملہ ظاہر ہے کہ لازمی تھا، اس لیے سمجھا گیا کہ چنگیز شاید اسے نظر انداز کر دے۔ مگر چنگیز پہاڑ عبور کر کے شمال کی طرف آیا اور دریائے سائر کے شمالی کنارہ سے اوترار کے سامنے نمودار ہوا۔ گورنر نے بڑی جرأت، مایوسی کی جرأت کے ساتھ شہر کا دفاع کیا۔ منگول شہر میں آ گئے تو بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے بہترین سپاہیوں کے ساتھ قلعہ کے حفاظتی چبوترہ میں پناہ لی۔ بھوکے رہنے اور شہر سے منگولوں کو نکالنے میں ایک اور مہینہ لگ گیا۔ منگول شہر میں داخلہ ہوئے تو ترکوں کے تیر ختم ہو چکے تھے۔ گورنر اور اس کی عورتوں نے چھت پر پناہ لی تو عورتوں نے دیوار سے اینٹیں نکال کر گورنر کو دیں جنہیں وہ منگولوں پر برساتا رہا۔ مگر

اس سے کیا حاصل ہونا تھا۔ اب بھی گورنر پاگلوں کی طرح لڑتا ہوا گرفتار ہوا اور گھسیٹ کر چنگیز خان کے سامنے لایا گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا چنگیز خان کو انتظار تھا۔ اس نے پگھلا ہوا سیسہ اس کی آنکھوں اور کانوں میں ڈال کر اسے مارنے کا حکم دیا۔

اور پھر معصوم لوگوں کا قتل عام ہوتا رہا جن کا بس اتنا قصور تھا کہ جس بادشاہ کی وہ رعایا تھے اس نے چنگیز خان کی توہین کی تھی۔ منگول صرف ان شہروں اور قصبوں کو معاف کرتے تھے جو اپنے دروازے رضا کارانہ کھول دیتے تھے۔ مکینوں کو شہر سے باہر بھیج کر وہ کئی دن شہر لوٹتے رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص وہاں پایا جاتا تو قتل کر دیتے۔ اگر کوئی شہر مقابلہ کرنے کے بعد ہتھیار ڈالتا تو معافی شاید ہی ملتی۔ تاشقند کے مغرب میں واقع بناکت کے مزاحمت کاروں سے تین دن میں ہتھیار ڈالنے کے لیے کہا گیا اور ان سے جان بخشی کا وعدہ کیا گیا مگر سب کو قتل کر دیا گیا۔ ہنرمند منگول سرداروں کے حوالے کیے جاتے، وسطی زمانوں میں ہنرمند بیش قیمت 'چیز' سمجھے جاتے تھے اور تمام نوجوانوں کو منگول محاصروں میں اپنی مدد کے لیے ساتھ لے جاتے تھے، جن کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہوتا تھا۔ منگولوں کا طریقہ یرغمالیوں کو اپنے آگے ہنکانا تھا۔ جب وہ کسی شہر کا محاصرہ کرتے تو ان سے زندہ ڈھال کا کام لیتے۔ یہ ترکیب انہوں نے چین میں سیکھی تھی۔ آس پاس کے دیہات سے یرغمالی لے جانا اور انہیں 'شاک ٹروپس' کے طور استعمال کرنا.. ٹروپس جو شاک دینے کے بجائے شاک لیتے تھے۔

بخارا نے مزاحمت کی مگر کرائے کے سپاہیوں نے رات کے وقت بھاگنے کی کوشش کی۔ منگولوں نے انہیں پکڑا اور قتل کر دیا۔ پھر وہ شہر کے اندر داخل ہوئے اور تمام مکینوں کو شہر سے باہر نکلنے کا حکم دیا جبکہ خود شہر لوٹتے رہے۔ مگر شہر والوں کی سزا معاف پھر بھی نہیں ہوئی۔ شوہروں کے سامنے بیویوں کو ریپ کیا گیا۔ جن شوہروں نے مداخلت کی وہ مارے گئے۔ بعض عورتوں نے ذلت کے ڈر سے خودکشی کر لی۔ پھر شہر کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔

سمرقند کا محاصرہ مئی 1220ء میں ہوا۔ سمرقند میں ترک فوجوں کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ فصیلیں محفوظ تھیں۔ چنگیز خان نے حملہ کرتے ہوئے قیدیوں کو آگے کیا۔ شہر کے لوگ لڑنے کے لیے باہر نکل آئے۔ منگولوں نے حسب معمول بھاگنے کا بہانہ کیا۔ دفاع کاروں نے ان کا بے تحاشا پیچھا کیا تو منگول اچانک پلٹے اور انہیں کاٹ کر نیست و نابود کر دیا۔ شہر میں نصف کرائے کے سپاہی چنگیز خان سے مل گئے۔ شہر والوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ جو کرائے کے سپاہی باقی تھے انہیں ایک ایک کر کے قتل کر دیا گیا۔ پھر انہیں قتل کیا گیا جو جا کر

چنگیز خان سے مل گئے تھے۔ چنگیز خان کو غداری سے نفرت تھی۔ تیس ہزار ہنروَر منگول اپنے ساتھ لے گئے۔ دوسرے تیس ہزار مردوں کو 'شاک ٹروپس' کے طور پر ہمراہ لیا۔ کئی قیدیوں نے تاوان دے کر رہائی پائی۔

ارگنج نے بھی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ منگولوں نے قیدیوں سے خندقیں بھروائیں جس میں دس دن لگ گئے، پھر وہ دیواروں تلے سرنگیں بچھانے لگے۔ ممکن ہے گن پاؤڈر بھی یہاں استعمال ہوا ہو۔ شہر کے اندر انہوں نے آگ لگانے کے لیے تیل کی بالٹیوں سے کام لیا۔ چنگیز خان کے دو بیٹوں کے مابین ناچاقی سے محاصرہ کے ابتدائی ایام میں شکست ہوئی تو منگول اس کا بدلہ لینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اگر لوگ اپنے آپ کو ان کے ظلم سے بچانے کی کوشش کرتے تو منگول اسے اپنی توہین سمجھتے۔ انہوں نے قریہ بہ قریہ، قدم بہ قدم لوگوں کو قتل کرتے ہوئے شہر پر قبضہ کر لیا۔ عورتوں اور بچوں نے مزاحمت کاروں کی بھرپور مدد کی۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں ہر صورت قتل ہونا ہے۔ آخر جب چند مزاحمت کار عافیت کے کسی گوشہ میں زندہ بچ گئے تو انہوں نے رحم کی درخواست کی۔ جواب مہمل تھا، جس پر ہر وہ فرد شک کر سکتا تھا جو منگولوں کی خصلتوں سے واقف ہو۔ لوگوں کو شہر سے نکال دیا گیا۔ پھر ہنرمندوں کے علاوہ ہر مرد کو قتل کر دیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا اور دریا کو روکنے والا ہر بند توڑ دیا اور جلے ہوئے کھنڈروں کو غرق آب کیا۔

ترک سلطان اب اپنی حماقت پر افسوس کر رہا تھا کہ جس کی وجہ سے اتنی ہلاکت، اتنی تباہی ہوئی۔ جب وہ فرار ہوا تو چنگیز خان نے جیبی کو اس کا پیچھا کرنے کے لیے بھیجا۔ سلطان کے اب بھی لاکھوں وفادار تھے مگر وہ اس قیامت خیز تباہی سے گھبرا گیا اور اپنے حواس پر قابو نہ پا سکا۔ اپنی فوجوں کو منظم کرنے اور لڑنے کے بجائے بغداد پہنچنے کی امید لے کر جنوب میں ایران کی طرف گیا۔ پھر ارادہ بدلا اور کیسپین کی طرف واپس آیا۔ وہ پیچھا کرنے والوں سے صرف ایک قدم آگے تھے، جب وہ ایک کشتی کے اندر کود کر سوار ہوا۔ وہ ابسکن جزیرے میں پہنچا جہاں تھکاوٹ اور مایوسی کے عالم میں اِس دنیا سے رخصت ہوا۔

اس عرصہ میں چنگیز خان بے دریغ قتل و غارت کر رہا تھا۔ سمرقند کے قریب خوشگوار اور پُرسکون دن گزارنے کے بعد وہ دریائے آمو پر واقع ایک شہر ترمز پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ اس شہر نے بھی ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا جس پر شہر میں داخل ہو کر منگولوں نے اس کے ہر شہری کو قتل کر دیا۔ جب وہ ایک بوڑھی عورت کو قتل کرنے لگے تو اس نے جان کی

خاطر انہیں موتی دینے کا وعدہ کیا۔ ان کے پوچھنے پر بوڑھی عورت نے بتایا کہ موتی اس نے نگل لیا ہے۔ انہوں نے فوراً عورت کا پیٹ کاٹ کر دیکھا تو وہاں کئی موتی تھے۔ چنگیز خان نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ ہر لاش کا پیٹ چاک کر کے موتی تلاش کیے جائیں۔

بلخ نے خاموشی سے ہتھیار ڈال دیئے۔ دراصل اس نے پہلے ہی جیبی سے اس کا وعدہ کر لیا تھا۔ شہر کے تمام لوگوں کو شہر سے باہر نکال کر سب کو قتل کر دیا۔ یہ محض اذیت پسندی تھی یا پھر بلخ کو دوسرے محاذوں کے لیے عبرت کی مثال بنانا تھا۔ ان کے لیے وارننگ تھی اور قیدیوں کو انسانی ڈھال بنانا تو ان کے لیے معمول کی بات تھی۔

لوٹ مار ہوتی رہی۔ بے گناہ کٹ کٹ کر گرتے رہے اور افغانستان تک چنگیز خان کا ڈنکا بجتا رہا۔ خوارزمی سلطنت کے وارث کا پیچھا ہندوستان کی سرحد تک کیا گیا۔ چنگیز خان نے اپنے تیر اندازوں کو تیر چلانے سے اس وقت روک دیا جب شہزادہ غزنی کے قریب دریائے سندھ میں کود گیا اور ان سے کہا کہ یہ شخص تمہارے لیے ایک مثال ہے اور تمہیں اس جیسا ہونا ہے۔ مگر اس وقت تک وہ ہزاروں لاکھوں معصوم انسانوں کو افغانستان میں قتل کر چکا تھا۔ جب بامیان کے محاصرہ کے دوران اس کا پوتا مارا گیا تو اس نے وہاں ہر ذی روح کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ ان بچوں کو بھی قتل کیا جو ماں کے پیٹ میں تھے اور کسی گھر میں کوئی پالتو جانور زندہ نہ بچا۔ یہ ایک رائٹ مین کا بالکل غیر منطقی ردعمل ہے جو اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے کہ جو سر اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دے اسے اس کے جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔

1222ء میں چنگیز نے گھر واپس جاتے ہوئے پھر آمو دریا پار کیا۔ یہاں چنگیز نے دو مسلم سکالر ساتھ لیے کہ وہ اسے اسلام کا مطلب سمجھائیں۔ اس نے شہروں اور ان کے انتظامی معاملات کی اہمیت بیان کرتے ہوئے دو مسلم قانون دانوں کو گہری دلچسپی سے سنا اور انہیں ایک بڑے علاقہ کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ جب وہ گھر واپس آیا تو ایک چینی فقیر کو اپنا منتظر پایا۔ (جسے اس نے تین سال پہلے اس امید پر بلایا تھا کہ وہ اسے شاید عمر دراز کرنے کی دوا دے سکے) اس نے تاؤازم کے فلسفہ کے بارے میں اس کے خیالات دلچسپی سے سنے مگر وہ اگلی صبح پھر گھوڑے پر سوار تھا کہ تنگت لوگوں سے بدلہ لے، کیونکہ انہوں نے خوارزمی سلطنت کے ساتھ جنگ میں فوج بھیجنے سے انکار کیا تھا۔ پھر وہی پرانی کہانی، وہی لوٹ مار، وہی قتل و غارت، وہی ریپ، ٹارچر اور آتش زنی۔ اگرچہ پہاڑی لوگ چنگیز خان کے آنے سے پہلے

ہی ادھر ادھر ہو گئے اور خون خرابہ سے بچ گئے۔ اس نے اپنے چینی مشیر چتسائی کے اس مشورے سے اتفاق کیا کہ مفتوحہ ملک کو تباہ کرنے سے بہتر ہے کہ ٹیکس وصول کیا جائے۔(اسی طرح چین میں متعین اس کے جنرل مقالی نے جو ابھی تک گولڈن شہنشاہوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا، فیصلہ کیا کہ لوگوں پر ظلم کرنا بند کر کے انہیں پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے)

چنگیز خان 1227 میں بدستور تنگت کے شہر جلا رہا تھا اور ان پر قبضہ کر رہا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ ایک خانہ بدوش کی حِس کے ذریعہ اسے احساس ہو گیا کہ موت قریب ہے۔ شکار کے دوران کسی حادثہ سے وہ کمزور ہو گیا تھا۔ اب وہ رائٹ مین کی مخصوص ذہنیت کی وجہ سے تنگت کو اپنی بیماری اور آنے والی موت کا ذمہ دار قرار دے رہا تھا، کیونکہ دوسری جنگوں کی تکان دُور کیے بغیر اسے اپنے انتقام کی جنگ تنگت کے ساتھ لڑنا پڑی تھی۔ وہ دارالحکومت تنکشیا کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے حکم دیا کہ سزا کے طور پر ہر انسان صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے تا کہ آنے والی نسلیں کہہ سکیں کہ خان نے ان کی نسل کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اور پھر انسانی نسل کے اس بہت بڑے قاتل کو ساٹھ برس کی عمر میں اگست 1227ء کے دوران میں موت نے ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔

بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے وہ محض ایک جنونی قاتل نہیں تھا۔ ایک انسان کی حیثیت سے اس میں کئی شاندار بلکہ محبت کے قابل خوبیاں تھیں۔ وہ ایک اعلیٰ ظرف اور کشادہ دل انسان تھا۔ مگر غصہ کی حالت میں کوئی بھی وحشیانہ حرکت کر سکتا تھا۔

وہ اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے اسے مثالی میدان مل گیا تھا۔ منگولیا کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو اس میں یکجہتی لا سکے اور ایک بار جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو چنگیز خان 'توسیع کے قانون' کا پابند ہو گیا جو ہر ابھرتی ہوئی طاقت کے لیے ناگزیر ہے۔ طاقت، بڑھنا، پھیلنا اور غالب آنا اس کی حیاتیاتی مجبوری ہے۔ اسے اپنی قوم کی وہ خواہشات پوری کرنا تھیں جن کے خواب وہ ہمیشہ دیکھا کرتی تھی اور منگولوں کی خواہشات قتل و غارت لوٹ کھسوٹ اور سیکس تک محدود تھیں۔ غنیمت ہے کہ اس کی کامیابی سے نہ صرف اس کے لوگوں کی خواہشات پوری ہوئیں بلکہ طاقت کے لیے اس کی وحشیانہ بھوک کو بھی چین آ گیا۔ اپنی بے لگام انانیت اور اپنے فطری وحشی پن کی حدوں کے اندر رہ کر اس نے اپنی ذاتی ترقی و اصلاح پر پوری توجہ دی۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس نے کبھی اخلاق کے اندر قبائلی تصور کو جھٹلایا ہو۔ منگول روس کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔

1240ء میں کیو تباہ کیا۔ پولینڈ میں داخل ہوئے ۔لیگنٹز کے مقام پر پولوں اور جرمنوں کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوا۔ انہیں ختم کیا۔خوش قسمتی سے انہیں لوئر سائلیشیا کے پہاڑ سے جنگلات اچھے نہیں لگے۔ انہیں کھلے میدان پسند تھے۔ (اچھا ہوا کہ انہیں جرمنی کی طرف مزید ایک سو میل بڑھنے کا خیال نہیں آیا ورنہ وہ مولا رڈیا ایلبے سے آگے کے دیہات کو اپنی پسند کے مطابق پاتے) اس لیے وہ پیچھے ہٹ کر ہنگری میں داخل ہوئے۔ جہاں مگیار لوگوں کو قتل کیا جو شارلیمین کے زمانہ سے یورپ پر حملے کر رہے تھے۔

اس عرصہ میں ایشیا کے اندر اوگودائی مر چکا تھا، (1241ء) اور چنگیز خان کا پوتا منگو خان بن گیا تھا۔ اس نے بدنصیب سنگ شاہوں سے جنگ جاری رکھی اور اپنے بھائی ہلاکو **Hulagu** کو حکم دیا کہ وہ مسلمان شہروں پر حملہ کرے۔ اس کی وجہ ان کی ایرانی رعایا کی کوئی بغاوت نہیں تھی بلکہ منگو کے دل میں حسن بن صباح کے سلسلہ سے تعلق رکھنے والے قاتلوں کا خوف تھا۔

ہوا یہ کہ جب قزوین کا قاضی نئے خان کی خدمت میں اس کے دارالحکومت قراقرم میں سلام پیش کرنے آیا تو اس نے زرہ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے ہر وقت زرہ پہننی پڑتی ہے۔ قاضی نے حسن بن صباح اور اس کے قاتل مریدوں کا قصہ سنایا جو اب امام رکن الدین کی رہنمائی میں سرگرم تھے۔ قاضی نے غالباً اس مختصر مگر انتہائی خطرناک دہشت گرد فرقہ کی تصویر کشی میں اس زور بیان سے کام لیا کہ خان کانپ گیا کیونکہ قاضی نے اسے یہ بھی بتایا کہ خان کا نام بھی دہشت گردوں کی ہٹ لسٹ پر ہے۔ جب اسماعیلی سفیر، خان کے دربار میں حاضری کے لیے آئے تو انہیں واپس بھیج دیا گیا۔ خان نے محسوس کیا کہ خطرہ لحہ بہ لحہ قریب آ رہا ہے۔ (حالانکہ ضروری نہیں کہ آنے والے اسماعیلی قاتل ہوں) خان نے اپنے محافظوں کی تعداد دگنی کر دی جس کا مطلب ہے کہ اس کی نیندیں حرام ہو رہی تھیں ۔ وہ قاتلوں کی اس مہارت کے قصے سن کر ڈر رہا تھا کہ انہیں اپنے شکار تک پہنچنے میں دروازہ یا گارڈ، کوئی نہیں روک سکتا۔ اس لیے1256ء ہلاکو سے کہا گیا کہ وہ جا کر یہ خطرہ دُور کرے۔

صباحیوں کے پاس کئی محفوظ قلعے تھے اور سلجوقیوں کی طرح وہ منگولوں کا مقابلہ بھی ایک غیر معینہ مدت تک کر سکتے تھے۔ مگر رکن الدین صلح کل آدمی تھا۔ اس نے ہلاکو کے اس مطالبہ کا عاجزانہ جواب دیا کہ رکن اپنے قلعے خود تباہ کر دے اور اپنے سات سالہ بیٹے کو یرغمال

کی حیثیت سے منگولوں کے حوالے کرے۔ خوش قسمتی سے ہلاکو نے لڑکا واپس کر دیا، مگر اسماعیلی اپنی گردنیں منگولوں کو پیش کرنے کے سلسلہ میں بجا طور سے پریشان تھے۔ ہلاکو نے اس قلعہ پر حملہ کرنے کی تیاری کی جہاں رکن الدین مقیم تھا۔ مگر رکن نے جلدی سے ہتھیار ڈال دیے۔ ہلاکو نے اس کے بیش بہا نذرانے ازراہ کرم قبول کیے۔ رکن کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ اسے ایک سو سفید اونٹ اور ایک خوب صورت منگول لڑکی دی۔ اسے دوسرے قلعوں پر خون خرابے کے بغیر قبضہ کے لیے رکن کی مدد درکار تھی اور رکن نے اس معاملہ میں پوری مدد کی۔ تمام قلعوں نے ہتھیار ڈال دیئے حتیٰ کہ الموت میں ان کے مرکزی قلعہ پر بھی منگولوں کا قبضہ ہو گیا، جسے منگولوں نے آگ لگا دی۔

اب منگولوں کو رکن کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے اس کے خاندان کو قتل کر دیا۔ رکن نے قراقرم میں خان کی خدمت میں حاضر ہونے کی مہلت مانگی۔ مگر منگو نے ملنے سے انکار کر دیا۔ قراقرم سے واپس آتے ہوئے رکن الدین بھی قتل کر دیا گیا۔

چنانچہ ایران میں دہشت گردوں کا خاتمہ ہو گیا جیسے کہ مصر میں ہوا تھا، جہاں سلطان بے برس نے ان کا نام و نشان مٹایا تھا۔ اس طرح پہاڑ کے بوڑھے نے اپنی دہشت گردی کی قیمت ادا کی۔

ہلاکو جو اکثر منگول فاتحین کی طرح حماقت کی حد تک اذیت پسند تھا، اس نے اب بغداد کا رخ کیا۔ بغداد میں آخری عباسی خلیفہ معتصم کی حکومت تھی۔ منگول وہاں جنوری **1258**ء میں پہنچے اور المنصور اور ہارون الرشید کے عظیم شہر کا محاصرہ کر لیا۔ چند ہفتوں بعد معتصم نے رحم کی اپیل کی۔ یہ آسانی سے منظور ہو سکتی تھی کیونکہ بغداد نے منگولوں کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ مگر ہلاکو نے شہر پر حملہ کر کے قتل عام کا حکم دیا۔ غالباً منگولوں کے ہاتھوں یہ سب سے بڑا قتل عام تھا۔ بغداد دنیا کا حسین ترین شہر ایک سلگتا ہوا کھنڈر بن گیا۔ جس میں ہر طرف لاشیں تھیں۔ سلطان کو گھوڑوں کی ٹاپوں تلے کچلا گیا۔ ہلاکو نے بڑے اطمینان سے اپنی کارگزاری کا تماشہ دیکھا اور اگلے قتل عام کے لیے تیار ہو گیا۔

اگلا نشانہ افریقا اور راستہ فلسطین اور شام تھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ شمالی افریقا کے سارے ساحل کی تسخیر کوئی نہیں روک سکتا۔ ہلاکو کے مقابلہ میں بے برس کی فوج کے سوا کوئی فوج نہیں تھی۔ اس نے **1258**ء میں حلب فتح کیا اور مصر روانہ ہوا۔ مگر اس موقع پر اسے اپنے بھائی منگو کے انتقال کی خبر ملی اور یہ اہم خبر تھی، کیونکہ اب ہلاکو کے بڑے بھائی قبلائی کی تخت

نشینی کی باری تھی اور ایک اہم مسئلہ پر اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اسے سخت اختلاف تھا کہ منگول میدان کے شہسوار رہیں یا زیادہ تہذیب یافتہ ملک میں چلے جائیں ۔ اریبوگ سب سے چھوٹا بیٹا چنگیز خان کے ساتھ متفق تھا کہ منگول خانہ بدوش رہیں ۔ تہذیب انہیں کمزور اور کرپٹ بنا دے گی۔ ہلاکو، قبلائی سے متفق تھا کہ کرپشن عیش کا ذریعہ اور ناگزیر ہے۔ قبلائی کو اپنے مؤقف میں حمایت چاہئے تھی جبکہ اریبوگ کے کئی حامی تھے۔ ہلاکو اپنی فوج لیے گھر روانہ ہو گیا اور سارے بحیرۂ روم نے سکھ کا سانس لیا کہ اسے اتنے بڑے فتنہ سے نجات مل گئی۔

مگر بے برس نہیں چاہتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے چلا جائے۔ اس کی فوج نے ستمبر **1260**ء میں گلیلی سمندر کے قریب عین جالوت کے مقام پر منگولوں کا راستہ روک لیا اور منگولوں کو پہلی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ تاریخ کی ناانصافی سے منگول قتل عام سے بچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہلاکو اپنے زخم چاٹتا ہوا منگولیا واپس چلا گیا۔

اس کا جانا بروقت تھا۔ اریبوگ کی بحث ختم ہو گئی، جب اسے قید خانہ میں ڈال دیا گیا، جہاں وہ فوت ہو گیا۔ قبلائی خان**1260**ء میں خان اعظم بن گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کا بڑا کام چین کی فتح کو مکمل کرنا اور بادشاہی کے ایک نئے سلسلہ کا آغاز ہے۔ اور آئندہ چونتیس برس میں اس نے یہی کیا۔

وہ منگولوں کے سابق اتحادیوں سن شہنشاہوں سے لڑ رہا تھا اور یہ شمال میں چن شہنشاہوں کا تختہ الٹنے سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ تمام علاقہ میں چاول کے سیلاب زدہ کھیت تھے، جن کی وجہ سے سواروں کے دستے بے کار ہو گئے۔ گرم مرطوب موسم منگولوں کے لیے ناقابل برداشت تھا مگر انہوں نے محاصرہ میں ان منجنیقوں سے خوب کام لیا، جن سے خوارزمی سلطنت تباہ کی تھی۔ کوئی منجنیق سو آدمی مل کر چلاتے تھے۔ بیس برس سے کم مدت میں آخری سن شہنشاہ نے مایوس ہو کر اپنے آپ کو سمندر میں گرا دیا اور قبلائی خان چین کی قسمت کا مالک بن گیا۔ جس سال قبلائی خان منگولوں کا لیڈر بنا، مارکو پولو کا باپ اور چچا وینس سے قسطنطنیہ روانہ ہوئے۔ (قسطنطنیہ صلیبی کے محاصرہ سے اب تک لاطینیوں کے قبضہ میں تھا مگر اگلے سال پھر اس پر یونانیوں کا قبضہ ہو گیا) اس وقت مارکو چھ برس کا تھا اس لیے سفر نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں بخارا پہنچے جہاں ان کی ملاقات قبلائی کا پیغام ہلاکو کے نام لے جانے والوں سے ہوئی جس کے ذریعہ اسے منگو کی موت کی اطلاع دی گئی تھی اور وراثت کے معاملات سے باخبر کیا گیا تھا۔ پیغام برداروں نے دونوں کو مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ واپس کیتھے خان سے ملنے کے

لیے چلیں ۔ دونوں نے ان کی بات مان لی۔ اچھا ہوا کہ خان کی طرح وہ بھی تاتاریوں کی زبان جانتے تھے۔ خان ان کے ساتھ خوش دلی سے ملا اور بہت دیر باتیں کرتا رہا۔ وہ اسے اتنے اچھے لگے کہ اس نے انہیں پوپ کے پاس جانے کے لیے کہا تاکہ وہ ایک سو سکالر بھیجے اور وہ منگولوں کو مغربی طور طریقے سکھائیں ۔ دونوں یورپ واپس گئے جہاں انہیں پتہ چلا کہ پوپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ پولو کی بیوی بھی پندرہ سالہ مارکو سے جدا ہو کر دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ مارکو سمیت گیتھے واپس چلیں۔ وہ آرمینیا کے راستے ایران گئے، پھر پامیر سے ہوتے ہوئے کاشغر۔ اسی طرح منزلیں طے کرتے ہوئے خان کے پیکنگ پہنچے۔ قبلائی خان پھر انہیں گرم جوشی سے ملا۔ نوعمر ذہین مارکو سے مل کر وہ اور بھی خوش ہوا کہ وہ روانی کے ساتھ تاتاری بول سکتا تھا۔ اس نے کئی اہم سفارتی کام مارکو کے سپرد کیے۔ مارکو نے یہ واقعات اپنی قابل ستائش تصنیف میں رقم کیے ہیں جو ہمارے گئے دنوں کی ایک زندہ دستاویز ہے۔

کوئی شک نہیں کہ پولو خاندان کا استقبال گرم جوشی کے ساتھ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود قبلائی چین میں بن بلایا مہمان تھا۔ چینی منگولوں کو ایسی غلیظ، بدبودار اور قابل نفرت مخلوق سمجھتے تھے جنہیں بات کرنے اور کھانے پینے کا سلیقہ نہیں ۔ (چینی دودھ پینے کا خواب بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ اب بھی چائے کے ساتھ لیموں پسند کرتے ہیں۔ جہاں تک منگولوں کی غلاظت کا تعلق ہے تو تیرھویں صدی میں بلکہ شاید اب بھی یورپ بلکہ وینس میں بھی لوگ شاید ہفتہ میں ایک بار ہی نہاتے ہوں) اور جن کی کوئی اخلاقیات اور کوئی آداب نہیں ۔

مارکو سترہ سال قبلائی کے لیے خدمات سرانجام دیتا رہا۔ اس نے سلطنت کے دور دراز علاقوں کے سفر کیے، جیسے برما اور جاپان بلکہ شاید ہندوستان بھی گیا ہو۔ تین برس وہ یانگ چو شہر کا گورنر رہا۔ جب کبھی وہ سفر سے واپس آتا تو خان سے اپنے مشاہدات اور تجربات کا ذکر کرتا اور خان ان کے نوٹس لیتا رہتا تھا۔ وہ بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ جب انہوں نے خان سے واپس گھر جانے کی اجازت چاہی تو خان اداس ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے عزیز ترین مہمان واپس چلے جائیں ۔ لیکن آخر انہیں رخصت کیا اور ان کے ساتھ ایک شہزادی روانہ کی، جسے ایران کے خان سے شادی کرنا تھی۔ پولو نے اسے بخیریت ایران پہنچا دیا اور خود واپس وینس روانہ ہوئے۔ وہ سفر میں اتنے تباہ حال ہو چکے تھے کہ انہیں ان کے گھر داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ بعد میں جب انہوں نے اپنے دوستوں کو کھانے پر بلایا تو اپنے پرانے چیتھڑوں

میں پوشیدہ ہیرے، موتی، اور جواہرات نکال کر دکھائے۔ اس کے بعد انہوں نے کم و بیش پُرمسرت زندگی گزاری (سوائے اس کے کہ مارکو ایک مختصر عرصہ کے لیے جنوا کے قید خانہ میں رہا) اور قبلائی خان، کہ جسے کولرج نے اپنی ایک مشہور نظم کا موضوع بنایا تھا، ان کے وینس پہنچنے سے ایک سال پہلے مر چکا تھا۔

قبلائی خان نے پوری کوشش کی کہ وہ اپنے دادا کے خواب پورے کر سکے۔ اس نے جنوب میں جزیرۂ نمائے ویٹ نام کی طرف پیش قدمی کی اور اپنی فوجیں برما بھیجیں، مگر اس کے سپاہی گرم و مرطوب موسم اور مچھر مکھیاں برداشت نہ کر سکے۔ اس نے جاپان بھی فتح کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے بحری قوت ضروری تھی مگر چین آنے سے پہلے منگولوں نے سمندر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلے جنگی جہاز نے ان کے سپاہیوں کو شمالی کیوشو میں خلیج ہاکاٹ پر 1274ء میں اتارا تھا۔ مگر سمورائی مزاحمت کاروں کا مقابلہ سمندری سفر سے اکتائے ہوئے منگولوں کے لیے بہت دشوار تھا۔ سات برس بعد ایک لاکھ چالیس ہزار منگولوں پر مشتمل بہت بڑی فوج نے اسی خلیج میں اترنے کی غلطی کی۔ مگر جاپانیوں نے اس وقفہ میں خلیج کے گرد مضبوط دیوار بنا لی تھی اور منگولوں کو وہاں سے ملنے نہیں دیا جہاں وہ اترے تھے۔ یہاں تک کہ زبردست طوفان نے منگولوں کا جہازی بیڑا اور ان کا حوصلہ (مورال) دونوں تباہ کر دیے۔ ان کے بعض سپاہی ڈوبتے تیرتے غوطے کھاتے اپنے جہازوں تک پہنچے اور گھر روانہ ہو گئے۔ باقیوں کو جاپانیوں نے جب چاہا گرفتار کیا۔ جو منگول چین واپس پہنچے ان کی تعداد نصف سے بھی کم تھی۔

یہ شکست منگول سلطنت کا خاتمہ ثابت ہوئی۔ اگرچہ قبلائی اس کے تیرہ برس بعد، اپنی موت تک چین پر حکومت کرتا رہا مگر چین میں منگول اپنے قدم جما نہ سکے۔ چینیوں کو ان سے سخت نفرت تھی۔ جب قبلائی کے وارث اقتدار کی خاطر آپس میں لڑنے لگے تو پتہ چل گیا کہ منگول بالادستی کا دور ختم ہوا۔ خانہ جنگی نے ملک کے ٹکڑے کر دیے۔ اس اثنا میں چینی بھی بیدار ہو گئے اور منگولوں کو ہمیشہ کے لیے چین سے جانا پڑا۔ ابھی قبلائی کی موت کو صرف چوہتر برس ہوئے تھے کہ چنگیز خان کی عظیم سلطنت ایک لاش کی طرح گل سڑ کر ختم ہو گئی۔

نئی دنیاؤں کی تلاش

مارکو پولو کے سفر نامہ کے چھیالیسویں باب (حصہ دوم) نے تمام اٹلی میں جوش و خروش پیدا کر دیا۔ اس باب میں مارکو نے تاتاریوں کا ذکر کیا ہے، جن کا اپنا کوئی بادشاہ نہیں تھا۔ تاتاری ایک طاقتور حکمران کو خراج ادا کرتے تھے، جس کا نام ان کی زبان میں انکین تھا۔ اسے وہی اہمیت حاصل تھی جو ہماری زبان میں پریسٹر جان کو حاصل ہے۔ مگر آگے چل کر اس کا حوالہ صرف پریسٹر جان کہہ کر دیتا ہے۔ شاید اپنی کہانی قلم بند کرنے والے شخص رسٹی چیانو کی طرف سے حوصلہ افزائی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔ کیونکہ رسٹی چیانو کا خیال تھا کہ ان جملوں کی وجہ سے بہت سنسنی پھیلے گی۔ ایک سو سال سے پریسٹر جان کی لیجنڈ یورپ میں اتنی ہی مشہور تھی جتنی کہ پرنس آرتھر کے جادوگر مارلین کی تھی۔

اس کا آغاز 1165ء میں ہوا تھا۔ جبکہ پریسٹر جان کا ایک پراسرار خط اٹلی میں ملا۔ جس میں اس نے اپنی شاندار سلطنت کا ذکر بارھویں صدی کے شنگریلا کی طرح کیا تھا۔ مرلین کی کہانی کی طرح جو ایک بدنام رومان پسند جیوفری کی اختراع تھی، پریسٹر جان کی لیجنڈ نے بھی وسطی زمانہ کے رومان پرور تخیل کو بہت متاثر کیا۔ پوپ الیگزنڈر سوم نے پریسٹر جان کا خط اس سنجیدگی سے لیا کہ 1177ء میں اسے ایک طویل خط لکھا اور اپنا ذاتی معالج ماسٹر فلپ بھیجا کہ خط کو کہیں ہندوستان میں یا اس کے آس پاس پہنچا دے۔ ماسٹر فلپ کا کیا ہوا؟ یہ تو پتہ نہیں مگر پوپ کا خط نقل کی صورت اب بھی موجود ہے۔

پریسٹر جان اپنے خط میں لکھتا ہے کہ وہ بڑے شاندار محل میں رہتا ہے۔ جس کے گیٹ سرڈونیکس سے بنائے گئے ہیں جو پہلے سے ایک قسم کی وارننگ دیتے ہیں اگر کوئی زہر دینے کی کوشش کرے۔ یہ کہ اس کے پاس ایسا آئینہ ہے جس میں وہ تمام ملک اور اس

میں ہونے والا ہر واقعہ دیکھ سکتا ہے اور ایک چشمہ ہے جو آبِ حیات کی طرح ہے اور بوڑھا نہیں ہونے دیتا۔ ایک انگوٹھی ہے جس میں بیش قیمت پتھر جڑے ہوئے ہیں اور جس کے ذریعہ پریسٹر جان جب چاہے غائب ہوسکتا ہے۔ ریت کا سمندر ہے جس میں کئی قسم کی مچھلیاں ہیں، دریا ہیں کہ جن میں پانی بہنے کے بجائے پتھر لڑھکتے ہیں۔ سلمندر نامی کیڑے ہیں جو صرف آگ میں زندہ رہتے ہیں۔ پریسٹر جان کا لباس ان کی کھال سے بنتا ہے اور صرف آگ سے دھویا جاتا ہے۔ ملک کے اندر جھوٹ نہیں بولا جاتا، کوئی جرم نہیں ہوتا، غربت کا نشان نہیں، مگر پھر بھی پریسٹر جان ہے کہ جنگ ضروری سمجھتا ہے۔

چنانچہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب مارکوپولو نے ایک عیسائی حکمران انکین کا ذکر رسٹی چیانو سے کیا جسے پریسٹر جان سمجھا گیا کہ اس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ کیونکہ پریسٹر جان کے متعلق کوئی بھی گپ کتاب کثیر اشاعت کی ضمانت تھی۔

پولو کے سفر نامہ کی اشاعت کے بعد رومانی مزاج کے کئی سیاح سمرقند اور کاشغر روانہ ہوئے۔ انہیں پریسٹر جان تو نہیں ملا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ پریسٹر جان کا کبھی کوئی وجود ہی نہ تھا۔ دراصل پریسٹر جان کے متعلق پولو کا بیان غلط تھا۔ وہ اسے چنگیز خان کا دشمن بتاتا ہے اور پھر ایک حسین شہزادی کی خاطر ہونے والی جنگ میں مروا دیتا ہے۔ دراصل پریسٹر جان چنگیز خان کا گہرا دوست اور ساتھی طغرل خان آف کریٹس تھا۔ کریٹس نسطوری عیسائی تھے۔ ان کا تعلق عیسائیوں کے ایسے فرقہ سے تھا جس کا ایمان تھا کہ عیسیٰ بنیادی طور سے اور سب سے پہلے صرف انسان تھے جنہیں ایشیا بھیج دیا گیا تھا۔

جیوفری آف منماؤتھ، ایک بشپ نے مرلین اور کنگ آرتھر لیجنڈ کی بے پناہ تشہیر کی۔ انہی سے تہور اور شجاعت کی وہ روایت چلی جس میں نوجوان سردار مسلح ہوکر سر پر محبوبہ کا رومال لگائے نت نئے کارنامے سرانجام دیا کرتے تھے۔ اس روایت کو ہم وسطی زمانوں سے مخصوص اور منسوب کرتے ہیں اور پریسٹر جان کی لیجنڈ اس زمانہ کی گھٹن میں تازہ ہوا کا جھونکا بن کر آئی تھی۔ اس سے نئے جذبات اور عزائم پیدا ہوئے۔ نئے افق اور نئے خواب دیکھنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ ایک بار پھر ہم اس ناممکن زمانہ کا تصور کریں جب لوگ سمجھتے تھے کہ جس جھونپڑے میں وہ پیدا ہوئے، اسی میں مریں گے، جس میں اس کے باپ دادا اور پڑدادا مرے تھے اور جن میں ان کے بیٹے اور پوتے بھی وقت آنے پر مریں گے۔ یہ نہیں کہ لوگوں کو اپنی بھلائی کا خیال نہیں تھا بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا جامد ہے، ساکت ہے، ہل نہیں سکتی اور زندگی

ہے کہ جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ زندگی سخت ہے اور سخت تو اسے ہونا ہی تھا۔ کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے انسان جنت سے نکالا گیا تھا۔ اب کم از کم اتنا ہو گیا ہے کہ ہر شخص کی نجات چرچ کے ذمہ ہے اور چرچ اس کی دائمی لازوال پُرمسرت زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔ اس اثنا میں ہر جگہ موت اور فنا کے قصے جاری رہے۔ کلیساؤں کے باہر بھکاری اپنی معذوریوں کی نمائش کرتے۔ جذامی جلوسوں کی صورت سڑکوں اور گلیوں میں گھومتے، مجرم لوگوں کے سامنے آگ میں جلائے جاتے اور چوہے پالتو کتوں بلیوں کی طرح کوڑے کے ڈھیروں میں کھیلتے تھے۔ ہر چرچ میں 'موت کا رقص' ڈرامائی شکل میں پیش کیا جاتا۔ اس کا ایک نتیجہ وسطی زمانوں کے تخلیق کار کی گمنامی تھی۔ یہ بات ہمیں عجیب مگر قابل تحسین بھی لگتی ہے کہ کسی فن پارے، کسی تخلیق پر تخلیق کار کا نام نہ ہو۔ تاریخ دان ہم سے کہتے ہیں کہ یہ اس لیے کہ فن پارہ محض خدا کی خوشنودی کے لیے تخلیق ہوا تھا۔ اس کی عظمت کی نذر تھا۔ مگر چھوٹے محدود حلقوں میں لوگ تخلیق کار کو جانتے تھے اور کوئی سیاح پوچھے تو نام بھی بتا دیتے تھے۔ مگر سو سال بعد آنے والے کسی سیاح سے انہیں واسطہ نہیں تھا۔ کیونکہ آنے والی نسلوں کا تصور کہیں موجود نہیں تھا۔ وہ لوگ اپنی 'آج' میں رہتے تھے، انہیں گئی کل سے سروکار نہیں تھا۔ (1452ء تک ہیروڈوٹس کا ترجمہ لاطینی میں نہیں ہوا تھا) ان کا انکسار موم کے بے جان پتلوں جیسی ان کی ذہنیت کا ایک اور نتیجہ تھا۔

اور یہ تقریباً 1250ء کا زمانہ تھا کہ لوگوں نے کنگ آرتھر کی واپسی کے متعلق سرگوشیاں شروع کر دی تھیں۔ یا یہ کہ پوپ کے پاس ایک شہنشاہ جان دی پریسٹ کا خط آیا ہے، جو جب چاہے غائب ہو سکتا ہے اور جس کے پاس ایک آئینہ ہے جس میں تمام دنیا وہ دیکھ سکتا ہے اور ممکن ہے کہ اس وقت بھی ہمیں دیکھتا ہو۔ اس کا حاصل ایک جذباتی ہنگامہ ہوا ہو گا جس میں وہم اور خوف کی آمیزش بھی ہو گی کیونکہ اس آئیڈیا سے اندازہ ہو گیا تھا کہ نئی تبدیلیاں دہلیز پر ہیں۔ ہاں یہ اندازہ کسی کو نہ تھا کہ نئی تبدیلیاں قاتلوں کے لشکر لے کر آئیں گی جو اپنے پیچھے ویران شہر اور سربریدہ لاشیں چھوڑ جائیں گے۔

یورپ کی خوش قسمتی تھی کہ چنگیز خان کے لشکر پولینڈ سے آگے نہیں گئے۔ چین اور روس منگولوں نے تباہ کیے۔ مشرقی یورپ کو پہلے ترکوں پھر منگولوں نے روندا۔ عربوں کی عظیم تہذیب ترکوں اور منگولوں کے ہاتھوں برباد ہوئی۔ ان کے اپنے خلیفہ دولت اور نمائش کے خواہشمند تھے اور یہ کمزوری منگولوں کی طرح ہی تباہ کن تھی۔ بینکنگ ان کی ایجاد ہوتی مگر

اسلام نے سود سے منع کیا تھا، اس لیے یہودیوں اور عیسائیوں نے بینکنگ کا تصور ہتھیا لیا۔ مگر ایک بار جب وائکنگ آباد ہو گئے تو مشرقی یورپ قابل رشک حد تک مستحکم ہو گیا۔ جب منگولوں نے جرمنی سے چین تک کے راستے کھولے تو یورپ کے سوداگر اور سیاح ان سے فیضیاب ہوئے۔ تجارت بھی رومان جتنی پرکشش تھی۔ برتولومیوڈائس پریسٹر جان کی تلاش میں نکلا تو تلاش اس انکشاف پر ختم ہوئی کہ کیپ آف ہوپ کے گرد (سمندری) سفر ممکن ہے۔

چرچ، حسب معمول ان بڑی تبدیلیوں سے بے خبر تھا۔ جب سے وہ سیاسی طاقت بنا تھا چرچ اپنی اہمیت کے سلسلہ میں غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ دوسرے بڑے مذاہب کی طرح لوگوں میں اپنے تصورات کی اشاعت و تبلیغ کے بجائے حکم دینے اور حکومت کرنے میں لگ گیا تھا۔ وہ واقعہ کہ 'سینٹ امبروز نے شہنشاہ تھیوڈوسیس کو پبلک کے سامنے معافی مانگنے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ سرکس میں سات ہزار افراد ہلاک ہوئے تھے'؛ ہر پوپ کو اس طرح یاد رہا کہ اس نے ہر بادشاہ کی توہین کرنا اپنا فرض جانا۔ پاپائیت کے دو بڑے 'کارنامے' یہ ہیں کہ جرمنی کے گریگری VII کا بائیکاٹ کیا گیا اور معافی کے لیے اسے تین دن برف میں انتظار کرایا گیا اور جب انوسینٹ سوم، وسطی زمانوں کے سب سے بڑے پوپ نے تمام انگلستان کو 1209ء میں ارکانِ دین کی ادائیگی سے محروم رکھا اور آخر کنگ جان کو ڈرایا کہ انگلستان کو پوپ کی جاگیر کے طور پر اس کے حوالے کر دے ورنہ وہ بادشاہ کے خلاف کروسیڈ شروع کرے گا۔ (اور میگنا کارٹا پر پوپ کے تمام اعتراض اسے ختم کرنے میں ناکام ہوئے) 1268ء میں سٹوفر شہنشاہوں کے آخری وارث نوعمر کونراڈن کے قتل نے ثابت کر دیا کہ چرچ ہر طرح کی جنگ آخرکار جیت جاتا ہے۔ پوپ اس واقعہ سے اور بھی خوش ہوا ہوگا کہ قتل اس مقام پر ہوا جہاں فریڈرک دوم نے یونیورسٹی قائم کی تھی کہ وسطی زمانوں کے توہمات کا خاتمہ ہو۔

دانتے تقریباً پینتیس برس کا تھا جب پوپ بونیفس VIII نے مختلف پارٹیوں میں نئی خونریزی کا سبب جاننے کے لیے 'ریفری' بھیجا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ دانتے (جس نے پارٹی بدل لی تھی) کو ان الزامات اور مسائل کی بنا پر جلاوطن کر دیا گیا جن سے وہ بالکل بے تعلق تھا۔ گزشتہ اکیس سال سے دانتے شہر شہر بھٹک رہا تھا۔ ان لوگوں کے خوابوں میں کھویا ہوا جو اس سے جدا ہو چکے تھے اور ان خوابوں میں ایک خواب اس لڑکی بیٹرس کا تھا جس کی محبت میں دانتے اس وقت مبتلا ہوا تھا جب وہ نو برس کا تھا اور جو اپنے پچیسویں سال میں اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ انہی دنوں دانتے نے اپنی طویل نظم 'ڈیوائن کامیڈی' لکھی۔

نظم ایک سفر کی کہانی ہے جو دانتے نے خواب میں کیا، جس میں واصل اسے دوزخ کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر بیٹرس اسے جنت لے جاتی ہے۔ 'ڈیوائن کامیڈی' وسطی زمانوں کی سب سے بڑی اور پہلی رزمیہ ہے اور اس عہد کے انسانی ذہن کی مؤثر عکاسی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس میں سینٹ فرانسس اور کلونی کی مذہبی روح تلاش کرے تو اسے مایوسی ہوگی۔ نظم کا بڑا حصہ شخصیات اور روزمرہ کے واقعات پر طنز ہے گویا کہ کسی جدید شاعر نے امریکی سیاست اور نکسن کے واٹر گیٹ کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ لہجہ میں درد ہے اور خود رحمی ہے۔ لگتا ہے کہ دانتے ان لوگوں سے انتقام لینے کے لیے تڑپ رہا ہے جن سے اسے نفرت ہے اور جنہیں ہم سب مجرم سمجھتے ہیں۔ 'ڈیوائن کامیڈی' سے پتہ چلتا ہے کہ وسطی عہد ہمیشہ کی طرح بے فیض اور بنجر تھا اور انسانی نسل دم گھٹنے والی کمینگی میں سانس لیتی تھی۔

اس نظم نے ادب کی ایک نئی فارم کو جنم دیا جس نے دانتے کے ہمعصروں کو بہت متاثر کیا۔ وہ ناکام سیاستدان نہیں بلکہ ایک غمزدہ عاشق تھا جو اس عورت کے خوابوں میں گم تھا جو دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی تھی اور جسے اس نے ایک بار بھی نہیں چوما تھا۔ دانتے نے اپنی شاعری میں اس امیج سے کام لیا جو اس جذباتی عہد کا نمائندہ تھا۔ جلاوطنی نے اس کی کمر توڑ دی، اس عورت سے جدا کیا جسے وہ محبت کرتا تھا۔ چودھویں صدی میں دانتے کا امیج اتنا ہی متاثر کرتا تھا جتنا کہ بیسویں صدی میں ولینٹینو کا امیج متاثر کرتا رہا۔ دانتے نے نادانستہ طور سے فرد کا رومانی مسلک تخلیق کیا تھا۔

دوسرے شاعر جلدی سمجھ گئے۔ پیٹرارک (Petrarch) کی شاعری نے لارا کی محبت سے فیض پایا۔ تیئیس برس کی عمر میں اس نے لارا کو اوگنن کے ایک چرچ میں دیکھا تھا۔ اس کی محبت نے اسے یورپ کا نامور شاعر بنایا۔ اپنے ذاتی تجربہ سے اس نے نئے انداز کی شاعری تخلیق کی، جو گہری براہِ راست اور فطرت کے مناظر سے آراستہ تھی۔ یورپی تاریخ میں اس کی اہمیت یہ ہے کہ وہ پہلا 'رومانی' شاعر تھا۔ وہ بچپن میں زندگی پر کتابوں کو ترجیح دیتا رہا۔ ایک بار اس کے باپ نے تمام کتابیں اٹھا کر آگ میں ڈال دیں۔ جب اس کا وکیل باپ مر گیا تو ادب اور آرکیالوجی کی خاطر اس نے قانون پڑھنا چھوڑ دیا۔ اسی نے اٹلی کو قدیم ناقابل فراموش یادگاروں کا شعور دیا۔ وہ صرف اپنے خیالات کی دنیا میں زندہ رہا کرتا تھا اور دوسروں سے بھی یہی کرنے کو کہتا تھا۔

اس کی اداسی کی وجہ بھی دلچسپ ہے۔ جس اداسی نے زندگی بھر اس کا پیچھا نہیں

چھوڑا۔ 'مائی سیکرٹ' میں وہ مانتا ہے کہ اس کی اداسی کی سب سے بڑی وجہ قوت ارادہ کی وہ کمزوری ہے جس کے سبب وہ ویسی زندگی نہیں جی سکتا جس کے کہ خواب دیکھتا ہے۔ شاعر، جو نشاۃ ثانیہ کا پہلا آدمی کہلایا تھا ہمارے بنیادی انسانی مسئلہ کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہمارا شعور ہمارے کنٹرول میں نہیں ہے۔

اس کے نوعمر ہمعصر بوکاچیو نے بزنس چھوڑ کر شاعری کی۔ 'پرسنل' شاعری۔ وہ 'پہلا شاعر' کہلایا کیونکہ اس نے شاعری کی اور شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا۔ مگر آزادیٔ اظہار کے سلسلہ میں اس کا اہم کنٹری بیوشن اس کی 'Decameron' ہے، جس میں محبت اور جنس کا بیان اس بے باکی سے کیا گیا ہے جو کیٹولس کے بعد ناپید تھی۔ ممکن نہیں کہ وہ 'ڈیکیمرون' آزادی سے لکھ سکتا اگر پوپ ایوی گنن کے بجائے روم میں ہوتا۔ اس نے اپنی کتاب برطانوی سفیر جیوفری چاسر کو تحفہ میں دی۔ چاسر نے اسی سے متاثر ہوکے The Canterbury Tales لکھی۔ بوکاچیو فلورنس میں رہا کرتا تھا۔ ایک ایسا شہر جس کی اہمیت نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں اس کے سائز سے بڑھ کر ہے۔ اس کے دولت مند تاجروں نے مشہور فنکاروں کی خدمات حاصل کیں اور اسے یورپ کا نہایت خوب صورت شہر بنا دیا۔ یہاں ایک طرح کے سوشلزم کے ابتدائی تجربے بھی ہوئے۔ **1378**ء میں سلووسٹرو ڈی میڈیچی نے تاجروں کی طاقت کم کرنے کی کوشش کی۔ نچلے طبقہ کے مزدوروں نے احتجاج کیا اور مزدوری بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ انہیں کامیابی تو ہوئی مگر بے روزگاری میں اضافہ ہوگیا۔ تاجر انجمنیں بے شک ہمدرد نہ ہوں مگر انہوں نے دولت گردش میں رکھی۔ نئی حکومت جلد ختم ہوگئی مگر بعد میں جب کسی رہنما کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہیں یاد آیا کہ ایک میڈیچی نے غریبوں کی حمایت اور دولت مندوں کی مخالفت کی تھی۔ وہ کوسیموڈی میڈیچی نامی ان کے سربراہ کے پاس گئے کہ میڈیچیوں سے مدد چاہیں جنہوں نے ایک بار اور ان کا ساتھ دیا اور میڈیچی پندرھویں صدی کے بڑے حصہ تک فلورنس میں برسراقتدار رہے۔

فلورنس پھیلتا گیا اور روم ایک بار پھر پوپ کا شہر بن گیا۔ باقی بحیرۂ روم ترکوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ ترکوں کو چنگیز خان نے کچل دیا تھا مگر مملوکوں کے ہاتھوں ہلاکو کی شکست اور اس کے افریقا سے نکل جانے کے بعد انہوں نے سنبھلنا شروع کر دیا تھا۔

1290ء میں عثمان اوّل نے عثمانیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ **1331**ء میں ترکوں نے نکوسیا فتح کیا۔ سات سال بعد نکومیڈیا لیا۔ **1365**ء میں تھریس میں ایڈریانوپل فتح ہوا اور

ترکوں کا دارالحکومت بنا لیا گیا۔ اب قسطنطنیہ کے مغرب میں ترکوں کی حکومت قائم ہو گئی اور دنوں کی بات تھی کہ وہ عیسائی دارالحکومت فتح کر لیں۔ دراصل انہوں نے 1391ء اور 1398ء میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تھا مگر خراج لے کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ 1396ء میں ان کے خلاف کروسیڈ کا اعلان ہوا، جس کی قیادت ہنگری کے سگمنڈ نے کی۔ بیس ہزار عیسائی سرداروں نے جلدی آگے بڑھنے کی کوشش کی اور شکست کھائی۔

اس موقع پر منگولوں کے ایک اور حملہ کی وجہ سے یورپ کو دم لینے کی فرصت ایک بار اور مل گئی۔ اس بار حملہ آور منگولوں کا سردار تیمور لنگ تھا۔ تیمور لنگ چنگیز خان کی نسل سے تھا۔ اس نے انیس برس حملہ آور خانہ بدوشوں کے ساتھ لڑتے گزارے۔ پھر سات برس ایران فتح کرنے میں لگے۔ تیمور لنگ بہت بڑا جنرل، مگر کسی حد تک پاگل تھا۔ 1383ء میں جب اس نے سبزہ زار فتح کیا تو دو ہزار قیدی زندہ حالت میں مینار میں چنے، پھر مینار کو اینٹیں لگا کر بند کر دیا۔ اسی سال اس نے پانچ ہزار قیدیوں کے سر کاٹے اور سروں سے بہت بڑا برج بنایا۔ 1386ء میں اس نے تمام قیدی چٹان سے دریا میں گرا دیئے۔ دہلی میں اس نے ایک لاکھ انسان قتل کیے۔ تیمور لنگ نے 1400ء میں اناطولیہ پر حملہ کیا، اس پر قبضہ کیا اور اس کے چار ہزار محافظ زندہ دفن کیے۔ اگر وہ چنگیز خان ہوتا تو پہلے اپنا مرکز مضبوط کرتا اور پھر بڑی احتیاط سے شمال میں بڑھتا اور روس میں داخل ہوتا۔ روس اپنے اتحاد کے لیے کسی طاقتور حکمران کا منتظر تھا۔ جیسا کہ آرنلڈ ٹائن بی نے کہا کہ آج سمرقند ماسکو پر حکومت کرتا بجائے اس کے کہ ماسکو سمرقند پر حکومت کرے۔

مگر تیمور لنگ میں ذرہ بھر بھی سیاسی شعور نہیں تھا۔ روس وسیع کھلے میدانوں کا ملک تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فاتح کا کام ہے کہ دولت مند شہروں کا محاصرہ کرے اور ان کے تمام مکین ہلاک کر دے۔ اس مقصد کے لیے روس کے بجائے ہندوستان اور ایران زیادہ مناسب تھے۔ 1395ء میں توکمتیش خانہ بدوشوں کی سرکوبی کے لیے وہ روس گیا۔ لیکن چند دنوں میں اس چھوٹے چوبی شہر ماسکو سے ہو کر واپس آ گیا۔ مگر سمجھ نہ سکا کہ اس کی مٹھی میں کتنا بڑا خزانہ تھا۔ روس بدستور تاتاریوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ تیمور سمرقند واپس مڑا، پھر ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ اس کے اپنے سپاہی شمالی ہندوستان میں اپنے ترک عزیزوں پر حملہ کے خلاف تھے۔ مگر تیمور لنگ کے لیے صرف یہی ایک کام کرنے کا تھا۔ اور صرف یہی ایک کام اس نے کیا۔ 1405ء میں وہ چین پر حملہ کے لیے روانہ ہوا مگر راستہ ہی میں مر گیا۔ تیمور لنگ ایک ڈائنا سور

تھا جسے قدیم اسیرین فاتحین کی طرح ٹارچر اور قتل عام کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ اس کی سلطنت اس کی موت کے بعد نصف صدی کے اندر بکھر گئی۔

1402ء میں تیمور لنگ سلطنت عثمانیہ کو تباہی کے کنارے لے گیا۔ مگر اگلے سال واپس چلا گیا اور ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے انہیں 1453ء تک انتظار کرنا پڑا اور پھر انہوں نے اسے ناقابل یقین حد تک طاقتور توپوں کے ذریعہ حاصل کیا۔ ہر توپ ½ ٹن وزن کا گولا فائر کرتی تھی۔ جب اسے ٹیسٹ کیا گیا تو پتہ چلا کہ گولا ایک میل دُور تک مار کرتا تھا اور چھ فٹ تک زمین کے اندر چلا جاتا تھا۔ 29 مئی 1453ء کو ترک شہر میں داخل ہوئے۔ شہنشاہ مارا گیا اور عیسائی شہری قید کر لیے گئے۔

دراصل سلطان محمد دوم کا قسطنطنیہ پر قبضہ بہت بڑی غلطی تھی۔ یہ مشرق کی طرف جانے کا رستہ اور بین الاقوامی کراس روڈ تھی، جہاں تہذیبیں اور تاجر آپس میں ملتے تھے۔ شہر فتح کرتے ہی سلطان محمد نے بھانپ لیا کہ اس نے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ذبح کر دی ہے۔ یونانیوں کو شہر چھوڑنے سے روکنے کی کوشش کی مگر دیر ہو گئی تھی۔ زندگی کانسٹن ٹائن کے شہر سے رخصت ہو چکی تھی۔

اب بھی ترکوں کے عزائم میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ یونان کے مالک تھے، اب اٹلی کے مالک بننے کے خواب دیکھنے لگے۔ جب کیسمو ڈی میڈیچی وینس سے جلاوطن فلورنس میں تھا وینسوں نے ترکوں کے ساتھ سولہ سالہ جنگ کے بعد امن کا معاہدہ کیا تھا جس کی قیمت انہیں اپنے بعض تجارتی مرکز ترکوں کے حوالے کر کے ادا کرنا پڑی۔ پچاس برس بعد جنگ پھر شروع ہو گئی اور وینس کو مزید تجارتی مرکز دینا پڑے اور بحیرۂ اسود کے ذریعہ تجارت کے لیے بھاری سالانہ خراج ادا کرنا پڑا۔ 1480ء میں ترکوں نے اٹلی پر حملہ کیا اور اوترانتو فتح کر لیا۔ اگلے سال انہوں نے رہوڈس میں نائٹس آف سینٹ جان کا محاصرہ کیا۔ دشمنوں کی خوش قسمتی سے محمد دوم کا انتقال ہو گیا اور محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

مختصر یہ کہ ترک اب بحیرۂ روم کے چاروں اطراف پھیل رہے تھے۔ وہ وقت بھی آیا جب وہ خود بحیرۂ روم کی گزرگاہ، شمالی افریقی شہر، گیوٹا پر راج کرتے تھے، جہاں سے دور آبنائے جبل الطارق تک نظر جاتی تھی۔ اگر ترک (عربوں کی طرح) تجارت اور خیالات کے تبادلہ پر آمادہ ہوتے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہ پڑتا۔ مگر وہ بہت مشکل اور تند مزاج تھے۔

1415ء میں پرتگالیوں نے گیوٹا پر حملہ کے لیے فوج بھیجی۔ پرتگال نیا ملک تھا جسے

دوسرے کروسیڈ کے دوران عام لوگوں نے قائم کیا تھا۔ مختصر آبادی اور طویل سمندری ساحل تھا۔ قدرتی بات ہے کہ انہیں سمندری تاجر بننا تھا اور گیوٹا سے ان کی روزی کو خطرہ تھا۔ پرتگال کے بادشاہ جان نے اپنے بیٹے ہنری کو جہازوں کے ایک بیڑے کے ساتھ گیوٹا پر حملہ کے لیے بھیجا۔ خوش قسمت تھے کہ ہوا ان کی مدد پر تھی اور ترک غافل تھے۔ ہنری نے ان کا بیڑا غرق کیا اور گیوٹا کو تباہ کر دیا۔ اب کم از کم یورپی تاجر بحیرۂ روم آزادی کے ساتھ آ جا سکتے تھے۔

ادھر ترکوں نے چین، ہندوستان اور ایران کی طرف جانے والا خشکی کا تجارتی راستہ بند کر دیا اور چونکہ پندرھویں صدی کے عیسائی ریشم اور مسالوں کے شوقین ہو چکے تھے، انہیں اس سے بڑی مایوسی ہوئی۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ مسالوں سے سردیوں میں گوشت ایک عرصہ تک محفوظ رہتا ہے، بلکہ اس میں نمک سے بہتر ذائقہ پیدا ہوتا ہے۔ انہیں (غلطی سے) یہ بھی یقین تھا کہ مسالوں کی خوشبو طاعون سے بچاتی ہے۔ ایشیا میں سستے مسالوں کی کمی نہیں تھی۔ مگر ترکوں نے راستہ بند کر دیا تھا۔ یا بھاری ٹیکس وصول کرتے تھے۔

یورپ اب بھی پریسٹر جان کو بھولا نہیں تھا۔ وہ عظیم شہنشاہ جو کہیں ترکوں کی دوسری طرف حکمران تھا۔ اگر انہیں اس کے ملک کا راستہ مل جاتا تو مسئلہ شاید حل ہو سکتا تھا۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ راستہ کہاں ہے اور اس کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں۔

پرتگالی افریقا کے مغربی ساحل سے تقریباً ایک ہزار میل دور 'کیپ بوجا دور' چلے گئے تھے مگر وہاں کا پانی سفید اور خطرناک لگتا تھا۔ اسے 'ابلتا سمندر' کہا جاتا تھا۔ اس سے آگے جنوب میں اس وقت تک کوئی نہیں گیا تھا۔

خوش قسمتی سے پرنس ہنری کے پاس کچھ فالتو پیسے تھے۔ اس نے نقشہ نویسوں، جہاز رانوں اور جہاز ڈیزائنروں کو بلایا اور دور کے سفر پر جانے کے لیے جہاز رانوں کی تربیت کے لیے سکول کھولا۔ پریسٹر جان کی طرف جانے والا سمندری راستہ اس کا مسئلہ بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے 'ہنری دی نیویگیٹر' کا خطاب ملا تھا۔ حالانکہ اس کی جہاز رانی کاغذی تھی اور آرام کرسی تک محدود تھی۔ اس نے اپنی جان کبھی خطرہ میں نہیں ڈالی۔ اس کے جہاز سازوں نے ایک نئی قسم کا جہاز کارویل بنایا جو کھلے سمندروں کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ 1427ء میں اس کے کارویل اطلانتک میں (پرتگال کے ساحلوں سے قریباً آٹھ سو میل دور) موجود تھے۔ انہوں نے ازواز جزائر دریافت کیے اور پرتگالی آباد کار فوراً ان جزائر کی سمت روانہ ہوئے۔

جنوب میں 'کیپ بجادور' اب بھی ایک رکاوٹ تھی۔ 1433ء میں ایک کارویل

کے جہاز رانوں نے ابلتے سمندر میں جانے سے انکار کر دیا اور واپس آ گئے۔ ہنری آرام کرسی پر بیٹھا اصرار کرتا رہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ غالباً سمندر کا ابلنا گہرائی میں کمی کی وجہ سے ہے۔ انہیں اتنا کرنا ہے کہ اس میں جہاز چلائیں اور اس کے چکر لگائیں۔ اس کا کہنا درست ثابت ہوا۔ یہی جہاز اگلے سال کیپ بجا دور سے آگے نکل گیا اور دوسری طرف لنگر انداز ہوا۔ ملاحوں نے پھلوں پھولوں کے دلکش پودے دیکھے اور ان کے نمونے پرتگال لے کر آئے۔ جلد ہی ہنری کے جہاز نئی منزلوں کی تلاش میں افریقا روانہ ہوئے اور تجارتی چوکیاں قائم کرنے لگے۔

ہنری کا انتقال 1460ء میں ہوا۔ ہندوستان کی تلاش کے سلسلہ میں اس کا خواب ادھورا رہ گیا۔ اٹھائیس برس بعد برتولوی ڈائس 'کیپ آف گڈ ہوپ' آیا۔ اس کے بعد واسکوڈی گاما زیمبسی آیا اور دیکھا کہ عرب خشکی کے راستے اس سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ ایک عرب نے اسے کالی کٹ (ہندوستان) کا راستہ دکھایا۔ آخر جب وہ گھر واپس ہوا تو اس کے تین چوتھائی ساتھی فساد خون سے مر چکے تھے اور کئی جہاز چھن گئے تھے۔ پرتگالیوں نے عربوں سے نمٹنے کے لیے کئی جنگی جہاز بھیجے اور تجارتی چوکیاں قائم کیں۔

ان دنوں کرسٹوفر کولمبس بھی پرتگال میں تھا۔ وہ اپنے پروجیکٹ کے لیے فنڈ جمع کر رہا تھا اور مغرب میں اطلانتک کے پار ہندوستان و چین کا راستہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ پرتگالیوں نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ اپنا پروجیکٹ لیے سپین چلا گیا۔ یہاں قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور ہسپانوی ملکہ ازابیلا اس کی سرپرست بن گئی۔ تیاریوں میں بہت وقت لگ گیا۔ اس کے روانہ ہونے میں چھ سال صرف ہوئے۔ آخر 3-اگست 1492ء کو 'سانتا ماریہ'، 'پنٹا' اور 'نینا' سفر پر روانہ ہوئے۔

اس وقت کے نقشوں کی رُو سے جاپان (زپنگو) کو کینسر کے مغرب میں واقع ہونا تھا۔ چنانچہ کولمبس پہلے جنوب پھر مغرب کی سمت مڑا۔ ٹھیک راستہ پر جانے میں تقدیر نے اس کا ساتھ دیا۔ شمال مغرب کی ہوائیں اسے اڑا کر افریقا کے ساحل پر لے گئیں۔ ہفتوں یہ ہوائیں اطلانتک میں انہیں بھٹکاتی رہیں۔ جہاز ران گھبرا گئے کہ شاید ہم دنیا کے آخری کنارے پر ہیں۔ کولمبس کے پاس اپنے افسروں کی تسلی کے لیے ٹھیک فاصلہ اور انتہائی کم فاصلہ کا حساب موجود تھا۔ مگر جب انہوں نے بغاوت کی دھمکی دی تو اس نے وعدہ کیا کہ تین دن میں زمین اگر نظر نہ آئی تو ہسپانیہ واپس چلے جائیں گے۔

تیسرے دن، گیارہ اکتوبر کو سبز پتوں والی ایک ٹہنی جہاز کے قریب سے گزری۔ اگلے دن سحری کے وقت جہاز راں خوشی میں چلاتے ہوئے ساحل کی طرف بڑھے جہاں برہنہ افراد کا ایک گروہ حیرانی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ کولمبس سان سلواڈور پر اترا۔ اس نے ہیٹی اور کیوبا دریافت کیے۔ پھر سونے کی تلاش کے لیے ایک کالونی کا انتخاب کیا مگر اسے پیچھے چھوڑتے ہوئے سپین واپس آ گیا۔ تمام سفر میں سات مہینے صرف ہوئے۔ کولمبس کا استقبال ایک ہیرو کی طرح کیا گیا۔ اس پر عزت و دولت کی بارش کی گئی۔ عجیب بات ہے کہ کولمبس پھر بھی اس بڑے انعام کا تقاضا کرتا رہا جو اس ملاح کے لیے تھا جس نے سب سے پہلے زمین دیکھی۔ جس ثابت قدمی کی وجہ سے کولمبس نے امریکا دریافت کیا وہ ایک رائٹ مین کی خصوصیت اور ایک حد تک اس کی دیوانہ وار کوشش تھی۔ اسی دیوانگی نے اس کے لیے مسائل بھی پیدا کیے۔

جب دوسرا جہاز 'پنٹا' واپس آیا تو نئی اور پرانی دنیا کے لیے ایک نیا مگر عبرت ناک تحفہ لے کر آیا۔ آتشک، ایک جنسی مرض، جو کیپٹن مارٹن پنزون کو کسی عورت سے لگ گیا تھا اور دس برس میں یورپ اور ایشیا کے کئی ساحلوں میں پھیل چکا تھا۔ نئے رابطے کتنے عظیم تھے۔

کولمبس نے تین اور سفر کیے تھے۔ تیسرے سفر میں اس نے امریکا دریافت کیا تھا۔ مگر اس کی باقی زندگی اینٹی کلائمکس (مایوس کن) تھی۔ اس کے تکبر اور ضد نے کئی مسائل پیدا کیے۔ ایک بار وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا سپین واپس بھیجا گیا۔ اپنی خامیوں سے بالکل بے خبر وہ اپنے آپ کو ایک ولی سمجھتا رہا جسے دنیا نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ تھکا ہارا اور زخم خوردہ، وہ پچپن برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوا۔ افسوس کہ کولمبس اس بات سے بے خبر رہا کہ اس نے ایک نیا ملک دریافت کیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایشیا کے علاقہ میں آیا ہے۔ ایک اطالوی فلاسفر پیٹرو مارتیر نے زمین کے اس سائز کو بنیاد بنا کر حساب لگایا جو اریٹوستھی نس کی رائے اور حساب کے مطابق تھا تو پتہ چلا کہ کولمبس نے ایک نامعلوم براعظم دریافت کیا ہے۔ جسے وہ 'نئی دنیا' کہتا تھا۔ ایک اور سیاح امیریگو ویسپکی (جس نے کولمبس کے بعد جلد ہی اطلانٹک عبور کیا تھا) نے نئے براعظم کو اپنا نام امریکا دیا۔ 1501ء کے ایک نقشہ پر امریکا کو ایک ایسا جزیرہ دکھایا گیا ہے جس کا سائز افریقا کا ایک چوتھائی تھا۔

ان ابتدائی سیاحوں میں سے اکثر نے اپنی جانیں دی تھیں۔ جان کیٹ جس نے شمالی امریکا کا ساحل دریافت کیا اپنے بیڑے سمیت اطلانٹک میں کہیں لاپتہ ہو گیا۔ فلوریڈا کا

پتہ لگانے والا پونس ڈی لیون کسی انڈین کے تیر کا شکار ہوا۔ جون ڈی سولس دریائے پلیٹ کی دریافت کے بعد مشتعل مقامی لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اور فرنینڈو میگلن، (جسے دنیا کے گرد پہلا چکر لگانے کا اعزاز حاصل ہونے والا تھا) نے دراصل اپنا دوسالہ سفر کبھی پورا نہیں کیا۔ وہ فلپائنیوں کو بندوق کے زور پر عیسائی بنانے کی کوشش میں ہلاک ہوا۔

امریکا کے آغاز کی باقی کہانی دغابازی، ظلم اور بے ایمانی کی کہانی ہے۔ 1519ء میں ہسپانیولا کے گورنر نے ہرنندو کورٹیز کو حالات جاننے کے لیے ملک کے اندرونی دور دراز حصوں میں بھیجا۔ اتفاق سے کورٹیز وسطی امریکا کے ساحل پر جہاں اترا۔ وہاں انڈین بعض پُراسرار سفید دیوتاؤں کی واپسی کے انتظار میں تھے۔ لیجنڈ کے مطابق 'سفید چمڑی کے لوگ' سائنس اور انجینئرنگ کا علم لے کر کبھی ماضی بعید میں آئے تھے اور واپسی کا وعدہ کر کے چلے گئے تھے۔ میکسیکو کے ایزٹیکوں نے ہسپانویوں کو غلطی سے 'سفید دیوتا' سمجھا۔ کورٹیز کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ ایزٹک مقامیوں نے گھوڑے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ سمجھے کہ گھوڑا اور سوار ایک وجود ہے۔ چنانچہ ہسپانوی تعداد میں پانچ سے کم ہوتے ہوئے ان کے دارالحکومت تینوچتلان کی طرف بڑھے۔ ان کے بادشاہ مونتے زوما نے شائستگی کے ساتھ ہسپانویوں کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے جب سونے سے بھرے کمرے دیکھے تو انہیں لوٹنا چاہا۔ بادشاہ قیدی بنایا گیا بلکہ کورٹیز خود بادشاہ بن گیا۔ مگر جب وہ کہیں دور گیا لوگوں نے بغاوت کر دی۔ مونتے زوما کو قتل کیا اور ہسپانویوں کو مار مار کر باہر دھکیل دیا۔ کورٹیز کو بھاری توپ خانے کی مدد سے شہر واپس لینا پڑا۔ وسیع پیمانے پر تباہی اور خون ریزی ہوئی۔ کورٹیز تمام میکسیکو میں ایزٹیکوں کی طاقت کم کرنے کی کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ تین برس میں ایزٹیکوں کا نام ونشان مٹ گیا۔

اسی انداز سے فرانسیکو پزارو نے پیرو فتح کیا۔ میگلن کی طرح پیزارو کی مالی امداد شہنشاہ چارلس پنجم کرتا تھا۔ 1532ء میں صرف 188 جوانوں اور ستائیس گھوڑوں کے ساتھ وہ پانامہ سے جنوب روانہ ہوا۔ انکس اپنے بادشاہ اتھلپا کی قیادت میں فوج لے کر اس کے مقابلہ میں آئے۔ پیزارو نے بادشاہ کو مذاکرات کی دعوت دی۔ بادشاہ نہتا اپنے امرا لیے مذاکرات کے لیے آیا تو ہسپانویوں نے اشارہ ملتے ہی ان پر حملہ کر دیا اور سینکڑوں انڈین قتل کر دیے۔ انڈین سونے بھرا ایک کمرہ تاوان ادا کرنے پر آمادہ ہو گئے تاکہ بادشاہ رہا ہو جسے پیزارو نے یرغمال بنا رکھا تھا۔ مگر بادشاہ کا گلا دبا کر اسے مار دیا گیا۔ شاید اس مصیبت کی وجہ سے انکسوں نے ہمت ہار دی کہ انہوں نے کسی مؤثر مزاحمت کے بغیر دشمنوں کو اپنے

دارالحکومت کزکو پر قبضہ کرنے دیا۔'ان کا' سلطنت بھی ایزٹک سلطنت کی طرح آسانی سے تباہ کی گئی۔لوٹ کے مال پر ہسپانوی آپس میں لڑ پڑے اور پزارو بھی ان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

ان **99** برسوں میں جب ہنری کے کارویل نے ابلتے سمندر کا سامنا کیا اور جب پیزارو نے اتھلپا کو قتل کیا، دنیا بہت بدل چکی تھی۔ اتنی کہ اس سے پہلے کسی صدی میں نہیں بدلی تھی۔ کیونکہ ان سیاحتوں کا تعلق صرف جغرافیہ سے نہیں تھا۔ یہ انسان کے باطن کی اوڈیسی تھی۔ اپنے آپ کو پہچاننے، اپنی صلاحیتوں کو جاننے کا سفر تھا۔ چرچ اب بھی انسانی تخیل کا راستہ روک سکتا تھا۔ انسان کو سمجھا سکتا تھا کہ وہ ایک مکار گنہگار ہے، اسے ہاتھ پر ہاتھ رکھے صبر و سکون کے ساتھ اس دن کا انتظار کرنا ہے جب خدا اسے اس ظالم دنیا سے اٹھالے۔ فکر وعمل کی آزادی چرچ کی نظر میں شیطانی عمل تھا جس کی وجہ سے آدم کا زوال ہوا، اسے جنت سے نکالا گیا۔ اور ایسے انسان اب بھی موجود تھے جو چرچ کی ان باتوں کے قائل تھے۔ جاننے اور دریافت کرنے کے یہ سفر جرأت اور آزادی کے نئے عملی سبق تھے۔ چرچ اس حقیقت سے انکار کرسکتا تھا نہ اسے چھپا سکتا تھا۔ کولمبس اور میگلن نے انسان کو سکھا دیا تھا کہ وہ اپنے دماغ کے نامعلوم سمندروں میں کود جانے سے ہرگز نہ ڈرے۔

1512ء میں، میگلن کے سفر سے دو سال پہلے مارٹن لوتھر نے آزادی کے نئے تصور کا اعلان کیا تھا جب اس نے وٹن برگ چرچ کے دروازہ پر اپنا تھیسس (نظریہ) کیلوں سے لگایا تھا۔

'ایجاد' کی صورت میں ایک اور انقلاب آنے کو تھا جسے روکنے میں چرچ بے بس تھا۔ لوتھر کی بغاوت صرف وٹن برگ تک محدود رہتی اگر جرمنی کے شہر مینز میں یہ خاموش انقلاب نہ آتا۔ ایک زرگر وٹن برگ نے انجیل کی کم قیمت نقل بنانے کا تجربہ کیا۔ وسطی زمانوں کے راہب لکڑی یا کسی نرم دھات پر حروف کندہ کرنا جانتے تھے اور پھر انہیں سکرپٹ (مسودہ) پر چھاپ لیتے تھے۔ وٹن برگ انہیں پیتل کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتا تھا۔ بڑا مسئلہ سانچہ توڑنے کا تھا کہ اس کے بغیر حرف باہر نکالنا ممکن نہ تھا اور سانچہ اس طرح بے کار ہوتا تھا۔ اس نے تین حصوں میں ایک سانچہ بنایا جسے ایک سپرنگ جوڑ کر رکھتا تھا کہ اس کے حصے جدا کیے جائیں تو سانچہ نہ ٹوٹے۔ **1440**ء کے عشرہ میں اس نے اس ٹائپ سے انجیل چھاپنا شروع کی۔ یقیناً وہ دولت مند ہوتا مگر اس کا ایک پارٹنر اپنا سرمایہ واپس لینے کے لیے بے تاب ہو گیا اور وٹن برگ کو برباد کر دیا۔ وہ **1468**ء میں اندھا ہو کر فوت ہوا اور دنیا نے اسے بہت

جلد بھلا دیا۔

پرنٹنگ ایک ایسی ایجاد تھی یورپ جس کا منتظر تھا۔صرف تئیس برسوں میں ایک سو دس شہروں میں پرنٹنگ پریس کھل گئے۔ تمام یونانی اور رومی کلاسیکی فن پاروں کے ترجمے سستے ایڈیشنوں میں دستیاب ہو گئے۔ چرچ نے سخت کوشش کی کہ لوگ انجیل نہ پڑھیں کیونکہ جاہلوں پر نجات آسان ہوتی ہے، مگر چرچ اپنی بازی ہار چکا تھا۔

پرنٹنگ کے لیے سستا کاغذ بنائے بغیر پرنٹنگ کا انقلاب بھی ممکن نہ تھا۔ وسطی زمانوں میں راہب اپنے مسودے گائے بکری کی کھالوں اور ان کی جھلیوں پر نقل کیا کرتے تھے۔عربوں نے کاغذ بنانا چین سے سیکھا۔(جہاں چھپائی کی ایک قسم ایجاد ہو چکی تھی) اور کپڑا بننے والی مشین جیسا افقی اور دستی کرگھا خود ایجا کیا، جس میں صرف پیڈل دبانے سے دھاگے الگ ہو جاتے تھے۔ جب لوگوں نے اون کی جگہ سوت پہننا شروع کیا تو پرانا سوت کثرت سے مہیا ہونے لگا۔اس کا نتیجہ اچھا اور سستا کاغذ تھا۔کاغذ جس نے دانتے کو شہرت دی اور ہر قاری کے لیے پڑھنے کو دستی (نقل شدہ) کتاب دی۔

یورپی ذہن پر اس کا یہ اثر ہوا کہ انجیل اور دانتے کو سبقت نہیں ملی بلکہ بہادروں اور دلیروں کے قصے (مورتے ڈی آرتھر) پہلے پرنٹ ہوئے۔اس وقت تک **1920** کے عشرہ میں ان کے مصنف سرتھامس مالوری کے متعلق صرف اتنی جانکاری تھی کہ وہ غالباً **1400**ء میں وارو ِک شائر کے اندر پیدا ہوا اور پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ پھر ایک امریکی سکالر پر پبلک ریکارڈ آفس کے پرانے مسودوں کی ورق گردانی سے انکشاف ہوا کہ مالوری خود جرائم پیشہ تھا اور اس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ جیل میں گزارا تھا جہاں اس نے یہ مشہور کتاب لکھی۔فرانسیسی جنگوں میں ارل آف وارو ِک کے ماتحت لڑنے کے بعد اس نے وارو ِک شائر کی دیہاتی زندگی کو اپنے لیے ویران اور غیر دلچسپ پایا اور ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا سرغنہ بن گیا۔**1451**ء میں انہوں نے کومب میں ایک ایبی (جہاں راہب رہتے تھے) کے دروازے توڑے اور ہر قیمتی چیز لوٹ کر بھاگ گئے۔اس کی لوٹ مار کی کئی وارداتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ان غنڈوں کا پیش رَو تھا جن کے ساتھ ہماری ملاقات آئندہ کسی باب میں ہو گی۔

تیسری یا چوتھی بار نیوگیٹ جیل واپس آ کر اس نے اپنا وقت 'مورتے ڈی آرتھر' کی ترتیب میں گزارا۔اس سلسلہ میں اس نے شاید گرے فرئیر لائبریری سے بھی مدد لی ہو۔ یہ کہ جب اس نے کتاب مکمل کی وہ ابھی جیل میں تھا ان الفاظ سے ظاہر ہے جو اس نے خدا سے دعا

کرتے ہوئے کہا کہ ''میری نجات کے اسباب پیدا کر۔''

ہاتھ سے لکھا سکرپٹ شاید کسی لائبریری میں ہو اور بھلا دیا گیا ہو۔ (دراصل ایک ایسا سکرپٹ جس کے شروع اور آخر کے صفحات لاپتہ تھے۔ 1934ء میں ونچیسٹر سکول کی لائبریری سے ملا تھا) مگر خوش قسمتی سے 1485ء میں مالوری کی موت کے چودہ سال بعد یہ ایک انگریز ناشر ولیم کیکسٹن کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ اسے دنیا کے سامنے لے آیا اور اس کی اشاعت نے انجیل جتنی مقبولیت حاصل کی۔ ایک بدکار اور ڈاکو بالآخر لافانی ہو گیا، اگرچہ دیر سے۔ مگر اس سے بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ 'مورتے ڈی آرتھر' نے شجاعت اور دلیری کے آدرش یورپ کے ہر کونے میں پہنچا دیئے۔ انسان کو رومان اور مہم جوئی کا ذوق دیا۔ مالوری انہیں ہر پڑھے لکھے گھر کے اندر لے گیا۔

چرچ کے لیے انسانی تخیل کی یہ آزادی دہریوں اور کافروں کی ہر تعداد سے زیادہ خطرناک ثابت ہو گی مگر وہ دن ابھی نہیں آیا۔

چرچ کی بالادستی

1478ء میں ایسٹر سے ایک ہفتہ پہلے فلورنس میں قاتلوں کا ایک گروہ آیا۔ ان کا نشانہ میڈیچی گھرانے کے دو افراد لورینزو اور اس کا چھوٹا بھائی جیولیانو تھے۔ قاتلوں میں آرچ بشپ آف پیسا، فرونیسکو سلویتی، فلورنس کے دو ممتاز بینکر فرانسیسکو ڈی پیزی اور برنر ڈو بارنسیلی شامل تھے۔ روم میں اس سازش کی اخلاقی مدد کے لیے پوپ سکسٹس چہارم موجود تھا۔

قتل کی سازش میں ایک پوپ اور آرچ بشپ کا ملوث ہونا ہمارے لیے حیرانی کی بات ہے مگر پندرھویں صدی میں ایسا ہونا عام تھا۔ ہر پوپ ان دنوں دراصل رومی شہنشاہ اور سیزر بنا رہتا تھا۔ ساری دنیا سے آنے والی دولت سے اس نے محل بنائے، آرٹسٹ نوکر رکھے فوجیں کرائے پر لیں۔ مخالفوں کو زہر دیا، حرامیوں کا باپ بنا اور چرچ کے تمام بڑے عہدے رشتہ داروں کو دیئے۔ اٹلی میں کئی حریف بڑے شہر تھے جو تمام چھوٹے شہر ہڑپ کرنا چاہتے تھے۔ پوپ اس لوٹ میں سے اپنا حصہ یقینی بناتے تھے۔ کسی حد تک اسی وجہ سے پوپ اور لورینزو کے تعلقات کشیدہ تھے۔ دونوں ایک چھوٹا قصبہ امولا لینا چاہتے تھے۔ امولا ڈیوک آف ملان کی تحویل میں تھا اور ڈیوک نے اسے لورینزو کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پوپ نے ڈیوک کو رشوت دینے کی ایک صورت سوچی کہ اپنے بھتیجے کی شادی ڈیوک کی ناجائز بیٹی کے ساتھ کر دی۔ چنانچہ امولا پوپ کی ریاست کا حصہ بن گیا۔ لورینزو نے اسے فلسفیانہ انداز میں لیا کہ وہ اسی قسم کا آدمی تھا۔ لیکن جب آرچ بشپ کا انتقال ہوا تو پوپ نے اس کی جگہ اپنے کسی پسندیدہ شخص کو مقرر کرنا چاہا۔ لورینزو نے اس کی مخالفت کی اور اپنے بہنوئی کو اس عہدہ پر فائز کیا۔

میڈیچی فیملی فلورنس کے بہترین بینکر تھے۔ اگرچہ ان کے اہم حریف پازی تھے۔ پازی فلورنس کے عوام میں مقبول تھے۔ مگر اتنے مقبول نہیں تھے کہ میڈیچیوں سے ان کا موازنہ

ہو سکے۔ میڈیچی قدرتی طور سے عوام دوست اور جمہوریت پسند تھے۔ جب پوپ امولا خریدنے کے لیے روپیہ اکٹھا کر رہا تھا تو لورینزو نے پازیوں کو اسے روپیہ ادھار دینے سے منع کر دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ پازیوں پر بھروسا کر سکتا ہے۔ جبکہ فرانسکو پازی سیدھا پوپ کے پاس گیا اور اسے صورت حال سے باخبر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوپ کو روپیہ مل گیا اور اس نے اپنا اکاؤنٹ میڈیچیوں کے بجائے پازیوں کو ٹرانسفر کر دیا۔

اب لورینزو نے ایسی غلطی کی جس میں اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ وہ جوان اور جوشیلا تھا۔ اسے فرانسکو کی غداری پر غصہ بھی تھا۔ جیوانی برونومیو، ایک دولت مند شخص بستر مرگ پر تھا۔ اس کا بیٹا کوئی نہیں تھا لیکن اس کی بیٹی ایک پازی سے بیاہی ہوئی تھی۔ لورینزو نے عجلت میں ایک قانون بنایا کہ مرد کو جائداد کی وراثت میں ترجیح حاصل ہے۔ چنانچہ اس کے بھتیجوں کو برونومیو کی جائداد مل گئی۔ یہ اس وقت ہوا جب پوپ، اس کے بھتیجے، آرچ بشپ، اور فرانسکو پازی نے منصوبہ تیار کیا کہ میڈیچی برادران کو برطرف کر کے پازیوں کو فلورنس کا حاکم بنایا جائے۔ دراصل پوپ خون خرابہ نہیں چاہتا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ خون خرابہ کے بغیر میڈیچی برطرف نہیں ہوں گے۔

پازی فیملی کے سربراہ جوکولو کو بھی سازش میں شامل کیا گیا۔ وہ سازش کے خلاف تھے مگر بہرحال مان گیا۔ ان کے ایک اور ساتھی رینالٹو پازی کا خیال تھا کہ میڈیچیوں کو مالی لحاظ سے تباہ کرنا چاہیے۔ وہ قتل کر کے مشکلات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی بات نہیں مانی گئی۔ ڈیوک آف ملان کا قتل حال ہی میں ہوا تھا۔ ڈیوک کا قتل اس صفائی اور مہارت سے کیا گیا تھا کہ کتنی دیر لوگوں کو اس کے قتل کا پتہ نہ چلا۔ لوگ سمجھے کہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ دونوں میڈیچی بھائیوں کا قتل ذرا مشکل کام تھا کیونکہ دونوں کو کم و بیش ایک ہی وقت قتل کرنا تھا۔ پھر بھی میڈیچی ہتھیاروں اور گارڈ کے بغیر بے فکر گھومتے تھے۔

مانٹی سیکو، ایک پیشہ ور قاتل کو قتل پر مامور کیا گیا۔ اسے لورینزو سے ملایا گیا تا کہ کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔ لورینزو خوش شکل اور شائستہ شخص تھا اسے قتل کرنے کے خیال سے ماؤنٹی سیکو ضمیر کی خلش محسوس کرنے لگا، مگر دیر ہو چکی تھی۔ اب پلان نہیں بدل سکتا تھا۔ قتل کے بعد کرائے کے دونوں فوجیوں کو فلورنس کے گیٹ کے باہر پہنچنا تھا۔ جب ایسا ہو جاتا تو صورت حال خود ہی واضح ہو جاتی۔

منصوبہ سادہ تھا۔ رافیلو سنسونی نامی ایک نوجوان (جس کا تعلق ریاریو فیملی سے تھا)

چند دنوں کے لیے پازیوں کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ پروجیا کے گورنر کی ذمہ داریاں سنبھالنے جا رہا تھا۔ وہ پیسا (Pissa) یونیورسٹی کا نہایت ذہین طالب علم تھا۔ یقینی بات تھی کہ کوریزوا سے کھانے پر بلاتا اور پازی بھی اس کے ہمراہ ہوتے۔ لورینزو اور اس کے بھائی گلیانو کو ٹیبل سے اٹھتے ہی چھرا گھونپ دیا جاتا۔

پلان کے مطابق دعوت نامے بھیج دیے گئے۔ جب لورینزو نے سنا کہ وہ نوجوان فلورنس میں ہے تو اسے کھانے پر آنے کی دعوت دی۔ مگر اس موقع پر ایک رکاوٹ پیدا ہو گئی کہ گلیانو کا گھٹنا زخمی ہو گیا اور اسے بستر میں رہنا پڑا۔ قتل کا منصوبہ ملتوی ہو گیا کیونکہ گلیانو اگر زخمی تھا تو اگلے دن اس کا اپنے بھائی کے گھر آنا ممکن نہیں تھا۔ مگر یہ ممکن تھا کہ اسے ڈیومو کیتھڈرل میں عبادت کے لیے آنے پر آمادہ کیا جا سکے۔

اور اب مونٹی سیکو کے ضمیر میں روشنی کی کرن پھوٹی۔ وہ کھانے پر تو کسی کو قتل کرنے کے لیے تیار تھا مگر عبادت کے دوران قتل کرنا اور بات تھی۔ آرچ بشپ نے اسے بہت سمجھایا کہ ایسا کرنا قانون اور اخلاق کے عین مطابق ہے اور یہ کہ پوپ اسے نجات پانے میں مدد دے گا مگر مونٹی سیکو نے پھر بھی انکار کیا۔

رفالو کو اس سازش سے بے خبر رکھا گیا۔ اسے لورینزو کو گھر سے لینا تھا اور پھر عبادت کے لیے کیتھڈرل جانا تھا۔ جب سازشی افراد لورینزو کے گھر گئے تو پتہ چلا کہ وہ پہلے ہی رفالو کے ساتھ وہاں سے جا چکا ہے۔ مگر اس کا بھائی اب بھی بستر پر تھا۔ پازی اور برونسلی نے اسے تیار کر کے کیتھڈرل ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ چلتے ہوئے پازی نے اسے دوستانہ طور سے گلے لگا کر بھینچا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ گلیانو اپنا خنجر ساتھ لے کر آیا ہے یا نہیں، گلیانو غیر مسلح تھا۔

اشارہ ملتے ہی برونسلی 'غدار' کہتے ہوئے چیخا اور اپنا خنجر گلیانو کے پہلو میں اتار دیا۔ گلیانو تقریباً فوراً مر گیا۔ مگر پادری مفی لورینزو کے معاملہ میں اتنا کامیاب نہیں ہوا۔ پہلے حملہ کرنے کے بجائے اس نے اپنا ہاتھ لورینزو کے کندھے پر رکھا کہ تیار ہو کر زوردار وار کرے۔ لورینزوا اپنے بیمار بھائی سے زیادہ ہوشیار تھا۔ وہ جلدی سے مڑا مگر اس کی گردن زخمی ہو گئی۔ پازی اور برونسلی اسے مارنے کے لیے دوڑے مگر لورینزو کے دوستوں نے اسے گھیرے میں لے لیا اور ایک ایسے کمرہ میں لے گئے جس کے دروازے کانسی کے تھے۔ قاتلوں نے دروازوں کو توڑنے کی بہت کوشش کی مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر انہوں نے وہاں سے جانے

کا فیصلہ کیا۔ لورینزو نے کیتھڈرل خالی ہونے کا انتظار کیا اور پھر اپنے دوستوں کے ساتھ گھر چلا گیا۔

آرچ بشپ جلد ہی سگنوریا محل روانہ ہو گیا جہاں ٹاؤن کونسلر اور اہم مذہبی عہدہ دار یہ اعلان کرنے کے لیے جمع تھے کہ آئندہ آرچ بشپ حکومت کا سربراہ ہو گا۔ اس کے حامی جو اکثر کرائے کے غنڈے تھے اس کے ہمراہ تھے جنہیں آرچ بشپ کے فوراً بعد ہال میں داخل ہونا تھا، تاکہ حاضرین ان سے مرعوب ہوں۔ آرچ بشپ کے محل میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دروازہ بند کر دیا، یہ جانے بغیر کہ اس کے اندر حال ہی میں ایک اسپرنگ لاک لگایا گیا ہے۔ چنانچہ وہ محل میں داخل نہ ہو سکے۔ جب ہانپتے کانپتے آرچ بشپ نے اپنی بات ہکلاتے ہکلاتے شروع کی اور اس کی نظریں دائیں بائیں اپنے غنڈے ڈھونڈتی رہیں تو اس اثنا میں ٹاؤن کونسل کے صدر نے اپنے گارڈ بلائے اور آرچ بشپ کو گرفتار کر لیا۔

اب تک گلیانو کے قتل کی خبر ہر طرف پھیل چکی تھی۔ لوگ محل کے باہر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ محل کے دروازے کھلے تو لوگوں کی نظر کرائے کے غندوں پر پڑی جنہیں انہوں نے وہیں قتل کر دیا۔ بعض لوگ 'پازی ہاؤس' کی طرف بھاگے جہاں زخمی ہونے کے بعد فرانسکو لیٹا ہوا تھا۔ لوگوں نے فرانسکو کو کھڑکی میں سے نیچے پھینک کر مار دیا۔ یہی حشر آرچ بشپ کا ہوا۔ چوک میں موجود جس شخص پر بھی سازش میں شریک ہونے کا شک ہوا لوگوں نے اسے جان سے مار دیا۔ آخر کار لورینزو نے خود سگنوریا پیلس کی کھڑکی پر آ کر لوگوں سے پر امن رہنے اور گھر جانے کے لیے کہا۔

دوسرے دو پازی جوکوپو اور رینالٹو دو روز بعد گرفتار ہوئے۔ جوکوپو کو ٹارچر کر کے عریاں حالت میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور بے چارہ رینالٹو جس نے سازش کی مخالفت کی تھی اسے بھی لورینزو کے حکم پر پھانسی دی گئی۔ یہ ستم رانی لورینزو کی شان کے خلاف تھی۔ دو پادری جنھوں نے لورینزو کو خنجر مارنے کی کوشش کی تھی کہیں چھپے ہوئے پائے گئے۔ ان کے ناک کان کاٹنے کے بعد انہیں پھانسی دی گئی۔ مونتی سیکو، پیشہ ور قاتل بھی گرفتار ہوا۔ اس نے پوپ کو سازش میں ملوث کرتے ہوئے اپنے جرم کا کھل کر اعتراف کیا، جس کے نتیجہ میں اسے تلوار کے ذریعہ سپاہی کی موت مرنے کا اعزاز دیا گیا۔

سازش کی ناکامی سے پوپ سکسٹس بجا طور سے غضب ناک ہوا۔ آرچ بشپ کا قتل اسے اپنی طاقت کے خلاف براہِ راست چیلنج لگا۔ اس نے حکم جاری کیا کہ لورینزو کو روم

بھیجا جائے تا کہ اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ فلورنس نے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ چنانچہ پوپ نے شہر کا بائیکاٹ کیا اور اسے تباہ کرنے کے لیے کروسیڈ کا حکم دیا۔ کئی حریف شہر تھے جن کی عید ہو گئی۔ سینا، اربینا اور نیپلز حکم کی تعمیل کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ سینائیوں نے ڈیوک آف اربینا اور اربنیو کی طرح ٹسکینی پر حملے شروع کیے اور یہی نیپلز کے بادشاہ فیرینیٹ کی سب سے خطرناک فوجوں نے کیا۔ فلورنس کی کرائے کی فوجیں نیم دلانہ مزاحمت کے بعد پسپا ہو گئیں اور بحیرۂ روم کے ساحل پر فیرینسیٹ کو برتری حاصل ہو گئی۔ جب فلورنس زندگی و موت کی جنگ لڑ رہا تھا تو اچانک طاعون پھیل گیا، جس سے ہر روز آٹھ دس افراد ہلاک ہونے لگے۔ لورینزو بھی دانتے کی طرح فلورنس والوں کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اسے کسی وقت بھی دشمن کے حوالے کر سکتے ہیں۔

مگر اس نے بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اس کے دوست فرانسیسی سفیر نے انہیں حملہ کرنے سے روک دیا کہ اگر انہوں نے حملہ کیا تو فرانسیسی ساحلوں پر رکھا ہوا ان کا تمام سامان ضبط کر لیا جائے گا۔ فلورنس کے اتحادیوں وینس اور ملان نے پوپ کی فوجوں پر حملہ کر دیا، جس سے اتنا تو ہوا کہ دشمن کی طاقت اور توجہ بٹ گئی۔ پوپ نے اس کا توڑ یہ کیا کہ کرائے پر مزید فوجیں حاصل کیں جو آلپس سے اٹلی میں داخل ہو گئیں۔ حالات مزید خراب ہو گئے۔

اور اس موقع پر لورینزو نے زندگی کا سب سے بڑا کام کیا۔ اس نے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ فیرینٹ یہی چاہے گا کہ فلورنس جھکے، مگر تباہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ فرانس کا لوئیس **XI** نیپلز کو فرانس کا حصہ سمجھتا تھا اور لورینزو کے دوست کی حیثیت سے عجب نہیں کہ وہ نیپلز پر حملہ کر کے لورینزو کی موت کا بدلہ لے۔ فیرنیٹ کے لیے کیا ضروری تھا کہ وہ ایک غدار پوپ کی خاطر اپنی جان قربان کر دے؟

چنانچہ لورینزو سیدھا شیر کے منہ میں نیپلز کے اندر چلا گیا۔ یہ خطرناک بات تھی۔ فرنیٹ کے متعلق مشہور تھا کہ وہ تحفظ کا یقین دلا کر مہمان کی پیٹھ پر وار کرتا تھا۔ لورینزو کو اپنے ذاتی کرشمہ پر بھروسا تھا اور یہ کہ وہ اٹلی کی سیاست، کسی بھی اور شخص سے زیادہ جانتا ہے۔ تین مہینے لگ گئے مگر بالآخر لورینزو کی جیت ہوئی۔ فرنیٹ نے امن پر اتفاق کیا اور پوپ غضبناک و بے بس ہو گیا۔ لورینزو واپس فلورنس آیا تو لوگوں نے اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ لوگ فرطِ مسرت سے گھروں سے باہر آ گئے اور فلورنس کی تمام گھنٹیاں گنگنانے لگیں۔

اطالوی سیاست کی غیر یقینی کیفیت میں حالات جلد یا بدیر لورینزو کے خلاف ہو

جاتے۔ دراصل نیپلز کا بادشاہ امن پر راضی ہوتے ہی پچھتانے لگا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ لوریبنزو اپنے بحری سفر سے واپس آئے۔ پھر 1480ء میں فلورنس کو ایک غیر متوقع اتحادی ترکی سے امداد ملی۔ ترکوں نے 1453ء میں قسطنطنیہ فتح کر لیا تھا۔ اب انہوں نے اوریٹو کا محاصرہ کر لیا۔ ہر شخص کا خیال تھا کہ یہ لوریبنزو کے ایما سے ہوا۔ وہ فرنیٹ سے اکثر کہا کرتا تھا کہ ترکوں کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات ہیں۔ اب پتہ چلا کہ سچ کہتا تھا اور یٹو فتح ہو گیا۔ عام خیال تھا کہ اب سلطان محمد فاتح دوم روم کا رخ کرے گا۔ پوپ نے سوچا کہ یہ امن قائم کرنے کا وقت ہے۔ اس نے فلورنس سے سفارتی تعلقات بحال کیے اور اس کا بائیکاٹ کیا۔ اگلے سال سلطان محمد فاتح دوم کا انتقال ہو گیا۔ فلورنس امن و خوشحالی کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ دور 1492ء تک جاری رہا، جب لوریبنزو دنیا سے رخصت ہوا۔

اس وقت پوپ سکسٹس کو مرے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ مختلف مراحل طے کرنے کے بعد آخر کار روڈرگو بورگیا پوپ منتخب ہوا۔ اس کے متعلق تمام مؤرخ ایک زبان ہیں کہ وہ نہایت کرپٹ شخص تھا۔

روڈرگو لڑکیوں کا شوقین تھا۔ دوسرے بورگیوں کی طرح وہ بھی خوش شکل تھا۔ اس لیے اس نے ایسی زندگی گزاری جس پر کاسونوا کو بھی رشک آتا۔ اس کی خاص محبوبہ ونوزا کاٹینی تھی جو خود کو اس کی بیوی سمجھتی تھی۔ روڈرگو سے اس کے تین ناجائز بچے تھے، جون، سیزر اور لکریزیا جو بہت حسین تھی۔ سیزر اتنا حسین نہیں تھا مگر اس میں کوئی کمی بھی نہیں تھی۔

ونوزا تیس برس کی ہونے والی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا رشتہ قانونی حیثیت اختیار کر لے۔ روڈرگو اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا مگر اس نے ونوزا کے لیے شوہر ڈھونڈھ لیا جو شوہر بننے کے انعام میں پوپ کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔ روڈرگو نے اس پر واضح کر دیا کہ اپنے نئے شوہر کے ساتھ وفادار رہے۔ مگر 1482ء میں جب اس کا بیٹا جوفر پیدا ہوا تو شک گزرا کہ اس نے وعدہ کی پاسداری نہیں کی۔ پھر بھی اس نے جون اور سیزر کی طرح اسے شفقت سے پالا۔ ان دونوں میں سے ایک کو سپاہی بننا تھا کیونکہ راڈرگو اپنے خفیہ پلان کے مطابق اٹلی کا اقتدار سنبھالنا چاہتا تھا۔ دوسرے کو بہرکیف چرچ جانا تھا کہ ایک دن پوپ بن سکے۔ سیزر کے سخت احتجاج کے باوجود جون کا انتخاب فوج کے لیے ہوا جبکہ سیزر پادری بنایا گیا۔

جب تک اس کا باپ پوپ الیگزینڈر ششم بنے سیزر کے مزاج کی وہ خصوصیت

ظاہر ہونا شروع ہوگئی جس نے اسے اٹلی کا سب سے قابل نفرت انسان بنا دیا۔ وہ نہایت خودسر نوجوان تھا۔ پہلے دن سے ہی اس کی عادتیں بگاڑی گئی تھیں۔اس کی ماں نے اسے بہت چاہا، پھر بہن نے گویا اس کی پرستش کی۔اسی طرح اس کے نہایت طاقتور باپ نے اس سے خوب محبت کی۔ یہ ایک ایسا پس منظر تھا جس کے اندر کیلی گلا اور نیرو پیدا ہوتے ہیں۔ سیزر خوش شکل، ذہین اور طاقتور تھا۔ اسے کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی کہ اس کی خواہشیں پوری نہ ہوں۔اس نے اپنی توہین کبھی کسی کو معاف نہیں کی۔سولہ سال کی عمر میں اس نے پادری کا جبہ اتارا اور پوری طرح مسلح ہوکر، گھوڑے پر سوار روم کا چکر لگایا۔کبھی کبھی اس کی اس روز کی محبوبہ بھی ساتھ ہوتی تھی۔ وہ اعلانیہ اپنی بہن سے عاشقوں جیسا سلوک کرتا جو ابھی جوان ہو رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پوپ نے لکریزیا کی شادی کا فیصلہ کیا۔شوہر جو اس نے چنا اس کا تعلق ملان کے حکمران خاندان سے تھا۔سفروزا خوش ہوا کہ اٹلی کے سب سے طاقتور خاندان کے ساتھ اس کا رشتہ قائم ہونے کو ہے۔مگر جب اس نے سیزر کے چہرہ پر اشتعال کے آثار دیکھے اور سنا کہ وہ دشمنوں کو زہر دے کر مار دیتا ہے تو اسے احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی ہے۔فی الحال شادی نہیں ہوسکتی تھی کہ لکریزیا کم عمر تھی۔موقع ملتے ہی وہ واپس اپنے گھر پسارو بھاگا۔

پوپ پھر محبت میں مبتلا ہوگیا۔ اب ایک نوجوان لڑکی گلیا فرنیز کی باری تھی۔گلیا پوپ کے بھتیجے ارسینو کی منگیتر تھی۔گلیا نے خوبرو رڈریگو کی زیادہ دیر مخالفت نہ کی۔ وہ ارسینو کی بیوی اور روڈرگو کی داشتہ بن گئی۔ یہ رشتہ فرنیز فیملی کی خوش بختی کا آغاز تھا۔ پوپ کے بھتیجے ارسینو نے اپنی بیوی انکل کے ساتھ بانٹنے کا برا نہیں مانا۔ مانتا بھی تو کیا کرسکتا تھا۔انعام کے طور پر پوپ نے گلیا کے بھائی کو کارڈینل بنایا، اگرچہ جانتا تھا کہ اس کی سخت مخالفت ہوگی۔

جب **1494**ء میں فیرینیٹ، نیپلز کا بادشاہ فوت ہوا تو الفانسو، اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ پوپ نے اپنے بارہ سالہ بیٹے جوفر کی شادی الفانسو کی حسین ناجائز بیٹی سنچیا کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کیا۔سولہ سال کی عمر سے سنچیا عیاش سمجھی جاتی تھی۔ وہ بورگیا خاندان میں قابل ستائش اضافہ مانی گئی۔ اس کے علاوہ پوپ بھی نوجوان لڑکیاں پسند کرتا تھا۔ مگر اس سودے سے ایک اور خطرہ پیدا ہوگیا۔فرانسیسی بادشاہ چارلس ہشتم نے نیپلز کی ملکیت کا دعویٰ کیا اور **1494**ء میں چارلس نے اٹلی پر حملہ کیا۔ یہ حملہ چارسو سال کے غیرملکی حملوں اور غیرملکی غلامی کا آغاز تھا۔

پوپ خود بھی چارلس کے حملہ سے بے عزت ہوا۔ فرانسیسیوں نے اس کی محبوبہ گلیا اور گلیا کی بہن کو گرفتار کر لیا جن کی رہائی کے لیے بھاری رقم طلب کی۔ خوش قسمتی سے ان کا گرفتار کرنے والا شخص شجاعت کے اونچے آدرشوں کا قائل تھا جس کی وجہ سے ان کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی۔ مگر روم کی عورتیں اتنی خوش قسمت نہیں تھیں۔ جب جنوری 1495ء میں فرانسیسی فوجیں نیپلز جاتے ہوئے روم سے گزریں تو پوپ نے ساں انجلو میں پناہ لی اور فرانسیسی کئی دن لوٹتے رہے اور ریپ کرتے رہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ لٹیرے پھانسی دیئے جائیں گے۔ مگر بادشاہ کا حکم لٹیروں کو سیزر کی ماں کا گھر لوٹنے سے روک نہ سکا۔ (سیزر نے لٹیروں کو پکڑ لیا اور انہیں بری طرح ٹارچر کیا) پوپ امن کی اپیل کرنے پر مجبور ہوا۔ وہ سیزر کو یرغمال کی صورت فرانسیسیوں کو دینے پر بھی تیار ہو گیا۔ چنانچہ چارلس جب نیپلز روانہ ہوا تو سیزر اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے کارڈینل کا لباس پہنا ہوا تھا اور سترہ ویگنیں اس کے پیچھے تھیں۔ اس نے فرانسیسیوں کو بتایا کہ ان میں سفر کا لباس رکھا گیا ہے۔ سیزر نے کشتی میں اپنی مہارت کی وجہ سے فرانسیسی افسروں میں عزت پائی مگر موقع ملتے ہی فرار ہو کر روم واپس آ گیا۔ اس کی سترہ ویگنیں خالی پائی گئیں۔ روم اس کی پہلی کامیابی پر دل کھول کر ہنسا۔

خارجی جارحیت نے کئی متحارب گروہ متحد کر دیے۔ چارلس کو واپس الپس پار ہٹنا پڑا۔ نیپلز کے الفانسو کو تخت چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ چارلس پسپا ہوا تو واپس آ گیا۔ ایسے میں پوپ نے الفانسو اور اس کی حسین بیٹی سنچیا کو روم آنے کی دعوت دی۔ وہ سنچیا کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ دراصل سنچیا جان گئی تھی کہ وہ پوپ کو انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔ سیزر جو کسی دلکش لڑکی سے نظر نہیں ہٹا سکتا تھا اس نے سنچیا کو اپنے ساتھ لے جانے میں دیر نہیں کی۔ سنچیا سن چکی تھی کہ سیزر اٹلی میں سب سے خطرناک شخص ہے۔ سنچیا کی رضامندی میں اس کی سمجھداری کا زیادہ دخل تھا۔ دونوں کا مسئلہ جنس تھا۔ اس لیے انہوں نے ضمیر کی خلش محسوس نہیں کی۔ پوپ نے رقیب بننے کی خواہش نہیں کی۔ اس کے لیے یہی کافی تھا کہ سنچیا اس پر اپنی نوازشوں کا سلسلہ جاری رکھے۔

روڈرگو اس فکر میں تھا کہ وہ جنگ کو کیونکر اپنے حق میں استعمال کرے کہ اس کی جاگیر میں اضافہ ہو۔ چارلس جب فرانس واپس چلا گیا تو اس نے چارلس کی ایک دوست فیملی اورسیی پر حملہ کا فیصلہ کیا۔ اس کا بیٹا جون جسے سپاہی بننے کا بہت شوق تھا ان دنوں ہسپانیہ میں تھا۔ پوپ نے اسے واپس بلایا اور فوج کا انچارج مقرر کر دیا۔ مگر وہ ناکام جنرل ثابت ہوا۔

جب جنوری 1497ء میں بسانو کے قریب پوپ کی فوجوں کو شکست ہوئی تو پوپ نے امن کی اپیل کی اور جون بدنام ہو کر روم واپس آیا۔ سیزر نے بہرحال اس کی ناکامی پر اپنی خوشی ظاہر نہیں کی۔

لکریزیا کا شوہر جیوانی سفورزا سمجھ گیا تھا کہ اگر وہ سیزر کے قریب رہا تو اس کی خیر نہیں۔ اب وہ مستقل طور پر غیر حاضر رہتا تھا۔ ادھر پوپ نے طے کر لیا تھا کہ لکریزیا کو اسے طلاق دینی چاہیے۔ یہ بڑی بدنامی کی بات تھی مگر یہی ایک راستہ تھا۔ لکریزیا کے شوہر کی نامردی طلاق کی بنیاد بنائی گئی۔ سفورزا کی مردانگی پر حرف آیا تو وہ غصہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ مگر جب اسے معلوم ہوا کہ مردانگی ثابت کرنے کے لیے پادریوں کے ایک پینل کے سامنے اسے کسی طوائف کے ساتھ جنسی عمل کرنا ہوگا تو اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ طلاق پر راضی ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد پوپ نے فیصلہ کیا کہ لکریزیا کے لیے کوئی اور شوہر تلاش کیا جائے۔ جس کے نتیجہ میں سنچیا کے بھائی الفانسو کو اس کا شوہر منتخب کیا گیا۔

اس عرصہ میں روم کے اندر ایک اور افواہ پھیل چکی تھی اس کا تعلق پوپ کے بڑے بیٹے جون بورجیا سے تھا۔ بدھ 14 جون 1497ء کو جون اور سیزر اپنی ماں کے ساتھ کھانے پر گئے۔ تاریکی سے پہلے دونوں ایک پراسرار نقاب پوش کے ساتھ گئے جو کھانے کے دوران ان سے آ ملا تھا۔ جون اس نقاب پوش کے ساتھ حال ہی میں کئی بار دیکھا گیا تھا۔ اب جون اور نقاب پوش دونوں ایک گھوڑے پر سوار تھے۔ ایک موقع پر جون نے بتایا کہ وہ اکیلا نقاب پوش کے ساتھ جا رہا تھا۔ سیزر نے بظاہر مخالفت کی کہ رات کی تاریکی میں تنہا جانا خطرناک ہے۔ مگر پوپ کے حفاظتی دستوں نے روم کی سڑکیں اتنی محفوظ بنا دی تھیں کہ جون نے کوئی پروا نہ کی اور اپنے نقاب پوش دوست کے ساتھ رات کی تاریکی میں کہیں چلا گیا۔ اس کے بعد کبھی اسے زندہ نہیں دیکھا گیا۔ ایک ملاح نے بتایا کہ اس نے ایک شخص کو گھوڑے کی لگام تھامے دریا کی طرف آتے ہوئے دیکھا تھا۔ گھوڑے پر ایک لاش تھی کسی نے گھوڑے والے کو 'مائی لارڈ' کہہ کر پکارا۔ پھر چند لمحوں بعد لاش دریا میں گرانے کی آواز آئی۔

دریا ان دنوں اترا ہوا تھا۔ اس لیے جون کی لاش آسانی سے مل گئی۔ جون کے جسم پر نو گہرے زخم تھے۔ پوپ کا صدمہ سے برا حال تھا۔ وہ ویٹکین میں بند ہو گیا۔ تین روز روتا رہا کچھ کھایا نہ پیا۔ کئی لوگ سمجھتے تھے کہ جون کو پوپ کے دشمنوں نے قتل کیا ہے۔ شاید سفرازاؤں یا آرسیناؤں نے کیا ہو۔ یہ بعد میں ہوا کہ لوگوں نے دو اور دو جمع چار کیے کہ اگر اس کا بھائی

زندہ رہتا تو سیزر کی قسمت میں چرچ ہی ہوتا۔ مگر سیزر چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو سپاہی ثابت کرے۔ بھائی کی موت سے سیزر کو چرچ سے رہائی مل گئی اور اسے ڈیوک آف ویلنس کا فرانسیسی خطاب دیا گیا۔ (یہ نئے فرانسیسی بادشاہ لوئیس XII کے ساتھ پیکج ڈیل کا حصہ تھا) سیزر جب جو چاہتا تھا حاصل کر لیتا تھا۔

سیزر کی ڈیوک شاہی سے دو مقصد پورے ہوئے۔ اس سے فرنچ بادشاہ کے ساتھ پوپ کے تعلقات مستحکم ہو گئے اور سیزر سے پوپ کو کچھ عرصہ کے لیے نجات مل گئی۔ فرانس جا کر سیزر نے پہلا کام یہ کیا کہ بادشاہ سے اپنے لیے دلہن تلاش کرنے کی فرمائش کی۔ اس نے اپنے آپ کو ناپسندیدہ بنانے کا کام بڑے اہتمام سے شروع کیا۔ یہ اس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ گستاخ اور 'بگڑا ہوا بچہ' تھا۔ آخر اس کی شادی کنگ آف نوار کی سولہ سالہ بیٹی سے ہوئی۔ اپنے باپ کے نام خط میں اس نے سہاگ رات کی ہر جنسی تفصیل لکھی کیونکہ یہ باتیں پوپ کو اچھی لگتی تھیں۔ سیزر نے اپنے سرکاری فرائض تندہی سے سرانجام دیئے، اگرچہ ان دنوں وہ اس مرض میں مبتلا تھا جو کولمبس کے ملاح اپنے ساتھ لائے تھے۔ علاج سے آتشک ٹھیک ہو رہا تھا مگر اس کے آثار سیزر کے دلکش چہرے پر نمایاں ہو چکے تھے۔

پھر پوپ کے ایما سے فرانس سے بادشاہ نے اٹلی پر یلغار کی، سیزر اس کے ساتھ آیا۔ روم واپس آ کر اس نے وہ لوگ قتل کرنا شروع کیے جو فرانس میں اس کے ساتھ تھے۔ جن نوجوانوں سے اس کے قریبی تعلقات تھے وہ دعوتوں کے بعد مردہ پائے گئے یا دریائے ٹائبر میں زخموں سے چور ان کی لاشیں ملیں۔ رومنوں کو جون کی یاد آئی اور اس کے قتل میں ملوث ہاتھ نظر آنے لگے۔

اس عرصہ میں سیزر کامیاب جنرل ثابت ہو کر رہا۔ پوپ کو زہر دینے کی ناکام کوشش ہوئی۔ کاٹرینا سفورزا پر اس سلسلہ میں شک کیا گیا۔ کاٹرینا ایک ریاریو امولا اور فورلی کے گورنر کی بیوہ تھی۔ اس کا شوہر پوپ کا سخت دشمن تھا۔ وہ اب بھی حسین عورت تھی۔ سیزر اس امید کے ساتھ فوج لے کر روانہ ہوا کہ کاٹرینا کے صرف دو شہر نہیں ان سے زیادہ بھی فتح کر لے گا۔

دراصل اس کی فتوحات واک اوور (آسان فتح) تھیں۔ کاٹرینا سخت گیر حکمران تھی۔ اس کی رعایا سیزر کے سامنے ہتھیار ڈال کر خوش ہوئی۔ بوگریا، امونا اور فورلی فتح ہوئے، کاٹرینا نے فورلی قلعہ میں پناہ لی۔ مگر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا۔ سیزر نے اس بات کو

یقینی بنایا کہ کاٹرینا ہر چیز سرنڈر کرے اور پھر اس نے باپ کو اس رات کی ہر بات لکھی جو اس نے کاٹرینا کے ساتھ گزاری۔ اپنے آپ سے خوش اور مطمئن سیزر روم واپس چلا گیا۔ اپنے فاتحانہ نشہ میں اسے اپنی بہن یاد آئی۔ اس کے لیے یہ بات نا قابل برداشت تھی کہ وہ اب تک الفانسو کی بیوی بنی رہے اور اس سے (بظاہر) محبت بھی کرے۔ جولائی 1500ء میں الفانسو پوپ کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے سینٹ پیٹر سکوئر عبور کر رہا تھا کہ بعض زائرین اس کے پاس آئے۔ انہیں کچھ دینے کے لیے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ اس پر خنجر چلنے لگے۔ وہ طاقتور تھا اس لیے اس نے سخت مقابلہ کیا۔ پوپ کے گارڈ حملہ آوروں کی طرف بھاگ کر گئے، مگر وہ ہاتھ سے نکل گئے۔ الفانسو، بری طرح زخمی ویٹکن میں اپنی بیوی کے کمرے میں آیا۔ جہاں اس کی بہن سنچیا اور بیوی نے اس کی جان بچانے کی سخت کوشش کی۔ جب وہ ٹھیک ہونا شروع ہوا تو پوپ نے اپنے کمرہ کے ساتھ اسے کمرہ دیا تا کہ اس پر مزید کوئی حملہ نہ ہو۔ پہلے حملہ کے صرف ایک ماہ بعد لکریزیا اور سنچیا ایک گھنٹہ کے لیے اسے تنہا چھوڑ کر گئیں۔ واپس آئیں تو اسے مردہ پایا۔ قتل کے ملزم سیزر نے یہ کہہ کر اعتراف کیا کہ اپنی جان بچانے کے لیے اس نے قتل کیا ہے کیونکہ الفانسو نے باغ کی طرف جاتے ہوئے اس پر تیر چلایا تھا۔

نیپلز کے لوگوں نے اس کیس میں انکوائری کا مطالبہ کیا۔ پوپ نے اس کی اجازت دی مگر بعد میں بھول گیا۔ غم سے بے حال لکریزیا اپنے قلعہ نیپی چلی گئی۔ سیزر نے بھی کسی اور فوجی مہم پر جانے کی تیاری کی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ راستہ میں نیپی ضرور ٹھہرے گا۔ اگرچہ لکریزیا جانتی تھی کہ اس کا بھائی اس کے شوہر کا قاتل ہے، جب آپس میں ملے تو اس نے باہیں سیزر کے گلے میں ڈال دیں۔ سیزر نے بھی یہی ظاہر کیا کہ ایک بار پھر وہ اس کی محبوبہ ہے۔

بہن پر اپنا حق جتا کر سیزر نئی فتوحات کے لیے روانہ ہوا۔ اس میں اتنی جرأت اور دلیری تھی کہ اس کی فتوحات اس پر آسان ہو جائیں اور ان کی تیزی میں بھی کمی نہ آئے۔ مقصد رگمنا کی تسخیر تھی جو وینس کے جنوب میں واقع تھا۔ پوپ نے بارہ نئے نالائق مگر دولت مند کارڈینل رشوت لے کر مقرر کیے جنھوں نے اس مہم کی مالی امداد کے لیے رقم فراہم کی۔ سیزر نے فانو، ریمینی اور پسیارو فتح کیے۔ فنزا نے اپنے نوجوان حکمران کی قیادت میں مہینوں مقابلہ کیا، مگر مارچ 1501 میں آخر ہتھیار ڈال دیے۔ سیزر زور شور سے آگے بڑھ رہا تھا۔ لگتا

تھا کہ کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اپنی تصنیف 'دی پرنس' کے ساتویں باب میں اس کا دوست اور مشیر میکاوَلی ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے۔ جب سیزر نے روگمنا پر قبضہ کیا اور اس کے باپ نے اسے ڈیوک مقرر کیا تو ڈیوک نے سوچا کہ شدید بدانتظامی اور بدامنی کی وجہ سے سخت قوانین نافذ ہونے چاہئیں تا کہ لا اینڈ آرڈر بحال ہو۔ اس نے ایک نہایت ظالم شخص ریمیرو ڈی آرکو کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ اسے پورے اختیارات دیئے کہ لا اینڈ آرڈر بحال کرنے کے لیے جو چاہے کرے۔ اس نے پوری سختی اور شدت کے ساتھ حالات پر قابو پانے کی کوشش کی اور جلد ہی کامیاب ہو گیا۔ اس لمحہ سیزر جو قتل کے الزام سے بچنا چاہتا تھا، اس نے آرکو کو گرفتار کر لیا۔ اس کے دو ٹکڑے کیے اور سیسنا کے چوک میں پھینک دیا۔ لوگ خوش ہو گئے کہ سیزر نے ایک ظالم کو اس کے انجام تک پہنچایا ہے۔

میکاوَلی ایک اور کہانی سناتا ہے کہ جب سیزر کو معلوم ہوا کہ اس کے خلاف چند امرا سازش کر رہے ہیں تو اس نے تمام سازشیوں کو اچھے تعلقات اور آئندہ دوستیوں کا لالچ دیا اور دعوت دی کہ کھانے پر آ کر اپنے مسائل پیش کریں۔ وہ ہتھیار لیے بغیر آئے۔ بات کرنے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ پیچھے سے حملہ کر کے ان کے گلے گھونٹ دیئے گئے۔

1502ء کی گرمیوں میں سیزر نے یہی جوہر میدانِ جنگ میں دکھائے۔ اب اسے ایک شہر کیمرینو فتح کرنا تھا۔ یہ ریمگنا میں دوسرے مقبوضہ علاقوں کے جنوب میں واقع تھا اور اربینو ایک بڑا شہر ان دونوں کے درمیان تھا۔ اس کا ڈیوک، گوئیڈ بلڈو دوست اور اتحادی تھا اور سمجھتا تھا کہ اپنے شہر کے نازک محل وقوع کی وجہ سے اسے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ سیزر نے کیمرینو پر جنوب سے حملہ کیا۔ اور پھر خلاف توقع شمال کی طرف مڑا اور اربینو پر قبضہ کر لیا۔ گوئیڈو کو میٹو ا بھاگنا پڑا۔ پھر سیزر جنوب کی طرف مڑا اور کیمرینو لے لیا۔ اگر کوئی اسے غداری کا الزام دیتا تو شاید جواب دیتا کہ اگر کوئی دوست تمہاری پیٹھ میں چھرا مارنے کی پوزیشن میں ہے تو بہتر ہے کہ پہلے تم چھرا مارو۔

اس عرصہ میں لکریزیا نے پھر شادی کی۔ بورگیوں سے رشتہ جوڑنے میں جو خطرات تھے ان کا خیال کر کے تعجب ہوتا ہے کہ کون اس پر آمادہ ہوا ہو گا۔ مگر پوپ جانتا تھا کہ وہ دن بدن کمزور ہو رہا ہے۔ وہ اپنی پیاری بیٹی کو آباد دیکھنا چاہتا تھا۔ بہت بڑے جہیز کے بدلے ڈیوک آف فریرا تیار ہوا کہ اس کا بیٹا الفانسو ڈانسٹ پوپ کی ناجائز بیٹی سے شادی کرے۔ یہ رشتہ سیزر نے خود تجویز کیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی کامیابیوں نے اسے نیا اعتماد دیا

تھا کہ اس کے ڈنک سے کچھ زہر بھی نکال دیا تھا۔ پیشتر اس کے لکریزیا روانہ ہو، سیزر نے طے کیا کہ آخری راتیں وہ اس کے ساتھ گزارے گی۔

اور پھر انتہائی تیزی کے ساتھ طاقت کا یہ شاندار محل ڈھیر ہو گیا۔ 11 اگست 1503ء کو جمعہ کے روز پوپ اور سیزر شہر سے باہر ایک پارٹی میں گئے۔ ان کا میزبان کارڈینل ایڈریانی کاسٹیلی تھا۔ افواہ کے مطابق بورگیا کارڈینل کی دولت چاہتے تھے اس لیے اپنے ساتھ زہر بھرا مربہ (Jam) لے گئے۔ کارڈینل کو خبر مل گئی۔ اس نے پہلے ہی مہمانوں کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ اگلے دن پوپ، سیزر، کارڈینل سب بستر میں تھے، کئی دنوں تک پوپ اور اس کا بیٹا خطرہ میں رہے۔ پھر دونوں ٹھیک ہونے لگے، یہاں تک کہ پوپ تاش کھیلنے لگا۔ 18 اگست کو اس پر پھر بیماری کا حملہ ہوا اور وہ مر گیا۔

سیزر بستر پر تھا مگر پریشان تھا۔ اگرچہ اس حالت میں بھی وہ جوڑ توڑ میں مصروف رہا۔ جب ایک بے ضرر ضعیف العمر کارڈینل Pius III منتخب ہوا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ کم از کم دم تو لے سکتا تھا۔ مگر کتنی دیر دم لے سکتا تھا۔ ایک مہینہ میں بوڑھا کارڈینل مر گیا اور جس شخص نے جولیس دوم کی حیثیت سے اس کی جگہ لی وہ بورگیوں کا پرانا دشمن تھا۔ جس روز جولیس منتخب ہوا، سیزر نے میکاوَلی سے کہا کہ ''اس نے سوچا تھا کہ اس کے باپ کی موت پر سب کچھ ہو سکتا ہے اور اس نے 'سب کچھ' کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے باپ کی موت کے دن وہ خود بھی مر رہا ہو گا۔''

یہ صحیح جائزہ تھا۔ پہاڑ کے بوڑھے (حسن بن صباح) کی طرح سیزر نے اپنے خلاف اتنی نفرت پیدا کی تھی کہ اسے لوگ 'زہریلا سانپ' سمجھتے تھے۔ تین سال پہلے شہر کی ایک مقتدر شخصیت نے رپورٹ دی تھی کہ ''ہر رات چار یا پانچ مقتولوں کی لاشیں مختلف مقامات سے ملتی ہیں۔ ان میں پادری، بشپ سبھی ہوتے ہیں۔ تمام روم ڈیوک سیزر کے ہاتھوں تباہ ہونے کے ڈر سے کانپ رہا ہے۔'' لیکن اب جبکہ پوپ مر گیا تھا، روم کسی اور کے ڈر سے کانپنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سیزر نے دشمنوں کے حملوں سے بچنے کے لیے ساں اینجلو میں پناہ لی۔ ایک لمحہ کے لیے لگا کہ سیزر کا ستارہ پھر چمکنے والا ہے۔ نیا پوپ اسے فوج کا انچارج ماننے اور بغاوتیں رفع کرنے کے لیے بھیجنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ سیزر کو گرفتار کر کے قیدی کی طرح واپس ویٹکن لے آیا۔ اسے جس کمرہ میں رکھا گیا وہاں لکریزیا کا دوسرا شوہر مارا گیا تھا۔ جو ہسپانوی اس کے حامی تھے انہیں احساس ہوا کہ اسے فوج تیار کرنے کا

موقع دینا خطرناک بات ہے۔ جب سیزر روم سے فرار ہوا اور نیپلز میں اپنے حامیوں کے پاس گیا تو ہسپانوی بادشاہ فرڈیننڈ نے اسے گرفتار کرایا اور اسچیا کے جزیرہ میں قید کر دیا۔ وہاں دو مہینے رہنے کے بعد اسے مجبور کیا گیا کہ روگمنا میں اپنے مفتوحہ علاقے خالی کر دے۔ جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا اسے اب کھو دیا تھا۔ پھر اسے سپین جانے دیا گیا۔ مگر سپین جاتے ہوئے سیزر بھول گیا کہ وہاں ایک عورت بھی رہتی ہے جو اس کے بھائی جون کی بیوہ ہے اور جس نے اپنے شوہر کا بدلہ لینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ سیزر پھر گرفتار کیا گیا اور سن سلا میں قید رکھا گیا۔ اسے زندہ رکھنے کے لیے ہسپانویوں کے پاس ایک ہی وجہ تھی کہ وہ پوپ کے خلاف استعمال ہونے والا قیمتی مہرہ تھا۔ ورنہ سیزر کو جیل میں رکھنا طاعون کے کیڑے کو بوتل میں رکھنا تھا۔

1506ء میں سیزر فرار ہوا اور جا کر اپنے بہنوئی شانوارر کے ساتھ شامل ہو گیا جو سپین میں ایک سرحدی تنازعہ میں الجھا ہوا تھا۔ سیزر پھر کمانڈر بن گیا تھا، اس کے زیر کمان صرف ایک سو سپاہی تھے۔ یہ دکھانے کے لیے کہ وہ اتنا ہی بہادر ہے جتنا کہ پہلے تھا باقی فوج سے آگے جا کر اس نے دشمن پر حملہ کر دیا۔ مگر قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، سخت زخمی اور پیاسا مر گیا۔ یہ پندرہ تاریخ، مارچ کا مہینہ سال **1507**ء تھا اور سیزر بورگیا عمر کے لحاظ سے ابھی اکتیس سال کا نہیں ہوا تھا۔

سیزر کو رونے والے صرف تین تھے۔ اس کی ماں، اس کی بہن اور نکولو میکاوَلی، اس کا دوست اور مشیر، جس نے سوونرولا کے مارے جانے کے بعد اہمیت حاصل کرنا شروع کی تھی۔ ایک غریب وکیل کا بیٹا جو اپنے نشاۃ ثانیہ کے ہمعصروں کی طرح سمجھتا تھا کہ زندگی صرف کامیابی سے عبارت ہے۔ طاقت کا متلاشی ہونے کی وجہ سے اس نے نشاۃ ثانیہ کے اٹلی میں کھیلے جانے والی پاور گیم کا خوب مشاہدہ کیا۔ پوپ اور اسپین کی مدد سے جب میڈیچی اقتدار میں واپس آئے تو اسے نظر انداز کیا گیا جس کے بعد اس نے کتاب لکھنے کا ارادہ کیا۔ میکاوَلی گرفتار ہوا، ٹارچر ہوا اور آخر کار رہا ہوا۔ اس نے اپنی ریٹائرمنٹ 'دی پرنس' کے لکھنے میں صرف کی۔ موقع پرستی کے حق میں اس کی وکالت اتنی غیر معمولی ہے کہ یہ سوچنا بھی محال ہے کہ اس کے پیچھے کوئی خاص مقصد یا مفاد نہیں تھا۔ اس کی تصنیف کو طنز سمجھنے والے میکاوَلی کے نقطۂ نظر کی بنیادی سادگی نظر انداز کرتے ہیں۔ اسے روڈرگو یا سیزر سے زیادہ مذہب میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے لیے زندگی اپنا مقصد حاصل کرنے کا نام تھا۔ میکاوَلی کی نظر میں اٹلی کا اتحاد سب سے اہم سیاسی مقصد تھا۔ رگمنا فتح کرنے کے بعد سیزر اٹلی کو اس اتحاد کے قریب لے آیا

تھا اور اگر اس کی بدقسمتی اسے 1503ء میں بستر علالت پر نہ گراتی تو شاید وہ پورا اٹلی فتح کر لیتا۔ اتنے بڑے مقصد کے سامنے کسی چھوٹی سی غداری کی کیا اہمیت ہے؟

میکاوَلی کی بات ٹھیک لگتی ہے۔ مگر جب ہم سیزر کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں میکاوَلی کی بات میں ایک خامی محسوس ہوتی ہے۔ سیزر ایک نیم پاگل اذیت پسند تھا۔ ایک رائٹ مین جسے اس کی بڑھتی ہوئی انا ہانک رہی تھی۔ اس نے جو کامیابی بھی حاصل کی اسے اس کی اندرونی خرابی، اپنے منفی جذبات کے سامنے اس کی بے بسی نے برباد کیا۔ س کے سیاسی فیصلے بھی کم نظری، کوتاہ اندیشی پر مبنی تھے۔ اس کی ستم رانی نے اسے خطرناک اور اسی لیے قابل نفرت بنا دیا تھا۔ سیزر بے شک علاماتی شخص تھا مگر نشاۃ ثانیہ کی علامت نہیں تھا، جیسا کہ میکاوَلی کا خیال تھا۔ وہ صحیح معنوں میں کریمنل تھا، جرم کی علامت تھا۔ ایسا شخص تھا جس نے زندگی میں قدم قدم پر شارٹ کٹ لیے تھے۔ مجرم کے لیے فوری کامیابی سے زیادہ کوئی اور خرابی نہیں۔ اس سے چیل کی طرح جھپٹنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ سیلف کنٹرول نہ ہو تو جرم حد سے بڑھ جاتا ہے۔ پوپ کے سامنے سیزر کو ایک بار جب کسی کارڈینل پر غصہ آیا تو اس نے تلوار نکال کر اس پر حملہ کر دیا، یہاں تک کہ پوپ کے کپڑے خون سے خراب ہو گئے۔ یہ کسی فولادی شخصیت کی بڑائی نہیں تھی، ایک کریمنل کی کمزوری تھی کہ وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ باپ کی موت سے اسے احساس ہوا کہ اصلی طاقت اس کے پاس کبھی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ باپ کے کندھوں پر سوار رہا۔ اسی لیے اس نے میکاوَلی سے کہا کہ ”میں اپنے باپ کے ساتھ ہی مر گیا تھا“ شوکت وعظمت کے عظیم خواب منوں مٹی تلے دفن ہو گئے تھے۔

اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا ہے کہ کیوں تمام یورپ کے اصلاح پسند چرچ کا زوال چاہتے تھے۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ کرپٹ ہو چکا تھا کیونکہ اس کا علاج تو ممکن تھا بلکہ اس لیے کہ چرچ کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ روڈرگو بوگیا کوئی بہت بُرا آدمی نہیں تھا، سوائے اس کے کہ اس نے چند کارڈینل مروا دیئے تھے۔ اس کے علاوہ پوپ نے کوئی ظلم نہیں کیا تھا۔ مگر عیسیٰ کی تعلیمات سے اس کا اتنا ہی تعلق تھا جتنا کہ تبریس کا تھا۔

تاریخ اپنے اُصول بدلتی ہے

23 مئی 1593ء کی صبح کے دس بجے چار افراد دریائے ٹیمز پر نظریں جمائے یونانی طرز کے ایک ریستوران میں بیٹھے کچھ کھا رہے تھے۔ ان میں ایک بدنام اٹھائی گیرا، ایک ڈاکو، ایک سرکاری جاسوس اور ایک ڈراما نگار تھا۔ ڈراما نگار انتیس سالہ کرسٹوفر مارلو تھا جس نے اپنی تخلیق Tamburlain the Great کی وجہ سے تئیس برس کی عمر میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس کی 'Jew of Malta' اور 'Dr Faustus' بھی اتنی ہی کامیاب تصنیفات تھیں۔

اس روز مارلو یقیناً پریشان ہو گا کیونکہ دو ہفتہ پہلے اس کا دوست Thomas Kyd گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پولیس نے اس کے کمرے کی تلاشی بھی لی تھی۔ وہ اس قابل اعتراض لٹریچر کی تلاش میں تھے جس میں لندن والوں کو آبادکاروں کے خلاف اُکسایا گیا تھا۔ مگر انہیں Kyd کے جو کاغذات ملے ان کا موضوع دہریت اور عیسیٰ مسیح کا انکار تھا۔ Kyd کو Bridewell جیل لے جایا گیا جہاں اسے ریک پر ٹارچر کیا گیا۔ ریک ایک قسم کا شکنجہ تھا جس کے ذریعہ ملزم کو ٹارچر کیا جاتا تھا۔ شدید ٹارچر سے تنگ آ کر Kyd نے اعتراف کر لیا کہ دہریت کے بارے میں تحریریں اس کے دوست کرسٹوفر کی تھیں۔ اس وحشیانہ تشدد کے ذریعہ Kyd کو اس قدر اذیت دی گئی کہ وہ رہائی کے ایک برس بعد مر گیا۔ مارلو لندن سے دور اپنے دوست کے گاؤں سے گرفتار کر لیا گیا، جہاں وہ لندن میں پھیلنے ہوئے طاعون سے بچنے کے لیے چلا گیا تھا۔ مگر اس کے بارسوخ دوستوں کی وجہ سے اسے جلد ہی رہا کر دیا گیا۔ اس کے دوستوں میں Walsingham ملکہ الزبتھ کے سیکرٹری آف سٹیٹ کا کزن اور جاسوسی کے ادارہ کا سربراہ بھی شامل تھا۔ مگر پھر بھی مارلو کو 'سٹار چیمبر' کے سامنے پیش ہونا پڑا کہ

جس کے احتسابی مقاصد مذہب سے زیادہ سیاست کے ساتھ وابستہ تھے۔

مارلو نے دوستوں کے ساتھ کھاتے پیتے اور شاید جاسوسی پر بحث کرتے ہوئے دن گزارا۔ چاروں کبھی Walsingham کے ساتھ کام کرتے تھے۔ انہوں نے دریا کے سرسبز وشاداب کنارے پر کچھ دیر چہل قدمی کی اور کمرے میں جا کر مزید شراب پینے لگے۔ شام چھ بجے وہ بل ادا کرنے چلے تو مارلو اور ایک شخص انگرم فرائیزر کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ عدالتی شہادت کے مطابق مارلو نے چھرا لے کر اس کے سر پر مار دیا جس سے فرائیزر کے سر میں دو زخم آئے۔ دوسرے دوست مارلو سے چھرا چھیننے لگے مگر اتفاق سے چھرا فرائیزر کے ہاتھ آ گیا اور اس نے مارلو کی دائیں آنکھ کے اوپر مار کر دو انچ گہرا زخم کر دیا۔ جس سے مارلو کی فوری موت واقع ہوئی۔

مارلو کے کئی مداحوں نے اس واقعہ پر شک ظاہر کیا ہے۔ فرائیزر کو زخمی کرنے کی کہانی اس صورت میں سچ ہو سکتی تھی کہ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا ہو، اور مارلو نے اسے زخمی کر کے جھگڑے کا بہانہ بنا لیا ہو۔ بہرحال فرائیزر رہا ہو کر واپس اپنی ملازمت پر والسنگھم کے ادارے میں چلا گیا۔ مگر مارلو کو کیوں قتل کیا گیا؟ وہ اپنے دوستوں پر واقعی بوجھ تھا۔ چار سال پہلے وہ ایک ایسی لڑائی میں ملوث تھا جس میں ایک شخص بریڈلے قتل ہوا تھا۔ مارلو کی دوسری گرفتاری کے ایک ہفتہ بعد ولیم بریبز نامی ایک جاسوس نے ملکہ کے لیے ایک رپورٹ تیار کی جس میں کرسٹوفر مارلو کی رائے اس کے قابل مذمت خیالات کے متعلق تھی کہ موسیٰؑ شعبدہ باز تھے اور عیسیٰؑ سولی چڑھانے کے قابل تھے، اور یہ کہ تمام پروٹسٹنٹ منافق ہیں۔ ایک دوسری رپورٹ میں بینز نے مارلو کے متعلق لکھا تھا کہ وہ جہاں جاتا ہے لوگوں کو دہریت کا سبق دیتا ہے۔

پچاس برس پہلے بھی ایسی باتیں ناقابل برداشت تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ فریڈرک دوم نے حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دغاباز کہا تھا مگر اسے ایک متعصب پوپ کی حمایت اور دوستی حاصل تھی۔ جیسا کہ ہیو تھامس نے Unfinished History of the World میں کہا ہے کہ 400ء سے 1400ء کے درمیان ہزار سال میں ایسے خیالات رکھنے والا وہ واحد شخص ہے۔ کلاسیکی کلچر کے پیٹرارک جیسے لوگ بھی ایسی بات سوچنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خدا اور شیطان کے وجود کے اتنے قائل تھے کہ ایسی بات سوچنا بھی ان کے لیے گھاٹے کا سودا تھا۔ اگر جہنم واقعی موجود ہے تو اس کا انکار کر کے سزا کے طور پر جہنم واصل ہونا تھا۔ کیتھولک ازم

کے ساتھ لوتھر کی بے اعتنائی نے یورپ بھر میں بے چینی کی لہر دوڑا دی۔ لگتا تھا کہ جو سوچا نہیں جا سکتا تھا، جو ہو نہیں سکتا تھا وہ ہو گیا ہے۔ گویا کہ پہاڑ ٹوٹ کر گر گیا ہے، جس سے پتہ چلا کہ پہاڑ گتے کا بنا ہوا تھا۔ اگنیٹس لیولا اور کونسل آف ٹرینٹ کی کوششوں سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ بے حرمتی کے نئے رویہ کو ہم مارلو کے 'Jew of Malta' میں دیکھ سکتے ہیں، جب کوئی کہتا ہے کہ ''وہ دیکھو دو مذہبی کیڑے آ رہے ہیں۔''

اسی لیے جب ہم الزبتھ عہد کے لکھاریوں کو پڑھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے خیالات بھی ہمارے خیالات جیسے ہیں۔ دانتے، چاسر، پیٹرارک حتیٰ کہ مالوری بھی اجنبی، کسی دوسری دنیا کے لوگ لگتے ہیں۔ انہوں نے مان لیا تھا کہ وہ کسی بہت بڑی مشین کا چھوٹا سا پرزہ ہیں جسے مشین کے ساتھ حرکت کرنا ہے۔ ان کا تعلق مذہبی شک کی فضا میں پلنے والی پہلی نسل سے تھا۔ انگریزوں نے کبھی مذہب میں دلچسپی نہیں لی، جیسا کہ کونزیرز ریڈ کہتا ہے کہ ''تیس سال میں انہوں نے کسی لڑائی جھگڑے کے بغیر اپنے مذہب میں پانچ مختلف تبدیلیاں قبول کر لیں۔'' (The Tudors : p.138) جو لوگ پروٹسٹنٹ سے کیتھولک فرقہ کی طرف جانے اور پھر واپس آنے کو معمول کی بات سمجھتے ہوں وہ نہیں مانتے کہ دونوں میں سے کوئی ایک ہی سچ کا اجارہ دار ہے۔ وہ دہریت کی طرف بے شک مائل نہ ہوں مگر نئی مذہبی فضا کی وجہ سے وہ کیلون کے نظریہ، تقدیر اور روح کے غیر فانی ہونے پر بحث کے لیے تیار تھے۔ (مارلو کے ہمعصر والٹر ریلے کو دہریہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ اسے ایسے موضوعات پر بات کرنے کا بہت شوق تھا) جنہوں نے انہیں ممنوعہ موضوعات سمجھنا چھوڑ دیا تھا وہ اپنے ضمیر کے سامنے خود جواب دہ تھے۔ دراصل انہوں نے فرد کی طرح سوچنا اور جینا شروع کر دیا تھا۔

عیسائیت پر ایک اور طرف سے حملہ ہو رہا تھا، مگر اس رفتار سے کہ پہلے تو کسی کو اس کا احساس نہ ہوا۔ 1506ء میں نکولس کوپرنیکس نامی ایک فزیشن اپنے چچا بشپ آف ارم لینڈ (پولینڈ اور پروشیا کے درمیان) کا سیکرٹری اور میڈیکل ایڈوائزر بنا۔ کوپرنیکس چرچ کا ممبر تھا۔ فلکیات اس کا مشغلہ تھا۔ چھ برس بعد جب اس کا چچا فوت ہو گیا تو اسے ستاروں کے مشاہدہ کے لیے زیادہ وقت ملنے لگا۔ اس نے ایک چھوٹی سی کتاب میں لکھا کہ سورج کائنات کا مرکز ہے اور زمین سال میں ایک مرتبہ اس کے گرد چکر لگاتی ہے۔ اس حیرت انگیز انکشاف سے ہر اس بات کی تردید ہو گئی جس پر چرچ کو وسطی زمانوں سے یقین تھا۔ چرچ تولمی کے سسٹم کو تسلیم کرتا تھا، جس میں زمین کائنات کا مرکز ہے۔ جس کسی نے بھی آسمان کو غور سے دیکھا ہو

تولمی کا پیچیدہ نظام اس کے لیے مسئلہ تھا۔ اس میں بتانا پڑتا تھا کہ سیارے کیوں اتنے پیچیدہ مدار میں زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ کبھی تو پیچھے چلے جاتے ہیں۔ کوپرنیکس آسانی کے ساتھ ڈر جانے والا مختصر سا آدمی تھا۔ انقلابی تو کسی طور نہیں تھا۔ اس نے دیکھا کہ اگر اسے سچ سمجھ لیا جائے کہ زمین دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گھومتی ہے تو یہ تضاد ختم ہو جائیں گے۔ کوئی شخص کوپرنیکس کے خیالات پر حیران نہیں ہوا، اس وقت بھی نہیں جب اس نے 1542ء میں On the Revolution of Heavanly Bodies شائع کی۔ دراصل پوپ کے دست راست کارڈینل کی رائے تھی کہ کتاب شائع ہونا چاہیے اور جب شائع ہوئی تو کسی نے توجہ نہ دی۔ اس کی اشاعت کے جلدی بعد کوپرنیکس مر گیا اور جلد ہی بھلا دیا گیا۔

پچاس برس بعد اپنے دَور کے سب سے بڑے ماہر فلکیات Dane Tycho Brahe کو یقین آ گیا کہ کوپرنیکس غلطی پر تھا اور یہ کہ زمین کائنات کا مرکز ہے۔ اس کے استدلال کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے خیال میں زمین اگر سورج کے گرد گھومتی ہے تو ہر سال اسے لاکھوں میل سفر طے کر لینا چاہیے۔ اس صورت میں ستاروں کو اپنی پوزیشن بدل لینی چاہیے، جیسے کہ چرچ کا مینار چلتی ٹرین سے دیکھیں تو اپنی پوزیشن بدل لیتا ہے۔ مگر ستارے تو اپنی پوزیشن نہیں بدلتے۔ ٹائیکو نے یہ نہیں سوچا کہ ستارے ہم سے لاکھوں میل دور ہیں، اس لیے ہم ان میں ہونے والی کوئی چھوٹی تبدیلی نہیں دیکھ سکتے، جب تک ان کی پوزیشن ناپنے کا کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوتا۔

اگرچہ ٹائیکو کے پاس Magnifying Telescope نہیں تھی، (جو ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھی) پھر بھی اس نے سیاروں کی پوزیشن جاننے کے لیے ہزاروں مشاہدے کیے۔ جب وہ 1601ء میں فوت ہوا تو اس کے نوعمر ساتھی جوہانس کیپلر نے اس کے اعداد و شمار اور ان قوانین کا مطالعہ کیا جن کے تحت سیارے گردش کرتے تھے۔ ٹائیکو کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہر سیارہ مختلف رفتار سے اور مختلف وقت پر گردش کرتا ہے۔ یہی بات اس کے لیے پریشان کن اور بے معنی تھی۔ پھر ایک روز اس نے ایسے ہی ایک سیارے کی تصویر بنا لی اور دیکھا کہ وہ ہرگز پیچیدہ نہیں بلکہ بیضوی شکل کی ہے۔ اس نے اپنی تھیوری 1609ء میں 'The New Astronomy' کے اندر شائع کی۔ ماہرین فلکیات نے اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھا جبکہ دوسروں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔

ان ماہرینِ فلکیات میں سے ایک گلیلیو گیلی نامی اطالوی بے حد ذہین تھا۔ وہ پادوا

میں ریاضی کا پروفیسر تھا۔ جس سال کیپلر کی کتاب بازار میں آئی اسی سال گلیلیو نے ایک نئی ایجاد کی خبر سنی جو ہالینڈ میں فیشن بن گئی تھی۔ لینز (Lense) دنیا میں تین صدیوں سے موجود تھے۔ دراصل قدیم Rock Crystal Lenses نینوا اور کارتھیج میں پائے گئے تھے۔ اب ایک ڈچ کو معلوم ہوا تھا کہ اگر دو لینز گتے کی ٹیوب کے کونوں پر آمنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو دور کی چیزیں بڑی ہو کر نظر آتی ہیں۔ گلیلیو نے جلدی سے ٹیلی سکوپ بنایا اور 1609ء میں خزاں کی ایک رات کو اس کے ذریعہ چاند کو دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ چاند کی سطح ہموار نہیں تھی بلکہ اس پر دھبے اور گڑھے تھے۔ مزید غور سے دیکھا تو وہ دھبے وادیاں اور پہاڑ تھے۔ پھر اس نے اس دودھیا راستہ کا جائزہ لیا جو سفید گیس کی طرح نظر آتا تھا تو پتہ چلا کہ وہ لاکھوں ستاروں کا ہجوم ہے۔

یہ اس وقت ہوا جب اس نے ٹیلی سکوپ کا رخ جوپیٹر کی طرف کیا۔ اس نے تین ننھے 'ستارے' سیارے کے کنارے روشن دیکھے۔ اگلے دن وہ دوسری طرف چلے گئے۔ یعنی وہ ستارے نہیں تھے بلکہ ہماری زمین کے چاند کی طرح جوپیٹر کے چاند تھے۔ مگر ہمارا چاند ہمیشہ کوپرنیکس کے مخالفوں نے اس کی تھیوری کے خلاف استعمال کیا۔ اگر زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو چاند کیوں زمین کے گرد گھومے؟ ظاہر ہے کہ وہ فطرت کے قانون سے الگ نہیں۔ اب گلیلیو دیکھ سکتا تھا کہ چاند صرف ہمارا نہیں بلکہ دوسرے سیاروں کے بھی چاند ہیں۔ جوش میں آکر گلیلیو نے 'The Starry Messenger' کے نام سے کتاب لکھی۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ بکی اور گلیلیو آنکھ جھپکنے میں مشہور و معروف ہو گیا۔ وہ مارکوپولو کے سفرنامہ کی طرح دور دراز اَن دیکھے علاقوں کی کہانی تھی۔ ہر شخص اسے پڑھنا چاہتا تھا۔

درحقیقت گلیلیو ایک بڑا سائنسدان تھا مگر ابھی لوگ اس کے کام سے عام طور پر واقف نہیں تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ کیتھیڈرل میں بیٹھا تھا کہ اس نے چھت کے لیمپ کو آگے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے جان لیا کہ لیمپ آگے پیچھے جھولنے میں ایک جیسا وقت لیتا ہے۔ چند سال بعد وہ ایک جھکے ہوئے مینار کی چوٹی پر گیا اور ایک ہی وقت ایک بھاری اور دوسرا ہلکا گیند اوپر سے پھینکا تو دیکھا کہ دونوں نے زمین پر گرنے میں ایک جیسا وقت لیا ہے۔ جس سے ارسطو کا یہ کہنا غلط ثابت ہوا کہ بھاری چیز ہلکی چیز کے مقابلہ میں جلدی گرتی ہے۔

مگر ایک انسان کی حیثیت سے گلیلیو میں کئی خامیاں تھیں۔ طالب علمی کے زمانہ

سے وہ خودسر اور خود پسند تھا۔ پینتالیس برس کی عمر میں اچانک ملنے والی شہرت نے اس کی ان خامیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ اکیڈمی آف سائنس نے اس کے اعزاز میں دعوت دی اور ٹیلی سکوپ کی ایجاد کے سلسلہ میں حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے اپنا ممبر بنا لیا۔ پوپ پال پنجم نے اسے اپنی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع دیا۔ مگر شہرت کے نشہ میں وہ سارے آداب بھول گیا۔ جب سائنس کے میدان میں اس کے حریفوں نے اس کے خیالات پر اعتراض کیے تو اس کا مزاج اور بگڑ گیا اور اسے اپنی توہین خیال کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اکثر معاملات میں گلیلیو سچا تھا اور وہ غلط تھے۔ مگر یہ اس کی بدسلوکی کا جواز نہیں تھا۔ بلکہ چرچ کو اس کے بے دلیل دعوؤں کی فکر ہونے لگی۔

درحقیقت چرچ کو اس معاملہ میں مداخلت کا حق حاصل تھا۔ کارڈینل رابرٹ بیلر مائن، اپنے دور کے ایک معتبر مؤرخ کا کہنا تھا کہ اگر گلیلیو سمجھتا ہے کہ کوپرنیکس کا نظریہ درست ہے تو اسے درست ثابت کر کے دکھائے اور یہ وہ کام تھا جو گلیلیو نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اسے اب تک کشش ثقل کے اصول سے پوری واقفیت نہیں تھی۔ یہ تو کشش ثقل ہی بتائے کہ سیارے کیوں اس طرح سورج کے گرد چکر کاٹتے ہیں گویا کہ آپس میں دھاگے سے بندھے ہوئے ہوں اور کیوں وہ اس وقت تک ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہے جب تک کہ ان کے مدار گول رہنے کے بجائے بیضوی نہیں ہو گئے۔

ڈاکٹر ولیم گلبرٹ نے 1600ء میں اپنی کتاب On Magnets میں لکھا ہے کہ زمین بذات خود بہت بڑا مقناطیس ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ چیزیں خلا میں اڑنے کے بجائے اس کے ساتھ کیوں چپک جاتی ہیں۔ مگر گلیلیو یہ بات نہیں سمجھ سکا۔ بلکہ اس نے ایک کتاب 'Dialogue on the Two World Systems' لکھ دی، جس میں اس نے بدستور کوپرنیکس کی حمایت کی کہ اس کا خیال درست تھا۔ پوپ اربن ہشتم نے اس کا سکرپٹ پڑھا تو کہا کہ گلیلیو ایسی بات پر اصرار نہ کرے جسے وہ ثابت نہیں کر سکتا۔ اسے تولمی اور کوپرنیکس دونوں کے سسٹم پیش کرنا چاہئیں اور باقی سب کچھ قارئین پر چھوڑ دینا چاہیے۔

گلیلیو جیسے سخت مزاج آدمی کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ اس نے خفیہ طور سے کتاب چھپوا کر اس پر ایک چرچ سے منظوری کی مہر لگائی۔ ایک سادہ مگر جاہل پادری سے یہ کام لے کر اس نے کتاب 1632ء میں شائع کر دی۔ پوپ نے جب کتاب پڑھی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ گلیلیو کے خیالات سے زیادہ اسے گلیلیو پر غصہ آیا کہ اس

نے اس کی کھلی نافرمانی کی اور پوپ کے ساتھ مقابلہ پر اتر آیا۔ پوپ بھی بہت سخت مزاج تھا اور اس کے پاس طاقت بھی بہت تھی۔ چنانچہ کتاب ضبط ہوگئی اور گلیلیو کو عدالت کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ وہ اپنا دفاع کیا کرتا؟ اس نے پوپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کوپرنیکس کے مفروضہ کو تھیوری کے طور پڑھائے گا، اسے ایک مصدقہ حقیقت سمجھ کر نہیں پڑھائے گا۔ مگر اس نے اپنا وعدہ توڑ دیا تھا۔ اسے اپنا بیان اس طرح بدلنا پڑا کہ 'سورج کائنات کا مرکز ہے' اگر چہ لیجنڈ بیان کرتی ہے کہ اس نے زیر لب بڑ بڑاتے ہوئے کہا ''یہ گھومتی تو ہے۔'' (مطلب زمین) تب اسے آزاد کیا گیا۔ سائنس کے مؤرخ کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے چرچ کی منافقت اور سائنس کے طالب علم کی دیانت ظاہر ہوتی ہے۔ جبکہ اس مقدمہ میں سے چرچ کامیاب ابھرا ہے اور سائنسدان ملزم ٹھہرا ہے۔

مگر یورپ نے اسے اس طرح نہیں دیکھا۔ صدی ختم ہونے سے پہلے نیوٹن کی 'Principia' نے کسی شک وشبہ کے بغیر یہ کہہ دیا تھا کہ کوپرنیکس کا خیال ٹھیک ہے اور یہ دعویٰ اس شد و مد اور ریاضی کے کرتب اور حساب دانی کے ساتھ کیا گیا کہ کسی کو شک کی ہمت نہ ہوئی۔ کوئی شک نہیں کہ نیوٹن نے گلیلیو کی گتھی کا گمشدہ حصہ (یعنی کشش ثقل) تلاش کر لیا تھا۔ جو گلیلیو نہ کر سکا، وہ اس نے کر لیا تھا۔ اس نے کوپرنیکس کی تھیوری کو ثابت کر دیا۔ پوپ پال ہشتم گلیلیو سے یہی کروانا چاہتا تھا۔ کھلے ذہن کے سائنسی طالب علم کا کریڈٹ اسے ملنا چاہیے تھا۔ مگر اس کی بجائے چرچ کو خواہ مخواہ مذمت کا سامنا کرنا پڑا۔

یورپ اب ایک ایسے عہد میں داخل ہو رہا تھا جس پر ایتھنز کے گہرے اور پائیدار نقش نمایاں تھے۔ فرانسس بیکن (1561ء) کرسٹوفر مارلو سے تین برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ بیکن سائنس کا پہلا عظیم صاحب بصیرت انسان تھا۔ فرانس کا بھی وہی تھیسس تھا جس کی بدولت روجر بیکن کو تین سو سال پہلے جیل کا منہ دیکھنا پڑا تھا کہ سائنس کی بنیاد مشاہدے اور عقل (استدلال) پر ہونی چاہیے نہ کہ ارسطو جیسے کاہل فلسفیوں کی تحریروں پر جو اپنے مشاہدات پرکھنے کی زحمت نہیں کر سکتے تھے۔ بیکن کے اپنے ڈاکٹر ولیم ہاروے نے خون کی گردش دریافت کی تھی۔ فرانس میں ڈیکارٹ پڑھا رہا تھا کہ ہر علم کی بنیاد عقل پر ہے اور ہر چیز پر شک ہونا چاہیے، جب تک کہ وہ پرکھی نہ جائے۔ (چونکہ وہ ایک عیسائی ملک میں رہتا تھا، اس لیے چرچ پر تنقید کر کے جیل نہیں جانا چاہتا تھا) بیکن کا سیکرٹری تھامس ہابز تاریخ کا پہلا فلسفی تھا۔ یہ اس نے کہا تھا کہ ''انسانی زندگی اپنی فطری حالت میں تنہا کمتر، دشوار، ظالمانہ اور خام ہوتی

ہے۔'' اس کی رائے میں مذہب اس کا حل نہیں۔ بلکہ وہ سماجی معاہدہ ہے جو ایک مضبوط حکومت کے سایہ میں انسان مل جل کر رہنے کے لیے کرتے ہیں۔ انسان نے سوسائٹی اور حکومت تخلیق کی ہے کہ وہ نظم وضبط اور امن چین سے زندہ رہے۔ کسی بادشاہ کو حکومت کرنے کا خدائی حق نہیں۔ حکومت صرف اتفاق رائے سے ہوتی ہے۔ سپنوزا کو ہالینڈ میں یہودیوں کی ایک مذہبی تقریب سے اس لیے نکال دیا گیا کہ وہ اصرار کرتا تھا کہ مذہب کی بنیاد عقل پر ہونا چاہیے اور یہ کہ عقل کے ذریعہ ہر مذہبی بصیرت حاصل ہو سکتی ہے۔ جان لاک بھی سپنوزا کی طرح اسی سال (1632ء) پیدا ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نیک ہے اور زندگی کے جس اصول پر وہ آخرکار بھروسا کر سکتا ہے وہ عقل ہے، وہ استدلال ہے۔

یہ لوگ افلاطون اور اطالوی انسان دوستوں کے سچے وارث تھے اور لوتھر سے زیادہ اسٹیبلشمنٹ کے دشمن تھے۔ جس بات نے انہیں اور بھی خطرناک بنا دیا تھا وہ ان کی کسی مذہب کو چیلنج نہ کرنے کی خواہش تھی۔ وہ اس نئی دنیا کے نئے امکانات پر جان دیتے تھے جو عقل اور تخیل کی دین تھی۔ ڈیکارٹ نے تجزیاتی جیومیٹری، نیوٹن اور لیبنز نے **differential calculas** اور ریاضی کے نہایت طاقتور آلے بنائے کہ فطرت کے راز جان سکیں۔ پھر بھی تینوں اپنے آپ کو آرتھوڈوکس عیسائی سمجھتے تھے۔ بلکہ نیوٹن نے تو اپنی زندگی کے کئی سال انجیل کی کرونالوجی پر مبنی ''زمین کی تاریخ'' پر کام کرنے میں صرف کیے تھے۔ ایچ جی ویلز 'شارٹ ہسٹری آف دی ورلڈ' میں کہتا ہے کہ ''بنی نوع انسان کی تاریخ پچھلے چار سو سال سے اس قیدی کی طرح ہے جو مسلسل نیند میں ہو۔ بے آرامی اور بے چینی میں ہو۔ قید خانہ کو آگ لگ جاتی ہے جو اس کی پناہ ہے اور جس نے اسے روک رکھا ہے۔ آگ لگ جاتی ہے مگر وہ نہیں جاگتا بلکہ اپنے قدیم بے معنی خوابوں کو بھی آگ کی تپش میں شامل کر لیتا ہے۔

مگر اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ ڈیکارٹ، نیوٹن اور لیبنز سوئے ہوئے ہیں۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ لیبنز نے سوسائٹی آف سکالرز کا خواب دیکھا ہے، جو سائنس کی ہر قسم کی تحقیق کریں گے اور ہر دریافت کو ایک سسٹم میں یکجا کر دیں گے۔ اور یہ کہ نیوٹن کی '**Principia**' نے مستقبل کے سائنسدانوں کو کائنات کے مکینکس کی چابی مہیا کی ہے۔ ہر شخص جو انسانی تاریخ کے معنی سمجھتا ہے جان لے گا کہ نسل انسانی ابھی بیداری سے دور ہے۔

جب سائنسدان اور فلسفی سچ کے خواب دیکھ رہے تھے تو باقی دنیا اپنے محبوب مشغلے 'قتل عام' میں مصروف تھی۔ مگر اس کے انداز بھی بدل رہے تھے۔ ایک پرانے سٹائل کا فاتح

عالم' بابر' تیمور لنگ اور چنگیز خان کی اولاد میں سے تھا۔ جس سال کولمبس امریکا سے واپس آیا اسی سال بابر فرغانہ (چنگیز خان کا وطن) میں تخت نشین ہوا۔ جب تک بابر بیس برس کا ہوا اس نے سمرقند دو مرتبہ کھویا اور دو مرتبہ حاصل کیا تھا۔ تاتاریوں کے ہاتھوں ماوراء النہر سے نکلنے کے بعد وہ افغانستان کا بادشاہ بن گیا۔ پھر اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ 1519ء میں اس کا پہلا حملہ ناکام ہو گیا۔ پانچ سال بعد اس نے بارہ ہزار فوج کے ساتھ پھر حملہ کیا اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔ جب اس کا بیٹا ہمایوں بیمار ہوا تو بابر نے دعا کی کہ ہمایوں کی موت اسے آ جائے۔ ہمایوں صحت یاب ہو گیا اور بابر بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ ایک افغان سردار نے ہمایوں کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ مگر پندرہ سال بعد اس نے دہلی پھر فتح کر لی۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ایک حادثہ میں ہمایوں کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا اکبر، مغل اعظم اس کا جانشین ہوا۔ اکبر شمالی ہندوستان اور افغانستان کی سلطنت وسیع کرتا رہا۔ مگر وہ تیمور لنگ نہیں تھا بلکہ قبلائی خان سے زیادہ قریب تھا۔ اس کی سلطنت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ عیسائی بھی کثیر تعداد میں تھے۔ وہ سب سے ایک جیسا سلوک کرتا تھا اور ترقی کے یکساں مواقع دیتا تھا۔ اس کا دربار شان و شوکت اور علم کے لحاظ سے مشہور تھا۔ چنانچہ جب مذہبی جنگوں نے یورپ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور ڈیوک آف الوا ولندیزیوں کو ہزاروں کی تعداد میں جلا رہا تھا، اس وقت اکبر ایسی دریا دلی اور رواداری سے کام لے رہا تھا کہ اشوک کے بعد اس کی مثال ملنا محال ہے۔

چین میں پرانا نظام غالب رہا کیونکہ جاپانیوں کی طرح چینی بھی تبدیلی کے خواہش مند نہیں ہوتے۔ منگولوں کو 1368ء میں چین سے نکال دیا گیا تھا۔ ان کی جگہ منگ (Ming) خاندان نے لی، جس کی وجہ سے چین میں تین سو سال امن اور قانون کا دور دورہ رہا۔ اس خاندان کی بنیاد ایک بھکاری ہنگ ڈو نے رکھی جو باغی بن گیا تھا اور جسے اپنے وزیروں کو ٹارچر کرنے کی عادت تھی۔ اس کے جانشین کچھ بہتر تھے کہ انہوں نے کم از کم قانون اور امن قائم کیے رکھا، اس کے باوجود کہ شمال میں منگول حملے کرتے رہے اور جاپانی سمندری قزاق بھی بدامنی پھیلاتے رہے۔ اس کے لوگ غیروں کو اتنا ناقابل اعتماد سمجھتے تھے کہ انہوں نے چین آنے والے پہلے پرتگالیوں کو قتل کر دیا۔ 1644ء میں پیکنگ پر ایک لٹیرے نے قبضہ کر لیا جو خود کو ''جوشیلا جرنیل' کہلاتا تھا اور آخری منگ شہنشاہ نے شہر کی ایک پہاڑی پر جا کر خودکشی کر لی۔ جلد ہی اس کی جگہ ایک وحشی لشکر مانچو نے لے لی جنھوں نے بیسویں صدی تک چین پر حکومت کی۔ اجنبی تاجر خصوصاً انگریز ان کی اہمیت بتدریج کم کرتے رہے۔ انگریزوں

نے ہی چین میں افیم کو رواج دیا۔ ہم چین کو قدیم دنیا کی آخری آؤٹ پوسٹ (فوجی چوکی) کہہ سکتے ہیں جو تاریخ کے پرانے قانون پر عمل پیرا رہی۔ ایسے شہنشاہوں کی سرزمین، جو بتدریج فربہ اور نکمے ہو چکے تھے اور جن کا نئے وحشیوں کے ہاتھوں چین سے نکلنا مقدر ہو چکا تھا۔

اس عرصہ میں یورپ کے اندر جو کھیل کھیلا جا رہا تھا وہ نئے قواعد کے مطابق تھا۔ پرانے قواعد ہوتے تو سپین کے فلپ دوم جیسا طاقتور اور دولت مند بادشاہ آدھا یورپ فتح کر لیتا۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اپنے باپ کی طرح بے دریغ آگے بڑھنا نہیں جانتا تھا جو اسے چارلس پنجم (اپنے باپ) کا لائق جانشین بنا دیتا۔ وہ ایک محنتی بیوروکریٹ اور مذہبی جنونی کا بے ہنگم مجموعہ تھا۔ ایک سمجھدار بادشاہ اپنے پروٹسٹنٹ ازم کو الگ کر کے اپنی ولندیزی رعایا کو مطمئن کرتا۔ انگلستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرتا اور اپنی پوری فوجی قوت کے ساتھ ترکوں کا مقابلہ کرتا۔ مگر اس نے ولندیزیوں کو قتل کیا اور انگلینڈ سے تعلقات بگاڑ لیے، حالانکہ وہ ابھی بحیرۂ روم میں مسلمانوں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اپنی طاقت تقسیم کر کے اس نے اپنے آپ کو کمزور کر لیا تھا۔ برطانوی بحری بیڑے اور خراب موسم نے 1588ء میں آرمیڈا کو تباہ کر دیا تھا۔ اس کی ساری سکیمیں دھری رہ گئیں اور ترکوں کو اگرچہ شکست ہوئی مگر وہ مزید ایک سو سال اپنا اقتدار وسیع کرتے رہے۔ فلپ جیسا 'بُل اِن دی چائنہ شاپ' (برتنوں کی دکان میں بیل گھس آنا) رویہ اسے نوعمری میں دنیا کا فاتح بنا دیتا۔ مگر یورپ میں 'چائنہ شاپ' بہت چھوٹی اور بہت پُرہجوم ہو رہی تھی، اس لیے ممکن تھا کہ دنیا کا فاتح فرش پر ٹوٹے ہوئے برتنوں کے درمیان جان دے دیتا۔

ملکہ الزبتھ کا جانشین جیمز اوّل ہرگز 'بُل اِن دی چائنہ شاپ' نہیں تھا۔ وہ عجیب کمزور شخص، ہم جنس پرست تھا، جسے بات بات پر پھوٹ پھوٹ کر رونا آتا تھا۔ باتیں کرتا ہوا سسکیاں لیتا اور اتنا کمزور کہ باتیں کرتے ہوئے لوگوں کا سہارا لیتا تھا۔ مگر اس نے انگلینڈ کو سپین کے ساتھ مزید تصادم سے بچا لیا اور اس تصادم سے بھی الگ کر لیا جو ولندیزیوں کی بغاوت کے ساتھ شروع ہوا تھا اور جو تیس برس کی جنگ بن گیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ بادشاہ مامور من اللہ ہوتے ہیں۔ اسے رعایا پر اپنے خیالات ٹھونسنے کی بھی پوری آزادی تھی۔ مگر اسے احساس ہوا کہ کھیل پرانے قانون کے مطابق نہیں کھیلا جا رہا۔ مشکل یہ تھی کہ اس کے لوگ کھلم کھلا باغی نہیں تھے۔ مگر انہیں اپنے حقوق کا خاموش احساس تھا۔ جب اس نے پارلیمنٹ کا اجلاس فنڈز حاصل کرنے کے لیے بلایا تو انہوں نے اپنے حقوق کا تقاضا شروع کر

دیا اور بعد میں یہ کہہ کر فنڈز دینے کے حق میں ووٹ دینے سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے خوشامدیوں پر ضائع کرتا ہے۔ اس وقت بے چینی اور بڑھ گئی جب بادشاہ نے اپنے بیٹے چارلس کی شادی ایک ہسپانوی شہزادی کے ساتھ کرنے کا اعلان کیا۔ شادی اس لیے نہ ہوسکی کہ ہسپانوی بھی اس کے خلاف تھے۔ بہرحال پارلیمنٹ نے جیمز کو اتنی رقم دینے کی اجازت دے دی جتنی اس نے چاہی تھی۔ مگر جیمز کی زیادہ زندگی پارلیمنٹ کے ساتھ لڑتے جھگڑتے گزری۔ اسے ماننا پڑا کہ لوگوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہوچکی ہے جس کی وجہ سے انہیں اپنے حقوق اور انفرادیت کا احساس ہونے لگا ہے۔ اس کے بیٹے چارلس اوّل نے اس حقیقت کو اپنی جان دے کر جانا، جب پارلیمنٹ سے اس کی لڑائی شروع ہوئی جو چارلس کا سر کاٹنے پر ختم ہوئی۔

فرانس میں صورت حال زیادہ مستحکم، تقریباً وسطی زمانوں جیسی تھی۔ 1660ء میں ہنری آف نوار کے قتل کے بعد ہنری کی بیوی مَیری ریجنٹ بن گئی کیونکہ اس کا وارث لوئیس (تیرہ) صرف نو سال کا تھا۔ مَیری سازشوں میں ماہر تھی اور حکومت میں اس کی خادمہ لیونورا اور اس کا شوہر کونسینی مَیری کے مددگار تھے۔ شرمیلا نوعمر بادشاہ جس کا واحد مشغلہ شکار تھا، اس نے اپنے ایک سینئر شکاری لوئینز سے دل کی بات کہہ دی۔ ایک روز گارڈ کمانڈر درباریوں کے ہجوم میں سے گزرتا ہوا کونسینی تک جا پہنچا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ جنہوں نے کونسینی کو فوراً گولیوں سے اُڑا دیا۔ ''اب میں واقعی بادشاہ ہوں،'' لوئیس نے فخر سے کہا، جبکہ اس کی ماں ہسٹیریا میں مبتلا بستر میں پڑی تھی۔ سات آٹھ سو سال پہلے روس کے نوعمر بادشاہ آئیوان (جو اُس وقت تیرہ برس کا تھا) نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ اس کے دشمن، پرنس شوسکی کو قتل کر کے اس کی لاش کتوں کے سامنے پھینک دیں۔ یہ ایک خونی مگر نہایت کامیاب حکومت کا آغاز تھا۔ مگر لوئیس نئی صدی میں رہتا تھا۔ لوئینز کرپٹ اور لالچی مشیر ثابت ہوا۔ ملکہ کو اس کے چیف ایڈوائزر سمیت جلاوطنی سے واپس بلا لیا گیا۔ یہی مشیر تھا جو شاہی کونسل کا چیف بنا اور انگلینڈ، ہالینڈ اور ڈنمارک کے ساتھ مل کر چارلس پنجم کے وارثوں کے خلاف سازش کی اور آخر فرانس کو تیس سالہ تباہ کن جنگ میں الجھا دیا۔ روس کے برعکس فرانس میں کسی زار کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اسے ایک اعلیٰ سیاست دان، ایک ڈپلومیٹ (سفارت کار) کی ضرورت تھی جو حالات کا رخ موڑ دے۔

اس تیس سالہ جنگ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ کس طرح اپنے انداز بدل رہی تھی۔ اس کا سلسلہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے تصادم سے شروع ہوا۔ جب فرڈیننڈ آف

بوہیمیا نے لوتھر اور کیلون کے گروہوں کو کچلنے کی کوشش کی۔ بوہیمیا کے پروٹسٹنٹ باغی ہو گئے اور دو کیتھولک گورنروں کو پراگ کے قلعہ کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ہسپانیہ نے بغاوت دبانے میں مدد کے لیے فرنینڈس کو فوج بھیجی تو ایک پروٹسٹنٹ جرمن پرنس فریڈرک آف پلاٹنیٹ باغیوں کی طرف سے لڑنے آیا۔ پہلے ہنگری جنگ میں شامل ہونے پر مجبور ہوا۔ پھر سویڈن کی باری آئی۔ اگر فرنینڈس اپنے جنرل **Avallenstion** پر بھروسا کرتا تو شاید جنگ جیت جاتا، اس لیے کہ **Wallenstein** کو اس کے اپنے لوگوں نے قتل کیا تھا۔ پھر کیتھولک رچلو پروٹسٹنٹ فوجوں کی طرف سے لڑنے آیا، وہ ہاسبرگ جیسے کسی شخص کو یورپ کا سب سے طاقتور حکمران نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جنگ طول پکڑ گئی اور **1648**ء میں کسی نتیجہ کے بغیر ختم ہوئی۔ کوئی فریق فتح کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔

رچلو کا بھلا ہو کہ فرانس تیس سالہ جنگ میں سے پہلے سے زیادہ طاقتور ہو کر ابھرا۔ یہاں تک کہ اگلا بادشاہ **Lovis XIV** ایک رومن سیزر جیسے انداز اپنا سکتا تھا۔ وہ یقیناً اتنا طاقتور تھا کہ **1685**ء کا اعلان **Nantes** منسوخ کر دے اور پروٹسٹنٹ ازم کو فرانس میں خلاف قانون قرار دے۔ اس نے ورسائی تعمیر کیا اور اس میں اتنی عقل تھی کہ ایک دکان دار کے بیٹے ژاں بپٹسٹ کولبرٹ کو اپنا چیف منسٹر بنائے جس نے فرانس کی انڈسٹری میں انقلاب لا کر اسے دولت مند بنا دیا۔ طاقتور اور محفوظ ہو کر اس نے شہنشاہوں کا رویہ اختیار کر لیا۔ اس نے گلبرٹ کے اس خیال کو ماننے سے صاف انکار کر دیا کہ امرا کو بھی دوسرے لوگوں کی طرح ٹیکس ادا کرنے چاہئیں کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ دولت مند اور کاہل امرا اس کے دربار کی زینت اور زیبائش ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوئیس نے قومی دولت کو اتنی تیزی سے ضائع کر دیا جتنی تیزی سے گلبرٹ نے کمائی تھی۔ پھر یہ سوچ کر کہ ایک بڑے بادشاہ کو ایک بڑا فاتح بھی ہونا چاہیے، اسے سپین کے ساتھ لڑنے کا ایک بہانہ مل گیا۔ ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ وہ ہسپانوی نیدرلینڈز میں داخل ہو گیا اور اس وقت رکا جب اس نے تجارتی مراعات اور بہت بڑا علاقہ حاصل کر لیا۔ مگر ڈچ شہروں نے بغاوت کر دی اور ولیم آف اورنج کی قیادت میں اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ جب جیمز دوم کو ہٹا کر ولیم آف اورنج انگلستان کا بادشاہ بنا تو انگریز، ڈچ ہسپانوی اور سویڈ فوجوں نے مل کر لوئیس کی فوجوں کو اتنا ہراساں کیا کہ اسے مجبوراً امن کی درخواست کرنا پڑی۔ وہ سیکھ رہا تھا کہ اس نئی پیچیدہ دنیا میں اپنی مرضی کرنے والے شہنشاہوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ جب اس کا پوتا فلپ آف انجون **1701**ء میں سپین کا بادشاہ بنا تو

لوئیس نے سپین اور انگلینڈ کو ہمیشہ کے لیے متحد کرنے کا منصوبہ بنایا مگر باقی یورپ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ خصوصاً ڈچ جنہوں نے سپین کا اتنا ظلم برداشت کیا تھا۔ مگر لوئیس نے پھر وہی کیا کہ فوجیں لے کر نیدرلینڈز، (ہالینڈ) میں داخل ہو گیا کہ انہیں متفق ہونے پر مجبور کرے مگر 1702ء میں انگلینڈ اور ہالینڈ نے فرانس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور آدھا یورپ اس جنگ میں شامل ہو گیا۔ جنگ 1713ء تک جاری رہی جب آخر کار لوئیس نے امن کا فیصلہ کیا، مجبوراً یہ مانتے ہوئے کہ اس کا پوتا فلپ کبھی فرانس کا بادشاہ نہیں بن سکتا۔ چنانچہ جدوجہد کے بارہ سال ضائع ہو گئے اور لوئیس اپنے آپ کو بوڑھا، مایوس اور تھکا ہوا چارلس پنجم کے آخری دنوں کی طرح سمجھنے لگا اور دو سال بعد 1715ء میں مر گیا۔ اگر وہ تجارت اور نوآبادیاں بڑھانے پر توجہ دیتا تو فرانسیسی سلطنت دنیا میں پھیل چکی ہوتی اور امریکا کے لوگ آج شاید فرانسیسی بول رہے ہوتے۔ فرانس نے اپنے امریکی مقبوضات چند عشروں میں گنوا دیئے اور فرانس کے بادشاہ نے اپنا سر صدی ختم ہوتے ہوتے کٹوا دیا۔ اگر لوئیس (چودہ) کو شارلیمین بننے کا شوق نہ ہوتا تو فرانس کا انقلاب کبھی نہ آتا۔

اگر ہمارے خلائی مہمان 1450-1650ء کے درمیان ایک بار پھر زمین پر آ سکتے تو سمجھتے کہ قدیم روم کے زمانہ سے دنیا میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ زمین پر اب بھی دو بڑی طاقتیں پوپ اور تقدس مآب رومی شہنشاہ موجود ہیں جن کے سامنے پورا یورپ جھکتا ہے۔ وحشی اب بھی دروازوں پر دستک دیتے ہیں۔ مانا کہ منظر ڈایوکلیشین کے زمانہ سے زیادہ پیچیدہ ہے مگر یورپ میں اب بھی جیک بوٹ کی دلدوز آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ محبت اور رواداری کے مذہب، عیسائیت کا کوئی اثر، کوئی مقام نہیں کیونکہ انسانی فطرت ہزار ڈیڑھ ہزار برس میں بدل نہیں سکتی۔ شہر اب بھی کارتھیج کی طرح حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں اور اب بھی زمین پر بے شمار کیلی گلا رہتے ہیں۔

خوش قسمتی سے شاذ و نادر ہی ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں یہ راکھشس جنم لیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ روز اوّل سے مادی ضروریات کے غلام ہیں۔ ہمارے ماں باپ کو زندہ رہنے کے لیے ایک ڈسپلن کے اندر رہنا پڑا اور یہی سبق انہوں نے ہمیں سکھایا۔ نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کے تمام راکھشس تقریباً مطلق العنان، اپنی مرضی مسلط کرنے والوں میں سے پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ روٴسا اور تاجروں میں بھی کمیاب نہیں جنہیں ہر روز عام لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا ہوتا ہے۔ انہیں اس کے آداب بھی آتے ہیں۔ اکثر لوگ جانتے ہیں کہ غصہ

پر قابو نہ پانا اپنی تباہی کی ایک صورت ہے۔ ڈریکولا کا ہمعصر Guiles de Rais جرائم کی تاریخ کا ایک دلچسپ سنگ میل ہے کیونکہ وہ شاید ان لوگوں کی پہلی مثال ہے جن کی سیاسی طاقت محدود مگر اذیت رسانی لامحدود ہوتی ہے لیکن وہ فرانس یا شاید یورپ کے امیر ترین لوگوں میں سے تھا اور ہر لحاظ سے ایک ''بگڑا ہوا بچہ'' تھا۔ وہ 1404ء میں پیدا ہوا تھا اور جون آف آرک کی طرف سے بڑی بہادری کے ساتھ لڑا تھا۔ اس نے فرانس سے انگریزوں کو نکالنے میں بڑی مدد کی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنی جاگیر پر چلا گیا اور دونوں ہاتھوں سے دولت لٹائی۔ اس نے اپنا محبوب مشغلہ بچوں کو ٹارچر کرنا اور قتل کرنا بھی شروع کر دیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد پچاس بچوں کی لاشیں ایک کھنڈر سے ملیں۔ اکتوبر 1440ء میں اسے قتل کر کے جلا دیا گیا۔ اگرچہ وہ تاریخ کے غیر سیاسی راکھشسوں میں سے ہے مگر اس کی نفسیات سیزر بورجیا سے زیادہ مختلف نہیں۔

بے مہار انانیت کے اس فطری رجحان سے وہ مجرمانہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے جسے عیسائی مذہبی رہنما 'اوریجنل گناہ' کہتے ہیں۔ وہ اس میں انسانی فطرت کی کوئی بنیادی خرابی، کوئی بیماری یا کمزوری، دیکھتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ چرچ کی اتھارٹی کیوں ضروری ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ 'منقسم شعور' کے حوالہ سے اس مسئلہ کی وضاحت زیادہ آسان ہے کہ انسان کا اپنا رجحان بایاں دماغ انانیت کی سمت ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ تاریخ میں بڑے مظالم محض اذیت پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ مبالغہ آمیز مقصدیت کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ جیسے شہنشاہوں نے چین کی عظیم نہریں یا عظیم دیوار چین بنائی ہے، انہیں اپنے مقصد کا اتنا جنون تھا کہ انہوں نے افراد کے ساتھ کیڑے مکوڑوں جیسا سلوک کیا۔

جس قسم کے جرائم وسطی زمانوں کے اختتام تک ریکارڈ ہوئے ہیں ان کی نوعیت غیر انفرادی ہے۔ لٹیرے مسافروں کو اس طرح قتل کرتے ہیں جیسے قصائی مویشیوں کو ذبح کرتے ہیں۔ یہ روزی کمانے کا ایک ذریعہ ہے جب وہ پکڑے جاتے ہیں تو انہیں سزا دی جاتی ہے مگر اسے ریکارڈ نہیں کیا جاتا۔ جو جرائم ریکارڈ کرنے کے قابل سمجھے جاتے ہیں وہ غداری، سازش یا اتھارٹی کے خلاف ہونے والے جرائم ہیں۔ نچلی سماجی سطح پر ہونے والے جرائم کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ہی یہ صورت حال بدلنا شروع ہو جاتی ہے کیونکہ یہ انفرادیت پسندی کا دور ہے، مگر انفرادیت پسندی صرف تعلیم یافتہ طبقوں یا چرچ تک محدود ہے۔ چنانچہ

پادری Don Nicholo de Plegati کا واقعہ اس لیے حیران کن نہیں کہ وہ ریپ، قتل اور ڈاکہ زنی کرتے ہوئے محض پوپ کی تقلید کر رہا تھا۔

تقریباً ایک سو سال پہلے نیورمبرگ کے پبلک پراسیکیوٹر فرانز شمٹ نے اپنی ڈائری میں سزا یافتہ مجرموں کا ذکر بس اس طرح کیا کہ ''ایک چور کو پھانسی دی گئی،'' ''نیورمبرگ کا فریڈک ورنر، ایک قاتل اور ڈاکو جس نے تین قتل کیے اور بارہ ڈاکے ڈالے۔'' کئی بدترین جرائم حصہ داروں یا گینگ کے ذریعہ ہوتے ہیں۔

Kloss of Feysdorf ایک قاتل، جس نے ایک ساتھی کی مدد سے تین قتل کیے۔ پہلے اس نے اپنے ساتھی کو مارا، پھر مل کے آدمی کو مارا جس نے مل لوٹنے میں اس کی مدد کی تھی۔ تیسرا قتل فوکس مل کے مالک کا تھا جسے رات کو مل لوٹنے کے بعد قتل کیا گیا۔'' یہ اور اسی نوعیت کے اور کئی جرائم جنسی جرائم سمیت اسی انداز میں ڈائری کے اندر درج ہیں۔

مجرموں کی اذیت پسندی سے قطع نظر، کئی جرائم گمنام لگتے ہیں جیسے زمین سے اگے ہوئے ہوں یا مجرمانہ نیت کے بجائے محض حالات کی پیداوار ہوں۔

چونکہ سوسائٹی اب تیزی سے بدل رہی ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ تبدیلی کے اس ناگزیر عمل کا جرائم پر کوئی اثر نہ ہو۔ انہیں بھی بہرکیف بدلنا ہے۔ یہ الزبتھین ڈراما کا عہد ہے۔ اور شیکسپیئر اور مارلو کے ڈراموں میں انفرادیت پسند کرداروں کی بھرمار ہے اور یہ چوبی کردار نہیں، شیکسپیئر کے زمانہ میں ایرک کہلر کہتا ہے ''قوموں کی قسمت ان کے بادشاہوں اور امرا کی قسمت کے ساتھ وابستہ تھی۔'' اس سے بڑھ کر یہ کہ عام فرد نے کسی نہ کسی وجہ سے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ امرا اور بادشاہ کا ہمسر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب جیمز اوّل نے 1604ء میں اپنی پہلی پارلیمنٹ کا اجلاس بلایا تو اسے ایسے سخت گیر افراد کا سامنا کرنا پڑا جو اپنے حقوق کی خاطر لڑنے کے لیے کمر باندھے ہوئے تھے اور وہ نئی پارلیمنٹ مذہبی تنگ نظری اور بے روح اور بے کیف اخلاقیات کی نہیں بلکہ مذہبی انفرادیت پسندی کی ترجمان تھی۔

انفرادیت پسندی سے بغاوت تک

جس سال (1719) کیتھرین ہیز اور اس کا شوہر لندن منتقل ہوئے وہاں 'The Life and Strange Surprising Adventure of Robinson Crusoe' نامی کتاب نے ادبی حلقوں میں سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ اس کا مصنف جینئس اور کریمنلٹی کے باہمی تعاون کا دلچسپ نمونہ ہے۔

ڈینیل ڈی فو، 1660ء میں لندن کے میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان کیتھولک ازم اور پروٹسٹنٹ ازم دونوں کو نہیں مانتا تھا۔ 1685ء میں وہ جیمز دوئم کے خلاف ڈیوک آف مون متھ کی بغاوت میں شریک تھا۔ مگر خوش قسمت تھا کہ عدالت نے اسے موت کی سزا نہیں دی۔ اس کی شادی اچھے گھر میں ہوئی۔ اس کی بیوی 3700 پونڈ مالیت کا جہیز لائی جسے اس نے تجارت میں لگا کر اچھی خاصی دولت کمائی۔ مگر عیاشی کی وجہ سے دیوالیہ ہو گیا اور قرض خواہوں کے ڈر سے برسٹل بھاگ گیا جہاں وہ ''سنڈے جینٹل مین'' کے نام سے جانا جاتا تھا کیونکہ گرفتاری کے ڈر سے وہ صرف اتوار کو گھر سے باہر آتا تھا۔ ان دنوں ولیم اور ینج انگلستان پر حکومت کرتا تھا۔ وہ تنہائی پسند اور غیر مقبول بادشاہ تھا جسے نامقبول ہونے میں کمال حاصل تھا۔

1701 میں ڈینیل ڈی فو نے 'The True Born Englishman' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ بادشاہ کی مخالفت اس لیے کرنا کہ وہ اجنبی ہے، ناانصافی پر مبنی ہے۔ کیونکہ تمام انگریز مختلف قومیتوں کا مرکب ہیں۔ بدقسمتی سے ولیم آف اورینج اگلے سال مر گیا اور ڈینیل فو عارضی طور سے ایک مہربان کی عنایتوں سے محروم ہو گیا۔

نظم میں وہ ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے جو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا خاندان فاتح ولیم کے ساتھ آیا تھا۔ بادشاہ کی موت کے بعد لوگوں نے مطالبہ کیا کہ 'چرچ آف انگلینڈ' سے اختلاف کرنے والوں کو سرکاری ملازمت نہ دی جائے۔ عجیب بات ہے کہ ڈینیل فو ان کے ساتھ شامل ہو گیا، یہ سوچ کر کہ وہ غریب لوگ ہیں۔ دراصل اس نے اپنے ایک پمفلٹ میں طنزاً لکھا تھا کہ تمام اختلاف کرنے والوں کو پھانسی دے دی جائے یا جلاوطن کیا جائے اور جلاوطن ہونے سے انکار کریں تو انہیں زندہ جلا دیا جائے، اور اس کے نیچے کسی جانے پہچانے رجعت پسند کے دستخط کر دیئے۔ کئی انتہا پسندوں نے پمفلٹ کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ایک پادری نے تو یہاں تک کہا کہ انجیل کے سوا وہ اس پمفلٹ کو تمام کتابوں سے افضل سمجھتا ہے۔ اور یہ کہ خدا کرے کہ ملکہ این ان تجاویز پر عمل کرے۔ اختلاف کرنے والے پہلے تو زندہ جلائے جانے کے ڈر سے کانپے مگر جب پتہ چلا کہ یہ ڈینیل فو کا مذاق تھا تو سخت غضب ناک ہوئے۔ پارلیمنٹ نے ڈی فو کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا۔ ڈی فو کہیں جا کر چھپ گیا اور معافی مانگنے لگا جس کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور بالآخر گرفتار ہو کر جولائی 1703ء میں سزایاب ہوا۔

اس کے لیے یہ بڑی خوش نصیبی کی بات تھی کہ وہ رات ہی رات میں ہیرو بن گیا۔ لوگوں نے اس پر پھول برسائے اور زندہ باد کے نعرے بلند کیے۔

ڈی فو کو نیوگیٹ جیل میں ایک سال قید رکھا گیا۔ جہاں جیب کتروں کے ساتھ اس کا میل جول ہوا۔ جیل میں وہ اپنے ناولوں کے لیے مواد اکٹھا کرتا رہا اور پمفلٹ لکھنے جاری رکھے۔ اب وہ اتنا مشہور ہو چکا تھا کہ کوئی حکومت اسے خاموش نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے 'دی ریویو' اپنا پہلا اخبار جیل سے شروع کیا۔ 'دی ریویو' سیاسی تبصروں، قاتلوں اور ڈاکوؤں کے انٹرویوز اور نئے سکینڈلوں سے معمور اخبار تھا۔

اس نے لارڈ ٹریئر کے ذریعہ رہائی حاصل کی۔ اس نے لارڈ ٹریئر کو ایک ایسی سکیم بتائی جسے میکاؤلی جیسا آدمی ہی سوچ سکتا تھا کہ گورنمنٹ اپنے جاسوسوں کا ایک نیٹ ورک بنائے جو اس کے مخالفوں پر نظر رکھیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ملکہ این کو مجبور کر کے ڈی فو کو جیل سے رہا کروا لیا گیا اور ڈی فو سرکاری ایجنٹوں کا نیٹ ورک بنانے کے لیے ملک کے دورہ پر روانہ ہو گیا۔ اسے پولیس سٹیٹ کا بانی کہنا غلط نہ ہو گا۔ اس نے جاسوسی کے بنیادی قاعدے بنائے کہ ہر جاسوس کو عام شہری کی طرح لگنا چاہیے اور آپس میں ایک دوسرے کو نہیں جاننا چاہیے۔ مقصد یہ تھا کہ انگلستان

والوں کی سوچ پر غیر محسوس طریقہ سے پہرے بٹھائے جائیں۔ ڈی فو کی سکیم برٹش سیکریٹ سروس کا بنیادی پتھر تھی اور اس نے برطانیہ اور سکاٹ لینڈ کو ملا کر ایک ملک، برطانیہ عظمیٰ بنانے میں اہم کردار ادا کر کے اس کی افادیت ثابت کر دی۔ انگریزوں کو تو یہ بات اچھی لگی مگر سکاٹ شک میں مبتلا ہو گئے۔ 1706ء میں ڈی فو نے سکاٹ لینڈ جا کر کئی بارسوخ اور صاحب اقتدار افراد کو متاثر کر کے اپنا ہم خیال بنا لیا اور برطانیہ، برطانیہ عظمیٰ بن گیا۔

1710ء میں لبرل گورنمنٹ مستعفی ہو گئی تو ڈیفو (جس نے اپنے آپ کو لبرل (آزاد خیال) مشہور کر رکھا تھا) نے فوراً اس کے ساتھ اپنی وابستگی سے انکار کر دیا کہ مجھے پارٹی سے اپنا ملک زیادہ عزیز ہے۔ مگر 1714ء میں ہارلے کو ڈسمس کر دیا گیا۔ چند روز بعد ملکہ کا انتقال ہو گیا اور جارج کی قیادت میں وگ انتظامیہ اقتدار میں آ گئی۔ ڈیفو کو جیل بھیج دیا گیا اور اگرچہ اس نے جلد رہائی حاصل کر لی مگر ارل آف انگلینڈ کی توہین کے الزام میں اسے پھر جیل میں ڈال دیا گیا۔ ایک بار اور اس نے جاسوس کے طور پر اپنی خدمات پیش کر دیں اور لبرل جو اس کی اہلیتوں سے واقف تھے، انہوں نے سوچا کہ ایک زیر عتاب ٹوری اچھا جاسوس بنے گا۔ حکومت کا ''دشمن'' بن کر وہ شاید حکومت کے لیے مفید ثابت ہوا۔ اس وقت ٹوری ان کے اتنے مخالف نہیں تھے جتنے کہ **Jacobites** (سٹیورٹ کے حامی) تھے۔ حکومت کے دشمن کے روپ میں ڈیفو نے کئی اخبارات کا اعتماد حاصل کر لیا اور اپنے میکاویلین ہتھکنڈوں کے ذریعہ ہر وہ خبر روک دی جو حکومت کے خلاف تھی۔

جلد یا بدیر اس کی اصلیت ظاہر ہونا ہی تھی۔ **Mist** نامی اس کے ایک ساتھی نے ڈیفو کو دکھائے بغیر حکومت کے خلاف ایک خط شائع کر دیا اور جب حکومت کی طرف سے پوچھ گچھ ہوئی تو اس نے ڈیفو پر الزام لگانے کی کوشش کی۔ لبرلز کو شک ہو گیا کہ ڈیفو ڈبل ایجنٹ ہے۔ اس وقت تو معاملہ رفع دفع ہو گیا مگر ڈیفو نے جان لیا کہ اب اسے روزی کمانے کے لیے کوئی اور دھندا دیکھنا ہو گا۔ اسے یاد آیا کہ ایک دلچسپ کہانی کے لیے اس کے پاس میٹریل موجود ہے۔ 1704ء میں ایک سکاٹ قزاق کی لڑائی اپنے قزاق کپتان الیگزینڈر سلکرک کے ساتھ ہوئی تو اس کی اپنی درخواست پر اسے ایک ویران جزیرے **Juan Fernande** پر بھیج دیا گیا۔ کوئی مدد ملنے سے پہلے اس نے وہاں پانچ سال گزارے اور جب وہ انگلستان واپس آیا تو مشہور شخص تھا۔ 1713ء میں ڈیفو اسے ملنے کے لیے غالباً برسٹل گیا۔ اور معمولی سا معاوضہ ادا کر کے اس کے کاغذات لے آیا۔ اس میٹریل کو بنیاد بنا کر ڈیفو نے 'رابنسن

کروسو لکھ دی۔ کتاب 1719ء میں شائع ہوئی اور فوراً کلاسک بن گئی۔ بدنصیبی سے ڈیفو اس سے اتنا نہ کما سکا جو کما سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے کئی جعلی ایڈیشن شائع ہو گئے۔ مگر وہ دیگر ناول لکھتا رہا۔ 1720ء کے آغاز تک اس کی جاسوسی کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور گزر اوقات کے لیے صرف اس کے ناول باقی رہ گئے تھے۔

ستر برس کی عمر میں اگست 1730ء کے میں وہ اچانک غائب ہو گیا۔ اب تک اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی تھی، مگر پھر پتہ چلا کہ وہ پرانے قرض خواہوں سے چھپ رہا تھا۔ جیل کے دوران اس کی ٹائیل فیکٹری دیوالیہ ہو گئی تھی۔ پرانے قرض خواہ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے حالانکہ وہ اپنے ناولوں کی آمدنی سے یقیناً ان کا قرض بڑی حد تک اتار چکا ہو گا۔ پھر بھی اس نے یہی بہتر سمجھا کہ پھر بھاگ جائے۔ اگلے سال اپریل میں وہ ایک گمنام گھر میں مر گیا جو اس گھر سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔

ڈیفو ہماری نظر میں علاقائی اہمیت کا فرد ہے۔ جارج برنارڈ شا نے کہا تھا کہ ''ہم آرٹسٹ کا اندازہ اس کے اعلیٰ ترین اور مجرم کے گھٹیا ترین لمحات سے کرتے ہیں۔'' ایسے شخص کا ملنا دشوار ہے جس میں یہ دونوں عناصر موجود ہوں، تاکہ ہم اس کی مدد سے خود انسانی فطرت کے ان دونوں عناصر کے باہمی رشتہ کو سمجھ سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ ڈیفو بنیادی طور پر سمجھوتہ باز تھا۔ وہ ہمیشہ کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دھوکہ بازی کے بغیر اس دنیا میں خوشحال ہونا ممکن نہیں۔ حالانکہ ہم اس کی زندگی پر نظر ڈالیں تو لگتا ہے کہ وہ صاف غلطی پر تھا۔ تمام دھوکہ بازوں کی طرح وہ ایک خاص قسم کی حماقت کا شکار تھا جس کی وجہ سے نہیں جانتا تھا کہ قانون توڑنا اپنا مقصد حاصل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ نہیں۔ سیکریٹ سروس بناتے ہوئے ڈیفو کو یقین تھا کہ وہ دوسرا میکاؤلی ہے۔ وہ اپنی فطری عیاری کے ذریعہ تحفظ اور رسوخ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسے تحفظ ملا نہ رسوخ حاصل ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو صرف سیاسی ماحول کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔

چنانچہ ہم انسانی فطرت کی دو بڑی مخالف ذہنیتیں ڈیفو میں سرگرم عمل دیکھ سکتے ہیں، جو دراصل انسانی تاریخ کے دو بڑے دھارے بھی ہیں۔ جرم وتخلیق، تشدد و ذہانت، مصلحت اور ایمانداری۔ ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ جرم پر اصلی اعتراض یہ ہے کہ جرم بنیادی طور پر ایک غلطی ہے۔ ایک غلط انداز ہے، جینے کا غلط طریقہ ہے۔ اگر بے ایمانی اس کے

ذریعہ اپنا فوری مقصد حاصل کر سکتی ہے تو وہ ہماری دائمی ذلت اور بے قدری کی قیمت پر ایسا کرتی ہے۔

ڈیفو کے معاملہ میں ستم یہ ہے کہ وہ بذات خود ایمانداری، آرٹسٹ کی وجدانی ایمانداری کی علامت ہے جس کی وجہ سے اسے حقیقی کامیابی ہرگز حاصل نہیں ہوئی مگر جس نے یورپی کلچر کی سمت بدل دی۔ اس کی زندگی انسان کی شخصیت و روح، اس کے ظاہر و باطن میں تصادم کی کہانی ہے۔ اس کی مشکوک ذاتی اخلاقیات اس کے ساتھ مر گئی جبکہ اس کی فنکارانہ دیانت مارچ کرتی ہوئی آگے بڑھی اور ایسا انقلاب لے آئی جس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

صنعتی دور کے تصادم سمجھنے کے لیے ہمیں لوئیس چودہ کے عہد کی طرف واپس جانا ہو گا۔ لوئیس کا بھی ارادہ تھا کہ وہ وقت کی رفتار روک دے۔ جب اس کے وزیر کولبرٹ کی کوشش سے فرانس میں تجارت اور صنعت کو فروغ ہوا تو خوشحالی آئی۔ بادشاہ نے امرا کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر کے اس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ جنگوں پر بھی بہت دولت ضائع ہوئی۔ لوئیس1715ء میں مر گیا۔ ڈیوک آف اورلینز آیا تو صورت حال بہتر ہوئی۔ مگر1756ء میں جنگ کے تباہ کن سات سال فرانس کی سلطنت کے اکثر سمندر پار حصوں کو کھو دینے کا سبب بنے۔ فرانس کی آبادی مسلسل بڑھتی گئی اور1715ء میں سولہ ملین سے تجاوز کر کے انقلاب تک بیس ملین ہو گئی۔ شہر اور قصبے بھکاریوں اور بے روزگاروں سے بھر گئے۔ بعضوں نے ڈاکوؤں کے گروہ بنائے اور دیہات میں لوٹ مار کرنے لگے۔ جبکہ غریب فاقوں مر رہے تھے۔ دولت والے اب بھی ٹیکس نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ جب انگلستان 'دنیا کی ورکشاپ' بنا فرانس سماجی بحران اور بے چینی کا شکار تھا۔

مگر اصل مسئلہ اقتصادی نہیں نفسیاتی تھا۔ تاریخ کی بڑی جنگیں ان لوگوں کی وجہ سے ہوئیں جو 'بگڑے ہوئے بچے' تھے۔ فرانسیسی کسان دولت مندوں کی خوشحالی سے نہیں ان کی بدسلوکی سے مشتعل ہوئے تھے۔ لوئیس چودہ کبھی نہ سمجھ سکا کہ تاریخ نئے قوانین کے مطابق اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو شارلیمین سمجھتا تھا۔ امرا اس کے پیچھے چلتے تھے۔ لوئیس کے رائٹ مین رویہ کا اندازہ اس وقت ہوا جب1661ء میں ایک واقعہ پیش آیا کہ لندن میں فرانسیسی سفیر نے جب ہسپانوی سفیر کو آگاہ کیا کہ اگر وہ محل کے گیٹ پر پہلے پہنچا تو اس کے گھوڑوں کی لگامیں کاٹ دی جائیں گی۔ اس کے جواب ہسپانوی سفیر نے لگاموں میں

آہنی زنجیریں لگوادیں۔ چنانچہ لڑائی ہوئی اور خون خرابہ ہوا۔ لوئیس نے پیرس میں ہسپانوی سفیر کو اس پیغام کے ساتھ میڈرڈ واپس بھیج دیا کہ اگر فرانسیسی سفیر کے ساتھ تمام تقریبات میں ترجیحی سلوک نہ ہوا تو اس کے نتائج (یعنی جنگ) نہایت خطرناک ہوں گے۔ سپین میں فلپ چہارم کی حکومت تھی، جو اتنی طاقتور نہیں تھی کہ فرانس کا حکم نہ مانے۔ چنانچہ مطالبات پورے کرنے اور پبلک میں معافی چاہنے کے لیے ایک سفارت کار کو لوئیس کے پاس بھیجا گیا۔ لوئیس کا رویہ ایک مرکھنے بیل کی طرح تھا۔ جیسا کہ بادشاہ تمام تاریخ میں من مانی کرتے رہے ہیں۔ مگر دنیا بدل رہی تھی اور لوئیس کی خودسری اور من مانی کا براہِ راست نتیجہ فرانس کا انقلاب تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انقلاب کی ٹھیک تاریخ یعنی دسمبر 1725ء بھی بتائی جائے۔ یہ اس مہینہ کی بات ہے جب کہ تیس سالہ ڈراما نگار والٹیر اپنے وزیراعظم بننے کی بات تھیئٹر میں بڑی آزادی کے ساتھ کرتا تھا۔ جس پر ایک امیر شخص روہان نے اسے برا بھلا کہا۔ والٹیر نے بھی ویسا ہی جواب دیا۔ اس وقت تو ایک خاتون کے بے ہوش ہو جانے کی وجہ سے لڑائی ٹل گئی، مگر چند روز بعد والٹیر جب ڈیوک سیلی کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا تو پیغام ملا کہ باہر کوئی انتظار کر رہا ہے۔ وہ باہر گیا تو کرائے کے غنڈوں نے اسے مارنا شروع کر دیا، جبکہ روہان پیچھے کھڑا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

والٹیر غصہ میں پاگل ہو گیا اور بھاگا بھاگا اندر گیا کہ حملہ کے متعلق بیان پر دستخط کروائے مگر اس کے میزبان نے جھگڑے میں پڑنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار امرا کو پورا حق ہے کہ وہ عام آدمی کی توہین کریں۔ اور ہر چند کہ والٹیر کی رسائی دربار میں تھی اور وہ ملکہ کا پسندیدہ شخص تھا مگر انصاف حاصل کرنے میں کسی نے اس کی مدد نہ کی۔ والٹیر نے تلوار زنی سیکھنا شروع کی اور غنڈوں کے ساتھ ملنے جلنے لگا۔ وہ انتقام کے خواب دیکھ رہا تھا جس کا مطلب ہے کہ بڑے آدمی کی نفسیات بھی کسی مجرم سے مختلف نہیں ہوتی۔ روہان کا تعلق فرانس کے بڑے طاقتور خاندان سے تھا۔ اس نے والٹیر کے پیچھے پولیس لگا دی کہ اس سے ہمیں خطرہ ہے۔ والٹیر کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اس نے رہائی اس شرط پر حاصل کی کہ ملک چھوڑ دے گا۔ اسے بزور انگلستان جلاوطن کر دیا گیا۔

والٹیر کے تجربے نے اسے یورپ کا سب سے زہریلا طنز نگار بنا دیا۔ مذہب اور سماج پر اس کی نکتہ چینی نے روسو سمیت دوسرے اصلاح پسندوں کو بھی متاثر کیا۔ کہتے ہیں کہ روسو کی کتاب 'The Social Contract (1762)' سب سے بڑھ کر انقلابِ

فرانس کا سبب بنی۔

انقلاب میں روہان فیملی کے کتنے ہی لوگ مارے گئے مگر اس کے ایک رکن بشپ روہان نے ایک ایسے سکینڈل کو ہوا دی کہ اس کا شمار بھی انقلاب کے اسباب میں ہوتا ہے۔ بشپ روہان اونچا لمبا خوش شکل سمجھا جاتا تھا۔1770ء میں وہ سٹراسبرگ کا بشپ تھا، جب مستقبل کی ملکہ فرانس میری انٹونیٹی اپنے منگیتر سے ملنے جاتے ہوئے شہر سے گزری۔ وہ پندرہ برس کی دلکش حسینہ تھی جس کی ایک جھلک سے پوپ روہان کا دل دیوانہ قابو میں نہ رہا۔ پوپ کی بدنصیبی کہ آنے والے دس برس میں یہ بات صاف ہوگئی کہ ملکہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ روہان ملکہ کی ماں ملکہ تھریسا آف آسٹریا کے دربار میں سفیر رہ چکا تھا۔ آسٹریا کی اس ملکہ کو بھی روہان سے سخت نفرت تھی۔1780-1770ء کے درمیان ملکہ میری نے روہان کی تقرری کے کئی راستے روکے مگر اسے کارڈینل (پوپ منتخب کرنے والے ادارہ کا ممبر) بننے سے نہ روک سکی۔

1780ء میں روہان ایک اور حسینہ کے عشق میں مبتلا ہوا جو La Morte نامی ایک مفلس فوجی افسر کی بیوی تھی۔ کاؤنٹس روہان کی داشتہ بن گئی اور اس سے کہا کہ ملکہ ایک بیش قیمت نیکلس کی خرید میں اس سے کام لینا چاہتی ہے، جبکہ ملکہ اس بات سے بالکل بے خبر تھی۔ روہان خوش ہوگیا کہ ملکہ نے اس کے متعلق اپنی رائے بدل لی ہے اور حالت نشہ میں اس نے نیکلس ادھار لے کر کاؤنٹس کو دے دیا۔ جیولر نے جب پہلی قسط چار لاکھ فرانک کا مطالبہ کیا تو کاؤنٹس نے ملکہ کا ایک جعلی خط روہان کو دیا کہ وہ اپنی جیب سے ادا کر دے۔ کاؤنٹس روہان کو دراصل لکھ پتی سمجھی تھی جبکہ روہان اپنی فضول خرچیوں اور عیاشیوں کی وجہ سے خود مقروض رہتا تھا۔ جب وہ رقم ادا نہ کرسکا تو جیولر نے ملکہ سے براہِ راست رابطہ کیا۔ ملکہ کو معلوم ہوا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس نے روہان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ گرفتاری کا حکم دے کر ملکہ نے بگڑے ہوئے بچوں جیسی حرکت کی۔ چپ رہتی تو سب کے لیے بہتر تھا۔ روہان کو اس کے ہمراز Caglicostro (جادوگر) کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا۔ کاؤنٹس اور اس کا عاشق بھی گرفتار ہو گئے۔ (اس کا شوہر نیکلس بیچنے لندن گیا تھا) مقدمہ نے روہان کو تماشا بنا دیا۔ حالانکہ وہ اور اس کا جادوگر الزام سے دونوں بری ہو گئے۔ اس سے ملکہ میری کے خلاف بھی سخت اشتعال پیدا ہوگیا۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے رہے (انہیں ملکہ کا یہ کہنا یاد تھا کہ "وہ کیک کھائیں" جب اسے بتایا گیا تھا کہ غریبوں کے پاس کھانے کے لیے روٹی نہیں)

اسے لوگوں کے سامنے گرم لوہے سے داغا گیا اور کوڑے مارے گئے۔ (پانچ سال بعد وہ قرض خواہوں سے بچتی ہوئی لندن میں ایک کھڑکی سے گر کر مر گئی) نیکلس کے سکینڈل نے بادشاہت کا نام ڈبو دیا۔ نپولین نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''وہ انقلاب کا آغاز تھا۔''

1757ء تک حالات مزید خراب ہو گئے اور مارکوئیس دالافیت نے (جس نے امریکی انقلاب میں حصہ لیا تھا) بادشاہ کو مشورہ دیا کہ پارلیمنٹ کا اجلاس بلائے۔ لوئیس سولہ نے انکار کر دیا۔ لیکن چونکہ بات اخباروں، رسالوں تک پہنچ چکی تھی، اس لیے آخر کار مان گیا۔ اب وہ اچانک امرا میں غیر مقبول ہو گیا، جنہیں بجا طور پر شک گزرا کہ ہمیں ٹیکس دینے پر مجبور کرے گا۔ پارلیمنٹ بلائی گئی مگر عوام کے نمائندوں نے دیکھا کہ ہر موڑ پر بشپ اور ارسٹوکریسی (امرا) ان کا راستہ روک رہے ہیں۔ **1788**ء میں اچھی فصل نہ ہونے کی وجہ سے قحط پڑ گیا۔ کسانوں نے امیروں کے گھر لوٹنے اور جلانے شروع کر دیے۔ پیرس میں لوگوں نے سنا کہ انہیں مارنے کے لیے بادشاہ نے فوج بلائی ہے۔ **14** جولائی **1789**ء کو انہوں نے باستیل کا محاصرہ کر لیا، جہاں انہوں نے سمجھا کہ سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد چھپی ہوئی ہے۔ (جبکہ صرف ایک سو دس سپاہی تھے) اور شوٹنگ شروع کر دی۔ گورنر نے ہتھیار ڈال دیئے مگر جب وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ باہر آیا تو اسے پکڑ کر قصاب کے چھرے سے اس کی گردن جسم سے الگ کر دی۔ باستیل میں تمام قیدی ایک تباہ حال رئیس مارکی داساد سمیت رہا کر دیئے گئے۔

ملکہ اور بادشاہ فی الحال محفوظ تھے۔ اگر لوئیس سمجھداری سے کام لیتا تو وہ اپنا تخت بچا سکتا تھا۔ مگر اس نے بھاگ جانے اور فوج لے کر واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ **Varrenes** میں وہ اور ملکہ دونوں پکڑے گئے۔ انہیں واپس لا کر سزائے موت دی گئی۔

ملکہ کی موت کا براہِ راست ذمہ دار رابسپیری ایک لیفٹنٹ تھا، جو اپنے آپ کو انسان دوست سمجھتا تھا۔ **1793**ء تک رابسپیری کہتا رہا تھا کہ انقلاب کو بچانے کا واحد طریقہ ہر اس شخص کو قتل کر دینا ہے جس سے غداری کا خطرہ ہو۔ اس نے ایسے لوگوں پر مقدمے چلانے اور سزائیں دینی شروع کر دیں۔ صرف پیرس میں **2600** مشتبہ غدار (اکثر امرا) گرفتار اور قتل ہوئے۔ ان میں آکسیجن دریافت کرنے والا کیمسٹ لے وائزیئر اور آندرے شینئر (شاعر) بھی شامل تھا۔ بائیں بازو کے اعتدال پسند اراکین کے سر اس لیے کاٹے گئے

کہ وہ اعتدال پسند تھے۔ جب رابسپیری نے اپنے قریبی ساتھی دانتاں کو قتل کیا تو فرانس کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ تولون بندرگاہ ''غداروں'' نے برطانوی بحری بیڑے کے حوالے کر دی تھی۔ ایک نوجوان کپتان نپولین بونا پارٹ کو اسے واپس لینے کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ مگر جیکو بن اس کے سینکڑوں شہریوں کو 'غدار' کہہ کر قتل کرتے رہے۔ مارسیلز کو بھی 'غداروں' سے پاک کیا گیا۔ لیون نے اپنے جیکو بن لیڈر کو قتل کیا تھا۔ چنانچہ اس کا اپنا بھی یہی حشر ہوا۔

قدیم روم کی طرح ظلم میں سے ظلم جنم لیتا رہا۔ رابسپیری خونریزی سے پریشان تھا اور محسوس کرتا تھا کہ اس کے ساتھی قتل و غارت کی انتہا کر رہے ہیں۔ انقلاب نے فرانس کو قاتلوں سے بھر دیا تھا۔

1794ء میں رابسپیری نے خوف و دہشت میں مزید شدت پیدا کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ کہ حکومت سے اختلاف کرنے والے کا سر قلم کر دیا جائے۔ ایک مہینہ کے دوران پیرس میں 1300 انسانوں کے سر کاٹے گئے۔ اس تمام خونریزی نے بالآخر پیرس کے شہریوں کو بیزار کر دیا۔ نئی دہشت گردی کے درمیان جب اس کے ساتھی سٹی ہال میں نئی شر انگیزی کی منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ سپاہی ہال میں داخل ہو گئے۔ گولی چلنے کی آواز آئی اور رابسپیری ٹوٹا ہوا جبڑا لیے ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعض ساتھی کھڑکی سے کود گئے۔ اسی روز رابسپیری اور اس کے انیس ساتھیوں کی گردنیں مشینی آرے سے کاٹی گئیں۔ فرانس بھر میں جیکو بن فرقے کے لوگوں کو ہجوم نے قتل کیا اور فرانسیسی انقلاب میں انسانی تاریخ کا بے پایاں قتل عام اپنے انجام کو پہنچا۔

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ فرانسیسی انقلاب کا سبب اقتصادی حالات نہیں بلکہ افراد ہیں۔ وہ امرا ہیں جو سمجھتے تھے کہ ان کی دولت، ان کے خطابات قدرتی اور پیدائشی طور پر ان کا حق ہیں۔ وہ بادشاہ جو عوام کو کوڑا کرکٹ سمجھتا تھا اور جس نے ایک دعوت میں قومی پرچم اپنے پاؤں تلے روند دیا تھا۔ اگر لوئیس میں بصیرت ہوتی، انسانی عقل کو سمجھنے کی توفیق ہوتی تو وہ نئی اسمبلی کی حیثیت تسلیم کر لیتا۔ انسانی حقوق کا احترام کرتا مگر اس نے فوج کی وحشیانہ قوت سے عوام کو کچلنے کے خواب دیکھے۔

انگلینڈ میں بھی عوام کی حالت خراب تھی مگر وہاں انقلاب نہیں آیا۔ کیونکہ وہاں روہان جیسے نوبل (امرا) اور لوئیس جیسا بادشاہ نہیں تھا کہ عوام میں نفرت و انتقام کے جذبات

جنم لیتے۔ بادشاہ 1649ء میں مارا گیا تھا اور 'خدائی حقوق' کا تصور بھی اس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا تھا۔ جارج سوئم نے سوچا تو تھا کہ پارلیمنٹ کے بغیر حکومت کرے مگر امریکی انقلاب نے اس کا راستہ روک دیا تھا۔ جب والٹیر انگلینڈ سے واپس آیا اور اس نے وہاں کی آزادی کے حق میں لکھا تو اسے فرانس سے بھاگنا پڑا۔ اس کے برعکس جب ایک انگریز Tom Pain نے انگلینڈ میں رہتے ہوئے فرانسیسی انقلاب کے حق میں اپنی 'The Rights of Man' لکھی اور اگلے سال اس کا دوسرا حصہ لکھا، جس میں آرمی اور نیوی کی تعداد کم کرنے اور رفاعی مملکت بنانے کے سلسلہ میں تجاویز تھیں، تو یہ سوچ کر انگلینڈ سے چلا گیا کہ شاید اسے گرفتار کر لیا جائے۔ مگر یہ رابسپیری کی پولیس تھی جس نے اسے گرفتار کیا اور اس کا سر صرف اس لیے کٹنے سے بچ گیا کہ رابسپیری کا اپنا سر کٹ گیا تھا اور 'The Rights of Man' نئے محنت کش طبقے کی انجیل بن کر ان کے دلوں کو گرماتی رہی۔ انگلستان میں صنعتی انقلاب کے دوران غربت اور ذلت کسی سے کم نہ تھی مگر محض اس لیے کہ محنت کش طبقے 'The Rights of the Man' پر بات کر سکتے تھے۔ وہاں انقلاب کا خطرہ نہیں تھا۔ وہاں کوئی لوئیس سولہ، کوئی رابسپیری نہیں تھا۔

انیسویں صدی کے آغاز تک شاعر اور سیاسی مفکر جان چکے تھے کہ کھوکھلی انانیت پرستی بنی نوع انسان کے لیے لعنت ہے۔ اسی لیے ولیم بلیک نے امریکی انقلاب کا خیر مقدم کیا۔ اسی لیے ورڈز ورتھ، کولرج اور ساؤدی نے اس کی حمایت کی۔ اس لیے شیلے اور بائرن نے ظلم کی مذمت کی۔ اچانک انسان کے مسائل کا آسان حل نکل آیا کہ ہر مسئلہ آمریت، پاگل آمریت کی پیداوار ہے۔ روسو کا کہنا ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ انسان معصوم، خودنگر وخوش باش تھا۔ پھر سوسائٹی نے ذاتی ملکیت کا فتنہ کھڑا کر دیا اور ظلم و ناانصافی کے نئے دروازے کھل گئے۔

نپولین اپنے آپ کو فریڈرک اعظم کا جانشین سمجھتا تھا۔ جب وہ اس کے مقبرہ پر گیا تو اس نے اپنے افسروں سے کہا کہ ٹوپیاں اتار لو دوستو، اگر آج یہ زندہ ہوتا تو ہم یہاں نہ ہوتے۔ اس کا طاقت حاصل کرنا تاریخ کے حیرت انگیز واقعات میں سے ہے۔ ایک نوجوان افسر کی حیثیت سے اسے آسٹریا والوں سے لڑنے کے لیے اٹلی بھیجا گیا۔ اس کا کام انہیں ہراساں کرنا تھا۔ جبکہ فرانسیسی فوجیں ویانا میں جمع ہو رہی تھیں۔ اس کی فتوحات اتنی شاندار تھیں کہ وہ جلد فرانس کا ہیرو بن گیا۔ اس نے حکومت کو آمادہ کیا کہ اسے ہندوستان کے ساتھ

تجارت کا برطانوی راستہ کاٹنے کے لیے مصر بھیجے۔ ایک بار پھر اسے شاندار فتوحات حاصل ہوئیں۔ اس سے پیشتر کہ نیلسن ان کا بحری بیڑہ تباہ کر کے فرانسیسیوں کو مصر میں روک لے، نپولین تیزی کے ساتھ فرانس واپس گیا، حکومت کا تختہ الٹنے میں حصہ لیا اور پہلا کونسل منتخب ہو گیا۔ اس نے فرانس میں سول وار ختم کی، آسٹریا پر ایک فتح حاصل کی اور برطانیہ، آسٹریا اور روس کو امن قائم کرنے کے لیے مذاکرات کی میز پر لے آیا۔ اگلے دو برس میں اس نے پبلک سکول قائم کر کے، بے روزگاری کم کر کے اور یہ قانون بنا کر کہ 'سب انسان برابر ہیں' اس نے ثابت کر دیا کہ وہ بہترین حکمران ہے۔ اکثر لوگ اسے یورپ کا نجات دہندہ سمجھتے تھے اور بیتھوون نے اپنی سمفنی اس کی نذر کی تھی۔ 1804ء میں پوپ نے اسے ناٹرے ڈیم چرچ کے اندر شہنشاہ کا تاج پہنایا۔

اب نپولین کے پاس موقع تھا کہ وہ فرانس کو یورپ کا سب سے خوشحال ملک بنائے اور امن قائم کرے۔ مگر ظاہر ہوا کہ وہ سکندر اعظم سے لے کر اب تک کے دوسرے تمام خالی الذہن فاتحین سے بہتر نہیں۔ فاتح کو اپنی بڑائی اپنے خوف کے ذریعہ ثابت کرنا چاہیے۔ اس نے انگلستان پر حملہ کرنے کے لیے بحری بیڑا تیار کیا۔ نیلسن نے اسے Tralalgar کی جنگ میں تباہ کر دیا اور اسی کوشش میں اپنی جان گنوا دی۔ یورپ کی بڑی طاقتوں نے نپولین کے خلاف اتحاد قائم کر لیا۔ نپولین نے آسٹرلٹز کی جنگ میں آسٹریا اور روس کو شکست دے کر اپنا ملٹری جینئس ظاہر کیا۔ ایک بار اور اسے سکیورٹی حاصل تھی۔ ایک بار اور اس نے اسے دور پھینک دیا۔ اس دفعہ پروشیا کی باری تھی۔ اس نے انہیں تباہ کیا۔ روس کو شکست دی اور 1807ء میں ایک معاہدہ پر دستخط کیے۔ ایک دفعہ پھر اسے یورپ کا سب سے بڑا اسٹیٹس مین بننے کا موقع ملا۔ ایک دفعہ پھر جنگ کی مجرمانہ خواہش نے یہ موقع اس سے چھین لیا۔ زندگی بھر یہی اس کا وتیرہ رہا۔ نپولین 1812ء میں پانچ لاکھ فوج کے ساتھ روس میں داخل ہوا۔ روس کی فوج کے مقابلہ میں روس کی سردی نے اسے زیادہ نقصان پہنچایا۔ اس کے صرف اٹھارہ ہزار سپاہی گرتے پڑتے فرانس واپس پہنچے۔ فرانس کے دشمنوں نے پیرس پر حملہ کر دیا اور نپولین کو اَیلبا جلاوطن کر دیا۔

کہانی یہاں ختم ہونی چاہیے تھی۔ مگر نپولین فرانس واپس آ گیا۔ نئی فوج منظم کی اور پھر شہنشاہ بن گیا اور اب پہلی بار ایسا لگا کہ اس نے تجربہ سے کچھ سیکھا ہے۔ اس نے اپنے دشمنوں سے امن کی اپیل کی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے اسے عادی مجرم کا درجہ دیا جسے

مزید خرابی سے پہلے پھانسی پر لٹکانا چاہیے۔ انگلینڈ اور پروشیا نے مل کر سے واٹرلو میں شکست دی اور جنوبی اطلانٹک کے جزیرہ سینٹ ہیلینا بھیج دیا جہاں چھ برس بعد اس کا انتقال، شاید زہر کی وجہ سے ہوا۔

ہر انقلاب کی کہانی پڑھ کر اور نپولین کی زندگی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد خیال آتا ہے کہ تاریخ کی کوئی غائبانہ طاقت مسلسل اس کوشش میں رہتی ہے کہ انسان میں کامن سینس پیدا ہو۔ وہ اپنے حالات سے سبق سیکھے۔ جب ہم گزشتہ آٹھ ہزار برس کے واقعات یاد کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انسان کی سب سے دل خراش خصوصیت اس کی کمزوری ہے۔ جو بلا اس پر نازل ہوتی ہے وہ اسے بے بسی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ یہ بات بڑے بڑے سلاطین اور فاتحین کے متعلق بھی درست ہے۔ ان کے فاتحین تو یہ خونریز عیاشی بھی کرتے ہیں کہ محض بوریت کی وجہ سے کسی ملک پر لشکرکشی کریں اور اس کی کھڑی فصلیں جلا دیں۔ اس کے بچے قتل کر دیں۔ کہتے ہیں کہ سکندر اعظم یہ دیکھ کر رونے لگا کہ فتح کے لیے کوئی دنیا باقی نہیں رہ گئی۔ پتہ نہیں یہ کہانی کس کی ایجاد ہے۔ مگر اتنا تو ہے کہ اسے انسانی نفسیات سمجھنے میں کمال حاصل ہے۔ ہزاروں برس سے یہی ہوتا آیا ہے کہ جب بھی کسی زور آور کا دل اکتایا وہ اسے بہلانے کے لیے خون اور آگ کا کھیل کھیلنے لگا۔ جبکہ عام لوگ بھیڑوں کی طرح ایک دوسرے میں سر دے کر کھڑے ہو گئے اور طوفان گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔

جب نپولین کا یہ عجز ظاہر ہو گیا کہ وہ ماضی کے فاتحین کی نقل، ان کا روبوٹ ہے اور یہ کہ اس کا تصور عظمت اپنے ہم وطنوں کی جانوں سے کھیلنا ہے تو تمام یورپ اس کے خلاف صف آرا ہو گیا۔

نپولین کے بعد اگر ہم اس تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی دنیا کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ چین و جاپان نے پہلے ہی ارادہ کر لیا ہے کہ وہ تبدیلی کی رفتار کم کرتے ہوئے اپنے پرانے طریقوں پر قائم رہیں گے۔ ہندوستان بھی یہی چاہتا تھا، مگر مجبور ہے کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال پر قبضہ کر لیا ہے اور ملک کے باقی علاقے بھی اس کی زد میں ہیں۔ مگر یورپ یقیناً جنگ نہیں چاہتا۔ وہ ترقی کرنا اور صنعتی انقلاب کے خوشگوار نتائج سے فیض یاب ہونا چاہتا ہے۔

نپولین جونہی منظر سے ہٹا انگلینڈ، آسٹریا، روس اور پروشیا نے طے کر لیا کہ وہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے کریں گے اور بادشاہ کے ظل الٰہی اور 'خدائی حق' کے تصور کو پھر رائج

کریں گے۔ لوئیس اٹھارہ فرانس کا شہنشاہ بن گیا اور ارسٹوکریسی (امرا) نے سلکی ملبوسات اور ویسٹ کوٹ جھاڑ پونچھ کر پھر پہن لیے۔ انگلستان الگ اپنے راستے چلنا چاہتا تھا۔ اسے قانونی جواز کی پروانہیں تھی کیونکہ اس کی منڈیاں سلامت تھیں۔ انہیں کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑا تھا اور اس کی نظر مستقبل پر تھی۔

جرائم کی صدی

ڈینیل ڈیفو، ڈک ٹرپن کے، اور کارل مارکس جیک دی رپر کے زمانے میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

یہ بیان ان بے مثال سماجی تبدیلیوں کی نشان دہی کرتا ہے جو اس ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں وقوع پذیر ہوئیں۔ ٹرپن لوگوں کا پسندیدہ ہیرو تھا۔ جبکہ رپر سماج دشمن سمجھا جاتا تھا، جس سے ہر شخص نفرت کرتا تھا۔ لوگ اس سے اتنے خوفزدہ تھے کہ ایک خاتون صرف یہ خبر سن کر مرگئی کہ رپر نے ابھی ایک قتل کیا ہے۔ ڈیفو کے زمانہ میں جرائم پیشہ افراد قانون کی گرفت سے باہر تھے لیکن لندن کے غریبوں کے دلوں سے دُور نہیں تھے۔ چارلس ڈکنز نے ''اولیور ٹوسٹ'' میں 'بل سائیکس' کی تصویر اتنی دل کش بنائی تھی کہ اس کی وجہ سے وکٹوریہ عہد کا ایک معمولی چور بھی نیم دیو مالائی اہمیت اختیار کر لیتا تھا۔ مجرم، معاشرہ سے کٹ کر الگ ہو چکا تھا اور معاشرہ اسے ایک نا قابل برداشت اچھوت سمجھتا تھا۔

پھر بھی اٹھارویں صدی کے جرائم کا عذاب وکٹوریائی عہد کے ہر عذاب سے بڑھ کر عذاب تھا۔ 1751ء کے موسم گرما میں پورٹر نامی ایک زمیندار نے (جو چیس شائر میں پلفورڈ کے قریب رہتا تھا) فصل کی کٹائی کے لیے چند آئرش مزدور ملازم رکھے۔ اگست کی ایک شام پانچ مزدور گھر کا دروازہ توڑ کر اندر آئے اور زمیندار اور اس کی بیوی کو رسیوں سے باندھ دیا۔ پورٹر کی ایک بیٹی جو باپ کو ٹارچر ہوتے دیکھ رہی تھی بھاگ کر کمرہ میں آئی اور گھٹنے ٹیک کر منت سماجت کرنے لگی کہ اس کے باپ کو چھوڑ دیا جائے۔ اسے بھی باندھ دیا گیا اور گھر کی قیمتی اشیا اور نقدی کا پتہ پوچھا گیا۔ اس نے مزاحمت بے کار سمجھی اور سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ اس سے چھوٹی تیرہ سالہ بیٹی دبے پاؤں پچھلے دروازہ سے باہر نکلی اور اصطبل سے گھوڑا لے کر گاؤں

میں اپنے بھائی کے گھر گئی اور اسے ڈاکے کی خبر دی۔ بھائی اپنا ایک دوست ساتھ لے کر آیا تو سب سے پہلے انہوں نے اس شخص پر قابو پایا جسے چوروں نے پہرہ پر باہر کھڑا کیا تھا۔ اندر آئے تو ایک چور انہیں دیکھ کر کھڑکی کے راستے بھاگ گیا جبکہ دوسرے کو انہوں نے پکڑ لیا۔ دو چور انہوں نے پل پر جا پکڑے۔ ان کا سرغنہ سٹینلے لیور پول میں ایک جہاز پر پکڑا گیا۔ چاروں کو سزائے موت ہوئی لیکن سب سے کم عمر چور کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی گئی۔ سٹینلے سزا کے موقع پر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ 25 مئی 1752ء کو دو دوسرے مجرم کینلی اور مورگن پھانسی لگ گئے، ان کا رویہ اپنے وطن آئرلینڈ کے لوگوں کی طرح جرأت مندانہ رہا۔

اٹھارویں صدی میں اس قسم کی وارداتیں روزمرہ کا معمول بن گئی تھیں۔ فوجی دستوں کی طرح ڈاکو اپنے آپ کو منظم کرتے، ہفتوں اس گھر کی نگرانی کی جاتی جسے چوری کے لیے چنا جاتا تاکہ موقع آنے پر کسی مداخلت کا امکان نہ رہے۔ کینلی اور مورگن کی مثال سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے وسط میں چوروں نے ٹارچر کے طریقے سیکھ لیے تھے جو انقلاب تک فرانس میں عام ہو گئے تھے۔

کینلی اور مورگن کی سزایابی کے بعد ہنری فیلڈنگ (ناول نگار) نے جو تیرہ برس سے مجسٹریٹ تھا، اعلان کیا کہ اگر حکومت اسے چھ سو پاؤنڈ خرچ کرنے کا اختیار دے تو وہ لندن میں بڑھتے ہوئے جرائم کی رفتار روک سکتا ہے۔ سیکرٹری آف سٹیٹ اس پر رضامند ہو گیا۔ فیلڈنگ چونکہ باؤ سٹریٹ میں مجسٹریٹ تھا اس لیے اس کی بنائی ہوئی پولیس ''باؤ سٹریٹ رنرز'' کہلائی۔ ان کا کام اتنا تھا کہ وسطی لندن میں گشت کریں اور ان مجرموں پر نظر رکھیں جو اعلانیہ چوریاں کرتے تھے اور موقع ملنے پر انہیں گرفتار کریں۔ صرف روک ٹوک کے بجائے اچھے جاسوسی نظام کی ضرورت تھی کیونکہ ایلزبتھ دَور سے لندن کے چور اچکے اپنے آپ کو وسطی دَور کے بہادر اور شجاع سمجھنے لگے تھے۔ ملکہ این کے زمانہ میں لندن کا کوتوال ایک بدنام زمانہ شخص چارلس ہچن تھا، جو چوری کا سامان لے کر چوروں کو بلیک میل کیا کرتا تھا۔ جب جوناتھن وائلڈ نامی ایک سزا یافتہ شخص (جس نے قرض کی وجہ سے جیل میں چار سال گزارے تھے) 1714ء میں رہا ہوا تو اس نے ہچن کی مثال سامنے رکھی اور اس کی نقل کرتے ہوئے چوری کے سامان کا مشہور تاجر بن گیا۔ اگر چور گھڑی چراتا تو سیدھا وائلڈ کے پاس آتا۔ اسی طرح گھڑی کا مالک بھی اُسی کا رخ کرتا۔ مطلوبہ رقم کی وصولی پر گھڑی مالک کو واپس کی جاتی۔ چور اور وائلڈ منافع آپس میں بانٹ لیتے۔ کوئی شخص رپورٹ درج کرانے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا کہ

وہ یہی غنیمت سمجھتا تھا کہ اس کی چیز اسے واپس مل گئی۔ تعاون نہ کرنے پر چوروں کو مار دیا جاتا۔ دس برس تک وائلڈ خوشحال سے خوشحال تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ 1725ء میں جس سال کیتھرین ہینز جلائی گئی تھی، اسے ایک معمولی جرم یعنی چور کو فرار ہونے میں مدد دینے پر گرفتار کرلیا گیا۔ ایک اور معمولی جرم یعنی چور کو سزا دیئے بغیر چوری کا سامان واپس کرنے پر اسے 14 مئی 1725ء کو پھانسی دی گئی۔ فیلڈنگ نے اپنا پہلا ناول وائلڈ کے متعلق لکھا۔ اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ لندن میں جرائم کے جال کو ایسا کوئی بھی شخص توڑ سکتا ہے جو چوروں کو پہچاننے کی زحمت گوارا کرے۔ یہی ''باؤ سٹریٹ رنرز'' نے کیا۔ مجرموں کو ہمیشہ کی طرح گرفتاری کا کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے درجنوں گرفتار ہوئے۔ فیلڈنگ کہتا ہے کہ اسے صبح کے اخبار دیکھ کر اور یہ جان کر بے حد خوشی ہوتی ہے کہ ڈاکہ اور قتل کی وارداتیں روز بروز کم ہو رہی ہیں اور بالآخر ختم ہو گئی ہیں۔ اس نے حکومت کے 600 پاؤنڈ میں سے صرف آدھے پاؤنڈ خرچ کیے تھے۔

بڑی سڑکوں پر ڈاکہ زنی ختم کرنا بھی اتنا ہی آسان تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جدید پولیس گاڑیوں کی طرح بڑی سڑکوں پر پولیس کی گشت کا کوئی نظام ہو۔ اس کمی کو گھوڑوں نے پورا کیا۔ مسلح پولیس نے گھوڑوں پر سوار ہو کر لندن کے آس پاس گشت کرنا شروع کیا تو چورا چکوں میں ابتری پھیل گئی اور وہ دور دراز علاقوں میں نکل گئے۔ اس سے پہلے لندن میں پولیس کا کوئی معقول نظام نہیں تھا۔ بہرحال گھڑ سوار پولیس کی گشت سے جرائم کی تعداد میں ڈرامائی کمی ہوگئی۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ پرانے چوروں کی جگہ نئے چور آئے تو نئے ہتھکنڈے بھی ساتھ لے کر آئے۔ معاشرے سے کٹ کر الگ ہو کر جینے کی طرف یہ مجرموں کا پہلا بڑا قدم تھا۔ اب انہیں پرامن شہریوں پر جھپٹنے، انہیں لوٹنے کے لیے نئی عیاریوں سے کام لینا تھا۔ جب باؤ سٹریٹ میں فیلڈنگ کے نابینا بھائی، جان نے اس کی جگہ لی تو اسے تمام حکمت عملی نئے سرے سے دہرانا پڑی۔ درجنوں ہائی وے راہزنوں (بڑی سڑکوں کے ڈاکو) اور گھر لوٹنے والوں کو پھانسی اور عام چوروں کو پکڑا گیا۔ ان میں سے بعض جرائم بڑے دلچسپ تھے۔ ایک پادری ڈاکٹر ڈوڈ نے 4200 کے ایک بانڈ کے سلسلہ میں جعل سازی کی اور موت کی سزا پائی۔ ایک اور پادری جیمز ہکمن نے اس عورت کو گولی مار دی جس پر وہ عاشق تھا۔ (وہ ارل آف سینڈوچ کی داشتہ تھی) قتل کا محرک

جذبۂ رقابت تھا اور اس کی وجہ سے پھانسی کی سزا پائی۔ سارہ مریڈ ایک بوڑھی عورت پر دو لڑکیوں کے قتل کا الزام تھا۔ دونوں لڑکیوں کو سارہ کے پاس اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ انہیں گھر کے کام سکھائے۔ سارہ کی تندمزاجی سے تنگ آ کر ایک لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی تو سارا نے اسے اتنا مارا کہ بچی مرگئی۔ اس کے مرنے کی وجہ کوئی بیماری بتائی گئی۔ مقتولہ کی بہن اس لیے قتل کر دی گئی کہ اسے سارہ پر اپنی بہن کے قتل کا شبہ ہو گیا تھا۔ دونوں بہنوں کی لاشیں خراب ہونے لگیں تو سارہ نے ان کے ٹکڑے کیے اور اپنی بیٹی کی مدد سے کہیں چھپا دیں۔ سارہ کی بیٹی روکر نام کے ایک شخص کی محبوبہ بن گئی تو سارہ نے اس کے گھر جا کر جھگڑے کرنے شروع کر دیے۔ بیٹی نے اپنے عاشق کو دونوں بہنوں کے قتل کی تفصیل بتائی تو اس نے پولیس کو اطلاع دی۔ شاید اسے خیال تھا کہ اس کی محبوبہ پر کوئی الزام نہیں آئے گا کیونکہ اس وقت وہ کم عمر تھی۔ مگر وہ غلطی پر تھا۔ دونوں عورتوں کو پھانسی کی سزا ہوئی۔

مگر فیلڈنگ مر گیا تھا اور دوسرا کوئی شخص اس کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ اٹھارویں صدی کی جرم کی لہر بے روک ٹوک جاری رہی۔

صنعتی انقلاب نے حالات بدلنا شروع کر دیئے۔ جو کام کرنا چاہتے تھے انہیں کم از کم کام تو ملا۔ جیسا کہ پائک نے اپنی ''ہسٹری آف کرائم اِن انگلینڈ'' (Vol. 2, P 406) میں کہا کہ ''جرائم پیشہ طبقوں اور باقی معاشرہ کے درمیان ایک نئی حد فاصل ابھرنا شروع ہوگئی جو اس سے پہلے کہیں نہیں تھی، سڑکیں بہتر ہوگئیں۔ بہتر رابطوں کی وجہ سے چوروں ڈاکوؤں کی گرفتاری کے امکان زیادہ ہو گئے۔'' 1805ء میں گھوڑوں پر سوار پولیس پھر سڑکوں پر گشت کرنے لگی۔ لندن کے آس پاس دس میل بے وردی افسر شام پانچ بجے سے آدھی رات تک گھوڑوں پر گشت کرنے لگے۔ لندن میں اب بھی کوئی باقاعدہ پولیس نہیں تھی۔ انگریز سمجھتے تھے کہ پولیس کا کام تمہاری جاسوسی، تمہارے گھروں کی تلاشی اور تمہیں گھسیٹ کر جیل لے جانا ہے۔ چنانچہ جرم کی تفتیش کے طریقے تیر تکے پر منحصر تھے۔ نشانہ پر لگ گیا تو تیر ورنہ تکا۔

1811ء میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے ملک کے طول و عرض میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگ مجبور ہو گئے کہ اپنے تالے کنڈیاں لگا کر رہیں۔ واقعہ مشرقی لندن میں ریڈکلف روڈ پر واقع ایک گھر میں ہوا۔ اتوار 7 دسمبر 1811ء کی ایک رات ٹموتھی مارو کے گھر کوئی شخص دروازہ توڑ کر داخل ہوا اور ٹموتھی، اس کی بیوی، بے بی اور ایک تیرہ سالہ لڑکے کو قتل کر دیا۔ ایک خادمہ

جسے کوئی چیز خریدنے بھیجا گیا تھا واپس آئی تو اس نے لاشیں دیکھیں اور لوگوں کو خبر کی۔ ہر شخص قتل کی اس خوفناک واردات سے سراسیمہ ہوا۔ تمام مقتولوں کی کھوپڑیاں کچلی گئی تھیں اور گلے کاٹ دیئے گئے تھے۔ قتل کا مقصد ظاہر ہے کہ لوٹنا تھا۔

بارہ روز بعد کنگ آرمز پبلک ہاؤس میں اجتماعی قتل کی ایک اور واردات ہوئی۔ پبلک ہاؤس ولیمسن اور اس کی بیوی اپنی چودہ سالہ پوتی کٹی سٹلویل کی مدد سے چلا رہے تھے۔ بریجٹ ہیرنگٹن نامی ایک ملازم اور ایک کرایہ دار ٹرنر بھی تھا۔ رات گیارہ بجے پبلک ہاؤس بند ہونے کے بعد ولیمسن نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ براؤن جیکٹ پہنے ایک شخص مشتبہ حالت میں ادھر ادھر ٹہل رہا ہے۔ اگر اسے دیکھے تو گرفتار کر لے۔

کچھ دیر بعد جب کرایہ دار سونے چلا گیا تو اس نے بڑے زور سے دروازہ بند ہوتے سنا۔ اور پھر ہیرنگٹن کی آواز آئی کہ ''ہم سب قتل ہو گئے ہیں۔'' پھر اور چیخیں اور آوازیں۔ ٹرنر نے نیچے جا کر کمرہ میں جھانکا کہ ایک شخص لاش پر جھکا ہے اور اپنی جیبیں کسی چیز سے بھر رہا تھا۔ ٹرنر نے باہر جا کر قتل قتل کا شور مچایا تو آن واحد میں لوگ جمع ہو گئے۔ اندر جا کر دیکھا تو ولیمسن کی لاش زینہ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ اور دائیں ٹانگ میں شاید فریکچر تھا۔ کمرہ میں مسز ولیمسن اور ہیرنگٹن کی لاشیں تھیں۔ دونوں کے سر ہتھوڑے سے کچلے گئے تھے اور دونوں کے گلے ہڈی تک کاٹے ہوئے تھے۔ قاتل پچھلی کھڑکی سے بھاگ گیا تھا۔

واردات کے بعد درجنوں ملاح اور درجنوں براؤن جیکٹوں والے پکڑے گئے۔ ان میں ایک نوجوان ملاح جان ولیمز تھا۔ وہ خوبرو تھا اور شاید اسی لیے اسے غلطی سے ایک ''جنٹلمین'' بھی سمجھا جاتا تھا۔

اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مگر جب ایسے اشتہار بانٹے گئے جن پر قاتل کے ہتھوڑے (آلۂ قتل) کی تصویر بھی تھی تو جان ولیمز کے مالک مکان درمیلو نے ہتھوڑا پہچان لیا کہ یہ سویڈش ملاح جان پیٹرسن کا تھا کہ واردات کے وقت وہ اس علاقہ میں موجود نہیں تھا۔ مگر اس کے تمام آلات درمیلو کی تحویل میں تھے۔

جان ولیمز اب مشتبہ نمبر ایک تھا۔ وہی تھا کہ جو کنگز آرم کے پاس پاس واردات کی شام ٹہلتا تھا۔ سحری کے وقت وہ اپنی رہائش پر واپس آیا اور اس کی قمیص خون میں رنگی ہوئی تھی۔ کمرے میں مقیم ولیمز کے ساتھیوں نے بتایا کہ قتل کی رات ولیمز کی جیبیں خالی تھیں مگر اگلی صبح بھری ہوئی تھیں۔

ولیمز نے 28 دسمبر 1811ء کو جیل میں خودکشی کر لی۔ تفتیش کرنے والوں نے اعلان کیا کہ دونوں خاندانوں کا قاتل ایک ہی شخص ہے جبکہ دو مختلف آدمیوں کے پاؤں کے نشانوں کی موجودگی میں یہ فیصلہ متنازع تھا۔ ولیمز کے دل میں ایک نوک دار چھڑی دے کر اسے مشرقی لندن میں دفن کر دیا گیا۔ وہم پرستوں کو یقین تھا کہ خودکشی کرنے والوں کی روحیں بگڑ کر عفریت بن جاتی ہیں۔

ریڈکلف شاہراہ پر ہونے والی ہلاکتوں کی کہانی اتنی دلچسپ نہیں جتنی کہ خوفناک ہے۔ برطانیہ کی تاریخ، غالباً یورپ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی قتل کی واردات سے لوگوں میں اتنا خوف و ہراس پھیلا ہو۔ شاید اس لیے کہ عام خیال کے مطابق واردات کا مرتکب ایک شخص تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں وارداتوں میں خونریزی کا ارتکاب دو افراد بلکہ شاید کسی گینگ نے کیا تھا۔ ٹموتھی مار کے قریب رہنے والے ایک گواہ نے کئی افراد کے بھاگنے کی آواز سنی تھی۔ اگر اس کی گواہی سچ مان لی جاتی تو شاید اتنا خوف نہ پھیلتا کیونکہ 1811ء میں بھی لوگوں کو ڈاکوؤں کے گینگ یاد تھے۔ خوف کی اصل وجہ قاتل کا اکیلا ہونا تھا۔ اس کی دہشت تھی کہ اس نے تن تنہا اتنے قتل کیے! کیا وہ کوئی آدم خور تھا جو انسانی خون کی تلاش میں لندن کی دیواروں سے سر ٹکراتا پھرتا تھا۔ جیک دی رپر نے اپنے بھیانک خواب کو حقیقت کی شکل 77 برس کے بعد دی مگر 1811ء میں 'اکیلا مجرم' ابھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔

آئندہ دو عشروں میں اور واقعات نے پبلک کے خوف اور دلچسپی میں مزید اضافہ کر دیا۔ پہلا موقع ایک کھلاڑی اور جواری ولیم وئیر کا قتل تھا۔ جو دو کھلاڑیوں جان تھرٹل اور جوزف ہنٹ نے کیا۔ تھرٹل اپنے مضبوط جسم و جان کے ساتھ ریس اور باکسنگ کے میدانوں میں جانا پہچانا تھا۔ وئیر نے بلیئرڈ کھیلتے ہوئے اس سے اچھی خاصی رقم جیتی تھی۔ اور تھرٹل کو شک تھا کہ اس نے بے ایمانی کی ہے۔ غرضیکہ وئیر کو ولیم رابرٹ کے گھر دعوت پر بلایا گیا۔ چاروں لندن سے ایک بگھی میں روانہ ہوئے اور جب رکے تو تھرٹل نے وئیر کے چہرہ کو گولی کا نشانہ بنایا۔ وئیر نے منت سماجت کر کے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ مگر تھرٹل نے اسے زمین پر گرا کر اس کا گلا چاقو سے کاٹ دیا اور اس زور سے پستول وئیر کے سر پر مارا کہ پستول کی نالی سر توڑ کر اندر چلی گئی۔ انہوں نے لاش تالاب میں پھینکی اور رابرٹ کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے۔ اگلی صبح تھرٹل اور ہنٹ پستول اور چاقوؤں کی تلاش میں جائے واردات پر گئے مگر کامیاب نہ ہوئے۔ اتنے میں دو مزدوروں کو ان کے ہتھیار مل گئے۔ انہوں نے 'باؤ سٹریٹ رنرز' کو اطلاع

دی۔ رنرز کو لاش کسی اور تالاب سے ملی۔ شاید اس کی جگہ بدلی گئی تھی۔ رابرٹ نے سلطانی گواہ بننے میں دیر نہیں کی۔ تھرٹل کو پھانسی اور ہنٹ کو عمر قید کی سزا ملی۔

ان عام قسم کی ہلاکتوں سے اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ انہیں ڈرامائی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔

مگر یہ دلچسپی کیوں پیدا ہوئی، شاید اس لیے کہ تھرٹل مشہور کھلاڑی تھا یا یہ کہ تشدد اور جرم کی نوعیت اتنی شدید تھی کہ جرم کے خلاف لوگوں میں اور نفرت پیدا ہوئی۔ کیونکہ اسے وہ خدا اور انسان کے قانون کی صریح خلاف ورزی سمجھتے تھے۔ پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ سوسائٹی تیزی سے بدل رہی تھی۔ اگر یہ قتل ڈیفو کے زمانہ میں ہوتے تو اس وقت کے معمول میں ایک سرسری سا اضافہ سمجھے جاتے۔ مگر 1823ء میں حالات مختلف تھے۔ پائیک کہتا ہے، ''1820ء کے آغاز میں جب جارج سوئم فوت ہوا، تو برطانیہ نہایت دولت مند اور کئی لحاظ سے یورپ کا سب سے مہذب ملک تھا۔ بگھیاں تمام بڑی سڑکوں پر چلتی تھیں۔ سڑکیں اتنی اچھی تھیں کہ ان کا موازنہ اس تعمیری مہارت سے کیا جا سکتا تھا جو ہمیں رومنوں سے ورثہ میں ملی تھی۔ نہریں ملک بھر میں موجود تھیں اور یہ تمام تبدیلیاں جرائم کو روکنے کے لیے تھیں۔''
(ہسٹری آف کرائم اِن انگلینڈ Vol 2, P:407)

دراصل جرائم کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ میجر آرتھر گرفتھ نے 'مسٹریز آف دی پولیس اینڈ کرائم' میں لکھا کہ 1828ء میں 822 افراد میں سے صرف ایک فرد مجرم ہوتا تھا۔ اکثر جرائم غربت، فیکٹری مزدوروں کی نیم فاقہ کشی اور کھیت مزدوروں کی بے روزگاری کا نتیجہ تھے۔ جان ولیمز اور جان تھرٹل کے جرائم پر لوگ اس لیے حیران تھے کہ ان کی وجہ مایوسی نہیں تھی۔ بلکہ ان کا مقصد اپنا مفاد تھا۔ کیلی گلا کی طرح وہ انانیت اور خود پرستی کے مظاہر تھے۔ انفرادی ضمیر کا عہد انفرادی جرم میں بدل رہا تھا۔

ولیمز اور شاید اس کے ایک ساتھی نے ڈاکہ ڈالنے کے دوران قتل کیا تھا۔ گزشتہ صدی میں ایسے سینکڑوں قتل ہوئے تھے۔ تھرٹل نے غنڈہ گردی کے نشہ میں قتل کیا تھا۔ مگر لوگ انہیں جن بھوت یا دیو ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ایک ایسے دور میں جب معاشرہ روز بروز خوشحال ہو رہا تھا، روز بروز سائنس اور صنعتی ترقی کی طرف بڑھ رہا تھا، یہ مریضانہ ذہنیت نہ جانے کیوں پیدا ہو گئی تھی۔

دراصل یہ دو بالکل مختلف قسم کی تنہائیوں کا مسئلہ تھا۔ ایک تنہائی نئی صنعتی دنیا کی بے کیفی

تھی، دوسری تنہائی ناول کی وجہ سے تھی جو زوال پذیر ہو کر جنوں پریوں کی کہانی بن گیا تھا۔ حقیقت کے ساتھی ناول کا رشتہ برائے نام رہ گیا تھا۔ ہوریس ولپول کا 'کیسل آف اٹرینٹو' 1765ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت سے لکھاریوں میں یہ کشمکش شروع ہو گئی تھی کہ کون سب سے زیادہ وحشت خیز اور پراسرار کہانی لکھ سکتا ہے۔ 1795ء میں این ریڈ کلف کی 'Mysteries of Udolpho' نے میدان جیت لیا۔ ایک سال بعد میتھیو گریگری لیوس کی 'The Monk' اس سے بھی بازی لے گئی اس میں قتل اور بھوتوں جنوں سے لے کر ریپ تک سب کچھ تھا۔ پراسرار کہانی کسی پرانے قلعہ میں شروع ہوتی جس میں رومان، خوف، دہشت، جادو اور ظلم وستم کے واقعات کی بھرمار ہوتی۔ 'فرینکنسٹائن' اور 'ڈریکولا' جیسی ہالی ووڈ کی فلموں نے بعد میں یہ میڈیم اپنا لیا اور اس میں سبقت حاصل کی۔ 1820ء میں چارلس میٹورین نے اپنی 'Melmoth the Wonderer' پروڈیوس کی جس نے 'ڈکشنری آف لٹریری بائیو گرافی' کے مطابق خوف، دہشت اور اسرار کی پہلی مثالیں پیچھے چھوڑ دیں۔ 1840ء تک یہ کہانیاں اتنی مقبول ہوگئیں کہ ناشر اُن کے ہفتہ وار ایڈیشن شائع کرنے لگے۔ اس میں فیکٹریوں کے اندر دس بارہ گھنٹے کام کرنے کی تھکن اور بوریت بھی شامل ہوگئی جس کی وجہ سے ولیم ورئیر کے قتل نے ایسی مریضانہ اہمیت حاصل کی کہ قتل کے اصلی حقائق نظرانداز ہو گئے۔ دنیا نے حقیقت سے منہ موڑ لیا۔ ڈیفو نے حقیقت نگاری کے تحت لکھا تھا لیکن وسط انیسویں صدی کے داستان گو اور لکھاری کو جرم وستم کی ہر کہانی ایک ہی سانس میں بڑے والہانہ تسلسل کے ساتھ بیان کرنا ہوتی تھی کہ وہ لوگ مرعوب و متاثر ہوں جو ہر روز ظلم و شقاوت کی تازہ خبر پر پلتے تھے۔

اس قسم کے واقعات نے برطانوی پبلک کو ایک حقیقی پولیس فورس کی ضرورت کا احساس دلا دیا۔ پبلک میں سب سے زیادہ یہ احساس پیدا کرنے کا باعث ایڈنبرا میں لاشوں کے تاجر برک اور ہیئر کا مقدمہ تھا۔ یہ دونوں آئرش مزدور 1826ء میں ملے اور ایڈنبرا کے ایک ہوٹل میں اپنی بیویوں کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ جب ہیئر کا مالک فوت ہوا تو اس نے کسی طرح ہوٹل پر قبضہ کر لیا۔ ہوٹل کا ایک مہمان اولڈ ڈونلڈ فوت ہوا تو اس کے ذمہ کرائے کی کچھ رقم بھی تھی۔ ہیئر نے کرایہ وصول کرنے کا یہ طریقہ سوچا کہ مالک کی لاش میڈیکل سکول کے پاس بیچ دے۔ ڈاکٹر نوکس (10 سرجن سکوئیر) نے ہیئر کو سات پونڈ دس شلنگ لاش کا معاوضہ دیا جو کرایہ کی رقم سے دگنا تھا۔ اب ہیئر اور برک نے سوچا کہ اگر لاشیں میسر ہوں تو

روزی کمانے کا یہ آسان طریقہ ہے۔ مگر قبرستانوں میں اکثر پہرے لگے رہتے تھے کہ کوئی لاشیں نہ چرائے۔ اس کا حل انہیں یہ سوجھا کہ لاشیں چرانے کے بجائے بنائی جائیں اور قبرستان کا رخ کرنے سے پہلے بیچ دی جائیں۔ جب ایک مہمان جو دی ممپر بیمار ہوا تو برک اور ہیئر نے اسے جلدی مارنے کی کوشش میں اس کے چہرے پر تکیہ رکھ کر دبایا، یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ انہوں نے لاش دس پونڈ میں بیچی اور فیصلہ کرلیا کہ یہ نیا پیشہ مزدوری سے بدرجہا بہتر ہے۔

فروری 1828ء میں ایک سیلانی خاتون ایبگل سمپسن کو گھیر کر ہوٹل لایا گیا اور خوب شراب پلائی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا اس لیے ہیئر اور برگ گھبرا رہے تھے۔ اگلی صبح بھی وہ زندہ تھی، اس لیے انہوں نے اسے اور شراب پلائی۔ برک نے اس کی ٹانگیں پکڑیں اور ہیر نے گلا دبایا۔ یہ لاش بھی دس پونڈ میں بک گئی۔ آٹھ مہینوں میں انہوں نے گیارہ لاشیں اسی طرح 'بنائیں' اور بیچیں۔ بعض تو کبھی پہچانی نہیں گئیں، جیسے ایک آئرش بھکارن اور اس کا گونگا پوتا، جس کی کمر برک نے اپنے گھٹنے کے زور سے توڑی اور بھکارن کا گلا گھونٹ دیا۔ جب ایک نوجوان خوب صورت لڑکی میری پیٹرسن کی لاش ڈاکٹر نوکس کو بیچی گئی تو اس کے دل میں شک پیدا ہوا۔ اس لیے بھی کہ ایک طالب علم نے میری پیٹرسن کی لاش پہچان لی تھی۔ ڈاکٹر کا شک یقین میں بدل گیا، جب ہیئر اور برک نے ایک جانی پہچانی لڑکی ڈیفٹ جیمی کی لاش اسے بیچی مگر وہ خاموش رہا۔

برک اور ہیئر کا راز لاپرواہی سے افشا ہوا۔ انہوں نے ایک بیوہ ڈوچرٹی کی لاش کمرے میں رکھی اور کہیں چلے گئے۔ دو مہمانوں نے لاش دیکھ لی۔ جب وہ پولیس کے پاس جا رہے تھے تو راستہ میں برک کی بیوی ملی جس نے ان کے چہروں سے کسی خرابی کا اندازہ کرلیا اور گھٹنے ٹیک کر خاموش رہنے کی درخواست کی۔ وہسکی کے گلاسوں پر دونوں کرایہ دار مان گئے مگر پھر بھی پولیس کو اطلاع کردی۔ گھر کی تلاشی سے خون آلود کپڑے برآمد ہوئے۔ ہیئر جلدی سے سرکاری گواہ بن کر بچ گیا۔ برک کو موت کی سزا ہوئی اور جنوری 1829ء میں پھانسی لگ گیا۔ ہیئر ایڈنبرا سے چلا گیا اور لندن میں جا کر اندھے بھکاری کی موت مرا۔

برطانیہ میں جرائم کی تاریخ کا یہ سب سے گھناؤنا مقدمہ تھا اور برطانوی پبلک کے لیے حد سے زیادہ خوفناک تھا۔ کیونکہ انہیں حسین لڑکیوں کے ریپ کی کہانیوں کی عادت تھی۔ اس لیے ہیئر اور برک کی کہانی کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو ریپ کی کہانیوں کو حاصل تھی۔

یہ اور بات ہے کہ اس نے برطانوی عوام کو پولیس فورس کے قیام پر آمادہ کر لیا۔ جو سر رابرٹ پیل کی قیادت میں ستمبر 1829ء میں قائم ہوئی۔ نئی پولیس کو خاموشی، احترام، فرض شناسی، خوش خلقی اور اپنے اصولوں پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا۔ پولیس نے ان ہدایات پر حرف بحرف عمل کیا، جس کی وجہ سے اسے لوگوں کا اعتماد حاصل ہوا۔

مگر اس میں کچھ وقت لگا۔ ابتدا میں باوردی پولیس اپنی وردی میں ''سرکاری'' لگتی تھی جس کی وجہ سے انگلستان کے بڑے شہروں خصوصاً ان کے گلی کوچوں میں پولیس کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی جون 1830ء میں پولیس کانسٹیبل گنتھم نے دو شرابیوں کو آپس میں لڑتے دیکھا۔ جب انہیں چھڑانے کے لیے وہ ان کی طرف بڑھا تو اسے زمین پر گرا کر اس کے منہ پر اس زور سے بھاری بوٹوں کے ساتھ ٹھڈے مارے گئے کہ وہ مر گیا۔ پہلا پولیس مین تھا جو اپنا فرض ادا کرتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے قاتل فرار ہو گئے اور کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔ چھ ہفتوں بعد ایک پولیس مین جان لانگ کو شبہ ہوا کہ لندن میں گرے ان روڈ پر تین افراد چوری کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اس نے انہیں ٹوکا تو ان میں سے دو افراد نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور تیسرے نے اس کی چھاتی پر چاقو سے وار کیے۔ شور وغل ہوا تو ایک اور پولیس مین نے ایک بھاگتے ہوئے شخص کو پکڑ لیا۔ وہ جان سمتھ نامی ایک بیکر تھا جس کی ایک بیوی اور چھ بچے تھے۔ جو کہہ رہا تھا کہ اس نے 'ٹھہر جا چور' کی آواز سنی اور لوگوں کے ساتھ تعاقب میں شامل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ بے قصور تھا مگر شروع میں پولیس ایک بے قصور شخص کو پھانسی دینا بہتر سمجھتی تھی بجائے اس کے کہ کسی کو پھانسی نہ دے۔

1833ء میں ایک پولیس مین کے قتل سے ظاہر ہوا کہ حکومت کے بارے میں انگریزوں کا رویہ مبہم اور ناقابل فہم ہے۔ ایک نیم انقلابی گروپ 'نیشنل پولیٹکل یونین' نے 'کولڈ باتھ فیلڈز' میں ایک جلسہ کی دعوت دی جسے پولیس کمشنر نے فوراً خلاف قانون قرار دیا اور پابندی لگا دی۔ پابندی توڑ کر ایک ہجوم لاؤڈ سپیکر کے گرد جمع ہوا۔ آٹھ سو پولیس والے اور فوجی سپاہی امن قائم رکھنے پر مامور تھے۔ پولیس کے ایک جاسوس نے بغاوت کی خبر دی۔ پولیس انچارج نے پولیس کو ہجوم کی طرف بڑھنے کے لیے کہا۔ ہجوم نے جواب میں پولیس پر پتھر برسانے شروع کر دیے۔ پولیس نے غضبناک ہو کر بوڑھوں عورتوں بچوں سمیت سب کو مارنا شروع کر دیا۔ جونہی ایک پولیس مین رابرٹ کلے ان کا جھنڈا چھیننے لگا ایک شخص نے اس کے سینہ میں خنجر اتار دیا۔ رابرٹ چند قدم لڑکھڑایا اور گر کر مر گیا۔

موت کی تحقیقات پر مامور جج کو ظاہر ہے کہ پولیس سے ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس خیال سے کہ پولیس کو تقریر کی آزادی سلب کرنے کا حق حاصل نہیں جب جج نے جیوری کے ممبروں کو فیصلہ سنایا تو وہ اس پر متفق نہ ہو سکے۔ جج نے کہا کہ متفق ہونے تک تمام ممبر کھائے پیئے بغیر عدالت میں موجود رہیں، جس پر جیوری نے (جو معزز تاجروں پر مشتمل تھی) کسی گمنام شخص کے خلاف قابل جواز ارادۂ قتل کا فیصلہ دیا۔ پولیس اور پبلک کے درمیان اشتعال انگیزی بڑھ گئی لیکن انگریزوں کو ہمیشہ کے لیے اپنی رائے دینے کی آزادی مل گئی۔

فرانس میں صورت حال اور بھی نا قابل فہم تھی۔ لوئیس چودہ کے دنوں سے ان کی سرکاری پولیس موجود تھی۔ ہر پولیس مین سمجھتا تھا کہ وہ خود بادشاہ یا اس کا نمائندہ ہے، جو چاہے کہہ سکتا ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ انقلاب فرانس کی صورت ظاہر ہوا مگر بچوں کی قربانی اور اجتماعی زہر خورانی کے واقعات سے ثابت ہو گیا کہ فرانسیسیوں کو انگریزوں سے بہت پہلے پولیس کی ضرورت تھی۔ فرانس میں چیف آف پولیس کو اخبارات سنسر کرنے اور صحافیوں کو گرفتار کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔

جرائم کی روک تھام کے لیے فرانسیسی جاسوسی نظام پر توجہ دیتے تھے۔ انہوں نے جاسوسی کا جال ملک بھر میں پھیلا رکھا تھا۔ پولیس کے وزیر ایم ڈی سارٹینز نے ایک بار اپنے ایک دوست کو چیلنج کیا کہ پولیس کے علم کے بغیر کوئی شخص شہر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کا دوست جج ایک مہینہ بعد خفیہ طور پر ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ لیکن چند گھنٹوں کے اندر اسے سارٹینز کے ساتھ کھانا کھانے کا دعوت نامہ مل گیا۔ ایک دفعہ ویانا کی پولیس نے درخواست کی کہ آسٹریا کے ایک مشہور لٹیرے کو پیرس میں تلاش کیا جائے۔ سارٹینز نے جواب دیا کہ لٹیرا ابھی ویانا میں ہے۔ اس کا پتہ بتایا اور ویانا کی پولیس نے ٹھیک اس پتہ پر جا کر ملزم گرفتار کر لیا۔

فرانس کی انڈر ورلڈ (قمار بازی و شراب کے اڈے، قحبہ خانے وغیرہ) بھی اتنی منظم تھی کہ انگریز اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جب لوئیس سولہ نے میری انٹونیو سے شادی کی تو بدمعاشوں نے رات کی تاریکی میں موٹی رسیاں اس طرح باندھ دیں کہ مہمان بڑی تعداد میں ان سے الجھ کر گر پڑے۔ اڑھائی ہزار افراد پاؤں تلے کچل کر مر گئے۔ جیب تراشوں نے لاشوں کی جیبیں کاٹنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اگلے دن سارٹینز کے جوانوں نے مشہور مجرموں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارے اور سینکڑوں افراد گرفتار کیے۔ یہ کام انہوں نے اس تیزی سے کیا

کہ انہیں مسروقہ مال برآمد کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ یہ اس منحوس شادی کا آغاز تھا جو قتل گاہ میں ختم ہوئی۔

1789ء کے انقلاب کے بعد پولیس منتشر کر دی گئی جسے رابسپیری نے پھر منظم کیا جو اپنے دشمنوں کی سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ نپولین نے جوزف فیوچ کو اپنا پولیس منسٹر مقرر کیا اور فیوچ کے جاسوسی نیٹ ورک نے مہارت میں سارٹینز کے نیٹ ورک کو بھی مات کر دیا۔

فیوچ کے ماتحت پیرس کا پولیس چیف ایم ہنری تھا۔1809ء میں ایک روز مضبوط جسم کا ایک نوجوان یوجین فرانسوا وڈوک اس سے ملنے آیا اور معافی کے عوض بعض مجرموں کے متعلق ضروری اطلاعات مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ وڈوک کا رویہ ہنری کے ساتھ بالکل بے تکلفانہ تھا۔ وڈوک نے پُرخطر زندگی بسر کی تھی۔ اس کی تندمزاجی اور حسین عورتوں کی محبت نے اسے اکثر برے دن دکھائے تھے۔ وہ سمگلر رہ چکا تھا۔ جیل سے بھاگ چکا تھا۔ اب وہ ایک خاموش پُرسکون زندگی چاہتا تھا۔ ہنری نے دیکھ لیا کہ وڈوک بے بس ہو چکا ہے۔ وہ اسے اور بے بس کرنا چاہتا تھا کہ اس سے جو کام چاہے لے سکے۔ اس لیے اس نے انکار کیا اور وڈوک کو ناکام جانے دیا۔

جو بات وڈوک نے ہنری کو نہیں بتائی وہ اب اس کا جعل سازوں کے گروہ میں شامل ہونا تھا۔ انہوں نے پولیس کو اس کی اطلاع دی۔ پولیس اسے گرفتار کرنے اس وقت گئی جب ابھی وہ بستر میں تھا۔ اسے تقریباً برہنہ حالت میں چھت سے گرفتار کیا گیا۔ ہنری نے اسے گرفتار دیکھا تو بہت خوش ہوا کہ اب وہ یقیناً مجبور اور بے بس ہو گیا ہے۔ اب ہنری اس سے اپنی شرائط پر بات کر سکتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ وڈوک پولیس کا جاسوس بنے اور اپنے ساتھیوں سے غداری کرے۔ بہت مشکل کام تھا مگر وڈوک کے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اسے جاسوسی پر مامور کر کے لافورس جیل لے جایا گیا۔ یہ خطرناک کام تھا مگر اس کی آزادی کا انحصار اس کام کو اچھی طرح کرنے پر تھا اور اس نے یہ کام اتنی اچھی طرح کیا کہ ہنری نے اسے پولیس ایجنٹ کے طور پر رہا کرنے کا فیصلہ کیا۔ وڈوک کی تبدیلی کسی اور جیل میں کرنے کے لیے اسے زنجیریں پہنائی گئیں اور راستہ میں اسے بھاگ جانے دیا گیا۔ اس واقعہ نے اسے پیرس کی انڈرورلڈ کا ہیرو بنا دیا۔ اس کا پہلا کام ایک جعل ساز واٹرین کا پتہ لگانا تھا جو جیل سے بھاگا اور بالکل غائب ہو گیا۔ کہیں سے پتہ چلا کہ واٹرین کا کچھ سامان ایک کمرہ میں پڑا ہے۔

وڈوک نے اس کے آنے کا انتظار کیا اور آتے ہی اسے دبوچ لیا اور ہنری کے پاس لے آیا اسے بہت بڑا انعام ملا۔ جبکہ واٹرین اور ایک دوسرے مجرم باؤسین (جس نے وڈوک کے خلاف جاسوسی کی تھی) کو سزائے موت دی گئی۔ اسے بھی وڈوک کی اطلاع پر گرفتار کیا گیا تھا۔

آئندہ چند برسوں میں وڈوک ہیپرس کا سب سے لائق، فرض شناس اور باعزم پولیس ایجنٹ ثابت ہوا۔

اس کی کامیابی نے پولیس حلقوں میں اس کے دشمن پیدا کر دیئے۔ ہنری اچھی طرح جانتا تھا کہ وڈوک کو اپنی زندگی کا یہ نیا دور بہت عزیز ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پولیس کی صفوں میں باہمی رقابت اور حسد پیرس کے امن کو تہ و بالا کر سکتا ہے۔ شہر کے ہر حصہ میں پولیس سٹیشن موجود تھے۔ مگر ان کے مابین تعاون برائے نام تھا۔ ووڈک نے جب ایک مختصر مگر اعلیٰ تربیت یافتہ پولیس دستہ قائم کرنے کا مشورہ دیا جو ہر ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے آناً فاناً شہر کے ہر حصہ میں پہنچ جائے تو ہنری نے اس پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی۔ ووڈک کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی پسند کے چار افراد اپنے دستہ کے لیے چن لے تو اس نے چار مجرم اپنی مدد کے لیے منتخب کیے۔ پولیس کے اکثر افراد نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ مگر ہنری نے پروا نہ کی۔ پولیس کا یہ مختصر طوفانی دستہ آج کی فرانسیسی قومی پولیس فورس کی بنیاد بنا۔

1833ء میں ووڈک بزور ریٹائر کر دیا گیا۔ نئے پولیس چیف نے اعتراض کیا کہ تمام طوفانی دستہ مجرموں اور سابق مجرموں پر مشتمل ہے۔ وڈوک فوراً پرائیویٹ سراغ رساں بن گیا۔ وہ دنیا کا پہلا پرائیویٹ سراغ رساں تھا۔ اس نے اپنی آپ بیتی لکھی۔ بالزاک سمیت وہ اکثر لکھاریوں کا قریبی دوست تھا۔ بالزاک نے وڈوک کی مثال سامنے رکھ کر اپنا مشہور کردار ووٹرین تخلیق کیا تھا۔

وڈوک کی آپ بیتی کا عجیب پہلو یہ ہے کہ اس کے تمام جرائم بلا تشدد ہیں۔ یہ نہیں کہ مجرموں کو تشدد اور قتل کرنا نہیں آتا بلکہ اس لیے کہ اکثر جرائم میں سماج سے نفرت کا شائبہ نہیں۔ نہ سماج سے نفرت ان کی بنیاد ہے اور یہی بات جدید مجرموں کے لیے وجہ امتیاز ہے۔ تشدد کے زور پر چوری اور ڈاکہ زنی محض ایک پیشہ تھا جسے ان لوگوں نے اپنایا جنہیں شراب اور عورت کا بہت شوق تھا۔ کئی ڈاکوؤں نے قسم کھائی تھی کہ جیل سے باہر آنے کے بعد وہ وڈوک کو زندہ نہیں چھوڑیں گے مگر کسی نے اس پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ مخبر کی حیثیت سے ابتدائی دنوں میں وڈوک نے دو مجرموں سے ملاقات کی

جنہیں وہ جیل کے دنوں سے جانتا تھا۔ گھنٹوں وہ ان کے ساتھ شراب پیتا رہا۔ پھر ان کے ساتھ مل کر ایک ڈاکہ ڈالنے کا وعدہ کیا، جس میں دو بوڑھوں کے گلے کاٹنے کا پروگرام بھی شامل تھا۔ موقع ملتے ہی وڈوک نے ہنری کو اس پروگرام کی خبر دے دی۔ ڈاکو باغ کی دیوار کود کر اندر گئے تو پولیس ان کی منتظر تھی۔ اسی دوران کسی نے گولی چلائی اور وڈوک گولی لگنے کا بہانہ کر کے زمین پر گر گیا۔ اس کا ایک ساتھی اس کے غم میں ہلکان اس پر گرنے کو تھا کہ اسے تھام لیا گیا۔ ڈبلیو ایس گلبرٹ نے سچ کہا تھا کہ ''مجرم اگر جرم کرنے میں مصروف نہ ہو تو وہ عام آدمی کی طرح جذباتی اور انسان دوست ہوتا ہے۔'' وڈوک کا معمول تھا کہ وہ کبھی ان مجرموں کو سمجھنے کی کوشش کرتا جو اس کے ذریعہ پھانسی کے تختہ پر جاتے تھے یا عمر قید کی سزا پاتے تھے۔ وہ ان کے معمول کے کام بھی کرتا تھا، جیسے ان کے خاندان کو ان کے پیغام پہنچانا اور خاندان کی خیریت وغیرہ معلوم کرنا۔ ان کے ساتھ اس کے تعلقات میں قربت تھی اور گرم جوشی تھی۔ اس نے یہ عادت بنا لی تھی کہ جب دوسری جیل میں بھیجنے کے لیے لوگوں کو اکٹھے ہتھکڑیاں بیڑیاں لگائی جاتیں تو وہ قریب جا کر دیکھتا رہتا۔ پہلی دفعہ جب اس نے ایسا کیا تو وہ اس پر جنگلی درندوں کی طرح جھپٹے، اسے اور قریب آنے کو کہا۔ وڈوک نے بالکل یہ کیا جبکہ سلاخوں کے پیچھے سے دوسرے قیدی انہیں وڈوک کے قتل پر ابھارتے رہے مگر کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ اس کی بہادری کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وڈوک سزا یافتہ مجرموں کے پیغام ان کی بیوی بچوں اور محبوباؤں کو دیتا اور ان کی پھانسی سے پہلے ان سے اچھے دوستوں کی طرح جدا ہوتا تھا۔ سوشلسٹ سچ کہتے ہیں کہ ''جرم سماجی حالات کی پیداوار ہے۔'' مگر سماج کے دشمن مجرم کا ظہور ابھی نہیں ہوا تھا۔

لیکن آخر وہ ظاہر ہو کر رہا۔ 1834ء میں وڈوک کی ریٹائرمنٹ کے بعد پی ایف لیسینئر کے نام سے ایک بوڑھی عورت اور اس کا بیٹا قتل ہوئے۔ چند ہفتوں بعد ایک بنک کے قاصد کی جان لینے کی کوشش کی گئی جسے ایم موسیئر کے گھر سے روپیہ لانے بھیجا گیا تھا۔ سخت زخمی ہونے کے باوجود وہ چلّایا جس سے دو حملہ آور بھاگ گئے۔ اس نے وڈوک کے قائم مقام کینلر کو موسیئر کا حلیہ بتایا تو پتہ چلا کہ موسیئر دراصل لیسینئر تھا جس نے اپنے کئی نام رکھے تھے۔ اس کے دو ساتھی جو گرفتار ہوئے انہوں نے جرم کا اعتراف کیا۔ آخر لیسینئر ایک جعلی چیک کے سلسلہ میں خود گرفتار ہوا۔ اس بات سے برہم ہو کر کہ اس کے ساتھیوں نے اس سے غداری کی اس نے بھی بوڑھی عورت اور اس کے بیٹے کے قتل سے بنک قاصد پر حملہ تک تمام

جرائم کا کھل کر اعتراف کیا اور ایک نامور شخصیت کا درجہ پایا۔ ایک اوسط مجرم کی نسبت لیسینئر بہت زیادہ ذہین اور تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے شاعری کی، نراجیوں کا ادب پڑھا اور اپنے آپ کو ایک باغی اچھوت اور ٹھکرایا ہوا انسان سمجھا۔

لاسینئر کی 'آپ بیتی' ہمیں ایک ایسی کہانی سناتی ہے جو آج بہت عام ہے مگر اُن دنوں بے مثال تھی۔ ایک بہت حساس بچہ جو اس لیے حسد کا شکار ہوا کہ والدین اپنے بڑے بچہ کو زیادہ توجہ دیتے تھے، اسی لیے اس میں گہری نفرت اور خود رحمی پیدا ہوئی۔ بچپن ہی سے ناانصافی کا شکار، اس نے زندگی کا ایک ایسا تصور اپنایا جو دوسرے لوگوں کے تصور سے الگ تھا۔ اس نے چوری کی تا کہ توجہ حاصل ہو، مگر والدین اور غضبناک ہو گئے۔ بنک میں بوریت اور بیزاری کے دو سال گزارنے کے بعد وہ پیرس آ گیا اور قلم کی مدد سے زندہ رہنے کی کوشش کی مگر دیکھا کہ ناممکن ہے تو فوج میں شامل ہو گیا۔ وہاں دل نہیں لگا تو فوج سے بھاگ گیا۔ پھر جعل سازی پر اتر آیا۔ اٹلی میں اسے پتہ چلا کہ ہوٹل میں اس کے ایک ساتھی مہمان نے پولیس کو اس کے مفرور ہونے کی اطلاع دی ہے۔ لیسینئر نے اسے جنگل میں سیر کی دعوت دی۔ وہاں لے جا کر اسے ڈوئیل (مقابلہ) لڑنے کے لیے کہا۔ جب اس نے انکار کیا تو لیسینئر نے اسے سر میں گولی مار دی۔ فوج میں دوبارہ اس کا جانا ذلت پر ختم ہوا۔ جب وہ تھک کر مایوس ہونے لگا تو اس کی خود رحمی نے اس سے کہا کہ تمہاری بربادی کا ذمہ دار کوئی اور ہے۔ وہ 'کوئی اور' سوسائٹی تھی۔ اس کا استدلال بھی کارل پینزرم جیسا تھا مگر کارل پینزرم ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کے پیدا ہونے میں ابھی پچاس برس باقی تھے۔ پینزرم کی طرح وہ بھی سمجھتا تھا کہ اپنی ناکامیوں اور خامیوں کا الزام دوسروں کو دینا چاہیے۔ بعض لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ ''تمہیں کیا شکایت ہے؟ فرانس میں جعل ساز، اٹلی میں قاتل' پیرس میں چور، سوسائٹی کے خلاف برے عزائم، کیا بھلائی پر تمہارا حق تھا؟'' ''ہاں، کیونکہ میں نے سوچا تھا کہ میرے باپ کی دولت سب کچھ لوٹانے کے لیے بہت ہے۔ اٹلی میں قاتل؟ ہاں، کیونکہ مجھ سے غداری کی گئی تھی۔ سوسائٹی کے خلاف برے عزائم؟ ہاں، کیونکہ 1829ء میں اس نے مجھے اپنی صفوں میں جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کی ضرورت مجھے صرف روٹی کمانے کے لیے تھی۔ روٹی کمانے کا حق تمام برے بھلوں، تمام دنیا کو حاصل ہے۔'' پھر چند صفحات کے بعد وہ مانتا ہے کہ جب اس کی جیب میں پیسے ہوں تو وہ ان سے جلد از جلد نجات چاہتا ہے، یہ 'جادوئی سوچ' ہے کہ اس کی بدنصیبی کی وجہ ہمیشہ اس کی 'اپنی غلطیاں نہیں۔' جب میں نے دیکھا

کہ میری اپنی کسی غلطی کے بغیر میری جیبیں خالی ہوگئی ہیں تو میری نفرت اور بڑھ گئی۔ میں نے آخرکار تمام بنی نوع انسان کو اس نفرت میں شامل کر لیا۔ روسو سے اس نے سیکھ لیا تھا کہ ہماری بربادی کے ذمہ دار دولت مند ہیں۔ چنانچہ وہ گیا اور ایک بے چاری بوڑھی عورت اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا، جو معمولی سطح پر کرنسی کا کاروبار کرتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس کی خودرحمی نے اسے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا کہ تمام احتیاطیں ترک کرے، کنٹرول سے باہر ہو جائے ایک درندہ کی سطح پر گر جائے اور اپنے آپ کو یقین دلاتا رہے کہ اس کی کوئی غلطی نہیں۔ جیل میں اسے وہ توجہ ملی جس کے لیے وہ تڑپتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہاں اس نے موج کی۔ اس حالت میں اسے ضرور خیال آیا ہوگا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ شہرت کے لیے جس کا وہ ہمیشہ سے متلاشی تھا، وہ اپنے آپ کو کسی نظم اور ڈسپلن میں لا سکتا تھا۔ وڈوک کی طرح وہ دوسرا چانس لیتا اور خوش رہتا مگر دوسرا چانس اس نے یہ لیا کہ ایک بہادر کی طرح سکون سے پھانسی لگ گیا۔ یہ اس کا دوسرا بڑا کارنامہ تھا۔

اپنی آپ بیتی میں اس نے کہا ہے کہ ”میں صرف ایک نیکی جانتا ہوں جو تمام نیکیوں کی ہمسر ہے اور وہ نیکی طرز احساس ہے۔“

یہ تصور ہمیں اس کا اہل بناتا ہے کہ ہم سوچیں کہ معاشرہ میں کیا ہو رہا ہے اور جرم کے انداز، اس کی اصلیت کیوں روز بروز بدلتی رہتی ہے۔ غیر تعلیم یافتہ لوگ شاید اب بھی ڈیفو کے زمانہ میں رہتے ہوں مگر لیسینئر جیسے سینکڑوں ہزاروں لوگ گھٹیا ناولوں کے گرویدہ تھے اور مادی دنیا کے بجائے اپنی خیالی دنیا میں رہتے تھے۔ تخیل کی دنیا میں قدم رکھ کر وہ بے پڑھوں کی نسبت زیادہ حساس ہو گئے تھے۔ مگر اس طرح وہ مایوسی، حوصلہ شکنی اور خودرحمی کے شکار بھی ہوئے۔ خود اپنے جذبات کے قیدی بن گئے۔ اپنے مسائل کا سامنا جرأت اور ہمت سے کرنے کے بجائے جادو کے کرتب دکھانا شروع کر دیے اور ان مسائل میں الجھ گئے جن کا کہیں کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اپنی مایوسی کی حالت بیان کرتے ہوئے لیسینئر کہتا ہے کہ ”میں ایک گھنٹا میں دس سال جیا ہوں۔ میں اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہتا تھا اور یہ وقت مجھ پر بار بار آیا۔ اس لیے میری زندگی ایک طویل خودکشی ہے۔“

امریکا میں انہی دنوں ایک نوجوان فوجی کیڈٹ بھی (کہ جس کی جسمانی ساخت لیسینئر جیسی تھی) یہی کچھ کر رہا تھا۔ شعر کہنا، فرض سے غافل ہونا، خوب شراب پینا، دوستوں اور رشتہ داروں سے الگ رہنا اس کا شیوہ تھا۔ ایڈگر ایلن پو، نو برس لیسینئر سے چھوٹا تھا۔ اس نے

جرم کے بجائے ادب کا رخ کیا تھا مگر ان دونوں کی زندگی کا موازنہ کریں تو ان میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے ٹائپ کی دو انتہائیں ہیں جن میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کی اکثریت لیسینئر اور ایلن پو کی صلاحیتوں سے محروم تھی مگر ناول نے انہیں ایک مبہم اور موہوم سا جذبہ دیا کہ وہ زندگی میں اس سے زیادہ کے مستحق ہیں جو انہیں مل رہا ہے یا مل سکتا ہے۔ سوشلسٹ تحریروں نے اس جذبہ کو جواز دیا کہ لوگوں کی اکثریت اس لیے محروم ہے کہ ایک بہت چھوٹی اقلیت نے معاشرہ کی دولت پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ خیال ہی لیسینئر کو اس راستہ پر لایا کہ اپنی بہتری کی کوشش کے بجائے لوگوں کو چھرے مارتا پھرے اور جس نے جو کچھ اپنی محنت سے کمایا ہے اسے لوٹ لے یا کمانے والے کو قتل کر دے۔ سوشلزم اگرچہ ہمدردی اور انسانیت کے تصور سے شروع ہوا تھا۔ مگر جلد ہی کریمنلٹی کا ''جادوئی'' جواز بن گیا۔

امریکی معاشرہ نے ہمیشہ انسان کی انفرادی صلاحیتوں کو نکھارا ہے۔ اس لیے یہ حیرانی کی بات نہیں کہ امریکا میں جرائم کی یہ انفرادی خصوصیت یورپ کے جرائم سے بہت پہلے ظاہر ہوئی۔ 1776ء میں اٹھارہ سالہ حسین لڑکی بتھشیبا رگلز کی شادی ایک دولت مند زمیندار جوشوا سپونر سے ہوئی جو عمر میں اس سے کئی سال بڑا تھا۔ شادی اس کے باپ جنرل ٹموتھی رگلز نے طے کی تھی۔ بتھشیبا نے سسرال جا کر معاشقے شروع کر دیے۔ 1776ء میں بتھشیبا اپنے باپ کی طرح کنگ جارج کی زبردست حامی تھی جبکہ اس کا شوہر علیحدگی پسندوں کا حامی تھا۔ ایک روز کوئی سولہ سالہ سپاہی سامنے کے دروازہ سے گزرا۔ بتھشیبا نے اسے کھانے کی دعوت دے کر اندر بلا لیا۔ سولہ سالہ ایذرا راس جلد اس کے عاشقوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ فروری 1877ء میں بتھشیبا نے دو انگریز سپاہیوں کو کھانے پر بلایا جو امریکی جیل سے بھاگے تھے۔ اس نے راس اور دونوں انگریزوں کو اپنے شوہر کے قتل کی ترغیب دی۔ یکم مارچ 1878ء کو انہوں نے اسے گلا دبا کر مار دیا اور لاش کنوئیں میں پھینک دی۔ اگلی صبح بتھشیبا نے شوہر کے لاپتہ ہونے پر سخت پریشانی ظاہر کی۔ تلاش کرنے والوں کی ایک پارٹی نے سپونر کی لاش ڈھونڈ لی جس کے کپڑے بھی اتار لیے گئے تھے۔ تینوں قاتل وورسٹر کے قریب ایک سرائے میں ٹھہر گئے جہاں انہوں نے کچھ رقم خرچ کی جو بتھشیبا نے انہیں دی تھی۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ انہوں نے فوراً اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ اوروں کے ساتھ بتھشیبا کو بھی سزائے موت ہوئی۔ اس نے یہ کہہ کر کہ وہ حاملہ ہے سزا ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر کسی نے اس پر

اعتبار نہ کیا۔ سزا کے بعد جب پوسٹ مارٹم کیا گیا تو پتہ چلا کہ وہ پانچ مہینوں سے حاملہ تھی۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ بتھشیبا کا انتظار کیتھرین بیس کو نصف صدی سے تھا۔ مگر ہیڈن برگ کے جان ہوو نے اس کمال کا مظاہرہ کیا کہ جس کی کوئی مثال نیو گیٹ کیلنڈر میں نہیں۔ جب اس نے الزبتھ شٹز سے شادی کی تو اسے توقع تھی کہ اپنے باپ کی وراثت سے اسے حصہ ملے گا۔ مگر جب پیٹر شٹز 1795ء میں فوت ہوا تو اس نے اپنی جائداد کا بڑا حصہ اپنے دو بیٹوں پیٹر اور فرانسس کے لیے چھوڑا۔ الزبتھ کے حصہ میں صرف ایک ہزار ڈالر آئے۔ ہوور نے وصیت نامہ کو عدالت میں چیلنج کیا مگر ناکام ہوا۔ پھر وہ دونوں بھائیوں کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ اس نے ان کے باپ کو خواب میں دیکھا ہے، جس نے تاکید کی ہے کہ وراثت کی مساویانہ تقسیم کی جائے۔ مگر دونوں بھائیوں نے اس کا یقین نہ کیا۔ ہوور نے انہیں ڈرایا کہ ان کے باپ کی بات نہ مانی گئی تو وہ انہیں ڈرائے گا اور زندگی بھر ان کا پیچھا کرے گا۔ کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ سن کر دونوں بھائی جاگے تو صحن میں جا کر دیکھا کہ ہوور منہ سے ڈراؤنی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ان کے باپ کی روح نے اسے یہاں بلایا ہے۔ اس دفعہ انہوں نے اسے اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا۔

دو برس بعد وہ ایک سرائے میں گیا اور چار آئرش مزدوروں سے باتیں کرنے لگا اور انہیں دونوں بھائیوں کے قتل پر آمادہ کیا۔ اس وعدہ پر کہ ان کی دولت آپس میں بانٹ لیں گے کرسمس کے تین روز بعد مزدور شلٹز ہاؤس میں داخل ہوئے۔ فرانسس کو کان میں گولی مار کر ہلاک کیا۔ پھر کلہاڑے سے اس پر وار کیے۔ پھر انہوں نے پیٹر کے کمرہ میں جا کر اس پر حملہ کیا۔ مگر پیٹر کھڑکی سے کود کر بھاگ جانے میں کامیاب ہوا۔ جس آسانی سے ڈاکو گھر میں داخل ہوئے اور ٹھیک بیڈرو موں تک پہنچے اس سے شک پیدا ہوا۔ جس پستول سے فرانسس قتل کیا گیا تھا وہ بھی برآمد ہو گیا۔ پستول کا مالک ایک آئرش مزدور تھا۔ انہوں نے ہوور کو بھی ملزم ٹھہرایا اور پانچوں کے خلاف مقدمہ دائر ہوا۔ صرف ہوور اور پستول کے مالک مانوس پر فرد جرم لگائی گئی۔ ہوور نے پولیس کو اپنے پاگل ہونے کا یقین دلانے کی پوری کوشش کی۔ کبھی کپڑے پھاڑ کر برہنہ ہوا اور کبھی اپنے قریب آنے والے ہر شخص کو کاٹنے لگا۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ جولائی 1798ء میں اسے پھانسی دے دی گئی۔

اٹھارویں صدی کے خاتمہ پر یورپ کی نسبت امریکا قانون کا زیادہ احترام کرنے والا ملک تھا۔ اخلاقیات کی گرفت مضبوط تھی۔ دیہی علاقوں میں بڑے جرائم تقریباً ناپید تھے۔

چور ڈاکو تھے مگر ان کی زندگی مختصر تھی۔ اوہایو کے جنگل میں بگ ہوپ اور لٹل ہوپ نامی دو ڈاکوؤں نے درجنوں شکاری قتل کیے مگر آخر مارے گئے۔ بگ ہوپ کو قتل کر کے اس کا سر کاٹ لیا گیا۔ لٹل ہوپ بھاگ گیا۔ اگلے سال میسن نامی ایک قاتل کا سر ایک شکاری بل سٹین نے تن سے جدا کر دیا مگر سٹین کی بدقسمتی کہ اسے میسن سمجھ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا حالانکہ میسن کا سر شناخت کے لیے ایک جار میں رکھا گیا تھا۔

حیرانی ہے کہ اس عرصہ میں زیادہ جرائم غلاموں نے کیے۔ پومپ، ایک غلام نے 1795ء میں اپنے آقا چارلس فربش کو اس لیے قتل کیا کہ فربش نے اسے کوڑے مارے تھے اور رات بھر باندھے رکھا تھا۔ 1794ء میں ایڈمنڈ فورس نے پامیلا ٹلٹن آف ویسل بودھ کو ریپ اور قتل کیا۔ 1803ء میں کاٹو ایک غلام نے چیسٹرٹن (نیو یارک) میں مے ایٹکن کو ریپ اور قتل کیا۔ 1800ء میں ایک غلام جبریل نے رچمنڈ ورجینیا کے قریب ایک ہزار کالوں کی فوج تیار کی کہ گوروں کو قتل کیا جائے اور کئی گورے قتل بھی کیے۔ اس سے پیشتر کہ ملیشیا نے آ کر اس کی فوج کو شکست دی، نیو جرسی میں سائرس ایمیلی نے اپنے آقا ہمفری وال کو قتل کیا۔ 1831ء میں ایک غلام نٹ ٹرنر نے ورجینیا میں ایک نیگرو بغاوت کی قیادت کی اور گرفتار ہونے سے پہلے پچاس سفید فام قتل کیے۔ مقدمہ کے دوران نٹ ٹرنر نے جیوری سے کہا کہ ''میں نے خموشی اور اطمینان کے ساتھ مقتولوں کی بگڑی ہوئی لاشیں دیکھیں جن میں بچے بھی شامل تھے پھر فوراً اوروں کی تلاش میں چلا گیا۔''

نفرت پر مبنی قتل کا یہ ابتدائی دور تھا ایک طبقہ کی حیثیت سے نیگرو گوروں کی نسبت اپنی نفرت کے لیے بہتر جواز رکھتے تھے۔ اس لیے یہ حیرانی کی بات نہیں کہ ان میں سے بعض افراد معاشرہ کے خلاف لیسینئر جیسا رویہ اپنائیں۔ 'ریپ قتل' کے معاملہ میں بھی غالباً یہ بات صحیح ہے۔ سفید فام عورت روایتی 'ممنوعہ' کی نمائندہ تھی چنانچہ نیگرو پر حرام تھی۔ اس لیے 'ریپ قتل' جتنا جنسی جرم تھا اتنا ہی سماجی جرم بھی تھا۔

امریکا کا پہلا اجتماعی قاتل، سموئیل گرین بھی نفرت کی بنا پر قتل کرتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ کارل پنیزرم کے بہت قریب تھا۔ 1800ء میں میریڈتھ (نیو ہیمپشائر) کے اندر پیدا ہوا۔ گرین پیدائشی چور تھا۔ اس نے ابتدائی عمر میں چوری شروع کی تھی۔ ایک لوہار کا شاگرد تھا، چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس لیے اسے کوڑے مارے گئے اور گھر واپس بھیج دیا گیا۔ اسے پھر کوڑے لگے تو اس نے اپنے کتے کو کنوئیں میں پھینک دیا جس سے کنوئیں کا پانی آلودہ ہو

گیا۔ اسے پھر سزا دی گئی تو اس نے کسی پالتو جانور کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا۔ پھر وہ ڈن نامی ایک شخص کے ساتھ رہنے کے لیے نیو ہیمپٹن چلا گیا۔ پرانے سائیکل چرانا اور کوڑے کھانا پھر اس کا معمول بن گیا۔ دو دفعہ اس نے ڈن کے قتل کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ اس دفعہ اسے اتنا مارا گیا کہ لہولہان ہو گیا اور گوشت اس کے زخموں سے پھوٹ کر باہر آ گیا۔ آخر اس نے اپنے جیسے ایک آوارہ گرد ایش کے ساتھ دوستی کی اور ایک جعل ساز کے ساتھ کام کرنا شروع کیا جو ان کے ذریعہ جعلی کرنسی بازار بھیجتا تھا۔ ان دنوں کا ایک واقعہ گرین کی انتقامی ذہنیت ظاہر کرتا ہے۔ اس نے ایک تیز رفتار برف گاڑی کے نیچے لکڑی کا ایک بہت بڑا ٹکڑا پھینک کر اسے الٹا دیا۔ جس سے اس میں سوار کئی بچے زخمی ہو گئے۔ سکول ماسٹر نے ایش اور گرین دونوں کو مار مار کر بے حال کر دیا کچھ دیر بعد دونوں باہر جا کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ وہ آیا تو اسے مار مار کر بے ہوش کر دیا اور برہنہ حالت میں باندھ کر سردی سے ٹھٹھر کر مرنے کے لیے وہیں چھوڑ دیا۔ خوش قسمتی سے وہ مرنے سے پہلے لوگوں کو مل گیا۔

گرین کا پہلا قتل جیولری کے ایک سیلز مین کا قتل تھا جسے وہ اور ایش ایک سرائے میں ملے تھے جو نیو ہیمپشائر میں واقع تھی۔ انہوں نے موقع پا کر اسے لوٹا اور سوچنے لگے کہ کیا اسے مارنا ان کے لیے بہتر ہو گا۔ ''ایک مرا ہوا مرغا کبھی بانگ نہیں دیتا،'' ایش نے کہا اور گرین نے اس کا کام تمام کر دیا۔

گرین پھر مغرب کا روایتی 'برا آدمی' بن گیا۔ چوری میں مہارت اور مداخلت پر قتل اس کا معمول ہو گیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ گرین نے کتنے قتل کیے مگر وہ جلد ہی امریکا کا انتہائی مطلوب مجرم قرار دیا گیا۔ 1820ء میں اس کا کیریئر اپنے انجام کو پہنچا جب وہ نشہ میں ایک سٹور سے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اسے چار سال قید کی سزا ہوئی۔ سزا کاٹنے کے لیے اسے بوسٹن بھیجا گیا۔ کئی بار اس نے جیل سے بھاگنے کی کوشش کی اور ہر بار ناکام ہوا جس سے اس کی سزا میں بار بار اضافہ ہوا۔ آخر اسے پتہ چلا کہ ایک نیگرو قیدی ولیمز نے اس کے فرار کی آخری کوشش کے بارے میں گارڈز کو خبردار کر دیا تھا۔ ایک صبح وہ ولیمز کو گھیرنے میں کامیاب ہوا اور اسے مار کر بے ہوش کیا اور پھر اس کی باہیں، پسلیاں اور ٹانگیں بڑے اہتمام اور سکون کے ساتھ توڑیں۔ ولیمز زخموں سے چور ہو کر مر گیا اور گرین اپریل 1822ء میں پھانسی لگ گیا۔ پینزرم کے برعکس اس نے اپنے جرائم کی کہانی نہیں لکھی۔ اس لیے ہم 1818ء سے 1820ء تک اس کی دو سالہ مجرمانہ سرگرمیوں کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ وہ زور دار شخصیت کا مالک تھا اور پینزرم کی طرح اسے بھی جھکانا مشکل تھا۔ وہ لیسینئر کی قسم کا قاتل تھا جس کے لیے قتل اس کے اظہارِ ذات کا بگڑا ہوا ذریعہ تھا۔ اس لیے کہ وہ لیسینئر سے چودہ برس پہلے پھانسی لگا تھا ہم اسے جرائم کی نئی تاریخ کا 'پہلا قاتل' کہہ سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے باقی حصہ میں مجرم کا یہ ٹائپ عام ہوتا گیا۔ اس صدی کے آخر میں نطشے نے سٹرن برگ کے نام خط میں ایک قاتل پراڈو کا ذکر کیا ہے۔ ''جرائم پیشہ خاندانوں کی تاریخ ہمیں واپس ان افراد کی طرف لے جاتی ہے جو اپنے مخصوص سماجی ماحول سے زیادہ طاقتور تھے۔ پراڈو اس کی کلاسیکی مثال ہے۔ پراڈو اپنی سمجھ، جرأت اور ضبطِ نفس کے لحاظ سے ججوں بلکہ وکیلوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس کے باوجود کہ مقدمہ کی پریشانی سے وہ جسمانی طور پر اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ بعض گواہوں نے اس کی پرانی تصویر کی مدد سے اسے پہچانا۔ پراڈو دراصل ایک اور لیسینئر تھا، ایک ڈاکو جو پہچانے جانے کی صورت میں قتل سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ 1887ء میں وہ ایک ہوٹل میں ڈاکہ ڈالتے ہوئے بھاگا تو پکڑا گیا۔ مگر اس سے پہلے اس نے پولیس پر گولی چلا کر ان کا آدمی زخمی کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جرائم میں ملوث ہونے کے باعث اس کی دو داشتائیں بھی پکڑی گئیں، انہیں جیل کے اندر ایک ہی کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ ایک نے دوسری سے کہا کہ ایک طوائف میری آگیٹن کو پراڈو نے پچھلے سال قتل کیا۔ اس کا گلا کاٹا اور زیور لے کر بھاگ گیا۔ ڈیوٹی مجسٹریٹ کو بھی اس واقعہ کا پتہ چل گیا۔ پولیس نے وہ جیولر بھی تلاش کر لیا جس نے پراڈو کو پہچان لیا کہ اسی شخص نے میری کا زیور اس کے پاس بیچا تھا۔ عدالت میں پراڈو نے آپ اپنی وکالت کی اور جیسا کہ ایچ بی ارونگ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، ''خوب پڑھا لکھا، مناسب الفاظ سے مالا مال، نہ ختم ہونے والا احتجاج، ججوں کو مسترد کرتا ہوا، مگر سب بے کار، اسے پھانسی دے دی گئی۔ موت کی کوٹھڑی سے اس نے ایک دوست کو لکھا، 'سمجھ دار آدمی کے لیے قانون نام کی کوئی چیز نہیں۔ کوئی قانون غلطی اور استثنیٰ سے پاک نہیں اس لیے ہر سمجھ دار آدمی کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ قانون کا احترام کرے یا اسے توڑے۔'''

مگر لیسینئر کی طرح پراڈو بھی پیدائشی ایکٹر تھا۔ نطشے کا خیال درست ہے کہ پراڈو ایک فرد کی حیثیت سے اپنے مخصوص سماجی ماحول سے زیادہ طاقتور تھا۔ مگر جب وہ یہ کہتا ہے کہ پراڈو ضبطِ نفس میں اپنے ججوں سے بڑھ کر تھا تو یہ حقیقت نہیں رومان ہے۔ مقدمہ کی کارروائی

سے پتہ چلتا ہے کہ اسے باتیں کرنے کا بہت شوق تھا، جب اسے ٹیلی ویژن پر آنے کا موقع ملا تو اس نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ 'عقلمند آدمی' کے متعلق اس کی باتیں ایک مجرم مارکس ارلیئس کی باتوں جیسی ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ محض ایک طوائف کا گلا کاٹنے کی وجہ سے وہ عدالت کے کٹہرے میں تھا۔

قاتل کے متعلق جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ اس کا 'غلط اندازہ' ہے۔ لیسینئر خود اپنے اندر احساس کی کمی کا ذکر اس وقت کرتا ہے جب وہ قتل کرتا ہے۔ جیسے وہ دور کھڑا ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ بنیادی طور سے یہ فکر و عمل کا تضاد ہے، حقیقت سے فرار ہے۔ یہی بات ہم اس دور کے ایک اور اہم مقدمہ میں دیکھتے ہیں۔ جین بپٹسٹ ٹراپ مین 1869ء میں الساک کے اندر پیدا ہوا۔ وہ ایک غریب مکینک کا بیٹا تھا۔ سیموئیل گرین اور لیسینئر کی طرح اس کا باپ بھی اس سے بدسلوکی جبکہ ماں پیار کرتی تھی۔ ہم جنس پرست تھا۔ سکول میں اسے ڈرایا دھمکایا جاتا مگر جب اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جاتا تو وہ اس طرح مارنے مرنے پر تیار ہو جاتا کہ بالآخر انہوں نے اس کا خیال چھوڑ دیا۔ باپ کی ورکشاپ میں کام کرتے ہوئے اس کا بھائی اسے ڈراتا دھمکاتا۔ ایک دن اس نے ہتھوڑا لیا اور ایڈورڈ کے منہ پر دے مارا۔ اس کے بعد ایڈورڈ نے اس کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔

ٹراپ مین کھلاڑیوں کی طرح باقاعدہ ورزش کرتا یہاں تک کہ اس کا جسم مضبوط اور طاقتور ہو گیا۔ یوجین سو کی فرضی اور خوفناک کہانیاں وہ بار بار پڑھتا۔ غالباً زہر سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے چھپ کر کیمسٹری کا مطالعہ کیا کرتا۔ غرضیکہ دنیا میں نام پیدا کرنے کے لیے کئی منصوبے تیار کرتا تھا۔

دنیا میں نام پیدا کرنے والے مقتولوں میں اس کا ایک منصوبہ بیک وقت تمام خاندانوں کو ہلاک کرنا تھا۔ جب ایک دولت مند بزنس مین کنک اسے ملا تو اس نے کنک کو کئی منافع بخش سکیموں میں سرمایہ کاری کے لیے کہا۔ لیکن کنک نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے انکار کر دیا۔ آخر ٹراپ مین کسی کاروباری کام کے بہانے اسے ساتھ لے گیا۔ گاؤں جا کر اس نے کنک کو شراب کا گلاس دیا جس میں سائنائیڈ تھا۔ اس کے پینے سے کنک فوراً مر گیا۔ ٹراپ مین نے اسے جنگل میں دفن کیا اور اس کے بڑے بیٹے گستاؤ کو گاؤں اپنے ساتھ لے گیا۔ اسے بھی ہلاک کر کے دفن کیا، پھر میڈم کنک کو اس کے پانچ بچوں سمیت شوہر ملانے کے بہانے پیرس کے قریب پنٹین لے گیا۔ ٹیکسی سے اترنے کو کہا، ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور کسی

ویران جگہ لے جا کر سب کو مار دیا۔

دوسری صبح ایک مزدور نے سڑک پر خون دیکھا۔ خون کے نشانوں کے ذریعہ اس جگہ پہنچا جہاں زمین نئی کھدی ہوئی تھی۔ لوگوں نے لاشیں گڑھے سے نکالیں تو اندازہ ہوا کہ انہیں کیسی سفا کی سے قتل کیا گیا تھا۔ ایک بچے کے کوٹ پر لگے ہوئے لیبل سے کنک فیملی کی شناخت ہوئی۔ ٹراپ مین لی ہیور سے گرفتار ہوا جہاں سے وہ امریکا بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے لوگوں کے سامنے پھانسی دی گئی اور مشہور ناول نگار ترگنیئیف کو اس کی کوٹھڑی سے تختہ دار تک اس کے ساتھ جانے کی اجازت ملی۔ ترگنیئیف اس اکیس سالہ خوش شکل نوجوان سے متاثر تھا اور ظاہر ہے کہ اس کی سزا کو بربریت سمجھتا تھا۔ اس کے ایک ہمراہی نے کہا کہ اسے ایسا لگا کہ ہم کسی عام مجرم کی سزا نہیں دیکھ رہے بلکہ یہ سال 1794ء ہے اور ہم ایک ارسٹوکریٹ (امیر شخص) کی موت کا نظارہ کر رہے ہیں۔ تاہم ترگنیئیف نے اس جرم کی نوعیت کا ذکر کبھی نہیں کیا جس کے تحت ٹراپ مین کو سزا ہوئی۔

ٹراپ مین ایک اور قاتل تھا، ایک اور شخص جو اپنے مخصوص سماجی ماحول سے زیادہ طاقتور تھا۔ پھر بھی جرم کے متعلق نا قابل فہم بات مجرم کے 'غلط اندازے' ہیں۔ ریڈ کلف ہائی وے قتل کی طرح اس قتل کا منصوبہ بھی واہیات اور مبالغہ آمیز تھا۔ اس نے اتنا احمقانہ منصوبہ کیوں بنایا؟ اس کا جواب ہمیں یوجین سو کی تصنیف The Wandring Jew سے ملتا ہے جسے وہ بار بار پڑھتا تھا۔ یوجین کا ناول پادری روڈین کے متعلق ہے جو اپنے حلقہ کے لیے وسیع ترکہ اور جائداد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جو سائمن خاندان کے آخری سات ارکان 'وانڈرنگ جیوٗ' کے ورثا کے لیے بھی کافی ہو۔ 'وانڈرنگ جیوٗ' عیسیٰ کا مذاق اڑاتا تھا جس کی سزا تھی کہ مسیح کے دوبارہ ظہور تک دنیا میں بھٹکتا رہے۔ غرضیکہ وہ انہیں وراثت میں حق مانگنے سے روکنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ ایک کو نشہ کی دوا دی جاتی ہے۔ ایک پاگل مشہور کیا جاتا ہے۔ ایک قرضہ کے سلسلہ میں قید ہوتا ہے۔ ظالم پادری کسی سے زہریلا مقدس پانی لے کر پیتا ہے اور ہلاک ہو جاتا ہے۔ 'وانڈرنگ جیوٗ' ٹراپ مین کے لیے انجیل تھی۔ اسی لیے وہ سائنائیڈ اور اس کے اثرات کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ مگر اس نے فادر روڈین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سارے خاندان کو ہلاک کر دیا۔ ٹراپ مین اپنی، بلکہ یوجین سو کی خواہشات کا غلام تھا۔

دراصل میسلو کے 'نظریہ ضرورت' کے تحت جرم کی نوعیت بدل رہی تھی۔ میسلو کے مطابق انسان کی بنیادی ضرورت خوراک اور پانی ہے۔ زیادہ جرائم روٹی اور پانی کے لیے کیے

جاتے ہیں۔ دوسری ضرورت چھت ہے جس کے نیچے سر چھپایا جا سکے۔ امریکا نے اپنی قائدانہ صلاحیت اور زراعت پیشہ لوگوں کی مدد سے ان دونوں میں یورپ پر سبقت حاصل کر لی تھی، جہاں بالخصوص بڑے شہروں میں مجرموں کی اکثریت نیم فاقہ کش تھی اور آسمان کی چھت تلے رہتی تھی۔ 1826ء میں برک اور ہیئر کے جرائم بھی روٹی نمک کے لیے تھے۔ جبکہ بتھشبیا سپونر، جان ہوورا اور سیموئیل گرین کے جرائم چھت کے لیے تھے۔ اگرچہ ان جرائم میں ان کے اس تکبر کا دخل بھی تھا کہ مجرم برے بھلے، صحیح یا غلط کا فیصلہ خود کر سکتا ہے۔

دراصل اس طرح کے جرائم انیسویں صدی کے خصوصی جرائم بن گئے تھے۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے بلکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے کہ جب ان کا ذکر ہو تو ہمیں انہیں انیسویں صدی کے جرائم کی خصوصیت سے پہچان اور یاد کر لیتے ہیں۔ ہمیں ایک میڈیکل کالج کے ڈاکٹر جان ویبسٹر کا خیال آتا ہے جس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر پارک مین کے سر میں ڈنڈا مار کر اسے ہلاک کیا۔ پھر لاش کے ٹکڑے لیبارٹری کی بھٹی میں جلا دیئے۔ کانسٹین کینٹ، سولہ سالہ سکول گرل جس نے اپنے چار سالہ سوتیلے بھائی کی گردن کاٹ کر لاش دفن کر دی۔ ڈاکٹر پچرڈ کا خیال آتا ہے جس نے گلاسگو میں اپنی بیوی اور ساس کو زہر دیا اور فلورلیش کی براوو جس پر اپنے شوہر کو زہر دینے کا الزام لگا، میر لافریج جس پر آرسینک دے کر اپنے شوہر کو مار دینے کا الزام لگا۔ لزی بورڈن جس نے اپنے باپ اور سوتیلی ماں کو کلہاڑی سے ہلاک کیا۔ رگلے کا ڈاکٹر ولیم پامر جس نے اپنی بیوی بچوں اور کئی بدنصیب کاروباری ساتھیوں کو زہر دیا۔ میڈیلین سمتھ، جس نے اپنے عاشق کو زہر دیا اس لیے کہ وہ نہیں مانتا تھا کہ وہ اس سے تھک چکی ہے۔ ان تمام جرائم پر وکٹوریائی عہد کی مہر لگی ہے۔ بنیادی طور پر یہ 'گھریلو قتل' ہیں ان کے کئی مقاصد ہیں لیکن سب سے بڑھ کر قاتل کا گھریلو امن اور تحفظ ہے۔ صرف ایک کنسٹانس کینٹ ہے جو اس فہرست میں شامل نہیں۔ مضبوط دل و دماغ کی ایک قاتلہ جس نے نفرت کی وجہ سے قتل کیا اور اس کا اعتراف کر کے اپنے ضمیر کو اس کے بوجھ سے آزاد کیا اور تمام زندگی جیل میں گزاری۔ انسپکٹر جوناتھن وچر آف سکاٹ لینڈ یارڈ کی شاندار کارکردگی کی وجہ سے اس کا مقدمہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ اس سے کولنز اور ڈکنز اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے آئیڈیل پولیس مین کی حیثیت سے اسے اپنے ناولوں میں جگہ دی۔

جرائم کی پرانی پُرتشدد دنیا پیچھے رہ گئی تھی۔ صنعتی انقلاب نے دولت دی اور دولت نے تحفظ کا نیا شعور دیا کہ گھریلو استحکام زندگی کی بنیاد ہے۔ اٹھارویں صدی کا ناول ٹام جونز،

رابنسن کروسو، پیری گرائن پکل، گل بلاس جیسے سیلانیوں اور آوارہ گردوں کے متعلق تھا۔ انیسویں صدی کے ناول اور اس کے کردار ایک مضبوط اور متوازن گھریلو ماحول میں زندہ ہیں۔ وکٹورین عہد کے لوگ فارغ البال قابل عزت لوگوں کے متعلق پڑھنا چاہتے تھے۔ جیسے سکوئر براؤن، بشپ پراؤڈک، مسٹر پک وک اور جان ہیلی فکس وغیرہ۔ ان کا آئیڈیل بستر میں لپٹا ہوا، سونے کے لباس میں محفوظ بجمن کا چھوٹا بچہ ہے۔ ڈکنز کرسمس کی عکاسی کرتے ہوئے اس احساس کو سب سے بہتر بیان کرتا ہے۔ چاہے وہ ڈنگلے ڈیل کا کھیت ہو یا کریچٹ کا خستہ حال گھر ہو۔ اس لیے وکٹوریائی قتل نان نمک کا معاملہ نہیں اس کی وجہ 'گھریلو تحفظ' ہے۔

سوشلزم کے فروغ کی بھی یہی وجہ ہے۔ اٹھارویں صدی کے غریبوں نے مان لیا تھا کہ وہ پیدائشی 'جنٹلمین' نہیں اور اپنی قسمت پر صبر کر لیا تھا۔ مگر انیسویں صدی کے غریب جاننا چاہتے تھے کہ ہمارے سروں پر چھت کیوں نہیں۔ ہمارے گھر ہر روز روٹی کیوں نہیں پکتی۔ ہماری کوئی باقاعدہ آمدنی کیوں نہیں حالانکہ سب کو یہ آسانیاں حاصل ہیں۔ اس سے 'علیحدگی' کا بے چینی کا احساس پیدا ہوا اور لوگ آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔

وکٹورین، (ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ کے لوگ) ڈکنز جیسے صاحب نظر وکٹورین بھی 'اجنبیوں'، لیسیٹر جیسے 'اجنبیوں' کی روز بروز بڑھتی تعداد کا نوٹس نہ لے سکے جنہوں نے اپنے آپ کو معاشرے کا حصہ سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا اظہار ادب میں پہلی بار 1888ء میں ہوا۔ اس سال کا اکتوبر تھا جب ناروے کے ایک بیس سالہ نوجوان نٹ پیڈرسن نے **Hunger** کے عنوان سے ایک اسکیچ بنایا۔ جس میں اس نے فاقوں سے بدحال ایک شخص کو 'تنہا' ایک تاریک کمرہ (کرسچیانا اوسلو) میں رہتے ہوئے دکھایا۔ جو اپنے آپ کو 'جلاوطن' زندگی سے دور دھتکارا ہوا انسان کہتا ہے، جیسے کوئی شہری شہر سے کٹ کر تنہا جنگل میں رہتا ہو۔ دو برس بعد پیڈرسن نے کہانی کو پھیلا کر ناول بنایا اور اپنا نام بدل کر 'نٹ ہمسن' رکھا۔ اس کا ناول ایک بے حس، نامہربان سوسائٹی کے خلاف ایک فرد جرم ہے۔

اس سال 1888ء میں ہی انگلینڈ کو اچانک اس اجنبی، اس یکہ و تنہا شخص کے وجود کا احساس ہوا۔ 31 اگست کی صبح ایک مزدور نے کام کرتے ہوئے مشرقی لندن کے ڈسٹرکٹ وائٹ چیپل میں زمین پر پڑا ایک بنڈل دیکھا۔ بنڈل میں ایک نیم برہنہ عورت تھی جسے ریپ کیا گیا تھا۔ یہ لاش اس جرم میں اضافہ کی علامت تھی۔ مزدور نے اس کا چہرہ چھو کر دیکھا۔ وہ مر چکی تھی۔ بدنصیب عورت میری این نکلس ایک طوائف تھی، جو شام سے چند سکوں کے لیے

بھٹک رہی تھی کہ ڈوس ہاؤس میں رات بسر کرنے کے لیے کرایہ ادا کر سکے۔

اسی علاقہ میں ایک ہفتہ کے بعد ایک اور لاش 29 ہینبسری سٹریٹ سے ملی۔ لاش اس طرح بگاڑی گئی تھی کہ شبہ ہوتا تھا کہ قاتل انسانی اعضا کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔

لندن خبردار ہو گیا کہ کوئی پاگل جنونی قاتل درپے آزار ہے۔ پہلے قتل سے صدمہ ہوا تھا، دوسرے قتل سے سنسنی پھیل گئی۔ اب یاد آیا کہ ایک اور عورت شروع اگست میں جارج یارڈ بلڈنگز وائٹ چیپل میں قتل ہوئی تھی۔ جس کے جسم پر انتیس زخم تھے۔ ان دو وارداتوں سے ہر طرف اتنا ہی خوف پھیلا جتنا کہ 1811ء میں ریڈ کلف ہائی وے قتل کے موقع پر پھیلا تھا۔ پولیس نے درجنوں گرفتاریاں کیں۔ ہمسایوں کو جو شخص انوکھا اور عجیب نظر آیا وہ مشتبہ قرار پایا۔ کئی بدحواس افراد نے قتل کا اعتراف کرتے ہوئے پولیس کا رخ کیا۔ ستمبر کے آخر میں قاتل نے اپنا نام 'جیک دی رپر' رکھ لیا۔ سنٹرل نیوز ایجنسی کو ایک دھمکی آمیز خط ملا "میں جب تک گرفتار نہیں ہوتا ان آوارہ فاحشاؤں کے پرخچے اڑا دوں گا۔" دستخط، جیک دی رپر۔ شرابیوں اور حواس باختہ افراد کی طرف سے 'جیک دی رپر' کے نام سے خط آتے رہے جن میں وہ قتل کا اعتراف کرتے رہے۔

'رپر' کے خط سے دو روز بعد قاتل نے ایک رات میں دو وارداتیں کیں۔ برنر سٹریٹ کی انٹرنیشنل ورکرز ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ میں اس نے ایک طوائف الزبتھ سٹرائیڈ کا گلا کاٹ دیا۔ مگر ایک گھوڑا گاڑی کی آمد سے گھبرا کر بھاگ گیا۔ شہر جاتے ہوئے راستہ میں وہ کیتھرین ایڈوز، ایک طوائف، کو مٹر سکوائر کے ایک کونے میں لے گیا۔ طوائف ابھی ابھی بشپ گیٹ پولیس سٹیشن سے رہا ہوئی تھی جہاں اسے نشہ اور بدامنی کے الزام میں لے جایا گیا تھا۔ ایک پولیس کانسٹیبل جو ہر پندرہ منٹ بعد سکوائر کا چکر لگاتا تھا، اس نے وہاں ایک لاش پڑی دیکھی جس کے گردے نکال لیے گئے تھے۔ دوسری صبح اس سے پیشتر کہ اخبارات کو خبر ملے سنٹرل نیوز ایجنسی کو 'جیک دی رپر' کا ایک اور خط ملا جس میں معذرت کی گئی تھی کہ اس کے کام میں مداخلت ہوئی تھی جس کی وجہ سے وعدہ کے مطابق مقتولہ کے کان کاٹ کر ایجنسی کو نہ بھیج سکا۔ (کان کاٹنے کی کوشش ہوئی تھی)

چھ ہفتوں بعد 8 نومبر 1888ء کو رپر نے اپنا آخری قتل کیا۔ اس دفعہ اس نے ایک پچیس سالہ آئرش طوائف میری جینٹ کیلی (ملرز کورٹ ڈوسیٹ سٹریٹ) کو اپنا نشانہ بنایا۔ صبح دو بجے وہ اپنے کمرہ میں قتل ہوئی۔ ہمسایوں نے 'قتل' کی چیخ سنی مگر توجہ نہ دی۔ رپر

نے باقی رات لاش بگاڑنے میں گزاری۔ صبح اس کی لاش ملی تو اس کا سر جسم سے تقریباً الگ تھا۔ دل اس کے پاس تکیہ پر رکھا تھا۔ ایک بازو جسم سے تقریباً الگ کیا گیا تھا۔ قاتل نے اس کے چہرے اور ٹانگوں سے گوشت اتارنے میں ضرور کچھ وقت صرف کیا ہوگا۔

قتل کی وارداتیں ختم ہوگئیں مگر قاتل کی شناخت کبھی نہ ہوئی۔ پولیس کمشنر نے بیان دیا کہ قاتل جان ڈرٹ نامی ایک نوجوان، ناکام بیرسٹر ہے۔ جس نے اپنے آخری قتل کے بعد ڈوب کر خودکشی کی ہے۔

عجیب بات ہے کہ وکٹوریہ عہد کے ان لوگوں کو صرف معمولی سا شک تھا کہ یہ جنسی قتل ہیں۔ کسی اخبار نے انہیں جنسی قتل نہیں لکھا۔ حالانکہ قاتل کو اخلاقی لحاظ سے پاگل اور دیوالیہ کہتے تھے۔ برنارڈ شا نے مذاقاً کہا کہ ''قاتل شاید سماجی ریفارمر ہے جو مشرقی لندن کی حالت زار کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے۔'' اس کا تبصرہ اس کے اندازہ سے زیادہ صحیح تھا۔ وہ جنون کی حد تک قتل و خون کا خواہش مند تھا۔ اس قدر نفاست پسند تھا کہ لاشیں ہمیشہ قاعدے اور ترتیب سے رکھتا تھا۔ مگر سب سے معنی خیز بات اس کا اپنے آپ کو معاشرہ سے بالکل الگ سمجھنا تھا۔ لیسینیئر کی طرح اسے غالباً بیگانگی، بے تعلقی کا احساس تھا جو صرف اس وقت ختم ہوتا تھا جب وہ قتل کرے یا قتل کرنے کے خواب دیکھے۔ اگرچہ وہ سماجی حالات سے بے تعلق تھا اس کے باوجود مارکس کے 'الگ سماج' کی پیداوار تھا۔

اس عشرہ کا ایک نہایت سنسنی خیز امریکی مقدمہ ہے جو کئی لحاظ سے جیک دی رپر کے مقدمہ سے بھی زیادہ قابل ذکر ہے۔ ہرمن ویسٹر مکٹ 1860ء میں نیو ہمپشائر کے اندر پیدا ہوا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں میڈیکل سٹوڈنٹ تھا۔ شادی کی، دھوکہ دہی کا آغاز یعنی انشورنس فراڈ ایک مریض کی نقلی موت سے کیا جبکہ وہ ابھی میڈیکل سکول میں تھا۔ وہ مورز فورکس، نیو یارک سٹیٹ میں 1886ء تک پریکٹس کرتا رہا۔ پھر شکاگو چلا گیا۔ جہاں جا کر ایچ ایچ ہومز بن گیا۔ اب اس نے قاتل کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کیا۔ ایک دوست ڈاکٹر لی کاک کو لائف انشورنس کی وجہ سے قتل کیا۔ دوسری بار شادی کی مگر اپنی بیوی کے انکل کے نقلی دستخط کر کے مصیبت میں مبتلا ہوا۔ مسز ہولڈن 63rd سٹریٹ اینگل وڈ کے ڈرگ سٹور میں اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا اور 1890ء میں حصہ دار بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد مسز ہولڈن لاپتہ ہوگئی اور ہومز ڈرگ سٹور کا مالک بن گیا۔ کاروبار میں اتنا کامیاب ہوا کہ اس نے سٹور کے سامنے نیا گھر بنایا، جو بعد میں 'قتل محل' کہلایا۔ اس کی ایک خصوصیت اس کے راستہ کی پھسلن

تھی جو تہہ خانہ تک چلی جاتی تھی، پائپ تھے جن کے ذریعہ کمروں میں گیس بھر سکتا تھا۔ اس کا ایک واقف کار ڈاکٹر رسل کرسی کی چوٹ سے ہلاک ہوا تو اس کی لاش ایک میڈیکل سکول کے پاس بیچی گئی جس نے اس ہلاکت کی وجہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

اس کے بعد ہومز نے روپیہ حاصل کرنے کے لیے اپنے ایک ساتھی کو قتل کیا جو مچھلی کے شکار پر اس کے ساتھ گیا تھا۔ ایک اور شخص چارلس کول کو بھی اسی لیے قتل کیا۔ اس کے سر پر اس زور سے کوئی ہتھیار مارا گیا کہ اس کی کھوپڑی ٹوٹ پھوٹ کر میڈیکل سکول کے لیے بے کار ہوگئی۔ پھر ایک گھریلو ملازمہ لیزا کا قتل کیا کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ اس کا چوکیدار لیزا کو لے کر بھاگنے والا ہے جبکہ اسے چوکیدار کی بہت ضرورت تھی۔ ہومز اس کی لاش بحری جہاز سے میڈیکل سکول بھیجنے والا تھا کہ اس کی سیکرٹری میری لہرا کیمپ ایک حاملہ عورت سارہ کک کو ساتھ لیے اندر آ گئی۔ ہومز نے دونوں کو ایک کمرہ میں دھکیل دیا۔ جہاں وہ گیس سے دم گھٹ کر مر گئیں۔

ایمیلی سگرانڈ اس کی نئی سیکرٹری اور داشتہ بھی بنی۔ جب اس نے بتایا کہ اس کی شادی ہونے کو ہے اس نے ایمیلی کو گیس کے کمرہ میں بند کر دیا اور حکم دیا کہ اپنے منگیتر کے نام منگنی ٹوٹنے کا خط لکھے۔ لڑکی نے خط لکھ دیا۔ پھر بھی ہومز نے اسے گیس میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود بیٹھا اس کی سسکتی ہوئی موت کے مزے لیتا رہا۔ بعد میں اس نے اعتراف کیا کہ وہ لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

چند مہینوں میں مزید دس افراد ہلاک کیے گئے۔ روپیہ کے لیے ہومز نے اب زہر بھی لوگوں کو دینا شروع کر دیا تھا۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں جن میں سے اکثر اس کی داشتائیں بھی تھیں۔ انہی میں سے ایک لڑکی منی ولیمز بھی تھی جس سے ہومز نے کئی ہزار ڈالر بٹور لیے تھے۔ ہومز نے اس کی بہن نینی کو گیس چیمبر میں ہلاک کیا اور اس کے بھائی کو بہکا کر اس کی انشورنس پالیسی کا وارث بھی بن گیا۔ بعد میں اسے اپنی جان بچانے کے بہانے گولی مار دی۔ منی بھی قتل کر دی گئی کیونکہ اس نے ایک انشورنس ایجنٹ کو بتا دیا تھا کہ 'محل' میں لگنے والی آگ دانستہ آتش زنی تھی۔

اس کے جلد بعد ہومز نے ایک شخص بنجمن پٹزل کو بھی جرائم میں شریک کر لیا۔ ہومز شروع سے ہی پٹزل کی جان کے درپے تھا۔ اس کے پہلے مشترکہ جرم نے ہومز کو پہلی بار جیل پہنچا دیا۔ اس نے سینٹ لوئیس میں ایک ڈرگ سٹور خریدا۔ ڈرگ سٹور کا مال گروی رکھا اور

پٹزل سے کہہ کر مال وہاں سے اٹھوا دیا۔ اس نے چند روز جیل میں گزارے، اس سے پیشتر کہ اس کی نئی بیوی جارجینز یوک ضمانت پر اسے رہا کرائے۔ جیل میں ہی اس کی ملاقات مشہور ''ریل رہزن'' میریون ہیڈ پیتھ سے ہوئی جسے اس نے انشورنس کے سلسلہ میں ایک فراڈ کا منصوبہ بتایا کہ کسی شخص کی زندگی کا بیمہ کر کے اسے اتفاقی حادثہ میں قتل کیا جائے۔ پھر اس کی لاش کی جگہ کوئی اور لاش رکھ دی جائے۔ ہیڈ پیتھ نے اسے انشورنس کے معاملات طے کرنے کے لیے ایک وکیل کا پتہ بتایا۔ ہومز نے کامیابی کی صورت میں وکیل کو پانچ سو ڈالر ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

اگست 1894ء میں پولیس فلاڈلفیا کے ایک گھر بلائی گئی جہاں ایک لاش ملی تھی۔ لاش اس کی تھی جو کلوروفارم دھماکہ سے ہلاک ہوا تھا۔ لاش دراصل پٹزل کی تھی اور ہومز بیمہ کی رقم کا وارث تھا۔ انشورنس کمپنی نے اسے دس ہزار ڈالر ادا کیے مگر اس نے ہیڈ پیتھ یا وکیل کو ایک پیسا بھی نہ دیا۔ ہیڈ پیتھ نے اس کا راز افشا کر دیا۔ انشورنس کمپنی کو فراڈ کا پتہ چل گیا اور ہومز اچانک مطلوب شخص ہو گیا۔

دراصل ہومز پٹزل خاندان کے باقی افراد سے نجات حاصل کر رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح اس نے مسز پٹزل کو آمادہ کر لیا کہ اپنے تین بچے باپ سے ملانے اس کے ساتھ بھیجے۔ خوش قسمتی سے بروقت اس کا پتہ چل گیا جبکہ مسز پٹزل اور اس کے تین بچے ابھی زندہ تھے۔ اسے فلاڈلفیا واپس لایا گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق پٹزل کی موت کلوروفام سے ہوئی تھی۔ ایک سراغ رساں گیئر تین لاپتہ بچوں کی لاشوں کا پتہ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ دو لڑکیاں ٹورنٹو کے ایک تہہ خانہ میں دفن تھیں اور نو سالہ لڑکا انڈیانا پولیس سٹیشن کے قریب ایک گھر میں تھا مگر اب اس کی جلی ہوئی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔

موت کی سزا ہونے کے بعد ہومز نے اعتراف کیا کہ اس نے ستائیس قتل کیے تھے۔ ہومز نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے جرائم اس لیے کیے تھے کہ ''اپنے ہم جنسوں کے قتل سے، ان کی چیخوں سے لطف اندوز ہو۔'' ٹارچر و قتل کے آلات اس کے 'قتل محل' سے برآمد ہوئے۔

ہومز پیدائشی اذیت پسند نہیں تھا۔ نیو یارک سٹیٹ میں اس نے آٹھ سال پریکٹس کی تھی۔ اس کے ساتھ بیوی بچہ بھی تھے۔ اس کا رویہ بالکل نارمل تھا۔ وہ محض ایک دھوکہ باز تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ قاتل بنا۔ آغاز میں وہ صرف اس لحاظ سے نارمل نہیں

تھا کہ عورتوں کا بہت شوقین تھا۔

ہومز کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی بڑھتی ہوئی بے حسی کے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی جسمانی خستہ حالی بھی شامل ہے۔ وہ لومبروسو کے ان متروکہ خیالات سے بھی واقف تھا کہ انسان کی ایک ایسی 'مجرمانہ قسم' موجود ہے جو عام نارمل انسان سے مختلف ہے۔ اسے اس تصور پر بھی یقین تھا کہ چہرے کے دو حصے، کردار کے دو مختلف پہلوؤں کے مظہر ہیں۔ بایاں نظری کردار جبکہ دایاں اکتسابی کردار کا حامل ہے۔ ہومز کو یقین تھا کہ اس کے جسم اور چہرے کا ایک حصہ زبوں حالی کا شکار ہے۔ ڈیوڈ فرینک اپنی 'ٹارچر ڈاکٹرین' (نیو یارک 1975ء) میں اس حالت کو قدیم سائنس آف کریمنالوجی کی علامت قرار دیتا ہے۔ مگر ہومز کے ایک فوٹو گراف سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے چہرے کی دو اطراف بالکل مختلف ہیں اور دائیں جانب خاص طور سے رُو بہ زوال ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''میرے چہرے کی ایک سائیڈ اور ایک آنکھ اتنی بُری طرح مسخ ہیں کہ ہال کین (ہمعصر ناول نگار) میرے چہرے کی اس سائیڈ کو جرم اور شیطنت کا عکس سمجھتا ہے۔''

جیک دی رپر کی طرح ہومز بھی سماجی تاریخ کا ایک عبرت ناک باب ہے۔ مگر رپر کی نسبت اس کی اذیت پسندی زیادہ سوچی سمجھی ہوئی اور باقاعدہ تھی۔ اگر ایسا ہے تو رپر نے کیوں وائٹ چیپل قاتل کی طرح اپنے پیچھے خوفناک خیالی کہانیاں نہیں چھوڑیں؟ ایک وجہ یہ ہے کہ رپر کبھی گرفتار نہیں ہوا۔ اس لیے لوگ اسے جن بھوت یا شیطان، جو چاہیں سمجھیں۔ ایک وجہ اور ہے کہ ہومز کے ہمعصر اس کے مقاصد کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ تھامس ایس ڈیوک کے مطابق وہ دھوکہ باز تھا اور مال کی خاطر قتل کرتا تھا۔ اس کے اس اعتراف کو اہمیت نہیں دی گئی کہ اس نے کبھی قتل نہیں کیا۔ دوسرے اعتراف کو بھی ناقابل اعتماد سمجھا گیا۔ اکثر لکھاریوں کو یقین تھا کہ ہومز نے جرائم کی تفصیل میں مبالغہ سے کام لیا تاکہ اخبارات بڑھ چڑھ کر اسے اہمیت دیں۔ مگر ہم ان مقدموں سے واقف ہیں جن میں سزا یافتہ مجرموں نے اپنے جرائم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مسرت محسوس کی۔ اصل بات یہ ہے کہ مجرم کسی مبالغہ و جواز کے بغیر سچ اور صرف سچ بیان کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

اس کا اعتراف ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ ہومز اس مجرمانہ ذہنیت کا اعلیٰ ترین نمائندہ ہے جو نسل انسانی کا ورثہ ہے۔ مثلاً پہرے دار کو گیس چیمبر میں بند کرنا اور فاقوں مرنے دینا، پہرہ دار نے ہومز سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہومز کا جواب قاتلانہ غصہ تھا۔

غصہ، جو ایک رومی شہنشاہ کو ایک غلام کے ہاتھوں اپنی توہین پر آتا۔ اسی طرح ایملی کا اپنی شادی کی بات کرنے پر اسے گیس چیمبر میں دھکیل دینا اور اس سے منگنی توڑنے کا خط لکھوانا، اس کے باوجود گیس سے اذیت دے کر اسے ہلاک کرنا اسی مجرمانہ ذہنیت کی بھرپور نمائندگی ہے۔

ہم ہومز کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر ایک 'رائٹ مین' کو بھی اپنی بے سروپا انانیت چھپانے کا فن آنا ضروری ہے، اس کے لیے بھی نارمل نظر آنے کے سوا چارہ نہیں۔ صرف کوئی اٹیلا یا ہلاکو ہی دنیا کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ ہومز ایک رائٹ مین کی خوش فہمیوں، اُس کی گہری اور بے ٹوک انانیت کو حقیقت بنانے چلا تھا۔ اس کا 'قتل محل' اس کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ اس کی قتل و ہلاکت اور ٹارچر کی مشینیں اس کی بے رحم انانیت کی بے گمان توسیع تھیں۔ جب وہ ایملی سگرانڈ کو دم توڑتے ہوئے دیکھ چکا تو اس کی لاش بھٹی میں جلا کر خاک کر دی۔ اس وقت سوچتا ہوگا کہ وہ دنیا کا سب سے طاقتور اور خطرناک انسان ہے اور شکاگو کی نمائش میں لوگوں کے درمیان چلتے ہوئے ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو انسان کے بھیس میں خدا سمجھتا ہو۔

بغاوت

الیگزنڈر دوم مارچ 1881ء کی پہلی تاریخ کو جیب میں ایک دستاویز لیے محل واپس آ رہا تھا۔ اس دستاویز کا مقصد ایسی روسی پارلیمنٹ بنانا تھا جو برطانوی نمائندہ طرزِ حکومت کی طرف پہلا قدم ہو۔ اگرچہ الیگزنڈر نے سرف (روسی کاشتکار) رہا کر دیے تھے مگر سوشلسٹ ایجی ٹیشن زوروں پر تھی۔ پچھلے سال محل کا ڈائننگ روم بم مار کر تباہ کر دیا گیا تھا جہاں زار اور اس کا خاندان کھانے کے لیے آنے والے تھے۔ اب وہ اس پر آمادہ تھا کہ اپنی قطعی اور مکمل طاقت کے ایک معمولی حصہ سے دست کش ہو جائے۔

احتیاط کے طور پر اس کی گاڑی ایک مختلف راستہ سے واپس آ رہی تھی۔ زور کا دھما کہ ہوا اور گاڑی کے دروازے اڑ کر دور جا گرے۔ مگر زار محفوظ رہا۔ اس نے گھبرا کر گاڑی سے باہر دیکھا تو ایک آدمی اور ایک لڑکا خون میں لت پت سڑک پر پڑے تھے۔ الیگزنڈر مہربان شخص تھا، وہ گاڑی سے یہ دیکھنے اترا کہ کہیں وہ شدید زخمی تو نہیں۔ اس کے اترتے ہی دوسرا دھما کہ ہوا اور زار اوندھے منہ سڑک پر گر گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں۔ اسے فوراً محل لے جایا گیا مگر وہ ایک گھنٹا کے بعد مر گیا۔

قاتل، مائیکل بکونن کے ساتھی تھے جو مارکس کا حریف تھا اور چاہتا تھا کہ فرسٹ انٹرنیشنل کی قیادت مارکس کے بجائے اسے حاصل ہو۔ وہ جوزف پرودھوں کا پیرو تھا۔ اس نے ہی لفظ 'انارکی' ایجاد کیا تھا، جس کے معنی حکومت کے وجود سے انکار ہے۔ بکونن 1876ء میں ناکامی اور مایوسی کی موت مرا۔ ''ایک کولمبس جو امریکا نہ دیکھ سکا،'' جیسا کہ اس کے دوست الیگزینڈر ہرزن نے اس کے متعلق کہا تھا۔

سوشلسٹ سمجھتے تھے کہ بوسیدہ سرمایہ دارانہ نظام ختم ہو تو سوشلزم خود بخود آ جائے گا۔

مگر انارکسٹ اتنے پُرامید نہیں تھے۔ انہیں انسانی فطرت کی نیکی پر پورا یقین تھا کہ انسان میں یہ اہلیت ہے کہ وہ ایک اچھی دنیا میں اپنے ہم نفسوں کے ساتھ امن سے رہ سکے۔ مگر اس وقت طاقت بادشاہوں اور پولیس والوں کے پاس ہے اور وہ اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہتے اس لیے انقلاب کا واحد طریقہ انہیں راستہ سے ہٹانا ہے۔ پرنس پیٹر کروپوٹکن جیسے مہربان بھی جو اپنی نیک دلی کی وجہ سے انارکسٹ بن گیا تھا، بم اور بلٹ کا سبق دینے لگے۔ ''انقلاب کے راستہ میں اٹھنے والا ایک قدم بھی ہزار پمفلٹوں سے بہتر ہے۔'' انارکسٹوں نے 1870ء کے عشرہ میں چار مرتبہ بادشاہوں پر ناکام قاتلانہ حملے کیے۔ جرمنی کے ولیہلم اوّل پر دو، ہسپانیہ کے بادشاہ پر ایک اور چوتھا اٹلی کے بادشاہ پر ہوا۔ زار الیگزینڈر دوم کا قتل روس کے اندر خوف و دہشت کا اشارہ تھا۔ پولیس نے درجنوں انقلابی پکڑے۔ انہیں پیٹر اور پال نامی قلعوں میں پھانسی دی یا قید کر دیا۔ خبروں پر سنسر لگا دیا۔ زار الیگزنڈر سوم کو اصلاحات کے نام سے نفرت تھی۔ اس نے خوب کوشش کی کہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے کر کے پیٹر اعظم کے دن واپس لے آئے۔ مگر اس طرح وہ آپ ہی اپنے محل میں قید ہو گیا۔ وہ 1894ء میں فوت ہوا۔ زار نکولس اس کا جانشین ہوا، جسے آخری زار ہونا تھا۔

امریکا کے اندر انارکزم 1870ء کے عشرہ میں آیا۔ شکاگو میں اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ شہر اپنی کل دار بھٹیوں اور مویشیوں کے احاطوں (سٹاک یارڈ) کی وجہ سے ایک رات میں امیر ہو گیا تھا، اور ایک معمولی بندرگاہ سے ترقی کر کے بڑا شہر بن گیا تھا۔ شہر میں ہر طرف آبادکاروں کی کثرت تھی۔ نئے مالک انگریز مالکان کی طرح مزدوروں کی Starvation Wages ادا کرتے تھے۔ (تیس برس بعد بھی حالات اتنے خراب تھے کہ شکاگو سٹاک یارڈ کی جو حالت اپٹن سنکلیر نے اپنے ناول 'دی جنگل' (1906ء) میں بیان کی اس نے تمام ملک کو ہلا دیا) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں نے ٹریڈ یونین بنا لیں۔ مالکان نے Black Legs (ہڑتال میں شامل ہونے سے انکار کرنے والوں) کے ذریعہ ان کی ہڑتالیں ناکام بنانے کی کوشش کی۔ شکاگو مستقل طور پر صنعتی بے چینی کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایک جرمن آبادکار انگسٹ سپائیز نے اپنی زبان میں انارکسٹ اخبار ''ورکرز ٹائم'' نکالا اور مزدوروں کو اپنے حقوق کے لیے لڑنے کو کہا۔ اسے اس وقت بالخصوص دکھ ہوا جب اس کے بھائی کو پولیس نے لوگوں کو مشتعل کرنے کے الزام میں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس نے اخبار میں ''انتقام، انتقام'' اور ''مزدورو! ہتھیار اٹھاؤ'' کی آواز بلند کی۔ 3 مئی 1886ء کو پولیس اور

مزدوروں میں میکارمک کمپنی کے سامنے تصادم ہوا۔ اگلی صبح اخبار نے اسی شام 7:30 بجے ہے مارکیٹ (Hay Market) میں جلسہ عام کا اعلان کیا۔ آٹھ بجے تک تین ہزار افراد جمع ہو چکے تھے اور ساپیئز کی تقریر سن رہے تھے، جو کہہ رہا تھا کہ ''سرکاری گماشتوں کا ہتھیاروں کے ساتھ مقابلہ کرو۔'' جب ایک اور انارکسٹ نے کہنا شروع کیا کہ ''قانون توڑو''، ''سرمایہ داروں کو ختم کرو، اور آج کرو''، تو پولیس نے مداخلت کا فیصلہ کیا اور ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ اسی وقت ایک سیاہ بڑا بم راکٹ کی طرح سنسناتا ہوا آیا اور ایک زبردست دھماکہ ہوا جس کی آواز دور تک گئی۔ پولیس نے گولی چلا دی۔ ہجوم نے بھی گولی کا جواب گولی سے دیا۔ جب میدان خالی ہو گیا تو پتہ چلا کہ بم سے پولیس کے سات آدمی مارے گئے۔ انارکسٹ اپنے مارے جانے والوں کی لاشیں اور زخمیوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ پولیس نے اخبار کے دفتر کی تلاشی کی اور سات افراد سپائیز (Spies) سمیت گرفتار کر لیے۔ دو روز بعد پولیس نے بم فیکٹری کا پتہ چلا لیا۔ ایک شخص نے بتایا کہ انارکسٹوں نے شکاگو کے تمام پولیس سٹیشن ایک ساتھ اڑانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ بم بنانے والا لوئیس لنگ گرفتار ہو گیا۔ اگست میں سات انارکسٹوں کو پندرہ پندرہ سال قید اور آٹھ کو سزائے موت دی گئی۔

عدالت کا فیصلہ، ظاہر ہے کہ ناانصافی پر مبنی تھا، کیونکہ کسی کو بم پھینکنے والے کا علم نہیں تھا۔ پولیس کی لاشوں کے قریب بم کے ٹکڑوں سے یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ بم لوئیس لنگ کا بنایا ہوا تھا۔ مگر یہ کیسے پتہ چلا کہ سزائے موت پانے والوں میں سے کون شخص پولیس والوں کی موت کا ذمہ دار تھا۔ مگر عدالت کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اسے تو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ جنونی قاتل امریکی طرزِ زندگی اور آزادیٔ اظہار کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ لنگ نے جیل میں خود کشی کر لی اور سپائیز سمیت چار انارکسٹوں کو اگلے دن پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ لنگ نے جیل کی دیوار پر اپنے خون سے لکھا، ''انارکی زندہ باد۔''

انارکی کو اپنے شہید مل گئے تو تحریک اور زور پکڑ گئی۔ ان کی بنیادی سوچ کہ حاکم اور مالک جرائم پیشہ ہیں، محنت کشوں کو لوٹتے ہیں، جادو کا اثر رکھتی تھی۔

فرانس میں انارکسٹوں کی سرگرمیاں 1890ء کے عشرے میں شروع ہوئیں۔ مظاہروں میں شریک تین انارکسٹوں کو پولیس نے گرفتار کیا اور بہت بری طرح مارا۔ مقدمہ میں سرکاری وکیل نے ان کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا۔ بالکل واہیات مطالبہ، کیونکہ ان پر لوگوں کو صرف مشتعل کرنے کا الزام تھا۔ جج سمجھ دار تھا۔ اس نے ایک کو رہا کر دیا اور دوسرے

دو افراد کو تین اور پانچ سال کی سزائے قید بالترتیب دی۔ اگلے سال جج کے گھر پر دھماکہ ہوا جس سے زینہ گر گیا مگر خوش قسمتی سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ دو ہفتے بعد سرکاری وکیل کا گھر دھماکے سے اڑا دیا گیا۔

بائیں بازو کے ایک پروفیسر نے فرانسیسی پولیس کے بدترین تشدد کے بعد اعتراف کیا کہ حملہ کا منصوبہ اس نے بنایا تھا جبکہ اس پر عمل راوشول نامی ایک شخص نے کیا۔ اس شخص کو پولیس پہلے ہی ایک انقلابی کی حیثیت سے نہیں بلکہ مشتبہ قاتل اور چور کے طور پر جانتی تھی۔ اس کا اصلی نام Komigsteen تھا اور وہ ڈاکہ کی ایک واردات کے سلسلہ میں مطلوب تھا، جس میں اس نے ایک عمر رسیدہ مرد اور تین عورتوں کو قتل کیا تھا۔

سرکاری وکیل کے گھر دھماکے کی شام تقریباً چالیس برس کے ایک باریش شخص نے ریستوران میں کھانا کھاتے ہوئے لیرو نامی بیرے سے دھماکہ کے متعلق بات کی جس کے بارے ابھی کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ دو روز بعد وہ شخص ریستوران میں اسی وقت پھر آیا تو اس نے پولیس کو خبر کی جس نے آ کر اسے گرفتار کر لیا۔ مگر کیا وہ راوشول تھا؟ اتفاق سے پولیس کو شناخت کا ایک نیا طریقہ معلوم ہو چکا تھا جو برتلون نامی پولیس کلرک کی ایجاد تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بعض اشخاص کے سر کی گولائی، ہاتھوں پیروں کی لمبائی یونیک ہوتی ہے۔ اب ثابت ہو گیا کہ دھماکے کے متعلق بات کرنے والا راشول تھا۔ اس کے نتیجہ میں برتلون دنیا بھر میں مشہور ہو گیا اور دنیا کی ہر پولیس فورس نے اس کا طریقہ اپنا لیا۔ چند برس بعد اس طریقہ کی جگہ فنگر پرنٹس نے لے لی۔

لیرو گرفتاری میں اپنے کردار کا ذکر بڑے فخر سے کرتا رہا۔ مقدمہ سے ایک شام پہلے ریستوران میں بم دھماکہ ہوا جس میں ریستوران کا مالک اور لیرو کا بہنوئی مارا گیا۔

راشول خود ایسا شخص تھا جس نے فرانسیسیوں کی نیندیں حرام کی ہوئی تھیں۔ وہ بیالیس برس پہلے پیدا ہوا تھا اور اپنے باپ کونگسٹائن کی موت کے بعد اپنے خاندان کی کفالت کرتا تھا۔ آٹھ برس کے بیٹے کی موت کے بعد اس نے خاندان کو تنہا چھوڑ دیا۔ Jesuits (عیسیٰ سوسائٹی) کی سنگ دلی نے اسے دہریہ بنا دیا۔ جب وہ نراجیت (انارکزم) میں دلچسپی لینے لگا تو اسے اور اس کے چھوٹے بھائی کو نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس نے خاندان کو فاقے کرتے دیکھا۔ اس کی چھوٹی بہن مر گئی۔ اس نے آمدنی بڑھانے کے لیے ڈاکہ زنی کو پیشہ بنا لیا۔ اسے ان چار افراد کا کوئی افسوس نہیں تھا جو اس نے قتل کیے تھے۔ اس کے الفاظ میں 'وہ

مڈل کلاس' تھے۔

پیرس میں یکا یک خوف پھیل گیا۔ ایک افواہ گرم تھی کہ انارکسٹوں نے پانی کے ذخیروں میں زہر ملا دیا ہے، مگرنئی نسل کے شاعر اور پینٹران کے حامی تھے۔

بے روزگاری کے مارے ہوئے August Valliant نے جو بارہ برس کی عمر سے سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا پارلیمنٹ پر دسمبر 1893ء میں بم پھینکا۔ یہ چھوٹا بم تھا جس کا مقصد مارنے کے بجائے خبردار کرنا تھا۔ پھر بھی جج نے Valliant کو سزائے موت سنائی۔ ایک ہفتہ بعد ریستوران 'لازار' میں دو بم پھٹے، ایک شخص ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔ دو اور بم دھماکے سڑک پر ہوئے مگر صرف ایک راہگیر مارا گیا۔ جب ایک بم بلجیم کے ایک انارکسٹ Jean Paywels کی جیب میں پھٹا اور وہ ہلاک ہو گیا تو پتہ چلا کہ سڑک پر دو بم اس نے مارے تھے۔ ایک بم Foyot ریستوران میں پھٹا جس سے ایک شاعر لارنٹ ہتل ہاد اندھا ہو گیا۔ Emil Henry جس نے 'لازار' میں بم مارے تھے آخر گرفتار ہوا تو اس نے کہا کہ اس کا مقصد امرا کو نشانہ بنانا تھا جو ریستوران میں کھانا کھاتے تھے۔

فرانس کا صدر سیدی کارنو نمائش (24 جون 1894ء) جانے کے لیے کھلی گاڑی میں لیون سے گزرا تو اس نے پولیس سے کہا کہ کوئی شخص اس کے پاس آنا چاہے تو آنے دیں۔ ایک نوجوان لپٹا ہوا اخبار ہاتھ میں لیے آگے بڑھا، قریب آ کر اس نے اخبار میں سے چاقو نکالا اور صدر کے پیٹ میں مار دیا۔ پتہ چلا کہ نوجوان اطالوی ہے۔ انقلاب کے نعرے لگاتا ہوا وہ پھانسی لگ گیا۔

فرانس میں انارکسٹوں کی دہشت یکا یک ختم ہو گئی۔ حکومت نے تیس نراجیوں پر سازش کا مقدمہ بنایا۔ جیوری نے کسی قسم کے اثر میں آنے سے انکار کر دیا اور تین چوروں کے علاوہ سب کو رہا کر دیا۔ اس انصاف پسندی نے انارکسٹوں کو مزید شہیدوں سے محروم کر دیا اور ان کا پروپیگنڈا بے اثر ہو گیا۔ اس کے علاوہ تحریک کے رہنماؤں کروپوٹکن اور میلاتیستا کو پہلے ہی تشدد کی کارروائیوں پر شک ہونے لگا تھا۔ خصوصاً جب راشول جیسے لوگ تحریک میں شامل ہونے لگے تھے۔ فرانسیسی سوشلسٹ تحریک ایک بار پھر نظریاتی ہو گئی۔

اسپین میں نراجیت ایک مختلف کہانی تھی۔ ہسپانیویوں کو اعتدال کی عادت نہیں۔ جنوری 1892ء میں اندلس کے اندر کسانوں کی ایک مختصر سی بغاوت ہوئی۔ کھیت مزدور ان چار آدمیوں کو آزاد کرانے روانہ ہوئے جنہیں دس سال پہلے مزدور ایجی ٹیشن میں حصہ لینے کی

وجہ سے قید کر دیا گیا تھا۔ پولیس نے انہیں منتشر کر دیا اور ان کے چار لیڈر ہلاک کر دیے۔ ستمبر 1893ء میں ہسپانوی وزیراعظم مارٹنیز داکمپوس پر اُس وقت حملہ کیا گیا جب وہ بارسلونا میں فوجی دستوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ پالاس نامی ایک شخص نے اس پر دو بم پھینکے۔ اس کا گھوڑا اور چھ افراد ہلاک ہو گئے۔ اسے صرف خراشیں آئیں۔ پالاس مار دیا گیا۔ چھ ہفتہ بعد بارسلونا کے ایک تھیٹر میں دو بم مارے گئے۔ بائیس افراد ہلاک اور پچاس زخم ہوئے۔ پولیس نے اندھا دھند گرفتاریاں کیں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ جن پر شبہ تھا انہیں ٹارچر کیا کہ جرم کا اعتراف کریں۔ چھ افراد نے اعتراف کیا، انہیں سزائے موت دی گئی۔ سزائے موت پانے والوں میں وہ شخص بھی شامل تھا جس نے تھیٹر میں بم مارنے کا اعتراف کیا تھا۔

انگلستان والوں میں اتنی سمجھ تھی کہ وہ انارکزم کے بارے میں آپے سے باہر نہ ہو جائیں۔ شاید اس لیے کہ انہوں نے کبھی اس میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری وجہ سے کوئی معمولی سا فرق بھی عملی طور پر نہیں پڑ سکتا۔ اسی لیے ہر قسم کے انارکسٹ اور انقلابی کو انگلستان میں پناہ مل جاتی ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ پولیس اس کی بہت کم نگرانی کرے گی۔ برنر سٹریٹ کا کلب جہاں جیک دی رپر نے پہلے دو قتل کیے تھے انقلابیوں کے ملنے کی مشہور جگہ تھی کیونکہ وہاں بیٹھ کر وہ خونی انقلاب کے متعلق جتنی باتیں چاہتے، کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ان باتوں پر عمل کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ لندن میں1890ء کے عشرے میں انارکسٹوں کے تشدد کا صرف ایک واقعہ ہوا کہ ایک نوجوان مارشل بورڈن نے گرین وچ رصدگاہ کو بم مار کر اڑانے کی کوشش کی۔ (فروری 1892ء) بم وقت سے پہلے پھٹ گیا۔ نوجوان کے پرخچے اڑ گئے مگر رصدگاہ محفوظ رہی۔ اٹھارہ برس بعد دسمبر 1910ء میں روسی انارکسٹوں کا ایک گروپ ایسٹ لندن کے ایک جیولر کی دکان میں دروازہ توڑ کر داخل ہو گیا۔ پولیس آئی تو انہوں نے گولیاں برسانا شروع کر دیں جس کے نتیجہ میں پولیس کے تین آدمی مارے گئے۔ ملک بھر میں ان کا پیچھا کیا گیا تو کئی انارکسٹ گرفتار کر لیے گئے۔ اگلے سال جنوری میں ان کے دو رکن سٹنی سٹریٹ کے ایک گھر میں گھیر لیے گئے۔ رات بھر محاصرہ جاری رہا اور گولیاں چلتی رہیں۔ صبح ہوئی تو گھر کو آگ لگ گئی اور دونوں مفرور اس میں جل کر خاک ہو گئے۔ اس کے باوجود گورنمنٹ نے انارکسٹ خیالات دبانے کی کوشش نہیں کی۔ انگریزوں نے انہیں سنجیدگی سے نہیں لیا تو انارکزم کے آدرش رفتہ رفتہ معدوم ہو گئے۔

انارکسٹوں کا یہ خیال کچھ ایسا غلط نہیں تھا کہ دنیا کے بعض بدترین مسائل کی ذمہ دار

حکومتیں ہیں۔ مگر وہ بھول گئے کہ یہ انفرادی ذمہ داری کی بحث نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلہ میں انگلستان ایک دلچسپ مثال ہے۔ 1900ء تک برطانوی سلطنت رومی سلطنت سے کئی گنا بڑی تھی مگر انگریز اپنے آپ کو فاتح نہیں بلکہ مذہبی مشنریوں کی طرح تہذیبی مشنری سمجھتے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اونچی کلاس کے انگریزوں کے خیال میں وہ نفیس، ایمان دار اور بہت ذہین نہ سہی مگر بہت وفادار تھے۔ ان کے لیے یہ ماننا بہت مشکل تھا کہ ان کی نوآبادیاں انہیں ظالم اور لٹیرا سمجھتی ہیں۔

آئرلینڈ ہنری سوم کے زمانہ سے سیاسی مسائل سے دوچار تھا، جب انگلستان پروٹسٹنٹ ہوگیا اور آئرلینڈ بدستور کیتھولک رہا۔ انگریزوں کی نظر میں آئرلینڈ کی ہر بے چینی کا حل وہاں فوج بھیجنا اور انہیں قتل کرنا تھا۔ انگریز اسے صلح جوئی اور امن پسندی کہتے تھے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا میں ہے کہ ''آئرلینڈ اب اتنا پُرامن ہوگیا ہے کہ آرمیڈا (جنگی جہازوں کا بیڑہ) کے سال میں بھی آئرلینڈ نے جنبش نہیں کی۔''

1607ء میں پرانے آئرش ارل اس قدر بددل ہوئے کہ آئرلینڈ سے باہر جا کر مر گئے اور انگریزوں نے مسئلہ کا بزعم خود انقلابی حل سوچا کہ Ulster آئرلینڈ سے الگ کیا جائے اور وہاں انگریز پروٹسٹنٹ آباد کیے جائیں۔ 1641ء میں آئرش عوام نے پھر بغاوت کر دی اور Ulster میں پروٹسٹنٹوں کو قتل کیا۔ آٹھ برس بعد ان کا بدلہ لینے کے لیے کروم ویل آئرلینڈ گیا اور بہت زیادہ کیتھولک قتل کیے۔ اتنے زیادہ کہ Ulster کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوتا نظر آیا۔ جیمز دوم نے اپنا تخت دوبارہ حاصل کرنے کے لیے آئرش عوام سے مدد چاہی مگر Boyne کی جنگ میں شکست کے بعد ملک سے چلا گیا اور آئرش عوام کو انگریزوں کی 'امن پروری' کا مزا ایک بار اور چکھنا پڑا۔

1916ء کی بغاوت میں چند قوم پرست شامل تھے جنہیں آئرش عوام کی عام حمایت حاصل نہیں تھی۔ انگریزوں نے اسے کسی مشکل کے بغیر رفع کر دیا۔ بہتر ہوگا کہ باغیوں کو جیل بھیجنے کے بجائے انہیں عوام میں غیر مقبول بنایا جاتا۔ مگر انگریزوں نے انہیں گولی مار دینے کا فیصلہ کیا۔ پرانے زخم تازہ ہوگئے، بھرپور بغاوت ہوئی۔ انگریز فوجیں آئرش ری پبلکن آرمی کو کچلنے لگیں۔ انگریز عوام آخر کار خود اس خوں ریزی سے تنگ آ گئے اور 1921ء میں جنوبی آئرلینڈ جمہوریہ بن گیا۔ مگر Ulster کا مسئلہ اب بھی حل نہ ہوا۔ اور بیسویں صدی کے آخری عشروں میں پہلے سے زیادہ سنگین ہوگیا۔ آئرلینڈ کے معاملہ میں انگریزوں نے اپنی

مشکلات کو ضرورت سے زیادہ اور بے جا اہمیت دی جس کا نتیجہ مسلسل خونریزی ہے۔

ہندوستان کی صورت حال بھی مختلف نہیں۔ انگریز کہتے ہیں کہ "فتح" ان پر مسلط کر دی گئی۔ حالانکہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے ساتھ صرف تجارت چاہتی تھی۔ پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کو برطانوی بحریہ نے ہندوستان کے ساتھ روابط بڑھانے سے روکا۔ **1756**ء میں انگریزوں نے پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کو شکست دی۔ کلائیو نے اپنا آدمی تخت پر بٹھایا اور انگریز بنگال کے مالک و مختار بن گئے۔ **1818**ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست دی اور ملک کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا 'بھائی چارہ' کا پیغام چین بھی پہنچایا۔ ہندوستان میں اسے افیون ملی تو وہ بھی انگلستان بھیج دی، جہاں وہ نزلہ زکام اور دانت درد میں مفید ثابت ہوئی۔ شروع میں اسے الکوحل سے زیادہ برا سمجھا گیا مگر انیسویں صدی کے آغاز میں اس کی نشہ ورانہ حیثیت مسلّم ہو گئی۔ اس کے باوجود کمپنی نے اسے چائے کے بدلہ چین بھیجنے سے گریز نہیں کیا۔ جاپانیوں کی طرح چینی بھی غیر ملکیوں سے واسطہ نہیں چاہتے تھے اور یورپ پر ان کے دروازے بند تھے۔ مگر چینیوں کو افیون چکھنے پر مجبور کیا گیا اور جلد ہی وہ دن آ گیا جب وہ خود افیون مانگنے لگے۔

1831ء میں شہنشاہ چین نے ایک بڑا ایمان دار شخص افیون کی سمگلنگ روکنے کے لیے مقرر کیا جس کے نتیجہ میں ہزار ٹن سے زیادہ افیون دریا میں پھینک دی گئی۔ برطانوی حکومت نے اپنی بحریہ بھیجی جس نے بندرگاہ اور چینی شہریوں پر لگاتار گولہ باری کی اور جزیرہ چوسان پر قبضہ کر لیا۔ شہنشاہ بے چارے کو شکست ہوئی اور ساٹھ لاکھ ڈالر جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ اس نے ہانگ کانگ بھی انگریزوں کو دے دیا تاکہ انگریز چین میں افیون کی بھرمار کر دیں۔ ہانگ کانگ کے علاوہ کینٹن، شنگھائی اور دوسری بندرگاہیں بھی غیر ملکیوں پر کھول دی گئیں جو اپنی آبادیوں میں اپنی مرضی سے رہ سکتے تھے اور چین بھر میں صرف اپنے قانون کے مطابق گھوم پھر سکتے تھے۔ انگریز، فرانسیسی، روسی، جرمن بلکہ جاپانی غیر ملکیوں نے چین کے علاقے آپس میں بانٹ لیے۔

1899ء میں ایک خفیہ وطن دوست پارٹی 'Order of Harmonious Fists' (جسے انگریز طنزاً باکسرز کہتے تھے) نے ریل کی پٹڑیاں اکھاڑنا، غیر ملکیوں اور چینی عیسائیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ باکسر بغاوت پر بین الاقوامی فوج (جس میں جاپانی بھی

شامل تھے) نے قابو پایا۔ چینی حکومت نے پینتیس کروڑ ڈالر جرمانہ ادا کیا اور مزید کئی رعائتیں دیں۔ اس کے نتیجہ میں چینی قوم پرستی کا آغاز ہوا اور 1911ء میں مانچو خاندان کی حکومت کا تختہ سن یات سن اور اس کے ساتھیوں نے الٹ دیا۔ سن یات سن نے جب غیر ملکیوں کو چین سے نکالنے کی کوشش کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ سن نے مدد کے لیے سوویٹ یونین کی جانب دیکھا اور مغرب کے لالچ اور حماقت کا نتیجہ کمیونسٹ چین کی صورت میں ظاہر ہوا۔

مغرب کے ساتھ جاپان کے بھی کچھ ایسے ہی مسائل تھے۔ 1853ء میں امریکا نے جاپان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ جب امریکی جنگی جہاز Yedo (بعد میں ٹوکیو) بندرگاہ پہنچے تو تجارتی رابطوں کا آغاز ہوگیا۔ مگر چینیوں کی طرح جاپانیوں کو بھی پتہ چل گیا کہ غیر ملکی اپنے قانون اور قواعد کے مطابق زندہ رہنا اور تجارت کرنا چاہتے ہیں۔ 1862ء میں ایک انگریز نے کوئی بدتمیزی کی جس کی بنا پر ایک رئیس کے آدمیوں نے اسے قتل کر دیا۔ مغربی طاقتوں، انگریز، امریکی، فرانسیسی اور ولندیزیوں سب نے مل کر ایک آواز میں احتجاج کیا اور بحری فوج جاپان کے ساحلی شہروں پر بمباری کے لیے روانہ کی۔ انہوں نے شہنشاہ کی بھی توہین کی جسے جاپانی خدا سمجھتے ہیں۔ شہنشاہ کو Hyot پر بمباری کی دھمکی دے کر اس سے معاہدوں پر دستخط کروائے۔ جاپانیوں نے سمجھ لیا کہ اب جدید ہونے کا وقت ہے۔ اس طرح ان کی کامیابیوں کی قابل ستائش کہانی شروع ہوئی اور جاپان ماڈرن صنعتی ملک بن گیا۔ لیکن مغرب نے جاپانیوں کی جو توہین کی اور مسلسل کر رہا تھا اس کا نتیجہ دسمبر 1941ء میں پرل ہاربر پر جاپانیوں کا حملہ تھا۔ مغرب کی نظر میں یہ جاپانیوں کی افسوس ناک غداری تھی۔ جبکہ جاپانیوں کی نظر میں یہ سو سال کی توہین کا بدلہ تھا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں مغربی طاقتیں افریقا سے نکل گئی تھیں۔ ولندیزیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ افریقا کے جنوبی علاقہ کی آب و ہوا خوش گوار ہے اس لیے وہاں آباد ہو چکے تھے۔ ہسپانوی اور پرتگالی مغربی ساحل پر آباد تھے جسے بعد میں گولڈ کوسٹ، آئیوری کوسٹ اور سلیو کوسٹ کے طور پر جانا گیا۔ بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ نے 1870ء کے آخر میں امریکی سیاح سٹینلے کو مالی امداد دی جس نے کانگو کا ایک بڑا علاقہ اس کے حوالے کیا۔ جو بلجیئن کانگو کے نام سے جانا گیا۔ ربڑ پیدا کرنے والے علاقوں میں جو خوفناک مظالم ہوئے انہوں نے لیجنڈری حیثیت اختیار کر لی۔ مقامی باشندے کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیے جاتے۔ اگر بھاگنے کی کوشش کرتے تو ان کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے جاتے۔ فرانسیسیوں نے کانگو کے شمالی حصوں پر قبضہ کر لیا۔ پرتگال نے

ساحل کے مشرق اور مغرب کا درمیانی علاقہ ہتھیا لیا۔ جرمنی نے زنجبار کے گرد ایسٹ کوسٹ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اٹلی نے شمال میں صومالی لینڈ، اریٹیریا اور یوتھوپیا پر قبضہ کر لیا۔ انگریز سب سے زیادہ لالچی ثابت ہوئے۔ انہوں نے کیپ ٹاؤن سے قاہرہ تک کو برطانوی مقبوضہ علاقہ بنانا چاہا اور 1899-1901ء میں جنگ بوئر کے نتیجہ میں ولندیزیوں سے ایک بڑا علاقہ بوئرز چھیننے میں کامیاب ہوئے۔ کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ افریقا پر افریقیوں کا بھی کوئی حق ہے۔ مگر جب دوسری عالمی جنگ کے بعد بعض افریقی ممالک آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو کئی افریقی ملک اس لیے کمیونسٹ ہو گئے کہ انہیں کمیونسٹ آئیڈیالوجی مغربی امپیریلزم سے مختلف لگتی تھی۔

یہ تمام واقعات انارکسٹوں کے اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ انسان کے مسائل کی ذمہ دار حکومتیں ہیں۔ انارکسٹوں کے نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ دنیا میں صرف ظالم و مظلوم دو قومیں رہتی ہیں۔ مگر جنہیں تاریخ سے واقفیت ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ مظلوموں کا بس چلے تو وہ بھی ظالم بن جاتے ہیں۔ اصل خرابی انسانی فطرت میں ہے۔ حکومتیں اس لیے ظالم ہوتی ہیں کہ وہ افراد سے بنتی ہیں اور افراد جیسا رویہ اختیار کرتی ہیں۔ جب کسی فرد کے ساتھ ظلم ہوتا ہے تو وہ اس کا بدلہ چاہتا ہے۔ یہی حال حکومتوں کا ہے۔ انارکسٹ اور سوشلسٹ کہتے ہیں کہ عام لوگ امن چاہتے ہیں، حکمران ہیں جو جنگ چاہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب قومی وقار مجروح ہوتا ہے تو سب جنگ چاہتے ہیں۔ اور عام آدمیوں کو دوسروں سے زیادہ جنگ کی جلدی ہوتی ہے۔ بین الاقوامی جنگ کی یہی وجہ ہے اور یہی وجہ جرم کی ہے۔ انسان آسانی کے ساتھ اپنی راست بازی کے زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اسی زعم کی وجہ سے وہ جذبات کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ جب اس کی عقل کام نہیں کرتی اُس وقت اس کی حالت ایک چھوٹے سے جہاز جیسی ہوتی ہے جو طوفان میں گھِرا ہو۔ وہ ہوتا ہے اور اس کے مجروح جذبات اور زخم خوردہ انانیت ہوتی ہے۔ اس کے سوا کسی کی اہمیت نہیں ہوتی۔ اگر وہ مخالف کو ذلیل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو طوفان تھم جاتا ہے، اسے دنیا اچھی لگنے لگتی ہے۔ نہ تھمے تو نیم پاگل ہو جاتا ہے۔

1894ء میں زار نکولس دوم کی تخت نشینی کے بعد افواہ پھیلی کہ نیا زار روس کو جدید بنانے اور لوگوں کو مزید آزادی دینے کے لیے بے تاب ہے۔ نیا زار بیل کی خصلتوں والے باپ سے مختلف تھا۔ مقامی کونسلوں کو بتا دیا گیا تھا کہ وہ وفود سے مل کر خوش ہوتا ہے۔

Tver سے ایک وفد پیٹرز برگ آیا اور بیش قیمت تحفے زار کی نذر کیے اور اپنے سپاس نامہ میں اسے اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے عرض کی کہ ہمیں توقع ہے کہ ''عالی جاہ مقامی کونسلوں کو اجازت دیں گے کہ وہ اپنے معاملات میں اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔'' یہ سنتے ہی زار کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے سپاس نامہ کے مصنف کو بے عزت کر کے نوکری سے نکال دیا۔ چند روز بعد اس نے وفود کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے سختی کے ساتھ کہا کہ ''بعض مقامی کونسلیں حکومت میں شریک ہونے کے خواب دیکھتی ہیں۔ ہر شخص جان لے کہ اپنے باپ کی طرح میں بھی آمریت کے اصولوں پر کاربند ہوں۔'' سننے والوں کے ہوش اڑ گئے اور زارینہ الیگزینڈر، اس کی بیوی آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی بلائیں لینے لگی۔

زار نے اپنے پولیس چیف فان پلیف کو حکم دیا کہ 'بائیں بازو' سے ہمدردی رکھنے والے ہر شخص کو گرفتار کرے۔ چیف نے اپنا کام زور شور سے شروع کر دیا۔ وہ پہلے ہی الیگزینڈر دوم کے قتل کے بعد اجتماعی سزائیں دے رہا تھا۔ نئے گرفتار ہونے والوں میں ایک خوبصورت طالبہ میری ویٹروف بھی تھی۔ اس کے کمرے سے بعض خلاف قانون کتابیں ملی تھیں۔ معمول کی سزا کے تحت اسے یونیورسٹی سے نکالا جانا تھا مگر اسے پیٹر اور پال کے قلعوں میں قید کر دیا گیا۔ پھر اس کے ساتھ کیا ہوا؟ کوئی نہیں جانتا، مگر ٹارچر اور ریپ کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا۔ 10 فروری 1897ء کو میری نے اپنے گدے کو پیرافین میں ڈبو کر آگ لگا دی اور اس پر اس طرح لیٹ گئی گویا کہ ہواؤں میں اڑنے والی ہے۔ شدید اذیت برداشت کرتے ہوئے وہ دو روز بعد مر گئی۔ دو ہفتوں تک اس کے والدین کو اطلاع نہیں دی گئی۔

ایک خفیہ پمفلٹ میں حکومت کو اس کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا اور پوچھا گیا کہ وہ کیسا ٹارچر تھا اور کیسی ذلت تھی جس کی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو مار دیا جبکہ اس کے دوست رہائی کے احکام حاصل کر چکے تھے۔ پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا گیا اور ہزاروں لوگ اس کے جنازہ میں شامل ہوئے۔ انہوں نے پولیس کی وارننگ نظرانداز کر دی۔ ایک برس بعد صنعتی مزدوروں نے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی بنائی جو آگے چل کر 'کمیونسٹ پارٹی' بنی۔

زار اس صورت حال سے بے تعلق تھا۔ وہ مشرق بعید بالخصوص چین اور کوریا کے اندر روس کا اثر بڑھانے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ حال میں جاپان نے چین کے ساتھ جنگ میں فتح پائی تھی اور علاقائی رعایتوں پر اصرار کر رہا تھا۔ روس کا بھی یہی مطالبہ تھا۔ 1901ء میں

جاپان کا سب سے بڑا مدبر سیاست دان ہرویوی اس مسئلہ پر بات کرنے پیٹرز برگ آیا۔ اسے نظر انداز کیا گیا اور اس کے ساتھ بدتمیزی کی گئی۔ اس کے سرکاری خطوط کے جواب میں ہفتوں تاخیر سے کام لیا گیا۔ زار جاپانیوں کو ناقابل برداشت اجنبی سمجھتا تھا جنہیں اپنی اوقات یاد رکھنی چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپانیوں نے کوریا میں متنازعہ علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ روسیوں نے طیش میں آ کر جنگ کا اعلان کیا۔ 1904ء میں روسی جنگی بیڑے کو جاپانی بحری بیڑا تباہ کرنے کا حکم ملا۔ مگر روسیوں کو ابھی حیران و پریشان ہونا تھا۔ روسی نہیں جانتے تھے کہ جاپانی برسوں سے صنعت اور جدیدیت اپنائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک ایسی جمہوریت رائج کر لی تھی روسی ابھی جس کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے روسیوں کو جنگ میں پے در پے شکستیں دیں۔ آخر روسی بحریہ سوشیما آئی۔ جاپانیوں نے چند گھنٹوں میں دو کے سوا تمام جہاز غرق کر دیے۔ جاپانیوں نے بتا دیا کہ ان کے چیف منسٹر کے ساتھ بدتمیزی اور گستاخی نہیں کی جاسکتی۔

جنگ کے بعد ایک روسی سیاست دان نے کہا کہ ''کریملن میں جاپانی نہیں روسی داخل ہوں گے۔'' وہ سمجھ گیا تھا کہ قومی توہین بدترین چیز ہے جو زار کو پیش آ سکتی ہے۔ دراصل جب جنگ جاری تھی تو پولیس چیف اس وقت مارا گیا، جب بم اس کی گاڑی کے نیچے پھینکا گیا۔ دھماکہ اتنا سخت تھا کہ صحیح معنوں میں اس کے پرخچے اڑ گئے۔

اب اس کی جگہ حکومت نے پرنس سویتوپولک مرسکی کو مقرر کیا۔ وہ آزاد خیال سمجھا جاتا تھا۔ اس نے عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے نیوز کانفرنس کر کے زار کے غضب کو بھڑک اٹھنے کی دعوت دی۔ 'ریمسٹفو' کے نمائندوں نے مزید آزادی کا مطالبہ کیا۔ 22 جنوری 1905ء کو ایک پادری فادر گوپن مزدوروں کا ایک وفد لے کر محل آیا تا کہ زار سے رعایات کی اپیل کی جائے۔ ان کے ساتھ کچھ اور مزدور، عورتیں اور بچے شامل ہو گئے۔ وہ محل کے سامنے 'لٹل فادر' کو آواز دے رہے تھے کہ فوج نے ان پر گولی چلا دی۔ پھر قازقوں نے لوگوں پر حملہ کر دیا اور انہیں تلواروں کے ساتھ چیرنے پھاڑنے لگے۔ ہر طرف دہشت پھیل گئی، بچے پاؤں تلے روندے گئے۔ ایک سو پچاس افراد ہلاک ہوئے اور دو سو زخمی ہوئے۔ جب زار نے یہ خبر سنی تو اس کا پہلا سوال تھا کہ ''کیا بہت کافی مارے گئے ہیں؟'' جب اسے بتایا گیا کہ ایک اور رجمنٹ نے نہتے مزدوروں اور کسانوں پر گولی چلائی ہے تو اس نے انہیں ''شاندار لوگ'' کہہ کر شاباش دی۔

روس میں ہونے والے ان واقعات کی بنا ایک اکیلے شخص کی خوش فہمی تھی کہ وہ اب بھی جو چاہے کر سکتا ہے اور مارکس نے بادشاہوں کے متعلق جو کہا تھا، سچ کہا تھا۔ عجیب بات ہے کہ زار ذاتی طور پر آمر یا ڈکٹیٹر نہیں تھا۔ وہ شریف آدمی اپنا وقت بیوی بچوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتا تھا۔ ناممکن تھا کہ وہ کسی سے بدسلوکی کرے چاہے وہ غصہ کی حالت میں کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ جو شخص بھی ملتا تھا، اس کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر جاتا تھا۔ لیکن جب وزرا کو برطرفی کے احکام بذریعہ ڈاک ملتے تو ان کے ہوش اڑ جاتے۔ دراصل نکولس کمزور شخص تھا وہ اپنی رائے لحہ بہ لحہ بدلتا رہتا تھا۔ غرضیکہ وہ ایک بچہ تھا جو اپنے خوابوں کی داخلی دنیا کو چھوڑ کر سنگین حقائق کی دنیا میں نہیں جا سکتا تھا۔ جب روس کو ایک حقیقت پسند حکمران چاہیے تھا اس وقت روس پر ایک ایسا شخص حکومت کر رہا تھا جو کسی ذمہ داری کا اہل نہیں تھا۔

ایسے شخص کے لیے زارینہ جیسی عورت بدترین بیوی تھی۔ وہ ایک اچھی گھریلو بیوی تو بن سکتی تھی مگر ملکہ بننے کے لائق نہیں تھی۔ وہ راسپوٹین کی گرویدہ تھی جو دیندار راہب تو تھا مگر موسیقی، شراب اور عورت کا شوقین بھی تھا۔ جب پارلیمنٹ (ڈوما) قائم کرنے کے لیے عام مطالبہ نے زور پکڑا تو راسپوٹین اسے بہکاتا رہا کہ وہ تمام روسیوں کا بادشاہ ہے۔ آمرِ مطلق ہے، جو چاہے کر سکتا ہے اور اسے ایسے ہی کرنا چاہیے۔

مگر بیسویں صدی کے پہلے دس سال ہر اس حکمران کے لیے خطرناک تھے جسے حقیقت کا شعور نہیں تھا۔ تاریخ کا دھارا تیزی، اور تیزی سے بہہ رہا تھا اور یورپ کی بدنصیبی کہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والا حکمران صرف زار نہیں تھا بلکہ جرمنی کا قیصر ولیم ثانی بھی تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ حساس اور جذباتی تھا۔ بناوٹ اور خودرحمی اس کی عادت تھی۔ پیدائشی طور پر وہ بازو سے معذور تھا۔ معذوری کی وجہ سے اس نے اپنے رعب اور دبدبہ میں اضافہ کر لیا تھا۔ کردار میں وہ جولیس سیزر سے زیادہ نیرو کی طرح تھا۔

اس نقاہت زدہ جنونی نے اپنے آپ کو ایک ایسے معاشرہ میں پایا جو تیزی کے ساتھ بوسیدہ ہو رہا تھا۔ 1848ء کے انقلاب نے جرمنوں کو ڈرا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پھر اس کا سامنا ہو۔ مگر 1900ء تک دنیا بہت بدل چکی تھی۔ اب آزاد خیال اور سوشلسٹ پاگل نہیں سمجھے جاتے تھے۔ لوگ تبدیلی چاہتے تھے، وہ جنگ اور آمریت سے تنگ آ چکے تھے۔ لیکن زار، آسٹریا کا شہنشاہ اور قیصر تاریخ کو پیچھے لے جانے کی دیوانہ وار کوشش کر رہے تھے۔

اگر زار حقیقت پسند ہوتا تو سمجھ سکتا کہ اسے روسی عوام کی مکمل حمایت درکار ہے۔ جاپان سے شکست نے روس کی کمزوری بے نقاب کر دی تھی۔ فوج کرپٹ سیاستدانوں اور جرنیلوں کے ہاتھ میں تھی جو اسلحہ خریدنے کے لیے مخصوص روپیہ بنک کے اندر اپنے ذاتی حساب میں جمع کرا دیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے سپاہیوں کے پاس پرانی ناکارہ رائفلیں تھیں اور باقیوں کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ روس دشمن طاقتوں میں گھرا ہوا تھا۔ جرمنی افریقا میں زمین پر قبضہ کے لیے اپنی بحریہ تیار کر رہا تھا۔ فرانس نے مراکش پر قبضہ کر لیا تھا۔ انگریز مصر میں موجود تھے۔ ترکی میں اس کی نئی نسل ''نوجوان ترک'' برسر اقتدار تھی جس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے ملک کو مزید تباہ ہونے نہیں دے گی۔ فرانز جوزف کا آسٹریا یورپ کے مستحکم ممالک میں سے تھا۔ اس کی نظریں بلقان پر تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بوسنیا، سربیا، کروشیا اور سلووینیا جیسے چھوٹے ملک متحد ہو کر 'سدرن سلاو لینڈ' (یوگوسلاویہ) کے نام سے بڑا ملک بن جائیں۔ آسٹریا نے 1878ء سے بوسنیا پر قبضہ کیا ہوا تھا اور اسے مستقل طور پر ہتھیا لینے کے لیے کسی بہانہ کی تلاش میں تھا۔ جب اس نے ایسا کر لیا تو یورپ میں بحران آ گیا اور روس تو جنگ پر تیار ہو گیا۔ مگر راسپوٹین نے زار کو منع کر دیا کہ بلقانی اتنے اہم نہیں کہ ان کے لیے لڑا جائے۔ اطالویوں کو بھی خیال آیا کہ ملک وسیع کرنے کا اچھا موقع ہے۔ چنانچہ انہوں نے 1911ء میں ٹریپولی پر قبضہ کر لیا۔ ملک غصب کرنے کا یہ پرانا کھیل تھا جو بڑی طاقتوں نے انیسویں صدی میں کھیلنا شروع کیا تھا لیکن اب وہ اس لیے خطرناک لگتا تھا کہ بڑا کھیل چھوٹے میدان میں کھیلا جا رہا تھا، پھر یہ کہ بڑی طاقتوں نے کئی اتحاد بنا لیے تھے کہ کسی ایک پر حملہ ہو تو دوسرے اس کی مدد کریں۔

28 جون 1914ء کو آسٹریا کے فرانز جوزف کا بیٹا آرچ ڈیوک فرانز فرڈیننڈ سرکاری دورے پر بوسنیا کے دارالحکومت سرائیوو گیا۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر ایسا کیا تھا کیونکہ 28 جون سربیا کی شکست کا دن تھا، جو ہر سال منایا جاتا تھا۔ آرچ ڈیوک کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ مارا جائے گا۔ اس نے اپنے بچوں کے ٹیوٹر سے کہہ دیا تھا کہ مجھے مارنے کے لیے آنے والی گولی راستہ میں ہے۔ اس صبح دس بجے ایک بم اس کی گاڑی پر پھینکا گیا۔ بہت سے لوگ مارے گئے مگر آرچ ڈیوک اور اس کی بیوی محفوظ رہے۔ بم مارنے والا پکڑا گیا اور اسے سائنائیڈ (زہر) لینے سے روک دیا گیا۔ آرچ ڈیوک نے ٹاؤن ہال کے اندر ایک تقریب میں شرکت کی۔ تقریب سے جاتے ہوئے اس نے اپنی بیوی سے کہا، ''مجھے لگتا ہے کہ ہمارے آس

پاس اور بم بھی ہیں۔" ایک دوراہے پر گاڑی نے غلط موڑ کاٹا اور مڑنے کے لیے رکی۔ ایک نوجوان ریوالور لیے سامنے آیا۔ اس نے دو فائر کیے، آرچ ڈیوک اور اس کی بیوی دونوں فوراً ہلاک ہو گئے۔

جلد ثابت ہو گیا کہ سربیا کے بعض اعلیٰ افسر سازش کے متعلق جانتے تھے۔ فرانز جوزف نے ان سے تفتیش کرنا چاہی لیکن سربیا نہ مانا اور آسٹریا نے اعلانِ جنگ کر دیا۔ روس نے سربیا کی امداد کا معاہدہ کیا ہوا تھا مگر صورتِ حال خطرناک تھی۔ کیونکہ قیصر یقیناً آسٹریا کی مدد کرتا۔ اس عرصہ میں روس بے چین ہوتا رہا۔ سربیا والے آخر سلاو (وسطی اور مشرقی یورپ کے لوگ) بھائی تھے اور آسٹریا ان کا ملک چھیننا چاہتا تھا۔ زار امن کی خواہش اور انتقام کے ارادہ کے درمیان دو نیم تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ جرمنی میں قیصر اپنی مصیبت میں مبتلا تھا کہ روس، برطانیہ اور فرانس نے مل کر جرمنی کو کچلنے کا ارادہ کر لیا۔ جدید تاریخ کے ایک نہایت نازک لمحہ میں وہ ایک ہسٹریائی عورت کا چلن اختیار کیے ہوئے تھا۔ اس نے زار کو پیغام بھیجا کہ جنگ کی تیاریاں فوراً روک دے۔ اتحادی اس زبان درازی پر حیران رہ گئے۔ ہر کوئی صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش میں لگ گیا۔ سربیا صلح صفائی کی بات کر کے آسٹریا کو مطمئن کرنے لگا۔ زار نے مشورہ دیا کہ معاملہ بین الاقوامی ٹربیونل کے سپرد کیا جائے۔ پھر آسٹریا نے سربیا کے دارالحکومت بلغراد پر گولہ باری کی۔ روس بدستور جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ جرمنی نے جنگ کا اعلان کیا اور زار، زندگی میں پہلی مرتبہ روس کا مقبول ترین شخص بن گیا کیونکہ لوگ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے جرنیلوں سے زیادہ جنگ کے لیے تیار تھے۔ قیصر نے روس کے اتحادیوں فرانس اور بلجیم کو توہین آمیز الٹی میٹم دیا۔ انہوں نے ویسا ہی جواب دیا۔ جرمنی نے سوچا کہ ندامت سے بچنے کے لیے اسے بلجیم پر مارچ کر دینا چاہیے۔ برطانیہ بلجیم کے دفاع کے لیے جنگ میں شامل ہو گیا اور اس لیے بھی کہ وہ جرمنی کو مزید بندرگاہوں پر قبضہ کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جاپان نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور اٹلی نے برطانیہ کی طرف داری کی۔

جنگ کیا تھی زار کے زوال کا پیش خیمہ تھی۔ اس کی فوج بہادری سے لڑی مگر فوج کے پاس گولہ بارود نہیں تھا، مناسب وردیاں نہیں تھیں۔ اس کی خوراک ریلوے گوداموں میں پڑی گل سڑ گئی تھی۔ بھاری جانی نقصان اور شکستوں کے بعد زار نے کمانڈر انچیف کو برطرف کر دیا اور اس کی ذمہ داریاں خود سنبھال لیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ روسی پھر بھی فاقوں

مرے اور جنگ کا جنون بھاپ بن کر ہوا میں اڑ گیا۔ دسمبر 1916ء میں راسپوٹین لبرل نوجوان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کی لاش دریائے نیوا میں برف کے نیچے پائی گئی اور زار ناکام و نامراد محاذ سے واپس آ گیا۔ حکومت ٹوٹ پھوٹ رہی تھی اور ہڑتالوں نے ملک مفلوج کر دیا تھا۔ پیٹرز برگ 8 مارچ 1917ء کے دن لاقانونیت کی لپیٹ میں آ گیا۔ روٹی نہ ملنے کی وجہ سے جگہ جگہ ہنگامے ہو رہے تھے۔ پولیس نے ہجوم پر گولی چلا دی۔ فوجی دستے الگ بغاوت کر رہے تھے۔ پارلیمنٹ نے مداخلت کرنے اور صوبائی حکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ زار بے بسی کے ساتھ اپنے خواب خاک میں ملتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے محل سے نکل جانا چاہا تو اس کے اپنے سپاہیوں نے واپس محل میں جانے کا حکم دیا۔

جرمنی یہ حالات دیکھ کر خوش تھا۔ اس نے لینن کو روس واپس بھیج دیا۔ لوگوں نے اس کا استقبال گرم جوشی سے کیا مگر اس کی اپنی پارٹی حکمران نہیں تھی۔ لینن عارضی طور پر فن لینڈ چلا گیا مگر بھیس بدل کر پھر واپس آیا اور حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنایا۔ نومبر 1917ء میں بالشویکوں نے پیٹروگراڈ کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔

زار کی فیملی پہلے ہی سائبیریا میں جلاوطن تھی۔ اس نے ملک سے چلے جانے کی تجویز ماننے سے اس لیے انکار کر دیا کہ اسے اقتدار دوبارہ حاصل ہونے کی امید تھی۔ اقتدار میں آنے کے بعد بالشویکوں نے زار کے خاندان کو یورال بھیج دیا۔ چونکہ زار کی وفادار فوجیں دور نہیں تھیں اس لیے انہیں مار دینے کا حکم دیا گیا۔ 16 جولائی 1918ء کو زار، زارینہ، چار بیٹیاں اور اس کا تیرہ سالہ بیٹا گولی مار کر ہلاک کر دیے گئے۔ اگلے دن زار کا بھائی، زارینہ کی بہن اور چار بھتیجے بارود سے اڑا دیے گئے۔ ملک کے باقی حصوں کے اندر کمیونسٹوں اور زار کی وفادار فوجوں میں جنگ جاری رہی اور دونوں اطراف سے دردناک مظالم ہوئے۔ تمام روس زار کی اس خودفریبی کی سزا بھگت رہا تھا کہ وہ اپنے باپ کی طرح حکومت کر سکتا ہے۔

اگر انسان تاریخ سے سیکھ سکتا تو پہلی عالمی جنگ سے سیکھ لیتا کہ جنگ بے معنی، بے مقصد اور لاحاصل ہے۔

جرمن جرنیل فان شیلیفین نے ایک پلان تیار کیا تھا جو اتحادیوں کو مہینوں میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا۔ منصوبہ یہ تھا ایک بہت بڑی فوج فرانس بھیجی جائے۔ اتنی بڑی کہ سارا فرانس ہفتوں میں روند دے اور پھر روس پر حملہ کر دے۔ قیصر کی بدنصیبی کہ شیلیفین مر گیا اور نیا جرنیل وان مولیتکے وقت کی اہمیت نہ جان سکا۔ اس نے گھبرا کر اپنی فوج روس اور فرانس پر حملہ

کے لیے دو حصوں میں تقسیم کر دی۔ اس بے تدبیری کا انجام یہ ہوا کہ مارنی دریا کے قریب جا کر جرمنوں کے قدم رک گئے۔ وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ دونوں حریفوں نے آمنے سامنے مورچے کھود لیے اور ایک دوسرے پر حملے کرتے رہے۔ اسی طرح انہوں نے جنگ کے باقی چار برس گزار دیے۔ دونوں طرف سے لاکھوں انسان مارے گئے۔ دونوں دشمن مورچوں میں ڈٹے رہے، کوئی کسی کو پیچھے نہ ہٹا سکا۔ چرچل (دی لارڈ آف ایڈمیرلٹی) نے جمود توڑنے کی کوشش کی۔ اس نے روس کی نئی سپلائی لائن کھولنے کی کوشش میں درہ دانیال سے ترکی پر حملہ کر دیا، لیکن لاتعداد جانوں کے نقصان کے باوجود یہ کوشش بھی ناکام رہی۔

اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ اتنی بڑی دو فوجیں چار برس آمنے سامنے کھڑی لڑتی رہیں، ان میں حملے اور جوابی حملے بھی ہوئے، دونوں جانب سے لاکھوں انسان مارے گئے مگر کچھ کھویا نہ پایا۔ وہی زمین کا ایک ظالم ٹکڑا جو روز اول سے جہاں تھا وہیں رہا، کم ہوا نہ زیادہ۔ جب انگریزوں نے **1915**ء میں شمال مشرقی فرانس پر حملہ کیا تو انہوں نے اپنے اڑھائی لاکھ انسان قربان کیے اور تین میل زمین حاصل کی۔ جب جرمنوں نے **1916**ء میں روس پر حملہ کیا تو دونوں طرف سے بیس لاکھ انسان جنگ میں شریک ہوئے، جن میں سے آدھے مارے گئے۔ روس کھنڈر بن گیا مگر جرمن اس پر قبضہ نہ کر سکے۔

پھر کیوں لڑتے رہے؟ کیوں ان کے لیڈروں نے سیز فائر نہیں کیا؟ کیوں امن مذاکرات نہیں کیے؟ جبکہ شلیفین پلان کی ناکامی نے قیصر کے دوسرے عزائم پر پانی پھیر دیا تھا، اس کا ہر قدم بے جان اور بے مقصد بنا دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ دونوں طرف جذبات کی حکمرانی تھی، انسانوں کا زیاں قومی وقار کی سربلندی سے پورا کرنا تھا۔ یہ اس وقت ہوا جب جرمنوں سے ایک اور ناقابل یقین غلطی ہوئی کہ انہوں نے برطانوی سپلائی لائن کاٹنے کے لیے امریکی جہاز ڈبونے شروع کیے۔ امریکا نے جنگ سے دور رہنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا مگر جب جرمنی کی یو۔ بوٹ نے ان کے جہاز ڈبوئے تو ان کی قومی غیرت نے انتقام کا تقاضا کیا۔ جس کے بعد جرمنی کے سیکرٹری کا ایک غالباً جعلی ٹیلی گرام منظر عام پر آیا کہ اگر جرمنی جنگ جیت گیا تو امریکی زمین کا ایک بڑا حصہ میکسیکو کے حوالے کیا جائے گا۔ اس سے نفرت اور انتقام کے لیے زمین ہموار ہو گئی اور **1917**ء میں امریکا جنگ میں شریک ہو گیا۔ اس کی شرکت نے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ قیصر بے بس ہو گیا، جب اس کے جنرلوں نے بتایا کہ ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

یورپ تباہ حال تھا۔ اس کے آدھے نوجوان مارے گئے تھے۔ سینکڑوں شہر تباہ ہو چکے تھے۔ تین بڑے شاہی خاندان برباد ہو گئے تھے۔ روس میں رومانوف، آسٹریا میں ہاسبرگ اور جرمنی میں ہن زولرنز۔ قیصر مجبوراً تخت و تاج چھوڑ کر ہالینڈ چلا گیا، جہاں وہ 1942ء میں فوت ہوا۔ دنیا نے جب نقصانات کا اندازہ کیا تو پتہ چلا کہ شاید بنی نوع انسان کی تاریخ کا یہ سب سے بھیانک لمحہ ہے۔ جب سے تہذیب کا آغاز عراق سے ہوا انسان ہمیشہ اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ زمین کے معاملہ میں دست و گریباں ہو رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں بنیادی طور پر کوئی بہت بڑی خرابی ہے۔ زمین کی حیوانی ضرورت تہذیب سے ہم آہنگ نہیں۔ جانور زمین کے تنازعہ میں صرف غراتے ہیں مگر فوجیں غرانے کو کافی نہیں سمجھتیں۔ جنگ کا مسئلہ بنیادی طور پر زمین کا مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ شاید اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک کہ دنیا سے سلطنتیں بنانے والے کا نام ونشان نہ ختم ہو جائے۔

امریکی صدر اُڈرو وِلسن یہ بات جانتا تھا، اس لیے اس نے مستقبل کے سرحدی تنازعات سے نمٹنے کے لیے لیگ آف نیشنز کا قیام ضروری سمجھا۔ یورپ نے سکھ کا سانس لیا مگر فاتحین کو یقین نہیں آیا کہ یہ سرحدی تنازعے، یہ زمین کیونکر جنگ عظیم اور درحقیقت تاریخ کی تمام جنگوں کی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ انہوں نے یورپ کا نقشہ اس طرح بدلنا شروع کیا کہ وہ چند برسوں کے اندر ایک نئی جنگ کی ضمانت بن جائے۔

مافیا

جنگ کسی معاشرہ کی جارحیت کا دانستہ اظہار ہے۔ بدقسمتی سے جن بوتل سے نکالنا آسان ہے مگر واپس بھیجنا مشکل ہے۔ ہر جنگ کے بعد جرائم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے پہلی عالمی جنگ کے بعد جرائم کی جو لہر آئی اُس کا سبب بھی جنگ تھی۔ ایک لحاظ سے یہ گزشتہ تمام مثالوں سے مختلف تھی کہ ختم ہونے کے بجائے لحہ بہ لحہ زور پکڑتی گئی اور بوریگا بورجیا کے زمانہ سے بڑھ کر کرپشن کا ذریعہ بن گئی۔

یونانی سمندری قزاقوں کے دَور سے منظم جرم تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ مگر قانون کی قوتوں کے سامنے مجرم بے بس رہے ہیں۔ مجرموں میں ان جیسی مہارت تھی نہ ان کی طرح دور تک دیکھ سکتے تھے۔ اسی لیے پومپئی نے قزاقوں کو ہفتوں میں ختم کر دیا تھا۔ اس لیے شیکسپیئر اور جوناتھن وائلڈ کے لندن میں منظم جرم زور نہیں پکڑ سکا کہ تشدد سے شہری مشتعل ہوتے ہیں اور حکومت کارروائی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جن ملکوں میں ڈاکہ زنی زندگی کی مانی ہوئی حقیقت سمجھی جاتی ہے وہاں اس کا وجود اکثر شہریوں کی مرضی اور امداد سے ہوتا ہے۔ مگر صرف انیسویں صدی کے سسلی اور یونان جیسی جگھوں میں یہ ہوتا ہے جہاں لوگ حکومت سے نفرت کرتے ہیں اور ڈاکوؤں کو ''آزادی کے مجاہد'' سمجھتے ہیں۔ پھر بھی تشدد کا نتیجہ خطرناک ہوتا ہے۔ **1870**ء میں بدنام زمانہ اور اینکس بادرز کے ڈاکوؤں نے ممتاز سیاحوں کی پارٹی مراتھن کے قریب پکڑی اور پچاس ہزار پونڈ تاوان یا عام معافی طلب کی۔ (وہ ڈاکہ زنی کے ذریعہ بہت مال دار ہو گئے اور معاشرہ میں واپسی چاہتے تھے) یونانی حکومت نے صاف انکار کر دیا اور سپاہیوں نے ڈاکوؤں کی پناہ گاہوں پر حملہ کر دیا۔ ڈاکوؤں نے ایک گاؤں ڈیلیسی کی طرف بھاگتے ہوئے چار یرغمالی قتل کر دیے۔ سات ڈاکو قتل اور چھ ڈاکو زندہ گرفتار ہوئے۔

برطانوی حکومت نے یونان پر حملہ کی دھمکی دی۔ روس نے جوابی دھمکی دی کہ جنگ میں وہ یونانیوں کا ساتھ دے گا۔ اکثر ایسے ڈاکو گرفتار ہو گئے۔ جو بھاگ گئے تھے یا جو بچ گئے وہ مار دیے گئے اور یونان میں اغوا ایک قابل قبول رسم نہ رہی۔

اٹلی ایک اور ملک تھا جہاں بیرونی حکمرانی اور سیاسی بے چینی نے منظّم جرم قابل عزت بنا دیا۔ وسطی زمانہ میں سسلی کے اندر ''مافیا'' کے معنی ہر غیر ملکی چیز سے نفرت تھی۔ صدیاں گزرنے کے بعد اس سے مراد وہ مجرم تھے جو غیر ملکی حکام کی مزاحمت کرتے تھے۔ اطالویوں کی یہ ذہنیت بھی لاقانونیت بڑھانے کا سبب بنی کہ ایک بار آپس میں خونخوار لڑائیاں شروع ہو جاتیں تو پھر نسل در نسل ان کا سلسلہ جاری رہتا۔ مگر عجیب بات ہے کہ 1860ء میں اٹلی کے ساتھ جیری بالدی کے اتحاد نے مافیا کو بڑھتے جرائم پیشہ گروہوں میں بدل دیا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ جب جیری بالدی نے سسلی پر حملہ کیا تو مافیا نے اپنی خدمات اسے پیش کیں۔ (کیونکہ مافیا افورڈ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ہارنے والوں کا ساتھ دے) جس سے اسے ایک طرح کی اہمیت مل گئی۔ اس کے علاوہ مافیا نے کرائے کے غنڈوں کی ایک فوج بنا رکھی تھی جسے حکومت اور زمیندار کسانوں کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ اور اب جبکہ اٹلی بالآخر اٹلی والوں کا ہو گیا تھا، مافیا نے سیاسی جھگڑوں سے توجہ ہٹا کر لوٹ مار اور بھتے کا رخ کر لیا تھا۔ مجرم اب سماج کا ٹھکرایا ہوا دور پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا مجرم نہیں تھا۔ اب اسے معاشرہ میں عزت اور طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ 1860ء کے آخر تک مافیا خود ایک معاشرہ بن گیا تھا جس کے اپنے قواعد و ضوابط تھے۔ (امریکا کے مغربی ساحل پر چینی 'ٹونگز' بھی یہی کچھ کر رہے تھے) دراصل اس 'مجرم بھائی چارہ' کا مقصد خود خفیہ مقامی حکومت بننا تھا۔ وہ چھوٹے زمینداروں سے غنڈہ ٹیکس وصول کرتے اور جو انکار کرتا اس کی جائداد تباہ کر دیتے۔ بعد میں غنڈہ ٹیکس کا نام انہوں نے 'محافظ ٹیکس' رکھ دیا تھا۔ ججوں اور پولیس کو بھی رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا کہ مجرموں کو سزا نہ دیں۔ انہوں نے ایک قانون 'اومریٹا' بنا لیا تھا کہ لوگ چپ رہیں اور مجرموں کے خلاف حکومت سے کوئی بات نہ کریں، چاہے قاتل کی گولی سے مر ہی کیوں نہ رہے ہوں۔

مافیا لیڈر جلد ہی سمجھ گئے کہ جرم روزی کمانے کا سب سے اچھا طریقہ نہیں۔ انہوں نے 'قبضہ گروپ' بنا لیے، جہاں زمین کا مالک زمین پر نہ ہوتا وہ زمین یا جائداد اپنی مرضی کے کرائے پر کسانوں کو دیتے۔ 1890ء کے آخری عشرہ تک سسلی میں ایک نئی ارسٹوکریسی (طبقۂ امرا) پیدا ہو چکی تھی جسے ہم 'جرائم پیشہ ارسٹوکریسی' کہہ سکتے ہیں، اور جس کا ایک لیڈر

فیرو نیک دل اور مہربان سمجھا جاتا تھا۔

فیرو ہی مافیا کو امریکا لے گیا تھا۔ اطالوی آبادکار اکثر نیو اورلینز میں رہنا چاہتے تھے۔ اس کی آب و ہوا بہت حد تک جنوبی اٹلی جیسی تھی۔ سسلی کے بدنام ترین ڈاکو سپز یٹو نے 1880ء میں یہاں آباد ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ سپز یٹو نے کہا تھا کہ ایک مافیا سو (مافیا کا ممبر) کو بھی تشدد میں احتیاط کرنی چاہیے۔ نومبر 1876ء میں اس کے گینگ نے ایک انگریز جان فورسٹر روز کو اغوا کر لیا اور رہائی کے لیے پانچ ہزار پونڈ تاوان طلب کیا۔ اس کی بیوی نے تاوان دینے سے انکار کر دیا تو سپز یٹو نے اس کے شوہر کا کان کاٹ کر اسے بھیج دیا۔ ایک ہفتہ بعد دوسرا کان بھی اسے مل گیا۔ اس کے ساتھ پیغام بھی بھیجا کہ اگر تاوان ادا نہ کیا تو اگلی دفعہ ناک بھیجی جائے گی۔ بیوی نے تاوان ادا کر دیا مگر ڈاٸیلسی کے قتل کی طرح یہ واقعہ بھی انٹرنیشنل سکینڈل بن گیا۔ اٹلی کی حکومت نے ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے اپنے آدمی بھیجے تو ایک لڑائی میں نو ڈاکو مارے گئے اور چودہ گرفتار کر لیے گئے۔ سپز یٹو رشوت دے کر جیل سے نکل گیا مگر اس فیصلہ کر لیا کہ سسلی اس کے رہنے کی جگہ نہیں اور نیویارک روانہ ہو گیا۔ اطالوی آبادکاروں کی کثرت سے شمال کے مقابلہ میں نیو اورلینز مزید پُرکشش ہو گیا تھا مگر سپز یٹو نیو اورلینز کی بے ہنگم لاقانونیت سے بددل تھا۔ اس نے مافیا کے اپنے قوانین نافذ کرنا شروع کر دیے۔ وہ یقیناً امریکا کا پہلا گاڈفادر بن جاتا اگر سسلی کے حکام اس کی گرفتاری پر اصرار نہ کرتے۔ جولائی 1881ء میں دو پولیس آفیسروں مائل اور ہینسی نے اسے گرفتار کیا۔ گرفتاری اس کے دوست ٹونی کی غداری کے سبب ہوئی۔ چند روز بعد ٹونی کا مقابلہ سپز یٹو کے دوست ارڈیٹو سے ہوا۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں، ارڈیٹو زخمی ہوا اور ٹونی ہلاک ہو گیا۔ یہ غالباً امریکا کی پہلی مافیا ہلاکت تھی۔ ارڈیٹو گرفتار ہوا اور اسے قتل کے جرم میں سزا ہوئی۔ سپز یٹو بھی سسلی کی جیل میں واپس آ گیا۔ مگر مافیا کو امریکا سے کوئی نہ نکال سکا۔

سپز یٹو کے جانے کے بعد (اس نے باقی زندگی قید میں گزاری تھی) نیو اورلینز کی مافیا برادری یا کم از کم اس کے اطالوی حصہ کو دو بھائی چارلس اور ٹونی منظم کرتے تھے۔ دونوں سیاسی طاقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ نیو اورلینز کی ایک نہایت بااثر فیملی کے سربراہ تین بھائی پرووِنزانو تھے۔ جہازران کمپنیوں کے ساتھ معاہدوں کی بنا پر انہیں جہازوں سے پھل اتارنے اور رکھنے کے سلسلہ میں اجارہ داری حاصل تھی۔ انہوں نے کئی سو اطالوی مزدور ملازم رکھے تھے جنہیں وہ نسبتاً بہتر معاوضہ ادا کرتے تھے۔ 1886ء میں ایک

نئی جہاز ران کمپنی متر نگا بندرگاہ آئی اور پروونزانو کے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا۔ سینہ زوری کی وجہ سے متر نگا کو اپنے حریفوں سے کاروبار چھیننے میں صرف دو سال لگے۔ حریفوں نے بھی بدلہ لینے کا ارادہ کر لیا۔ 5 مئی 1890ء کو کشتی سے کیلے اتارنے کے بعد متر نگا اور اس کے تین ساتھی فروٹ ویگن میں روانہ ہوئے تو اچانک ایک طرف سے فائر ہوئے اور متر نگا اپنے ساتھیوں سمیت زخمی ہو گیا۔ متر نگا کی ٹانگ کاٹنی پڑی۔

پولیس چیف ہینسی (جس نے نو سال پہلے سپز یٹو کو گرفتار کیا تھا) نے کیس اپنے ہاتھ میں لیا۔ پروونزانو متر نگا کے دوست تھے۔ مگر گواہی کے مطابق حملہ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ چنانچہ ان کے دو بھائی اور تین ملازم گرفتار کر لیے گئے۔ مگر ہینسی جانتا تھا کہ متر نگا بھی جرم میں برابر کا شریک ہے۔ وہ نیواورلینز میں مافیا کی طاقت ختم کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے روم کی پولیس کو سپز یٹو گینگ کے ڈاکوؤں کی تصویروں کے لیے لکھا جن کے متعلق شبہ تھا کہ واردات میں شامل تھے اور ان کا تعلق متر نگا گینگ سے تھا۔ اسے ایک گمنام خط ملا کہ اگر اس نے تصویروں پر اصرار کیا تو مارا جائے گا مگر اس نے پروا نہیں کی۔ پروونزانو مجرم ثابت ہوئے مگر ان کے وکیل نے نظر ثانی کی درخواست دی۔ جو منظور ہو گئی۔ ہینسی نے اعلان کیا کہ وہ پروونزانو کے حق میں گواہی دے گا اور مافیا کے خلاف ثبوت عدالت میں پیش کرے گا۔ (اس کا بھائی مائل مبینہ طور پر مافیا کے ہاتھوں ہوسٹن میں ہلاک ہوا تھا اور ہینسی انتقام چاہتا تھا) 15 اکتوبر 1890ء کی رات ہینسی ایک پولیس کپتان کے ہمراہ گھر آ رہا تھا۔ جب وہ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو اچانک کئی گولیاں چلیں۔ کپتان دوڑ کر واپس لوٹا تو اس کا چیف مر رہا تھا۔ گولی کس نے چلائی؟ 'کتوں نے'، ہینسی نے جواب دیا۔ اور ہسپتال جا کر مر گیا۔

نیواورلینز میں بے چینی پھیل گئی۔ بعض ممتاز اطالوی خاندانوں نے اخبارات کے ذریعہ اس ہلاکت سے اپنی لاتعلقی کا یقین دلایا۔ میئر شیکسپیئر نے معاملہ اپنے ہاتھ لیا، پولیس سے کہا کہ ضروری ہو تو ہر اطالوی کو گرفتار کرو۔ انیس اٹالین گرفتار کیے گئے۔ ان میں ایک چودہ سالہ لڑکا بھی تھا جس پر شبہ تھا کہ اس نے ہینسی کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ فروری 1891ء میں ان کا مقدمہ شروع ہوا۔ ایک ہیوبرٹ نیلی کے سوا تمام لکھنے والے متفق تھے کہ اطالویوں کے خلاف مکمل ثبوت موجود ہے۔ وکیل صفائی ڈومینک ججوں کو رشوت دینے اور گواہوں کو دھمکانے میں بدنام تھا۔ ایک ملزم نے اعتراف کیا کہ وہ اس میٹنگ میں موجود تھا جہاں ہینسی

کے قتل کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس کے باوجود جیوری نے ملزموں کے حق میں فیصلہ دیا۔ نیواورلینز کے امریکیوں میں بے بسی تھی اور غم وغصہ تھا۔ اور اطالوی خوشیاں منا رہے تھے۔ ملزموں کی حفاظت کے خیال سے انہیں جیل واپس لے جایا گیا مگر اجازت تھی کہ جہاں چاہیں گھومیں پھریں۔ وہ رات انہوں نے چیانٹی اور سپیگھٹی کھا پی کر منائی۔ دو روز بعد مشتعل ہجوم نے جیل پر حملہ کیا اور دیکھا کہ وہاں چودہ میں سے صرف گیارہ ملزم موجود تھے۔ اکثر مار مار کر ہلاک کر دیے گئے تھے۔ ایک کو پھانسی دی گئی۔ وہ قتل کے مجرم تھے یا نہیں تھے مگر ان کے انجام سے مافیا کی سرگرمیوں میں کمی آ گئی۔

مقدمہ کی وجہ سے امریکیوں کو پتہ چل گیا کہ مافیا نے ڈرا دھمکا کر غنڈہ ٹیکس وصول کرنے کے اطالوی طریقے اپنا لیے ہیں۔ اب جبکہ نیواورلینز میں مافیا کی طاقت عارضی طور پر ٹوٹ گئی تھی نیواورلینز کے اطالوی نژاد تاجر مانتے تھے کہ دھمکا کر ان سے حفاظتی ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ اس عرصہ میں امریکا کے اندر اطالوی جرائم کا نیٹ ورک پھیلتا گیا۔ 1930ء میں اس نے ایک نیا نام 'بلیک ہینڈ' رکھ لیا۔ اس نام کا پتہ اس وقت چلا جب ایک ٹھیکہ دار نکولا کا پیلو نے پولیس کو بتایا کہ اسے دھمکی آمیز خط آ رہے ہیں جن پر 'بلیک ہینڈ' کے دستخط ہوتے ہیں۔ وہ پہلے ہی ایک ہزار ڈالر دے چکا تھا۔ مگر درمیان پڑنے والے دوستوں نے بتایا کہ کریمنل دو ہزار اور مانگتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ وہ اسے دیوالیہ کرنا چاہتے ہیں، کا پیلو نے پولیس کو خبر کر دی۔ پولیس کی تفتیش سے ظاہر ہوا کہ دوست بھی شریک جرم تھے۔

4 اپریل 1903ء میں مین ہٹن میں ویران جگہ پر ایک لاش ملی۔ جو کافی حد تک خراب ہو چکی تھی اور جس پر کسی تیز دھار آلہ کے سترہ زخم تھے۔ نیو یارک کے سب سے بڑے سراغ رساں جوزف پیٹروسینو نے بالآخر لاش پہچان لی جو مڈونیا نامی جرائم پیشہ کی تھی اور ٹامس پیٹو (جسے پیٹو بیل بھی کہتے تھے) کی دکان سے ملی تھی۔ پیٹو اور مڈونیا دونوں اطالوی جعل سازوں کے ایک گروہ میں شامل تھے۔ ان کا کام جعلی کرنسی تقسیم کرنا تھا۔ مڈونیا آمدنی میں سے اپنے حصہ سے زیادہ رقم لے جاتا تھا اس لیے اسے قتل کر کے لاش ایسی جگہ رکھی گئی کہ گینگ کے دوسرے ممبر خبردار ہوں۔ واردات کی نوعیت ایسی تھی کہ مقدمہ بہت مشہور ہوا۔ مگر جب مقدمہ ناکام ہوا اور جرم ثابت نہ ہوا تو لوگ بہت مایوس ہوئے۔ جرم کے گواہ یکایک سب کچھ بھول گئے۔ مقتول کی بیوی نے بھی گواہی دینے سے انکار کر دیا۔

یہ مسئلہ اس لیے پیدا ہوا کہ اٹلی میں جرائم پیشہ گینگ اس لیے برداشت لیے گئے کہ

وہ حکمرانوں کے مخالف تھے اور لوگ حکمرانوں سے بے زار تھے۔ امریکا میں اس انارکزم کی خوب پیوند کاری ہوئی، جہاں سفید فام پروٹسٹنٹ اوروں کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ اور امریکا جیسی نئے امکانات کی دنیا میں آ کر کئی مفلس اطالوی خوشحال ہو گئے تھے اور ان کے دلوں میں حسد پیدا کر دیا تھا جو غریب رہ گئے تھے۔ غنڈہ گردی لوٹنے کا آسان اور محفوظ طریقہ تھا۔ بچہ اغوا کرنے یا بارود سے گھر اڑا دینے کی دھمکی اکثر اطالویوں کو یہ سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ روپیہ ذہنی سکون کی معمولی قیمت ہے۔ مجرم بھی اس غنڈہ گردی سے محفوظ نہیں تھے۔ ایک جعل ساز گینگ کے سرغنہ (جو لیو بھیڑیئے کے نام سے جانا جاتا تھا) نے بتایا کہ اپنی 'حفاظت' کے لیے دس ہزار ڈالر برسوں ادا کرتا رہا کیونکہ اپنے مجرمانہ کرتوتوں کی وجہ سے ضرورت پڑنے پر بھی وہ پولیس کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔

1907ء میں نیو اورلینز مافیا کا ذکر پھر اخبارات میں تھا۔ سات سالہ والٹر ایک رئیس زادہ آئس کریم کی خاطر ایک شخص کے ساتھ چلا گیا۔ چند گھنٹوں بعد بذریعہ خط اس کے باپ سے چھ ہزار ڈالر تاوان طلب کیا گیا۔ اس اطالوی باپ نے سوچا کہ 'بلیک ہینڈ' کو توڑنے کا یہی وقت ہے۔ اس نے ایک کمیٹی بنائی، کئی گرفتاریاں بھی ہوئیں مگر گرفتار ہونے والے شہادت نہ ہونے کی وجہ سے رہا ہو گئے۔ پھر ایک اطالوی تاجر نے پولیس کو بتایا کہ ایک خط کے ذریعہ اس سے دو ہزار پونڈ بھتہ طلب کیا گیا ہے اور خط یقیناً ٹونی نے لکھا ہے۔ پولیس نے خط والٹر والے خط سے ملا کر دیکھا تو دونوں کی لکھائی ایک جیسی تھی۔ ٹونی کا بھائی فرینک گرفتار کیا گیا تو مان گیا کہ ٹونی اغوا کی وارداتوں میں ملوث ہے۔ پولیس نے کمپیانو نامی ایک شخص کو ہاتھ باندھ کر درخت پر لٹکا دیا۔ اس کی گردن میں پھندا ڈال کر خوب زور سے کسا تو وہ مجبور ہو کر پولیس کو ایسی جگہ لے گیا جہاں بچہ کی لاش کمبل میں لپٹی پانی میں پڑی تھی۔ اس نے بتایا کہ بچہ رو رہا تھا اور ایک شخص اس کا گلا دبا رہا تھا (دراصل والٹر کو کلہاڑا مار کر قتل کیا گیا تھا)

اب پتہ چلا کہ کمپیانو نے علاقہ بھر میں خوف پھیلا رکھا تھا۔ اس کی گرفتاری تک کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس کے متعلق بات کرتا۔ کمپیانو کی بیوی سمیت چھ افراد پر مقدمہ چلایا گیا۔ ٹونی اور تین دوسرے ملزم فرار ہو گئے۔ دو بھائیوں کو سزائے موت ہوئی۔ دوسرے مقدمہ میں باقی چار افراد مجرم ثابت ہوئے مگر انہیں سزائے موت نہیں دی گئی۔ ایک موقع پر لگتا تھا کہ مشتعل ہجوم ان کی تکا بوٹی کر دے گا مگر کمشنر نے ملیشیا کو بلایا اور خطرہ ٹل گیا۔ نیو اورلینز میں مافیا کی طاقت ختم ہو گئی تھی۔

ان ابتدائی دنوں میں مافیا کے خلاف لڑائی میں نیویارک بالخصوص کامیاب رہا۔ اس کی بڑی وجہ جوزف پیٹرو کی بہادری تھی۔ وہ سراغ رساں جس نے پیٹرو 'بیل' گرفتار کیا تھا۔ جب سنگر کروسو کو 'بلیک ہینڈ' کا دھمکی آمیز خط ملا، پیٹرو نے اس کا پتہ چلا لیا۔ اس کے دونوں بازو توڑ دیئے اور ایک کشتی میں ڈال کر سسلی واپس بھیج دیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ 'بلیک ہینڈ' کا الفانو (جس نے نیپلز کا ایک پورا خاندان قتل کیا تھا) نیویارک میں ہے تو پیٹرو سیدھا اس کے کمرے میں چلا گیا اور دو مسلح پہرے داروں سمیت الفانو کو گرفتار کر کے پولیس سٹیشن لے آیا۔ پیٹرو نے اپنے کمشنر بنگھم کو آمادہ کیا کہ وہ اسے سسلی بھیجے تاکہ اٹلی کی پولیس فائلوں سے بلیک ہینڈ گینگ کے متعلق معلومات فراہم کر سکے۔ پالرمو میں اس نے درجنوں ایسے اشخاص کی فائلیں دیکھیں جن کے متعلق وہ جانتا تھا کہ امریکا میں ہیں۔ مگر سسلی میں مافیا کے ایک سرغنہ ڈون نے اسے ایک شان دار ہوٹل میں دعوت دی اور پیٹرو نے جلد بازی میں دعوت قبول کر لی۔ جب ڈون نے جان لیا کہ پیٹرو کی معلومات خطرناک حد تک زیادہ ہیں تو اسے مار ڈالنے کا حکم دیا۔ پیٹرو سے کہا گیا کہ 12 مارچ 1909ء کو جیری بالدی کے مجسمہ کے پاس ایک مخبر سے ملنے آئے۔ رات کا وقت ملاقات کے لیے دیا گیا۔ رات کی تاریکی میں گولیاں چلیں اور پیٹرو کا جسم چیرتی ہوئی نکل گئیں۔

پیٹرو کے قتل سے امریکا میں سخت مایوسی پھیل گئی۔ لوگوں کو مافیا کی طاقت کا اندازہ ہو گیا۔ غریب مگر ذہین نوجوان سمجھنے لگے کہ جمہوری معاشرے میں محنت سے زیادہ جرم ترقی میں مددگار ہے۔ بعض نے سوچا کہ معمولی جرم کرنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اصل کامیابی پولیس افسروں اور سیاستدانوں کے ساتھ مل کر کرپشن میں ہے۔

1919ء تک نیویارک امریکا کا کریمنل دارالحکومت تھا۔ دوسرے بڑے شہروں میں مافیا ایک زیرزمین جرائم پیشہ تنظیم کی صورت میں موجود تھی۔ صرف نیویارک میں اسے ایک حد تک سیاسی اہمیت حاصل تھی اور نیویارک باقی امریکا، بالخصوص دیہات میں کرپشن کا گھر سمجھا جاتا تھا۔ امریکا مذہبی ملک تھا اور اس میں قانون و امن کی گرفت مضبوط تھی۔ مگر پھر امریکا کے آئین پسند شہریوں نے ڈاکوؤں کو اپنے جال پھیلانے کا اختیار (1920ء) میں دیا۔ اس مینڈیٹ کا نام Volstead Act تھا۔

شراب پر پابندی کوئی فوری مذہبی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کا آغاز 1840ء کی ابتدا سے ہو چکا تھا۔ یہ مغرب کے میدانوں اور سرحدی شہروں سے ابھرا تھا۔ اکثر چھوٹے شہروں میں

سیلان (ہوٹل) ایک جھونپڑا سا تھا جو سستی وہسکی اور جن بیچتا تھا۔ پینے والے انہیں پی پی کر بے ہوش ہو جاتے کہ شاید ایک مہینہ تک شہر واپس نہ ہو۔ آس پاس بھٹکتی عورتیں اکثر کمزور اور بیمار ہوتیں۔ جب برائی اتنی گھناؤنی ہوتی تو شراب دشمن عناصر آسانی کے ساتھ نیکوں کو قائل کر لیتے کہ اس مسئلہ کا حل مکمل پابندی ہے۔ اس میں بوریت اور جنسی مایوسی کا بھی ایک کردار تھا۔ کیری نیشن جو کنساس کے سیلان کلہاڑا لے کر توڑ پھوڑ دیتا تھا بار پر 'غیر اخلاقی' تصویریں دیکھ کر اور مشتعل ہو جاتا۔ امریکنوں میں منظم جرم کے بڑھنے کا احساس پیدا ہوا تو پابندی کے حامیوں نے اسے پابندی کے حق میں دلیل کی طرح استعمال کیا کہ الکوحل پر پابندی عائد ہو تو اس سے جڑی ہوئی برائیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔

مگر اس زاہدانہ جارحیت کے باوجود، اگر پہلی عالمی جنگ نہ ہوتی تو امریکا یہ ہلاکت خیز قدم کبھی نہ اٹھاتا۔ جب کئی ملکوں نے الکوحل بنانے پر پابندی محض اس لیے لگا دی کہ اناج خوراک کے لیے محفوظ رہے۔ اس سے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا کیونکہ امریکی قیصر کو شکست دینے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ کانگرس کی ''خشک مزاج'' لابی نے کامیابی دہلیز پر دیکھی تو اٹھارویں ترمیم (الکوحل پر پابندی) کی حمایت کر دی۔ سینیٹر اینڈریو جے والسٹیڈ نے اس کے قانونی نفاذ کی تجویز پیش کی جو بڑی آسانی سے منظور ہو گئی۔

کانگریس نے امریکا میں وہی حالات پیدا کر دیے تھے جن کی وجہ سے اٹلی میں لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ حکومت اچانک لوگوں کی دشمن بن گئی۔ امریکی ویسے بھی سیاستدانوں سے بدگمان تھے۔ اب ول راجرز نے صورت حال پر اس طرح تبصرہ کیا، ''کانگرس کے ساتھ جب وہ کوئی مذاق کرتے ہیں وہ قانون بن جاتا ہے اور جب قانون بناتے ہیں تو مذاق بن جاتا ہے۔'' اس بار کانگرس نے واقعی برا مذاق کیا تھا۔ جو ڈاکو نئے قانون کا دشمن ہوا وہ پبلک کا دوست اور مربی بن گیا۔ دس برس کی ہلاکتوں اور تشدد کے بعد جب امریکا نے اپنی غلطی محسوس کی۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ منظم جرم امریکا میں اپنے قدم جما چکا تھا۔

شکاگو میں 'بگ جم' کلاسیمو نے (جسے اس وجہ سے کہ جیب میں ڈائمنڈ لیے پھرتا تھا، 'ڈائمنڈ جم' بھی کہا جاتا تھا) پہلے ہی بڑے پیمانے پر شراب کی سمگلنگ کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھی ٹوریو کی مدد سے بدکاری کے اڈے بھی چلاتا تھا۔ ٹوریو چھوٹے قد کا خوش لباس اور نرمی سے بات کرنے والا ذہین شخص تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تشدد کرنے والے کو تشدد کا نشانہ بھی بننا ہوتا ہے۔ اگر ڈاکوؤں میں جھگڑا ہو جاتا تو وہ قتل پر ڈپلومیسی کو ترجیح دیتا تھا۔ جب پابندی

شروع ہوئی تو اس کی عمر تقریباً پینتیس برس اور کلوسیمو کی پچاس برس تھی۔ پچاس کی عمر میں کلوسیمو اس سنہری موقع سے کیا فائدہ اٹھاتا جو پابندی کی وجہ سے اس کی جیب میں تھا۔ مگر ٹوریو بے تاب تھا۔ 11 مئی 1920ء کو وہ اچانک کلوسیمو کی سلطنت کا وارث بن گیا جب اس کا مالک پراسرار طریقہ سے مارا گیا۔ افواہ گرم تھی کہ قاتل فرینکی ییل کو دس ہزار ڈالر، قتل کا معاوضہ ٹوریو نے ادا کیا تھا۔

کلوسیمو کا جنازہ بہت بڑا تھا کم از کم پانچ ہزار افراد اس میں شریک ہوئے۔ اسے دفناتے ہی ٹوریو نے شکاگو میں جرائم کی تنظیم خود سنبھال لی۔ کئی گروپ تھے جو لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے رہتے تھے، چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا ان کے علاقہ میں واردات نہ کرے۔ اس نے تمام گروپ جمع کیے کہ آپس میں امن سے رہیں اور ایک دوسرے کے علاقہ کا احترام کریں۔ لوٹنے کے لیے بہت مال ہے۔ جب تمام گروپ تعاون پر آمادہ ہو گئے یا کم از کم اشتعال انگیزی سے باز آنے کا وعدہ کیا تو ٹوریو نے کلیسمو کی سلطنت وسیع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے کک کاؤنٹی (جو اسے الاٹ کی گئی تھی) پر برلب سڑک قحبہ خانے کھولنے کے لیے جگہ تلاش کرنا شروع کی۔ اس نے پولیس اور مقامی افسروں کو رشوت دے کر اس پر راضی کر لیا۔ ٹوریو دھمکیوں اور تشدد سے گریز کرتا تھا اور اپنا کام ترغیب اور ترکیب کے ذریعے نکال لیتا تھا۔ شکاگو کے اکثر بارسوخ تاجر اور سیاست دان اس کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ ٹوریو ایک ہفتہ میں اتنا کما لیتا تھا جتنا کہ کلیسمو ایک سال میں کماتا تھا۔

عام مجرم اسے حسد کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہارورڈ نامی ایک شخص جس نے بوٹ لیگنگ (ایسی جگہ شراب بیچنا جہاں اس پر پابندی ہو) بزنس میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا، شراب کا ایک ٹرک روک کر ڈرائیور کو اس کے گھر بھیج دیا۔ اسے ہائی جیکنگ کہتے تھے۔ جب ٹوریو کے دو ٹرک اس طرح لاپتہ ہو گئے تو وہ تشدد کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ 8 مئی 1924ء کو ہارورڈ ساؤتھ وباش ایونیو میں اپنے شناساؤں کے سامنے اپنی بہادری کی ڈینگیں مار رہا تھا کہ ایک ہٹا کٹا اطالوی اندر آیا اور ہیلو ہارورڈ کہتے ہوئے اس کے سر میں چھ گولیاں اتار دیں۔ اگلی صبح ٹوریو کے ایک نائب کیپون کی تصویر اخبارات میں شائع ہوئی جو پولیس کو تفتیش کے لیے مطلوب تھا۔

1924ء میں کیپون چوبیس برس کا تھا۔ ٹوریو سے اس کی ملاقات نیویارک میں ہوئی تھی اور ہمیشہ وہ اسے اپنا ہیرو سمجھتا تھا۔ 1918ء میں جب کیپون انیس برس کا تھا تو ٹوریو

نے اسے شکاگو بلا لیا کہ کلیسمو کے کیفے میں پچھتر ڈالر فی ہفتہ معاوضہ پر کام کرے۔ اسے باؤنسر کے طور پر بس یہ کرنا تھا کہ ناپسندیدہ افراد کو کیفے کے قریب نہ پھٹکنے دے۔ عام خیال تھا کہ کلیسمو اسی کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔1922ء تک وہ بدکاری کے اڈوں سے دو ہزار ڈالر ہفتہ وار کما رہا تھا۔

جب پولیس اسے تلاش کر رہی تھی تو کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا تھا۔اس عرصہ میں قتل کے عینی شاہد شہادت سے منحرف ہونا شروع ہو گئے۔ ان میں سے ایک تو بالکل لاپتہ ہو گیا۔ ایک مہینہ بعد کیپون یہ کہتا ہوا پولیس سٹیشن آ گیا کہ شاید پولیس اس سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے۔مگر پولیس شہادت نہ ملنے کی وجہ سے مقدمہ ختم کرنے پر مجبور ہوگئی۔

1924ء تک ٹوریو، کیپون گینگ کی لڑائی بنیون کے ساتھ بھی ہو گئی۔ بنیون نے جنوبی علاقہ میں اپنا کام پھیلا رکھا تھا۔بنیون کبھی گایا کرتا تھا مگر بدکاری کے اڈوں کا مخالف تھا۔ جہاں بھی ممکن ہوا اپنے حصہ سے زیادہ سمیٹنے کی کوشش کرتا تھا۔پانچ لاکھ ڈالر میں اپنی بیئر کی فیکٹری ٹوریو کے ہاتھ بیچنا اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا تھا۔ٹوریو جب فیکٹری دیکھنے گیا تو اس نے پولیس کو خبر کر دی۔ٹوریو کو گرفتار کر لیا گیا۔

8 نومبر 1924ء کو تین بدمعاش نارتھ سٹیٹ سٹریٹ میں واقع بنیون کی فلاور شاپ کے اندر آئے۔ بنیون کو ان پر کوئی شک نہیں ہوا۔وہ اطمینان سے اپنے پھول بیچتا رہا۔ اس نے اپنا ہاتھ فرینکی ییل کی طرف بڑھایا جو نیویارک سے آیا تھا۔ییل اس کا ہاتھ تھامے رہا جبکہ دوسرے دو بدمعاشوں نے بنیون پر اپنے ریوالور خالی کر دیے۔ یہ جنازہ بھی بڑی شان و شوکت سے اٹھا۔بنیون کی لاش خالص چاندی کے تابوت میں رکھی گئی جس کی مالیت دس ہزار ڈالر تھی۔ٹوریو نے اس کی آخری رسوم کے لیے پھول نذر کیے۔

بنیون کے دوست ہیمی لوئیس نے بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ چند روز بعد کیپون ایک ریسٹورنٹ میں اس کے مالک ٹونی یونانی سے باتیں کر رہا تھا جو اس کا قریبی دوست تھا۔ چند گاہک آئے تو ٹونی انہیں ملنے اٹھا مگر پھر کبھی واپس نہ آیا۔ دوسرے دن اس کی لاش ملی۔ کہتے ہیں کہ کیپون یہ خبر سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ جنوری میں وہ اپنی گاڑی سے نکلتے ہوئے موت سے بال بال بچا۔ بارہ روز بعد ٹوریو اور اس کی بیوی گھر کے اندر داخل ہو رہے تھے کہ ان پر سب مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ڈرائیور زخمی ہو گیا۔ٹوریو زمین پر الٹا لیٹ گیا اور پھر اٹھ کر گھر کی طرف بھاگا۔ ایک گولی اس کے بائیں بازو میں لگی۔ پھر ایک شارٹ گن

کے فائر نے اس کا جبڑا توڑ دیا اور پھیپھڑے زخمی کر دیے۔ حملہ آور مار گن اس کے سر میں آخری گولی مار کر اسے ہلاک کرنے کے لیے اس کے سر پر کھڑا تھا کہ گن میں گولیاں ختم ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر گولیاں بھرے ان کے ڈرائیور نے بھاگنے کا سگنل دے دیا۔ ٹوریو نے اپنا کاروبار بیچا اور لاکھوں کا مالک بن کر اٹلی روانہ ہو گیا۔

کیپون کا خوف روز بروز بڑھ رہا تھا، لوئیس بدستور اس کے دوستوں اور ساتھیوں کو گولیاں مروا رہا تھا۔ اس کا اگلا نشانہ بیئر کا بہت بڑا تاجر اینجلو گینا تھا۔ پھر 20 ستمبر 1926ء کو گیارہ کاروں پر مشتمل ایک گروپ کیپون کے علاقہ کے عین مرکز Cieen آیا۔ ہتھرون ریسٹورنٹ سے آگے گیا جہاں وہ لنچ کر رہا تھا اور مشین گن سے باڑھ مار کر ساری جگہ چھلنی کر دی۔ کوئی شخص زخمی نہیں ہوا مگر کیپون پریشان ہو گیا۔ اس نے صلح کی خواہش کی۔ لوئیس اس شرط پر مان گیا کہ بنیون کے قاتل اس کے حوالے کیے جائیں۔ کیپون نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے کچھ آدمی فلاور شاپ کے سامنے کرایہ کے ایک کمرہ میں متعین کر دیے۔ فلاور شاپ ابھی تک لوئیس کا ہیڈ کوارٹر تھی۔ 11 اکتوبر 1926ء کو لوئیس فلاور شاپ میں جا رہا تھا کہ مشین گن سے گولیوں کی بارش ہوئی اور وہ چھلنی ہو کر گر گیا۔

جب بنیون کا دوسرا ساتھی ونسنٹ پولیس نے ہلاک کر دیا تو اس کے گینگ کا ایک ہی ممبر جارج مورن باقی رہ گیا جو کیپون کے لیے خطرہ بن سکتا تھا اور 'بگ' کے نام سے جانا جاتا تھا، کیونکہ غصہ میں پاگل ہو جاتا تھا۔

13 فروری 1929ء کو بیئر کے ایک تاجر نے مورن سے کہا کہ وہ ایک ٹرک شراب بیچنا چاہتا ہے۔ مورن نے اسے ٹرک نارتھ کلارک سٹریٹ کے ایک گیراج میں بھیجنے کو کہا۔ گاڑی دوسرے دن 'سینٹ ویلنٹائن ڈے' پر ٹھیک گیارہ بجے گیراج کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس میں سے پانچ اشخاص نکلے جن میں سے دو پولیس وردی میں تھے۔ چند منٹ بعد وہ گیراج سے باہر آئے تو دو پولیس والوں نے باقی تین اشخاص پر بندوقیں تانی ہوئی تھیں۔ گویا کہ انہیں گرفتار کیا تھا۔ کوئی شخص گیراج میں گیا تو دیکھا کہ سات افراد دیوار کے قریب فرش پر پڑے ہیں۔ پولیس نے انہیں قطار میں کھڑا کر کے مشین گن سے فائر کر دیا تھا۔ پھر انہیں شارٹ گن سے سر میں گولیاں ماری گئیں۔ ان میں زیادہ تر مورن کے آدمی تھے۔ ایک ڈاکٹر بھی تھا جو اس لیے مارا گیا کہ وہ وہاں موجود تھا۔

مورن قتل ہونے سے بچ گیا۔ وہ اس وقت آیا تھا جب گولیاں چل رہی تھیں۔ اس

نے پولیس کے جانے کا انتظار کیا۔ اس نے اصلی پولیس سے کہا کہ اس طریقہ سے ہلاک کرنے والا صرف کیپون ہے۔ مگر کیپون واردات کے وقت فلوریڈا کے پام آئی لینڈ پر نہا رہا تھا۔ مورن 1957ء میں پھیپھڑوں کے سرطان سے مر گیا۔

'سینٹ ویلنٹائن ڈے' کے واقعہ پر پبلک نے سخت احتجاج کیا۔ حکومت نے ارادہ کر لیا کہ کیپون پر ثابت کر دے کہ وہ قانون سے بالا نہیں۔ واردات کے ایک مہینہ بعد 16 مارچ 1929ء کو کیپون اور اس کا ایک ساتھی فلاڈلفیا کے ایک سینما سے جا رہے تھے کہ پولیس نے اسے ناجائز اسلحہ رکھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ فوراً ہی اسے ایک جج کے سامنے پیش کیا گیا جس نے اسے ایک سال سزائے قید دی۔ جس شخص کے پاس پانچ کروڑ ڈالر ہوں اس کے لیے یہ سزا معمولی بات تھی۔ جیل میں رہتے ہوئے اسے کم و بیش ہر چیز میسر تھی۔ مگر جب جیل سے باہر آیا تو دوسرا عشرہ ختم ہو چکا تھا اور کساد بازاری شروع ہو گئی تھی۔ جب ریونیو ڈیپارٹمنٹ نے اسے ٹیکس ادا نہ کرنے کے جرم میں گرفتار کیا تو اس نے چالیس لاکھ ڈالر دے کر جان چھڑانے کی کوشش کی، مگر ٹیکس ڈیپارٹمنٹ نہ مانا اور کیپون کو گیارہ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا اور اَسّی ہزار ڈالر جرمانہ ہوا۔ 1939ء میں پیرول پر رہا ہوا اور 1947ء میں مر گیا۔

اگرچہ 1920ء کے عشرہ میں شکاگو کے جرائم میں کیپون کی بدکرداری کا بڑا حصہ ہے لیکن امریکا کے ہر بڑے شہر کے اپنے غنڈے اور شراب کے اپنے سمگلر تھے۔ نیویارک، بوسٹن، فلاڈلفیا، ڈیٹرائٹ، ارکنساس اور لاس اینجلز وغیرہ میں ان کا جال پھیلا ہوا تھا اور شکاگو کی طرح ہر شہر کے اندر وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور قتل کرتے تھے۔ 1928ء میں مسولینی کے نکالنے پر ٹوریو امریکا واپس آیا اور نیویارک میں اپنا پرانا دھندا شروع کر دیا۔ اس نے جلد ہی ایک اور ناجائز سلطنت قائم کر لی۔ (1936ء میں ٹیکس ادا نہ کرنے کے جرم میں وہ جیل بھی دیکھ چکا تھا) شراب کے نمایاں سمگلر ہالینڈ کا رولمن اور لانسکی تھے جس نے جلدی سے شراب کی ایک اور سلطنت کھڑی کر لی تھی۔ (1936ء میں ٹیکس نہ دینے کی بنا پر وہ بھی جیل جا چکا تھا) نیویارک کا ایک مشہور سمگلر آرنلڈ مشہور قمار باز بھی تھا جو 1923ء میں ہی الکوحل کا ناجائز دھندا کرنے لگا تھا۔ آرنلڈ 1928ء میں تین لاکھ اٹھائیس ہزار ڈالر جوئے کا قرضہ نہ ادا کرنے کی وجہ سے قتل ہوا۔ دسمبر 1929ء میں لکی لوسیانو کو اس کے مخالف ڈائمنڈ کے آدمیوں نے مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ وہ سمجھے کہ مر گیا ہے مگر لکی فوراً ہسپتال لے جایا گیا تو

زندہ بچ گیا۔ اس کے بعد ڈائمنڈ گینگ کے افراد یکے بعد دیگرے غائب ہونے لگے۔ ڈائمنڈ خود دسمبر1931ء میں کسی نامعلوم شخص کے ہاتھوں مارا گیا۔

اس وقت تک امریکا میں اکثر لوگ محسوس کرنے لگے کہ شراب پر پابندی ایک خطرناک غلطی تھی۔ اس سے ملک بدمعاشوں کی جنت بن گیا تھا۔1932ء میں ڈیموکریٹک پارٹی نے انتخابی مہم کے دوران شراب پر پابندی کا خاتمہ اپنا مقصد بنایا۔ روزویلٹ نے ہوور کو بڑی اکثریت کے ساتھ شکست دی اور فروری1933ء میں پابندی ختم کر دی گئی۔

جب تک لوسیانو نے شکاگو کے کیپون کی طرح اپنے آپ کو نیویارک کا بڑا 'مافیا سکوٗ منوا لیا تھا۔ لوسیانو کا باس مسریا پرانی طرز کا گینگسٹر تھا۔1930ء میں ایک اور گینگ کے سرغنہ مرنزیانو نے مسریا کے گینگ سے لڑائی شروع کی۔ دونوں طرف سے گن مین مارے گئے تو لوسیانو نے سوچا کہ باس کی عدم موجودگی میں وہ شاید بہتر سودے بازی کر سکے۔15اپریل 1931ء کو مسریا اور لوسیانو نے ایک ریسٹورنٹ میں تاش کی بازی ختم کی ہی تھی کہ لوسیانو ٹوائیلٹ چلا گیا۔ اس کی غیر حاضری میں وٹو، البرٹ، انستاسیا اٹونی اور بگسی، پانچ مشہور بدمعاش اندر آئے اور انہوں نے مسریا کو قتل کر دیا۔ لوسیانو نے فوراً مرنزیانو کی شرائط پر اس سے صلح کر لی۔ مگر مرنزیانو کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ نیویارک مافیا کا گاڈ فادر بنے۔ پانچ افراد پولیس بیج دکھاتے ہوئے اس کے دفتر آئے اور وہاں موجود تقریباً بارہ افراد سے منہ دیوار کی طرف کرکے کھڑے ہونے کو کہا۔ پھر مرنزیانو کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ قاتلوں میں سے کسی کا تعلق مافیا سے نہیں تھا۔ وین برگ، اُن کا سرغنہ ولندیزی شلتز کا نائب تھا۔ مگر اس کے اندر شک نہیں کہ قتل میں مافیا کا ہاتھ تھا۔ کیونکہ اسی دن گیارہ ستمبر1931ء کو تیس سے زیادہ مافیا کے سرغنے مارے گئے۔ یہ کمال کی پلاننگ تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شراب پر پابندی نے کیونکر مافیا (اب یونین سی لیانو) کو دیوقامت کارپوریشن بنا دیا تھا۔ اب اس کا صدر نشین لکی لوسیانو تھا۔

شراب پر پابندی نے معمولی لچے لفنگے لکھ پتی بنا دیئے تھے اور اس طرح ان سے چھٹکارا حاصل ہونے کے امکان ختم کر دیے تھے۔"1931ء کے واقعہ کے بعد یونین مافیا نہیں بلکہ اصلی پوست کا ایک لمبا کش رہ گئی تھی۔" (Luciano's Story Chapter 4) اتنی دولت ہوتے ہوئے مافیا ہر خطرہ سے محفوظ تھا۔ سیاسی عہدے اور تقرریاں خرید سکتا تھا۔ مرنزیانو کے قتل کے بعد ضلعی کونسلر کو وارننگ دی گئی کہ اگر جان عزیز ہے تو مستعفی ہو جائے۔ اس کی جگہ

البرٹ میرانٹلی لوسیانو کا امیدوار منتخب ہوا۔ جولائی 1932ء میں میرانٹلی شکاگو میں صدارتی امیدوار کی نامزدگی کے لیے ہونے والے ڈیموکریٹک کنونشن میں موجود تھا۔ امیدوار ممتاز ڈیموکریٹ فرینکلن ڈی روز ویلٹ تھا۔ وہاں لکی لوسیانو اور اس کا دوست فرینک کاسٹیو بھی موجود تھا۔ لوسیانو نے اچھا کیا کہ پس منظر میں رہا ورنہ سیاسی مبصر کیا سوچتے کہ مافیا کے سرغنے ڈیموکریٹک کنونشن میں کیا کر رہے ہیں۔ بہرحال مندوب جی بھر کر شراب پیتے رہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میرانٹلی روز ویلٹ کے کسی مخالف کی حمایت کرتا تھا یا روز ویلٹ صدارتی امیدوار نامزد ہوا تھا۔ لوسیانو کے دوست دونوں طرف موجود تھے۔

چنانچہ پابندی ختم ہونے سے کسی گینگ کو کوئی قابل ذکر فرق نہیں پڑا۔ وہ جوا، منشیات وغیرہ جیسے دوسرے دھندوں میں پھیل گئے تھے۔ لوسیانو کا دوست لوئیس سلے سلائے کپڑوں کی صنعت کا اجارہ دار تھا۔ فرینک کا سٹیلو قمار بازی کے اڈوں کا مالک تھا اور جواہرات بھی سمگل کرتا تھا۔ لوسیانو جب تک فیصلہ کر چکا تھا کہ آئندہ منشیات کی سمگلنگ سب سے کامیاب دھندا ہوگا، اگرچہ بدکاری کے اڈوں کا اس کا جال ملک بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ ان کی باہمی رقابت سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ کیپون کی گرفتاری سے نیویارک والوں نے سیکھ لیا تھا کہ پبلک احتجاج کی نوبت آنے دینا دانش مندی نہیں۔ یہ نکتہ 1932ء کے آخر میں ہونے والی ایک میٹنگ میں واضح کیا گیا۔ اس میٹنگ کا چیئرمین گینگ لینڈ کا بزرگ سیاست دان عزت مآب جانی ٹوریو تھا۔ اس میں نیویارک کے سرکردہ غنڈے کاسٹیلو، اڈونیس، لیپکے، لونگی ذوالمن بگی، سیگل لانسکی اور ڈچ شولیٹز بلائے گئے تھے۔ کرسیٔ صدارت پر لوسیانو رونق افروز تھا۔

ٹوریو نے اجلاس کو بتایا کہ پابندی جب ختم ہوئی تو سیاست دانوں نے شراب کے لیے ہمارا سہارا لینا چھوڑ دیا اور سماجی رضا کار کے طور پر ہماری حیثیت ختم ہو گئی۔ اس طرح ہمارے گینگ مفید رابطوں سے محروم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ انہیں پہلے ہی متحد رہنے کا ارادہ کر لینا چاہیے۔ آپس کی لڑائیاں ختم ہونی چاہئیں۔ اس کے لیے گینگ کے سرغنوں کو آپس میں قریبی رابطے رکھنے چاہئیں۔ لوسیانو اور ٹوریو کی وضاحت کے بعد مخالفت ختم ہو گئی۔ دراصل گینگ یونین بنا رہے تھے کہ ایک کی طاقت سب کی طاقت ہے۔ 1934ء تک اس متحدہ حفاظتی سوسائٹی کی افادیت اس طرح ظاہر ہوئی کہ ملک کے تمام گینگ یونین میں شامل ہونے کی خواہش کرنے لگے۔ ارکنساس میں ایک میٹنگ بلائی گئی جس میں ارکنساس سٹی، شکاگو (کیپون گینگ) کلیولینڈ

اور ڈیٹرائٹ (پرپل گینگ) کے گینگ سرغنے اور بوسٹن، میامی، نیواورلینز، بلٹی مور، سینٹ پال اور لوبینانو سے مندوب شریک ہوئے۔ لوسیانو اور لانسکی میٹنگ کے آرگنائزر تھے۔ میٹنگ کا حاصل سنڈیکیٹ کی تشکیل تھی جسے بعض اوقات Murder Incorporated بھی کہا جاتا تھا۔

آج جب بھی کوئی تنظیم گٹر یا راستہ میں پڑی پائی جاتی ہے تو رائے عامہ کے اختلاف کی وجہ سے پبلک اور پریس دونوں اسے نظرانداز کرتے ہیں، جیسا کہ بیسویں صدی کے پُرتشدد آغاز میں ہوا کرتا تھا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ زیرزمین تنظیموں کا کوئی ایک سرغنہ بھی 1934ء سے اب تک قتل نہیں ہوا جب تک کہ اس کی اجازت نہ ملی ہو یا کسی سرکردہ سرغنہ نے اس کا حکم نہ دیا ہو۔

ڈچ شلز سنڈیکیٹ سے الجھنے والا پہلا شخص تھا۔ پابندی ختم ہونے کے بعد اس نے لاٹری یعنی 'نمبر ریکٹ' کا کام شروع کر دیا تھا۔ عجیب عادات واطوار کی وجہ سے اس کے ساتھی اسے ناپسند کرتے تھے۔ لوسیانو کو بھی اس کی بدمزاجی کا افسوس تھا۔ ایک موقع پر لوسیانو نے اپنے فلیٹ پر ایک میٹنگ بلائی تو اپنے گینگسٹر مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے چند لڑکیاں بھی بلا لیں۔ شلز میٹنگ اور اس کا ایجنڈا چھوڑ کر ایک لڑکی کے پیچھے پڑ گیا اور میٹنگ ختم ہونے تک اس کے ساتھ مصروف رہا۔ آخر سو ڈالر لوسیانو کی طرف پھینک کر چلا گیا کہ لڑکی کو دے دینا۔

فیڈرل حکومت نے شلز کے خلاف ٹیکس نادہندگی کے سلسلہ میں کارروائی شروع کی تو اس کے وکیل مقدمہ سیریکس (اب سٹیٹ نیویارک) لے گئے۔ شلز وہاں جا کر لوگوں میں گھل مل گیا اور فلاحی کاموں میں دلچسپی لینے لگا۔ بلکہ اپنا امیج بہتر کرنے کے لیے تعلقات عامہ کے ایک ادارے کی خدمات بھی حاصل کیں۔ اس ساری تگ و دو کا نتیجہ یہ نکلا کہ جیوری نے اسے الزام سے بری کر دیا۔ نیویارک میں اس کی غیرحاضری کی وجہ سے لیپکے نے ہارلم میں اس کے 'نمبر ریکٹ' کے کاروبار پر قبضہ کرنا چاہا۔ شلز کے نائب وین برگ کو سمجھایا کہ شلز طویل عرصہ کے لیے جیل میں رہے گا، چنانچہ وین برگ نئے مالک کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مگر شلز واپس آ گیا اور وین برگ پُراسرار حالات میں قتل کر دیا گیا۔ شلز غضب ناک تھا مگر جانتا تھا کہ وہ اکیلا پورے سنڈیکیٹ کا سامنا نہیں کر سکتا، اس لیے بہتر ہے کہ مناسب وقت کا انتظار کرے۔

پھر بھی شلز جیسے انفرادیت پسند کا نظروں سے بچنا آسان نہیں تھا۔ نیویارک کے

نئے میئر گارڈیا نے اعلان کیا تھا کہ وہ ریکٹیروں یعنی جعل سازوں اور ٹھگوں کا جینا حرام کر دے گا۔ تصویروں میں اسے کلہاڑے سے ان کی گیم مشینیں توڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ وقتی طور سے شلز محفوظ تھا کیونکہ اس نے ڈسٹرکٹ اٹارنی ولیم سی ڈوج کی انتخابی مہم پر ایک بڑی رقم خرچ کی تھی۔ مگر جب 'نمبر ریکٹ' کے متعلق تفتیش کرتے ہوئے ایک گرینڈ جیوری نے محسوس کیا کہ ڈسٹرکٹ اٹارنی جان بوجھ کر تفتیش میں رکاوٹیں ڈال رہا ہے تو انہوں نے اس کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ اس کی جگہ ایک نوجوان وکیل تھامس ای ڈیوی کا تقرر ہوا۔ اس سے پہلے ڈیوی نے فیڈرل اٹارنی کی حیثیت سے شلز کو انکم ٹیکس ادا نہ کرنے کے جرم میں سزا دی تھی۔ اس کی تقرری پر شلز بہت پریشان ہوا اور اس کے قتل کا ارادہ کیا۔ اس کا ایک گن مین ڈیوی کی نگرانی کرنے لگا۔ اسے معلوم ہوا کہ ڈیوی ہر صبح ایک ڈرگ سٹور پر فون کرنے آتا ہے جبکہ اس کے دو باڈی گارڈ باہر انتظار کرتے ہیں۔ سنڈیکیٹ کو سازش کا پتہ چلا تو شلز کو ایک میٹنگ میں بلایا گیا۔ لیپکے نے واضح کیا کہ ڈیوی کے قتل سے پبلک کی طرف سے شدید احتجاج ہوگا جس سے ہم سب بچنا چاہتے ہیں۔ شلز کے تمام دلائل رد کر دیے گئے اور فیصلہ ہوا کہ ڈیوی زندہ رہنا چاہیے۔ شلز نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ سنڈیکیٹ کو معلوم ہوا کہ وہ اب بھی ڈیوی کی نگرانی کرتا ہے تا کہ وہ جو چاہتا ہے، ہو کر رہے۔ جب سنڈیکیٹ کے انفارمیشن نیٹ ورک نے اطلاع دی کہ ڈیوی کے قتل میں دو دن رہ گئے ہیں تو سنڈیکیٹ نے اپنی کارروائی کا فیصلہ کیا۔

شلز نیویارک سے نیوجرسی چلا گیا۔ اس نے 'پیلس چاپ ہاؤس' میں کھانا کھایا۔ 23 اکتوبر 1935ء کو وہ اس کے ساتھ چاپ ہاؤس کے پچھلے کمرہ میں میٹنگ کر رہے تھے کہ شلز غسل خانے چلا گیا۔ سنڈیکیٹ کا قاتل ورک مین چاپ ہاؤس داخل ہوا اور وہ بھی سیدھا غسل خانہ چلا گیا۔ اور شلز کو واش بیسن پر جھکا ہوا پایا۔ اسے شلز کا باڈی گارڈ سمجھ کر ورک مین نے گن نکالی اور اسے گولی مار دی۔ پھر وہ باہر آ کر شلز کا انتظار کرنے لگا۔ گولی کی آواز سن کر تمام بار خالی ہو گیا۔ جلد ہی ورک مین کو پتہ چل گیا کہ غسل خانہ میں وہی آدمی تھا جسے قتل کرنا تھا۔ شلز مرا نہیں، اس نے مرنے سے پہلے چوبیس گھنٹے بدحواسی کی کیفیت میں ہسپتال کے اندر تڑپتے ہوئے گزارے۔ برسوں بعد ڈیوی کو پتہ چلا کہ وہ موت سے کتنا قریب تھا۔

شلز کے قتل سے بھی کم و بیش اتنا ہی ہنگامہ ہوا جتنا کہ ڈیوی کے قتل سے ہو سکتا تھا۔ شلز نے بدحواسی کے عالم میں آخری وقت میں کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ اس کے قتل کا ذمہ دار 'باس'

خود ہے۔ ڈیوی نے لوسیانو کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ وہ ارکنساس میں تھا۔ جونہی اس کا پتہ چلا ڈیوی نے مطالبہ کیا کہ لوسیانو کو اس کے حوالے کیا جائے۔ اس نے مختلف اڈوں پر کام کرنے والی عورتیں اکٹھی کیں۔ وہ اب سنڈیکیٹ کے لیے کام کرتی تھیں، پہلے خود مختار تھیں۔ ٹوریو نے انہیں مجبور کر کے اپنی ملازمت میں لیا تھا۔ ڈیوی سے بات کر کے وہ بہت خوش ہوئیں۔ انکم ٹیکس ادا نہ کرنے کے جرم میں ٹوریو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ لوسیانو پر جبراً غنڈہ ٹیکس وصول کرنے کا الزام سچ ثابت ہوا۔ ساڑھے تین لاکھ ڈالراس کی ضمانت کے لیے مقرر ہوئے۔ ٹوریو اڑھائی برس کے لیے جیل گیا۔ لوسیانو کو تیس سے پچاس سال تک قید کی سزا ملی۔ لوسیانو کے خلاف گواہی دینے والوں کی جانوں کو خطرہ کے پیش نظر جج نے وارننگ دی کہ اگر گواہوں کو نقصان پہنچا تو لوسیانو اور اس کے ساتھیوں کو زیادہ سے زیادہ سزا دی جائے گی۔ پہلے تو ایسا لگا کہ آخر کار امن اور قانون کی جیت ہوئی۔ ڈیوی تو یقیناً یہی سوچتا تھا۔ مگر اس نے یہ نہیں دیکھا کہ کرائم سنڈیکیٹ اب ملک بھر میں پھیل چکا ہے اور لوسیانو کے بغیر بھی خوب چل رہا ہے۔ جرائم کے چھوٹے اڈے ان کے مالکوں سے چھین کر سنڈیکیٹ میں شامل کر لیے گئے تھے۔ اگر کوئی قتل ضروری ہوتا تو کرائے کا قاتل کہیں باہر سے آتا اور اپنا کام کرتے ہی فوراً شہر سے چلا جاتا۔ برٹن ٹرکس کے تخمینہ کے مطابق 'مرڈر انکار پوریٹڈ' نے اپنے قیام کے بعد پہلے پانچ برس میں ایک ہزار قتل کیے تھے۔ ایک قتل کا معاوضہ ایک ہزار سے پانچ ہزار ڈالر تھا۔ (پٹسبرگ فل، قاتلوں کے ٹھیکہ دار نے 1930ء اور 1940ء کے درمیان پانچ سو قتل کیے تھے) اکثر مقتولوں کی لاشیں کبھی نہیں ملیں کہ دریاؤں میں پھینک دی جاتی تھیں۔

1940ء میں حکومت کو 'مرڈر انکار پوریٹڈ' کا پتہ چلا۔

ایک قیدی ہیری روڈلف نے پہلے ٹرکس پھر اسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی جنرل کو بلایا اور بیان کیا کہ 1933ء میں ایک اور گینگسٹر اس کے سامنے قتل کیا گیا تھا۔ قاتلوں میں ایک انتہائی مطلوب قاتل ریلیس بھی تھا۔ ریلیس کو یقین تھا کہ قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس لیے یہ سنتے ہی کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے وہ پولیس سٹیشن چلا گیا۔ مگر جب اسے پتہ چلا کہ ہیری روڈلف نے اس کی نشان دہی کی ہے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی کا دفتر زیادہ سے زیادہ بدمعاشوں کو جیل بھیجنے کا ارادہ کیے ہوا تھا۔ ریلیس جانتا تھا کہ اس کے خلاف روڈلف کی گواہی اس کی موت کا وارنٹ ہے۔

ریلیس کا تعلق اچھے خاندان سے تھا۔ وعدہ معاف گواہ بن کر جب اس نے

ڈسٹرکٹ اٹارنی اور اس کے سٹاف کو 'مرڈر انکار پوریٹڈ' کے متعلق بتایا تو انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس وقت پولیس اس کے وجود سے بالکل بے خبر تھی۔ اب ریلیس نے بتایا کہ اس کا تعلق ان کے ایک 'ٹروپ' سے ہے، جس کا کام قتل کرنا ہے اور یہ کہ ایسے کئی 'ٹروپ' تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

اس کی گواہی کی بنیاد پر لیپک اور لوئیس کو موت کی سزا دی گئی۔ کیپون پٹسبرگ فل (ہیری سٹراس) پپی مائینون اور ڈاشر کا بھی یہی انجام ہوا۔ ریلیس کی گواہی غنڈہ ازم کی تاریخ میں سب سے لرزہ خیز دستاویز تھی۔ مثلاً پٹسبرگ فل نے ایک مقتول کو محض اس لیے آگ لگا دی کہ اسے جلتا ہوا دیکھ کر لطف اندوز ہو سکے۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں انسانوں کے قصاب تھے۔ ریلیس نے یہ بھی بتایا کہ 1939ء میں جب لیپکے پولیس سے چھپ رہا تھا تو اس نے لیپکے کو ایسے گیارہ افراد قتل کرنے کا حکم دیا جو اس کے خلاف گواہی دے سکتے تھے۔ لیپکے مقدمہ شروع ہونے سے پہلے سات افراد قتل کرنے میں کامیاب ہوا۔

ریلیس کی متواتر گواہیوں سے اکثر گینگسٹر گھبرا گئے۔ 12 نومبر 1941ء کی صبح 'کڈ ٹوسٹ' (ریلیس) پر اسرار طور سے ہاف مون ہوٹل میں اپنی چھ منزلہ کھڑکی سے گر گیا۔ پولیس کے چھ ارکان اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ وہ حادثہ کے قریب کمرہ میں نہیں تھے یا دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کا جسم ہوٹل کی دیوار سے اتنا دور تھا کہ لگتا تھا کہ کسی نے اسے زور سے دھکا دیا تھا۔ مگر اس سلسلہ میں کسی کا نام نہیں لیا گیا۔ اس لیے اس کی موت راز بن گئی۔

اس عرصہ میں لوسیانو پیرول پر رہا ہونے کی جان توڑ مگر ناکام کوشش کرتا رہا۔ پھر 9 نومبر 1942ء کو فرانسیسی جہاز ''نارمنڈی'' دریائے ہڈسن میں پانی کی لکیر کی طرف جا کر جل گیا۔ وہ 'ٹروپ شپ' بنایا جانے والا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ تخریبی کارروائی تھی۔ واٹر فرنٹ (دریا کے قریب شہر کا حصہ) اب بھی سنڈیکیٹ بلکہ لوسیانو کے کنٹرول میں تھا جو جیل کی کوٹھڑی سے اس پر حکومت کرتا تھا۔ نیوی کی انٹیلی جنس نے لوسیانو سے مل کر اس کا تعاون حاصل کرنا چاہا۔ لانسکی (جو اب سنڈیکیٹ کا خزانچی اور چیف اکاؤنٹنٹ تھا) ثالث بننے پر آمادہ ہو گیا۔ پوری کہانی اب بھی در پردہ ہے۔ مگر لوسیانو نے بعد میں کہا کہ ڈیوی اور اس میں طے ہوا تھا کہ وہ اس کی انتخابی مہم میں نوے ہزار ڈالر دے گا (ڈیوی صدارتی انتخاب لڑنا چاہتا تھا) اور واٹر فرنٹ کو تخریب سے محفوظ رکھنے میں انٹیلی جنس سے تعاون کرے گا۔ اس کے بدلے میں جنگ

ختم ہونے پر پیرول پر رہا کر کے اٹلی روانہ کیا جائے گا۔ فی الحال اسے کم سٹاک (نیویارک) کی نسبتاً آرام دہ جیل میں بھیج دیا جائے گا۔ لوسیانو تو ہٹلر کو بھی قتل کروانے پر تیار تھا، اس کے لیے اس نے ایک قاتل جینوویز کا انتخاب کیا تھا جو فی الحال اٹلی میں تھا۔ بہرحال اس عظیم الشان منصوبہ کا کچھ نہ بنا۔ مگر جنگ کے باقی دنوں میں نیویارک کا واٹر فرنٹ تخریب سے محفوظ رہا۔ جنگ کے خاتمہ پر ڈیوی نے اپنا وعدہ پورا کیا اور لوسیانو کو پیرول پر رہا کر کے اسے اٹلی واپس بھیج دیا۔ (حالانکہ وہ امریکی شہری تھا) ڈیوی نے ریپبلکن امیدوار کی حیثیت سے دو مرتبہ (1944ء اور 1948ء) صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اور دونوں مرتبہ ہار گیا۔ مگر وہ نیویارک سٹیٹ کا گورنر بن گیا۔

عجیب بات ہے کہ اٹلی پر امریکی قبضہ سے مافیا کی طاقت بحال ہو گئی جسے مسولینی نے کچل دیا تھا۔ امریکی فوجیں جب اٹلی میں داخل ہوئیں تو سسلی کے گاڈ فادر روزینی کے نام لوسیانو کے ایک پیغام کی وجہ سے مافیا نے ان فوجوں کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔ اس لیے اور بھی ضروری ہو گیا کہ ان ''وطن دوست'' اطالویوں کو پورا موقع دیا جائے کہ ملک کے اندر حالات معمول پر لانے میں قائدانہ کردار ادا کریں اور نیپلز جیسے شہروں میں کلیدی ذمہ داریاں ان ''فاشسٹ دشمن'' عناصر کے سپرد کر دی گئیں۔ امریکا نے اٹلی مافیا کو واپس کیا تھا۔

لوسیانو فروری 1946ء میں امریکا سے گیا تھا۔ ایک سال بعد وہ ہوانا (کیوبا) میں تھا جہاں لانسکی جرائم کنٹرول کرتا تھا۔ وہاں سب سے اچھے ہوٹل میں لوسیانو نے امریکا بھر سے گینگسٹر بلائے جن میں فرینک کاسٹیلو، ولی موریٹی، بگزی سیگل (جو لاس ویگاس میں جوئے کی صنعت کا بانی تھا) اور شکاگو سے فیشٹی برادرز شامل تھے۔ جب سیگل سے کہا گیا کہ لاس ویگاس کا جوا کسینو اور فلیمینگو ہوٹل بنانے کے لیے جو رقم اس نے قرض لی تھی اس کا کچھ حصہ واپس کرے تو وہ بگڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے دوست لانسکی سے اسے سمجھانے کے لیے کہا گیا، مگر ناکامی ہوئی۔ 20 جون 1947ء کو سیگل بیورلے ہلز میں اپنی داشتہ ورجینیا کے کمرے میں مارا گیا۔ لانسکی یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ''میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔'' خود لانسکی نے اس قتل سے انکار کیا اور اس سلسلہ میں لوسیانو کا نام لیا۔

جب بتستا (Batista) حکومت کو ہوانا میں لوسیانو کی موجودگی کا پتہ چلا تو اس نے لوسیانو کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ لوسیانو اٹلی واپس چلا گیا۔ روم (جہاں اس نے کئی ریکٹ بنائے تھے) کی حکومت نے بھی اسے وہاں رہنے نہ دیا تو آخر وہ نیپلز میں رہنے لگا۔

وہاں اس نے اپنی صفائی میں کئی انٹرویو دیئے کہ وہ غنڈہ نہیں، خواہ مخواہ اسے بُرے کاموں میں ملوث کیا جاتا ہے۔1961ء میں جب وہ چونسٹھ برس کا تھا، اس نے ایک فلم پروڈیوسر کو اپنی زندگی پر فلم بنانے کی اجازت دی تا کہ اس کے بارے میں شبہات ختم ہو جائیں۔ پھر امریکا سے حکم آیا کہ ''لانسکی اسے پسند نہیں کرے گا۔'' لوسیانو نے پروڈیوسر مارٹن گوش سے معذرت کی کہ فلم بنانے کا خیال چھوڑ دے۔ جب گوش نے اس سے کہا کہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ لوسیانو کا وعدہ اٹل ہوتا ہے تو لوسیانو نے جواب دیا کہ ''اگر میں نے وعدہ پورا کیا تو ہم دونوں کے سر ہمارے جسموں پر نہیں رہیں گے۔'' مگر اس کی دل جوئی کے لیے لوسیانو نے اپنی زندگی کے متعلق دل کھول کر باتیں کیں۔ وہ باتیں 'The Last Testament of Lucky Luciano' کی بنیاد بنیں۔ جنوری 1962ء میں لوسیانو چونسٹھ برس کی عمر میں مر گیا۔

لوسیانو کا ایک قریبی ساتھی گینو ویز حالات خراب دیکھ کر امریکا سے بھاگ گیا تھا۔ جنگ کے دن اس نے اٹلی میں گزارے۔ اگر مسولینی یہ جان کر نادم ہوا تھا کہ اس کا لکھ پتی دوست ایک مفرور غنڈہ ہے تو گینو ویز کے نولا کے فسطائی ہیڈ کوارٹر پر دو تین لاکھ ڈالر خرچ کرنے سے اس کی ندامت کم ہو گئی تھی۔ جب امریکی فوجیں آئیں تو گینو ویز نے کوشش کی کہ اسے آرمی انٹیلی جنس میں مترجم کا کام مل جائے۔ اسی عرصہ میں ایک سی آئی اے ایجنٹ کو معلوم ہو گیا کہ وہ ایک مفرور قاتل ہے تو اسے نیویارک واپس لایا گیا۔ جون 1946ء میں اس کے خلاف سب سے اہم گواہ پیٹر لاٹیمپا کو جیل میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا اور گینو ویز رہا ہو گیا۔ اس نے نیویارک میں اپنی دہشت پھیلانے میں دیر نہیں کی۔ اکتوبر 1951ء میں نیو جرسی مافیا کا بانی ولی موٹیٹی قتل ہو گیا۔ وہ گینو ویز کے مخالف فرینک کاسٹیلو کا قریبی ساتھی تھا جس نے لاس ویگاس میں سیگل کے قمار خانہ پر قبضہ کر لیا تھا اور گینو ویز نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس میں مداخلت کرے گا۔ جون 1953ء میں کاسٹیلو کا ایک اور دوست سٹیون فرانز قتل ہو گیا۔ فروری 1955ء میں لاگی ذلمن کی باری تھی جو اپنے گھر (اورنج نیو جرسی) کے تہہ خانے میں رسی سے لٹکا ہوا مردہ پایا گیا۔ اور پھر مئی 1957ء میں کاسٹیلو گھر میں داخل ہو رہا تھا کہ اسے کسی کے چلّانے کی آواز آئی۔ ''فرینک! یہ تمہارا حصہ ہے'' اور اس کے سر میں گولی مار دی۔ حملہ آور کے چلّانے سے شاید اس کی جان بچ گئی۔ اس کا بہت سا خون ضائع ہو گیا مگر موت ٹل گئی۔ پولیس نے اس کی جیب سے لاس ویگاس کے قمار خانہ کی رسیدیں برآمد کیں۔ جب کاسٹیلو نے ان کے متعلق کچھ بتانے سے انکار کیا اور حملہ آور کا نام بھی نہ بتایا تو عدالت

کی توہین کے جرم میں اسے جیل بھیج دیا گیا۔ چوکیدار نے پولیس فوٹو سے حملہ آور کو پہچان لیا۔ وہ گینو ویز کا ساتھی ونسنٹ تھا۔

دو مہینہ بعد فرینک سکیلز مافیا کا ایک سرغنہ برونکس سٹریٹ میں دن دیہاڑے قتل کر دیا گیا۔ اس لیے کہ افواہ کے مطابق وہ مافیا کی ممبر شپ غیر اطالویوں کے ہاتھ بیچتا تھا۔ مگر زیادہ امکان ہے کہ وہ بھی گینگ وار کا نشانہ تھا۔

کاسٹیلو کی عدم موجودگی میں سنڈیکیٹ کا ایک اور سرغنہ البرٹ انستاسیا طاقت کی دوڑ میں گینو ویز کا حریف بن گیا۔ انستاسیا وہی شخص تھا جس نے ایک سماجی کارکن آرنلڈ شستر کے قتل کا حکم دیا تھا کیونکہ اس نے ایک ڈاکو ولی سٹن کو پہچان لیا تھا اور پولیس کو خبر کر دی تھی۔ آرنلڈ کے قتل کا مقصد دوسرے سماجی کارکنوں کو خبردار کرنا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔ انستاسیا نے بعد میں آرنلڈ کے قاتل کو بھی قتل کروا دیا تھا کہ اس کے قتل کا سراغ نہ ملے۔

گینو ویز کو کاسٹیلو اور انستاسیا کے مذاکرات کا پتہ چلا تو سمجھ گیا کہ ان کا موضوع خود میں ہوں۔ تو کیوں نہ پہلا وار میں کروں۔ انستاسیا اس کے اپنے گن مین سے واقف تھا اس لیے گینو ویز نے کارلو گمبینو سے رابطہ کیا۔ انستاسیا نیویارک میں انتہائی مطلوب شخص تھا۔ برٹن تورک نے بتایا کہ وہ ایک بہت پرانا مفرور تھا جس نے تیس برس پہلے ایک قتل کیا تھا۔ اس کی بدنامی مافیا کے لیے مضر تھی۔ 25 اکتوبر 1957ء کو انستاسیا شیرٹن ہوٹل کے تہہ خانے میں حجام کی کرسی پر لیٹا شیو کروا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں تک بند کی ہوئی تھیں کہ دو افراد آئے اور اس کے قریب آ کر اسے گولی مار دی۔ انستاسیا جمپ کرتا ہوا آئینہ میں جا لگا جو اسے مزید گولیاں لگنے سے پاش پاش ہو گیا تھا۔ قاتلوں نے پستول پھینکے اور ہوا ہو گئے۔

اس قتل کا ذمہ دار جوئے گالو تھا جسے مافیا میں کوئی اہم حیثیت حاصل نہیں تھی مگر جو اسے حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ اگلے دو سال میں اس نے مزید بارہ قتل کیے۔ جب 1959ء میں گالو سینیٹ کی کرائم کمیٹی کے سامنے پیش ہوا اور رابرٹ کینیڈی نے اس سے سوالات کیے تو کارروائی ٹیلی کاسٹ ہوئی۔ گالو وہی بنا جو اس کے سوانح نگار ڈونلڈ گوڈرڈ نے اس کے متعلق لکھا تھا یعنی منظم جرم کا تھیٹریکل ہیرو۔ چند ماہ بعد جج سیموئیل نے اسے غنڈہ ٹیکس وصول کرنے کے جرم میں تین سال قید کی سزا دی۔ مگر خود تین مہینوں کے اندر اندر نوکری سے باہر ہو گیا۔

گالو محض قاتل بننے سے اکتا گیا تھا۔ شاید اس نے یہ بھی محسوس کر لیا ہو کہ خاندان کا بڑا جو پروفیسی اب چند دنوں کا مہمان ہے (اس کا انتقال 1962ء میں ہوا) 1961ء میں گالو نے ایک دلیرانہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا کہ پروفیسی خاندان کے ممتاز اراکین اغوا کر لے۔ اس کے ''لشکریوں'' نے فرینک سمیت چار پروفیسی بدمعاش دبوچ لیے۔ جو پروفیسی مذاکرات پر آمادہ ہو گیا بشرطیکہ یرغمالی رہا کر دیئے جائیں۔ اس کے فوراً بعد جوئے گالو کے بھائی لاری گالو پر قاتلانہ حملہ ہوا جو پولیس کی اچانک آمد سے ناکام ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ پروفیسی شاید اس سے بازی لے گیا ہے۔ وہ غنڈہ گردی کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا کیونکہ اس نے فلوریڈا میں تھیوڈور موس نامی ایک ساہوکار کے بزنس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ گالو کو سات سے چودہ برس کی سزائے قید ہوئی اور پروفیسی سے لڑائی کا خاتمہ ہوا۔ چند ماہ بعد پروفیسی کینسر سے مر گیا۔

اس وقت تک گینو ویز کی سرغنوں کا سرغنہ بننے کی کوشش بھی ناکام ہو گئی، جس کی بڑی وجہ سنڈیکیٹ کا خزانچی لانسکی تھا۔ لانسکی، لوسیانو کا قریبی دوست تھا۔ فلوریڈا میں قمار بازی سے متعلق اس کے کئی مفاد تھے۔ جب ذولمن اور انستاسیا دنیا میں نہ رہے تو وہ جان گیا تھا کہ اس کی باری بھی آنے والی ہے۔ نومبر 1957ء میں گینو ویز نے امریکا کے مافیا سرغنوں کی میٹنگ ایک تاجر جوئے باربرا کے گھر واقع اپلاچین (نیویارک) میں بلائی۔ لانسکی نے معذرت کی کہ فلو کی وجہ سے وہ میٹنگ میں نہیں آ سکتا۔ عجیب بات ہے کہ اس کا کوئی دوست بھی نہیں آیا۔ اس روز مقامی پولیس باربرا کے گھر آئی۔ وہاں کئی لیموزین گاڑیاں کھڑی دیکھیں تو تفتیش کا فیصلہ کیا۔ کتنے ہی گینگسٹر کھڑکیوں سے کود کر بھاگ گئے۔ یہ اس وقت ہوا جبکہ گینو ویز ملک بھر کے لیے سنڈیکیٹ کا سربراہ منتخب ہو گیا تھا۔ یہ بدشگونی تھی، پولیس کے چھاپہ میں کوئی گرفتار ہوا نہ کسی پر کوئی الزام لگا۔ ہر شخص کے پاس وہاں موجود ہونے کی معقول وجہ تھی۔ پھر بھی یہ خبر اخبارات کا عنوان بن گئی۔

جب لانسکی نے سنا کہ گینو ویز لوسیانو کے قتل کی سازشیں کر رہا ہے حالانکہ لوسیانو ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا تھا، تو اس نے سنگ سنگ سے اپنا ایک آدمی نیلسن کینٹیلوپ بلایا اور اسے زندگی بھر کے لیے پنشن اور تحفظ کا لالچ دیا کہ منشیات بیورو کے سامنے گینو ویز کے خلاف گواہی دے۔ اس کی گواہی سے گینو ویز پندرہ برس کے لیے جیل چلا گیا۔

جیل میں رہتے ہوئے بھی اس کی طاقت میں کمی نہیں آئی۔ جیل سے بھی اس کے

حکم پر کئی قتل ہوئے۔ اس کے ساتھی ہر روز آ کر اسے ضروری خبریں پہنچاتے۔ دوسرے قیدی اس سے بات نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ وہ پہلے بات نہ کرے۔ انہی میں سے ایک قیدی ولاچی بھی تھا جو ایک سرغنہ بنانونس کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ گینو ویز کا خیال تھا کہ اس کی جیل یاترا کے لیے ولاچی بھی ذمہ دار تھا۔ ولاچی کے اعصاب فولادی نہیں تھے۔ اسے پتہ چلا کہ اس کے قتل کا حکم جاری ہو چکا ہے تو اس نے قید تنہائی کو ترجیح دی اور اس کے لیے درخواست کی۔ وہاں جا کر اس نے سوچا کہ اس کے زندہ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ جو اسے قتل کرنا چاہتا ہے اس سے نجات حاصل کی جائے۔ 22 جون 1962ء کو ولاچی نے لوہے کا ایک پائپ لیا اور ایک جعل ساز جان سٹوپ کو قتل کر دیا۔ بہت دیر سے اسے پتہ چلا کہ سٹوپ کی صورت گینو ویز کے ایک پٹھو ڈیپلارمو سے ملتی تھی، جسے قتل کرنا تھا۔ سزا کے خوف سے ولاچی نے حکومت سے سودے بازی کا فیصلہ کیا تو مافیا کے جرائم اور تنظیم کی لمبی فہرست سامنے آئی۔ اس نے بات یہاں سے شروع کی کہ لفظ 'مافیا' ایک زمانہ ہوا کہ پرانا ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ پہلے 'یونین' پھر 'کوسا نوسٹرا' نے لی۔ اس نے جسٹس ڈیپارٹمنٹ کے اس خیال کی تصدیق کی کہ سنڈیکیٹ کے خلاف ڈیوی کی کارروائی سے (جس میں لیپکے اور پٹسبرگ فل سزایاب ہوئے اور لوسیانو کو امریکا سے نکالا گیا) بنیادی سطح پر مافیا کی تنظیم کا کچھ نہیں بگڑا۔ رابرٹ کینڈی نے ولاچی کا بیان 'منظم کرائم' کے خلاف سب سے بڑی کامیابی تصور کیا۔

اس دفعہ حکومت نے 'کڈ ٹوسٹ' والی غلطی نہیں دہرائی۔ ولاچی سخت نگرانی میں جیل کی ایک آرام دہ کوٹھڑی کے اندر رکھا گیا۔ اگرچہ گینو ویز نے اس کے قتل کا معاوضہ ایک لاکھ ڈالر مقرر کیا مگر وہ ہارٹ اٹیک سے مرنے کے لیے زندہ رہا اور بالآخر 1971ء میں ٹیکساس میں اپنی جیل کوٹھڑی میں مر گیا۔ گینو ویز خود 1969ء میں جیل کے اندر مرا۔

گینو ویز جیل چلا گیا تو کارلو گمبینو 'کوسا نوسٹرا' کا سب سے طاقتور رکن بن گیا۔ جلد ہی اسے ایک ایسے چیلنج سے سابقہ پڑا جو پروفیسی فیملی پر گالو کے قبضہ کی کوشش سے زیادہ خطرناک تھا۔ جوئے بن بنانو ایک فیملی سرغنہ تھا جو ریٹائر ہو کر ٹیوسن ساں ایریزونا چلا گیا تھا۔ اگرچہ نیویارک کے ساتھ اس کے مفادات، خصوصی طور پر ساہو کارے میں اب بھی وابستہ تھے۔ بن نانوس اس نو رکنی کمیشن میں سے تھا جسے امریکا کے چوبیس مافیائی سرغنوں نے سنڈیکیٹ کی دیکھ بھال کے لیے منتخب کیا تھا۔ جب بن نانو کا بیٹا بل بھی منتخب ہو کر کمیشن میں شامل ہو گیا تو دوسرے ممبروں نے محسوس کیا کہ بن نانو فیملی خواہ مخواہ اہمیت اختیار کر رہی ہے۔

اس وقت تک ولاچی کے انکشافات سے گھبرا کر بن نانو عارضی طور پر کینیڈا چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے سوچا کہ کمیشن کے دوسرے ممبر اس کی جان کے درپے ہیں تو کیوں نہ پہلے خود وار کرے؟ بن نانو نے سوچا اور مافیا کے چار بڑے سرغنوں (کارلو گمبینو سمیت) کے قتل کا حکم دے دیا۔ بن نانو کے پروفیسی خاندان کے ساتھ قریبی رشتے تھے۔ اس کا بیٹا بل روسالک پروفیسی کے ساتھ بیاہا گیا تھا۔ چنانچہ قتل کا حکم پروفیسوں کے 'ہٹ مین' جوئے کولمبو کو پہنچا دیا گیا۔ کولمبو نے یہ جانتے ہوئے کہ اتنے بڑے چار سرغنوں کو قتل کرنا آسان نہیں گمبینو سے رابطہ کیا "یہ جنگ ہے، بن نانو ٹیک اوور کرنا چاہتا ہے۔"

21 اکتوبر 1964ء کو بن نانو نیویارک میں اپنے گھر جا رہا تھا کہ دو آدمیوں نے اس کی پسلیوں پر پستول رکھ کر اسے گھسیٹا اور گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ کیٹس کل کے مقام پر کمیشن میں اس کے ساتھی اراکین وضاحت چاہتے تھے۔ انہیں اس قتل کرنے کی جلدی نہیں تھی کیونکہ اس کے بیٹے کی زندگی میں اسے قتل کرنے سے ایک نئی گینگ وار چھڑ سکتی تھی جو مافیا کی بدنامی کا سبب بنتی۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ بن نانو اپنا 'بزنس' ان کے حوالے کرے اور ریٹائر ہو کر گمنام ہو جائے۔ بن نانو کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اپنی زندگی کے بدلے اور اس وعدے پر کہ اس کا خاندان محفوظ رہے گا، وہ ملک چھوڑنے پر تیار ہو گیا۔ غمگین اور فکرمند وہ ہیٹی چلا گیا۔

بل بن نانو اپنے باپ کے اغوا اور ریٹائرمنٹ سے بجا طور پر پریشان تھا۔ نہ اس کے لیے وہ توہین قابل برداشت تھی جو اس واردات کی وجہ سے ہوئی۔ مخالفین کی لڑائیوں سے تنگ آ کر جنوری 1966ء میں امن کی صورت پیدا ہوئی مگر جونہی مذاکرات کے لیے مقررہ مقام کی طرف بل بن نانو بڑھا کسی نے اس پر فائر کیا۔ اسے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑا۔ کوئی شخص زخمی نہیں ہوا مگر جب بن نانو نے ہیٹی میں اس حملہ کے متعلق سنا تو سمجھ گیا کہ مخالفوں نے معاہدہ توڑ دیا ہے۔ مئی 1966ء میں وہ امریکا واپس آیا۔ اس کا آنا 'بنانا وار' کا سگنل تھا۔ نومبر 1967 میں بن نانو کے سابق ساتھی (جو منحرف ہو کر مخالفوں کے پاس چلے گئے تھے) بروکلین ریسٹورنٹ میں کھا رہے تھے کہ ایک آدمی ان کے ٹیبل کے پاس آیا اور سب مشین گن سے گولیوں کی بارش کر کے انہیں ڈھیر کر دیا۔ مارچ 1968ء میں بن نانو کا ایک اور منحرف ساتھی گاڑی پارک کر رہا تھا کہ گولی آ کر اس کے گلے پر لگی۔ چند دنوں بعد بل بن نانو کا ڈرائیور اور باڈی گارڈ مخالفوں نے قتل کر دیا۔ خونریزی اب بھی بارہ سال بعد تک

جاری تھی کہ جولائی 1979ء میں مارمن گلانٹ، بن نانو کا ایک اور ساتھی بروکلین ریستوران میں ہلاک کر دیا گیا۔

مگر شاید 1970ء کے عشرہ میں مافیا کی یہ کوشش بہت دلچسپ تھی کہ امریکی پبلک کو یقین دلا دے کہ یہاں مافیا کا وجود کہیں نہیں۔ یہ احمقانہ سکیم کولمبو کے دماغ کی اختراع تھی۔ وہی سابق 'ہٹ مین' جواب پروفیسی خاندان کا سربراہ تھا۔ 1970ء میں جب اس کا بیٹا جعلی سکے بنانے کے الزام میں گرفتار ہوا تو کولمبو نے امریکی اطالوی شہری حقوق لیگ بنالی تاکہ اس طریقہ پر احتجاج کیا جا سکے کہ اچھے شہری ہمیشہ مافیا ہونے کے الزام میں پکڑ لیے جاتے ہیں۔ مافیا ایک وہم ہے جو پولیس کی ایجاد ہے۔ امریکا میں کہیں بھی کوئی 'منظم جرم' نہیں اور اگر ہے تو اس میں اطالویوں کا یقیناً کوئی حصہ نہیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اطالوی امریکیوں میں اس کے بیان سے سخت بے چینی پیدا ہو گئی ہے اور وہ اپنے آپ کو نسلی منافرت کا نشانہ سمجھنے لگے ہیں۔ ہالی وڈ سے کہا گیا کہ وہ فلموں میں مافیا کا حوالہ ترک کریں جس کی وجہ سے 'گاڈ فادر' کے سکرپٹ میں سے لفظ مافیا نکال دیا گیا۔ لیگ نے ایف بی آئی ہیڈ کوارٹرز کا گھیراؤ کیا۔ مین ہٹن کے کولمبس سرکل کی ریلی میں پچاس ہزار افراد نے حصہ لیا۔ کولمبو گمنامی سے نکل کر اچانک قومی شخصیت بن گیا۔ سیاستدان اس کے ساتھ احترام سے بات کرنے لگے۔ مافیا کے غنڈوں کو سماجی رہنماؤں کے ساتھ تصویریں کھنچوانے کی عادت ہو گئی۔ ایک رپورٹر نے کولمبو کی جادوئی ٹوپی کے کمال پر لکھا جس کی وجہ سے مافیا جادوگر کے سفید خرگوش کی طرح غائب ہو گیا۔

پہلے تو کارلو گمبینو جیسا ہر 'گاڈ فادر' انتظار کرنے اور دیکھنے کے موڈ میں تھا۔ وہ ہمیشہ پبلسٹی سے دور رہتے تھے۔ لیکن اب لگتا تھا کہ کولمبو نے جو کیا ٹھیک ہی کیا ہے۔ مگر دسمبر 1970ء میں حالات بگڑنے لگے، جب کولمبو کا باڈی گارڈ را کو سٹیٹ سپریم کورٹ کے باہر گرفتار کیا گیا۔ وہ ایک سیاہ اٹیچی کیس لیے ہوئے تھا جس کے متعلق کولمبو بضد تھا کہ وہ اس کا ہے اور اس میں سول رائیٹس لیگ کے کاغذات ہیں۔ اسے فکر مند پا کر ایف بی آئی نے انہیں چیک کیا تو اس میں لاکھوں کے سودے تھے جن کا تعلق کارلو گمبینو جیسے جانے پہچانے مافیا سرغنوں سے تھا۔ مافیا نے اچانک دیکھا کہ وہ پھر پولیس کی زد پر ہے۔ انہوں نے کولمبو کی لیگ اس کی ذمہ دار ٹھہرائی۔

28 جون 1971ء کو لیگ کے پہلے سال کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے کولمبو حاضرین کی بہت بڑی تعداد کے سامنے کولمبس سرکلر میں کھڑا ہوا۔ جونہی وہ ہجوم میں سے گزرتا

ہوا روسٹرم کی سمت بڑھا فائرنگ کی آواز آئی اور وہ زمین پر گر گیا۔ اس پر فائر ایک نیگرو نوجوان جیروم جانسن نے کیا تھا۔ اس کے فوراً بعد کولمبو کے ایک باڈی گارڈ نے جیروم پر فائر کرکے اسے ہلاک کر دیا۔ (باڈی گارڈ کا کبھی پتہ نہیں چلا) دماغ کے آپریشن سے کولمبو کی حالت بہتر ہوئی مگر ایک سرغنہ کی حیثیت سے اس کا کردار ختم ہو گیا، وہ مفلوج ہو چکا تھا۔

کولمبو کے قتل کی وجہ سے گالو پر سب سے زیادہ شبہ تھا۔ وہ 1961ء میں جیل گیا اور دس سال بعد باہر آیا تھا۔ جیل میں اس نے جو دس سال گزارے، وہ حکومت کے لیے مشکلات اور مسائل پیدا کرتے ہوئے گزارے تھے۔ اپنی پرانی دنیا جنوبی بروک لین آ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ راکومراگلیا کو وہاں سے دفع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے کولمبو کی مقبولیت کا احساس بھی ہوا جو شہری حقوق کے پھٹے ہوئے پوسٹروں سے صاف ظاہر تھا۔

جیل کے دس برسوں نے گالو کو اس فیصلہ پر پہنچنے میں مدد دی کہ وہ ایک بدمعاش کی طرح زندگی گزارنے سے تنگ آ چکا ہے۔ ایک فلم **The Gang that Couldn't Shoot Straight** (مافیا کی پیروڈی) دیکھنے کے بعد اس نے فلم کے ایک اہم کردار جیری ارباش کو فون پر اپنا تعارف کرایا۔ کچھ دنوں میں ان کی آپس میں دوستی ہو گئی۔ جیری نے اس کا تعارف اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ بھی کرایا۔ جیری کی بیوی اس کی ذہانت اور علم سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ سارتر، کامیو اور کافکا کی باتیں کرتا تھا، ''وہ ان کی تلاش میں ہے جو اس کی طرح روشن دماغ ہوں۔'' ایک روز مزار باش نے کہا۔ جلد ہی وہ ایک اہم سماجی شخصیت بن گیا۔ اس کے نئے دوست کہتے تھے کہ اس سے ہماری دوستی کا مطلب بدمعاشوں میں معمول کی مریضانہ دلچسپی نہیں بلکہ وہ ہمیں اپنی ذہانت سے متاثر کرتا ہے۔

مئی 1972ء میں گالو نے ایک طلاق یافتہ حسین عورت سے شادی کی۔ اس کے ساتھ اس کی نوعمر بیٹی بھی تھی۔ چھ اپریل کو وہ ملبیری سٹریٹ کے ریستوران میں کھانا کھانے گیا جو کولمبو کے علاقہ میں تھا۔ پتہ نہیں یہ اس کی دیدہ دلیری تھی یا یہ اشارہ کہ اسے کسی کا خوف نہیں۔ حالانکہ کولمبس سرکلر کے قاتلانہ حملہ کی واردات میں سب سے زیادہ اسی پر شک کیا جاتا تھا۔ شامت اعمال سے وہ اپنی تینتالسویں سالگرہ منانے اپنی نئی بیوی اور سوتیلی بیٹی کے ساتھ وہیں واپس آیا۔ کولمبو کے ایک آدمی نے انہیں دیکھا تو فوراً فون پر کسی سے بات کی۔ اس کے تیس منٹ بعد تین افراد ریستوران میں آئے اور شوٹنگ شروع کر دی۔ گالو پہلی گولی لگتے ہی ہلاک ہو گیا اگرچہ جان نکلنے میں کچھ دیر لگی۔

اس کی موت کے بعد اور کئی قتل ہوئے۔ مختصر سی مدت میں سولہ افراد مارے گئے۔
گالو کا قتل ایک پورے عہد کا خاتمہ لگتا تھا۔ امریکا میں مافیا تقریباً سو سال پہلے آیا تھا۔ جب سپوزیٹو سسلی سے نیو اورلینز آیا اور آئندہ پچاس برس اپنی بے رحم انفرادیت پسندی اور انانیت کا زہر امریکی زندگی میں گھولتا رہا۔ لوسیانو کے ٹیک اوور اور سنڈیکیٹ بننے سے یہ ایک تجارتی ادارہ بن گیا۔ مگر اس کے کرتا دھرتا اب بھی انفرادیت پسندی کی بوسیدہ روایات کے غلام تھے۔ کولمبو کی موت تک ان میں سے اکثر مر چکے تھے یا 'ریٹائر' ہو چکے تھے۔ لانسکی نے مجبوراً ملک چھوڑ دیا۔ اس پر ٹیکس ادا نہ کرنے کے الزامات تھے۔ کارلو گمبینو ہارٹ اٹیک کی وجہ سے ملک بدر نہ ہوا۔ مافیا کے نئے سرغنے سنڈیکیٹ کے ساتھ جوان ہوئے تھے۔ ان کی سوچ ایک قومی کارپوریشن کے ممبران جیسی تھی۔ اگر گالو نے بھی 'راست روی' کا فیصلہ کیا ہوتا جیسا کہ اسے اصرار تھا کہ زندگی کے آخری دنوں میں اس نے ایسا ہی کیا تھا تو وہ بھی ایک بوسیدہ اور بے کار شخص ہوتا۔ وہ ادارہ کے لیے چلتی پھرتی توہین کا ذریعہ تھا۔ اس کی موت سے یہ تضاد کھل کر سامنے آیا کہ مافیا جو تقریباً سو سال پہلے اتھارٹی کی مخالفت کی علامت تھا، اب خود اتھارٹی بن چکا تھا۔ جس کی اس نے مخالفت کی تھی۔

یہ بات بھی اتنی ہی متضاد لگتی ہے کہ اس دور میں جبکہ جرائم پر قابو پانے کے نت نئے سائنسی طریقے موجود ہیں، مافیا حکومت کی ہر وہ کوشش ناکام بنا دے جو وہ جرائم کے خاتمہ کے لیے کرتی ہے۔ اس لیے کہ جس کام میں بے شمار دولت ہو اور ہر دولت مند کریمنل کے حامی حکومت کی صفوں میں موجود ہوں، وہاں حکومتی تدابیر اکثر ناکام ہو جاتی ہیں۔ 1970ء کے عشرہ میں منشیات کی سمگلنگ دنیا کی سب سے زیادہ نفع بخش صنعت بن چکی تھی۔ 1960ء میں ایک کلو ہیروئن کی قیمت مارسیلز میں اڑھائی ہزار ڈالر تھی، جہاں ہیروئن مارفین سے بنائی جاتی تھی۔ جبکہ نیویارک میں اس کی تھوک قیمت چھ ہزار ڈالر اور پرچون میں چھ لاکھ ڈالر فی کلو تھی۔ 1980ء تک چوتھے گریڈ کی ہیروئن سپلائر سے بارہ ہزار ڈالر میں ملتی تھی جبکہ نیویارک کے تھوک بازار میں اس کی قیمت اڑھائی لاکھ ڈالر تھی۔ دنیا بھر میں کوئی اور کاروبار ایسا نہیں جو اتنا منافع دے۔

1962ء میں نیویارک نارکوٹکس بیورو کی ایک پیروڈی مارسیلز میں منشیات کے بزنس کے لیے موت کا وارنٹ ثابت ہوئی۔ پالرمو مافیا کا اصلی مرکز، دنیا میں منشیات کی سمگلنگ کا مرکز بن گیا تھا۔ امریکا کی ساٹھ فیصد ہیروئن پالرمو سے آتی تھی جس کے نتیجہ میں

1973-83ء کے درمیان پالرمو اٹلی کا سب سے دولت مند شہر بن گیا۔ اس کا ایک اور نتیجہ پالرمو میں دو قتل ہفتہ وار کی اوسط بھی تھی۔

مافیا کے ہر مخالف کی زندگی خطرہ میں تھی۔ 1962ء میں دو جج، پولیس کے دو چیف اور ایک ممتاز عیسائی ڈیموکریٹ بھی اوروں کے ساتھ ان کے تشدد کا نشانہ بنے۔ مافیا اب آپے سے باہر ہو چکا تھا۔ پی ایل ٹورلے، سسلی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر مافیا کا سرگرم مخالف تھا، اور پارلیمنٹری اینٹی مافیا کمیشن کا ممبر تھا۔ اس نے ایک بل پیش کیا تھا جس کا مقصد مافیا سے نمٹنے کے لیے پولیس کو خصوصی اختیارات دینا تھا۔ جس میں بنک اکاؤنٹ چیک کرنا اور ٹیلی فون ٹیپ کرنا بھی شامل تھا۔ مگر اس کا بل قانون نہ بن سکا۔ 30 اپریل 1982ء کو لاتورلے مافیا کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

جنرل البرتو ڈلا چیزا، وہ پولیس مین جس نے 'ریڈ بریگیڈ' کو شکست دی تھی، اب پالرمو کا چیف ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوا تھا۔ جب وہ اپنی نئی نوجوان بیوی کے ساتھ پالرمو پہنچا تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ قتل کر دیا جائے گا۔

3 ستمبر 1982ء کو البرتو دلا چیزا اپنی بیوی اور محافظ سمیت ہلاک کر دیا گیا۔ جس کے بعد چرچ نے مافیا کی زبردست مخالفت شروع کی۔ پوپ نے پالرمو جا کر اس کی مذمت کی اور ایک مجرم ضمیر پارلیمنٹ نے لاتورلے بل پاس کر دیا۔ مافیا کے خلاف یہ اٹلی کی سب سے کامیاب مہم تھی۔ نومبر 1982ء میں 65 ملزموں کا مقدمہ پالرمو میں شروع ہوا جسے روزالویو سپوٹولا کے نام پر سپٹولا ٹرائل کے نام سے جانا گیا۔ سپٹولا مبینہ طور پر مافیا کا 'اکاؤنٹنٹ' تھا جس کی لاکھوں ڈالر سمگلنگ کی تفتیش نئے قانون کے تحت شروع ہوئی تھی۔ مگر سسلی میں کم از کم بیس خفیہ ہیروئن فیکٹریوں (جن کی ہفتہ وار پیداوار پچاس لاکھ ڈالر مالیت کی تھی) کے ہوتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ نیا اینٹی مافیا قانون بھی مسئلہ کی تہہ تک پہنچ سکتا تھا۔

امریکا اور اٹلی سے موازنہ کریں تو برطانیہ میں 'منظم جرم' کا معاملہ بڑی حد تک غیر پیشہ ورانہ تھا۔ 1969ء میں 'کرلے یونٹز' کے مقدمہ کے بعد ان کے وکیل صفائی نے بتایا کہ ایک موقع پر 'جڑواں بھائی' نیویارک گئے تھے۔ وہاں جا کر انہوں نے مافیا کے ساتھ تجارتی رابطے قائم کرنے کی کوشش کی اور مافیا کو یقین دلایا کہ لندن میں ان کا حکم چلتا ہے۔ پولیس ان کی تنخواہ دار ہے اور یہ کہ ان کی گرفتاری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مافیا نے اپنا نمائندہ لندن بھیجا جس کی گرفتاری میں پولیس نے دیر نہیں کی اور اسے مے فیر ہوٹل سے پکڑ کر برسٹل جیل

بھیج دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں تمہاری حکومت ہے۔'' اس نے نفرت انگیز لہجہ میں دونوں بھائیوں سے کہا جب وہ اس سے ملنے جیل آئے۔

لندن میں گینگسٹر ازم پہلی عالمی جنگ کے بعد 1920ء کے عشرہ میں آیا۔ بڑے شہروں کی تنگ و تاریک گلیوں کے اپنے جرائم پیشہ ہجوم تھے۔ مگر جس قسم کی گینگ وار کا ذکر 'ایک یادگار شہر' میں ہوا ہے، وہ امریکی مافیا کی نسبت لاس اینجلز میں میکسیکو کے نابالغ بچوں کے موجودہ تشدد سے زیادہ قریب ہے۔ مطلب یہ کہ بنیادی مسئلہ 'زمین' کا ہے۔ ہجوم سے ٹینشن اور ٹینشن سے جارحیت پیدا ہوتی ہے۔ ایک 'نارمل' سماجی صورت حال میں ہجوم کے بغیر پانچ فیصد اہم اور بااثر افراد کے پاس اظہار ذات کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ مقابلے کے کھیل اور دن کے خواب ہوتے ہیں۔ مگر ایسی سوسائٹی جو جارحیت اور تشدد کی آگ میں سلگتی ہو اس میں ذہین افراد بھی چیلنج نظر انداز نہیں کرتے۔ جارحیت کا جواب جارحیت، ان کی عزت نفس کا تقاضا ہوتا ہے اور ایک عام نارمل مقابلہ تشدد بن جاتا ہے۔

1920ء کے عشرہ میں گلاسکو کے اندر درجنوں گینگ برگ کیٹ بوائز، ساؤتھ سائیڈ سٹکرز، بیہائیو گینگ وغیرہ جیسے ناموں کے تھے **Norman Lucas** نے اپنی کتاب **Britain's Gangland Beehive** میں لکھا ہے کہ پیٹر ولیمسن بیہائیو گینگ کا لیڈر، برطانیہ کا پہلا سچا گینگ لیڈر تھا۔ اس نے کئی اٹھائی گیروں اور نقب زنوں کو اپنے گینگ میں شامل کیا اور خوب پیسا کمایا۔ برطانیہ میں پستول وغیرہ ملنے مشکل تھے اس لیے گلاسکو گینگ ٹوٹی بوتلوں اور استروں سے کام لیتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گینگسٹر ذہنیت تنگ و تاریک گلیوں کے گندے ماحول کی پیداوار ہے، جس میں ''ملکیت'' ہر فساد کی بنیاد بنتی ہے۔ اگر ہم اس حقیقت سے انکار کرنا چاہیں تو جرائم پیشہ افراد ایک ایسے سماج کی دین ہیں جس کی بنیاد ظلم اور ناانصافی پر ہے تو بھی صاف ظاہر ہے کہ جوئے گالے جیسے افراد بھی گینگسٹر نہ بنتے اگر ان کا تعلق متوسط طبقہ سے ہوتا اور وہ ہائی سکول اور یونیورسٹی گئے ہوتے۔ برطانیہ میں بھی امریکا جیسے سلمز (**slums**) ہیں، تنگ و تاریک گلیاں ہیں۔ پھر برطانوی معاشرہ کے اندر در اندازی میں گینگسٹر اس طرح کامیاب کیوں نہیں ہوئے جس طرح کہ مافیا نے امریکی زندگی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اس کا جواب شاید انگریزوں کی وہ بے بدل صلاحیت ہے جس کی مدد سے وہ ناگزیر سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں امریکا کی طرح برطانیہ میں بھی شراب پر پابندی کی تحریک

زوروں پر تھی۔ مگر برطانوی پارلیمنٹ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اسے قانون بنا دے۔ امریکا میں مافیا کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ منشیات تھیں۔ برطانیہ میں منشیات کا عادی نیشنل ہیلتھ سے ڈرگ لے سکتا تھا، اگر وہ علاج پر آمادہ ہو۔ اس لیے برٹش ڈرگ سنڈیکیٹ بننے کے امکان محدود، بلکہ معدوم تھے۔

1920ء کے عشرہ میں ایسے لگا گویا کہ مافیا سٹائل گینگسٹر ازم انگلستان آ چکا ہے۔ پہلی عالمی جنگ ختم ہوتے ہی برطانیہ نے وکٹورین ازم کو خدا حافظ کہا۔ جنسی آزادی کی نئی لہر تھی اور لوگ خوش رہنا چاہتے تھے۔ ریس ہمیشہ سے کہیں زیادہ مقبول ہو گئی۔ ریس میں روپے کی ریل پیل کا لازمی نتیجہ 'ریس گینگ' کا وجود میں آنا تھا۔ بک میکرز کو نہ صرف ''تحفظ'' کا معاوضہ (بھتہ) ادا کرنا تھا بلکہ گینگ سے دیگر ''خدمات'' اور اشیا قیمتاً حاصل کرنا تھیں جن میں سٹول، ریس کارڈ بلکہ چاک بھی شامل تھے۔ ایک برمیکھم گینگ جو برمیکھم بوائز گینگ کے نام سے جانا جاتا تھا اور جس کا سرغنہ بل کبمر تھا، مڈلینڈز اور شمال کے کئی علاقوں میں سرگرم تھا، مگر جب انہوں نے جنوب کی سمت بڑھنا چاہا تو اس کا مقابلہ لندن کے اطالوی گینگ، سبینی بوائز سے ہوا جس کے سرغنے چارلس ہیری اور جوزف سبینی تھے۔ ان کا تعلق سسلی کے مافیا سے تھا۔ **1930**ء کے تمام عشرہ میں ان کے درمیان خونریز تصادم ہوتے رہے۔ لندن کے مورنگٹن کریسنٹ میں ہونے والی ان کی ایک لڑائی جوزف سبینی اور اس کے پانچ آدمیوں کی گرفتاری پر ختم ہوئی۔ پولیس کئی ریوالور اور دوسرے خطرناک ہتھیار بھی برآمد کر کے ساتھ لے گئی۔ مقدمہ میں گواہ حاضر نہ ہوئے یا آنا بھول گئے۔ برمیکھم گینگ کا ایک ممبر چارلس سبینی کے فلیٹ کی قریبی سڑک پر مردہ پایا گیا مگر اس نے قتل کے سلسلہ میں لاعلمی ظاہر کی۔ ایسا لگا کہ نیویارک مافیا کی طرح سبینی مافیا کو بھی طاقتور ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ بالخصوص باتھ ریس کورس کی اس خوفناک لڑائی کے بعد جس کے نتیجہ میں برمیکھم بوائز ہار کر ہمیشہ کے لیے مڈلینڈز واپس چلے گئے۔ ہوسٹن کے ایک اور گینگ نے سبینی علاقہ میں وارداتیں شروع کر دیں۔ ریس ٹریک پر ان کی لڑائیوں سے پبلک اس قدر مشتعل ہوئی کہ پولیس کو ان کے خلاف سخت کارروائی کرنا پڑی۔ **Leaves** ریس کورس میں جب ہوسٹن گینگ کے سولہ افراد پکڑے گئے تو پولیس نے قید سخت کی سزائیں دلوائیں اور دوسری عالم گیر جنگ شروع ہونے تک، جبکہ سبینی برادران دشمن کی حیثیت سے نظر بند تھے۔ ریس گینگ کے درجنوں ممبر جیلوں میں تھے، ان کے سرغنے بھی جیل میں تھے، اس لیے کوئی سنڈیکیٹ نہیں تھا کہ 'حسب معمول' کاروبار جاری

رکھتا۔

برطانیہ میں گینگ ازم ہمیشہ سے دشوار اور پُرخطر تھا مگر 1960ء کے عشرہ تک امریکی مافیا کی نسبت بہت کم خطرات سے دوچار تھا۔ اس سلسلہ میں جیک 'سپاٹ' کی مثال خصوصیت کی حامل ہے۔ سپاٹ (جس کا اصلی نام کیمرن تھا) نے اپنا ایک 'ریس سرکل' بنا رکھا تھا، جو فراڈ میں ماہر تھا۔ ریس میں شرطیں لگانے والے (سپنٹر) جب جیت کی رقم میں سے اپنا حصہ لینے آتے تو حصہ دینے والے (بک میکر) فرار ہو جاتے۔ سوہو (Soho) کے اندر سپاٹ اور ایک بک میکر البرٹ ڈیمیز (مخالف گینگ کے سرغنہ بلی ہل کا دوست) کے درمیان ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ سپاٹ نے چاقو لیا اور ڈیمیز کو مارنے کے لیے ایک فروٹ شاپ میں اس کا پیچھا کیا۔ گھبراہٹ میں چاقو اس کے ہاتھ سے گرا تو ڈیمیز نے اٹھا کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ پولیس آنے تک سپاٹ خون ضائع ہونے سے بے ہوش ہو چکا تھا اور ڈیمیز ٹیکسی میں بیٹھ کر بھاگ گیا تھا۔ مقدمہ کے دوران تمام گواہوں کے برعکس سپاٹ اپنی ضد پر قائم رہا کہ پہلے حملہ ڈیمیز نے کیا تھا اور سپاٹ کو خلافِ امید ایک اسی سالہ پادری باسل اینڈریوز سے مدد بھی مل گئی۔ اینڈریوز نے عدالت میں بیان دیا کہ جب لڑائی ہوئی تو وہ فرتھ سٹریٹ میں موجود تھا اور اس نے ڈیمیز کو سپاٹ پر حملہ کرتے ہوئے خود دیکھا تھا۔ چنانچہ سپاٹ رہا ہو گیا۔ یہ بعد کی بات ہے کہ جب اس نے اخبار پڑھا تو انصاف کے نام پر اسے آگے آنے کا خیال آیا۔ اس کی گواہی سے سپاٹ رہا تو ہو گیا تھا مگر جیوری کے دماغ میں کوئی شک بھی تھا جس کی وجہ سے ڈیمیز بھی رہا کر دیا گیا۔ مگر اس فیصلہ سے برطانوی پولیس سخت برہم ہوئی۔ کیسے ممکن ہے کہ دونوں افراد بے گناہ ہوں، جبکہ دونوں نے ایک دوسرے کو زخمی کیا تھا۔ باسل اینڈریوز نے لوگوں کی ناپسندیدہ نظریں محسوس کر لیں اور پھر جب اس کی زبان سے یہ بھی نکل گیا کہ ریس پر شرطیں لگانے سے وہ کئی بار دیوالیہ ہو چکا ہے، تو شک اور گہرا ہو گیا۔ آخر اینڈریو نے مان لیا کہ سپاٹ کے حق میں گواہی کے عوض اسے رشوت کے چند پاؤنڈ ملے تھے۔ رشوت دینے والے تین اشخاص جیل بھیج دیے گئے۔ چھ ماہ بعد جب سپاٹ اپنی بیوی کے ساتھ جا رہا تھا اسے زمین پر گرا کر خوب مارا اور استرے سے زخمی کیا گیا۔ سپاٹ نے انڈر ورلڈ ضابطہ کی پابندی کی اور خوش رہا۔ مگر اس کی بیوی نے ہل ہل اور اس کے کئی آدمیوں کا نام لیا۔ ان میں سے دو ملزم گرفتار ہوئے اور دونوں سات سات سال کے لیے جیل بھیج دیئے گئے۔ اور برطانوی عوام اپنی اس خوش فہمی میں مگن رہے کہ آخری جیت انصاف کی ہوتی ہے۔

1960ء کے ایک مقدمہ کی وجہ سے اس میں کچھ شک پیدا ہوا، 'سوہو' کلب کا منیجر سلوین کونے سٹپنی میں واقع پین کلب گیا۔ اس کی گرل فرینڈ بار کی میزبان جون بینڈ نگ بھی ساتھ تھی۔ کلب میں ایک غنڈہ جیمز ناش اس کے قریب آیا جس نے اس پر اپنے بھائی رونی سے بدسلوکی کا الزام لگایا اور ہاتھا پائی شروع کر دی۔ کونے زمین پر گر پڑا، اس کی ناک اور چند دانت ٹوٹ گئے۔ پھر دو فائر ہوئے۔ چوکیدار بلی امبروز پیٹ میں گولی لگنے سے گر گیا اور دوسری گولی کا نشانہ شاید کونے بنا۔ پولیس آئی تو وہ باہر راستہ پر پڑا تھا۔ ناش کا کہیں پتہ نہ تھا مگر اس کے دو ساتھی جان ریڈ اور جوزف پائل گرفتار کر لیے گئے۔

استغاثہ کی بڑی گواہ پین کلب کی پارٹنر مسز فے سیڈلر تھی، مگر وہ روپوش ہو گئی۔ اسے تلاش کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ کونے کا دوست جان سائمن پولیس کی سخت حفاظت میں لے لیا گیا۔ کیونکہ گینگ اسے قتل کرنے کی فکر میں تھے۔ اس کی بیس سالہ گرل فرینڈ باربرا ابوٹسن اپنا چہرہ سوہو میں زخمی کروا چکی تھی۔ استغاثہ نے جج پر زور دیا کہ مقدمہ شروع کرے کیونکہ گواہوں کی جانیں خطرہ میں تھی۔ اسی روز باربرا غسل خانہ میں تھی کہ تین افراد فلیٹ کا دروازہ توڑ کر اندر آئے، باربرا کو پانی میں غوطے دیئے اور اس کے چہرہ پر مزید زخم لگائے۔ باربرا فوراً لندن بھاگ گئی۔ اپریل 1960ء میں سائمن نے گواہی دی کہ کونے کو ناش نے قتل کیا تھا۔ مگر فے سیڈلر پھر بھی عدالت میں پیش نہیں ہوئی تھی۔ جج نے خلافِ توقع مقدمہ روک دیا اور جیوری کو رخصت کیا۔ جیوری کے ایک ممبر نے بعد میں بتایا کہ اس نے ریمانڈ پر ایک قیدی کے ساتھ مقدمہ کے متعلق بات کی تھی۔ جب مقدمہ نئے سرے سے شروع ہوا تو ایک گواہ مسلسل اصرار کرتا رہا کہ لڑائی کے وقت جون بینڈ نگ شراب میں مدہوش تھی اور سائمن کسی دوسرے شراب خانے میں تھا۔ ریڈ اور پائل کے خلاف الزامات ختم کر دیے گئے اور جیمز ناش رہا کر دیا گیا۔ بعد میں تینوں پر کونے کو مجروح کرنے کا الزام ثابت ہو گیا۔ ناش کو پانچ سال اور دوسروں کو ڈیڑھ ڈیڑھ سال سزائے قید ہوئی۔ سائمنز پر بعد میں حملہ ہوا، اسے لہولہان کر کے سڑک پر چھوڑ دیا گیا۔ فے سیڈلر مقدمہ کے بعد معذرت کرتے ہوئے پیش ہوئی کہ اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ کونے کی دوست جون بینڈ نگ کو لندن چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اگلے چند برس وہ بار بار اپنا ایڈریس بدلتی رہی۔ مقدمہ کے متعلق عام تاثر تھا کہ اس سے برطانوی انصاف کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

1956ء میں دو بدمعاشوں کو قاتلانہ حملہ کی سزا سناتے ہوئے جج نے کہا، "لندن

میں1956ء کے یہ دن شکاگو میں 'پابندی' کے بدترین دنوں سے بھی زیادہ برے ہیں۔'' یہ ریمارکس پیش بینی تھی۔ اگرچہ پولیس اب بھی بے خبر تھی کہ کریز اور رچرڈسن نام کے دو گینگ پہلے ہی موجود ہیں جو جان بوجھ کر مافیا کی نقل کرتے ہیں۔

چارلس رچرڈسن 1934ء میں کیمبرویل کے اندر پیدا ہوا۔ منظور شدہ سکول میں تعلیم پائی۔ چودہ برس کا تھا کہ اس کا باپ گھر بار چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس نے 1956ء میں پیکفورڈ سکریپ میٹل کمپنی جنوبی لندن میں قائم کی۔ دراصل یہ چوری کا مال لینے کا اڈہ تھا۔ رچرڈسن میں کاروبار کی عمدہ صلاحیت تھی، اگر وہ چاہتا تو جائز طریقوں سے بھی دولت کما سکتا تھا۔ مگر اس نے اور اس کے بھائی ایڈی نے اونچے درجہ کا فراڈ اپنا پیشہ بنا لیا۔ طریقہ واردات یہ تھا کہ تھوک کا بیوپار اعلیٰ سطح پر شروع کرتے اور فیکٹری کو مال کا آرڈر دیتے۔ مال ملتے ہی فوراً اس کی ادائیگی کر دیتے۔ اسی طرح پہلا دوسرا اور تیسرا آرڈر دیتے۔ ہر آرڈر پچھلے آرڈر سے بڑھ کر ہوتا تھا۔ پھر وہ ایک بہت بڑی فرمائش، غالباً بیس ہزار پونڈ مالیت کی بھیجتے اور مال لے کر روپوش ہو جاتے اور سامان کم قیمت پر بیچ دیتے۔

1956ء میں بھی پولیس رچرڈسن کے تیزی سے پھیلتے ہوئے دھندے سے باخبر تھی۔ مگر ویسٹ اینڈ کلب کے مالکان (جنہیں انہوں نے ایک ڈاکو کرائے پر دے رکھا تھا اور جن سے بزور وہ ''تحفظ'' کا الاؤنس وصول کرتے تھے) میں سے کسی کو پولیس سے شکایت کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ کسی پر شک بھی ہوتا تو رچرڈسن اسے ڈرا دھمکا دیتا کہ اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے۔ کہتے ہیں کہ وہ اذیت پسند تھا جو جسمانی اذیت دے کر خوش ہوتا تھا۔ بچپن کے ایک دوست لارنس بریڈبری نے اس کے اذیت رسانی کے طریقوں کا ذکر کیا۔ جب رچرڈسن نے چوری کا مال ادھر ادھر لے جانے کے لیے اسے اپنے ٹرک استعمال کرنے کے لیے کہا تو بریڈبری گھبرا گیا اور بہانے کرنے لگا۔ ایک رات چارلس اور ایڈی رچرڈسن اپنے کلب آئے جو بریڈبری کی نگرانی میں تھا، اور کلب بند ہونے کے منتظر رہے۔ کلب بند ہوا تو انہوں نے بریڈبری کو میز پر لٹا لیا اور اس کی آستینیں لپیٹ دیں۔ اور اس کا بازو کہنی سے کلائی تک استرے سے چیر دیا۔ زخم کے اندر کئی بار استرا چلا کر اسے ناقابل برداشت اذیت دی۔ جس کے بعد بریڈبری نے رچرڈسن گینگ چھوڑنے کا خیال ترک کر دیا۔ 1966ء میں جنوبی افریقا کے اندر اس پر رچرڈسن کے ایک قریبی ساتھی کے قتل کا الزام لگا، جس کے متعلق رچرڈسن کو یقین تھا کہ اس نے دھوکہ دیا ہے۔ قتل کے جرم میں بریڈبری عمر بھر کے لیے قید ہو

گیا۔

کسی کو ٹارچر کرنے سے پہلے رچرڈسن جج کا لباس پہن لیتا اور مقدمہ کی کارروائی شروع ہو جاتی۔ ملزم کے کپڑے اتار دیئے جاتے۔ الیکٹرک جنریٹر کے ساتھ جسم کے حساس حصوں سمیت مختلف حصے جوڑ دیئے جاتے اور ہینڈل گھما دیا جاتا۔ ساتھ ہی پانی کی بالٹیاں اس پر انڈیلی جاتیں کہ برقی رو کے خلاف اس کی مزاحمت اور کم ہو جائے۔ ننگا جسم سگرٹوں سے داغا جاتا اور برقی چولہے قریب لائے جاتے۔ ایک شخص ہیرس پر یہ عذاب ایک گھنٹا تک نازل ہوتا رہا اس لیے کہ رچرڈسن اس سے کسی شخص کا پتہ پوچھنا چاہتا تھا۔ اس کی بے گناہی کا یقین ہو گیا تو اسے کپڑے پہننے کی اجازت دی مگر اچانک اس کے پاؤں میں چاقو گاڑ دیا۔ پھر رچرڈسن نے خلافِ معمول غلطی مانی، ہیرس سے معذرت کی اور ڈیڑھ سو پاؤنڈ اسے دیئے۔ اس کا مطلب ہے کہ رچرڈسن ٹارچر سے لذت حاصل کر رہا تھا اور اس پر قابو پانے میں ناکام ہو کر ہیرس کے پاؤں میں چاقو گاڑ دیا تھا۔ جب اس کی لذت پرستی نے تسکین پائی تو ہیرس کو رہا کر دیا۔ جولائی 1965ء میں جیمز ٹیگرٹ کو کسی کاروباری معاملہ میں بلایا گیا۔ دراصل اس پر الزام تھا کہ اس نے 1200 پاؤنڈز ادا نہیں کیے۔ ٹیگرٹ کو ننگا کر کے مارا گیا۔ اس کے دانت اکھاڑ پھینکے گئے۔ جسم کے مختلف حصوں پر استرے سے زخم لگائے گئے۔ بجلی کے تابڑتوڑ جھٹکوں سے اس کا برا حال ہو گیا۔ اسی دوران ان کا ایک ساتھی الفرڈ برمن کمرہ میں آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ لہولہان ایک شخص کرسی کے ساتھ بندھا ہے اور رچرڈسن پاگلوں کی طرح اس پر چیخ رہا ہے اور اسے بے تحاشا مار رہا ہے۔ رسیاں کھول کر ٹیگرٹ سے کہا گیا کہ اپنے جسم سے اور دیواروں سے خون صاف کرے۔

ٹیگرٹ پولیس کے پاس گیا تو سب لوگ زخم دیکھ کر اور اس سے بھی بڑھ کر اس کی کہانی سن کر کانپ گئے۔ ان دنوں بریڈبری تھامس ولڈیک کو قتل کرنے کے جرم میں جنوبی افریقا کی ایک جیل میں تھا۔ اس سے پوچھ گچھ کے لیے ایک سراغ رساں لندن سے گیا اور حقیقت جان کر قائل ہو گیا کہ رچرڈسن گینگ اپنے مدمقابل کرے گینگ سے کسی طرح کم خطرناک نہیں مگر اس وقت تک چارلس رچرڈسن ایک مالدار بزنس مین بن چکا تھا جس کے پارک لین میں شان دار دفاتر تھے۔ ضروری تھا کہ اس کی طرف بڑھنے میں احتیاط کی جائے۔ اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے کمانڈر جان روز کا انتخاب کیا گیا۔ یہ بھی شک تھا کہ پولیس کے بعض افراد بھی اس کے تنخواہ دار تھے۔ اس لیے تفتیشی دستہ کے ہر فرد کو مکمل رازداری

کا حکم دیا گیا۔ پھر بھی رچرڈسن تفتیش سے باخبر ہو گیا اور ملک چھوڑنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مگر اس وقت تک تفتیش کو ایک سال ہو گیا تھا اور فوری کارروائی ضروری ہو گئی تھی۔ اسسٹنٹ چیف کانسٹیبل جیرلڈ میکارتھر تفتیش کا انچارج چھٹی پر آسٹریا چلا گیا تا کہ گینگ کا شک دور ہو جائے اور چند روز بعد خفیہ طریقہ سے واپس آ گیا۔ پولیس نے جولائی 1966ء میں سحری کے وقت چھاپہ مارا اور رچرڈسن، اس کے بھائی اور آٹھ دوسرے آدمی گرفتار کر لیے۔ اس کی بیوی بھی گرفتار کر لی گئی۔ مقدمہ کے دوران ایک کے بعد دوسرا مظلوم آتا رہا اور رچرڈسن کے ظلم کی کہانی بیان کرتا رہا جس سے ظاہر ہوا کہ رچرڈسن کا ٹارچر انڈر ورلڈ کا نارمل ٹارچر نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ رچرڈسن اس سے لذت حاصل کرتا تھا۔

بیالیس دن کے مقدمہ کے بعد رچرڈسن کو اٹھاون برس، ایڈی کو دس برس، روئے ہال (الیکٹرک جنریٹر کا انچارج) کو دس برس اور دوسرے گینگ ممبروں کو مختلف سزائیں دی گئیں۔

جیل میں رچرڈسن نے سدھرنے کے تمام آثار ظاہر کیے۔ معذور قیدیوں کی دلجوئی کے لیے ان کے ساتھ کام کرتا رہا۔ پھر نیک چلنی کی بنیاد پر ٹرسٹی بن گیا۔ مگر پیرول کی آٹھ درخواستیں نامنظور ہونے کے بعد جیل سے بھاگ گیا۔ یہ سطریں لکھنے تک مفرور ہے، کہتے ہیں کہ پیرس میں زندگی گزار رہا ہے۔

امریکی مافیا کی طرح رچرڈسن گینگ بھی پبلسٹی سے دور رہتا تھا۔ انہیں دولت اور طاقت میں دلچسپی تھی مگر شہرت کی پروا نہیں تھی۔ ان کے بڑے مخالف کرے برادران نمود و نمائش کے شوقین تھے مگر ان کے ہتھکنڈے ایسے تھے کہ وہ رچرڈسن گینگ کے مقابلہ میں زیادہ عرصہ تک جیل سے باہر رہے۔

رونلڈ اور ریجینلڈ کرے لندن کے ایسٹ اینڈ کے اندر اکتوبر 1933ء میں پیدا ہوئے۔ سکول میں دونوں لڑاکے مشہور تھے۔ نوعمری میں دونوں پیشہ ور باکسر بن گئے۔ کچھ عرصہ فوج میں گزارا جس کے دوران اکثر سلاخوں کے پیچھے رہے۔ کوینٹ گارڈن کے ایک کلب میں جیک سپاٹ کے لیے کام کرتے رہے۔ جلد ہی وہ 'سلامتی ریکٹ' میں شامل ہو گئے۔ مال ئینڈ ز روڈ کے ایک بلیئرڈ ہال اور ایسٹ اینڈ کی گرین ڈریگن کلب پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان کی دہشت کی وجہ سے کاروبار میں خوب ترقی ہوئی۔

1956ء میں رونلڈ سخت مصیبت میں پڑ گیا جب دو ساتھیوں سمیت وہ سیپٹنی میں

ایک برطانوی مجمع میں جا دھمکا اور ایک شخص ٹیرینی مارٹن پر چلایا، ''باہر آؤ، ہم تمہیں قتل کریں گے۔'' کئی گواہوں کے سامنے انہوں نے مارٹن کو مارا پیٹا اور سنگین مار کر زخمی کر دیا، جس کی وجہ سے رونالڈ اور اس کے ایک ساتھی کو تین سال قید کی سزا ہوئی اور رابرٹ رمزے جس نے سنگین ماری تھی سات سال کے لیے جیل گیا۔

ونچسٹر جیل میں پتہ چلا کہ رونلڈ کرے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔ اس لیے اسے اپسم میں دماغی امراض کے ہسپتال بھیج دیا گیا۔

ایک دن ریگی اسے ملنے آیا مگر دوسرے ملاقاتیوں کے ساتھ جو شخص باہر چلا گیا وہ رونی تھا۔ پھر ریگی نے اپنی شناخت کرائی تو اسے بھی باہر جانے کی اجازت دینا پڑی۔ ایک صحافی نارمن لوکاس کے کہنے سے بالآخر رونی ہسپتال واپس گیا۔ 1959ء کے موسم بہار میں آزاد ہوا تو ریگی کے ساتھ مل کر دونوں نے Bow میں ڈبل آر کلب کھولا۔ (شاید رولز رائس سے بہت متاثر تھے) انہوں نے ویسٹ لینڈ کے نام سے ایک اور کلب بھی کھولا، اسمیر الڈا بارن نامی ریسٹورنٹ بھی شروع کیا۔ سیاست دانوں اور فلمی حلقوں میں گھل مل کر 'سلیبر ٹی' (نامور شخصیت) بننے کی کوشش کی۔ ان کے ریسٹورنٹ کا کھانا عمدہ تھا۔ (ایک بار میں نے بھی کھایا تھا) مگر میزبانی حد سے زیادہ فرخدلانہ تھی، اس لیے ناکام ہو گیا۔ 1959ء میں ریگی کو بزور روپیہ طلب کرنے کے جرم میں ڈیڑھ سال قید کی سزا ہوئی۔ مگر وہ جلد جیل سے باہر آ گیا۔ اور سیلیبرٹی کی زندگی اور اس کا تشدد پھر رواں دواں تھے۔

جڑواں بھائی دوہری شخصیتوں کے مالک تھے۔ ان کا کزن رونلڈ ہرٹ جس نے کچھ عرصہ جیل میں گزارا تھا، 1960ء کے عشرہ میں ان کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اس نے نارمن لوکس کو ان کے متعلق اپنے تاثرات بتائے کہ سماجی لحاظ سے دونوں بھائی خوش پوش و خوش اطوار تھے، بظاہر ان میں کوئی برائی نہیں پائی جاتی تھی، پھر بھی اشتعال کے بغیر تشدد پر اتر آتے تھے۔ خصوصاً رونلڈ پر ہسٹریا کے دورے پڑتے تھے جن کی وجہ سے وہ نیم پاگل ہو جاتا تھا۔ ایک شخص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مذاق سے کہا کہ موٹے ہو گئے ہو تو اس کا چہرہ اس بری طرح زخمی کیا گیا کہ اسے ٹانکے لگوانے پڑے۔ ایک اور شخص کی ٹانگ میں اس شبہ کی وجہ سے گولی ماری گئی کہ اس نے دھوکا دیا تھا۔ ریگی کرے نے ہرٹ سے کہا ''کبھی گولی مار کے دیکھو، بہت مزا آتا ہے۔'' ہرٹ نے لوکس سے کہا، ''میں نے بے جواز لوگوں پر بدترین تشدد ہوتے دیکھا ہے اور ان کے چہرے استرے کے زخموں سے مسخ دیکھے ہیں۔''

1965ء میں ریگی کرے نے اپنے بچپن کی محبوبہ فرانسس شی سے شادی کی۔ شی عمر میں اس سے سات سال چھوٹی تھی۔ شروع سے ہی شادی تباہ کن ثابت ہوئی۔ یونان میں ہنی مون کے دوران اس نے عروسی جوڑے میں ملبوس شی کو کمرے میں بند کیا اور شراب پینے چلا گیا۔ شی کا کہنا تھا کہ ان کی شادی ہمیشہ ادھوری رہی۔ اس پر تکمیل کی صبح کبھی طلوع نہیں ہوئی۔ دو سال بعد شی اسے چھوڑ گئی۔ اس کے بعد وہ حد سے بڑھ کر نیند کی گولیاں کھا کر ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ وہ تئیس برس کی تھی۔

یہ بھی 1965ء میں ہوا کہ دونوں بھائی زبردستی روپیہ طلب کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ ان کی ضمانت اس شبہ کی بنا پر نہ ہو سکی کہ شاید شہادتوں میں مداخلت کریں۔ لارڈ بوتھے، رونلڈ کے ایک شناسا نے یہ پوچھ کر ہاؤس آف لارڈز میں سنسنی پھیلا دی کہ مقدمہ کے بغیر وہ کب تک گرفتار رہیں گے۔ نوے دنوں اور دو مقدموں کے بعد جڑواں بھائی رہا ہو گئے۔

جڑواں بھائیوں کے سب سے بڑے مخالف رچرڈسن برادرز چارلس اور ایڈ تھے، جنہیں دریا کے جنوبی حصہ میں برتری حاصل تھی۔ حریف گینگ سرغنوں کے پاس ایک دوسرے کے لیے نفرت تھی اور نفرت کے سوا کچھ نہ تھا۔ رچرڈسن کا نائب جارج کانیل بھی رونلڈ کرے کی نفرت کا نشانہ تھا۔ اس نے رونلڈ پر ہم جنس پرستی کا الزام اعلانیہ لگایا تھا۔ اور رونلڈ کے انیس سالہ بوائے فرینڈ کے باپ کو ان کے باہمی رشتہ کی نوعیت بھی سمجھائی تھی۔ مارچ 1966ء تک رچرڈسن گینگ کا بڑا حصہ جیل میں تھا۔ صرف ان کا ایک نمایاں ممبر، جارج کارنیل گرفتاری سے بچ سکا تھا۔

6 مارچ کی شام وہ بیتھنل گرین کے 'بلیک بیگرز' نامی پبلک ہاؤس گیا، جو رونالڈ کرے کی ''جاگیر'' کے عین درمیان واقع تھا۔ رونلڈ کو اس کے وہاں موجود ہونے کی اطلاع کی گئی۔ وہ ایک سکاٹ جان بیری کو ہمراہ لے کر فوراً روانہ ہوا۔ ساڑھے آٹھ بجے وہ 'بلیک بیگرز' میں تھا۔ شام خاموش تھی اور بار تقریباً خالی تھا۔ بیری نے چھت کی طرف ہوائی فائر کیے اور رونالڈ نے موزر نکال کر رونلڈ کی دائیں آنکھ کے اوپر گولی ماری جس کے بعد دونوں وہاں سے چلے گئے۔ جب ریگی کو بتایا گیا کہ رونلڈ نے جارج کارنیل کو قتل کر دیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ ''رونی ایسے تماشے کرتا رہتا ہے۔''

پولیس کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے رونلڈ نے الزامات کی صحت سے انکار

کیا۔ اس نے اخباری نمائندوں کے ہجوم کے سامنے اپنا انکار پھر دہرایا۔ ایسٹ اینڈ میں سب جانتے تھے کہ جارج کارنیل کا قتل رونلڈ نے کیا ہے مگر گواہی دینے والا کوئی نہیں تھا۔

کارنیل کے قتل سے Van Vogat کی قابو سے باہر ہونے والی بات سچ ثابت ہوئی۔ اس قتل کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ کارنیل کسی طور رونلڈ کے لیے خطرہ نہیں تھا۔ مگر رونلڈ بے قابو ہونے اور قتل کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ کارنیل اس کی 'سلطنت' میں در آیا ہے تو موت اس کا مقدر بن گئی۔ یہ نیرو کی خصلت تھی جسے ایک غنڈے نے اپنا لیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے برطانیہ پر ثابت کرنا تھا کہ برطانیہ کا سب سے بڑا غنڈہ ڈونلڈ کرے ہے۔

اور یہ ثابت ہو کر رہا، جب قتل کو مہینے گزر گئے اور پولیس نے اسے گرفتار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لگنے لگا کہ دونوں بھائی (جیسا کہ وہ دعوے کرتے تھے) قانون سے بالا ہیں۔ جب گواہ شناخت پریڈ میں رونلڈ کرے کی شناخت نہ کر سکے تو دونوں بھائیوں نے پارٹی دے کر جشن منایا۔ پارٹی میں اخبارات کے نمائندے بھی بلائے گئے، یقین نہیں آتا مگر رونی نے اپنے بھائی کو قتل پر آمادہ کیا۔ وہ قتل کو قابل فخر کارنامہ سمجھتا تھا۔ ہرٹ نے نارمن لوکس سے کہا، رونی مسلسل اپنے بھائی سے پوچھتا اور تقاضا کرتا رہا کہ وہ اپنی باری کا قتل کب کرے گا۔ ریگی نشہ میں اکثر بڑبڑایا کرتا، ''مجھ سے نہیں ہوتا کسی کا خواہ مخواہ کسی وجہ کے بغیر قتل کرنا۔'' مگر رونی کو اس کی پروا نہیں تھی۔

اس لیے کہ ریگی بھی اپنے قاتل ہونے پر فخر کر سکے، اس کے لیے ایک شکار تلاش کیا گیا۔ جیک وٹّی نام کا ایک شخص کہ جو عام طور پر 'دی ہیٹ' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کیونکہ گنجا سر چھپانے کے لیے ہر وقت ہیٹ پہنے رکھتا تھا۔ وٹّی میں چبھتے طنز کی صلاحیت تھی۔ اس کے ریمارک جب جڑواں بھائیوں کو پہنچائے گئے تو انہوں نے سوچا کہ اس کے متعلق ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ وٹّی پہلے بھی ایک بار ان سے معذرت کر چکا تھا کہ اس کا مطلب نقصان پہنچانا نہیں تھا مگر پھر بھی جملوں کا طنزیہ سلسلہ جاری رہا۔

28 اکتوبر 1967ء کو کرے اپنے چند گماشتوں کے ہمراہ ہیکنے کے جاز کلب پہنچے اور مالک سے کہا کہ وہ یہاں جیک ہیٹ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی التجا پر کہ یہاں ایسی کوئی حرکت نہ کریں انہوں نے سٹوک نیوگٹن کا رخ کیا۔

جونہی وٹّی کمرہ میں داخل ہوا، ریگی اسے دھکیل کر ایک طرف لے گیا اور ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ گولی نشانہ پر نہ لگی تو اسے لاتوں گھونسوں سے سب نے مارنا شروع کیا

اور دوبارہ فائر کیا مگر کچھ نہ ہوا تو ریگی نے ریوالور پھینک دیا اور ایک گینگ ممبر سے چاقو لے کر وٹی کے چہرے اور پیٹ میں بار بار مارا۔ رونلڈ کی آواز آئی، ریگ رکو نہیں، اسے جان سے مار دو۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چاقو لیا اور وٹی کی گردن میں پورے زور سے گھونپ دیا۔ کار میں لاش لے کر وہ اپنے بڑے بھائی چارلس کے پاس چلے گئے اور اسے ٹھکانے لگانے کے لیے کہا۔ وہ اسے ایک شخص فریڈ فورمین کے پاس لے گیا جو بعد کی شہادت کے مطابق ان کی لائی ہوئی ایک لاش پہلے بھی ٹھکانے لگا چکا تھا۔ لاش اور کار کا کبھی کہیں پتہ نہیں چلا۔

جڑواں بھائیوں نے سوچا کہ اگر کچھ عرصہ کے لیے لندن سے چلے جائیں تو بہتر ہو گا۔ انہوں نے ہیڈلے کے قریب سفوک میں بہت بڑا مکان خریدا۔ اس گاؤں میں وہ جنگ کے دوران آ کر ٹھہرے تھے اور جاگیرداروں کی طرح رہتے تھے۔ انہوں نے چرچ کی نئی چھت بنوائی، گاؤں کے بچوں کے لیے گدھا خریدا اور عام طور پر خوش مزاجی اور وضع داری سے رہے۔

کرے برادران نے سوچا، اور ٹھیک سوچا کہ ان کی سرگرمیوں کی اطلاع پولیس کو دینے کی جرأت کسی کو نہیں ہو گی۔ کارنیل کے قتل اور وٹی کی گمشدگی کا سراغ لگاتے ہوئے پولیس کو لوگوں کی خوفزدہ اور بے مہر خاموشی کا سامنا کرنا پڑا مگر وقت پولیس کے ساتھ تھا۔ کمانڈر جون ڈی روز آف سکاٹ لینڈ نے فیصلہ کیا کہ ایک خصوصی ٹیم تشکیل دی جائے جس کا ہیڈ کوارٹر ٹنگل ہاؤس ہو۔ ایک پولیس آفس بلاک ہو جہاں سے دریائے ٹیمز ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔.. میڈیا برادران کی ''حکمرانی'' بھی روز نے ختم کی تھی۔ اس نے سراغرساں نیپر ریڈ کو ٹیم کا انچارج بنایا۔ انہوں نے جاسوسوں، مخبروں بلکہ گھریلو ملازماؤں کے بھیس میں خواتین پولیس کو بھی تفتیش پر لگا دیا۔ گھروں کی نگرانی ہونے لگی اور فرم ''Firm'' (گینگ اس نام سے جانا جاتا تھا) کے ہر ممبر کے پیچھے پولیس سائے کی طرح لگ گئی۔ مئی 1968ء میں کمانڈر روز نے دیکھا کہ انہیں آگے بڑھنے کے لیے کافی ثبوت مل گیا ہے۔ 8 مئی سحری کے وقت 68 آدمیوں کے ایک دستہ نے ایسٹ اینڈ میں کئی اچانک چھاپے مارے۔ جنوری 1969ء میں ریجینلڈ کرے، رونلڈ، لمبرانیو برادران جان بیری (جو کارنیل کو گولی مارتے وقت رونلڈ کے ساتھ تھا) فرینک فورمین اور چارلس کرے سمیت گیارہ افراد کٹہرے میں کھڑے تھے۔

الزامات کی طویل فہرست میں تین قتل تھے۔ جان کارنیل، جیک وٹی اور فرینک

مچل، مچل بھی وٹی کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ مگر اس معاملہ میں کرے برادران پر شک کیا جاتا تھا جن کی مدد سے مچل دسمبر 1966ء میں دارمور جیل سے فرار ہوا تھا۔

فرینک مچل سادہ مزاج شخص تھا جس نے زندگی کی ابتدا معذور بچوں کے ادارہ سے کی تھی۔ زندگی بھر معمولی چوریوں ٹھگیوں کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا رہا۔ وہ کئی بار جیلوں اور پاگل خانوں سے فرار ہوا۔ ایک بار اس نے ایک مجسٹریٹ پر حملہ کی کوشش کی۔ اگرچہ پاگل تھا مگر بارہ افراد مل کر اس پر قابو پا سکے۔ ریمپٹن مینٹل ہسپتال سے بھاگنے کے بعد ایک بار اس نے دو کلہاڑے چرا لیے۔ جس کی وجہ سے اس کا نام 'مچل کلہاڑا' رکھا گیا۔ ڈارٹ مور جیل میں نو سال گزارنے کے بعد وہ ٹرسٹی (قابل اعتماد) ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اسے خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ وہ ورکنگ پارٹیوں کے ساتھ جیل سے باہر جا سکتا تھا۔ وہ پبلک مقامات گھومتا پھرتا رہتا اور بوتلیں لے کر ڈارٹ مور واپس آتا تھا۔ کیونکہ شگفتہ مزاج اور خوش اطوار تھا۔ جب خفا ہوتا تو جیل حکام اسے وہ کرنے دیتے جو چاہتا تھا کیوں کہ اس کے ساتھ گزارے کا یہی آسان طریقہ تھا۔ مگر جب نو برس کے بعد بھی رہائی کے آثار نظر نہ آئے تو مچل نے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ مشکل نہیں تھا کہ وہ اکثر سارا دن جیل سے باہر رہتا تھا۔ اس سے پیشتر کہ اس کے فرار ہونے کا پتہ چلے مچل ایسٹ لندن کے ایک فلیٹ میں بیٹھا ٹیلی ویژن پر اپنے فرار ہونے کی خبر سن رہا تھا۔ فلیٹ اسے کرے نے لے کر دیا تھا اور کلب کی ایک حسینہ لیزا بھی بھیجی تھی۔

حکام نے اخبارات کے ذریعہ کوشش کی کہ مچل اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دے۔ کرے کے آدمی حکام سے مچل کے لیے یہ رعایت حاصل کرنے میں لگے رہے کہ اگر وہ جیل واپس آ جائے تو پیرول کے لیے اس کا کیس زیر غور ہو گا۔ مگر جب مچل کو پتہ چلا تو اس نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ جیل سے اکتا چکا تھا اور ایک طویل عرصہ کے بعد آزادی اور نارمل جنسی زندگی گزار رہا تھا۔ کرے سمجھ گئے کہ وہ ان کے لیے پریشانی کا سبب بنے گا۔

23 دسمبر 1967ء کو جیل سے بھاگنے کے گیارہ روز بعد کرے کا ایک آدمی فلیٹ پر آیا اور مچل کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ مچل نے لیزا کو چوما جو اس سے پیار کرنے لگی تھی اور چلا گیا۔ چند منٹ بعد لیزا نے باہر سے مختلف قسم کی آوازیں سنیں۔ استغاثہ کا الزام تھا کہ مچل زبردستی وین میں ڈال لیا گیا اور فریڈ فورمین نے سائیلنسر والے پستول کے ذریعہ اس کے سر

میں گولی ماری۔ کچھ دیر بعد مچل کی بات ہوئی تو ریگی پھوٹ کر رو دیا اور کہا کہ ''زندگی بڑا مشکل کھیل ہے۔''

کرے برادران کے جیل جاتے ہی گواہ حکام کے سامنے پیش ہو گئے۔ بار کی لڑکی جس کے سامنے کارنیل مارا گیا تھا اور جو واقعہ کے متعلق اپنی لاعلمی پر بضد تھی، مان گئی کہ وہ خوف کی وجہ سے خاموش تھی۔ اب اس نے قتل کی پوری تفصیل بیان کی اور کرے کے کزن رونلڈ ہرٹ نے وٹی کے قتل کی گواہی دی۔ چالیس روز کی عدالتی کارروائی کے بعد کٹہرے میں موجود گیارہ میں دس ملزم مجرم ثابت ہوئے۔ جڑواں بھائیوں کو تیس تیس برس اور ان کے بھائی چارلس کو دس برس قید کی سزا ملی۔ وہ دن گئے جب لندن شراب پر پابندی دور کا شکاگو بن گیا تھا۔

منظم جرم کے مطالعہ نے Yochelson اور Samenoa کے اس نکتہ کو مزید واضح کر دیا ہے جس کا حوالہ انہوں نے ''دی کریمنل پرسنالٹی'' میں دیا ہے کہ مجرم کا مسئلہ سوچی سمجھی برائی نہیں بلکہ بچگانہ خودرائی اور خودسری ہے۔ اس کی واضح مثال چارلس رچرڈسن ہے جو جھوٹ موٹ کا جج بن کر فرضی مقدموں کے فیصلے سناتا ہے۔ یہ قابو نہ آنے کا معاملہ نہیں بلکہ قابو سے باہر ہونے کی خواہش ہے۔ یہ بات جارج کارنیل کے قتل کے بارے میں بھی سچ ہے۔ رونلڈ کرے نے عدالت میں بیان دیا کہ کارنیل کو قتل کرنے سے چند روز پہلے اس نے کارنیل کے بیٹے کو ہسپتال میں پھول بھیجے تھے۔ وہ غصہ نہیں تھا بلکہ یہ احساس تھا کہ اپنی توہین کا بدلہ لینا اس کی اپنی جان پر فرض تھا۔ وہ جج بن کر ان قوانین کے مطابق سزا دے رہا تھا جو اس نے خود ایجاد کیے تھے۔ چارلس رچرڈسن کا کہنا تھا کہ وہ جیل جا کر بدل گیا ہے، پھر بھی اس نے کھلی جیل سے بھاگنے میں دیر نہیں کی کیونکہ پیرول کے لیے اس کی درخواست منظور نہیں ہوئی تھی۔ دراصل مجرم ایک ایسا بچہ ہے جو بالغ ہونے سے انکار کرتا ہے۔

سیاسی غنڈہ گردی

جس وقت پہلی عالمی جنگ کے فاتحین آپس میں مال غنیمت کی بندر بانٹ کر رہے تھے، روس ایک ہلاکت خیز خانہ جنگی سے دوچار تھا۔ یہ خانہ جنگی 1920ء میں ختم ہوئی۔ جب امریکا میں شراب پر پابندی شروع ہوئی اس وقت روس ایک غیر معمولی تجربہ کے لیے تیار تھا کہ کارل مارکس کے سوشلزم کو عملی شکل دے۔

بالشویک شروع سے پرانے جمہوری عمل پر وقت ضائع کرنے کے مخالف تھے۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے انقلاب سے پہلے ایک پارلیمنٹ، ایک دستور ساز اسمبلی کی تجویز پیش کی تھی۔ مگر صرف تقریباً پچیس فیصد ووٹ ملنے کی وجہ سے اسے بزور توڑ دیا۔ 1921ء تک روس کے اکثر لوگ کمیونسٹوں اور مخالفین کے ساتھ ان کے سلوک سے تنگ آ گئے تھے۔ قتل و غارت سے انہوں نے فرانسیسی انقلاب جیسی دہشت پھیلائی تھی۔ پیٹروگراڈ سے پرے Kronstad جزیرہ پر چودہ ہزار ملاح کسانوں کے نمائندے بنے ہوئے تھے اور ایسی سوشلسٹ حکومت کا مطالبہ کرتے تھے جس میں بالشویک نہ ہوں۔ لینن نے فوج بھیجی اور ان میں سے اکثر ملاح مارے گئے۔ 1922ء میں اس نے ادب پر سنسر شپ پھر لگا دی۔ مقصد یہ تھا کہ انقلاب دشمن کتابوں کی اشاعت روکی جائے۔ خانہ جنگی ختم ہونے اور زار کی فوجوں کی ہزیمت کے بعد لینن نے فیصلہ کیا کہ پیداوار کے تمام ذرائع یک لخت ریاست کی تحویل میں لینا زیادتی ہے۔ نئی اقتصادی پالیسی کے مطابق صرف بڑی صنعتیں ریاست کی ملکیت ہوں گی، چھوٹے تاجر اور کسان حسب معمول کام کرتے رہیں گے۔ لینن ہر لحاظ سے حقیقت پسند تھا جو مارکسزم کے اثر کا اندازہ کرنے کے لیے اسے قدم بہ قدم نافذ کرتا۔ مگر وہ جنوری 1924ء میں فوت ہو گیا۔ اس کی جگہ تین افراد زینوفیف، کامینوف اور سٹالن نے لی۔ سٹالن پارٹی کا سیکرٹری جنرل تھا۔

فوراً ہی سٹالن اور پارٹی سب سے ممتاز نظریہ ساز لیوٹراٹسکی (جسے سول وار جیتنے کا اعزاز حاصل تھا) کے درمیان یہ اختلافات پیدا ہو گئے کہ روس دنیا بھر میں کمیونزم پھیلائے یا اپنی سرحدوں کے اندر اسے کامیاب کرنے کی کوشش کرے۔ ٹراٹسکی کا خیال تھا کہ پارٹی بین الاقوامی کمیونزم کے لیے کام کرے۔ سٹالن زیادہ حقیقت پسند تھا اس کی رائے تھی کہ روس اپنے مسائل پر توجہ دے۔1927ء میں ٹراٹسکی کا پارٹی سے نکلنا اور اس کے بعد جلاوطن کیا جانا سٹالن کی جیت تھی۔ زینوئیف اور کامینوف بھی پارٹی کی تنقید کا نشانہ بنے۔ سٹالن اب روس کا ڈکٹیٹر تھا۔

1929ء ٹراٹسکی کی جلاوطنی کے سال سٹالن نے سوسائٹی میں انقلابی تبدیلی لانے کے لیے پارٹی کو ذریعہ بنانے کا ارادہ کیا۔ یعنی ہر بارسوخ شخص اجتماعیت کے متعلق مارکس کے نظریہ کو صحیح مانے۔ (سٹالن نے لینن کی نئی اقتصادی پالیسی پچھلے سال منسوخ کر دی تھی) اب سرمایہ کاری اور انفرادیت پسندی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مارکس کے مطابق پرولتاریوں کو نئے سماج کے سچے راہنما بننے اور اسے منظم کرنے کا موقع دیا جائے۔ ٹریکٹر چلانے والا کاشتکار دن کا کام ختم کر کے مقامی پارٹی میٹنگ میں جائے تاکہ مارکس اور لینن کی تعلیمات سے واقف ہو سکے، یا انقلاب کے متعلق اوپیرا دیکھے۔ دانشور ذاتی مسائل فراموش کر کے سیاسی اور اجتماعی حوالوں سے سوچنا شروع کریں۔ ان کا فرض ہے کہ عوام کی تربیت کریں اور انہیں اپنی منزل پہچاننے میں مدد دیں۔ لکھاری جو انسان کی فطرت اور تقدیر کی نیرنگیوں میں گم رہتے ہیں اور اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ جب عوام کے ساتھ ان کا روحانی رشتہ قائم ہو گا تو انہیں فوراً انسانی تقدیر کی سمجھ آ جائے گی۔

دراصل روسی ادب اور آرٹ انقلاب کے بعد ترقی کر رہا تھا۔ زار کا زوال ترقی اور آزادی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ دانش وروں کی نظر میں کمیونزم آزادی کا محافظ تھا۔ آرٹ، ادب اور سینما میں انقلاب نے جدیدیت کی روح پھونک دی تھی۔Batleship Potemkin، 1925ء میں اُس زمانے کی سنسنی خیز تخلیق تھی۔ مایاکوفسکی اور السینن کی شاعری عوام کے دلوں کی دھڑکن تھی۔ یہی حال شولوخوف کی The Tales of the Don' اور بیبل کی 'ریڈ کیولری' کا تھا۔ دیمیتری سوستانووچ کی پہلی سمفنی (1925ء) نے دنیا بھر کی توجہ حاصل کی جبکہ اس کا طنزیہ منظوم میوزیکل ڈراما 'The Nose'' دانشوروں اور مزدوروں میں بہت مقبول تھا۔ مگر اس ابتدائی دور میں بھی کئی لکھاری کمیونزم کے بارے میں اپنے تحفظات بیان کرتے ہیں۔ اور 'بہادر نئی دنیا' زندگی میں اپنا راستہ بنا رہی تھی۔ اولیشا کا

ناول ''Envy'' ایک ایسے انفرادیت پسند کی کہانی ہے جو کامریڈز کے اس معاشرہ میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ کہنے کو یہ اس انفرادیت پسند کے رویہ کا تنقیدی جائزہ ہے مگر اصل مقصد اجتماعیت پسندی کی کھلی مخالفت ہے۔ زمیاتن کا 'We'۔ اور آرویل کا ناول 1984ء کی وہ حیرت انگیز پیش بینی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مستقبل کی ایک ریاست تمام آزادی اجتماعیت کے نام پر کچل دے گی۔

1930ء تک سٹالن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انفرادیت پسندی کی یہ بحث ختم ہونی چاہیے جو پرانے بورژوائی اصولوں کی گونج تھی۔ آج سے ادب اور آرٹ سیاسی ہوں جن کا مقصد عوام کی سربلندی ہو۔ تجربات ختم ہوں کہ عوام تجرباتی تخلیقات نہیں سمجھ سکتے۔ وقت کا تقاضا انقلابی پرولتاری آرٹ ہے۔ جو لکھاری عوامی ادب کی تخلیق پر آمادہ تھے انہیں رہائشی سہولتیں اور معاشی تحفظ مہیا کیا گیا۔ ان لکھاریوں کی تصنیفات چونکہ سرکاری اشاعتی ادارے شائع کرتے تھے اس لیے وہ کثیر تعداد میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ببل، زمیاتن اور اولیشا جیسے انفرادیت پسندوں کو نظر انداز کر کے انہیں ان کی تنہائی کا احساس دلایا جاتا تھا۔ مایاکوفسکی نے جسے (مصنفین کی یونین) آر اے پی پی میں شمولیت پر مجبور کیا گیا تھا، خودکشی کر لی۔ زمیاتن ملک سے باہر چلا گیا، الیشا نے لکھنا ترک کر دیا اور ببل آخر کار کسی نظر بندی کیمپ میں لاپتہ ہو گیا۔ میئر ہولڈ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ اس کی گرفتاری کے بعد اس کی بیوی قتل کر دی گئی۔ شستاکووچ 'فارمل ازم' کی وجہ سے برا سمجھا گیا کہ اس کے کام میں پروپیگنڈا کم اور موسیقی زیادہ ہے۔ مجبور ہو کر اس نے اپنی چوتھی سمفنی واپس لے لی جو اس وقت تک اس کی سب سے اچھی تخلیق تھی۔

روس میں جو ہوا وہ فرانس میں ہوتا اگر رابسپیری اقتدار میں رہتا اور ڈکٹیٹر بن جاتا۔ سٹالن ہوشیار و خودسر تھا۔ اگرچہ اتنا ذہین نہیں تھا۔ اسے مارکس ازم میں اندھا یقین تھا۔ وہ ارادہ کیے ہوئے تھا کہ ذاتی ملکیت کو اس کی ہر صورت میں ختم کر دے۔ چھوٹے مالکان اپنی زمینوں سے بے دخل کر دیے گئے۔ ایسے چھوٹے فارم یکجا کر کے ایک مشترکہ بڑا یونٹ بنا دیا جاتا تھا۔ غذائی اجناس کی پیداوار میں ڈرامائی کمی ہوئی، اگرچہ اعداد و شمار سے لوگوں کو بے خبر رکھا جاتا تھا۔ اس بالجبر اجتماعیت پسندی کے خلاف مزاحمت پیدا ہونے سے سٹالن فکرمند ہوا تو اس نے اعلان کیا کہ اس کے افسر اس معاملہ میں 'ضرورت سے زیادہ سرگرمی' سے کام لے رہے ہیں، جبکہ انہیں قدم بہ قدم آگے بڑھنا چاہیے۔ اس ترکیب سے وہ خود اپنے افسروں کے

مقابلہ میں کسانوں کا حامی لگنے لگا۔ مگر چھوٹے مالکان کو بے دخل کرنے کی پالیسی جاری رہی، یہاں تک کہ لاکھوں جلاوطن ہوئے یا ہلاک کر دیے گئے۔1931-33ء کے قحط میں ایک کروڑ افراد مزید ہلاک ہوئے۔

اس سنگین صورتِ حال سے پارٹی کارکنوں میں سخت بے چینی پیدا ہوئی۔ ان میں سے بعض کارکن خفیہ طریقہ سے ٹراٹسکی کو اعداد و شمار سے باخبر رکھتے۔ ٹراٹسکی کا اخبار انہیں شائع کرتا اور مطالبہ کرتا کہ پارٹی لیڈرشپ میں بنیادی تبدیلی ناگزیر ہے۔1933ء میں سٹالن نے ہزاروں پارٹی کارکن پارٹی سے نکال دیئے۔ اس کے پرانے ساتھیوں کامینوف اور زینوئیف کو سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔

قدیم روم ہوتا تو سٹالن قتل کر دیا جاتا۔ سوویت روس میں پولیس کی آہنی دیوار نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ مگر سٹالن کی بیوی نے اس دہشت گردی سے تنگ آ کر 1932ء میں خودکشی کر لی۔ سٹالن کو اس المیہ نے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ میں مستعفی ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اراکین کو اپنی خوش نصیبی کا یقین نہیں آتا تھا اس لیے وہ اپنی خوشی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے۔ آخرکار مولوٹوف نے خاموشی توڑتے ہوئے اعلان کیا کہ پارٹی کو سٹالن پر پورا اعتماد ہے۔ اس کے بعد سٹالن نے پھر یہ غلطی کبھی نہیں دہرائی۔

مگر اپنے ساتھیوں پر بے اعتباری اور شک بڑھ گیا۔ یہ سوچ کر کہ بعض لوگ اس کی جان کے درپے ہیں اس نے پہلے وار کرنے کو جان بچانے کا بہتر طریقہ سمجھا ہوگا۔ 1934ء میں پارٹی سیکرٹری کیروف قتل کر دیا گیا۔ سٹالن نے ایسے تمام افراد سے نجات پانے کا فیصلہ کر لیا جنہیں اس کی قیادت پر معمولی سا بھی شک ہو۔ کیروف کے قتل کا مقدمہ ختم ہونے کے بعد ایک کمیشن سے کہا گیا کہ عوام کے دشمن ختم کر دیئے جائیں۔ جلد ہی کامینوف اور زینوئیف سمیت پارٹی کے ممتاز اراکین کے خلاف حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں مقدمے شروع ہو گئے۔ سب کے سب مجرم ثابت ہوئے اور سب کے سب فوراً ہلاک کر دیے گئے۔

باقی دنیا اس پر حیران رہ گئی کہ ملزموں میں سے اکثر نے عدالت کے سامنے جرم کا اعتراف کیا اور یہ سلسلہ آئندہ کے 'نمائشی مقدموں' میں بھی جاری رہا۔ ان اعترافات کے متعلق عام خیال تھا کہ ملزموں کو ٹارچر کر کے ان سے حاصل کیے گئے ہیں۔ مگر 'Darkness at Noon'

میں آرتھر کوئیسلر نے لکھا ہے کہ وہ پرانے انقلابی مارکسزم کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ کے اسیر تھے۔ وہ انقلاب کے لیے لڑے تھے۔ انقلاب آ چکا تھا اور اب وہ فالتو آدمی تھے۔ انہیں انقلاب کے لیے آخری قربانی دینے پر آمادہ کیا جا رہا تھا۔ اگر وہ انکار کرتے اور سٹالن کی مذمت کرتے ہوئے موت کو گلے لگا لیتے تو گویا وہ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار دے دیتے جس سے وہ کمیونسٹوں کو مارتے اور انقلاب کی توہین کرتے۔ دراصل کمیونزم یرغمال کی صورت سٹالن کے ہاتھ آ گیا تھا جسے انسانی ڈھال کی طرح اس نے اپنے سامنے تان لیا تھا۔ اگر پرانے کمیونسٹ اس پر فائر کرتے تو کمیونزم، ان کا سب سے بڑا خواب، پاش پاش ہو جاتا۔

نمائشی مقدمے، جاری رہے اور ملک بھر میں اندھا دھند گرفتاریاں ہوتی رہیں۔ جیل بند مزدور، پادری، سرکاری افسر اور دانشور سب تفتیش میں شامل تھے۔ ایک اندازے کے مطابق 38-1934ء کے درمیان ستر سے اسی لاکھ افراد سزا یاب ہوئے۔ ان میں پارٹی ممبروں کی کثیر تعداد، سنٹرل کمیٹی کے 140 اراکین جو 1934ء میں منتخب ہوئے تھے، سبھی شامل تھے۔

درحقیقت سٹالن نے کمیونزم کو اتنا شدید نقصان پہنچایا جو کمیونزم کے تمام دشمن مل کر بھی اسے نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مارکسزم کا بنیادی مقصد دنیا میں بدی کے وجود کی وضاحت ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا میں بدی سرمایہ داروں کے ظلم کی وجہ سے ہے۔ ایک بار اس ظلم سے نجات مل جائے تو دنیا سکھ کا سانس لے گی اور ہمیشہ خوش رہے گی۔ حالانکہ سوویت روس اس امر کی زندہ مثال ہے کہ اقتصادیات کے ساتھ تو بدی کا شاید ہی کوئی تعلق ہو مگر انسانی تکبر کے ساتھ اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔

باقی یورپ میں یہ بات اتنی واضح نہیں تھی۔ طویل جنگیں اپنے پیچھے تبدیلی کی زبردست خواہش چھوڑتی ہیں۔ جب سپاہی جنگ کے بعد گھر واپس آئے اور انہیں جنگ کے بعد کی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں سرفہرست ان کے معاشی مسائل، ضروریات زندگی کی ہوش ربا قلت اور ان کے اپنے کٹے پھٹے اعضا تھے تو ان کی نظر قدرتی طور سے روس کی جانب اٹھتی تھی۔ جہاں (جیسا کہ سوشلسٹ کہتے تھے) سماجی انصاف کے معاملہ میں تاریخ کا سب سے بڑا تجربہ ہو رہا تھا۔ یورپ کی کمیونسٹ پارٹیوں میں یکا یک ڈرامائی انداز میں ممبروں کی بھرمار شروع ہو گئی۔ جرمنی اور اٹلی جہاں سخت بے روزگاری کا سامنا تھا ایسا لگتا تھا کہ مزدور کسی وقت بھی پیداوار کے ذرائع پر قبضہ کر لیں گے۔ 1920ء میں اطالوی مزدوروں نے چھ سو

فیکٹریوں پر قبضہ کر کے انقلاب کی آہٹ کا اعلان کیا۔ جرمنی میں کیمونسٹ پارٹی ہر بڑے شہر کے ہر کونے میں پھیل گئی۔ ہر طرف سرخ جھنڈے لہراتے ہوئے مزدوروں کے جلوس سڑکوں پر تھے یا فیکٹریوں کے باہر کیمونسٹ کارکنوں کے خیالات سنتے تھے۔ مسولینی، ایک سوشلسٹ جو اپنے آپ کو اٹلی کا لینن سمجھتا تھا اور جسے 1919ء کے انتخابات میں بھاری شکست ہوئی تھی مگر 1920ء کی ہڑتالوں اور فسادات نے اسے پھر ایک موقع مہیا کر دیا تھا کہ اٹلی کے سیاسی معاملات میں سرگرمی سے حصہ لے۔ اس کے 'جنگجو دستے' کیمونسٹوں پر حملے کر کے ہڑتالیں ناکام بنانے کی کوشش کرتے۔ وہ انہیں 'وطن دشمن انتہا پسند' کہتے تھے۔ ایک قدیم رومی سمبل، چھرے، لکڑیوں کے بنڈل درمیان میں کلہاڑا، ان کا سمبل تھا، جو طاقت کی علامت تھا۔ 1922ء میں فاشسٹوں نے روم پر قبضہ کر لیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بادشاہ نے مسولینی کو وزیراعظم بنا دیا۔ اطالوی تاجروں اور بینکروں نے ایک محبِ وطن کو کیمونسٹوں پر ترجیح دی۔

جرمنی میں ایک فوجی نائیک اڈولف ہٹلر، جنگ (جس میں اس نے نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں) سے واپس آ کر میونخ میں مزدور پارٹی میں شامل ہو گیا۔ کیمونسٹ انقلاب جرمنی بھر میں پھیل چکا تھا۔ کہیں مزدور کونسلیں تھیں تو کہیں سپاہیوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ کرسمس 1918ء تک ایک انقلابی گروپ Spartacist (گلیڈیئٹر انقلاب کا لیڈر) نے برلن پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ گروپ دو سال پہلے Carl Liebknecht اور روزا لکسمبرگ نے بنایا تھا۔ اب الیگزنڈر پلاٹز میں دو لاکھ مزدور سرخ پرچم لہرا رہے تھے۔ مسولینی کے فاشسٹوں جیسی ایک تنظیم 'آزاد فوج' برلن میں داخل ہوئی اور لکسمبرگ و دیگر انقلابی رہنماؤں کو قتل کر کے کیمونسٹ انقلاب کو کچل دیا۔ میونخ میں کارل ایزنر نے انقلاب کو بہتر طریقہ سے منظم کیا۔ بادشاہ فرار ہو گیا اور بویریا جمہوریہ بن گیا۔ مسولینی کی طرح ہٹلر بھی کیمونسٹوں کے عالمی انقلاب کے نعرے سے بیزار تھا اور یہ بات اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکی کہ اکثر کیمونسٹ لیڈر یہودی تھے۔ اس کا اندازہ اسے جنگ سے پہلے ہو گیا تھا جبکہ وہ آرٹ سٹوڈنٹ کی حیثیت سے میونخ اور برلن میں نیم فاقہ کش بھٹک رہا تھا اور اکثر یہودی عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ شاید وہی دن تھے جبکہ اس کے دل میں پہلی دفعہ یہودیوں سے نفرت پیدا ہوئی تھی۔

سولہ اکتوبر 1919ء ہٹلر کی زندگی اور یورپ کی تاریخ کا عہد ساز دن ہے۔ 'جرمن

ورکر پارٹی' کی ایک میٹنگ میں ہٹلر نے اپنی زندگی کی پہلی تقریر کی، اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک پیدائشی مقرر ہے۔ اس نے ایک گھنٹا تقریر کی اور ہجوم مسحور ہو گیا۔ اگلی دفعہ اس کے سننے والوں میں دگنا، تگنا اور پھر چوگنا اضافہ ہوا اور پھر ان کی تعداد ہمیشہ بڑھتی رہی۔

اس کی تقریر کا راز اس کے واضح خیالات اور شدید جذبات تھے جو مارکس کی آئیڈیالوجی کی طرح نیچرل اور سادہ تھے۔ جرمنی کو سیاست دانوں اور یہودیوں کی غداری سے شکست ہوئی تھی۔ (جرمنی میں یہ یقین عام تھا کہ جرمن فوج اس وقت بھی طاقتور اور ناقابل شکست تھی جب اسے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا) یہودی بین الاقوامی سوشلزم کے حق میں تھے کہ ان کا اپنا کوئی ملک نہیں تھا۔ نہ وہ ان قوموں کو برداشت کرتے تھے جن کی جڑیں اپنی زمین میں تھیں۔ جرمنوں کی اذیت دور کرنے کے لیے جرمنوں جیسی جرأت چاہیے تھی۔ لوگوں کو صرف ان سے طاقت چھیننی تھی جنھوں نے جرمنوں کے ساتھ غداری کی تھی اور جرمنی کے عظیم ماضی سے سبق حاصل کرنا تھا۔

نومبر **1923**ء میں ہٹلر نے مسولینی سے متاثر ہو کر بغاوت کی کوشش کی۔ اس کے نیشنل سوشلسٹوں (جو اَب نازی کہلاتے تھے) نے وزارت جنگ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر آسانی کے ساتھ منتشر کر دیئے گئے۔ ہٹلر گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر غداری کا مقدمہ چلایا گیا۔ اس نے عدالت میں ایسی خطابت سے کام لیا کہ ججوں نے اس کی جگہ اپنے آپ کو ملزموں کے کٹہرے میں پایا۔ بہرحال اسے صرف پانچ سال سزائے قید ہوئی جس میں سے اس نے نو مہینے جیل میں گزارے۔ جیل میں اس نے اپنی خودنوشت سوانح ''میری جدوجہد'' لکھی جس کا مرکزی خیال شمالی یورپ کے لوگوں (نارڈک) کی نسلی برتری تھی۔ جو قومیں نارڈک نہیں تھیں ان میں نیگرو، یہودی اور سلاف (وسطی اور مشرقی یورپ کی قومیں) شامل تھے۔

برطانیہ اور فرانس میں کمیونسٹ انقلاب کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ ان دو ملکوں کو جنگ سے فائدہ حاصل ہوا تھا۔ مگر اتنی سماجی بے چینی موجود تھی جو سوشلسٹ کاز کو ہوا دینے کے لیے کافی تھی۔ **1924**ء میں دونوں ملکوں میں سوشلسٹ اقتدار میں آئے۔ مگر جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ معاشی مسائل حل نہیں کر سکتے تو ان کی مقبولیت کم ہو گئی۔

جب ہٹلر جیل سے باہر آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے سننے والوں کی تعداد کم ہو گئی ہے اور اب ان میں وہ پہلی سی گرم جوشی بھی نہیں۔ جب اس نے بغاوت کی تھی اس وقت افراطِ زر کی وجہ سے جرمن مارک کی قیمت ایک ڈالر کے مقابلہ میں تقریباً صفر رہ گئی تھی۔

برطانیہ اور فرانس کی سوشلسٹ حکومتوں نے جرمنی کے معاملہ میں نسبتاً بہتر رویہ اپنایا، جس کی وجہ سے جرمنی کی صنعت سنبھلنا شروع ہوگئی۔ خوشحالی بڑھی تو جرمنوں نے شکست کے جھوٹے بہانے تلاش کرنا چھوڑ دیئے۔ مزدور روزگار ملنے پر خوش تھے اس لیے انہیں سیاست میں دلچسپی نہ رہی۔ سیاست، جو ہمیشہ انقلابیوں کے ہونے کا جواز بنتی ہے۔ مگر چھوٹے تاجر اور کسان جن کے تمام اثاثے افراط زر نے چاٹ لیے تھے اب بھی اپنے آپ کو تباہ حال اور ستم رسیدہ سمجھتے تھے۔ ہٹلر نے اب ان کی طرف توجہ کی اور مزدوروں کے بجائے ان کا ترجمان بنا۔ اس نے سیاسی شخصیتوں سے ملنا جلنا شروع کر دیا جو اسے کمیونزم کے خلاف ایک دیوار سمجھتے تھے۔ فوج کے ساتھ بھی اس کے تعلقات تھے۔ جنرل لڈنڈورف اسے فوج کا دوست سمجھتا تھا۔ ہٹلر نے اپنی بنیادیں مضبوط کیں۔ بڑے بڑے صنعت کاروں کی حمایت حاصل کی اور نازیوں کو ایک زبردست فوجی قوت بنا دیا۔

امریکا میں جنگ کے بعد کے معاشی بحران کا عرصہ بہت کم تھا۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرہ میں کاروبار پھیلتا رہا۔ برطانیہ کے بجائے اب امریکا 'دنیا کی ورکشاپ' بن رہا تھا۔ برطانیہ کی اپنی صنعت کو 1925ء میں ونسٹن چرچل کے اس فیصلہ سے دھچکا لگا جب وہ جنگ سے پہلے کے نرخوں پر گولڈ سٹینڈرڈ واپس لایا۔ یہ فیصلہ قومی وقار کے لیے اچھا مگر تجارت کے لیے برا تھا۔ کیونکہ پونڈ سٹرلنگ کی قیمت اب وہ نہیں تھی جو 1914ء میں تھی۔ اطلانتک پار خوشحالی سے اعتماد پیدا ہو رہا تھا اور اعتماد خوشحالی میں اضافہ کر رہا تھا۔ جب برطانیہ، فرانس اور جرمنی نے امریکا سے اپنا سود کم کرنے کی درخواست کی تا کہ یورپ سے سونے کا امریکا جانا بند ہو تو امریکا فوراً مان گیا۔ اب قرض لینا آسان تھا۔ اس امید افزا ماحول میں ہر شخص قرض لینا چاہتا تھا۔ ہر شخص سرمایہ کاری کے لیے تیار تھا۔ ایسی کمپنیاں بھی تھیں جو دوسری کمپنیوں میں قرض کی رقم سے سرمایہ کاری کرتیں جو اس کے بدلے مزید کمپنیوں میں سرمایہ کاری کرتیں۔ کارل مارکس ہوتا تو اس سسٹم کی خرابیوں کی طرف اشارہ کرتا۔ منافع محنت سے پیدا ہوتا ہے اگر لاکھوں سرمایہ کار منافع کے انتظار میں ہوں تو شاید اتنا منافع حاصل نہ ہو سکے جو ان کے لیے کافی ہو۔ فلوریڈا میں زمین کی مہنگائی سے بھی سرمایہ دارانہ معیشت کی خرابیوں کا اندازہ ہوا۔ سارے نودولتیے دھوپ میں گھر بنانا چاہتے تھے اس لیے فلوریڈا میں زمین کی قیمتیں بتدریج بڑھتی رہیں۔ آخر دلدل اور کیچڑ کے علاقہ کی زمین بھی سمندر کنارے زمین کی قیمت پر بکی۔ جبکہ سرمایہ کار سمجھتے رہے کہ وہ فلوریڈا کی 'اصلی زمین' خرید رہے ہیں۔ جب لوگوں نے

موقع پر جا کر اپنی زمین دیکھی تو وہ بے فائدہ اور بیکار تھی۔ انہوں نے اسے ہر قیمت پر بیچنے کی کوشش کی۔ فلوریڈا میں زمین کی قیمت اتنی گری کہ 1925ء کے مقابلہ میں 1928ء کے اندراس کی قیمت کا چھٹا حصہ بھی حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔

اکتوبر 1929ء میں سرمایہ کار کمپنیوں کو اس تباہی نے آن لیا جس کی پیش بینی مارکس کر سکتا تھا۔ کسی ظاہری وجہ کے بغیر 24 اکتوبر کو وال سٹریٹ کے سٹاک ایکسچینج نے اعتماد کھو دیا اور ہر شخص نے شیئر بیچنا شروع کر دیے۔ ایجنٹوں نے خطرہ کا احساس کر لیا اور مل کر پھر خریدنے لگے۔ مگر ایک ہفتہ بعد پھر وہی صورت حال واپس آ گئی اور تین برس جاری رہی۔ نو ہزار بینک بند ہو گئے اور امریکی محنت کشوں کا چوتھا حصہ بے روزگار ہو گیا۔

چونکہ تمام بڑے صنعتی ملک آپس میں تجارت کیا کرتے تھے اس لیے تباہی کا دائرہ دنیا بھر میں پھیل گیا۔ صرف روس پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ بھی اس لیے کہ سٹالن کے دور میں روس کے پاس بیچنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

جرمنی میں معاوضے کم کر دیئے گئے اور ٹیکس بڑھا دیئے گئے۔ ہٹلر سے نجات نیا عذاب تھا۔ 1929ء کی رائے شماری میں اسے زبردست شکست ہوئی۔ جو حکومت نئی خوشحالی کی ذمہ دار تھی اس نے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ مگر 1930ء کے انتخابات میں جبکہ بے روزگاروں کی تعداد تیس لاکھ ہو چکی تھی نازیوں نے 107 ووٹ حاصل کیے اور جرمنی میں دوسری بڑی پارٹی کا درجہ حاصل کیا۔ کمیونسٹ معمولی فرق سے تیسرے درجہ پر رہے۔ 1933ء کے انتخابات میں نازیوں کو 230 نشستیں ملیں۔ وہ اس اکثریت کے لیے ناکافی تھیں۔ جو نازیوں کی ضرورت تھی۔ تعطل ختم کرنے کے لیے مزید انتخابات ہوئے۔ اب نازیوں نے نشستیں ہاریں اور کمیونسٹوں نے جیتیں۔ آخر جب مخلوط حکومت بنانے کی کوششیں ناکام ہو گئیں تو صدر ہنڈن برگ نے مجبوراً ہٹلر کو چانسلر مقرر کیا۔ یہ جنوری 1933ء کا واقعہ ہے۔

ہٹلر نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس امید پر کہ شاید وہ مشتعل ہو کر قانون توڑے اور اس کے طوفانی دستوں کو اسے کچلنے کا موقع مل جائے مگر اسے مایوسی ہوئی۔ کمیونسٹوں نے یہی کافی سمجھا کہ مزدوروں کو بغاوت پر آمادہ کریں اور خود ہٹلر کا نشانہ بننے سے گریز کریں۔ پھر 27 فروری 1933ء کو ریشتاغ (پارلیمنٹ) کی عمارت میں آگ لگ گئی۔ مجرم کوئی ولندیزی سابق کمیونسٹ وان ڈیرلوبے تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ کام اس نے اکیلے کیا تھا۔ (اگرچہ اکثر مؤرخ اب بھی کہتے ہیں کہ

آگ نازیوں نے لگائی تھی) اگلے دن ہٹلر نے ہنڈن برگ سے ایک حکم پر دستخط کروائے جس کی رو سے انسانی حقوق کی کئی تنظیمیں معطل کر دی گئیں۔ پھر جس آسانی کے ساتھ جرمنی میں کمیونزم کا خاتمہ کیا گیا اسے دیکھ کر باقی یورپ کی تمام کمیونسٹ پارٹیاں حیران رہ گئیں۔ وان ڈیرلوبے کو گولی مار دی گئی۔

باقی دنیا نے جرمنی میں نازی ازم اور اٹلی میں فسطائیت کے آ جانے سے کوئی قابل ذکر خطرہ نہیں محسوس کیا۔ عالمی معیشت بحران میں تھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے باصلاحیت رہنماؤں کی ضرورت تھی۔ وہ حکومت کی مداخلت سے معیشت کو سنبھالا دینا چاہتے تھے۔ ایک اصول، جسے **Keynesianism** کے نام سے جانا گیا، کینز نہیں مانتا تھا کہ سپلائی اور ڈیمانڈ کے ذریعہ معیشت بحال ہو سکتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ بے روزگاری سے نجات حاصل کرنے کے لیے حکومت قومی ٹیکسوں کے ذریعہ روزگار پیدا کر سکتی ہے۔ اس طرح نئے مزدوروں کے پاس خرچ کرنے کے لیے روپیہ ہوگا اور معاشی مشین بتدریج کام کرنا شروع کر دے گی۔ ایک حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ پیداوار کم ہو کہ زیادہ، افرادی قوت میں کمی نہیں ہوتی، نہ خام مال کی دستیابی میں فرق پڑتا ہے۔ کھانے والوں کی تعداد بھی ایک جیسی ہوتی ہے۔ مگر جرأت اور اعتماد کی کمی ہوتی ہے۔ اگر کوئی حکومت یہ قلت دور کر سکے تو خوشحالی دنوں کی بات ہے۔

اٹلی میں معیشت کی بحالی کے لیے مسولینی نے 'دگنی گندم اگاؤ' مہم شروع کی۔ یہ ایک عمدہ خیال ثابت ہوتا اگر دنیا کی بدحالی راستہ کی دیوار نہ بن جاتی اور گندم کے بھاؤ گر نہ جاتے اور وہ نصف قیمت پر درآمد کی جاتی۔ اس کے باوجود لوگوں نے ساتھ دیا اور معیشت آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگی۔ ہٹلر نے وسیع پیمانے پر موٹر ویز جیسے پبلک ورکس پروگرام شروع کیے اور جرمنی کی اقتصادی زندگی 'قومی گروپوں' کے ذریعے منظم کی۔ یہ گروپ رہنمائی یا امداد کے لیے حکومت سے رجوع کر سکتے تھے۔ تین برس میں بے روزگاری کا تقریباً خاتمہ ہو گیا تھا۔ امریکا میں نئے صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ نے بھی یہی پالیسی اختیار کی کہ سول ورکس ایڈمنسٹریشن کے ذریعے بے روزگاروں کے لیے روزگار کا بندوبست کیا اور سول کنزرویشن کور بنائی تاکہ بے روزگاروں کو نیچرل کنزرویشن پروجیکٹس پر کام دے۔ این آر اے (دی نیشنل ریکوری ایڈمنسٹریشن) نے مقابلوں اور قیمتیں متعین کرنے کے بوسیدہ انداز کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس نے تمام مزدوروں کو یونین میں شامل ہونے کا حق بھی دیا۔ 1935ء میں

سپریم کورٹ نے حکم دیا کہ یہ سب غیر آئینی ہے، جس کے بعد این آر اے منظر سے غائب ہو گئی۔ مگر مزدور اپنی یونین بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ امریکی صنعت کو بھی کم و بیش انہی حالات کا سامنا کرنا پڑا جن کا تجربہ جنگ کے بعد جرمنی اور اٹلی کی صنعتوں کو ہوا تھا۔ یعنی عوامی مظاہروں اور پولیس و ہڑتالیوں میں تصادم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کمیونسٹ روز ویلٹ کی 'نئی ڈیل' کی حمایت کر رہے تھے، اس لیے کمیونزم امریکا میں محترم ہو گیا تھا۔ لوزیانا کے گورنر ہوئی لانگ اور فادر کوگلن آف مشی گن نے انتہا پسندانہ سوشلسٹ طریقے اختیار کرنے کے لیے کہا۔ مگر ان کا انداز مسولینی اور ہٹلر کے لہجہ سے مختلف نہیں تھا۔

جرمنی اور اٹلی کی صورتِ حال عالمی امن کے لیے پہلے ہی خطرہ بن رہی تھی۔ ہٹلر کے برسر اقتدار آنے کے چند ماہ بعد نازیوں نے تمام شہروں میں کتابیں جلانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ صرف کمیونسٹ لٹریچر ہی نہیں بلکہ آئن سٹائن، ٹامس مان اور ایچ جی ویلز کی کتابیں بھی جلاتے تھے۔ ہٹلر کے 'خاکی قمیصوں' والے یہودی سٹوروں کے باہر کھڑے ہو جاتے اور لوگوں کو اندر جانے سے منع کرتے۔ 1934ء میں ہٹلر کو معلوم ہوا کہ ارنسٹ روہین، اس کے 'طوفانی دستوں' کا سالار اس کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہا ہے۔ 30 جون 1934ء کو وہ میونخ گیا اور ارنسٹ اور اس کے ساتھیوں کو اپنی نگرانی میں گرفتار کرایا۔ سینکڑوں طوفانی دستے (سٹارم ٹروپر) اس رات مارے گئے۔ اس سال خزاں میں نیورمبرگ میں فتح کے جشن منائے گئے۔ ستمبر 1935ء میں اعلان ہوا کہ 'نیورمبرگ قوانین' کی رُو سے جس کسی کے بھی دادا دادی دونوں یہودی ہوں وہ جرمن نہیں۔ یہودی اور غیر یہودی کی شادی بھی خلافِ قانون قرار دے دی گئی۔ باقی یورپ کو احساس ہوا کہ گر کر پھر اٹھنے والا جرمنی خطرناک ہمسایہ ہے۔

مسولینی کو رنگ و نسل کے معاملات کی بہت کم فکر تھی۔ اسے لوگوں کے سامنے آنے اور تقریریں کرنے میں مزا آتا تھا۔ مگر کم از کم اختلاف کرنے والوں کو برداشت کرتا تھا۔ اس کے ایک شدید مخالف ناول نگار البرتو موراویا نے جنگ کے بعد ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''مسولینی برا آدمی نہیں تھا، مگر یہ بات اس کے ماتحتوں کے متعلق کہنا مشکل ہے۔'' اصل بات یہ ہے کہ فسطائیت نے کوتاہ نظر اور کم فہم لوگوں پر اختیارات لاد دیئے تھے اور انہیں کھل کھیلنے کا موقع دیا تھا۔ ہیمنگوے نے اپنی کہانی میں ان دنوں اٹلی جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک نہایت سمجھ دار نوجوان فاشسٹ امریکیوں کو سختی کے ساتھ حکم دے رہا تھا کہ اسے لفٹ دیں جبکہ ایک بے ایمان پولیس والا ان سے اس لیے رقم بٹور رہا تھا کہ ان کی نمبر پلیٹ صاف نہیں

تھی۔ اٹلی اور جرمنی کو درحقیقت اس مسئلہ کا سامنا تھا۔ ہوہینز ولرز کے دور میں پروشیا بھی ڈکٹیٹرسٹیٹ تھی۔ مگر پولیس اور فوج دیگر اداروں کی طرح قانون اور ضابطہ کی پابند تھی۔ جرمنی اور اٹلی میں وردی والا ہر احمق ایک بونا ڈکٹیٹر بن جاتا تھا۔ دراصل یہ جرائم پیشہ عناصر کی دانستہ حوصلہ افزائی تھی۔ ہٹلر نے روہین کو اس لیے گرفتار کیا کہ روہین 'سٹارم ٹروپرز' کی طاقت میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ نازی پارٹی کی بڑھتی ہوئی طاقت بھی اسی پریشر کی غماز تھی۔ ہر طاقت ور فوج لڑنا چاہتی ہے۔ دسمبر 1934ء میں جب اطالوی اور ابی سینیا کی فوجوں کے درمیان تصادم ہوا تو مسولینی اسی پریشر کا شکار تھا۔ اڑتیس سال پہلے ابی سینیا نے ادووا کی جنگ میں بیس ہزار اطالوی ہلاک کیے تھے۔ نئے واقعہ نے اٹلی کے قومی وقار پر نیا زخم لگایا اور مسولینی کو توسیع پسندی کے قانون کے تحت (جو ہر کامیاب ڈکٹیٹر کا وتیرہ ہوتا ہے) ایک کامیاب جنگ لڑنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اکتوبر 1935ء میں اس کی فوجیں اطالوی صومالی لینڈ سے ابی سینیا میں داخل ہوگئیں اور ادووا پر قبضہ کرلیا۔ مئی، اگلے سال تک وہ عدیس ابابا پر قبضہ کرچکی تھیں اور اطالوی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ اب ابی سینیا ہمارا ہے۔

سپین، یورپ کا شاید سب سے زیادہ روایت پسند ملک بھی سیاسی تبدیلیوں کی حالت میں تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز کی ہسپانوی تاریخ اس دور کے روس کی تاریخ سے مختلف نہیں۔ سخت اور بے جان طبقاتی نظام، ظلم اور آمریت کی عادی بادشاہت، نیم فاقہ کش کسان اور انقلاب کی روز افزوں آہٹ۔ سپین پہلی عالمی جنگ سے باہر رہا تھا لیکن اس کی اسلحہ ساز فیکٹریوں کی تعداد اور مزدوروں کی طاقت میں اضافہ ہوا تھا۔ 1921ء میں سپین کی فوج کے بیس ہزار جوان مراکو میں ہلاک کیے گئے تھے۔ اس سے سخت بے چینی پیدا ہوئی جو اس وقت ختم ہوئی جب جنرل پریموڈی ریویرا نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ ریویرا شاہ الفانسو (تیرہ) کی آشیرواد سے ڈکٹیٹر بن گیا۔ (الفانسو نے اٹلی کے بادشاہ کے ساتھ ریویرا کا تعارف یہ کہہ کر کرایا تھا کہ ''یہ میرا مسولینی ہے'') لیکن ڈکٹیٹر بھی سپین کو ٹوٹنے سے نہ بچا سکا۔ ریویرا نے 1930ء میں استعفیٰ دے دیا، افراتفری پھر پھیل گئی۔ 1931ء میں بادشاہ بھاگ گیا۔ جب ایک ری پبلکن (لبرل کیمونسٹ) حکومت اقتدار میں آئی تو کسانوں نے زمین کے مالکان سے زمین چھیننا اپنا حق جانا اور حکومت نے ایک عرصہ تک اس سلسلہ میں کچھ نہ کیا۔ تاریخ میں پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ جب سپارٹکس کی قیادت میں غلاموں نے روم کے خلاف بغاوت کی تھی تو کسانوں نے زمینداروں سے یہی سلوک کیا تھا۔ زمینداروں نے لوٹ سے نجات کے لیے

فوج سے مدد چاہی۔ 1936ء میں فوج کے اندر بغاوت ہوئی جس میں سے جنرل فرانکو لیڈر کی حیثیت میں سامنے آیا۔ خونریز خانہ جنگی مارچ 1939ء تک جاری رہی۔ جب فرانکو ڈکٹیٹر بنا تو خانہ جنگی میں سات آٹھ لاکھ انسان مارے جا چکے تھے۔

ہٹلر کے جرمنی میں 'نو بیدار قومی وقار' گئے دنوں کی ہزیمتوں کی تلافی چاہتا تھا۔ جنگ کے خاتمہ پر جرمنی کو رن لینڈ، الپس اور پولش کوری ڈور (پولینڈ کی گزرگاہ) جیسے علاقوں کا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ مگر نازیوں کا پہلا مقصد آسٹریا اور جرمنی کا تحاد تھا۔ آسٹریا میں ایک مضبوط نازی پارٹی موجود تھی۔ عبث تھا کہ یہ جرمن زبان بولنے والا ملک جواب کسی سلطنت کا مرکز بھی نہیں تھا، ایک علیحدہ ملک بنا رہے۔ جولائی 1934ء میں ویانا میں نازیوں کے ایک گروپ نے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی اور آسٹریا کے چانسلر ڈولفس کو قتل کر دیا۔ مگر اس موقع پر مسولینی اٹلی اور جرمنی کے درمیان ایک بفرسٹیٹ (فاصل ریاست) کا خاتمہ نہیں چاہتا تھا، اس لیے اپنی فوجیں سرحد پر لے آیا۔ یوگوسلاویہ نے بھی یہی کیا۔ ہٹلر نے فوراً بغاوت سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی اور عارضی طور سے آسٹریا کے متعلق منصوبے ملتوی کر دیے۔ مگر اس واقعہ سے اس میں بڑی اور بہتر فوج کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ اگلے سال 'معاہدہ امن' کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے جبری بھرتی پھر شروع کر دی۔ مارچ 1936ء میں اس نے اپنا پہلا بڑا جوا کھیلا اور اپنی فوج کو رن لینڈ پر حملہ کا حکم دیا۔ اس کے جنرل گھبرائے ہوئے تھے کیونکہ فوج کی تعداد صرف بیس ہزار تھی۔ اگر فرانسیسی جوابی حملہ کرتے تو جرمنوں کو پیچھے ہٹنا پڑتا۔ لیکن فرانس نے کچھ نہ کیا۔ دسمبر 1936ء میں ہٹلر نے جاپان کے ساتھ کمیونسٹ مخالف معاہدے پر دستخط کیے اور سپین میں فرانکو کی باغی حکومت کو تسلیم کیا۔ سول وار کی ابتدا سے ہٹلر، جنرل فرانکو کی اسلحہ سے مدد کرتا رہا تھا۔

مسولینی دوست بنا تو 1937ء میں برلن، روم، ٹوکیو ایک محور بنا جس کی وجہ سے تینوں محوری طاقتیں کہلائیں۔ ہٹلر نے اپنی تمام توانائیاں آسٹریا کے ساتھ اتحاد کے مسئلہ پر لگا دیں۔ آسٹرین چانسلر کو دھمکا کر مطالبہ کیا گیا کہ آسٹریا کی نازی پارٹی کو مزید آزادی دے۔ سیاسی جوڑ توڑ سے تنگ آ کر چانسلر نے مارچ 1938ء میں استعفیٰ دے دیا اور نئے نازی چانسلر نے ہٹلر کو آسٹریا میں فوج بھیجنے کی دعوت دے دی۔

پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ پر چیکوسلاویکیہ نے آسٹریا کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں تیس لاکھ جرمن آباد تھے اور نئے جرمنی میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ ہٹلر دھمکیاں دیتا

رہا مگر آگے قدم رکھنے میں اسے احتیاط کرنا پڑی۔ فرانس، برطانیہ اور سوویٹ یونین نے حملہ کی صورت میں چیکوسلاویکیہ سے مدد کا وعدہ کر لیا تھا۔ پھر ہٹلر یہ جان کر حیران ہوا کہ برطانوی وزیراعظم چیمبرلین مسئلہ کا پرامن حل ڈھونڈنے کے لیے جرمنی آ کر اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ برطانیہ جنگ سے بچنے کے لیے بے تاب تھا۔ ہٹلر سے بات کرنے کے بعد چیمبرلین بھی فرانسیسی وزیراعظم دلاوئیر کا ہم نوا بن گیا کہ چیکوسلاویکیہ متنازعہ علاقہ آسٹریا کو واپس کرے۔ چیک اس فیصلہ پر برہم ہوئے مگر بے بس تھے۔ میونخ میں ہٹلر، مسولینی چیمبرلین، دلاوئیر اور روزویلٹ اس مسئلہ پر بات کرنے جمع ہوئے اور 'سٹوڈیٹن لینڈ' علاقہ جرمنی کو واپس کر دیا۔

برطانوی پارلیمنٹ میں ونسٹن چرچل نے خبردار کیا کہ یہ فراخ دلانہ پالیسی تباہی کا راستہ ہے۔ چرچل کی توقع سے پہلے اس کی بات سچ ثابت ہوئی۔ سلووک وزیراعظم ٹسو کو حکومتی بحران میں برطرف کر دیا گیا۔ اس نے سلوویکیہ کی خودمختاری کے لیے ہٹلر سے مدد چاہی۔ ہٹلر نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ نہ صرف چیکوسلاویکیہ کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا بلکہ پولینڈ کا ایک حصہ بھی قبضہ میں لے لیا، جس پر چیک اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتے تھے۔ انہی دنوں مسولینی نے البانیہ پر قبضہ کر لیا۔ اب برطانیہ اور فرانس کے پاس ہٹلر کو روکنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ سوویٹ یونین کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اس مرحلہ پر اگست 1939ء میں نازیوں نے یہ کہہ کر دنیا کو ہلا دیا کہ انہوں نے سٹالن کے ساتھ 'جنگ نہ کرنے' کا معاہدہ کر لیا تھا۔

اب ہٹلر کے لیے یہی کام رہ گیا تھا کہ پولش کوریڈور (پولینڈ کی گزرگاہ) واپس لے۔ پول سمندر کے ساتھ اپنا رابطہ ختم ہونے پر اعتراض کر سکتے تھے اس لیے لازم ہوا کہ پولینڈ پر حملہ کیا جائے۔ یکم ستمبر 1939ء کو ہٹلر کی فوجیں سرحد کی طرف بڑھیں اور اس کے جہازوں نے وارسا پر بمباری کی۔ دو روز بعد برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

یہ سب کیونکر ہوا؟ مارکس ہوتا تو سرمایہ دارانہ نظام کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا، جیسا کہ مارکسسٹ مؤرخ سمجھتے رہے۔ مگر اس بحران کا کوئی تعلق منڈی کے بھاؤ یا آزاد تجارت سے نہیں تھا۔ ٹالسٹائی اسے تاریخ کے فطری قوانین کی کارستانی کہتا جس کی پیش بینی موسم کی طرح ممکن نہیں۔ مگر ہم بار بار دیکھ چکے ہیں کہ یہ شخصیات ہیں جو تاریخ کا رخ بدل دیتی ہیں۔

ایک بڑا آدمی ــــ کوئی جولیس سیزر، چنگیز خان، پیٹر اعظم، نپولین یا بسمارک ــــ جو اپنے سامنے ایک مقصد رکھتا ہے اور اسے حاصل کرنے روانہ ہوتا ہے، کسی کو ''بڑی'' کامیابی حاصل ہوتی ہے، کسی کو ''بڑی'' کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا انحصار اس کی شخصیت اور اس کے کرشمہ پر ہے۔ شخصیت ہی وہ راز ہے جو قوموں کے عروج و زوال میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

1920ء کے بعد پیدا ہونے والے بحران پہلی عالمی جنگ کا براہِ راست نتیجہ تھے۔ جنگ نہ ہوتی تو روس کا انقلاب نہ ہوتا، اطالوی اور ہسپانوی فسطائیت نہ ہوتی، جرمنوں کا نازی ازم نہ ہوتا۔ پہلی عالمی جنگ کا تقریباً تمام الزام ایک شخص قیصر پر عائد ہوتا ہے۔ قیصر کے بعد ہٹلر آیا، ہسٹیریا کا مارا ہوا ایک اور نخوت پسند قیصر ہمیں نیرو کی یاد دلاتا ہے تو ہٹلر انارکسٹ ایوا کول یا لاسینیئے کی طرح ہے۔ وہی تنہا انفرادیت پسندی، وہی بھوکی ذہانت، وہی فالتو آدمی یا اچھوت ہونے کا احساس۔ ان دونوں نے اپنی بدنصیبیوں کا ذمہ دار بورژوازی کو ٹھہرایا تھا، جبکہ ہٹلر نے یہودیوں کو قربانی کا بکرا بنایا۔ وہ مارکسزم سے پہلے ہی بیزار تھا۔ جب وہ مزدور کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور مزدوروں سے وطن پرستی، مذہب اور قانون کے خلاف مارکس کی باتیں سنتا تھا۔ مارکس کی مخالفت اور ٹریڈ یونین میں شامل ہونے سے انکار کی وجہ سے اسے چھت سے گرانے کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس لیے جب اسے پتہ چلا کہ اکثر ممتاز سوشلسٹ اور مارکسسٹ یہودی تھے تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ''میرے اندر کی لمبی جنگ ختم ہوئی۔'' اب اسے قربانی کا بکرا مل گیا تھا۔

ہٹلر کا مسئلہ ایک مجرم کا مسئلہ تھا، اپنے اوپر قابو نہ ہونا، تنقید یا اختلاف سے ہسٹیریائی ہو جانا۔ اس کا پرانا دوست کبیزک اپنی کتاب میں ہٹلر کی جوانی کے متعلق لکھتا ہے کہ ''اڈولف بڑا پُرتشدد اور سخت تندمزاج تھا۔ سرسری باتوں پر چیخنا چلّانا شروع کر دیتا، جس کا کوئی موقع نہیں ہوتا تھا۔'' دونوں مواقع پر جب چیمبرلین اسے ملنے گیا اس نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ قریبی ساتھی کہتے ہیں کہ جب ایسا ہوتا تو اس کا چہرہ خون سے سرخ ہو جاتا اور وہ ایک پاگل کی طرح لگنے لگتا۔ ایک یہودی نے پیرس میں کسی جرمن سفارت کار کو گولی مار دی، ہٹلر نے یہودیوں کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ ایک قاتل دستہ اس کے ایس ایس چیف ہینڈرچ کو قتل کرتا ہے۔ ہٹلر سارے گاؤں کو تباہ کرنے کا حکم دیتا ہے، اگرچہ اس گاؤں کا قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے بعض افسروں نے اسے بم مار کر قتل کرنے کی کوشش کی تو اس نے سازشیوں کو قصاب

کے گوشت لٹکانے والے کُنڈوں سے لٹکا کر پیانو کی تار سے ان کے گلے گھونٹ دینے اور اس کی فلم بنانے کا حکم دیا تا کہ اس کے 'روح پرور' نظارے سے بار بار لطف اندوز ہو سکے۔

اس مجنونانہ انانیت پرستی سے ہٹلر کا زوال ہوا۔ دو غلطیاں اہم تھیں۔ 23 اگست 1940ء کو بعض جرمن بمبار طیاروں نے راستہ بھول کر لندن کے مرکز پر بمباری کی۔ برطانیہ نے جواب میں برلن پر علامتی فضائی حملہ کیا تو ہٹلر غصہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ ''جب برٹش ائیر فورس دو، تین، چار ہزار کلوگرام بم گرائے گی، تو ہم ایک رات میں ڈیڑھ سو، ڈھائی سو، تین سو اور چار لاکھ کلوگرام بم گرائیں گے،'' اس نے کہا، اور لندن کو تباہ کرنے کا حکم دیا۔ انگریزوں کو مشکل سے اپنی خوش قسمتی کا یقین آیا۔ جرمن طیاروں کا اصلی نشانہ جنوب میں واقع برطانیہ کے فضائی اڈے اور اس کی افسوس ناک حد تک مختصر ائیر فورس تھی۔ جبکہ لف ٹاف سول آبادی پر بمباری چاہتا تھا۔ برطانوی 'سپٹ فائر' مقابلہ پر آ گئے اور برطانیہ نے جنگ جیت لی۔ ہٹلر نے حملہ کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس ایک غلطی کا نتیجہ مغرب میں اس کی شکست تھی۔

دوسری غلطی کی وجہ سے وہ مشرق میں جنگ ہار گیا۔ مارچ 1941ء میں یوگوسلاویہ نے ہٹلر کی مدد کا فیصلہ کیا۔ مگر جب وزرا واپس بلغراد آئے تو بغاوت ہو گئی اور حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ بغاوت سے ہٹلر پر غصہ کا بدترین دورہ پڑا۔ وہ انتقام کے لیے چیخا اور یوگوسلاویہ کو بے رحمی سے کچلنے کا حکم دیا۔ گوئرنگ حکم بجا لایا، یوگوسلاویہ کو خاک کے اندر ملانے میں چار ہفتے صرف ہو گئے، یہ چار ہفتے روس پر حملہ میں تاخیر کا سبب بنے۔ انہی چار ہفتوں میں ہٹلر نے جنگ ہار دی۔ نپولین کی طرح اسے بھی روس کے موسم کا نشانہ بننا پڑا، اس سے پیشتر کہ اس کی فوجیں ماسکو پہنچیں اور محفوظ ہو جائیں۔

مئی 1945ء میں جب روسی فوجیں لڑتی بھڑتی برلن میں داخل ہو رہی تھیں، ہٹلر نے برلن کے زیر زمین ریلوے میں (جہاں ہزاروں جرمنوں نے پناہ لے رکھی تھی) سیلاب کی طرح پانی چھوڑنے کا حکم دیا۔ ''جرمنی ڈوب جانے، مٹ جانے کا مستحق ہے،'' ہٹلر نے کہا، ''جرمنی میری قیادت کا اہل نہیں ہے۔''

دو ہفتے کے بعد اس نے خودکشی کر لی۔

کرائم ایکسپلوژن

دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر جرائم میں اُسی طرح تیزی سے اضافہ ہوا جیسا کہ تاریخ کی ہر بڑی جنگ کے بعد ہوا کرتا ہے۔1946ء تک برطانیہ میں زمانہ امن کی نسبت جرائم کی تعداد دو گنا ہو گئی، دو گنا چوریاں ڈاکے، دو گنا ریپ اور تشدد کی وارداتیں۔ امریکا میں بھی جو فاصلے کے لحاظ سے جنگ سے دور رہا تھا، جرائم میں دو تہائی اضافہ ہو گیا۔

1950ء کے آغاز میں جرائم کم ہونا شروع ہوئے۔1954ء تک1945ء کی نسبت کم ہو گئے۔ ایسے لگا کہ بحران ختم ہو گیا اور حالات معمول کے مطابق ہو گئے۔لیکن بغور دیکھنے سے ایک خوف ناک رجحان کا اندازہ ہوا کہ خوشحالی سے اگرچہ چوری اور ڈاکہ کی وارداتوں میں کمی ہوئی مگر تشدد اور سیکس سے متعلقہ وارداتوں میں بتدریج اضافہ ہوا، یہاں تک کہ وہ1945ء کے مقابلہ میں دو گنا ہو گئیں۔

اب جرائم معاشرہ کی صحت مندی کا صحیح بیرومیٹر ہیں۔ مجرم ان چوہوں کی طرح ہیں جو طاعون پھیلتے ہی سب سے پہلے مر جاتے ہیں۔ مجرم ایک ایسا شخص ہے جس کا ٹینشن معمول سے بڑھ کر ہوتا ہے جو امتناعی قوت کو کام کرنے سے روکتا ہے۔ اس لیے جب معاشرہ میں یاس کا عالم ہو تو اس ٹینشن کا اندازہ مجرم کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر ایک نیا خوف ناک جرم کیا جاتا ہے، ایسا جرم جو پہلے کبھی نہیں ہوا، تو اسے ایک سرسری واقعہ نہ سمجھا جائے۔ جیسے ڈاکٹر کسی نئی بیماری کے پھوٹنے کو ایک عجوبہ سمجھے کیونکہ ایک نیا اور خوف ناک جرم معاشرہ کی مجموعی حالت سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

اس کی ایک مثال بعد از جنگ دَور کے دو جرم ہیں۔ سات ستمبر1949ء کو ایک فرانسیسی کینیڈین البرٹ گائی نے اپنی بیوی جہاز سے کہیں بھیجی۔ بیس منٹ بعد وہ جہاز فضا میں

پھٹ گیا۔ جہاز میں سوار تیئیس افراد ہلاک ہو گئے۔ جہاز کا ملبہ معائنہ کرنے سے پتہ چلا کہ حادثہ ڈائنامائٹ کی وجہ سے ہوا۔ تفتیش سے ظاہر ہوا کہ گائی نے بم بیوی کے بیگ میں چھپا کر رکھ دیا تھا۔۔ بیوی کی موت سے اس کا مقصد بیوی کی انشورنس دس ہزار ڈالر حاصل کرنا تھا۔ گائی کے دو ساتھیوں سمیت اسے سزائے موت دی گئی۔ یکم نومبر 1955ء کو جان گراہم نے اپنی ماں کو ڈینور ائرپورٹ سے جہاز کے ذریعہ روانہ کیا۔ یہ جہاز بھی فضا میں جا کر پھٹ گیا۔ حادثہ میں چالیس افراد ہلاک ہوئے، اس کا باعث بھی ڈائنامائٹ تھا۔ گراہم نے ڈیٹونیٹر گھر میں چھپا رکھے تھے۔ اسے گیس چیمبر کے اندر بھیج کر موت کی سزا دی گئی۔ کئی لوگوں نے اپنی مائیں اور بیویاں روپے کے لالچ میں ہلاک کیں۔ 1949ء تک ایسی کوئی مثال نہیں تھی کہ دولت کے لیے اتنے افراد ہلاک کیے جائیں۔ یہ ایک نئی قسم کی تنہائی تھی جو محرومیوں سے پیدا ہوئی تھی۔

یہی تنہائی دوسری عالمی جنگ کے بعد سیکس سے متعلقہ جرائم میں اضافہ کا سبب بنی۔ امریکا میں جرائم کے بارے میں 1950ء کے ایک جائزہ کے مطابق اڑھائی لاکھ آبادی تک کے شہروں میں جرم کی رفتار واجبی رہی۔ بڑے شہروں میں چھوٹے شہروں کی نسبت تین گنا زیادہ قتل ہوئے۔ جبکہ تشدد اور ریپ میں چار گنا اضافہ ہوا۔ 1956ء تک واضح ہو گیا کہ چوری کی وارداتوں میں کمی عارضی تھی، ان میں پھر اضافہ ہونے لگا تھا۔ قتل اور ریپ بھی بدستور بڑھ رہے تھے۔ 1960ء تک امریکا میں تقریباً دس ہزار قتل ہر سال (اکثر بندوقوں سے) ہونے لگے تھے۔ 1970ء تک یہ تعداد پندرہ ہزار (یعنی نصف گھنٹا میں ایک قتل) ہو گئی۔ یہ سطریں لکھتے وقت (1983ء) یہ تعداد بڑھ کر بیس ہزار قتل سالانہ (ہر پندرہ منٹ میں ایک قتل) ہو گئی ہے۔ ریپ میں اس سے بھی بڑھ کر اضافہ ہوا۔

ریپ بدستور بیسویں صدی کا خصوصی جرم رہا۔ بڑے جرائم کی ہر فہرست میں جنسی قتل تعداد اور تناسب دونوں کے لحاظ سے سرفہرست ہیں۔ جنسی جرائم نے یہ حیثیت انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں حاصل کی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ وکٹورین عہد کی نام نہاد عصمت مآبی تھی، سیکس کو لعنت اور گناہ سمجھنا تھا۔ (اگرچہ بڑے شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی نے بھی اس میں اپنا کردار ادا کیا تھا) 1900ء کے بعد 'عصمت مآبی' نے صحت مند جنسی حقیقت پسندی کو راستہ دیا تو جنسی جرائم یکا یک کم ہو گئے۔ مگر یہ ایک فریب تھا۔ جنس پرستی بدستور معاشرہ کا محبوب ترین وتیرہ رہا۔

1926ء میں امریکا میں ایرل ولسن (جس نے کچھ عرصہ دماغی امراض کے ہسپتال میں بھی گزارا تھا) نے جنسی قتل کی مہم پر شمالی امریکا اور کینیڈا کا دورہ کیا۔ جس کے دوران اس نے بائیس عورتیں قتل کیں۔ وہ ''کرایہ کے لیے'' کی تختی دیکھ کر دروازہ پر دستک دیتا۔ اگر مالکہ مکان اکیلی ہوتی تو اسے ریپ کر کے اس کا گلا دبا دیتا۔ اخبارات نے اسے ''گوریلا جنسی قاتل'' کا نام دیا۔ عورتوں کے خلاف اس کے جرائم اخبارات کے عنوان بنتے رہے، یہاں تک کہ وہ کینیڈا میں گرفتار ہوا۔ 1927ء میں ولسن کو پھانسی دی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی سنسنی خیز پبلسٹی سے ہر ایک کا دھیان جنسی جرائم کی طرف پہلے سے بڑھ گیا اور اس لیے جنسی جرائم میں اضافہ ہوا۔ برطانیہ میں اب بھی پریس اس معاملہ میں محتاط تھا۔ 1921ء میں ایک ڈرائیور تھامس الاوے نے اکتیس سالہ ارین والکنز کا اشتہار اخبار میں دیکھا جو باورچی کی ملازمت کے لیے تھا۔ وہ اسے بورن ماؤتھ کار میں لے کر گیا۔ اسے بے ہوش کیا اور ریپ کرنے والا تھا کہ پکڑا گیا۔ ارین کو ہلاک کرنے کے جرم میں اسے پھانسی دی گئی۔ اگرچہ جج نے فیصلہ میں لکھا کہ الاوے مقتولہ کو ورغلا کر کسی غیر اخلاقی مقصد کے لیے لے گیا تھا لیکن ریپ کا حوالہ دینے سے جان بوجھ کر گریز کیا گیا۔ اس اپروچ کی وجہ سے دوسری عالمی جنگ تک برطانیہ میں سیکس جرائم کی شرح برائے نام رہی۔

1922ء میں الاوے کا مقدمہ لوگوں نے فراموش کر دیا جب ایڈتھ تھامسن اور فریڈرک بائی واٹرز کے مقدمہ کو بے پناہ پبلسٹی ملی۔ دونوں آپس میں محبت کرتے تھے۔ بائی واٹرز نے ایڈتھ کے شوہر کو ہلاک کیا تھا۔ مسز تھامسن پر الزام تھا کہ قتل اس کے اشتعال دینے سے ہوا۔ مگر شہادت کمزور تھی۔ اس کے باوجود اسے سزائے موت ہوئی اور پھانسی لگا دی گئی۔ مقدمہ اپنے پیچھے یہ تاثر چھوڑتا ہے کہ اسے زنا اور قتل کی ترغیب دونوں کے جرم میں پھانسی ہوئی۔ امریکا میں 1920ء کا ایک ایسا کیس البرٹ سنیڈرز کا قتل تھا جسے اس کی بیوی رُتھ کے عاشق نے ہلاک کیا تھا۔ سینڈرز کو پہلے مار مار کر بے ہوش کیا، پھر گلے میں تار کا پھندا ڈال کر اسے ہلاک کیا گیا۔ 1928ء میں جب اسے سنگ سنگ میں بجلی کے ذریعہ موت کی سزا دی گئی تو ایک رپورٹر اس کی موت کا لمحہ فلم بند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ عبرت آموز تصویر دنیا بھر میں اس پیغام کے ساتھ شائع ہوئی کہ ''گناہ کی مزدوری موت ہے۔''

مگر جنسی جرائم کی وارداتیں بڑھتی رہیں۔ اہم وارداتیں کج رَوی کی نئی مثالیں تھیں۔ 1932ء میں ایک ہنگیرین کمپنی ڈائریکٹر متوشکا پر مقدمہ قائم ہوا۔ الزام تھا کہ اس

نے ٹرین کے دو حادثے کیے تھے اور تیسرے کی تیاری کر رہا تھا۔ 1931ء میں ویانا ایکسپریس برلن کے قریب پٹڑی سے اتر گئی۔ ایک زور دار دھماکہ ہوا تھا اور سولہ افراد زخمی ہوئے تھے۔ ستمبر میں بوڈاپسٹ ویانا ایکسپریس پٹڑی سے اتر گئی۔ بائیس افراد ہلاک ہوئے۔ ڈائنا مائٹ کی وجہ سے بعض کے پرخچے اڑ گئے۔ متوشکا نے مانا کہ حادثہ کے خیال سے اس میں شدید جنسی خواہش بیدار ہوتی ہے۔ عمر قید کی سزا پانے کے بعد وہ جیل سے بھاگ گیا۔ پھر 1953ء میں کوریا کی جنگ کے دوران وہ ٹرینیں تباہ کرنے والے یونٹ کے کمانڈر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔

1928ء میں نیو یارک میں ایک باپ سمان شفیق بزرگ البرٹ فش نے فریڈ فیملی سے ان کی دس سالہ بیٹی گریس کو پارٹی میں لے جانے کی اجازت چاہی۔ اس کے بعد گریس کبھی نہیں دیکھی گئی۔ چھ سال بعد فش نے فریڈ کو ایک خط کے ذریعے بتایا کہ اس نے کیونکر اس کی بیٹی کا گلا گھونٹا اور کیونکر اس کے جسم کے مختلف حصے پکا کر کھائے۔ خط کی وجہ سے پولیس اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئی تو پتہ چلا کہ بچوں کی چیخ و پکار سے اسے مسرت حاصل ہوتی تھی۔ گھروں کے رنگ ساز کی حیثیت سے اس نے کئی بچے ٹارچر اور ہلاک کیے تھے۔ اپنے الیکٹرو کیوٹ (بجلی کے ذریعہ موت) ہونے کے خیال سے بھی اسے اشتعال ہوتا تھا۔ ''یہ میری زندگی کا سب سے بڑا سنسنی خیز لمحہ ہے۔'' وہ پولیس سے کہتا۔ (پیٹر کرٹن نے کہا تھا کہ ''سر کٹوانے کے بعد وہ بالٹی میں گرتے ہوئے اپنے خون کی آواز سننا چاہتا تھا۔'')

جرمنی میں 1936ء فش مقدمہ کے سال ایک تریسٹھ سالہ گھڑی ساز اڈولف سیفلڈ نے بھی مانا کہ اس نے زندگی بھر صرف لڑکے قتل کیے۔ سیفلڈ انہیں ایک زہریلا مشروب پلاتا جس سے وہ اونگھنے لگتے۔ مگر جنسی دست درازی کے نشان کہیں نہیں ملتے تھے۔ جب وہ گرفتار ہوا جرمنی کا چانسلر ہٹلر تھا اور وہ جانتا تھا کہ جرم کی پبلسٹی سے نئے مجرم پیدا ہوتے ہیں۔ سیفلڈ پر کسی شور شرابہ کے بغیر مقدمہ چلا اور اسے پھانسی دی گئی۔

کلیولینڈ اوہائیو میں ایک قاتل نے (جو کنگس بری رن کے پاگل قصاب کے نام سے جانا جاتا تھا) بارہ عورتیں مرد 38-1935ء کے درمیان قتل کیے، جو زیادہ تر آوارہ گرد اور لاوارث تھے۔ ان کے جسموں کے ٹکڑوں کی چھوٹی ڈھیریاں بنا دی جاتیں۔ سر اکثر غائب ہوتے۔ ایک مرتبہ دو جسم آپس میں جڑے ہوئے ملے تھے۔ پاگل قصائی کبھی گرفتار نہیں ہوا۔

جنسی قتل کا عالمی ریکارڈ اب بھی ایک جرمن ہرونوار کے پاس ہے جس نے

1927-44ء کے درمیان (جب وہ اٹھارہ برس کا تھا) پچاسی قتل کرنے کا اعتراف کیا۔ **1936**ء میں لد کے ایک جنسی واردات میں گرفتار ہوا اور ہملر کے حکم پر خصی کر دیا گیا۔ مگر اس سے اس کی جنسی بھوک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پھر واردات چونکہ ہٹلر دور میں ہوئی، اس لیے تفصیلات کو پبلسٹی سٹنٹ بننے سے روک دیا گیا۔ مگر ہم اتنا جانتے ہیں کہ نازیوں نے اس پر کئی تجربے کیے اور اس کی موت ایک انجکشن سے ہوئی۔

آیئے ایک سوال پوچھنے کے لیے لحہ بھر کو رک جائیں۔ ایسے جرائم اس معاشرہ کی کیسی تصویر پیش کرتے ہیں جس معاشرہ میں وہ جنم لیتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سراپا تشدد جرائم، یہ کرٹن یہ مٹوشکا، یہ لد کے اور سیفلڈ جرمنی میں نازیوں کے تشدد کی عکاسی کرتے ہیں۔ مگر یہ کہنا غلط ہوگا کیونکہ یہ سب **1914**ء سے پہلے کے یورپ میں پیدا ہوئے تھے۔ تمام قتل تمام جرائم ہٹلر کے اقتدار سے بہت پہلے ہوئے تھے۔ تشدد سماجی ٹینشن کا عکس ہے اور ٹینشن جنگ اور بحران کے زمانوں میں کم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بحران کم از کم بوریت میں اضافہ نہیں کرتا۔

تشدد کی وضاحت کا ایک اور انداز بھی ہے۔ جانوروں میں سب سے ظالم جانور **Shrew** ہے، چھوٹا اور چوہے جیسا۔ اس کا وزن ایک اونس کا پانچواں حصہ ہے۔ وہ اپنے سے بڑے جانور کو مار لیتا ہے اور اپنے جیسوں کو کھانے میں دیر نہیں کرتا۔ وضاحت اس کے سائز میں ہے۔ اس کے سائز کے تناسب سے چونکہ وہ رقبہ بہت بڑا ہے جس میں وہ رہتا ہے، اس لیے **Shrew** کا درجۂ حرارت فوراً کم ہو جاتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے اسے بروقت کھانا پڑتا ہے۔ شریو کو وحشی بننا پڑتا ہے، ورنہ مر جائے گا۔

انسان کے بیرونی حجم کا تناسب اس کے وزن سے بہت کم ہوتا ہے۔ اس لیے ہر کھانے کے بعد وہ گھنٹوں تک کھانا بھول سکتا ہے۔ مگر اس سیارے کی سطح پر چند لاکھ برسوں سے رہنے کے دوران میں موسم بدلتے رہے ہیں۔ بڑے بڑے برفانی دور بھی آئے ہیں۔ اس لیے زندگی آسان نہیں تھی۔ اس چیلنج کا ایک جواب جنسی عمل رہا ہے۔ جان کو خطرہ ہو تو وصل کی خواہش بیدار ہوتی ہے، جو شریو (چھوٹا چوہا) کی نہ ختم ہونے والی بھوک کے مترادف ہے۔

لیکن زندہ رہنے کے لیے اس کا بڑا میکانزم ایک قابل اعتماد آلے یا ایک قسم کے دماغی مائیکروسکوپ کی ترقی ہے جس کے ذریعہ وہ مخصوص مسائل پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ وہ ان

مسائل پر اسی شدت کے ساتھ جھپٹتا ہے جس شدت کے ساتھ شیر اپنے کھانے پر جھپٹتا ہے۔ صبر انسان کا کبھی بڑا آدرش نہیں رہا۔ جب ایسے مسائل پیدا ہوں جن سے اس کی جان کو خطرہ ہو تو انہیں حل کرنے کی فوری تڑپ اس میں پیدا ہوتی ہے۔

پھر کیوں انسان تخلیق کار بھی ہے اور مخلوق کا قاتل بھی ہے؟ اس کی کامیابیوں کی کہانی اس کے جرائم کی کہانی سے الگ نہیں کی جا سکتی کیوں کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے جو مسائل حل کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ جب روسی ناول نگار ترگنیف نے ایک قاتل جے بی ٹروپ مین کے آخری لمحات دیکھے تو اسے اس کے ساتھ ہمدردی ہوئی، اور بجا ہوئی کہ ٹروپ مین کے برباد ہونے کا سبب اس کے مسائل حل کرنے کی اہلیت تھی۔ اگر ٹروپ مین مختلف راستہ پر چلتا تو ایک مشہور سائنسدان یا ایک مشہور ناول نگار ہوتا۔

اس خصوصی ذریعہ کی وجہ سے انسان بوریت کا سامنا کرتا ہے اور ہر مخلوق سے زیادہ کرتا ہے۔ اکثر جانور بوریت ناپسند کرتے ہیں مگر انسان کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ چیخوف نے اپنے ڈرامہ 'The Wood Demon' میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> ''میرے دوست تم نے حقیقی بوریت کا مزا کبھی نہیں چکھا۔ جب میں سربیا میں ایک رضا کار تھا، وہاں پتہ چلا کہ اصلی بوریت کیا ہوتی ہے۔ گھٹن، گرم، گند اور جامِ شراب کے ایک دور کے بعد کھولتا ابلتا ہوا سر، جیسے ٹوٹ رہا ہو۔ ایک دفعہ مجھے یاد ہے کہ ایک گندے چھوٹے شیڈ تلے بیٹھا تھا۔ کیپٹن کا شکنازی بھی وہاں تھا۔ بات کرنے کے سارے موضوع بہت پہلے ختم ہو چکے تھے۔ کہیں جانا نہیں تھا، کچھ کرنا نہیں تھا۔ پینے کی خواہش نہیں تھی۔ اکتاہٹ ہی اکتاہٹ، قہر آلود خاموشی تھی اور ہم تھے۔ ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ وہ مجھے گھورتا ہے، میں اسے گھورتا ہوں۔ وہ مجھے، میں اُسے۔ ہم گھورتے ہیں اور نہیں جانتے کہ کیوں گھورتے ہیں۔ ایک گھنٹا گزرتا ہے پھر ایک اور گزرتا ہے اور ہم گھور رہے ہیں۔ اچانک کسی وجہ کے بغیر وہ اچھلتا ہے اور مجھ پر اپنی تلوار نکال لیتا ہے۔ میں بھی فوراً اپنی تلوار نکالتا ہوں کہ مجھے قتل نہ کر دے اور چک چک شروع ہو گئی۔ بڑی مشکل سے ہمیں الگ کیا گیا۔ میں تو بچ گیا مگر کیپٹن آج تک چہرے پر زخم لیے پھرتا ہے۔ دیکھو کہ انسان کتنی بری طرح بور ہو سکتا ہے۔''

اگر ہم یہ دونوں فیکٹر ملائیں، بوریت کے خلاف انسان کا شدید ردعمل اور زندگی کے کسی بھی مسئلہ کا جنس کے ذریعہ حل، تو ہم نے جرائم میں اضافہ کا راز جان لیا ہے۔ بوریت سے غیر حقیقی کا احساس پیدا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے انسان کی کوئی گہری خواہش بیدار ہوتی ہے۔ چند لوگوں، بالخصوص عورتوں کو یہ احساس پُرخوری کی طرف لے جاتا ہے، مگر مردوں میں اس سے جنس، تشدد یا دونوں کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں کہ کریٹن کی اذیت پسندی کا سبب جیل میں اس کی قید تنہائی ہے، جب اس کے جنسی خواب اس کے جینے کا بہانہ بنتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ کتنے جنسی قاتل آوارہ گرد اور بھٹکتے ہوئے سیاح تھے، جیسے واچر، ٹیس ناؤ، سیفلڈ اور پینزم تھے۔ ان کی جڑیں کہیں نہیں تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کی شناخت کا بحران پیدا ہوا، جو احساس حقیقت کے لیے خطرہ ہے۔ جنسی تشدد ان میں حقیقت کا احساس بحال کرتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے گویا کہ ان کے اندر کوئی کمپاس پھر کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔

اس سے جنسی تشدد کے ایک اور ناقابل فہم پہلو کی وضاحت ہوتی ہے۔ جنسی مجرموں کی اکثریت مینس کلاؤ اور ورزینی جیسے اوباش اور ناکارہ لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو پیدائشی طور پر نارمل نہیں ہوتے۔ بیسویں صدی میں جنسی مجرموں کا بڑا حصہ سیفلڈ اور پینزم کی طرح ذہین بلکہ اوسط درجہ سے زیادہ ذہین ثابت ہوا۔ یہاں پھر ہمیں بوریت فیکٹر کا سامنا ہے کہ معمولی ذہانت کے لوگ بہت کم بور ہوتے ہیں۔ بوریت ان کا مسئلہ ہے جو بہت ذہین اور بہت حساس ہوتے ہیں۔ (ایک تاریک کمرہ میں حسیات سے محروم ہو کر ذہین افراد ان سے پہلے اذیت محسوس کرنے لگتے ہیں جو کم ذہین ہوتے ہیں۔ کتنے دن وہ اذیت برداشت کر سکتے ہیں۔)

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اعلیٰ ذہانت کے لوگ دوسروں کی نسبت تشدد کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں کیونکہ دوسرے عوامل بھی شامل ہوتے ہیں، جیسے ذہانت سے تعمیری کام لینا۔ اس کے معنی ہیں کہ ذہین ترین افراد کی ایک مخصوص تعداد میں ذہانت عدم استحکام کا باعث بنتی ہے۔ جس کا اظہار شاید تشدد میں ہو۔

اگر ہم مسئلہ کی جڑ تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ہمیں ماننا ہے کہ بوریت اندر کی ویرانی ہے اور یہ ماحول سے کٹ کر اس سے الگ رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ شمولیت کے احساس سے بوریت غائب ہو جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے وسط سے انسان کے اپنی سوسائٹی میں

سرگرمی کے ساتھ شمولیت کے امکان ختم ہو چکے ہیں۔ نتیجہ علیحدگی اور تنہائی ہے جس کی طرف مارکس نے اشارہ کیا ہے۔ تنہائی اور یہ ذہنیت کہ اس پر قابو پانے کے واسطے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں، کیسی 'بغاوتیں' کی ہیں۔ ایک کتاب میں جرائم کے ماہر برائن میریز نے نئی قسم کے مجرم کی کردار نگاری کے لیے ایک نئی ترکیب Reaction man ایجاد کی ہے۔ میریز کہتا ہے کہ ماضی میں مجرموں نے چاہے چوریاں کی ہوں یا جیبیں کاٹی ہوں مگر ایسا کرتے ہوئے وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ سوسائٹی سے جنگ کر رہے ہیں۔ ان کی محرومیاں انہیں چوری پر مجبور کرتی تھیں، جیسے کوئی بھوکا باغ سے سیب چرا لے۔ بیسویں صدی میں جو مجرم سامنے آیا ہے وہ سوسائٹی کے خلاف ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سوسائٹی نے اسے ایک بھرپور زندگی گزارنے کے حق سے محروم کر رکھا ہے۔ وہ باغ کو آگ لگا کر راکھ کر دینا چاہتا ہے۔

نیا مجرم غلطی پر ہے، اس کی تنہائی کا ذمہ دار سماج نہیں بلکہ سماجی ترقی ہے۔ تہذیب کی وضاحت 'محنت بچانے والی مشین' (لیبر سیونگ ڈیوائس) کے طور پر کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ کتاب بھی لیبر سیونگ ڈیوائس ہے جو اتنی آسانی کے ساتھ خبر و نظر کا ذریعہ بنتی ہے۔ مگر ہر لیبر سیونگ ڈیوائس فرد کی شمولیت کم کرتی ہے۔ جتنی وہ ترقی کرتی ہے اتنی فرد کی شمولیت کم ہوتی ہے۔ موٹر کار، ہوائی جہاز اور ریڈیو کی آمد سے جنسی جرائم کا گہرا تعلق ہے۔ ریڈیو پھر بھی کسی حد تک تخیل کا تقاضا کرتا ہے۔ ریڈیو کے بعد بلیک اینڈ وائٹ اور پھر کلر ٹیلی ویژن آیا۔ ترقی بڑھتی گئی Participation اور کم ہوگئی۔ سپر مارکیٹ کو گاؤں کی کسی دکان کی طرح گاہکوں کے ہجوم کی طلب نہیں۔ اسے گنے چنے گاہک اور بھرپور منافع چاہیے۔ زندگی کے معاملات میں فرد کی عدم شمولیت یا محدود شمولیت تشدد میں اضافہ کرتی ہے۔ چیخوف کے دو افسر سربیا میں عدم شمولیت کے خلاف ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

چیخوف کے دونوں افسروں کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ تخیل سے محروم تھے۔ اگر ان میں تھوڑا سا تخیل بھی ہوتا تو شاید ''وار اینڈ پیس'' پڑھنے بیٹھ جاتے۔ آج کل معمولی سپاہی بوریت سے بچنے کے لیے کسی مزاحیہ کتاب یا کھیل کا سہارا لیتا ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں انسان نے اپنے تخیل سے حیرت انگیز حد تک کام لینا سیکھا ہے۔ خود اس سے بھی جرائم کا مسئلہ الجھا ہے۔ فریڈرک بیکر نے غالباً مہینوں ایک بچے کے قتل کا تصور کرتے ہوئے گزارے ہیں، اس سے پیشتر کہ فینی آدمز کا قتل کرے۔ 1867ء میں ایسے جرائم تقریباً ناپید تھے۔ سو سال بعد خوفناک حد تک عام ہو گئے۔ 1924ء میں ایک تیئیس سالہ مکینک ڈونلڈ فیرن نے بہت وقت کلوریڈو

سے پچاس میل دور ایک چرچ میں گزارا۔ وہ 'پینٹنس' فرقہ والوں کا آخری مضبوط مرکز تھا۔ 'مقدس ہفتہ' میں انہوں نے جو مذہبی تقریبات کیں ان میں ٹارچر بھی تھا۔ (یہ مقامی لوگ یعنی انڈین سمجھتے تھے کہ درد برداشت کرنا مردانگی کی نشانی ہے) وہ ہر تقریب اپنے ایک رکن کی قربانی دے کر ختم کرتے۔ فیرن بھی اذیت پسند تھا۔ ''جب سے میں جوان ہوا، مجھے ایک خوبصورت جوان لڑکی کو ٹارچر کرنے میں مزا آتا تھا'' اپریل 1942ء میں جب اس کی بیوی ہسپتال میں تھی تو وہ نرسنگ کی سترہ سالہ طالبہ ایلس پوزٹر کو اغوا کر کے چرچ لے گیا جہاں اسے مختلف طریقوں سے ٹارچر کیا اور آخرکار ریپ کرنے کے بعد قتل کر دیا۔ لاش کنوئیں میں پھینکنے کے بعد جب وہ واپس چلا تو راستہ میں اس کی گاڑی کیچڑ میں پھنس گئی، جسے ایک کسان کی مدد سے نکالا۔ اسی کسان کی نشان دہی پر پولیس نے فیرن کو گرفتار کیا اور گیس چیمبر اس کی سزائے موت کا ذریعہ بنا۔

ولیم ہیرنز کے معاملہ میں تخیل کا کردار اور بھی واضح ہے۔ ہیرنز شکاگو کا اٹھارہ سالہ جنسی قاتل 1946ء میں گرفتار ہوا۔ ہیرنز تیرہ برس کی عمر سے عورتوں کے کپڑے چرایا کرتا تھا جنہیں پہن کر جنسی تسکین حاصل کرتا تھا۔ ہیرنز نے چوری اور جنس یکجا کر لیے تھے۔ چوری کے لیے کسی کھڑکی میں سے داخل ہوتے ہوئے اسے مکمل جنسی تسکین ملتی۔ اگر چوری کرتے ہوئے دیکھ لیا جاتا تو لڑنے مرنے پر اتر آتا۔ اکتوبر 1945ء میں ایک نرس اس وقت اپنے اپارٹمنٹ میں آ گئی جب وہ چوری کر رہا تھا۔ ہیرنز نے اس کا سر توڑ دیا۔ اس نے چوری کرتے ہوئے ایک عورت کو سوتا پایا تو اس کے گلے میں چاقو گھونپ دیا۔ ایک لڑکی فرنسیسن براؤن کے قتل اور لاش مسخ کرنے کے بعد اس نے دیوار پر لکھا ''خدا کے لیے مجھے پکڑو، اس سے پہلے کہ میں اور قتل کروں۔ میں اپنے آپ کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔''

ایسی مثالیں 'تخیلاتی فتوحات' کہلا سکتی ہیں۔ جنسی جذبات تخیل کی مدد سے زور پکڑتے ہیں، یہاں تک کہ مریضانہ شدت اختیار کر لیں۔

جنوری 1947ء میں ایک مسخ شدہ لاش لاس اینجلز میں پائی گئی۔ کمر سے کاٹ کر اس کے دو حصے کیے گئے تھے۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق اسے الٹا لٹکا کر مارا گیا تھا۔ وہ بائیس سالہ الزبتھ شارٹ تھی اور فلم سٹار بننے کی امید لے کر ہالی وڈ آئی تھی مگر ایک غیر پیشہ ور طوائف بن کر رہ گئی تھی۔ سیاہ لباس پہنتی تھی، اس لیے اس کے دوست اسے 'بلیک ڈیلیا' کہتے تھے۔ اس کا قاتل کبھی گرفتار نہیں ہوا۔ اس گھناؤنے جرم کا خوف لوگوں کے تخیل میں بس

گیا، یہاں تک کہ لاس اینجلز میں اس سال ایسے چھ اور جرم اس جرم کی نقالی میں ہوئے۔ ایک میں مجرم نے لپ اسٹک سے مقتولہ کے سینے پر بی ڈی (بلیک ڈیلیا) لکھا۔

اور بھی عجیب بات ہے کہ کم از کم ستائیس افراد نے قتل کا اعتراف کیا۔ مگر تفتیش کرنے پر اعتراف غلط ثابت ہوا۔ اٹھائیسواں اعتراف نو سال بعد ہوا۔ مگر ایسے جرم کا اعتراف کوئی کیوں کرے جو اس نے نہیں کیا؟ 'The Compulsion to Confess' میں تھیوڈور ریک نے اس بارے میں فرائیڈ کا نظریہ اس طرح بیان کیا ہے کہ ''اس طرح مجرم اپنے آپ کو اور سوسائٹی کو جرم کے غیر شعوری احساس سے رہائی دلانا چاہتا ہے اور یہ کہ سوسائٹی اس کی شکر گزار ہو۔'' (p. 279) لیکن ہم اس میں صاف طور سے قاتل کے ساتھ حسد کا جذبہ بھی دیکھ سکتے ہیں جو ایک مریضانہ خصوصیت ہے۔ تقلیدی جرائم درحقیقت تخیل میں کیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ایک ایسی مثال ہے جس میں جنسی تشدد سے ایسے ہی چونتیس ردعمل پیدا ہوئے، چھ قتل اور اٹھائیس جھوٹے اعتراف اور یہ سب ایسے علاقہ میں ہوا جو سائز کے لحاظ سے تقریباً لندن جتنا تھا۔ خیال آتا ہے کہ اس علاقہ میں اور لوگ بھی اس مریضانہ دل کشی کے اسیر ہوں گے۔ مگر اپنی نقالیاں اپنے تخیل تک محدود رکھتے ہوں گے Henry Barbusse کے ناول 'Hell' میں ایک بیرسٹر کی گفتگو کا ذکر ایک شخص کے متعلق ہے جس نے ایک چھوٹی بچی کے ریپ کے بعد اس کا گلا گھونٹ دیا۔ بیرسٹر اس ذکر پر دوسرے لوگوں کا ردعمل دیکھتا ہے۔ ایک نوجوان ماں اپنی بچی لے کر کھڑی ہو جاتی ہے مگر اس سے چلا نہیں جاتا تھا اور جو لوگ یہ ذکر بظاہر نظر انداز کر رہے تھے وہ دراصل اپنے جذبات چھپا رہے تھے۔

فرائیڈ کی طرح Barbusse کا بھی کہنا ہے کہ ایسے جرائم لاشعور کے 'عفریتوں کا شعوری اظہار ہے،' اور یہ کہ 'عفریت ہم سب کے اندر ہیں۔' ہم میں سے اکثر اس بیان کو 'نامکمل' سچ سمجھیں گے جسے بے شمار مبالغوں نے مکمل جھوٹ بنا دیا ہے۔ (مثلاً اگر ایک ماں سننے پر مجبور ہے تو اس کی مجبوری اس کے بچہ کا تحفظ ہے کہ وہ تباہی آنے سے پہلے اس کی مزاحمت کے لیے تیار ہو جاتی ہے) مگر یہ اصلی مسئلہ نظر انداز کرنا ہے کہ انسان نے ایک ایسی تہذیب تخلیق کی ہے جس کے لیے وہ پوری طرح تیار نہیں تھا۔ اس کا موازنہ ایک برفانی سفید ریچھ سے ہو سکتا ہے جو سنٹرلی ہیٹڈ پنجرہ میں بند ہے۔ حدت اور گھٹن نے اس کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ وہ 'محفوظ' ہے مگر بے چین ہے جب تک ہم یہ نہ سمجھیں، ہمیں اس روز افزوں اذیت رسانی کی سمجھ نہیں آ سکتی جو 1960ء سے نہ جانے کتنے جرائم کی بنیاد ہے۔

تہذیب ہمارے ذہنی تجربہ میں اضافہ کرتی ہے۔ اسے سنوارتی نکھارتی ہے۔ یہ کتابیں، یہ ٹیلی ویژن اور ہماری بات چیت سب اسی لیے ہیں۔ مگر تہذیب ہمارے جسمانی، ہمارے مادی تجربہ کو کم کرتی ہے۔ ہم فطرت سے دور ہو جاتے ہیں، ضرورت کا احساس بھی کم ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر ان حالات کے عادی ہو چکے ہیں مگر وہ بھی ہیں جو" کسی چیز کی کمی" کے مہمل احساس کو خاطر میں نہیں لاتے۔ گویا کہ نارمل تجربہ ایک حد تک غیر حقیقی ہو گیا ہے اور خواب بن گیا ہے۔ مہذب انسان کے بنیادی حالات میں سے یہ اس کی ایک بنیادی حالت ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے۔

چنانچہ 1960ء کا عشرہ جدید جرائم میں واٹر شیڈ (حد فاصل) ہے۔ ایسا عشرہ جس میں کئی سماجی بندھن ٹوٹے اور ٹوٹ کر بکھر گئے، بالکل ہی سماجی رشتوں کی بات ہے۔ صنعتی شہروں میں غریبوں کی ایسی بستیاں موجود ہیں جن میں کرائم کی شرح بہت زیادہ ہونی چاہیے تھی مگر بہت کم ہے کیونکہ وہاں انسانی رشتے مضبوط ہیں۔ ہمسایوں کو ایک دوسرے کا خیال رہتا ہے۔ اگر کوئی بیمار ہو یا کسی کو حادثہ پیش آئے تو ہمسائے باری باری اس کے سارے کام کرتے ہیں، کوئی کھانا پکاتا ہے، تو کوئی کپڑے دھوتا ہے۔ بچوں کو تیار کر کے سکول بھیجا جاتا ہے۔ ایسے علاقے بڑے شہروں کے ان سلمز (تنگ و تاریک غلیظ آبادیاں) سے یقیناً مختلف ہیں جہاں کئی قسم کے غریب لوگ رہتے ہیں اور ٹولیاں بنا کر ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں کہ ان کے پاس کرنے کے لیے کام نہیں ہوتا اور جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ایسے سلمز میں لوگ اپنے ہمسایوں سے بھی واقف نہیں ہوتے اور بچے بھی صرف ان کو جانتے ہیں جو اسکول میں ان کے ساتھ پڑھتے ہیں یا ایک گلی میں کھیلتے ہیں۔ وہ بھی اپنے والدین کے راستہ پر چلتے ہیں اور ہمسایوں کو غیر یا اپنے دشمن سمجھتے ہیں۔ ایسے علاقے شاید سلمز بھی نہیں ہوتے۔ جدید لاس انجلز میں میکسیکو کے نوجوانوں کے اندر قتل کی وارداتیں اتنی زیادہ ہیں کہ اس سے پہلے ان کی مثال نہیں ملتی۔ میکسیکو میں سماجی بھائی چارے اور رواداری کی روایت ہمیشہ سے قابل ستائش حد تک زندہ ہے۔ ان کے بدترین سلمز بھی اس نعمت سے محروم نہیں۔ "بہتر" علاقوں میں چلے جائیں تو بوریت وہاں منہ کھولے بیٹھی ہوتی ہے۔ علیحدگی کا جان لیوا احساس ہوتا ہے۔ بے تعلقی ہوتی ہے، پرانے سماجی رشتوں کی جگہ مکروہ علاقائیت لے لیتی ہے جس کا نتیجہ ہر دوسری گلی کے خلاف اشتعال اور تشدد ہوتا ہے۔

ومبلڈن میں 1969ء میں ہونے والا واقعہ اس کی ایک مثال ہے۔ ایک درجن

لڑکوں نے ایک شخص کو مار مار کر اس لیے ہلاک کر دیا کہ ان کے خیال میں وہ ہم جنس پرست تھا۔ وہ لڑکے سلمز کے بدحال اور غضبناک مکین نہیں تھے بلکہ الٹن اسٹیٹ جیسی شاندار آبادی میں رہتے تھے۔ مگر پلانر یہ بھول گئے کہ لندن سلمز کی محنت کش فیملیوں کو الٹن اسٹیٹ میں منتقل کرنے کا نفسیاتی نتیجہ کیا ہوگا۔ ان لڑکوں کا رِنگ لیڈر جیفری ہیمنڈ کوئی سر پھرا نوجوان نہیں تھا۔ وہ گویا تھا اور سینٹ جان ایمبولینس اور رائل میرین کیڈٹس میں رہ چکا تھا اور ٹیلی ویژن پر بچوں کے پروگرام 'بلیو پیٹر' میں آیا کرتا تھا۔ 29 ستمبر 1969ء کو وہ اپنا گینگ لے کر ان بدمعاشوں کی تلاش میں نکلا جو لوگوں کی کاریں توڑ دیتے تھے لیکن اب لوگ اپنی گاڑیاں اور دور کھڑی کرتے تھے۔ انہوں نے ایک زمین دوز راستہ کے قریب انتظار کیا اور پھر ایک اٹھائیس سالہ کلرک مائیکل گرو چی پر حملہ کر دیا۔ ہیمنڈ 'چارج' چیخا اور لڑکوں نے اسے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ اصل مسئلہ بوریت اور جڑ نہ ہونے کا احساس تھا۔

یہی مسئلہ بڑے بڑے رہائشی علاقوں کا ہے جن میں فلیٹ بھی شامل ہیں۔ یعنی چوری توڑ پھوڑ وغیرہ۔ ایک امریکی تجزیہ سے پتہ چلا ہے کہ فلیٹوں کے مکین بنگلوں میں رہیں جہاں ان کے انفرادی باغ ہوں تو جرائم ڈرامائی طور سے کم ہو جاتے ہیں۔ مسئلہ علاقہ، زمین ہے۔

ایک بار سماجی رشتوں کی گرفت کمزور ہو جائے تو بوریت اور بے دلی کا قدرتی اظہار تشدد ہوتا ہے۔ اس موقع پر ہی 'جادوئی فکر' اپنے آپ میں آتی ہے اور تشدد کا دانشورانہ جواز مہیا کرتی ہے۔ ورنر بوسٹ ایک جرمن جنسی قاتل (جس کی عادت جوڑوں پر حملہ کر کے بیوی کو ریپ کرنے کی تھی) نے پولیس کو بتایا کہ مجھے ان جوڑوں کی بے حیائی پر غصہ آتا ہے جو کاروں کے اندر جنسی عمل کرتے تھے اور یہ کہ ایسے کام جرمنی کے لیے لعنت ہیں۔ تئیس سالہ ہیزک جس نے بیس ریپ اور دس قتل کیے تھے، گرفتاری کے بعد کہا کہ اس نے پہلا قتل ایک فلم 'دی ٹین کمانڈمنٹس' دیکھنے کے بعد اور یہ فیصلہ کرتے ہوئے کیا تھا کہ عورتیں دنیا کے تمام مسائل کی ذمہ دار ہیں۔ اس کے بعد اس نے ایک پارک میں ایک اٹھارہ سالہ لڑکی ریپ کی اور اس کا گلا کاٹ دیا۔ پیٹرک بائرنی (جس نے برمنگھم کے وائی ڈبلیو سی اے ہوسٹل میں 1959ء میں ایک لڑکی ریپ کی تھی) نے کہا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ عورتوں سے اپنی جنسی گھٹن کا انتقام لیتا ہے۔ روڈلف پلائیل ایک جرمن ریپسٹ جس نے 1958ء میں جیل کے اندر خودکشی کی تھی، اپنے آپ کو 'بہترین قاتل' کہلانا پسند کرتا تھا۔ اس نے پچاس عورتیں قتل کی تھیں۔ ''ہر شخص کی

اپنی پسند ہوتی ہے،'' وہ کہتا تھا۔''بعض لوگ تاش کھیلنا چاہتے ہیں، مجھے لوگوں کو قتل کرنا پسند ہے۔'' یعنی قتل کرنا قابل عزت پیشہ ہے جس میں اپنی قاتلانہ مہارت پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اس کی خودکشی اس کا کھلا اعتراف تھا کہ وہ اپنے آپ کو جیوری کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔

جان لینا چاہیے کہ 'جادوئی سوچ' کا تعلق زندگی کے صرف ایک پہلو سے ہوتا ہے۔ ورنہ کئی لحاظ سے وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ جس کی مثال 'رائٹ مین' ہے، جو اپنے دوستوں اور عزیزوں کی نظر میں بالکل نارمل ہوتا ہے۔ 1950ء کے عشرہ میں ایک 'پاگل بمبار' نے نیویارک میں دہشت پھیلا دی۔ بم گرینڈ سنٹرل سٹیشن، ریڈیو سٹی میوزک ہال، میسی ڈیپارٹمنٹ سٹور اور کئی پبلک مقامات پر گرے۔ خوش قسمتی سے کوئی شخص ہلاک نہیں ہوا اور چند لوگ زخمی ہوئے، پولیس کو بمبار کا پتہ اس وقت چلا جب اس نے ایڈیسن کمپنی کے خلاف خط لکھا کہ اسے تپ دق کا مرض ان کی وجہ سے ہوا۔ کمپنی کا ریکارڈ دیکھنے سے پتہ چلا کہ 1931ء میں ایک شخص جارج میٹسکی گیس خارج ہونے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا اور معذوری کی پنشن بھی حاصل کرنے میں ناکام ہوا تھا۔ میٹسکی چون سالہ کنوارہ، اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتا تھا۔ ہر اتوار چرچ جاتا تھا اور باقاعدگی کے ساتھ ڈبل بریسٹڈ سوٹ پہنتا تھا۔ وہ کبھی کسی کو معمولی سا پاگل بھی نہیں لگا۔ اپنے ظاہر کے لحاظ سے وہ بالکل نارمل تھا۔ میٹسکی کو مینٹل ہوم میں رکھا گیا۔

جنسی قاتل رچرڈ سپیک کا بھی یہی معاملہ ہے۔ جب پولیس نرسوں کے ہوسٹل جیفری مائر شکاگو میں 14 جولائی 1966ء کو بلائی گئی تو اسے یقین ہو گیا کہ کوئی مفرور پاگل واردات میں ملوث ہے۔ نیچے سیڑھیوں پر ایک لڑکی کی مسخ شدہ لاش تھی۔ اوپر سات عورتوں کی بے جان برہنہ لاشیں، جنہیں چیرا پھاڑا گیا تھا۔ ایک نرس کرازون امورا جو بچ گئی تھی، اس نے بیان کیا کہ ایک داغ دار چہرے والے شخص کے لیے دروازہ اس نے کھولا تھا جس نے اسے بندوق سے ڈرایا تھا۔ اس نے نو نرسیں باندھ دیں، پھر انہیں باری باری دوسرے کمرہ میں لے گیا۔ مس امورو پلنگ کے نیچے چھپ گئی تھی اس لیے قاتل اسے دیکھ نہ سکا۔ جب اس نے بتایا کہ قاتل کے بازو پر ٹیٹو سے ''دوزخ بنانے والا'' لکھا تھا تو پولیس نے پہچان لیا کہ وہ رچرڈ سپیک، ایک ملاح تھا جس نے 'لوکل سی مین یونین کو ملازمت کے لیے درخواست بھیجی تھی۔ دو روز بعد جب اس کا نام ٹیلی ویژن پر نشر ہوا تو سپیک نے ایک ہوٹل میں خودکشی کی کوشش کی۔

ٹیٹو کو اس ڈاکٹر نے پہچانا جس نے اس کی زخمی کلائیوں کی مرہم پٹی کی۔

چہرے پر چیچک کے داغوں کے باوجود، سپیک ایک خاموش شرمیلا شخص لگتا تھا اور اپنی نرم خوئی سے متاثر کرتا تھا۔ (ایک شخص جو اسے شکاگو میں ملا تھا اسے میرے سامنے 'جادوگر' کہتا تھا) قتل کرنے سے چند ہفتے پہلے وہ ہسپتال میں اپنڈکس کے آپریشن کے لیے داخل ہوا تھا۔ ایک نرس جو اس کے ساتھ تفریح کے لیے گئی تھی اس نے بتایا کہ وہ بہت مہربان شخص تھا مگر اپنی طلاق یافتہ بیوی سے سخت نفرت کرتا تھا۔ گلوریا ڈیوی واحد نرس تھی جو ریپ ہوئی (اور جس کی لاش نیچے سیڑھیوں پر ملی تھی) شکل وصورت میں وہ سپیک کی بیوی سے مشابہ تھی۔

بار بار ہم مجرموں میں یہ خلاف امید خوبی دیکھتے ہیں کہ مائرہ ہنڈلے کو جانوروں سے محبت تھی۔ جیفری ہیمنڈ کے باپ نے اس کے متعلق کہا، ''اسے بچوں سے محبت ہے۔ وہ جذباتی لڑکا ہے۔'' ہیمنڈ کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ ہم جنس پرستوں کے خلاف نفرت کا ایک لمحہ اسے تشدد پر مجبور کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہ ایک خاص میدان میں 'قابو سے باہر ہونے کا' فیصلہ تھا۔ لیکن تشدد کے ذریعہ اظہار نفرت کے اس فیصلہ کا انحصار کسی حد تک سماجی پس منظر پر ہے کہ وہ مشفقانہ اور حوصلہ افزا یا مخالفانہ اور حوصلہ شکن ہے۔ رچرڈ سپیک کی گھریلو زندگی ناخوشگوار تھی۔ اس لیے وہ آوارہ ہو گیا۔ مائرہ ہنڈلے کا بچپن دو گھروں میں بٹا رہا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کے والدین دوسری بہن کو اس سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ بریڈی ناجائز بیٹا تھا۔ چارلس مینسن کی ماں پندرہ سال کی عمر میں حاملہ ہو گئی تھی اور چارلس کی پیدائش کے بعد جیل چلی گئی تھی۔ سماجی بندھن کمزور ہوں تو محبت کرنے کی صلاحیت مضبوط نہیں ہوتی نہ وہ ایک پائیدار اور مضبوط رشتہ میں ڈھل سکتی ہے۔ جبکہ نفرت ایک چھپا ہوا آتش فشاں ہے جس کے متعلق کوئی نہیں جانتا کہ کب پریشر پڑے اور پھٹ جائے۔

1960ء کے عشرہ میں صاف پتہ چل گیا تھا کہ اتھارٹی سے نفرت اور عام سماجی بیزاری 1880ء کی نراجیت اندھیر گردی سے زیادہ شدت اختیار کر گئی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کا زمانہ سماجی لحاظ سے پرسکون تھا۔ شاید اس لیے کہ فسطائیت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ برطانیہ میں اس کی روح رواں وہاں کی سوشلسٹ حکومت تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سوشلزم کی طرف مائل ہونا کسی سوشل بے چینی کی نشانی تھی۔ بلکہ پانچ سال کی لگاتار جنگ کے بعد تبدیلی کی خواہش تھی۔ قومی مزاج قدامت پسند تھا اور اس قدامت پسندی کی وجہ سے نئی نسل میں ایک ردعمل پیدا ہوا۔

سماجیات کے امریکی ماہر ڈیوڈ ریزمین نے 1956ء میں ایک مضمون 'The Found Generation' میں لکھا کہ امریکا کی نئی نسل خوفناک حد تک تنظیمی ذہنیت رکھتی ہے۔ اس کا مقصد ایک بیوی، ایک گھر، ایک کار اور اچھی ملازمت ہے تا کہ وہ ہر لحاظ سے محفوظ ہو۔ ایسے لوگ ایٹم بم گرا سکتے ہیں نہ عالمی جنگ شروع کر سکتے ہیں۔

بیسوی صدی کے دوسرے نصف تک ایک نئی نسل استحکام سے اپنی بیزاری ظاہر کر رہی تھی۔ انگلینڈ میں جان آزبرن کے کھیل 'Look Back in Anger' سے متاثر 'Angry Young Man' نے چرچ، حکومت اور شاہی خاندان، تمام اسٹیبلشمنٹ کی جی بھر کر مذمت کی۔ امریکا میں 'The Beat Generation' نے جیک کیرواک اور ایلین جنسبرگ کی قیادت میں 'ہپی کلچر' کی حمایت کرتے ہوئے سوسائٹی نظر انداز کر دی۔ مگر اصرار اسٹیبلشمنٹ کے ظلم اور ناانصافی پر تھا۔ فرانس میں سارتر کے ساتھی اپنے آپ کو ماؤسٹ کہلاتے تھے اور کمیونسٹ انقلاب کی راہ دیکھتے تھے۔ 1945ء کی شکست سے بدستور نڈھال جرمنی میں کسی نئی ادبی تحریک کے آثار تو نہیں تھے مگر بے چینی اور بے اطمینانی پھیل رہی تھی۔

استحکام کے خلاف بغاوت نے سب سے مؤثر اظہار رول وینی گم اور گائی ڈیبور کی تحریک 'Situationist International' کے مینی فسٹو میں پایا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسٹیبلشمنٹ نے لوگوں کو محکوم رکھنے کے لیے زندگی کو ایک مسلسل تفریح بنا دیا ہے۔ یہ کھیل تماشے، کمپیوٹر، ٹیلی ویژن اور تمام نئی تفریحات اس لیے ہیں کہ لوگوں کو مویشیوں کی طرح مطیع اور فرماں بردار بنایا جائے۔ اس کا جواب بغاوت، جدید زندگی کے ہر شعبہ میں بغاوت ہے۔ چاہے وہ سکول ہوں یا یونیورسٹیاں اور فیکٹریاں ہوں۔ ہر اس چیز کو اپنا دشمن نمبر ایک سمجھنا چاہیے جو نئی زندگی کے عیش و آرام میں اضافہ کرے۔

اس باغی نسل پر ایک اور زبردست اثر ہربرٹ مارکیوز ہے۔ مارکسی خیالات کا ایک جرمن یہودی سوشیالوجسٹ جو جرمنی میں نازیوں کے اقتدار کے بعد امریکا منتقل ہوا۔ وہ امریکی معاشرہ سے بھی اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی نفرت اسے ہٹلر کے جرمنی سے تھی۔ وہ اسے کامیابی، من مانی اور معیاریت کے نشہ میں بدمست سمجھتا تھا۔ 1941ء سے ہی وہ صنعتی معاشرہ اور اس مشینی ذہنیت کے بارے میں اپنے شبہات ظاہر کر رہا تھا جو انسان سے اس کی آزادی چھین رہے تھے۔ 1951ء میں اس نے اپنی کتاب 'Eros and civilization' کا آغاز فرائیڈ کی دلیل سے کیا کہ ''تہذیب ہمیشہ انسان کے قدرتی رجحان دبا دیتی ہے،'' اور

1964ء میں One Dimensional Man' اس طرح شروع ہوئی۔ ایک آرام دہ، سہل، معقول، جمہوری، ''غیر آزادی'' صنعتی ترقی کی علامت بن کر نئی صنعتی تہذیب میں موجود ہے، مارکیوز کے دماغ میں کسی آئیڈیل بے جبر سوسائٹی کا ایک دھندلا تصور موجود تھا۔ روسو کے خوابوں جیسا ایک خواب تھا جس میں ہر شخص وہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ مارکیوز پرانے فیشن کا انارکسٹ تھا۔ مگر اس کی ماڈرن زندگی کی مذمت ان نوجوان دلوں میں للکار بن کر گونجی جو ماڈرن زندگی کی بوریت اور اس کے کھوکھلے پن سے واقف تھے۔

دوائیں جو مارکیوز تجویز کرتا تھا وہ افیم سے تیار نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ Mescalin اور ایل ایس ڈی کی طرح Psychedelics تھیں (ذہنی بیداری میں اضافہ کرنے والی سمجھی جاتی تھیں) جن کی عادت بھی نہیں پڑتی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ بائیں دماغ کے نارمل دباؤ دینے والے repressive عمل کو معطل کر کے اپنا کام کرتی ہیں جس سے ادراک ہمارے دائیں دماغ کی بیداری سے تشکیل پاتا ہے۔ 1950ء کی دہائی کے آخر میں ٹموتھی لیری، ہارورڈ میں نفسیات کے ایک لیکچرر نے Psychedelics (یہ لفظ اس کی ایجاد ہے) کے تجربے کیے تو اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک نئی آگہی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اس نے اپنی ڈاکٹرین اس طرح مختصراً کی ٹرن آن، ٹیون اِن، ڈراپ آؤٹ (کام شروع کرو، وقت کے ساتھ قدم ملاؤ، تقلید ترک کرو) 1963ء میں ہارورڈ سے نکالے جانے کے بعد وہ نئی نسل کا گرو بن گیا۔ بعد میں اسے ڈرگ سمگلنگ کے جرم میں دس سال قید کی سزا ہوئی۔

1966ء کے موسم خزاں میں سٹراس برگ یونیورسٹی کے طلبا نے ایک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد مارکسی تعلیمات کی نشر و اشاعت تھا۔ انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں اتھارٹی کے خلاف بغاوت پر زور دیا گیا تھا۔ ایسے تمام طلبا یونیورسٹی سے نکال دیے گئے مگر اس کا الٹا اثر ہوا کہ تمام فرانس میں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہیں 'Enrages' کا نام دیا گیا۔ نینترے یونیورسٹی میں انہوں نے استادوں کو پڑھانے سے روک دیا۔ اور دیواروں پر ننگی تصویریں بنائیں۔ ہنگامہ رفع کرنے کے لیے پولیس بلانا پڑی۔ مئی 1968ء میں بدامنی نے پیرس کا رخ کیا۔ طلبا نے سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کیں، ٹائر جلائے اور پتھر برسائے جبکہ فرانسیسی پولیس حسب عادت بڑی بے نیازی کے ساتھ موقع واردات پر پہنچی۔ لمحہ بھر کے لیے لگا کہ ڈیگال حکومت کا دور ختم ہوا۔ مگر مزدور خود چونکہ انقلاب کی یہ کوششیں احمقانہ سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے فیکٹریوں پر قبضہ کرنے سے انکار کر دیا۔

آہستہ آہستہ فرانسیسی بغاوت ختم ہوگئی۔ مگر برطانیہ میں، جرمنی اور امریکا میں بغاوت کی آگ سلگتی رہی۔ جون 1967ء میں جب شاہ ایران برلن آیا تو طلبا نے اس کی آمرانہ حکومت کے خلاف سخت احتجاج اور مظاہرے کیے۔ پولیس نے مظاہروں کا جواب تشدد سے دیا اور ایک طالب علم بینواونسورن ہلاک ہوگیا۔ اب طلبا کی سمجھ میں آیا کہ تشدد کا جواب تشدد ہے۔ احتجاج کے دو بڑے لیڈر گورڈن ایسلیے اور الرک مینہوف تھے۔ اکتوبر 1968ء کو لندن میں گروسونر سکوئر کے مظاہرین کے ساتھ پولیس نے ناروا سلوک کیا تو بعض افراد نے ایک اور زیادہ متحرک اور فعال تنظیم 'اینگری بریگیڈ' بنانے کا فیصلہ کیا۔ امریکا میں 'شہری گوریلوں' کے ایک گروپ نے (جو ویدرمین کہلاتے تھے) پہلے ہی فوجی اہمیت کے مقامات بنکوں اور بڑی کارپوریشنوں کے دفتروں میں بم نصب کر کے سرمایہ کاری کے خلاف احتجاج شروع کر رکھا تھا۔

سان فرانسسکو میں اس 'مکمل انقلاب' کے آئیڈیا کو 'ہپون' نے بڑی سنجیدگی سے لیا۔ جو چارلس مینسن ایک گٹارنواز اور کرشماتی شخصیت (پیدائش 1934ء) کے گرد جمع تھے۔ مینسن نو سال کی عمر میں پہلی بار ریفارمیٹری سکول گیا تھا۔ جب تک 1967ء میں سان فرانسسکو منتقل ہوا وہ اپنی جوانی کا لمبا عرصہ جیل میں گزار چکا تھا۔ جس کی وجہ کار چوری اور قرضوں میں فراڈ جیسے جرائم تھے۔ اس نے اپنے آپ کو ایک نئے Psychedelic کلچر کی دنیا میں پایا۔ ایش بری کے ہپی ایل ایس ڈی چھوٹے حقوں میں رکھ کر لیتے تھے اور اپنے آپ کو 'فلاور چلڈرن' کہتے تھے۔ کسی کو پروا نہیں تھی کہ مینسن نے زندگی کا بڑا حصہ جیل میں گزارا تھا بلکہ وہ اسے مینسن کی خوبی سمجھتے تھے۔ مینسن عمر میں سب سے بڑا تھا۔ لڑکیاں اسے باپ کی طرح سمجھتی تھیں۔ مفرور اس کے گرد جمع ہونے لگے اور جلد ہی 'ہارٹ ایش بری' میں مینسن کا گھر جذباتی طور سے محروم لڑکیوں اور اس کے گرویدہ لڑکوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اگر وہ مارکیوز کو نہ پڑھتے تو جنس کو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ کبھی نہ سمجھتے۔

1968ء تک مینسن پاپ میوزک کے کاروبار میں شامل ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کا 'خاندان' ایک کامیاب گروپ 'بیچ بوائز' کے بڑے آرام دہ گھر میں بھی کچھ عرصہ رہا۔ مینسن کی ناکامی سے اس کے مزاج میں تلخی آ گئی تھی۔ 'خاندان' جو اب بچوں سمیت تیس افراد پر مشتمل تھا، ایک فارم میں منتقل ہوگیا۔ جو ایک عمر رسیدہ شخص جارج سپاہن کی ملکیت تھا۔ مینسن کا 'خاندان' اصطبل وغیرہ صاف کرنے کے عوض وہاں رہنے لگا۔

منشیات کے کثرتِ استعمال نے اپنا رنگ دکھایا اور تشدد ناگزیر ہو گیا۔ مینسن نے منشیات کے کالے تاجر برنارڈ کرو کے سینہ میں گولی مار دی۔ کرو کی حالت بہتر ہو گئی اور اس نے پولیس میں جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ اس مہینہ مینسن اور اس کے دوست بوبی بیوسل نے ایک اور منشیات کے تاجر گیری ہیمن کو ڈیتھ ویلی میں سرمایہ لگانے پر مجبور کیا۔ اس کے انکار پر اس نے گیری کو ٹارچر کیا اور اس کے سینہ میں چھرا مار کر اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ بیوسل نے دیوار پر لکھا 'سیاسی بونا خون میں' تاکہ پولیس بلیک پینتھر موومنٹ کو قتل کی ذمہ دار سمجھے۔

مینسن گوروں کو کالوں (جن سے وہ سخت نفرت کرتا تھا) سے لڑانا چاہتا تھا اور اسی طرح انقلاب لانے کا خواہش مند تھا۔ 8 اگست 1969ء جمعہ کے روز تین لڑکیاں اور ایک مرد، مینسن کے چار ساتھی گاڑی پر بینڈکٹ کینن میں واقع ایک گھر کے اندر گئے جو پاپ میوزک بزنس سے منسلک ایک شخص نے کرایہ پر دے رکھا تھا، اور جس کے خلاف مینسن کو کوئی شکایت تھی۔ اب اس گھر میں فلم ڈائریکٹر رومن پولانسکی اور اس کی بیوی شیرون ٹیٹ رہتے تھے۔ پولانسکی لندن میں تھا۔ شیرون ٹیٹ نے دو مرد اور ایک عورت، تین مہمان کھانے پر بلائے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے کوئی نشہ آور دوا لی اور دنیا سے غافل ہو گئے۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی مینسن کے ساتھیوں نے ایک لڑکا دیکھا۔ انہوں نے پہلے اس کے سر میں گولی ماری، پھر وہ گھر میں داخل ہوئے اور شیرون ٹیٹ اور اس کے تینوں مہمان قتل کیے۔ ہال کے دروازہ پر ان کے خون سے 'خنزیر' لکھا اور چلے گئے۔

اس واردات سے ویسی ہی سنسنی پیدا ہوئی جس کی امید مینسن کر رہا تھا۔ اگلے دن 'فیملی' نے ٹیلی ویژن کی خبریں اطمینان سے دیکھیں۔ شام تک لاس اینجلس میں ہر بندوق اور ہر پہرہ دینے والا کتا بک چکا تھا۔ مینسن نے ایک بار اور چوٹ لگانے کا فیصلہ کیا، جبکہ لوہا گرم تھا۔ اس شام ایل ایس ڈی لینے کے بعد اپنے چھ ساتھیوں کے ساتھ لاس اینجلس ڈسٹرکٹ کے ایک مال دار شخص کے گھر میں داخل ہوا۔ لینو لیبیکا ایک سپر مارکیٹ کا مالک تھا۔ گھر میں اس کی بیوی روزمیری بھی تھی۔ مینسن گن لے کر ان کی خواب گاہ میں گیا اور انہیں باندھ دیا۔ پھر اپنے تین ساتھی بھیجے جنہوں نے لیبانوکس کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا اور دروازے پر 'ہیلٹر سکیلٹر' خون کے ساتھ لکھا جس کا مطلب مینسن کی زبان میں بغاوت تھا۔ بغاوت اس وقت ہو گی جب گورے کالوں سے لڑنے کے لیے تیار ہوں گے۔

مگر بغاوت نہیں ہوئی۔ لاس اینجلس نے ایسے کئی قتل دیکھے تھے اس لیے کوئی

ردِعمل نہیں ہوا۔ اگلے مہینہ فیملی 'ڈیتھ ویلی' روانہ ہوگئی۔ جب مینسن نے رینجرز کے ایک بلڈوزر کو آگ لگائی تو پولیس نے فارم پر دھاوا بول دیا اور سارے ہپی گرفتار کر لیے۔ جیل میں ایک مہینہ رہنے کے بعد سوسین اٹکنسن نے جو فیملی کی ایک ممبر تھی اور دونوں وارداتوں میں شریک تھی، ان کا ذکر جیل میں ایک ساتھی سے کیا۔ بات پولیس تک پہنچ گئی۔

اس کے بعد جو مقدمہ چلا وہ لاس اینجلس کی تاریخ کا سب سے طویل اور مہنگا مقدمہ تھا۔ مینسن نے پوری کوشش کی کہ وہ اسے سوسائٹی اور ججوں کے خلاف فرد جرم بنا دے۔ وضاحت کی کہ قتل محبت کی وجہ سے کیے گئے۔ جب سوسین سے پوچھا گیا کہ کیا آٹھ انسانوں کے قتل کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تو سوسین اٹکنسن نے پلٹ کر سوال کیا کہ کیا نیپام بموں کے ذریعہ ہلاک کیے جانے والے ہزاروں انسانوں کی ہلاکت کی کوئی اہمیت ہے؟ پریذیڈنٹ نکسن نے مینسن اور اس کے پانچ ساتھیوں کا جرم ثابت ہونے سے پہلے ہی انہیں مجرم قرار دے دیا اور مینسن مغربی ساحل کے زیرزمین نیٹ ورک کا ہیرو بن گیا۔ مگر مقدمہ نے باقی دنیا پر ثابت کر دیا کہ سماجی انقلاب کی تمام تحریک محض کھوکھلی جذباتیت تھی۔ جس کا مؤقف ہر دلیل، ہر منطق سے محروم تھا۔

اطلانتک کے دوسری طرف انقلاب زندہ رہا، بڑی حد تک اس وجہ سے کہ سماجی تصادم کا مدار وسیع تھا۔ تحریک آزادی فلسطین یا سرعرفات کی زیر قیادت 1964ء میں قاہرہ میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا مقصد فلسطین کو اسرائیلیوں سے آزاد کرانا تھا۔ 1967ء میں عربوں نے مصر کی قیادت میں اسرائیل پر حملہ کیا۔ مگر اسرائیل نے فوراً جوابی حملہ کیا اور چھ دن میں فتح حاصل کی۔ فوجی فتح سے ناامید فلسطینیوں نے حکمت عملی تبدیل کی۔ جولائی 1968ء میں ایک اور فلسطینی گروپ پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین (پی ایف ایل پی) کے تین ارکان نے روم سے تل ابیب پرواز کرنے والا ایک طیارہ اغوا کیا اور پائلٹ کو الجیریا میں اترنے کے لیے کہا۔ اسرائیلیوں نے سولہ عرب حریت پسند، طیارہ اور اس میں سوار اسرائیلیوں کی رہائی کے بدلے آزاد کرنے پر اتفاق کیا۔ ستمبر 1970ء میں پی ایف ایل پی نے بیک وقت تین جہاز اغوا کیے۔ (چوتھا جہاز اغوا کرنے کی کوشش ناکام ہوئی) ان میں سے ایک امریکی جمبو جیٹ (لاکھوں ڈالر مالیت کا) قاہرہ ایئر پورٹ پر دھماکہ سے اڑا دیا۔ امریکا کے خلاف اس احتجاج کی وجہ اسرائیل کے لیے امریکی حمایت تھی۔ اس عرصہ میں ایک برطانوی ڈی سی 10 جہاز بحرین میں اغوا کیا جا چکا تھا اور فلسطینیوں نے خاتون کمانڈو لیلیٰ خالد کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا۔

باقی تین جہاز اردن میں تباہ کیے گئے۔ لیکن تباہی سے پہلے تمام مسافروں سے جہاز خالی کرا لیے تھے حالانکہ جہاز مسافروں سمیت تباہ کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ مسافروں کے عوض سات فلسطینی رہا کیے گئے۔ ان حملوں کے بعد فلسطینیوں کے خلاف عالمی رائے عامہ بدلنا شروع ہوئی۔ میڈیا نے بھی اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کیا تو دنیا کو بتدریج مگر یقینی طور سے احساس ہوا کہ فلسطینیوں کی جدوجہد بے جواز نہیں اور اپنا وطن حاصل کرنا فلسطینیوں کا جائز حق ہے۔

1964ء میں جب پی ایل او کا آغاز ہوا تھا تو اسی سال مارکس سے متاثر آئرش ری پبلکن آرمی (آئی آر اے) اور پروونڑنل آئی آر اے (جن کا ایک ہی مقصد آئرلینڈ کا اتحاد تھا) میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ 1968ء میں آئرلینڈ کی کیتھولک آبادی کو پروٹسٹنٹ السٹر گورنمنٹ سے شکایت تھی کہ انہیں دوسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ پے در پے تلخیوں اور اختلافات نے 1968ء میں آخرکار فساد کی صورت اختیار کر لی اور شمالی آئرلینڈ میں دہشت گردی کی ابتدا ہو گئی۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے درمیان کئی خون ریز تصادم ہونے کے بعد برطانوی حکومت نے اپریل 1969ء میں فوج السٹر بھیجی۔ برطانوی فوج کا مقصد کیتھولک شہریوں کا دفاع تھا مگر جلد ہی خود دہشت پسندوں کا نشانہ بن گئی۔ 'Provors' دہشت گردی میں پیش پیش تھے۔ پروورز نے ہی 'کار بم' کا آغاز کیا تھا، یعنی کار چوری کر کے اس کی مختلف جگہوں میں بم نصب کیا جائے، اور شہر کے مرکز یا کسی اور مناسب مقام پر کار پارک کی جائے تا کہ بم پھٹنے سے پہلے کسی کو پتہ نہ چلے۔ بعض کیتھولک علاقے آئی آر اے کے مرکز بن گئے جہاں فوج یا پولیس کا جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ بلفاسٹ میدان جنگ بن گیا تھا۔

1968ء میں جنوبی امریکا میں بھی دہشت پسندی زوروں پر تھی۔ 1967ء میں بولیویا میں چی گویرا کی موت نے اسے انقلاب کی علامت بنا دیا۔ سپین میں باسک علیحدگی پسندوں کے خلاف نئی حکمت عملی، بلجیم میں لسانی فسادات اور ویلز میں ویلش قوم پرستوں کی دہشت گردی، اسی سال روسیوں نے چیکوسلوا کیہ پر الیگزینڈر ڈوبیک کی آزاد خیال حکومت کو دبانے کے لیے حملہ کیا۔ امریکا میں انسانی حقوق کا لیڈر مارٹن لوتھر کنگ میمفیا میں قتل ہوا اور سینیٹر رابرٹ کینیڈی کو لاس اینجلس میں گولی ماردی گئی۔ فرانس میں طلبا کے فساد ہوئے تو لگا کہ 1968ء اس انقلاب کی آہٹ ہے جس کی پیش گوئی سچویشنسٹ کیا کرتے تھے۔ مگر طلبا کے فسادات کا نتیجہ عام شہریوں کے لیے ایک زیادہ معتبر اشارہ تھا۔ گالسٹ (ڈیگال کے حامی) عام

انتخابات کرانے پر مجبور ہو گئے مگر پہلے سے زیادہ اکثریت کے ساتھ اقتدار میں واپس آ گئے۔

پھر بھی دہشت پسندی کے عروج نے عرب اور امریکا کے بائیں بازو کو یہ حوصلہ دیا کہ 'مارکیوز کی بے جبر سوسائٹی' کی آرزو کرے۔ برطانیہ میں Essex یونیورسٹی کے طلبا کا ایک گروپ اپنے آپ کو 'اینگری بریگیڈ' کہلانے لگا اور سبوتاژ کی کارروائیوں میں حصہ لینے لگا۔ جیسے لندن کے بڑے سٹوروں میں آتش گیر بم رکھ دیے۔ 1971ء میں دو بم ربارٹ کار کنزرویٹو ایمپلائمنٹ منسٹر کے گھر پھٹے۔ ایک اور بم پولیس کمپیوٹر سنٹر، ایک بم سیکرٹری تجارت جان ڈیویز کے گھر، ایک پوسٹ آفس کے ٹاور کے اوپر پھٹا۔ کوئی شخص زخمی نہیں ہوا۔ برطانوی پولیس نے شمالی لندن کے ایک کمیون سے مجرموں کو گرفتار کیا جن میں سے چار ملزم دس سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ مغربی جرمنی میں بم وارداتوں کا ذمہ دار اندریس بادو کے گروپ بادر میخاف کو ٹھہرایا گیا۔ مئی 1972ء میں الرائک میخاف اور گورڈن الیسلین نے کئی افراد زخمی اور قتل کیے تھے۔ چند ماہ بعد ان کا وکیل اور سرغنے تینوں گرفتار ہوئے۔ ہورسٹ ماہیلر گروپ بنانے میں مدد کے جرم میں بارہ سال قید ہوا مگر گروپ کے دوسرے اراکین نے حملے جاری رکھے۔

کرسچین ڈیمو کریٹک یونین کا لیڈر پیٹر لورینز فروری 1975ء میں اغوا ہوا، گورنمنٹ نے پانچ لیفٹسٹ رہا کیے تو اسے رہائی نصیب ہوئی۔ اپریل 1975ء میں بادر میخاف کے ایک سپلنٹر گروپ نے سٹاک ہام میں مغربی جرمنی کے سفارت خانہ پر قبضہ کر لیا، ملٹری اتاشی قتل کیا اور مطالبہ کیا کہ بادر میخاف کے ممبر رہا کیے جائیں۔ ان کا مطالبہ نہیں مانا گیا تو انہوں نے عمارت بارود سے اڑا دی۔ جب گھیرے میں لیے گئے تو سب نے ہتھیار ڈال دیے۔ مئی 1976ء میں الرک میخاف جیل میں مردہ پایا گیا۔ جیل حکام کے مطابق اس نے خودکشی کی تھی۔ مگر بائیں بازو کا الزام تھا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ اپریل 1977ء میں چیف فیڈرل پراسیکیوٹر سیگفر ڈ بوبک اپنی کار میں قتل کیا گیا۔ اس کے باوجود بقیہ تین سرغنوں اندریز بادر، گدرن ایسلن اور جان کارل ریسپ کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ جولائی میں جرگن پونٹو، ڈریسڈیز بنک کا چیئرمین اپنے گھر میں دہشت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ستمبر 1977ء میں ایک صنعت کار ہیس مارٹن سکلیئر اغوا کر لیا گیا۔ تاوان کے طور پر بادر، ایسلن اور ریسپ کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ سکلیئر ابھی رہا نہیں ہوا تھا کہ چار عربوں نے لفتھانسا کا ایک جیٹ ہوائی جہاز قبضہ میں لے لیا اور اسے صومالیہ کے ایک ہوائی اڈہ موگا ڈیشو پر رکھا۔ اسے

مسافروں سمیت تباہ کرنے کی دھمکی دی اگر بادر اور اس کے ساتھی رہا نہ کیے گئے۔ مغربی جرمنی کے کمانڈو جہاز پر حملہ آور ہوئے اور چار میں سے تین ہائی جیکر ہلاک کر کے چھیاسی مسافر چھڑا لیے۔ چند گھنٹوں بعد بادر، ریسپ اور گردن ایسلن اپنے قید خانوں میں مردہ پائے گئے۔ تفتیش کی رپورٹ تھی کہ خودکشی کی، جبکہ عام خیال تھا کہ حکومت کو ان سے جان چھڑانے کا یہی ایک راستہ نظر آیا کہ انہیں مروا دے۔ اگلے دن سکلیئر کی لاش ایک لاوارث کار میں سے ملی۔

امریکا میں عشرہ بھر میں دہشت گردی کی سب سے بڑی واردات ایک اخبار کی مالکہ پیٹی ہیرسٹ کا اغوا تھا جو فروری 1974ء میں اپنے فلیٹ سے اغوا ہوئی۔ دہشت پسند اپنے آپ کو 'سمبیو نیز لبریشن آرمی' کہلاتے تھے۔ ان کے لیڈر فیلڈ مارشل سبنک کا مطالبہ تھا کہ پیٹی کا باپ ڈونلڈ ہیرسٹ غریبوں کو لاکھوں ڈالر کی خوراک مفت مہیا کرے۔ مطالبہ نامناسب تھا۔ کیونکہ حال ہی میں اسے لاکھوں ڈالر کا نقصان ہوا تھا۔ پھر بھی ہیرسٹ نے 20 لاکھ ڈالر کی خوراک تقسیم کی۔ ایس ایل اے نے فی الفور اعلان کیا کہ یہ ناکافی ہے۔ اس سے بہت زیادہ کی ضرورت ہے۔ مگر اس پر مزید بحث رک گئی جب دہشت پسندوں نے پیٹی کی ایک ٹیپ ریلیز کی جس میں اس نے اپنے خاندان کو غاصب سرمایہ دار کہا اور اعلان کیا کہ وہ تانیا کے نام سے حریت پسند بن گئی ہے۔ جب ایک کیمرہ سے اس کی تصویر لی گئی جس میں اس نے چھوٹی مشین گن اٹھا رکھی تھی تو اسے مفرور قرار دیا گیا۔ مئی میں پولیس نے S 1 A کے چھ ارکان لاس اینجلس کے گرد و نواح میں واقع ایک مقام پر گھیر لیے۔ طرفین کی فائرنگ سے سرغنہ ڈونلڈ ڈی فریز سمیت تمام ارکان مارے گئے۔ مارشل سینک اور پیٹی ہرسٹ دونوں وہاں موجود نہیں تھے۔ پیٹی مزید سولہ مہینے مفرور رہی۔ اور آخر ستمبر 1975ء میں گرفتار ہوئی۔ اس کے مقدمہ میں ڈیفنس نے موقف اختیار کیا کہ اسے گمراہ کیا گیا ہے۔ یہ موقف ایک نئی بحث کا نکتہ آغاز بن گیا کہ جان بچانے کے لیے اگر اغوا کاروں کی سوچ اپنائی جائے تو کیا یہ جرم ہے؟ اسے سات سال قید کی سزا ہوئی مگر اپیل کے نتیجہ میں اسے کم کر کے صرف نگرانی کا حکم دیا گیا۔

مقدمہ دو برس تک اخبارات کا عنوان بنا رہا۔ مگر اسے لوگوں کی ہمدردی نصیب نہ ہوئی۔ جب تک پیٹی ہیرسٹ گرفتار ہو شمالی ویت نام، جنوبی ویت نام کا بڑا حصہ تسخیر کر چکا تھا۔ ویت نامیوں کی بڑی تعداد کمیونسٹ حکومت سے بچنے کے لیے کشتیوں کے ذریعہ سمندر کا راستہ اختیار کر رہی تھی۔ اپریل 1975ء میں سائیگون (اب ہو چی منہ سٹی) پر کمیونسٹوں کے قبضہ

کے چند ماہ میں ڈیڑھ لاکھ افراد وہاں سے چلے گئے اور بہت سی چھوٹی کشتیوں میں گئے جو لاپتہ ہو گئیں۔ آئندہ چار برس لوگ مسلسل شہر چھوڑتے رہے اور المیہ کی شدت کا اندازہ آہستہ آہستہ ہوا۔ والدین نے ہزاروں بچے اس امید پر آگے بھیج دیئے تھے کہ بعد میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ لیکن جنوب مشرقی ایشیا کے پناہ گزین کیمپوں میں جا کر انہوں نے آخری سانس لیا۔ پناہ گزینوں کے سیلاب نے زور پکڑا تو تھائی لینڈ اور ملائیشیا، قریب ترین غیر کمیونسٹ ملکوں نے کشتیاں سمندر واپس کرنا شروع کر دیں۔ تھائی لینڈ کے ماہی گیر سمندری قزاق بن گئے۔ کشتیاں پکڑنے لگے اور پناہ گزینوں کو قتل کرنے لگے۔ جو زندہ بچے انہوں نے ریپ اور بچوں کی ہلاکت کے بارے میں دلدوز کہانیاں بیان کیں۔ پھر بھی کمیونسٹوں سے نفرت اتنی شدید تھی کہ چار برس بعد 1979ء میں قریباً مزید ڈیڑھ لاکھ افراد وہاں سے بھاگ گئے۔

1980ء تک یورپ اور امریکا میں بائیں بازو کی دہشت پسندی روبہ زوال تھی اور دائیں بازو کی دہشت پسندی پریشان کن حد تک اس کی جگہ لے رہی تھی۔ 1980ء میں ایک جج نے دائیں بازو کے آٹھ دہشت پسندوں کو 1974ء میں ایک مسافر ٹرین کو بم سے اڑانے کا ذمہ دار ٹھہرایا جس میں پندرہ انسانی جانیں ضائع ہوئی تھیں تو چند گھنٹوں کے اندر بلوگنا ریلوے اسٹیشن پر بہت بڑا بم دھماکہ ہوا جس میں 79 افراد ہلاک اور 160 زخمی ہوئے۔ 26 ستمبر 1980ء کو ایک بم میونخ آکٹوبر فیسٹ کے باہر پھٹا جہاں لوگ جانے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ تیرہ ہلاک اور دو سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ ایک نیا نازی نوجوان بھی ہلاک ہوا جسے اس المیہ کا ذمہ دار سمجھا گیا۔ جدید تاریخ میں دہشت گردی اور تشدد کے بدترین عشرہ کا یہ خوفناک انجام تھا۔

1970ء کے عشرہ میں بھی عام قسم کے جرائم میں ظلم اور تشدد کے نئے معیار قائم ہوئے اس دور کے جرائم کی خصوصیت شقاوت اور انسانی زندگی اور اس کے دکھوں سے ایسی بے نیازی اور بے تعلقی تھی جس کی مثال گئی صدیوں میں نہیں ملتی۔

جون 1972ء میں سانتا باربرا کیلی فورنیا میں سپر مارکیٹ میں ایک ڈاکہ زنی کے بعد، ایک خاندان میکراری کے تین ممبر، باپ شرمن عمر سینتالیس سال، اس کی بیوی کیرولین اور انیس سالہ بیٹا ڈینی گرفتار ہوئے۔ بعد میں ان کی بیٹی جنجر اور اس کا شوہر کارل ٹیلر بھی گرفتار ہوئے۔ پتہ چلا کہ خاندان ٹیکساس سے باہر منتقل ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے پیچھے سٹور لوٹنے اور ان میں کام کرنے والی لڑکیاں ریپ کرنے کی ایک افسوس ناک کہانی چھوڑی تھی۔ انہوں

نے یہ عادت بنالی تھی کہ سٹور لوٹتے، اور اگر وہاں کوئی خوب صورت لڑکی ہوتی تو اسے اپنے ساتھ لے جاتے اور تینوں مرد اسے ریپ کرنے کے بعد ہلاک کر دیتے۔ انہوں نے بیس سے زیادہ قتل کیے تھے۔ دونوں عورتیں ریپ پر اعتراض نہ کرتیں۔ وہ اسے مردوں کی فطری خواہش سمجھتی تھیں جو ڈاکہ زنی میں جان کی بازی تک لگا دیتے تھے۔ کیرولین کہا کرتی تھی، ''شاید یہ عجیب لگے مگر میں اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی ہوں۔''

1970ء کے عشرہ کا سب سے حیرت انگیز ٹیڈ بڈی کا کیس تھا۔ اگست 1975ء میں جب بڈی پہلی بار گرفتار ہوا تو اس پر جنسی قتل کی بارہ وارداتوں کا شبہ تھا جو پچھلے برس ہوئی تھیں۔ ان میں سے آٹھ سیاٹل اور باقی 'لیک سٹی' کے علاقہ میں ہوئیں۔ بڈی ایک ذہین، خوش شکل نوجوان تھا جو قانون کا سٹوڈنٹ تھا۔ وہ سیاٹل سے منتقل ہو کر لیک سٹی آیا تھا۔ 14 جولائی 1974ء کے واقعات سے قاتل کے مخصوص طریقہ واردات کا اندازہ ہوتا تھا۔ لیک سمنش کے قریب ایک پکنک میں ایک شائستہ نوجوان ایک لڑکی کے ٹیبل کی طرف بڑھا اور پوچھا کہ کیا وہ اس کی کشتی کار تک لے جانے میں مدد کرے گی۔ وہ مان گئی اور اس کے ساتھ چلنے لگی۔ مگر جب بڈی نے بتایا کہ اس کی کار اوپر پہاڑی پر ہے تو لڑکی نے اپنی جان چھڑائی اور واپس چلی گئی مگر اس نے دیکھا کہ ایک اور لڑکی جینس اوٹ اس کے ساتھ گئی ہے۔ اوٹ اس کے ساتھ گئی مگر پھر کبھی واپس نہ آئی۔ اسی سہ پہر ایک اور لڑکی ڈینس ناسلنڈ نے بھی یہی کیا۔ مہینوں بعد دونوں کی کھوپڑیاں نہر کے قریب پہاڑی کے دامن میں ملیں۔ نومبر 1974ء میں ایک نوجوان نے جس نے اپنا تعارف پولیس افسر کے طور پر کرایا، نسالٹ لیک سٹی کے شاپنگ سنٹر میں ایک لڑکی کارول ڈی رونچ سے کہا کہ اس کی کار چرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کار کا جائزہ لینے لگی اور اس کے ساتھ پولیس سنٹر جانے پر آمادہ ہو گئی کہ وہاں مشتبہ شخص کو دیکھے۔ کار میں قدم رکھتے ہی اسے ہتھکڑی لگا دی۔ مجرم نے اسے سلاخ مار کر بے ہوش کرنے کی کوشش کی مگر لڑکی کار سے باہر کودنے میں کامیاب ہو گئی۔ اتنے میں ایک اور کار آئی جس کے ذریعے مجرم فرار ہو گیا۔

آئندہ نو مہینوں میں کئی اور لاشیں ملیں۔ اگست 1975ء میں بڈی رات کے وقت مشکوک حرکات کرتا ہوا گرفتار ہوا اور کارول ڈی رونچ نے اسے پہچان لیا کہ اسی شخص نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔

بڈی بضد رہا کہ لاشیں برآمد ہونے والی جگہ پر اس کی موجودگی ایک ناخوش گوار

اتفاق تھا۔ اس کی ذہانت اور پرکاری اس معاملہ میں اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ ایک ہردلعزیز قیدی تھا۔ اس نے اپنا مقدمہ بڑی ذہانت کے ساتھ لڑا۔ 30 دسمبر 1978ء کو وہ جیل سے بھاگ گیا۔

دو ہفتوں بعد ایک شخص فلوریڈا میں لڑکیوں کے ایک ہوسٹل میں داخل ہوا اور ایک بڑی لکڑی کے ساتھ چار لڑکیوں پر حملہ آور ہوا۔ ایک کو گولی ماری، ایک ریپ کی، اسے دانتوں سے کاٹا ایک اور لڑکی گلا گھونٹ کر مار دی۔ ایک قریبی گھر میں ایک اور لڑکی پر حملہ ہوا اور اس کے سر میں زخم آیا۔ فون کی آواز سن کر حملہ آور بھاگ گیا۔ ذرا فاصلہ پر 'سٹوڈنٹ لاجنگ ہاؤس' میں بڈی جعلی نام سے رہتا تھا۔ جلد ہی بڈی نے ایک چرائی ہوئی کار کے ذریعہ وہ جگہ چھوڑی۔ چندروز بعد کار پہچانی گئی اور وہ گرفتار ہو گیا۔

مقدمہ کے دوران بڈی ہمیشہ کی طرح اپنی ذہانت اور کشش سے متاثر کرتا رہا۔ عام خیال تھا کہ وہ قاتل نہیں ہوسکتا اور یہ کہ اس کے خلاف تمام شہادت محض اتفاقیہ ہے مگر فیصلہ کن شہادت ایک ڈینٹسٹ نے دی، جس نے ہوسٹل میں قتل ہونے والی لڑکی کے جسم پر بڈی کے دانتوں کے نشان پہچان لیے۔

بڈی کی زندگی پر سٹیفن جی مچوڈ اور ہیو آئیزن ورتھ نے اپنی کتاب میں کھل کر بحث کی ہے۔ ان کے ساتھ اپنے انٹرویو کے دوران بڈی اصرار کرتا رہا کہ وہ قاتل کے عزائم کے بارے میں محض قیاس آرائیاں کرتا تھا مگر جس صحت اور عمدگی کے ساتھ اس نے ان کا ذکر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض قیاس آرائیاں نہیں تھیں۔ بڈی 1946ء میں پیدا ہوا۔ وہ ناجائز بچہ تھا جسے اس کے دادا دادی نے جی بھر کر بگاڑا۔ اس کی ماں نے سیاٹل کے ایک باورچی سے شادی کر لی تھی، اس لیے وہ تنہائی اور نفرت کی آگ میں ہر وقت سلگتا رہتا تھا۔ اکثر صحت مند نوجوانوں کی طرح اس میں جنسی قوت معمول سے بڑھ کر تھی۔ مگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس میں تشدد کا اضافہ بھی ہو گیا۔ میں اس اضافہ کی لمحہ بہ لمحہ تفصیل سے واقف نہیں۔ جنسی طور سے شرمیلا اور دبا ہوا وہ ریپ کے خوابوں میں کھو گیا۔ ایک رات اس نے ایک روشن کمرہ میں ایک عورت کو کپڑے بدلتے دیکھا تو دیوانہ ہو گیا۔ گھنٹوں اس کی گلی میں بھٹکتا رہا۔ ہر رات اس کا یہی معمول تھا۔

ایک رات بہت پینے کے بعد اس نے ایک عورت کو بار سے نکلتے دیکھا تو اس کا پیچھا کرنے لگا۔ اسے لکڑی کا ایک بڑا ٹکڑا مل گیا جسے لے کر وہ اس سے کئی قدم آگے نکل گیا

تاکہ موقع ملتے ہی اس پر حملہ کرے۔ اس کے انتظار میں وہ ایک تاریک کونے میں کھڑا ہو گیا لیکن وہ اس تک پہنچنے سے پہلے ایک گھر میں داخل ہو گئی۔

عورت پر حملہ آور ہونے کی خواہش اور بڑھ گئی۔ ایک رات پھر وہ ایک عورت کے پیچھے چلنے لگا جو چابیوں کی تلاش میں تھی۔ اس نے ایک لکڑی اس کے سر پر ماری۔ جب عورت چیخی تو وہ بھاگ گیا۔

وہ اپنے وجود کے اندر کوئی وجود محسوس کرنے لگا جسے وہ اپنا تضاد، بگڑی شخصیت اور بدنیتی کہتا تھا۔

بڈی نے پہلے قتل کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے سامنے کا ایک دروازہ کھلا دیکھا۔ اندھیرا ہونے کے بعد وہ اُس گھر کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ لنڈا ہیلی، واشنگٹن یونیورسٹی کی اکیس سالہ طالبہ گلا دبا کر بے ہوش کی گئی۔ دور کسی جگہ لے جا کر اسے ریپ کیا گیا۔ بڈی اگر اسے قتل نہ کرتا تو وہ اسے بھاگنے نہ دیتی۔ جب پوچھا گیا کہ کیا اس لڑکی کے ساتھ باتیں بھی ہوئیں تو بڈی نے جواب دیا کہ وہ کوئی شخصیت نہیں بلکہ ایک خیال تھا۔

اس کے بعد ریپ اس کے لیے حرزِ جان بن گیا، جس کے بغیر اسے چین نہ آتا تھا۔ بڈی کے حساب سے اس روز سمنش لیک سے دو لڑکیاں اغوا ہوئیں۔ پہلی لڑکی اس نے کمرہ میں باندھ کر رکھی جب تک کہ دوسری کو واپس لایا۔ بڈی ایک ایسا شخص تھا جس نے خواہشات کی خاطر زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔

پتہ نہیں کہ بڈی نے کل کتنے قتل کیے۔ پولیس کا خیال ہے کہ ڈین کورل اور جان گیسی سے زیادہ قتل کیے۔ گیسی، اب تک امریکا میں قتل کی وارداتوں کا ریکارڈ ہولڈر تھا۔ **1980**ء تک نامعلوم افراد نے جو 'فری وے کلرز' مشہور تھے، چوالیس نوعمر لڑکے قتل کر کے ان کی لاشیں کیلی فورنیا ہائی وے کے آس پاس دفن کی تھیں۔ (**1981**ء میں ولیم بونین نے قتل کی اکیس وارداتوں کا اعتراف کیا اور دس وارداتوں کی سزا پائی۔ تین مزید افراد نے بھی سزا پائی جن میں سے ایک نے جیل میں خودکشی کر لی)

جرائم کے متعلق **1945**ء سے ہونے والے اس جائزے سے جو بات صاف طور سے سامنے آئی ہے وہ جرائم میں مستقل اضافہ اور ان کی ہول ناک نوعیت ہے۔ گویا کہ انسان کے راستہ میں کوئی بنیادی رکاوٹ تھی جو لمحہ بہ لمحہ دور ہو رہی ہے۔ **IK** کی طرح اکثر مجرم ہم نفسی کے احساس سے محروم ہیں مگر **IK** کے پاس تو اپنی روایتی زندگی کی افراتفری اور بھوک کی

صورت میں ایک جواز موجود ہے۔ گزشتہ بیس برس کے بدترین مجرم ایک آرام دہ، خوشحال اور رفاہی معاشرہ کی پیداوار ہیں۔

جرائم کی تعداد اور شدت میں اضافہ ہو رہا ہے، مگر معاشرہ بے حس ہے۔ 1913ء میں میری فیگن کا قتل امریکا کے ہر اخبار کا عنوان بن گیا تھا۔ آج شاید اسے کسی مقامی اخبار میں بمشکل کوئی جگہ ملے۔ 1983ء کا نیا سال مناتے ہوئے ہم نے اخبارات سے یہ تین خبریں لی ہیں۔ مانچسٹر میں ایک پندرہ سالہ لڑکے کو عمر قید کی سزا ملی۔ اس نے اپنی میوزک ٹیچر پر جنسی حملہ کیا تھا اور پندرہ بار اسے چاقو مارا تھا۔ سان فرانسسکو میں دو افراد ایک تین سالہ بچی اور گیارہ سالہ لڑکے کو اغوا کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ انہوں نے ایک سال سے دونوں بچوں کو ایک وین میں قید کیا ہوا تھا۔ جب گرفتار ہوئے تو ایک شخص بچی کے ساتھ بستر میں تھا۔ دونوں برہنہ تھے۔ بولٹن لنکا شائر میں اٹھہتر سالہ ضعیف عورت پر تین بچوں (عمر چھ، آٹھ اور نو سال) نے حملہ کیا۔ اسے مارا پیٹا، اور لوٹنے کے بعد زخمی حالت میں وہیں زمین پر چھوڑ دیا۔ تین ہفتے پہلے اس کے اکیاسی سالہ بھائی پر ایک شخص نے اس کے گھر میں آ کر حملہ کیا، جس کی وجہ سے اسے تین ہفتے ہسپتال میں گزارنا پڑے تا کہ اس کے زخم بھر جائیں۔ اس کی بہن نے کہا، ''میں بہت ناراض اور پریشان ہوں، پتہ نہیں آج کل یہ کیا ہو رہا ہے۔''

نوعِ انسان کی مجرمانہ تاریخ کے اس جائزے کے بعد ہم شاید اس سوال کا کوئی مناسب جواب دے سکیں۔

حقیقت کا شعور

1750ء میں ایک سیاح ہاورتھ یارک شائر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ لوگ پبلک ہاؤس کی کھڑکیوں سے باہر کود رہے ہیں اور دیوانہ وار دیواروں پر چڑھ رہے ہیں، کیونکہ کسی نے پادری کو ہاتھ میں کوڑا لیے آتے دیکھ لیا تھا۔ ہاورتھ (جہاں برونٹیس چند سال آ کر رہے) کا پادری ولیم گرمشا تھا جس نے علاقہ بھر میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ جب چرچ میں عبادت شروع ہوتی تو وہ چپکے سے گاؤں چلا جاتا اور اپنے کوڑے کے ذریعے آوارہ گردوں کو چرچ جانے پر مجبور کرتا۔

آزاد خیالی کے اس زمانہ میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ چند صدیاں پہلے مذہبی اور اخلاقی ضوابط کتنے سخت تھے۔ ان دنوں بھی گرمشا جیسے لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ سبت کی خلاف ورزی بدترین گناہ سمجھا جاتا تھا۔ جیل کے ایک کارندے نے بتایا کہ سزائے موت پانے والے مجرم ڈاکہ زنی یا قتل کے اعتراف سے پہلے سبت کی خلاف ورزی کا اعتراف کیا کرتے تھے۔ جب ڈاکٹر جانسن مشہور پینٹر جوشوا رینالڈ سے اُس کے بسترِ موت پر ملا تو اُسے قسم دی کہ اتوار کو کبھی تصویر نہیں بنائے گا۔ اتوار کو خوشی کی کوئی دھن گنگنانا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا جیسا کہ گورڈن ریٹرے نے 'The Angel Makers' میں کہا ہے کہ کئی لوگ ہفتہ اتوار کے علاوہ بھی ہر روز چار مرتبہ چرچ جایا کرتے تھے۔ بازار میں وعظ کی کتابیں ناولوں سے زیادہ بکتی تھیں۔

اگر ہم مذہبی معاملات میں اپنے بزرگوں کی سخت گیری، ان کی مکمل سپردگی، سزا کے تصور اور یہ کہ 'خدا ہر لحہ ہمیں دیکھ رہا ہے' کے عقیدہ کو سمجھ سکیں تو شاید ہم یہ بھی سمجھنے لگیں کہ اس نقطۂ نظر کے نہ ہونے سے یہ اخلاقی بحران پیدا ہوا ہے۔ ایک ثقافتی مؤرخ شاید اس زوال کا

رشتہ ناول کے عروج سے جوڑے۔ لیکن یہ تو ایسا ہے کہ گرم پانی سے نہانے کے بجائے کوئی ٹھنڈے پانی میں کود جائے۔ یہ عیاشی کا آغاز ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح ناول کے ساتھ پورنو گرافی (فحاشی) کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ وکٹورین پورنو گرافی نے بے راہروی اور شراب پر پابندی پر زیادہ زور دیا۔ وہ پابندی کے اس لیے اتنے دلدادہ تھے کیونکہ اکثر لوگ پادری گرمشا اور اس کے شاگردوں کے مذہبی نظریہ سے اب تک چمٹے ہوئے تھے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ پابندی کی اس اخلاقیات نے کیونکر جنسی جرائم میں اضافہ کیا ہے اور جنسی جرم آخر کار کیسے بیسویں صدی کا نمائندہ جرم بنا ہے۔

جو ہوا ہے وہ بالکل واضح ہے۔ انسان نے تہذیب اپنے تحفظ کے لیے بنائی مگر جیسا کہ فرائیڈ نے کہا ہے کہ تہذیب میں ایک بڑی خرابی مایوسی ہے۔ معاشی لحاظ سے محروم شخص کی نظر ہمسایہ کی دولت پر ہوتی ہے۔ اگر جنسی بھوک کا شکار ہو تو اس کی نظر میں کسی کی بیٹی ہوتی ہے۔ سماج نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے چند قوانین اور اخلاقی پابندیوں کا ایک نظام وضع کیا ہے۔ جب تک یہ نظام زندہ اور متحرک ہو، معاشرہ ہر بلا سے محفوظ رہتا ہے۔ ورنہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا ہے۔

یہ اٹھارویں صدی کا آخری دور تھا، جب سیاسی مفکروں نے معاشی خرابیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر لوگ غریب ہیں تو اس کا ذمہ دار وہ سماجی نظام ہے جس کی بنیاد ناانصافی پر ہے اور اگر کوئی غریب شخص مال دار ہمسایے کی دولت پر قبضہ کر لے تو وہ اس کا حق ہے کیونکہ ہمسایہ اگر ایمان دار ہوتا تو مال دار نہ ہوتا۔

جنسی تصورات کے بارے میں تبدیلیوں کے آشکارا ہونے میں زیادہ دیر لگی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مفلسی میں جنس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے مگر خوشحالی میں اسے اولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ جنسی قاتل ملون ریس نے کہا تھا، ''تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قتل کرنا غلط ہے، صرف انفرادی معیار اسے صحیح یا غلط بناتا ہے۔'' پیٹرک بائرن (YWCA میں قتل کرنے والا) کا بھی یہی مطلب تھا جب اس نے کہا کہ وہ عورتوں سے اپنے جنسی ٹینشن کا انتقام لینے کی کوشش کر رہا ہے۔

جنسی جرم بنیادی طور پر 'جادوئی سوچ' کی ایک قسم ہے۔ 'آؤٹ آف کنٹرول ہونے کا فیصلہ' بے شک بالکل جذباتی فیصلہ ہو جیسا کہ پال نولیس کے معاملہ میں تھا۔ اس نے عورتوں کو قتل کرنے کا سلسلہ محض اس لیے شروع کر دیا کہ اس کی گرل فرینڈ نے اسے چھوڑ دیا

تھا۔ یا پھر شاید یہ فیصلہ 'منطقی' ہو جیسا کہ ٹیڈ بڈی کا معاملہ ہے جو اپنی خواہشات ریپ کے ذریعہ پوری کرتا ہے اور اس کے خطرناک نتائج کا سامنا کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں مجرم سمجھتا ہے کہ اسے ایسا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر معاشرہ اس سے انکار کرے تو اسے اس کے حق سے محروم کرتا ہے۔ یہی مثال عام قسم کے جرائم کی ہے۔ مجرم کی توجہ اپنی مایوسی اور نفرت پر مرکوز ہوتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ چوری یا ڈاکہ زنی سماجی ناانصافی کے خلاف احتجاج کا جائز طریقہ ہے۔ اگر معاشرہ کو یہ پسند نہیں تو اس کی بہتری کا خیال رکھے اور اس کی شکایات دور کرے۔

اگر ہم پادری گرمشا کے دن یاد کریں، اور پھر ماڈرن کیلیفورنیا پر ایک نظر ڈالیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ غلطی کہاں ہوئی ہے۔ کیلیفورنیا کا موسم خوشگوار ہے، ایک شان دار فلاحی نظام رائج ہے، سماجی باغیوں کو برداشت کیا جاتا ہے۔ منشیات کا کاروبار زوروں پر ہے۔ یہ سب یکجا ہوں تو زیادہ تر پابندیاں بے اثر ہو جاتی ہیں جو معاشرہ اپنے تحفظ کے لیے عائد کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ 'جادوئی سوچ' میں اضافہ اور اس تشدد میں اضافہ ہے جو اس سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ جاننا مشکل ہے کہ اس رویہ، اس رجحان کی تلافی کیسے ممکن ہے اور کیسے اسے روکا جائے مبادا رفتہ رفتہ بڑھ کر ساری دنیا کے لیے عذاب نہ بن جائے۔

اگر یہ منظر نامہ درست ہے تو معاملہ واقعی گمبھیر ہے۔ اصل مسئلہ انسان کی اس خوش فہمی کا ہے کہ اسے ہر حال میں ''آزادی'' کا حق حاصل ہے۔ اگرچہ آزادی مل جائے تو نہیں جانتا کہ اس کا کیا کرے۔ ہیوم کا کہنا ہے کہ ''انسان کی عادت ہے کہ آزادی کے بارے میں اپنی اہلیت کا اندازہ بہت بڑھ چڑھ کر کرتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انسان ایک فرد کی حیثیت سے اپنی ذات میں امکانات کا ایک لامحدود ذخیرہ ہے۔ اگر جابرانہ نظام ختم کر کے معاشرہ کو نئی ترتیب دی جائے تو یہ امکانات کھل کر سامنے آئیں گے اور ہم ترقی کی نئی منزلوں کی طرف بڑھ سکیں گے۔'' مگر حقیقت، جیسا کہ ہیوم نے کہا، اس کے برعکس ہے۔ انسان کی جڑیں اس کی زمین کے اندر ہیں۔ اس کی بنیادی فطرت میں ترمیم اور تبدیلی محال ہے۔ وہ اپنی جگہ مستحکم اور قائم ہے۔ یہ تو عادت اور روایت کی بات ہے کہ اس سے کوئی بھلائی سرزد ہو۔ سپنگلر کی تصنیف Decline of the West کے مطابق اور ٹوائن بی کی 'اسٹڈی آف ہسٹری' کی رو سے یہ بات تہذیبوں کے زوال کا سبب بیان کرتی ہے۔ جب زندگی کی سختیاں انہیں ضبط نفس (اپنے آپ کو کنٹرول کرنے) پر مجبور کرتی ہیں تو وہ طاقتور ہو جاتے ہیں۔ انہیں کامیابیاں

حاصل ہوتی ہیں۔ پھر وہ سمجھتے ہیں کہ ڈسپلن کی ضرورت باقی نہیں تو ڈسپلن غائب ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی زوال کا عمل شروع ہوتا ہے۔ پچھلی صدی کے جرائم کی کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری تہذیب اب اس مقام پر پہنچ چکی ہے۔

یہ جائزہ بڑی حد تک سچا ہے، مگر پورا سچ نہیں ہے۔ ہیوم ناانصافی کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ انسان کی فطرت بدل نہیں سکتی، جبکہ یہ اس کی بدلتی ہوئی فطرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے اس زمین پر موجود ہر مخلوق سے پہلے ترقی کی ہے۔ اسپنگلر اور ٹوائن بی ٹھیک کہتے ہیں کہ تمام تہذیبیں عروج و زوال کے ایک مسلسل عمل سے گزرتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام تہذیبیں بنیادی طور پر ایک ہیں، ورنہ ہم قدیم عراق کی تاریخ دہرا رہے ہوتے۔ اگر انسان ترقی کرتا ہے تو تہذیب ترقی کرتی ہے۔ صحیح صورت حال سمجھنے کے لیے ہمیں مسئلہ کو ارتقائی تناظر میں رکھ کر دیکھنا ہے۔ محض تہذیبوں کی تاریخ نہیں، خود انسان کی تاریخ کو دیکھنا ہے۔

ہم یہاں سے شروع کر سکتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں کئی واٹر شیڈ (حد فاصل) ہیں۔ ایسے اہم واقعات جنھوں نے انسانی رویہ میں کئی بنیادی تبدیلیاں کی ہیں۔ ان میں زراعت کا آغاز، شہر آباد کرنا، تحریر کی ایجاد، فلکیات، بڑے مذاہب کا نزول، ڈراما کی تخلیق، فلسفہ، ادب اور سائنس سبھی شامل ہیں۔ ان میں سے تقریباً سب کا تعلق انسانی دانش سے ہے۔ انسان نے دوسری مخلوقات سے پہلے اور ان سے زیادہ ترقی اس لیے کی ہے کہ اس نے اپنے دماغ سے کام لینا سیکھ لیا ہے۔

اس کا انحصار ایک طرح کے دماغی مائیکروسکوپ کی ترقی یعنی مسائل کو پوری توجہ اور باریکی کے ساتھ دیکھ لینے اور پوری طرح سمجھ لینے پر ہے۔ مگر اس اہلیت نے جو اس کی زندگی کی ضمانت بھی ہے اسے ایک کریمنل بنا دیا ہے اور اس کی نظر کا مدار اتنا تنگ کر دیا ہے کہ وہ ایک بددماغ خبطی بن گیا ہے۔ انسان نے پرندے کی آنکھ کا نظارہ (جو تمام حیوانوں کے لیے فطری ہے) ایک کیڑے کی آنکھ کے نظارہ سے بدل لیا ہے۔ اس نے عزت و احترام حاصل کرنے کے لیے اپنی انانیت میں روز افزوں اضافہ کیا ہے۔ قدیم زمانوں میں ظالم لوگ اپنی بہیمانہ انانیت پرستی کی وجہ سے قتل کیا کرتے تھے، آج کی تہذیب کو جرم کے بے رحم مسائل کا سامنا ہے کیونکہ خودستائی کی سطح انانیت کی اُس سطح پر پہنچ چکی ہے۔ جس پر لاکھوں انانیت پرست پہلے سے موجود ہیں۔

کیڑے کی آنکھ کے نظارہ سے ایک اور پیچیدگی پیدا ہوئی ہے کہ انسان کا ہپناٹائز ہونا آسان ہو گیا ہے۔ ہم جانور کو اس کی توجہ کا دائرہ تنگ کر کے ہپناٹائز کرتے ہیں جبکہ انسان کی توجہ کا دائرہ تقریباً ہمیشہ تنگ ہوتا ہے۔ ہپنوسس (اسکنز وفرینیا) بنیادی طور پر حقیقت کا شعور نہ ہونے کو کہتے ہیں۔ انسان اپنی زیادہ زندگی نیم ہپناٹائزڈ حالت میں بسر کرتا ہے۔ یہی حالت بڑی حد تک جرم اور تشدد کی وجہ بنتی ہے۔ ہپنوسس کے اثر میں آ کر ان واقعات کو سرسری اور معمولی واقعات سمجھا جاتا ہے۔ روپرٹ بروک نے پہلی عالمی جنگ کو خوش آمدید کہا۔ وہ اسے تطہیر اور صفائی کا عمل سمجھتا تھا۔ اُس طوفان کی طرح جو ماحول کو صاف کر دیتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ 'دوہرے شعور' کی نشوونما انسان کی بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ جرم بنیادی طور پر 'بایاں دماغ شعور' کی تنگی سے بچنے کی کوشش ہے اور جنسی جرائم کے سلسلہ میں یہ بات اور بھی صحیح ہے۔

وائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ ہمارے پاس ادراک کے دیکھنے اور سمجھنے کے دو طریقے ہیں۔ جنہیں **presentational immidiacy** اور **casual efficacy** کہتا ہے۔ **immidiacy** قریب سے یعنی کیڑے کی نظر سے دیکھنا ہے۔ دوسرے طریقہ کا تعلق طائرانہ نظر سے ہے۔ جب تم یہ پیراگراف پڑھتے ہو تو اسے حرف بہ حرف سمجھتے ہو۔ اگر موضوع پیچیدہ ہو یا بری طرح سے پیش کیا گیا ہو تو تم 'کیڑے کی نظر' سے اسے دیکھنے کی حالت میں رہو گے۔ یا اس وجہ سے کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو اور لفظوں کو لفظوں سے جوڑ نہیں سکتے۔ یہ جوڑنے کا، علت و معلول کی ترتیب سے انہیں آپس میں ملانے کا عمل ہمیں کیڑے کے بجائے پرندہ کی نظر سے دیکھنے کا موقع دیتا ہے۔ وائٹ ہیڈ اسے **casual efficacy** کہتا ہے۔ اسے **meaning perception** کہنا زیادہ آسان ہوگا۔

سارتر کا ناول '**Nausea**' ایسے شخص کی کہانی ہے جس کا ادراک ہمیشہ 'کیڑے کی نظر' میں ڈھل جاتا ہے۔ حقیقت اچانک احمقانہ اور بے معنی لگنے لگتی ہے۔ سارتر کہتا ہے کہ "**Nausea**" (متلی) **meaning perception** سے زیادہ موزوں ہے، کیونکہ ہم کسی یقین یا مایوسی کے عمل سے زندگی کو معنی دیتے ہیں۔ ایک شخص کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ایسی ہے کہ دنیا میں صرف اسی کی آرزو کی جائے۔ اس سے شادی کرتا ہے۔ ہنی مون پر چلے جاتے ہیں۔ پہلی رات اسے مایوسی نہیں ہوتی، بلکہ پرلطف ہے۔ پھر بھی اس سے

وہ مسرت حاصل نہیں ہوتی جس کی توقع تھی۔ دراصل وہ رات حقیقت، بہت بڑی حقیقت اور محض حقیقت ہے۔ شادی سے ایک سال بعد محبت روٹین بن جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے خیالات بھٹکنے دیتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ وہ خود وہ نہیں کوئی اور شخص ہے۔ اسے اگر پہلی محبت یاد آئے تو دکھ سے مسکراتا ہے کیونکہ اس محبت کی بنیاد اُس لڑکی کی زندگی اور اصلیت سے ناواقفیت پر ہے۔

مگر ان لمحات کا کیا کریں جب اس کی مسرت اسے پھر حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ کئی دنوں کے کاروباری دورہ سے گھر واپس آتا ہے تو وہ لڑکی اسے دلکش اور دلفریب لگتی ہے۔ نئے سرے سے اس کی محبت میں مبتلا ہوتا ہے۔ اگر یہ 'خیال' ہے تو اپنے بے مثال تواتر کے لحاظ سے یہ خیال کئی تجربوں پر بھاری ہے۔

دراصل یہ ہوا کہ پرسیپشن کے دونوں طریقے ایک بار پھر آپس میں مل کر ایک ہو گئے۔ 'The Dam Busters' میں پال برک ہل جنگ میں رائل ایئرفورس کی ایک کارروائی کا ذکر کرتا ہے کہ وہ کس طرح Moene ڈیم تباہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بم Spherical (کرّوی) تھے جنہیں نہر کی سطح کے ساتھ اچھلتے ہوئے جا کر ڈیم تباہ کرنا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے انہیں پانی کی بالکل صحیح بلندی سے گرانا تھا۔ الٹیمٹر (بلندی ناپنے کا آلہ) صحیح نہیں تھے۔ ناپنے کا ہر آلہ جہاز سے معطل ہو گیا تھا جیسے صحیح لمبائی کی رسی بار بار پیچھے آئے۔ پھر برنس ویلس نے آ کر ایک لائٹ جہاز کی دم دوسرے کی ناک پر فٹ کر دی۔ پھر دونوں کو اس طرح فوکس کیا کہ آپس میں مل کر صحیح بلندی پر ایک دائرہ بن گئیں۔ جب پانی پر دائرہ ظاہر ہوا تو وقت بم برسانے کا تھا۔

جوش و گھبراہٹ میں ہمارے ادراک کے دونوں انداز ایک نکتہ پر فوکس ہو جاتے ہیں اور ہمیں 'مکمل حقیقت' کا احساس ہوتا ہے۔ طائرانہ نظر اور کیڑے کی نظر آپس میں مل جاتی ہیں۔ جب کوئی شخص تھکتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ غلط بلندی پر اڑ رہا ہے، اگرچہ وہ اپنی بیوی بازوؤں میں لیے ہوئے ہے۔ مگر اس کی حقیقت سے بے خبر ہے۔ اس کا قریبی ادراک فوکس میں ہے۔ مگر اس کا معنوی ادراک دھندلا ہے۔

اس کے برعکس اگر وہ کسی دوست کے ساتھ بیوی کے متعلق باتیں کر رہا ہو تو شاید اسے اچانک احساس ہو کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کتنی زیادہ محبت کرتا ہے۔ اس کے meaning perception نے فوکس کر لیا ہے مگر بیوی کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے

قریبی پرسپشن کا کہیں پتہ نہیں۔

انسان کا مسئلہ ہے کہ وہ اکثر غلط بلندی پر اڑتا ہے۔ والٹر جب آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو دو کرنوں کو ایک نکتہ پر فوکس کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسی لیے وہ عورتوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی حرکات کا ذکر کریں۔ وہ اس ذکر سے محظوظ ہوتا ہے۔ اس کی زیادہ جنسی زندگی Immediacy کا دھندلا پرسپشن ہے 'My Secret of Life' کا لکھنا meaning پرسپشن اور مصروفیت کو بحال کرنے کی کوشش ہے۔

اور اب ہم اس مسئلہ کو تاریخی تناظر میں دیکھنا شروع کر سکتے ہیں۔ انسانی ارتقا سب سے پہلے زندگی کے چیلنج کا جواب تھا۔ انسان نے اپنے تحفظ کے لیے تہذیب بنائی مگر شہروں میں زمین اور اس کی ملکیت کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس مسئلہ کی وجہ سے جنگ ہوئی۔ اپنے ہمسایہ کے 'احساس تنہائی' کی وجہ سے ڈاکہ زنی اور قزاقی اس کی زندگی کا حصہ بن گئی۔

جنگ نے انسان کو آگے بڑھنے پر مجبور کیا۔ عظیم ڈائنا سور کاہلی کی وجہ سے ہلاک ہوا کیونکہ اس کے سامنے کوئی چیلنج نہیں تھا۔ انسان کو دشمنوں کا سامنا تھا۔ اس نے تہذیب اپنے تحفظ کے لیے بنائی تھی۔ مگر دیکھا کہ اس کے ہم جنس، دوسرے انسان جنگلی درندوں سے بھی بدتر تھے۔ جنگ اور سماوی آفات نے اسے پتھر عہد کے انسان سے زیادہ ہوشیار اور حوصلہ مند بنا دیا۔ اسے مائیکروسکوپ بایاں دماغ پرسپشن بڑھانا پڑا۔ اس کا ایک نتیجہ ظلم اور غیر انسانیت تھی۔ ایک اور نتیجہ، اہم نتیجہ زندہ رہنے کی اہلیت میں روز افزوں ترقی تھی۔

پھر انسان جاننے لگا کہ 'بایاں دماغ شعور' بیش بہا قوت زبان کی بدولت ہے۔ اپنے ماضی کے تجربات کو فراموش کرنے کے بجائے وہ انہیں زبان کے ذریعہ محفوظ کر سکتا ہے، بلکہ آئندہ نسلوں تک لے جا سکتا ہے۔ ٹروجن وار کے دنوں میں ہومر ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا مگر اس جنگ کا تمام واقعہ اور تجربہ زبان میں محفوظ ہو گیا اور دو سو سال بعد ہومر نے اسے لکھا، یہاں تک کہ سوفوکلیس کے زمانہ میں اس سے عظیم ڈراما تخلیق ہوا۔

افلاطون نے جان لیا تھا کہ مسئلے حل کرنے کے لیے 'سوچنا' انسان کی فطرت ہے۔ سوچ کے ذریعہ ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ ایک غلام جس نے کبھی جیومیٹری کا نام بھی نہ سنا ہو، اسے صرف عقل کی مدد سے جیومیٹری کے سوال حل کرنے سکھائے جا سکتے ہیں۔

غور و فکر کے ان نئے طریقوں سے کام لینے کے لیے اس کے شاگرد ارسطو نے ایک بڑا پروجیکٹ شروع کیا تا کہ انسانی علم کے ہر شعبہ میں ترقی ہو اور اس میں وہ تقریباً

کامیاب رہا۔ انسان کا دم بخود کرنے والا وژن ظاہر کرتا ہے کہ وہ صرف انسان نہیں بلکہ خداؤں سے اس کا قریبی رشتہ ہے۔

رومیوں کے تجربہ کے مطابق یہ خوش خیالی تھی۔ رومی قابل ستائش لیفٹ برین مفکر تھے۔ مگر انہیں لیفٹ برین آگہی کی تمام خامیوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں اس کی فطری مایوسی اور حقیر باتوں میں الجھنا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ رومی تہذیب شاید ثابت کرنا چاہتی تھی کہ اپنی دانش کے باوجود، جو اسے مویشیوں سے الگ کرتی ہے، انسان مایوس کن حد تک ناتواں اور کمزور ہے۔ یہ حیرانی کی بات نہیں کہ عیسائیوں نے اوریجنل گناہ، انسان کی فطری ستم رانی پر اتنا زور دیا کیونکہ رومی ان کے سامنے ایک زندہ مثال کی طرح تھے۔

ان عیسائیوں نے جب رومی تہذیب اپنے ہاتھ میں لی تو کسی سے بہتر ثابت نہیں ہوئے۔ مگر کم از کم انہوں نے رومیوں کی یاس انگیزی سے تو نجات حاصل کی۔ وہ افلاطون کے وژن کی طرف لوٹے۔ انسان بے شک خدا نہ ہو مگر اس کی روح لافانی ہے۔ اسے 'بچایا' جا سکتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے بضد تھے کہ اسے صرف اس طرح 'بچایا' جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دماغ سے کام نہ لے اور اپنی نجات کا معاملہ چرچ پر چھوڑ دے۔

مسلمان زیادہ سمجھ دار تھے۔ وہ استدلال کے مخالف نہیں تھے۔ جس کی وجہ سے سائنس اور فلسفہ عربوں کا تحفہ بن کر یورپ واپس آئے۔ سائنس اور علم نئے سرے سے زندہ ہوئے۔ جب پلوٹارک اپنے ہمعصروں کو آرکیالوجی (آثارِ قدیمہ) سکھا رہا تھا تو ثابت کر رہا تھا کہ انسان پرسپشن (ادراک) کی دونوں کرنیں بیک وقت استعمال کر سکتا ہے۔ یہ کہ وہ ایک ٹوٹے ہوئے مجسمہ کو دیکھ سکتا ہے اور یہ بھی فوراً جان لیتا ہے کہ یہ مجسمہ دو ہزار سال پہلے یونان میں بنا تھا، یا میریئس اور سلا کے روم میں تخلیق ہوا تھا۔

انسانی ذہن پر اس نئے اعتماد نے سائنس کو نئی زندگی دی۔ انسان پر زمین و آسمان کے راز کھلے، زندہ مخلوق کا میکانزم سمجھ میں آیا۔ اٹھارویں صدی کے انسان کو انسانی ریزن پر بجا طور سے ناز اور وہم پرستی سے نفرت تھی۔ سائنس نے انسانی زندگی بدل دی تھی۔ پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ یہ عمل اسی طرح آئندہ بھی جاری رہے گا لیکن **New Atlantis** ناممکن خواب نہیں تھا۔

یہ ناول کے عروج کا دور بھی تھا جس سے ہمارے جدید دور کے تشدد کا آغاز ہوتا ہے۔ اس امر کا شدید احساس تھا کہ انسان کو آزاد ہونا چاہیے اور آزادی کا مطلب تھا کہ وہ جو

چاہے کرے۔ مونک لیوس اور متورین دو ناول نویسوں نے انسانی آزادی اور ظلم کا یہ تصور تلاش کیا تھا۔ جبکہ داساد اسے اس انتہا تک لے گیا کہ انسان دنیا میں ظالم ترین مخلوق ہے۔ مگر ورڈز ورتھ، گوئٹے اور ہوف مین جیسے رومان پسند ایک اور مسئلہ میں الجھے ہوئے تھے کہ کیا انسان اس آزادی کا اہل ہے، جس کی جھلکیاں ہمیں حیران کرتی ہیں اور جنہیں میسلو چوٹی کا تجربہ کہتا ہے۔ پھر وہ کیوں اتنی جلدی غائب ہو جاتی ہیں اور کیوں وہ انہیں اپنی مرضی سے واپس نہیں لاسکتا؟ اس مسئلہ نے اذیت ناک صورت اختیار کی۔ اس کی وجہ سے رومان پسندوں میں خودکشی کا رجحان پیدا ہوا اور بعض لوگ وقت سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ زندگی دھوکہ ہے۔

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کہاں غلطی پر تھے۔ انہیں ایسے لمحات کا تجربہ ہوا جب پرسیپشن کی دو کرنیں فوکس ہوگئی تھیں اور ان میں امید اور مسرت کا شدید احساس پیدا ہو گیا تھا۔ ایسے مواقع پر پرانے 'زخم' بھر جاتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے آدمی عداوت فراموش کر دیتا ہے۔ اس میں اتحاد و یگانگت کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایسا جذبہ جو شدید اور بلند ہوتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پرسیپسن کے دو طریقے سیڑھی کی طرح استعمال کرتا ہے تا کہ عام انسانوں کی سطح سے اوپر اٹھ جائے مگر سیڑھی پر چڑھنے کا عادی نہیں اس لیے زمین پر چت گرتا ہے اور قائل ہوتا ہے کہ 'جھلک' جو اس نے دیکھی ایک قسم کا فریب تھا۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ انیسویں صدی کی خصوصیت فحاشی کی فراوانی ہے۔ فحاشی کا ذریعہ یہ رومانی خیال ہے کہ سیکس انتہائی پُر لطف ہے اور سخت منع بھی ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ فحاشی 'مصروفیت' تک جانے کی کوشش ہے **Immediacy perception** اور **meaning perception** کا ملاپ ہے۔ ایک شخص جو تاریکی میں اپنی بیوی کے ساتھ بستر میں ہے، محض اپنی حسیات کی گرفت میں ہے۔ ایسی صورت میں ایک فربہ لڑکی اور کلوپیٹرا میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ تجربہ حقیقت کے شعور یعنی **meaning perception** (مینگ پرسیپشن) کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اور یہ انسان میں اتنا کمزور ہوتا ہے کہ وہ تاریکی میں ہو تو سوئچ آف کرنا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود انسان کا تخیل اس کی اتنی بڑی خوبی ہے کہ ایسے واقعہ کی تحریری رپورٹ اسے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ وہ اسے بڑی حد تک 'حقیقت' پر مبنی سمجھتا ہے، اس کی شدت کا قائل ہوتا ہے۔ یہ 'پابندی' ہے جس سے شدت اور 'فوکسنگ' کا لمحاتی تجربہ پیدا ہوتا ہے۔ سوئبرن ایک دلچسپ مثال دیتا ہے۔ اسے کوڑے مارنے اور سزا دینے کے تصور

سے بھی خوف آتا تھا۔ اس کی بعض بہترین نظموں کا موضوع ''درد'' ہے۔ اس کا دوست مانکٹن ملینس پورنوگرافی کا شوقین تھا جس کی وجہ سے اسے پورنوگرافی تک رسائی حاصل تھی۔ پورنو میں سوئبرن کی تمام دلچسپی کا محور اس کی شاعری تھی، جیسے درمیانی عمر میں شراب تھی۔ وہ اپنے شعری وِژن کی شدت دہرانا چاہتا تھا۔ اپنی سیڑھی پر واپس جانا چاہتا تھا۔ وہ 'مصروفیت' فوکس کے لمحہ کے لیے بے چین تھا۔ پورنوگرافی، نہ شراب اس کے کام آئی۔ وہ اپنی سیڑھی پر واپس نہ جا سکا اور اس کی شاعری تکلیف دہ حد تک بنجر اور ویران ہوگئی۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں فحاشی کا فروغ محض محرومی کا معاملہ نہیں تھا، عیاشی کا نتیجہ بھی نہیں تھا جس کا آغاز کریسا ہارلو کے ریپ سے ہوا تھا۔ یہ دو کرنوں کو فوکس کرنے کی بھدی کوشش گمراہ رومان پرستی تھی۔ معاشرہ کی قیمت پر فرد کے آگے بڑھنے کی خواہش تھی۔

1900ء تک رومانیت مر گئی تھی۔ اس کی موت مایوسی سے ہوئی تھی۔ ورڈز ورتھ اور گوئٹے کی رومانیت جان دار اور امید افزا ہے۔ ورلین اور ڈوسن کی رومانیت نڈھال اور اداس ہے۔ اس 'اداس نسل' کے شاعروں نے مان لیا تھا کہ 'وِژن کے لمحات' فریب ہیں۔ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہتر ہے کہ مان لیں کہ زندگی فراڈ ہے اور اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیں۔

مگر آزادی کا وژن مر نہیں گیا تھا۔ وہ ایک اور شکل میں وجودیت **Existentionalism** کے نام سے بیسویں صدی میں ظاہر ہوا۔ وجودیت کے بانی کا کہنا ہے کہ سکول کا ایک لڑکا بھی دوات میں مکھی یا چھت سے ٹپکتے ہوئے بارش کے ایک قطرہ پر توجہ دینے سے آزادی کی دھڑکن محسوس کر سکتا ہے۔ ہرمن ہیسے نے کہا کہ چھوٹی چیزوں پر توجہ دیتے ہوئے ہم تازہ دم ہوتے ہیں، نئی زندگی پاتے ہیں۔ سارتر جب گرفتار ہونے کو تھا تو اس نے اپنا پیراڈوکس (تضاد) ان الفاظ میں بیان کیا کہ اس نے اپنے آپ کو کبھی اتنا آزاد محسوس نہیں کیا جتنا کہ جرمن قبضہ کے دوران کیا ہے۔ کامیو کا کہنا تھا کہ سسی فس آزاد ہو سکتا ہے اگرچہ اسے ہمیشہ کے لیے پہاڑی پر چٹان چڑھانے اور گرانے کی سزا دی جائے۔ سب یک زبان تھے کہ آزادی، باطنی کیفیت ہے جس میں ہم قوت ضائع نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے کہ انسان بوریت کے ہاتھوں مسلسل خوار ہو رہا ہے۔ پھر بھی آگہی کے ایسے لمحات آتے ہیں جب اسے اس پیراڈوکس کے احساس کا علم ہوتا ہے کہ جس چیز پر بھی وہ اپنی پوری اور مکمل توجہ مرکوز کرتا ہے وہ

دلچسپ ہو جاتی ہے۔ ایک سادہ دیوار بھی دلکش لگتی ہے اگر تم اس میں اتنی دلچسپی لو جتنی کہ ایک دلچسپ کتاب میں لیتے ہو۔ جب دوستوئیفسکی فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا ہوا تو یہ جان کر حیران ہوا کہ کوئی چیز بور کرنے والی نہیں۔

یہ نئے رومان پرست، یہ وجودیئے اپنے پیش رووں کی نسبت بہت کم ناامید تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی کے کوئی معنی نہیں مگر یہ بھی مانتے تھے کہ انتخاب کا حق انسان کے پاس ہے۔ انہیں بیسویں صدی کی بے مثال فلسفیانہ بصیرت میں بھی کمال حاصل تھا۔ ایڈمنڈ ہسلر کا کہنا ہے کہ 'آ گہی ارادی ہے' یعنی آ گہی آئینہ نہیں کہ اس میں حقیقت جھلکتی ہے بلکہ اس ہاتھ کی طرح ہے جو بڑھ کر کوئی چیز گرفت میں لے لیتا ہے۔

دراصل یہ اس مسئلہ کا حل تھا جس نے رومان پرستوں کو مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ 'وژن کے لمحات' میں دنیا حسین لگتی ہے ورنہ اکثر نڈھال بے لطف اور بے کیف ہے۔ انہوں نے دو پرسپشن ملانے کی کوشش کی تھی اور سمجھا تھا کہ 'وژن کے لمحات' سراب ہیں۔ ہسلر کی 'ارادی آ گہی' والی بات سمجھ میں آ جائے تو مسئلہ وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ اگر توجہ دیئے بغیر ہم اپنی گھڑی دیکھیں تو وقت کا پتہ نہیں چلتا کہ کیا بجا ہے۔ اگر بالکل صاف دیوار پوری توجہ سے دیکھیں تو کئی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو ویسے نظر نہیں آتیں۔ پرسپشن میں آ گہی شامل ہوتی ہے، وہ حقیقت پر اس طرح حملہ کرتی ہے جیسے ہل زمین کا سینہ چیرتا ہے۔

یہ بات سمجھ میں آ جائے تو بڑی بات ہے۔ جب سے اس نے منقسم شعور میں ترقی کی، دماغ ایک طرف سے مائیکروسکوپ اور دوسری طرف سے ٹیلی سکوپ کا کام کرنے لگا ہے۔ انسان زندگی سے کٹ کر بے بس تماشائی بن گیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کو یہ شعور دیا ہے کہ دماغ بے بس نہیں۔ وہ اسے حقیقت کو بدلنے میں مدد دے سکتا ہے بلکہ شعور بذاتِ خود حقیقت کو بدلنے والا ہے۔ اس وقت ہم اناڑیوں کی طرح بھونڈے پن سے اسے استعمال کرتے ہیں جیسے بچہ کسی چمک دار چیز کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہتا ہے۔ اگر شعور ہاتھ جیسا ہے تو اسے گرفت میں لینے، بہت کچھ کرنے، دوست بننے اور تخلیق کرنے جیسے حساس کام سکھاتا ہے۔

ہندوستان کے یوگیوں نے اس سچائی کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ ہم سب خوشی کے لمحات میں اسے محسوس کرتے ہیں۔ خوشی کے لمحات، جو ہماری امیدوں سے بڑھ کر ہیں جو ہمیں چھٹی منانے سے حاصل ہوتے ہیں جو تبدیلی کی ہماری خواہش سے ماورا ہیں۔ بہرحال کہیں نہ

کہیں یہ احساس موجود ہوتا ہے کہ دنیا ہمارے اندازے سے بڑھ کر حسین اور دلچسپ ہے اور یہ کہ اگر ہم ایک بار اب یہ بصیرت حاصل کرلیں تو پھر کبھی اسے نہیں گنوائیں گے۔

ہیوم بالکل غلطی پر ہے۔ انسان زمین میں گڑا ہوا چوپایہ نہیں کہ ہل نہ سکے۔ منقسم شعور سے اس میں انقلابی تبدیلی پیدا ہوئی ہے تاکہ وہ تہذیب کی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔ تب سے وہ لحہ لحہ بدل رہا ہے۔ مسلسل بدل رہا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ، مسئلہ جس کی وجہ سے اس نے کئی اذیتیں، کئی عذاب دیکھے ہیں یہ رہا ہے کہ وہ شعور کی تنگی اور لیفٹ برین انانیت کا کیا کرے۔ مسرت کی تلاش اس سلسلہ میں اس کا پسندیدہ طریقہ رہا ہے۔ کامیابی کے، فتوحات کے لمحے اسے اچھے لگتے ہیں۔ ان لمحوں میں وہ اپنے آپ کو بہت آزاد سمجھتا ہے۔ ماضی کے تین ہزار برس سے اکثر سب سے بڑے آدمیوں نے سب سے بڑی فوجوں کے ساتھ ہمسایہ ملکوں پر یلغار کی ہے، امن کو انتشار میں بدلا ہے۔ یہ عروج نہیں زوال ہے۔ ارتقائی قوت نے خود اپنے خلاف جنگ کی ہے، اپنے آپ کو شکست دی ہے۔

مگر گزشتہ تین صدیاں انسانی ترقی کے لحاظ سے دلچسپ رہی ہیں۔ نیوٹن نے دکھا دیا کہ انسانی دماغ آسمانوں کے راز جان سکتا ہے اور کم از کم اس لحاظ سے انسان ایک خدا سے مشابہ ہے۔ آئندہ صدی میں انسان نے اس کی حدود سے واقف ہونے کے لیے آزادی کی حقیقت جاننے کی بھرپور کوشش کی۔ اس روشنی میں ہمیں پادری گرمشا کے زمانہ سے لے کر آج اپنے پرتشدد عہد تک ہونے والی بظاہر پرآشوب تبدیلیوں کو دیکھنا چاہیے۔ یہ انسان کی بالا رادہ کوشش تھی کہ خود اپنی فطرت اس کے تقاضوں اور امکانات کو سمجھ سکے اور ارتقائی معنوں میں یہ حیران کن حد تک کامیاب تجربہ تھا۔

ہمیشہ سے انسان کا بڑا مسئلہ اس کی یہ ذہنیت رہی ہے کہ زندگی ایک فریب ہے، ایک دھوکہ ہے۔ وہ اپنی خواہشات پوری کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہے مگر تجربہ اسے سکھاتا ہے کہ سب بے معنی، سب لاحاصل ہے۔

اگر ہم سے غور سے دیکھیں کہ ایسے تجربات میں کیا ہوتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دماغ بذاتِ خود ناکام ہوا۔ جب ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی کام ہمارے بس میں ہے تو دماغ خود بخود آرام کرنے لگتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کہ ہم لقمہ منہ تک پہنچنے سے ایک لحہ پہلے گرا دیں۔ مگر بچے جو نئے نئے کھانا سیکھتے ہیں اکثر اپنے لقمے زمین پر گرا دیتے ہیں، اس سے پہلے کہ منہ تک پہنچیں۔ انسانی شعور ابھی بچپنے کی حالت میں ہے۔ اس بچہ کے ہاتھ کی طرح جو نہیں جانتا کہ

اس کا صحیح استعمال کیا ہے۔

پچھلی نصف صدی میں انسانی شعور نے اپنے آپ کو جاننے اور اپنے امکانات کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی ہے، اگرچہ اس کے اکثر مظاہر مایوس کن تھے۔ جیسے ڈرگ کلچر، جیسے ڈین کارل اور ٹیڈ بڈی کی مثالیں جو عیاشی کے نت نئے طریقے ایجاد کرتے تھے۔ ہمارے اس عہد نے ولہلم رائخ اور رون ہبرڈ سے مہر بابا اور مہارشی تک اتنے مسیحا اور گرو دیکھے ہیں کہ اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نہیں۔ ان میں سے اکثر بھلے لوگ تھے اور ان کے مسلک بھی مثبت تھے۔ مگر ان کے معتقد ان سے مبالغہ آمیز خوبیاں منسوب کرتے ہیں۔ 1950ء کے عشرے میں الڈوس ہکسلے کا یہ کہنا کہ ایل ایس ڈی یا mescalin جیسی کوئی ڈرگ شعور کی مقصدیت اور ارادیت میں اضافہ کرتی ہے اور اس کی لامحدودیت کو واضح کرتی ہے، پرسیشن کو سمجھنے کے سلسلے میں ایک اہم قدم تھا۔ (اگرچہ 1960ء کے عشرہ میں ذہنی توانائی اور بیداری کے بجائے اسے ذہنی عیاشی کا ذریعہ بنالیا گیا)

دوسرے مسلک جیسے 'منقسم دماغ نفسیات' اور بائیو فیڈ بیک کنٹرول ان خامیوں سے بالکل پاک ہیں۔ دونوں میں قریبی تعلق ہے۔ دراصل بائیو فیڈ بیک کنٹرول 'دایاں دماغ آ گہی' کو جاننے کا ایک طریقہ ہے۔ 'بائیو فیڈ بیک مشین' کے ذریعہ ہم اپنے دماغ کا ردم یا جلد کی برقیاتی حرکت سن سکتے ہیں۔ جب ہم آرام کرتے ہیں تو آرام چیئر کی گہرائی میں دھنس جاتے ہیں اور لیفٹ برین کا انفرادیت پسند حصہ ادھر ادھر ٹہلنا چھوڑ دیتا ہے۔ رائٹ برین پرسپشن میں اپنی آواز تو تنوع اور تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ہم تفریح کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ آرم چیئر میں آرام کرتے ہیں جس کے تاثرات حسیات کو گھیر لیتے ہیں اور دایاں دماغ تبصرہ کرنے لگتا ہے۔ گئے زمانوں کی یاد دلاتا ہے۔ (یہ 'رائٹ برین کمپلیکس' ہے جہاں یادیں محفوظ ہوتی ہیں) چنانچہ بائیو فیڈ بیک، انانیت کو یاد دلانے کا طریقہ ہے کہ یہ محض آ گہی کا سایہ ہے اور یہ کہ وہ اس سے زیادہ طاقتور دوست کا سہارا لے سکتا ہے جو ورڈز ورتھ کے 'other modes of being' کو عملی طور سے سمجھتا ہے۔ اگر رومان پرست اس تکنیک سے واقف ہوتے تو شاید کئی المیے نہ ہوتے۔

اس میکانزم میں انسان کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ صبح جب آنکھیں کھولتا ہوں، ہوش میں آتا ہوں تو دیکھنا بھی شروع کرتا ہوں مگر میرا ہوش میں آنا محض 'پرسپشن' سے کہیں زیادہ ہے۔ حافظہ سے محروم کوئی شخص وہی بیڈ روم دیکھے جو میں دیکھتا ہوں' ایک بچہ یا کوئی کتا

دیکھے تو ان کی اور میری آگہی میں فرق ہونا لازمی ہے۔ فرق اس طرح کہ میں پرسپشن میں کیا اضافہ کرتا ہوں۔ میرا دماغ لاکھوں یادوں کا سٹور ہاؤس ہے۔ جن سے میں اپنا پرسپشن بڑھاتا ہوں۔ جب میں اپنے گھر کی تصویر دیکھتا ہوں تو اس اجنبی کی نظر سے نہیں دیکھتا جسے میں گھر کی تصویر دکھا رہا ہوں کیونکہ میں گھر سے وابستہ یادوں کے ذریعہ تصویر مکمل کرتا ہوں۔ جبکہ اجنبی کے پاس ایسی کوئی یاد نہیں جس سے وہ اپنا پرسپشن (تصور) مکمل کرے، سوائے اس کی اپنی یادوں کے جو ایسے ہی گھروں کے متعلق ہیں۔

یہ میکانزم جسے ہم 'تکمیل' کہہ سکتے ہیں، آگہی کا ناگزیر حصہ ہے۔ اس کے بغیر دنیا بے معنی ہے۔ میں کمرے میں ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ ٹیبل کے نیچے کوئی چیز پڑی نظر آتی ہے، ایک لمحہ کے لیے میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ چیز کیا ہے۔ ایک خاص زاویہ سے دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ بچہ کا کھلونا ہے۔ میں نے اسے 'مکمل' کر لیا ہے۔

بہت دنوں کے بعد میں کسی طویل سفر سے گھر واپس آتا ہوں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر شراب کے دو گھونٹ لیتا ہوں۔ ایک لکڑی آتش دان میں ڈالتا ہوں اور فٹ سٹول پر پاؤں رکھ کر اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔ میرا گھر مجھے پہلے سے زیادہ بڑی حقیقت لگتا ہے۔ کیا میں معمول سے زیادہ اسے 'مکمل' نہیں کر رہا ہوں؟

نہیں، کیونکہ میں اس لیے گھر کی ہر چیز پر زیادہ توجہ دے رہا ہوں اور پرسپشن میں زیادہ طاقت صرف کر رہا ہوں کہ میں گھر آ کر بہت خوش ہوں۔ دراصل میں پہلے سے بہت زیادہ دیکھ رہا ہوں۔ یہ بات عجیب لگتی ہے کیونکہ میں وہی کمرہ دیکھتا ہوں جو پہلے سے دیکھتا آیا ہوں۔ مگر نہیں، میرا دماغ چونکہ زیادہ بیدار ہے اس لیے میں دیکھتا ہوں کہ میری بیوی نے پردے بدل دیئے ہیں، یا یہ کہ لیمپ شیڈ ایک طرف جھکا ہوا ہے، بچے نے اپنے جوتے ایسی جگہ رکھ دیئے ہیں کہ ان کی وجہ سے کوئی گر سکتا ہے۔ عام طور سے میں ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ میرا پرسپشن اپنے آپ کو عام چیزوں تک محدود کر لیتا ہے، جیسے کوئی اسکیچ ہو۔ اس لیے کہ میں اچھی طرح جاگ رہا ہوں۔ میرے دماغ نے اسکیچ میں نئی باریکیاں نئے رنگ بھر دیئے ہیں۔

میں گھر سے باہر جا کر چھٹی مناتے ہوئے چھٹی سے اس لیے لطف اندوز ہوتا ہوں کہ اسکیچ بھرپور ہو، اس میں ساری باریکیاں سما جائیں۔ میں پرسپشن کو زیادہ احتیاط، زیادہ توجہ کے ساتھ 'مکمل' کر رہا ہوں۔

اس 'زیادہ مکمل' پرسپشن کا ایک نام بھی ہے، ہم اسے خوشی کہتے ہیں۔
اور ہم یہ خوشی کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ پرسپشن کو کیونکر بھرپور اور مکمل بناتے ہیں؟

ایک تشبیہہ اسے واضح کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔ آگہی ندی کی سطح ہے۔ ہماری ساری یادیں، سارے تجربے، ندی کی سطح کے نیچے ہیں۔ بعض اس کی گہرائی میں ہیں، بعض سطح سے بالکل نیچے تیرتے ہیں۔ جب مجھے کوئی نیا تجربہ ہوتا ہے تو میں اپنی یادوں کو سطح کے نیچے سے بلا کر اسے 'مکمل' کرتا ہوں۔ چنانچہ جب چھٹی پر جاتا ہوں تو مجھ پر اطمینان کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور ہر قسم کی یادیں سطح پر آتی ہیں۔ یہ یادیں شاید اپنے ساتھ خوشی لے کر آئیں اور خوشی کی وجہ سے مزید یادیں سطح پر آئیں۔ اور اچانک اتنی بہت سی یادیں سطح پر آ کر اس طرح چھا جاتی ہیں کہ پانی مشکل سے نظر آتا ہے۔ جتنا زیادہ آگہی کا 'دامن بھرتا' ہے اتنی زیادہ مجھے خوشی ہوتی ہے اور اتنی زیادہ یادیں سطح کا سینہ چیر کر اوپر آ جاتی ہیں اور یہی وہ لمحہ ہے جب میں چیخ کر کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی شان دار ہے، بے بدل ہے اور یہ کہ ہم زندگی کو محض ایک آئینہ، یا پانی کی کھوکھلی سطح سمجھ کر اسے ضائع کر دیتے ہیں۔

اگلی صبح میں جاگتا ہوں، اور آگہی ایک بار پھر ایک صاف آبی سطح ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں، چند یادیں ابھرتی ہیں، آس پاس تیرتی ہیں اور پھر ڈوب جاتی ہیں۔ اچانک میں انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ دیکھتا ہوں۔ چیزوں کو سطح پر لانے میں طاقت صرف ہوتی ہے اور یہ طاقت میں ایک حد تک جمع کر لیتا ہوں۔ لیکن اگر مجھے چھٹی سے حاصل ہونے والی خوشی کا تجربہ کرنا ہے تو مجھے 'فیڈ بیک' کا سلسلہ شروع کرنا چاہیے جب مجھے خوشی سے نئی طاقت اور طاقت سے مزید خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اب لگتا ہے کہ یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔ ویسے خوشی کے لمحات کا حصول مشکل نہیں۔ میسلو کا کہنا ہے کہ اکثر صحت مند لوگ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر فیڈ بیک کا سلسلہ شروع کرنا کہیں زیادہ مشکل ہے۔ میرا دماغ عام طور سے ایک پرانی کار کی طرح ہے جس کے سپارک پلگ گیلے ہیں اور جسے اسٹارٹ کرنے کی مسلسل کوشش کرتا ہوں، یہاں تک کہ بیٹری بے کار ہو جاتی ہے مگر انجن میں زندگی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔

یہ ٹھیک ہے کہ جسمانی محرک بڑی حد تک مدد کرتا ہے۔ اسی لیے جب میں چھٹی پر ہوتا ہوں تو مجھے زندگی کے بھرپور ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اور بچوں کو کرسمس پر اس کا احساس کیوں ہوتا ہے۔ جب میں کسی نئے اور دلچسپ مقام پر تفریح کے لیے جاتا ہوں، میرے پاس

شراب ہے اور اچھا کھانا ملنے کی امید بھی ہے تو میرے لیے 'فیڈ بیک' کے امکان بڑھ جاتے ہیں اور جرم کی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔ ہیگ جیسا جنونی قاتل فاسٹ سپورٹ کاروں، اچھے لباس اور مہنگے ہوٹلوں پر جان دیتا تھا اور اپنی خوشی کی خاطر انہیں کسی قیمت پر بھی حاصل کرنا چاہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ enrichment ان کے حصول میں ہے۔ بڈی کا خیال تھا کہ کسی عام آدمی کو اتنے جنسی تجربے نہیں ہو سکتے جتنے کہ وہ چاہتا ہے اور یہ کہ یہ تشنگی enrichment کے حصول میں مستقل رکاوٹ ہے۔ اس نے مسئلہ کا حل قتل اور ریپ میں تلاش کیا۔

پھر ایسا کیوں ہے کہ یہ طریقے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ کوئی شخص جس کا مجرموں سے واسطہ ہو، کوئی پولیس مین، کوئی وکیل یا ماہر نفسیات تصدیق کرے گا کہ مجرم ہماری نسبت بہت زیادہ غم زدہ ہوتے ہیں۔ کوئی چیز انہیں اندر ہی اندر کھائے چلی جاتی ہے۔ بوسٹن کے قاتل نے اپنے چند مسائل شاید حل کر لیے ہوں مگر اس کے لیے اسے دو ہزار ریپ اور ایک درجن قتل کرنا پڑے اور ان کی قیمت اسے اپنی آزادی اور زندگی کی صورت میں ادا کرنا پڑی۔ جرم، شعور کی ''تکمیل'' کا ناکام طریقہ ہے۔

وجہ ظاہر ہے۔ ایز چمنٹ تکمیل کا انحصار پرسپشن کے دو دھاروں کو فوکس میں لینے پر ہے Meaning Perception کو بھی Immediacy پرسپشن جتنا طاقتور ہونا چاہیے کیونکہ یہ دماغ کی ایک قوت کا نام ہے جس کا انحصار ایک خاص ذہنی طاقت پر ہے اور اس ذہنی طاقت سے تمام مجرم محروم ہوتے ہیں۔ وہ 'تکمیل' کے عمل میں جسمانی محرک پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ کارل پینزم نے پہلی چوری گیارہ برس کی عمر میں کی تھی، وہ جسمانی محرک حاصل کر رہا تھا۔ سٹیون جوڈی بھی یہی کر رہا تھا جس نے بارہ برس کی عمر میں پہلا ریپ کیا تھا۔

دوسری طرف شیلے نے ابتدائی عمر میں جان لیا تھا کہ اس کا جواب meaning پرسپشن کی طاقت اور اس طاقت میں اضافہ سے ہے۔ شیلے نے سمجھ لیا تھا کہ شعور یادوں کے ہجوم میں بھرپور اور شاداب ہوتا ہے۔ پروست پر بھی یہی انکشاف ہوا تھا جب اس نے ہرب ٹی کے ساتھ کیک کا ایک ٹکڑا لیا۔ وہ بچپن کی یادوں کے ہجوم میں کھو گیا تھا۔ اس نے اس تضاد کو بھی محسوس کیا کہ انسان واقعی ایک قسم کا خدا ہے۔ ''میں نے آپ کو اتفاقی، سیکنڈ کلاس اور فانی سمجھنا چھوڑ دیا ہے''، جس شخص میں یہ شعور پیدا ہو گیا ہو وہ کبھی مجرم نہیں بن سکتا کیونکہ مجرموں کی طرح یہ غلطی نہیں کر سکتا کہ جسم کی دنیا کو واحد حقیقت سمجھے۔ وجدانی طور سے وہ جانتا ہے کہ

اصل جواب ایسی قوت کے پاس ہے جو نظر نہیں آتی۔

دراصل مجرم بھی اپنے بے ہنگم طریقہ سے یہ جانتا ہے۔ جیسا کہ 'My Secret Life' کا مصنف اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھتا ہے۔ وہ اپنے دماغ کو اس طرح فوکس کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جس طرح کہ عام طور سے نہیں ہوتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تمام جنسی جرائم کے پیچھے یہ محرک ہے۔ فریڈرک بیکر ایک بچہ کے ریپ میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جیک دی ریپر اپنی اذیت پسندی میں، جبکہ پال بولز تشدد میں اسے پانے کی کوشش کرتا ہے۔ بوسٹنی قاتل اس انداز اور اس بے حیائی کے ساتھ مقتولوں کی لاشیں رکھتا ہے کہ اس کے حافظہ پر ان کی یادیں نقش ہو جائیں اور وہ جب چاہے انہیں تازہ کر سکے۔ پرسپشن کی اس تیزی میں جرم کے نشہ، اس کی عادت کا سراغ ملتا ہے۔ جیکوئیس میرین الجیریا میں باغیوں سے لڑنا چھوڑ کر مسلح ڈاکہ زنی کی طرف آ گیا۔ خطرہ سے پیدا تیز آگہی ایک نشہ آور دوا بن گئی تھی۔

چنانچہ جرم، جیسا کہ ویلز نے 'The Croquet Player' میں کہا ہے، غاروں میں بسنے والے ہمارے بزرگوں کی خوف ناک وراثت نہیں ہے بلکہ یہ 'منقسم دماغ' سے پیدا شعور کی تنگی کی تلافی کی کوشش ہے۔ اوران معنوں میں انسانی تخلیق اس کا سرچشمہ ہے۔ شیکسپیئر نے کہا ہے کہ ''دیوانے، عاشق اور شاعر سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔'' وہ اس فہرست میں مجرموں کو بھی شامل کر سکتا تھا۔ مجرم کو انسان نہ سمجھنا غلطی ہے حالانکہ مجرم ہم سب سے زیادہ انسان ہے۔ وہ ہم سے زیادہ اس سراب کے لیے سرگرداں ہے جس کی تلاش ہماری زندگی میں زہر گھول دیتی ہے۔ ہم سب خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں کے اسیر ہیں۔

جرم اس مسئلہ کا حل نہیں جو جھولے سے قبر تک ہم سب کی جانوں کے ساتھ لگا ہوا ہے، یعنی ذاتی ترقی کا مسئلہ۔ مگر مذہبی انتہا پسندوں کی جنت سے مارکس کے میٹریل ازم تک اس مسئلہ کے سارے انسانی حل ناقص اور غلط ہیں۔ مجرم غلط حل اپنانے میں ہم سے آگے چلا جاتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ ہمیں ہماری حماقت کا احساس دلاتا ہے کہ ہم بھی وہی غلطی چھوٹی سطح پر کر رہے ہیں۔ جرم میں انسان کی دلچسپی کا یہ حقیقی جواز ہے۔

یہ ایک ارتقائی مسئلہ ہے۔ جسمانی ضرورتیں پوری کرنا تمام جانوروں کا مسئلہ ہے۔ انسان خوش قسمت ہے کہ اس نے جسم کے ساتھ دماغ کا بھی خیال رکھا ہے۔ اس نے دماغ کی طاقت اور تربیت پر توجہ دی ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی کامیابی ہی نے اس کی ترقی کا راستہ روک لیا ہے۔ تہذیب نے اسے عیش و آرام سے جینا سکھایا ہے جبکہ اس کے جوہر چیلنج

اور بحران میں ظاہر ہوتے ہیں مگر چیلنج اور بحران سے بچنے کے لیے اس نے تہذیب ایجاد کر لی ہے۔

کیا اس گرداب سے باہر نکلنے کی کوئی صورت ہے؟ دوہری شخصیت کا مسئلہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارا داخلی وجود بے شک منقسم ہو، مگر ہمارے دماغ کے دو نصف ایسے ہیں جو باہمی تعاون کے اہل ہیں۔ دراصل وہ ہر وقت تعاون کرتے ہیں۔ میں جب لکھتا ہوں تو دایاں دماغ بصیرت جبکہ بایاں الفاظ دیتا ہے۔ لیکن جب میں ناشتہ کرنے یا کھانا کھانے جیسا کوئی سیدھا سادا کام کرتا ہوں تو بایاں کوئی مداخلت نہیں کرتا، یہاں تک کہ اخبار پڑھتے ہوئے میں توس پر مکھن بھی لگا سکتا ہوں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسئلہ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ اگر میں کسی ہوٹل میں ناشتہ کرتا ہوں اور دوسرے ٹیبل پر کوئی بدتمیز شور کرنے والا بچہ ہو تو میں آرام سے ناشتہ نہیں کر سکتا۔ ہوتا یہ ہے کہ بچے کا شور اخبار سے میری توجہ ہٹا دیتا ہے اور 'مجھے' یعنی بائیں دماغ کو غصہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ مجھے ناشتہ میں مزا نہیں آتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بدہضمی ہو جائے۔ میرے بائیں دماغ نے میرے دائیں دماغ، میرے 'روبوٹ'، میرے ہاضمہ کے سیدھے سہل کام میں مداخلت کی ہے۔

اور جب وہ اس طرح مداخلت کرتا ہے تو دراصل کیا ہوتا ہے؟ اس کی وجہ سے اندر کی طاقت ضائع ہونے لگتی ہے۔ جب میں آرام سے ہوں اور اس کام میں دلچسپی لے رہا ہوں جو کر رہا ہوں تو میری توانائیاں خاموشی سے اور ضائع ہوئے بغیر اس کام میں شامل ہو جاتی ہیں جو میں کر رہا ہوں۔ کسی بے چینی کی وجہ سے جب میرے بائیں دماغ کی توجہ میں خلل پیدا ہوتا ہے تو میری توانائی ضائع ہونے لگتی ہے اور یہ تہذیب یافتہ انسان کا بنیادی مسئلہ ہے۔ وہ جانے بغیر مسلسل 'ضائع' ہوتا رہتا ہے اور اس 'ضیاع' کی وجہ سے وہ شعور کی ان بلندیوں کو نہیں چھو سکتا جس کا وہ اہل ہے۔

اگر یہ بے چینی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے تو اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنی بری طرح ضائع ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ پیٹ کی خرابی میں مبتلا رہے یا اسے اپنی بے چینی یاد آئے تو اسے دل ڈوبنے کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے سامنے دوسرا راستہ بھی ہے۔ وہ بات چیت میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور اچانک اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی طاقت ضائع ہونا بند ہو گئی ہے۔ مگر ذہنی مسرت کے یہ کیف آور لمحے ہمیں یاد دلاتے

ہیں کہ ہم عام طور پر جانے بغیر اپنی کتنی طاقت ضائع کرتے ہیں۔

ہر وہ چیز جو ہمیں نروس کر دے، ہماری توانائی ضائع کرتی ہے جیسے کوئی ہمارے پاؤں غور سے دیکھے اور دیکھتا رہے، اور ہم گھبرا جائیں کہ جرابیں الٹی پہنی ہیں یا جوتے قابل اعتراض ہیں۔ لیکن انسان کا تمام ارتقا اس کی خود پسندی کا ارتقا ہے۔

جس چیز میں ہم دلچسپی لینے لگیں، اسے اپنی توجہ کا مرکز بنائیں وہ ہمیں تازگی اور توانائی دیتی ہے۔ اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ دماغ کے دو حصے کسی پس و پیش کے بغیر آپس میں تعاون کرتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی زندگی میں سیکس کی کتنی بڑی اہمیت ہے۔ مثلاً ایک پریشان حال شخص کا اچانک کسی لڑکی سے سامنا ہوتا ہے۔ وہ اسے حسین اور تنہا پا کر خوش ہوتا ہے تو پلک جھپکنے میں اس کی پریشانی خوشی میں بدل جاتی اور اس کی توجہ ناقابل تقسیم ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کا دماغ بھی یکجا اور غیر منقسم ہوتا ہے۔ اس کے تمام جسمانی مشاغل کھانا پینا، چلنا اٹھنا بیٹھنا اس 'غیر منقسم' کیفیت کے مظاہر ہوتے ہیں۔ مگر ان میں سے شاید ہی کوئی سیکس جیسی وارفتگی کے ساتھ اس کا مظہر ہو۔

اور یہ اس لیے کہ سیکس سے فوری طور پر 'منقسم شعور' کی وہ دراڑیں بھر جاتی ہیں جن کی وجہ سے لوگ جنسی بے راہروی کی طرف راغب ہوتے ہیں اور جن کا جرم سے قریبی تعلق ہے۔

اب ہمیں مسئلہ کے حل کی کوئی صورت نظر آنے لگی ہے اور اس مسئلہ میں صرف جرم نہیں بلکہ انسانی ترقی کے راستہ میں رکاوٹ کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ اب تک یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ مسئلہ 'لیفٹ برین' کا ہے کہ وہ اپنی آگہی کی طاقت سے بے خبر ہے۔ خیر وہ تو کوئی بات نہیں کہ آگہی پیدا تو ہوسکتی ہے۔

جب کوئی ہپناٹسٹ کسی شخص سے کچھ کرنے کے لیے کہتا ہے، کوئی ایسا کام جو عام حالات میں کرنا مشکل ہوتا ہے، جیسے کہ سگریٹ نوشی ترک کرنا، ایسی صورت میں ہپناٹسٹ کیا کرتا ہے کہ لیفٹ برین کی 'مداخلت' روک دیتا ہے۔ اسے بے حس و حرکت کر دیتا ہے۔ لیکن اگر ہم ایسے غیر معمولی کام کر سکتے ہیں تو خود اپنے آپ کو انہیں کرنے کا حکم کیوں نہیں دیتے؟ کیونکہ لیفٹ برین انا، اپنی طاقت، اپنی صلاحیتوں سے بے خبر ہے۔

مگر یہ بات بے معنی لگتی ہے جب بھی ہم کسی چیز میں گہری دلچسپی لیتے ہیں تو اس سے متعلق ہر کام کو تفریح سمجھ کر سرانجام دیتے ہیں۔ جب ہم کوئی مشکل کام مشکل سمجھے بغیر

کرتے ہیں تو 'انا' محسوس کرتی ہے کہ اس کا ایک طاقتور 'حامی' موجود ہے۔ جب ہم اچھے موڈ میں ہوں اور ہماری نظر زندگی کے روشن پہلوؤں پر ہو تو یہ 'حامی' آنے والے دنوں کی باتیں ہمیں پہلے بتا دیتا ہے اور احمقانہ حرکتیں اور غلطیاں کرنے سے روکتا ہے۔ بلکہ حسین اتفاقات کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ غالباً یہ حامی رائٹ برین ہے جو ہمیں کسی ایسے دوست کے خط کی نوید بھی دیتا ہے جس کی برسوں سے کوئی خبر نہیں آئی۔ بہرحال نارمل اور تندرست لوگوں سے اس 'نظر نہ آنے والے حامی' کا سامنا اکثر ہوتا ہے۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا بڑا مسئلہ، لیفٹ برین کی اپنی طاقت سے بے خبری ہے۔

مگر تجربہ اور آگہی میں فرق ہے۔ شاید میں یہ جانے بغیر کار چلا سکوں کہ اس کا انجن کیا بلا ہے۔ ریاضی کے کسی فارمولے سے کام لے سکوں یہ جانے بغیر کہ وہ کیسے کام کرتا ہے۔ مگر اپنی ذہنی کاوش کے ذریعہ ہم جان سکتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ کیوں اور کیسے کر رہے ہیں۔ لیفٹ اور رائٹ برین میں قریبی تعاون کے وقت توجہ دینے سے ہمیں لیفٹ برین کی کچھ طاقت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ابراہم میسلو نے جب طلبا سے اپنے چوٹی کے تجربات کا ذکر کیا تو انہیں اپنے چوٹی کے تجربے یاد آنے لگے جن کا نوٹس انہوں نے اس وقت نہیں لیا تھا۔ آگے چل کر اسے پتہ چلا کہ جب اس کے طلبا نے چوٹی کے تجربوں کی بات باقاعدگی سے سوچنا اور کرنا شروع کی تو انہیں اور زیادہ چوٹی کے تجربے ہونے لگے۔ لیفٹ برین 'اَن دیکھے معاون' کو پہچاننے لگا تھا اور زندگی کے شاندار لمحات لانے میں اس کی طاقت کا اعتراف شروع کر دیا تھا۔

اور اب ہم آخرکار انسانی ارتقا اور انسانی کریمنلٹی کے اس مسئلہ کو سمجھنے لگے ہیں اور اس کے حل کی طرف شاید قدم بڑھا سکتے ہیں۔

اگر ہمیں کبھی کسی حقیقت کا علم حاصل ہو تو ہم اسے اپنے شعور میں جذب کرنے لگتے ہیں۔ گزشتہ صدی میں شعور کے متعلق بنیادی حقائق ہم نے جان لیے ہیں۔ لاشعور کے متعلق فرائیڈ کا تصور، ارادیت کے متعلق ہسرل، اقتدار کی خواہش اور ایڈلر، میسلو کا چوٹی کا تجربہ، دوہرے دماغ کے متعلق سپیری کا نظریہ، اِن سب نے انسانی نفسیات کے متعلق ہمارے علم میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ جو بات ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ شعور انسانی تجربات کے لیے محض آئینہ نہیں بلکہ ایک ہاتھ ہے جو حقیقت کو گرفت میں لیتا ہے۔ گرفت جتنی مضبوط ہو دنیا اتنی ہی حقیقت سے قریب تر لگتی ہے اور اس مٹھی کے بند ہوتے ہی چوٹی کے تجربات کی جھلک

نظر آتی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر جانس کہتا ہے کہ یہ جان کر کہ اسے صبح پھانسی لگنا ہے، انسان کا دماغ حیرت انگیز طور پر اس جان کاری پر اپنے خیالات مرکوز کرتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنا شعور صحیح مقصد یعنی گرفت میں لینے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ ہم ہاتھ شاذ و نادر ہی استعمال کرتے ہیں اس لیے وہ کمزور رہ جاتا ہے۔ جب میسلو کے طلبا نے چوٹی کے تجربہ کے متعلق سوچنا اور بولنا شروع کیا تو وہ قدرتی طور پر ان کی سمجھ میں آنے لگا، کیونکہ انہوں نے 'مٹھیاں بھینچ' لی تھیں۔ گرفت سخت کرنا دراڑیں بھرنے کے مترادف ہے اور دراڑیں بھرنے سے شعور پر اچانک زور پڑتا ہے۔ اسی لیے ہسرل کہتا ہے کہ چھوٹی چیزوں پر توجہ دینے سے نئی قوت حاصل ہوتی ہے، دراڑیں بھر جاتی ہیں اور گرفت سخت کرنے سے فوراً ایسا ہوتا ہے کہ روشنی کی ایک کرن نظر آتی ہے۔

اس بیان کی صداقت پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ بس یہ کرنا ہے کہ پٹھے تنے ہوئے ہوں، آنکھیں بھنچی ہوں اور دماغ کی گرفت سخت کرنے کی ایک اچانک اور زور دار کوشش کریں تو فوری مسرت کی ایک شان دار لہر نمودار ہو گی مگر یہ فوراً غائب ہو جاتی ہے کہ پٹھے بہت کمزور ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ہر پٹھہ کوشش کرنے سے مضبوط ہو سکتا ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب ہم دماغ کی گرفت سخت کرتے ہیں تو کسی اندرونی قلعہ میں پسپا ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ کرکے گور کا یہی مطلب ہے، جب وہ کہتا ہے کہ ''سچ داخلیت ہے۔'' دراصل یہ طاقت کے ایک ذریعے سے فوری رابطہ ہے جو ہمارے اندر موجود ہے۔

مگر ان سب باتوں کا جرم کے مسئلہ سے کیا تعلق ہے۔ اس کا جواب ڈان میک ڈوگلڈ کے اس کامیاب علاج میں ہے جس کے ذریعہ اس نے جارجیا اسٹیٹ جیل کے نفسیاتی مریضوں کو صحت یاب کیا تھا۔ سارتر نے کہا ہے کہ مجرم ایک ایسا شخص ہے جسے اپنے آپ کو مجرم سمجھنے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کو، بدقسمتی کو، خود اپنے تشدد کو اور بے مقصدیت کو اپنا قاتل سمجھتا ہے۔ میک ڈوگلڈ نے مجرموں (اپنے مریضوں) کو سمجھا دیا تھا کہ تمام خرابی ان کے اپنے ذہنی رویوں میں ہے۔ جب اس نے ایک قیدی کے معاملہ میں مداخلت کی جو ایک اور قیدی کے قتل کا پروگرام بنا رہا تھا جس نے اس کی توہین کی تھی تو اسے پتہ چلا کہ مجرم نے جب اپنے دشمن، اپنے ہونے والے قاتل کو ایک سینڈوچ اور کافی پیش کی تو صورت حال بالکل بدل گئی۔ میک نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی ناگزیر ہلاکت یا حادثہ کا شکار نہیں۔ میک نے

اسے وہ راز بتا دیا تھا جس نے انسان کو ایک برہنہ شجرنشین سے زمین کی سب سے ترقی یافتہ مخلوق بنا دیا تھا کہ انسان کی کنٹرول کرنے کی طاقت فورس 'سی' اس کے معاملہ میں سب سے اہم ہے، جیسا کہ ویلز کے مسٹر پولی نے جان لیا تھا کہ ''اگر تمھیں اپنی زندگی پسند نہیں تو تم اپنی زندگی بدل سکتے ہو۔''

اس وقت سوسائٹی مجرم کی شریک خیال ہے کہ کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مگر بڑی تبدیلیاں لانے والے چند لوگ ہیں اور بہتر لوگ ہیں جو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ سوسائٹی اس وقت جرم کنٹرول کرے گی جب وہ صرف یہ مان لے کہ جرم کنٹرول کرنے کی طاقت اس کے پاس ہے۔

تیس لاکھ برس سے زیادہ کی انسانی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انسانی دماغ کا پہلا بڑا موڑ وہ لمحہ ہے جب اسے اپنے وجود کا احساس ہوا۔ جب انسان نے 'میں' کہنے کے لیے پہلی دفعہ تالاب میں اپنا چہرہ پہچانا اُس وقت وہ بڑائی اور کریمنلٹی (مجرمیت) دونوں کا اہل ہوا۔

اگر انسانی ارتقا کی تاریخ سے ہم کوئی سبق سیکھ سکے ہیں تو وہ یہ ہے کہ 'مجرم شخص' کی زندگی بے معنی ہے۔ مسرت و آزادی سے محروم ہے۔ وہ ایک سایہ ہے، وہم ہے اور فریب ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں کر سکا جیسے ایک بچہ مسخ شدہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ انسان سے شیطان بن گیا ہے۔

مجرم انسان نہیں، انسان کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور یہ احساس ہی ہمارا سرمایہ ہے، ہماری امید ہے جیسا کہ نوویلس کا کہنا ہے کہ ''جب ہم خواب دیکھتے ہیں کہ ہم خواب دیکھا کرتے ہیں، تو ہم جاگنا شروع کرتے ہیں۔''

مگر وحشی ازم کا کوئی جواز، کوئی بہانہ اس گھناؤنی برائی پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔ جیبی اگرچہ اس سے کم ظالم تھا مگر اُسی کی طرح ضمیر کی خلش سے آزاد تھا۔ اسے جنگی حکمت عملی کے سلسلہ میں جائزہ لینے کے لیے .... اور روس بھیجا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ علاقے خوارزمی سلطنت کے حصے نہیں تھے۔ مگر اس نے شہر جلائے اور جن شہروں نے مزاحمت کی انہیں ان کی آبادی سے محروم کر دیا۔ صحرا سے کیسپیئن کے شمال کی طرف تین مختلف نسلوں پر مشتمل پہاڑی لوگوں کی مشترکہ فوج نے اس پر حملہ کیا۔ ان میں سے ایک گروپ ترک خانہ بدوشوں کا تھا۔ جیبی نے لوٹ مار کا بہت سا مال دے کر انہیں خرید لیا۔ جب وہ دوسرے دو قبائل کو شکست دے چکا تو اس نے رشوت قبول کرنے والے ترک قبیلہ کا پیچھا کر کے انہیں قتل کیا اور جو مال دیا تھا اسے واپس لوٹ لیا۔ بعد میں آٹھ ہزار افراد کی ایک روسی فوج کو آج کے .... کے قریب .... وادی میں شکست دی۔ ایک روسی شہزادہ کسی طرح اپنے قلعہ بند کیمپ پہنچ گیا اس نے اپنے گھر محفوظ واپسی کی یہ بات ہم اس کے جرنیلوں (جن میں اس کے چار بیٹے تھے) کے متعلق نہیں کہہ سکتے جب اس کے بیٹے .... کی کمان میں ایک فوج خراسان کے شہر Nisa کے اندر داخل ہوئی تو شہر کے تمام مکینوں کو شہر سے باہر جانے اور اپنے ہاتھ پیچھے باندھنے کا حکم دیا جس کے بعد منگولوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور ان پر تیر چلا کر انہیں قتل کیا۔ اگر وہ پہاڑیوں میں بکھر جاتے تو شاید بچ جاتے۔ جب Merv پر قبضہ ہوا تمام لوگوں کے سر Toly کے سامنے کاٹے گئے اور اس کے سامنے دو سو تاجروں کو ٹارچر کیا گیا کہ وہ اپنی دولت کا پتہ بتائیں۔ بعد میں .... کو بتایا گیا کہ .... میں مردوں میں لیٹ کر موت سے بچ گئے تھے۔ چنانچہ جب عمر خیام کے وطن نیشا پور کی باری آئی تو اس نے حکم دیا کہ تمام لاشوں کے سر کاٹ کر سروں سے تین مینار بنائے جائیں جن میں ایک مینار بچوں دوسرا عورتوں اور تیسرا مردوں کے سروں کا ہو۔ شاید یہ مریضانہ اذیت رسانی ہے۔

شرائط پیش کیں، منگول مان گئے پھر اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ ممکن نہیں کہ چنگیز خان کے وحشی پن کا شدید ضابطہ اخلاق ان دغابازیوں کی اجازت دیتا۔

منگول سلطنت ایک اور نصف صدی تک قائم رہی۔ چنگیز خان کی موت کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اسے قائم رکھا بلکہ اس کے ٹوٹنے اور بکھرنے میں سو سال لگ گئے۔

چنگیز خان کا بڑا بیٹا جوچی اس کی موت سے چھ ماہ پہلے مر چکا تھا۔ اس کا بیٹا خان منتخب ہوا۔ اس نے گولڈن شہنشاہوں کے ساتھ اپنے باپ کی جنگ جاری رکھی اور جنوب میں برسر اقتدار سنگ شہنشاہ کو اپنا اتحادی بنانے کی کوشش کی جو اپنے جس کے شمالی صوبے گولڈن شہنشاہوں نے اسے سے چھین لیے تھے۔ 1234 میں گولڈن (چین) کمزور ہو چکے تھے۔ منگولوں نے اپنی عادت کے مطابق دھوکہ کیا اور سنگ شاہوں کے خلاف جنگ شروع کر دی۔

جرائم کی صدی

ڈینئل ڈیفو، ڈک ٹرپن اور کارل مارکس جیک دی رپر کے زمانے میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

یہ بیان ان بے مثال سماجی تبدیلیوں کی نشاندہی کرتا ہے جو اس ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں وقوع پذیر ہوئیں۔ ٹرپن لوگوں کا پسندیدہ ہیرو تھا۔ جبکہ رپر سماج دشمن سمجھا جاتا تھا جس سے ہر شخص نفرت کرتا تھا۔ لوگ اس سے اتنے خوفزدہ تھے کہ ایک خاتون صرف یہ خبر سن کر مر گئی کہ رپر نے ابھی ایک قتل کیا ہے۔ ڈیفو کے زمانہ میں جرائم پیشہ افراد قانون کی گرفت سے باہر تھے۔ لیکن لندن کے غریبوں کے دلوں سے دور نہیں تھے۔ چارلس ڈکنز نے 'اولیور ٹوسٹ' میں 'بل سائیکس' کی تصویر اتنی دل کش بنائی تھی کہ اس کی وجہ سے وکٹوریہ عہد کا ایک معمولی چور بھی نیم دیو مالائی اہمیت اختیار کر لیتا تھا۔ مجرم، معاشرہ سے کٹ کر الگ ہو چکا تھا اور معاشرہ اسے ایک ناقابل برداشت اچھوت سمجھتا تھا۔

پھر بھی اٹھارویں صدی کے جرائم کا عذاب وکٹوریائی عہد کے ہر عذاب سے بڑھ کر عذاب تھا۔ 1751 کے موسم گرما میں پورٹر نامی ایک زمیندار نے (جو چیس شائر میں پلفورڈ کے قریب رہتا تھا) فصل کی کٹائی کے لیے چند آئرش مزدور ملازم رکھے۔ اگست کی ایک شام پانچ مزدور گھر کا دروازہ توڑ کر اندر آئے اور زمیندار اور اس کی بیوی کو رسیوں سے باندھ دیا۔ پورٹر کی ایک بیٹی جو باپ کو ٹارچر ہوتے دیکھ رہی تھی۔ بھاگ کر کمرہ میں آئی اور گھٹنے ٹیک کر منت سماجت کرنے لگی کہ اس کے باپ کو چھوڑ دیا جائے۔ اسے بھی باندھ دیا گیا اور گھر کی قیمتی اشیا اور نقدی کا پتہ پوچھا گیا اس نے مزاحمت بے کار سمجھی اور سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ سے چھوٹی تیرہ سالہ بیٹی دبے پاؤں پچھلے دروازہ سے باہر نکلی اور اصطبل سے گھوڑا لے کر گاؤں میں اپنے بھائی کے گھر گئی اور

اسے ڈاکے کی خبر دی۔ بھائی اپنا ایک دوست ساتھ لے کر آیا تو سب سے پہلے انہوں نے اس شخص پر قابو پایا جسے چوروں نے پہرہ پر باہر کھڑا کیا تھا۔ اندر آئے تو ایک چور انہیں دیکھ کر کھڑکی کے راستے بھاگ گیا جبکہ دوسرے کو انہوں نے پکڑ کیا۔ دو چور انہوں نے سٹینلے پل پر جا پکڑے۔ ان کا سرغنہ سٹینلے لیور پول میں ایک جہاز پر پکڑا گیا۔ چاروں کو سزائے موت ہوئی لیکن سب سے کم عمر چور کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی گئی۔ سٹینلے سزا کے موقع پر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ 25 مئی 1752 کو دو دوسرے مجرم کینلی اور مورگن پھانسی لگ گئے، ان کا رویہ اپنے وطن آئرلینڈ کے لوگوں کی طرح جرأت مندانہ رہا۔

اٹھارویں صدی میں اس قسم کی وارداتیں روزمرہ کا معمول بن گئی تھیں۔ فوجی دستوں کی طرح ڈاکو اپنے آپ کو منظم کرتے ہفتوں اس گھر کی نگرانی کی جاتی جسے چوری کے لیے چنا جاتا تا کہ موقعہ آنے پر کسی مداخلت کا امکان نہ رہے۔ کینلی اور مورگن کی مثال سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے وسط میں چوروں نے ٹارچر کے طریقے سیکھ لیے تھے جو انقلاب تک فرانس میں عام ہو گئے تھے۔

کینلی اور مورگن کی سزایابی کے بعد ہنری فیلڈنگ (ناول نگار) نے جو تیرہ برس سے مجسٹریٹ تھا۔ اعلان کیا کہ اگر حکومت اسے چھ سو پاؤنڈ خرچنے کا اختیار دے تو وہ لندن میں بڑھتے ہوئے جرائم کی رفتار روک سکتا ہے۔ سیکرٹری آف سٹیٹ اس پر رضامند ہو گیا۔ فیلڈنگ چونکہ باؤ سٹریٹ میں مجسٹریٹ تھا۔ اس لیے اس کی بنائی ہوئی پولیس 'باؤ سٹریٹ رنرز' کہلائی۔ ان کا کام اتنا تھا کہ وسطی لندن میں گشت کریں۔ اور ان مجرموں پر نظر رکھیں جو اعلانیہ چوریاں کرتے تھے اور موقعہ ملنے پر انہیں گرفتار کریں۔ صرف روک ٹوک کے بجائے اچھے جاسوسی نظام کی ضرورت تھی کیونکہ الزبتھ دور سے لندن کے چور اچکے اپنے آپ کو وسطی دور کے بہادر اور شجاع سمجھنے لگے تھے۔ ملکہ این کے زمانہ میں لندن کا کوتوال ایک بدنام زمانہ شخص چارلس ہچن تھا۔ جو چوری کا سامان لے کر چوروں کو بلیک میل کیا کرتا تھا جب جوناتھن وائلڈ نامی ایک سزایافتہ شخص (جس نے قرض کی وجہ سے جیل میں چار سال گزارے تھے) 1714 میں رہا ہوا تو اس نے ہچن کی مثال سامنے رکھی اور اس کی نقل کرتے ہوئے چوری کے سامان کا مشہور تاجر بن گیا۔ اگر چور گھڑی چراتا تو سیدھا وائلڈ کے پاس آتا اسی طرح گھڑی کا مالک بھی اسی کا رخ کرتا۔ مطلوبہ رقم کی وصولی پر گھڑی مالک کو واپس کی جاتی۔ چور اور وائلڈ منافع آپس میں بانٹ لیتے۔ کوئی شخص رپورٹ درج کرانے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ یہی غنیمت سمجھتا تھا کہ اس کی چیز اسے واپس مل

گئی۔تعاون نہ کرنے پر چوروں کو مار دیا جاتا۔دس برس تک وائلڈ خوشحال سے خوشحال تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ 1725 میں جس سال کیتھرین ہینز جلائی گئی تھی،اسے ایک معمولی جرم یعنی چور کو فرار ہونے میں مدد دینے پر گرفتار کر لیا گیا۔ایک اور معمولی جرم یعنی چور کو سزا دیئے بغیر چوری کا سامان واپس کرنے پر اسے 14 مئی 1725 کو پھانسی دی گئی۔فیلڈنگ نے اپنا پہلا ناول وائلڈ کے متعلق لکھا۔اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ لندن میں جرائم کے جال کو ایسا کوئی بھی شخص توڑ سکتا ہے جو چوروں کو پہچاننے کی زحمت گوارا کرے۔یہی باؤ سٹریٹ رنرز نے کیا۔مجرموں کو ہمیشہ کی طرح گرفتاری کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔اس لیے درجنوں گرفتار ہوئے۔فیلڈنگ کہتا ہے کہ اسے صبح کے اخبار دیکھ کر اور یہ جان کر بے حد خوشی ہوتی ہے کہ ڈاکہ اور قتل کی وارداتیں روز بروز کم ہو رہی ہیں اور بالآخر ختم ہو گئی ہیں۔اس نے حکومت کے 600 پاؤنڈ میں سے صرف آدھے پاؤنڈ خرچ کیے تھے۔

بڑی سڑکوں پر ڈاکہ زنی ختم کرنا بھی اتنا ہی آسان تھا ضرورت اس بات کی تھی کہ جدید پولیس گاڑیوں کی طرح بڑی سڑکوں پر پولیس کی گشت کا کوئی نظام ہو۔اس کمی کو گھوڑوں نے پورا کیا۔مسلح پولیس نے گھوڑوں پر سوار ہو کر لندن کے آس پاس گشت کرنا شروع کی تو چوراچکوں میں ابتری پھیل گئی اور وہ دور دراز علاقوں میں نکل گئے۔اس سے پہلے لندن میں پولیس کا کوئی معقول نظام نہیں تھا۔بہرحال گھڑسوار پولیس کی گشت سے جرائم کی ڈرامائی کمی ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی تھی۔وقت گزرنے کے ساتھ پرانے چوروں کی جگہ نئے چور آئے تو نئے ہتھکنڈے بھی ساتھ لے کر آئے۔معاشرے سے کٹ کر الگ ہو کر جینے کی طرف یہ مجرموں کا پہلا بڑا اقدم تھا۔اب انہیں پرامن شہریوں پر جھپٹنے،انہیں لوٹنے کے لیے نئی عیاریوں سے کام لینا تھا۔جب باؤ سٹریٹ میں فیلڈنگ کے نابینا بھائی،جان نے اس کی جگہ لی تو اسے تمام حکمت عملی نئے سرے سے دہرانا پڑی۔درجنوں ہائی وے راہزنوں (بڑی سڑکوں کے ڈاکو) اور گھر لوٹنے والوں کو پھانسی اور عام چوروں کی پیروی ہوئی ان میں سے بعض جرائم بڑے دلچسپ تھے۔ایک پادری ڈاکٹر ڈوڈ نے 4200 کے ایک بانڈ کے سلسلہ میں جعل سازی کی اور موت کی سزا پائی۔ایک اور پادری جیمز ہکمن نے اس عورت کو ولی ماردی جس پر عاشق تھا۔(وہ ارل آف سینڈوچ کی داشتہ تھی) قتل کا محرک جذبۂ رقابت تھا اور اس کی وجہ سے پھانسی کی سزا پائی سارہ مریڈ ایک بوڑھی عورت پر دو لڑکیوں کے قتل کا الزام تھا۔دونوں لڑکیوں کو سارہ کے پاس اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ انہیں گھر کے کام سکھائے۔سارہ کی تند مزاجی سے تنگ آ کر ایک

لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی تو سارا نے اسے اتنا مارا کہ بچی مر گئی۔ اس کے مرنے کے کی وجہ کوئی بیماری بتائی گئی۔ مقتولہ کی بہن اس لیے قتل کر دی گئی کہ اسے سارہ پر اپنی بہن کے قتل کا شبہ ہو گیا تھا۔ دونوں بہنوں کی لاشیں خراب ہونے لگیں تو سارہ نے ان کے ٹکڑے کیے اور اپنی بیٹی کی مدد سے کہیں چھپا دیں۔ سارہ کی بیٹی روکر نام کے ایک شخص کی محبوبہ بن گئی تو سارہ نے اس کے گھر جا کر جھگڑے کرنے شروع کر دیے۔ بیٹی نے اپنے عاشق کو دونوں بہنوں کے قتل کی تفصیل بتائی تو اس نے پولیس کو اطلاع دی۔ شاید اسے خیال تھا کہ اس کی محبوبہ پر کوئی الزام نہیں آئے گا کیونکہ اس وقت وہ کم عمر تھی۔ مگر وہ غلطی پر تھا۔ دونوں عورتوں کو پھانسی کی سزا ہوئی۔

مگر فیلڈنگ مر گیا تھا اور دوسرا کوئی شخص اس کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ اٹھارویں صدی کی جرم کی لہر بے روک ٹوک جاری رہی۔

صنعتی انقلاب نے حالات بدلنا شروع کر دیئے۔ انہیں کم از کم کام تو ملا جو کام کرنا چاہتے تھے جیسا کہ پائک نے اپنی 'ہسٹری آف کرائم' ان انگلینڈ، (Vol. 2, P 406) میں کہا کہ 'جرائم پیشہ طبقوں اور باقی معاشرہ کے درمیان ایک نئی حل فصال ابھرنا شروع ہو گئی جو اس سے پہلے کہیں نہیں تھی، سڑکیں بہتر ہو گئیں۔ بہتر رابطوں کی وجہ سے چوروں ڈاکوؤں کی گرفتاری کے امکان زیادہ ہو گئے۔ 1805 میں گھوڑوں پر سوار پولیس پھر سڑکوں کی گشت کرنے لگی۔ لندن کے آس پاس دس میل بے وردی افسر شام پانچ بجے سے آدھی رات تک گھوڑوں پر گشت کرنے لگے۔ لندن میں اب بھی کوئی باقاعدہ پولیس پر گشت کرنے لگے۔ لندن میں اب بھی کوئی باقاعدہ پولیس نہیں تھی۔ انگریز سمجھتے تھے کہ پولیس کا کام تمہاری جاسوسی، تمہارے گھروں کی تلاشی اور تمہیں گھسیٹ کر جیل لے جانا ہے۔ چنانچہ جرم کی تفتیش کے طریقے تیر تکے پر منحصر تھے۔ نشانہ پر لگ گیا تو تیر ورنہ تکا۔

1811 میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے ملک کے طول و عرض میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگ مجبور ہو گئے کہ اپنے تالے کنڈیاں لگا کر رہیں۔ واقعہ مشرقی لندن میں ریڈکلف روڈ پر واقعہ ایک گھر میں ہوا۔ اتوار 7 دسمبر 1811 کی ایک رات ٹموتھی مارو کے گھر کوئی شخص دروازہ توڑ کر داخل ہوا اور ٹموتھی، اس کی بیوی، بے بی اور ایک تیرہ سالہ لڑکے کو قتل کر دیا۔ ایک خادمہ جسے کوئی چیز خریدنے بھیجا گیا تھا واپس آئی تو اس نے لاشیں دیکھیں اور لوگوں کو خبر کی۔ ہر شخص قتل کی اس خوفناک واردات سے سراسیمہ ہوا۔ تمام مقتولوں کی کھوپڑیاں کچلی گئی تھیں اور گلے کاٹ دیئے گئے تھے۔ قتل کا مقصد ظاہر ہے کہ لوٹنا تھا۔

بارہ روز بعد کنگ آرمز پبلک ہاؤس میں اجتماعی قتل کی ایک اور واردات ہوئی۔ پبلک ہاؤس ولیمسن اور اس کی بیوی اپنی چودہ سالہ پوتی کٹی سٹلویل کی مدد سے چلا رہے تھے۔ بریجٹ ہیرنگٹن نامی ایک ملازم اور ایک کرایہ دار ٹرنر بھی تھا۔ رات گیارہ بجے پبلک ہاؤس بند ہونے کے بعد ولیمسن نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ براؤن جیکٹ پہنے ایک شخص مشتبہ حالت میں ادھر ادھر ٹہل رہا ہے۔ اگر اسے دیکھے تو گرفتار کر لے۔

کچھ دیر بعد جب کرایہ دار سونے چلا گیا تو اس نے بڑے زور سے دروازہ بند ہوتے سنا۔ اور پھر ہیرنگٹن کی آواز آئی کہ 'ہم سب قتل ہو گئے ہیں' پھر اور چیخیں اور آوازیں۔ ٹرنر نے نیچے جا کر کمرہ میں جھانکا کہ ایک شخص لاش پر جھکا ہے اور اپنی جیبیں کسی چیز سے بھر رہا تھا۔ ٹرنر نے باہر جا کر قتل قتل کا شور مچایا تو آن واحد میں لوگ جمع ہو گئے۔ اندر جا کر دیکھا تو ولیمسن کی لاش زینہ پر پڑی ہوئی تھی۔ اسکا گلا کٹا ہوا تھا۔ اور دائیں ٹانگ میں شاید فریکچر تھا۔ کمرہ میں مسز ولیمسن اور ہیرنگٹن کی لاشیں تھیں۔ دونوں کے سر ہتھوڑے سے کچلے گئے تھے اور دونوں کے گلے ہڈی تک کاٹے ہوئے تھے۔ قاتل پچھلی کھڑکی سے بھاگ گیا تھا۔

واردات کے بعد درجنوں ملاح اور درجنوں براؤں جیکٹوں والے پکڑے گئے۔ ان میں ایک نوجوان ملاح جان ولیمز تھا۔ وہ خوبرو تھا اور شاید اسی لیے اسے غلطی سے ایک ''جنٹلمین'' بھی سمجھا جاتا تھا۔

اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مگر جب ایسے اشتہار بانٹے گئے جن پر قاتل کے ہتھوڑے (آلۂ قتل) کی تصویر بھی تھی تو جان ولیمز کے مالک مکان ورمیلو نے ہتھوڑا پہچان لیا کہ یہ سویڈش ملاح جان پیٹرسن کا تھا کہ واردات کے وقت وہ اس علاقہ میں موجود نہیں تھا۔ مگر اس کے تمام آلات ورمیلو کی تحویل میں تھے۔

جان ولیمز اب مشتبہ نمبر ایک تھا۔ وہی تھا کہ جو کنگز آرم کے پاس پاس واردات کی شام ٹہلتا تھا۔ سحری کے وقت وہ اپنی رہائش پر واپس آیا اور اس کی قمیض خون میں رنگی ہوئی تھی۔ کمرے میں مقیم ولیمز کے ساتھیوں نے بتایا کہ قتل کی رات ولیمز کی جیبیں خالی تھیں مگر اگلی صبح بھری ہوئی تھیں۔

ولیمز نے 28 دسمبر 1811 کو جیل میں خودکشی کر لی۔ تفتیش کرنے والوں نے اعلان کیا کہ دونوں خاندانوں کا قاتل ایک ہی شخص ہے جبکہ دو مختلف آدمیوں کے پاؤں کے نشانوں کی موجودگی میں یہ فیصلہ متنازع تھا۔ ولیمز کے دل میں ایک نوکدار چھڑی دے کر اسے

مشرقی لندن میں دفن کر دیا گیا۔ وہم پرستوں کو یقین تھا کہ خودکشی کرنے والوں کی روحیں بگڑ کر عفریت بن جاتی ہیں۔

ریڈکلف شاہراہ پر ہونے والی ہلاکتوں کی کہانی اتنی دلچسپ نہیں جتنی کہ خوفناک ہے۔ برطانیہ کی تاریخ، غالباً یورپ کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی قتل کی واردات سے لوگوں میں اتنا خوف و ہراس پھیلا ہو۔ شاید اس لیے کہ عام خیال کے مطابق واردات کا مرتکب ایک شخص تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں وارداتوں میں خونریزی کا ارتکاب دو افراد بلکہ شاید کسی گینگ نے کیا تھا۔ ٹموتھی مار کے قریب رہنے والے ایک گواہ نے کئی افراد کے بھاگنے کی آواز سنی تھی۔ اگر اس کی گواہی سچ مان لی جاتی تو شاید اتنا خوف نہ پھیلتا کیونکہ 1811 میں بھی لوگوں کو ڈاکوؤں کے گینگ یاد تھے۔ خوف کی اصل وجہ قاتل کا اکیلا ہونا تھا۔ اس کی دہشت تھی کہ اس نے تن تنہا اتنے قتل کیے! کیا وہ کوئی آدم خور تھا جو انسانی خون کی تلاش میں لندن کی دیواروں سے سر ٹکراتا پھرتا تھا۔ جیک دی ریپر نے اپنے بھیانک خواب کو حقیقت کی شکل 77 برس کے بعد دی مگر 1811 میں 'اکیلا مجرم' ابھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔

آئندہ دو عشروں میں اور واقعات نے پبلک کے خوف اور دلچسپی میں مزید اضافہ کر دیا۔ پہلا موقعہ ایک کھلاڑی اور جواری ولیم ویئر کا قتل تھا۔ جو دو کھلاڑیوں جان تھرٹل اور جوزف ہنٹ نے کیا۔ تھرٹل اپنے مضبوط جسم و جان کے ساتھ ریس اور باکسنگ کے میدانوں میں جانا پہچانا تھا۔ وہ ہٹر نے بلیئرڈ کھیلتے ہوئے اس سے اچھی خاصی رقم جیتی تھی۔ اور تھرٹل کو شک تھا کہ اس نے بے ایمانی کی ہے۔ غرضیکہ ویئر کو ولیم رابرٹ کے گھر دعوت پر بلایا گیا۔ چاروں لندن سے ایک بگھی میں روانہ ہوئے اور جب رکے تو تھرٹل نے ویئر کے چہرہ کو گولی کا نشانہ بنایا۔ ویئر نے منت سماجت کر کے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ مگر تھرٹل نے اسے زمین پر گرا کر اس کا گلا چاقو سے کاٹ دیا اور اس زور سے پستول ویئر کے سر پر مارا کہ پستول کی نالی سر توڑ کر اندر چلی گئی۔ انہوں نے لاش تالاب میں پھینکی اور رابرٹ کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے۔ اگلی صبح تھرٹل اور ہنٹ پستول اور چاقوں کی تلاش میں جائے واردات پر گئے مگر کامیاب نہ ہوئے۔ اتنے میں دو مزدوروں کو ان کے ہتھیار مل گئے۔ انہوں نے 'باؤ سٹریٹ رنرز' کو اطلاع دی۔ رنرز کو لاش کسی اور تالاب سے ملی۔ شاید اس کی جگہ بدل لی گئی تھی۔ رابرٹ نے سلطانی گواہ بننے میں دیر نہیں کی۔ تھرٹل کو پھانسی اور ہنٹ کو عمر قید کی سزا ملی۔

ان عام قسم کی ہلاکتوں سے اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ انہیں ڈرامائی شکل میں لوگوں کے

سامنے پیش کیا گیا۔

مگر یہ دلچسپی کیوں پیدا ہوئی، شاید اس لیے کہ تھرٹل مشہور کھلاڑی تھا یا یہ کہ تشدد و جرم کی نوعیت اتنی شدید تھی کہ جرم کے خلاف لوگوں میں اور نفرت پیدا ہوئی۔ کیونکہ اسے وہ خدا اور انسان کے قانون کی صریح خلاف ورزی سمجھتے تھے۔ پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ سوسائٹی تیزی سے بدل رہی تھی۔ اگر یہ قتل ڈیفو کے زمانہ میں ہوتے تو اس وقت کے معمول میں ایک سرسری سا اضافہ سمجھے جاتے۔ مگر 1823 میں حالات مختلف تھے۔ پائیک کہتا ہے۔'' 1820 کے آغاز میں جب جارج سوئم فوت ہوا، تو برطانیہ نہایت دولت مند اور کئی لحاظ سے یورپ کا سب سے مہذب ملک تھا۔ بگھیاں تمام بڑی سڑکوں پر چلتی تھیں۔ سڑکیں اتنی اچھی تھیں کہ ان کا موازنہ اس تعمیری مہارت سے کیا جا سکتا تھا جو ہمیں رومنوں سے ورثہ میں ملی تھی۔ نہریں ملک بھر میں موجود تھیں اور یہ تمام تبدیلیاں جرائم کو روکنے کے لیے تھیں۔ ہسٹری آف کرائم ان انگلینڈ Vol2, (P407

دراصل جرائم کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ میجر آرتھر گرفتھ نے 'مسٹریز آف دی پولیس اینڈ کرائم' میں لکھا کہ 1828 میں 822 افراد میں سے صرف ایک فرد مجرم ہوتا تھا۔ اکثر جرائم غربت، فیکٹری مزدوروں کی نیم فاقہ کشی اور کھیت مزدوروں کی بے روزگاری کا نتیجہ تھے۔ جان ولیمز اور جان تھرٹل کے جرائم پر لوگ اس لیے حیران تھے کہ ان کی وجہ مایوسی نہیں تھی۔ بلکہ ان کا مقصد اپنا مفاد تھا۔ کیلی گلا کی طرح وہ انانیت اور خود پرستی کے مظاہر تھے۔ انفرادی ضمیر کا عہد انفرادی جرم میں بدل رہا تھا۔

ولیمز اور شاید اس کے ایک ساتھی نے ڈاکہ ڈالنے کے دوران قتل کیا تھا۔ گزشتہ صدی میں ایسے سینکڑوں قتل ہوئے تھے۔ تھرٹل نے غنڈہ گردی کے نشہ میں قتل کیا تھا۔ مگر لوگ انہیں جن بھوت یا دیو ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ایک ایسے دور میں جب معاشرہ روز بروز خوشحال ہو رہا تھا۔ روز بروز سائنس اور صنعتی ترقی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ مریضانہ ذہنیت نہ جانے کیوں پیدا ہوگئی تھی۔

درصال یہ دو بالکل مختلف قسم کی تنہائیوں کا مسئلہ تھا۔ ایک تنہائی نئی صنعتی دنیا کی بے کیفی تھی دوسری تنہائی ناول کی وجہ سے تھی جو زوال پذیر ہو کر جنوں پریوں کی کہانی بن گیا تھا۔ حقیقت کے ساتھی ناول کا رشتہ برائے نام رہ گیا تھا۔ ہوریس ولپول کا 'کیسل آف ارینٹو' 1765 میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت سے لکھاریوں میں یہ کشمکش شروع ہوگئی تھی کہ کون سب سے زیادہ وحشت

خیز اور پراسرار کہانی لکھ سکت اہے۔1795 میں ریڈ کلف کی ' Mysteries of Uddpho' نے میدان جیت لیا۔ایک سال بعد میتھیو گریگری لیوس کی 'The Monk' اس سے بھی بازی لے گئی اس میں قتل اور بھوتوں جنوں سے لے کر ریپ تک سب کچھ تھا۔ پراسرار کہانی کسی پرانے قلعہ میں شروع ہوتی جس میں رومان خوف دہشت جادو اور ظلم وستم کے واقعات کی بھرمار ہوتی۔'فرینکنسٹائن' اور 'ڈراکولا' جیسی ہالی ووڈ کی فلموں نے بعد میں یہ میڈیم اپنا لیا اور اس میں سبقت حاصل کی۔1820 میں چارلس میتھورین نے اپنی ' Mehmoth the Wonderer' پروڈیوس کی۔جس نے 'ڈکشنری آف لٹریری بائیوگرافی' کے مطابق خوف، دہشت اور اسرار کی پہلی مثالیں پیچھے چھوڑ دیں۔1840 تک یہ کہانیاں اتنی مقبول ہو گئیں کہ ناشران کے ہفتہ وار ایڈیشن شائع کرنے لگے۔اس میں فیکٹریوں کے اندر دس بارہ گھنٹے کام کرنے کی تھکن اور بوریت بھی شامل ہوگئی۔ جس کی وجہ سے ولیم وریئر کے قتل نے ایسی مریضانہ اہمیت حاصل کی کہ قتل کے اصلی حقائق نظر انداز ہو گئے۔ دنیا نے حقیقت سے منہ موڑ لیا۔ڈیفو نے لکھا تھا کہ وسط انیسویں صدی کے داستان گو اور لکھاری کو جرم وستم کی ہر کہانی ایک ہی سانس میں بڑے والہانہ تسلسل کے ساتھ بیان کرنا ہوتی تھی کہ وہ لوگ مرعوب ومتاثر ہوں جو ہر روز ظلم وشقاقت کی تازہ خبر پر پلتے تھے۔

اس قسم کے واقعات نے برطانوی پبلک کو ایک حقیقی پولیس فورس کی ضرورت کا احساس دلا دیا۔ پبلک میں سب سے زیادہ یہ احساس پیدا کرنے کا باعث ڈینیرا میں لاشوں کے تاجر برک اور ہیئر کا مقدمہ تھا۔ یہ دونوں آئرش مزدور 1826 میں ملے اور ایڈنبرا کے Beggars میں اپنی بیویوں کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ جب ہیئر کا مالک فوت ہوا تو اس نے کسی طرح ہوٹل پر قبضہ کر لیا۔ ہوٹل کا ایک مہمان اولڈ ڈونلڈ فوت ہوا تو اس کے ذمہ کرائے کی کچھ رقم بھی تھی۔ ہیئر نے کرایہ وصول کرنے کا یہ طریقہ سوچا کہ مالک کی لاش میڈیکل سکول کے پاس بیچ دے۔ڈاکٹر نوکس (10 سرجن سکوئیر) نے ہیئر کو سات پونڈ دس شلنگ لاش کا معاوضہ دیا۔ جو کرایہ کی رقم سے دگنا تھا۔اب ہیئر اور برک نے سوچا کہ اگر لاشیں میسر ہوں تو روزی کمانے کا یہ آسان طریقہ ہے۔مگر قبرستانوں میں اکثر پہرے لگے رہتے تھے کہ کوئی لاشیں نہ چرائے اس کا حل انہیں یہ سوجھا کہ لاشیں چرانے کے بجائے بنائیں جائیں اور قبرستان کا رخ کرنے سے پہلے بیچ دی جائیں۔ جب ایک مہمان جو دی ممپر بیمار ہوا۔تو برک اور ہیئر نے اسے جلدی مارنے کی کوشش میں اس کے چہرے پر تکیہ رکھ کر دبایا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔انہوں نے لاش دس پونڈ میں بیچی اور فیصلہ کر لیا کہ یہ

نیا پیشہ مزدوری سے بدر جہا بہتر ہے۔

فروری 1928 میں ایک سیلانی خاتون ایبگل سمپسن کو گھیر کر ہوٹل لایا گیا اور خوب شراب پلائی گئی۔ پہلا موقعہ تھا اس لیے ہیئر اور برگ گھبرا رہے تھے۔ اگلی صبح بھی وہ زندہ تھی اس لیے انہوں نے اسے اور شراب پلائی برک نے اس کی لاتیں پکڑیں اور ہیر نے گلا دبایا۔ یہ لاش بھی دس پونڈ میں بک گئی۔ آٹھ مہینوں میں انہوں نے گیارہ لاشیں اسی طرح 'بنائیں' اور بیچیں۔ بعض تو کبھی پہچانی نہیں گئی جیسے ایک آئرش بھکارن اور اس کا گونگا پوتا، جس کی کمر برک نے اپنے گھٹنے کے زور سے توڑی اور بھکارن کا گلا گھونٹ دیا۔ جب ایک نوجوان خوب صورت لڑکی میری پیٹرسن کی لاش ڈاکٹر نوکس کو بیچی گئی تو اس کے دل میں شک پیدا ہوا اس لیے بھی کہ ایک طالب علم نے میری پیٹرسن کی لاش پہچان لی تھی۔ ڈاکٹر کا شک یقین میں بدل گیا جب ہیئر اور برک نے ایک جانی پہچانی لڑکی ڈیفٹ جیمی کی لاش اسے بیچی مگر وہ خاموش رہا۔

برک اور ہیئر کا راز لاپرواہی سے افشا ہوا انہوں نے ایک بیوہ ڈوچرٹی کی لاش کمرے میں رکھی اور کہیں چلے گئے۔ دو مہمانوں نے لاش دیکھ لی۔ جب وہ پولیس کے پاس جا رہے تھے تو راستہ میں برک کی بیوی ملی جس نے ان کے چہروں سے کسی خرابی کا اندازہ کر لیا اور گھٹنے ٹیک کر خاموش رہنے کی درخواست کی وہسکی کے گلاسوں پر دونوں کرایہ دار مان گئے مگر پھر بھی پولیس کو اطلاع کر دی۔ گھر کی تلاشی سے خون آلود کپڑے برآمد ہوئے۔ ہیئر جلدی سے سرکاری گواہ بن کر بچ گیا۔ برک کو موت کی سزا ہوئی اور جنوری 1829 میں پھانسی لگ گیا۔ ہیئر ایڈن برا سے چلا گیا اور لندن میں جا کر اندھے بھکاری کی موت مرا۔

برطانیہ میں جرائم کی تاریخ کا یہ سب سے گھناؤنا مقدمہ تھا اور برطانوی پبلک کے لیے حد سے زیادہ خوفناک تھا۔ کیونکہ انہیں حسین لڑکیوں کے ریپ کی کہانیوں کی عادت تھی۔ اس لیے ہیئر اور برک کی کہانی کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو ریپ کی کہانیوں کو حاصل تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے برطانوی عوام کو پولیس فورس کے قیام پر آمادہ کر لیا۔ جو سر رابرٹ پیل کی قیادت میں ستمبر 1829 میں قائم ہوئی نئی پولیس کو خاموشی 'احترام' فرض شناسی، خوش خلقی اور اپنے اصولوں پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا۔ پولیس نے ان ہدایات پر حرف بحرف عمل کیا۔ جس کی وجہ سے اسے لوگوں کا اعتماد حاصل ہوا۔

مگر اس میں کچھ وقت لگا۔ ابتدا میں باوردی پولیس اپنی وردی میں ''سرکاری'' لگتی تھی جس کی وجہ سے انگلستان کے بڑے شہروں خصوصاً ان کے گلی کوچوں میں پولیس کے خلاف نفرت

پیدا ہوگئی تھی جون 1830 میں پولیس کانسٹیبل گنتھم نے دو شرابیوں کو آپس میں لڑتے دیکھا جب انہیں چھڑانے کے لیے وہ ان کی طرف بڑھا تو اسے زمین پر گرا کر اس کے منہ پر اس زور سے بھاری بوٹوں کے ساتھ ٹھڈے مارے گئے کہ وہ مر گیا۔ پہلا پولیس مین تھا جو اپنا فرض ادا کرتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے قاتل فرار ہو گئے اور کبھی گرفتار ہوئے۔ چھ ہفتوں بعد ایک پولیس مین جان لانگ کو شبہ ہوا کہ لندن میں گرے ان روڈ پر تین افراد چوری کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اس نے انہیں ٹوکا تو ان میں سے دو افراد نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور تیسرے نے اس کی چھاتی پر چاقو سے وار کیے۔ شور وغل ہوا تو ایک اور پولیس مین نے ایک بھاگتے ہوئے شخص کو پکڑ لیا۔ وہ جان سمتھ نامی ایک بیکر تھا جس کی ایک بیوی اور چھ بچے تھے۔ جو کہہ رہا تھا کہ اس نے 'ٹھہر جا چور' کی آواز سنی اور لوگوں کے ساتھ تعاقب میں شامل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ بے قصور تھا مگر شروع میں پولیس ایک بے قصور شخص کو پھانسی دینا بہتر سمجھتی تھی بجائے اس کے کہ کسی کو پھانسی نہ دے۔

1833 میں ایک پولیس مین کے قتل سے ظاہر ہوا کہ حکومت کے بارے میں انگریزوں کا رویہ مبہم اور ناقابل فہم ہے۔ ایک نیم انقلابی گروپ 'نیشنل پولیٹیکل یونین' نے 'کولڈ باتھ فیلڈز' میں ایک جلسہ کی دعوت دی جسے پولیس کمشنر نے فوراً خلاف قانون قرار دیا اور پابندی لگا دی۔ پابندی توڑ کر ایک ہجوم لاؤڈ سپیکر کے گرد جمع ہوا۔ آٹھ سو پولیس والے اور فوجی سپاہی امن قائم رکھنے پر مامور تھے۔ پولیس کے ایک جاسوس نے بغاوت کی خبر دی۔ پولیس انچارج نے پولیس کو ہجوم کی طرف بڑھنے کے لیے کہا۔ ہجوم نے جواب میں پولیس پر پتھر برسانے شروع کر دیے۔ پولیس نے غضبناک ہو کر بوڑھوں عورتوں بچوں سمیت سب کو مارنا شروع کر دیا۔ جونہی ایک پولیس مین رابرٹ کلے ان کا جھنڈا چھیننے لگا ایک شخص نے اس کے سینہ میں خنجر اتار دیا۔ رابرٹ چند قدم لڑکھڑایا اور گر کر مر گیا۔

موت کی تحقیقات پر مامور جج کو ظاہر ہے کہ پولیس سے ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی اس خیال سے کہ پولیس کو تقریر کی آزادی سلب کرنے کا حق حاصل نہیں جب جج نے جیوری کے ممبروں کو فیصلہ سنایا تو وہ اس پر متفق نہ ہو سکے۔ جج نے کہا کہ متفق ہونے تک تمام ممبر کھائے پیے بغیر عدالت میں موجود رہیں۔ جس پر جیوری نے (جو معزز تاجروں پر مشتمل تھی) کسی گمنام شخص کے خلاف قابل جواز ارادۂ قتل کا فیصلہ دیا۔ پولیس اور پبلک کے درمیان اشتعال انگیزی بڑھ گئی لیکن انگریزوں کو ہمیشہ کے لیے اپنی رائے دینے کی آزادی مل گئی۔

فرانس میں صورت حال اور بھی ناقابل فہم تھی۔ لوئیس XIV کے دنوں سے ان کی

سرکاری پولیس موجود تھی۔ ہر پولیس مین سمجھتا تھا کہ وہ خود بادشاہ یا اس کا نمائندہ ہے۔ جو چاہے کہہ سکتا ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ انقلاب فرانس کی صورت ظاہر ہوا مگر بچوں کی قربانی اور اجتماعی زہر خورانی کے واقعات سے ثابت ہو گیا کہ فرانسیسیوں کو انگریزوں سے بہت پہلے پولیس کی ضرورت تھی۔ فرانس میں چیف آف پولیس کو اخبارات سنسر کرنے اور صحافیوں کو گرفتار کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔

جرائم کی روک تھام کے لیے فرانسیسی جاسوسی نظام پر توجہ دیتے تھے۔ انہوں نے جاسوسی کا جال ملک بھر میں پھیلا رکھا تھا۔ پولیس کے وزیر ایم ڈی سارٹینز نے ایک بار اپنے ایک دوست کو چیلنج کیا کہ پولیس کے علم بغیر کوئی شخص شہر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کا دوست جج ایک مہینہ بعد خفیہ میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ لیکن چند گھنٹوں کے اندر اسے سارٹینز کے ساتھ کھانا کھانے کا دعوت نامہ مل گیا۔ ایک دفعہ وائنا کی پولیس نے درخواست کی کہ آسٹریا کے ایک مشہور لٹیرے کو پیرس میں تلاش کیا جائے۔ سارٹینز نے جواب دیا کہ لٹیرا ابھی وائنا میں ہے۔ اس کا پتہ بتایا اور وائنا کی پولیس نے ٹھیک اس پتہ پر جا کر ملزم گرفتار کر لیا۔

فرانس کی انڈر ورلڈ (قمار بازی و شراب کے اڈے، قحبہ خانے وغیرہ) بھی اتنی منظم تھی کہ انگریز اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جب لوئیس XVI نے میرانٹونیو سے شادی کی تو بدمعاشوں نے رات کی تاریکی میں موٹی رسیاں اس طرح باندھ دیں کہ مہمان بڑی تعداد میں ان سے الجھ کر گر پڑے۔ اڑھائی ہزار افراد پاؤں تلے کچل کر مر گئے۔ جیب تراشوں نے لاشوں کی جیبیں کاٹنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اگلے دن سارٹینز کے جوانوں نے مشہور مجرموں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارے اور سینکڑوں افراد گرفتار کیے۔ یہ کام انہوں نے اس تیزی سے کیا کہ انہیں مسروقہ مال برآمد کرنے میں کوئی دوق پیش نہیں آئی۔ یہ اس منحوس شادی کا آغاز تھا جو قتل گاہ میں ختم ہوئی۔

1798 کے انقلاب بعد پولیس منتشر کر دی گئی جسے روبسپیری نے پھر منظم کیا۔ جو اپنے دشمنوں کی سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ نپولین نے جوزف فوچ کو اپنا پولیس منسٹر مقرر کیا اور فوچ کے جاسوسی نیٹ ورک نے مہارت میں سارٹینز کے نیٹ ورک کو بھی مات کر دیا۔

فوچ کے ماتحت پیرس کا پولیس چیف ایم ہنری تھا۔ **1809** میں ایک روز مضبوط جسم کا ایک نوجوان یوجین فرانکوئس وڈوک اس سے ملنا آیا اور معافی کے عوض بعض مجرموں کے متعلق ضروری اطلاعات مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ وڈوک کا رویہ ہنری کے ساتھ بالکل بے تکلفانہ تھا۔ وڈوک نے پرفطر زندگی بسر کی تھی۔ اس کی تند مزاجی اور حسین عورتوں کی محبت نے اسے اکثر

برے دن دکھائے تھے۔ وہ سمگلر رہ چکا تھا۔ جیل سے بھاگ چکا تھا اب وہ ایک خاموش پرسکون زندگی چاہتا تھا۔ ہنری نے دیکھ لیا کہ وڈوک بے بس ہو چکا ہے۔ وہ اسے اور بے بس کرنا چاہتا تھا کہ اس سے جو کام چاہے لے سکے۔ اس لیے اس نے انکار کیا اور وڈوک کو ناکام جانے دیا۔

جو بات وڈوک نے ہنری کو نہیں بتای وہ اب اس کا جعل سازوں کے گروہ میں شامل ہونا تھا۔ انہوں نے پولیس کو اس کی اطلاع دی پولیس اسے گرفتار کرنے اس وقت گئی جب ابھی وہ بستر میں تھا۔ اسے تقریباً برہنہ حالت میں چھت سے گرفتار کیا گیا۔ ہنری نے اسے گرفتار دیکھا تو بہت خوش ہوا کہ اب وہ یقیناً مجبور اور بے بس ہو گیا ہے۔ اب ہنری اس سے اپنی شرائط پر بات کر سکتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ وڈوک پولیس کا جاسوس بنے اور اپنے ساتھیوں سے غداری کرے۔ بہت مشکل کام تھا مگر وڈوک کے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اسے جاسوسی پر مامور کر کے لافورس جیل لے جایا گیا۔ یہ خطرناک کام تھا مگر اس کی آزادی کا انحصار اس کام کو اچھی طرح کرنے پر تھا اور اس نے یہ کام اتنی اچھی طرح کیا کہ ہنری نے اسے پولیس ایجنٹ کے طور پر رہا کرنے کا فیصلہ کیا۔ وڈوک کی تبدیلی کسی اور جیل میں کرنے کے لیے اسے زنجیریں پہنائی گئیں اور راستہ میں اسے بھاگ جانے دیا گیا۔ اس واقعہ نے اسے پیرس کی انڈر ورلڈ کا ہیرو بنا دیا۔ اس کا پہلا کام ایک جعل ساز واٹرین کا پتہ لگانا تھا۔ جو جیل سے بھاگا اور بالکل غائب ہو گیا۔ کہیں سے پتہ چلا کہ واٹرین کا کچھ سامان ایک کمرہ میں پڑا ہے۔ وڈوک نے اس کے آنے کا انتظار کیا اور آتے ہی اسے دبوچ لیا اور ہنری کے پاس لے آیا اسے بہت بڑا انعام ملا۔ جبکہ واٹرین اور ایک دوسرے مجر باؤسین (جس نے وڈوک کے خلاف جاسوسی کی تھی) کو سزائے موت دی گئی۔ اسے بھی وڈوک کی اطلاع پر گرفتار کیا گیا تھا۔

آئندہ چند برسوں میں وڈوک ہیپرس کا سب سے لائق، فرض شناس اور باعزم پولیس ایجنٹ ثابت ہوا۔

اس کی کامیابی نے پولیس حلقوں میں اس کے دشمن پیدا کر دیئے۔ ہنری اچھی طرح جانتا تھا کہ وڈوک کو اپنی زندگی کا یہ نیا دور بہت عزیز ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پولیس کی صفوں میں باہمی رقابت اور حسد پیرس کے امن کو تہ و بالا کر سکتا ہے۔ شہر کے ہر حصہ میں پولیس سٹیشن موجود تھے۔ نگران کے مابین تعاون برائے نام تھا۔ وڈوک نے جب ایک مختصر مگر اعلیٰ تربیت یافتہ پولیس دستہ قائم کرنے کا مشورہ دیا جو ہر ہنگامی صورت حال سے نمٹنے آناً فاناً شہر کے ہر حصہ میں پہنچ جائے تو ہنری نے اس پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی۔ وڈوک کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی پسند کے چار افراد

اپنے دستہ کے لیے چن لے۔تو اس نے چار مرم اپنی مدد کے لیے منتخب کیے۔ پولیس کے اکثر افراد نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ مگر ہنری نے پرواہ نہ کی۔ پولیس کا یہ مختصر طوفانی دستہ آج کی فرانسیسی قومی پولیس فورس کی بنیاد بنا۔

1833 میں وڈوک بزور ریٹائر کر دیا گیا۔ نئے پولیس چیف نے اعتراض کیا کہ تمام طوفانی دستہ مجرموں اور سابق مجرموں پر مشتمل ہے۔ وڈوک فوراً پرائیویٹ سراغ رساں بن گیا۔ وہ دنیا کا پہلا پرائیویٹ سراغ رساں تھا۔ اس نے اپنی آپ بیتی لکھی۔ بالزاک سمیت وہ اکثر لکھاریوں کا قریبی دوست تھا۔ بالزاک نے وڈوک کی مثال سامنے رکھ کر اپنا مشہور کردار ووٹرین تخلیق کیا تھا۔

وڈوک کی آپ بیتی کا عجیب پہلو یہ ہے۔ کہ اس کے تمام جرائم بلا تشدد ہیں۔ یہ نہیں کہ مجرموں کو تشدد اور قتل کرنا نہیں آتا بلکہ اس لیے کہ اکثر جرائم میں سماج سے نفرت کا شائبہ نہیں۔ نہ سماج سے نفرت ان کی بنیاد ہے اور یہی بات جدید مجرموں کے لیے وجہ امتیاز ہے۔ تشدد کے زور پر چوری اور ڈاکہ زنی محض ایک پیشہ تھا جسے ان لوگوں نے اپنایا جنہیں شراب اور عورت کا بہت شوق تھا کئی ڈاکوؤں نے قسم کھائی تھی کہ جیل سے باہر آنے کے بعد وہ وڈوک کو زندہ نہیں چھوڑیں گے مگر کسی نے اس پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ مخبر کی حیثیت سے ابتدائی دنوں میں وڈوک نے دو مجرموں سے ملاقات کی جنہیں وہ جیل کے دنوں سے جانتا تھا۔ گھنٹوں وہ ان کے ساتھ شراب پیتا رہا۔ پھر ان کے ساتھ مل کر ایک ڈاکہ ڈالنے کا وعدہ کیا۔ جس میں دو بوڑھوں کے گلے کاٹنے کا پروگرام بھی شامل تھا۔ موقعہ ملتے ہی وڈوک نے ہنری کو اس پروگرام کی خبر دے دی۔ ڈاکو باغ کی دیوار کود کر اندر گئے تو پولیس ان کی منتظر تھی اسی دوران کسی نے گولی چلائی اور وڈوک گولی لگنے کا بہانہ کر کے زمین پر گر گیا۔ اس کا ایک ساتھی اس کے غم میں ہلکان اس پر گرنے کو تھا کہ اسے تھام لیا گیا۔ ڈبلیو ایس گلبرٹ نے سچ کہا تھا کہ 'مجرم اگر جرم کرنے میں مصروف نہ ہو تو وہ عام آدمی کی طرح جذباتی اور انسان دوست ہوتا ہے' وڈوک کا معمول تھا کہ وہ کبھی ان مجرموں کو سمجھنے کی کوشش کرتا جو اس کے ذریعہ پھانسی کے تختہ پر جاتے تھے یا عمر قید کی سزا پاتے تھے۔ وہ ان کے معمول کے کام بھی کرتا تھا جیسے ان کے خاندان کو ان کے پیغام پہنچانا اور خاندان کی خیرت وغیرہ معلوم کرنا ان کے ساتھ اس کے تعلقات میں قربت تھی اور گرمجوشی تھی۔ اس نے یہ عادت بنالی تھی کہ جب دوسری جیل میں بھیجنے کے لیے لوگوں کو اکٹھے ہتھکڑیاں بیڑیاں لگائی جاتیں تو وہ قریب جا کر دیکھتا رہتا۔ پہلی دفعہ جب اس نے ایسا کیا تو وہ اس پر جنگلی درندوں کی

طرح جھپٹے اسے اور قریب آنے کو کہا۔ وڈوک نے بالکل یہ کیا جبکہ سلاخوں کے پیچھے سے دوسرے قیدی انہیں وڈوک کے قتل پر ابھارتے رہے مگر کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ اس کی بہادری کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وڈوک سزا یافتہ مجرموں کے پیغام ان کی بیوی بچوں اور محبوباؤں کو دیتا اور ان کی پھانسی سے پہلے ان سے اچھے دوستوں کی طرح جدا ہوتا تھا۔ سوشلسٹ سچ کہتے ہیں کہ ''جرم سماجی حالات کی پیداوار ہے'' مگر سماج کے دشمن مجرم کا ظہور ابھی نہیں ہوا تھا۔

لیکن آخر وہ ظاہر ہو کر رہا۔ **1834** میں وڈوک کی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پی ایف لاسینئر کے نام سے ایک بوڑھی اور اس کا بیٹا قتل ہوئے۔ چند ہفتوں بعد ایک بنک قاصد کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ جسے ایم موسیئر کے گھر سے روپیہ لانے بھیجا گیا تھا۔ سخت زخمی ہونے کے باوجود وہ چلایا جس سے دو حملہ آور بھاگ گئے۔ اس نے وڈوک کے قائم مقام کینلر کو موسیئر کا حلیہ بتایا تو پتہ چلا کہ موسیئر دراصل لاسینئر تھا۔ جس نے اپنے کئی نام رکھے تھے۔ اس کے دو ساتھی جو گرفتار ہوئے انہوں نے جرم کا اعتراف کیا۔ آخر لیسینئر ایک جعلی چیک کے سلسلہ میں خود گرفتار ہوا۔ اس بات سے برہم ہو کر کہ اس کے ساتھیوں نے اس سے غداری کی اس نے بھی بوڑھی عورت اور اس کے بیٹے کے قتل سے بنک قاصد پر حملہ تک تمام جرائم کا کھل کر اعتراف کیا اور ایک سیلبرٹی (نامور شخصیت) کا درجہ پایا۔ ایک اوسط مجرم کی نسبت لیسنر، بہت زیادہ ذہین اور تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے شاعری کی تراجیوں کا ادب پڑھا اور اپنے آپ کو ایک باغی اچھوت اور ٹھکرایا ہوا انسان سمجھا۔

لینیسئر کی 'آپ بیتی' ہمیں ایک ایسی کہانی سناتی ہے جو آج بہت عام ہے۔ مگر ان دنوں بے مثال تھی۔ ایک بہت حساس بچہ جو اس لیے حسد کا شکار ہوا کہ والدین اپنے بڑے بچہ کو زیادہ توجہ دیتے تھے اسی لیے اس میں گہری نفرت اور خود رحمی پیدا ہوئی۔ 'بچپن ہی سے ناانصافی کا شکار، میں نے زندگی کا ایک ایسا تصور اپنایا جو دوسرے لوگوں کے تصور سے الگ تھا' اس نے چوری کی کہ توجہ حاصل ہو مگر والدین اور غضبناک ہو گئے۔ بنک میں بوریت اور بیزاری کے دو سال گزارنے کے بعد وہ پیرس آ گیا اور قلم کی مدد سے زندہ رہنے کی کوشش کی مگر دیکھا کہ ناممکن ہے تو فوج میں شامل ہو گیا۔ وہاں دل نہیں لگا تو فوج سے بھاگ گیا۔ پھر جعل سازی پر اتر آیا۔ اٹلی میں اسے پتہ چلا کہ ہوٹل میں اس کے ایک ساتھی مہمان نے پولیس کو اس کے مفرور ہونے کی اطلاع دی ہے۔ لیسنئر نے اسے جنگل میں سیر کی دعوت دی۔ وہاں لے جا کر اسے ڈوئیل (مقابلہ) لڑنے کے لیے کہا۔ جب اس نے انکار کیا تو لیسینئر نے اسے سر میں گولی مار دی۔ فوج میں دوبارہ اس کا جانا

ذلت پر ختم ہوا۔ جب وہ تھک کر مایوس ہونے لگا تو اس کی خود رحمی نے اس سے کہا کہ تمہاری بربادی کا ذمہ دار کوئی اور ہے۔ وہ 'کوئی اور' سوسائٹی تھی۔ اس کا استدلالی بھی کارل پینزرم جیسا تھا مگر کارل پینزرم ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسے پچاس برس بعد پیدا ہونا تھا۔ پینزرم کی طرح وہ بھی سمجھتا تھا کہ اپنی ناکامیوں اور خامیوں کا الزام دوسروں کو دینا چاہیے۔ بعض لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ ''تمہیں کیا شکایت ہے؟ فرانس میں جعل ساز، اٹلی میں قاتل' پیرس میں چور، سوسائٹی کے خلاف برے عزائم، کیا بھلائی پر تمہارا حق تھا؟'' ہاں، کیونکہ میں نے سوچا تھا کہ میرے باپ کی دولت سب کچھ لوٹانے کے لیے بہت ہے۔ اٹلی میں قاتل؟ ہاں، کیونکہ مجھ سے غداری کی گئی تھی۔ سوسائٹی کے خلاف برے عزائم؟ ہاں، کیونکہ **1829** میں اس نے مجھے اپنی صفوں میں جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کی ضرورت مجھے صرف روٹی کمانے کے لیے تھی۔ روٹی کمانے کا حق تمام برے بھلوں۔ تمام دنیا کو حاصل ہے'' پھر چند صفحات کے بعد وہ مانتا ہے کہ جب اس کی جیب میں پیسے ہوں تو وہ ان سے جلد از جلد نجات چاہتا ہے، یہ 'جادوئی سوچ' ہے کہ اس کی بدنصیبی کی وجہ ہمیشہ اس کی 'اپنی غلطیاں نہیں' جب میں نے دیکھا کہ میری اپنی کسی غلطی کے بغیر میری جیبیں خالی ہو گئی ہیں تو میری نفرت اور بڑھ گئی۔ میں نے آخر کار تمام بنی نوع انسان کو اس نفرت میں شامل کر لیا۔ روسو سے اس نے سیکھ لیا تھا کہ ہماری بربادی کے ذمہ دار دولت مند ہیں۔ چنانچہ وہ گیا اور ایک بے چاری بوڑھی عورت اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا۔ جو معمولی سطح پر کرنسی کا کاروبار کرتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس کی خود رحمی نے اسے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا کہ تمام احتیاطیں ترک کرے، کنٹرول سے باہر ہو جائے ایک درندہ کی سطح پر گر جائے اور اپنے آپ کو یقین دلاتا رہے کہ اس کی کوئی غلطی نہیں۔ جیل میں اسے وہ توجہ ملی جس کے لیے وہ تڑپتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہاں اس نے موج کی۔ اس حالت میں اسے ضرور خیال آیا ہوگا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ شہرت کے لیے جس کا وہ ہمیشہ سے متلاشی تھا وہ اپنے آپ کو کسی نظم اور ڈسپلن میں لا سکتا تھا۔ وڈوک کی طرح وہ دوسرا چانس لیتا اور خوش رہتا مگر دوسرا چانس اس نے یہ لیا کہ ایک بہادر کی طرح سکون سے پھانسی لگ گیا یہ اس کا دوسرا بڑا کارنامہ تھا۔

اپنی آپ بیتی میں اس نے کہا ہے کہ 'میں صرف ایک نیکی جانتا ہوں جو تمام نیکیوں کی ہمسر ہے اور وہ نیکی طرز احساس ہے'

یہ تصور ہمیں اس کا اہل بناتا ہے کہ ہم سوچیں کہ معاشرہ میں کیا ہو رہا ہے اور جرم کے انداز، اس کی اصلیت کیوں روز بروز بدلتی رہتی ہے۔ غیر تعلیم یافتہ لوگ شاید اب بھی ڈیفو کے زمانہ

میں رہتے ہوں مگر لیسینئر جیسے سینکڑوں ہزاروں لوگ گھٹیا ناولوں کے گرویدہ تھے اور مادی دنیا کے بجائے اپنی خیالی دنیا میں رہتے تھے۔ تخیل کی دنیا میں قدم رکھ کر وہ بے پڑھوں کی نسبت زیادہ حساس ہو گئے تھے۔ مگر اس طرح وہ مایوسی، حوصلہ شکنی اور خود رحمی کے شکار بھی ہوئے۔ خود اپنے جذبات کے قیدی بن گئے اپنے مسائل کا سامنا جرأت اور ہمت سے کرنے کے بجائے جادو کے کرتب دکھانا شروع کر دیے اور ان مسائل میں الجھ گئے جن کا کہیں کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اپنی مایوسی کی حالت بیان کرتے ہوئے لیسینئر کہتا ہے کہ ''میں ایک گھنٹہ میں دس سال جیا ہوں میں اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہتا تھا اور یہ وقت مجھ پر بار بار آیا۔ اس لیے میری زندگی ایک طویل خودکشی ہے''

امریکہ میں انہی دنوں ایک نوجوان فوجی کیڈٹ بھی (کہ جس کی جسمانی ساخت لیسینئر جیسی تھی) یہی کچھ کر رہا تھا۔ شعر کہنا، فرض سے غافل ہونا، خوب شراب پینا دوستوں اور رشتہ داروں سے الگ رہنا اس کا شیوہ تھا۔ ایڈگر ایلین پو، نو برس لیسنیر سے چھوٹا تھا۔ اس نے جرم کے بجائے ادب کا رخ کیا تھا مگر ان دونوں کی زندگی کا موازنہ کریں تو ان میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے ٹائپ کی دو انتہائی ہیں جن میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کی اکثریت لیسینئر اور ایلین پو کی صلاحیتوں سے محروم تھی مگر ناول نے انہیں ایک مبہم اور موہوم سا جذبہ دیا کہ وہ زندگی میں اس سے زیادہ کے مستحق ہیں جو انہیں مل رہا ہیا مل سکتا ہے۔ سوشلسٹ تحریروں نے اس جذبہ کو جواز دیا کہ لوگوں کی اکثریت اس لیے محروم ہے کہ ایک بہت چھوٹی اقلیت نے معاشرہ کی دولت پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ خیال ہی لیسینئر کو اس راستہ پر لایا کہ اپنی بہتری کی کوشش کے بجائے لوگوں کو چھرے مارتا پھرے اور جس نے جو کچھ اپنی محنت سے کمایا ہے اسے لوٹ لے یا کمانے والے کو قتل کر دے۔ سوشلزم اگرچہ ہمدردی اور انسانیت کے تصور سے شروع ہوا تھا۔ مگر جلد ہی کریمنلٹی کا ''جادوئی'' جواز بن گیا۔

امریکی معاشرہ نے ہمیشہ انسان کی انفرادی صلاحیتوں کو نکھارا ہے۔ اس لیے یہ حیرانی کی بات نہیں کہ امریکہ میں جرائم کی یہ انفرادی خصوصیت یورپ کے جرائم سے بہت پہلے ظاہر ہوئی۔ **1776** میں اٹھارہ سالہ حسین لڑکی بتھشیبا رگلز کی شادی ایک دولت مند زمیندار جوشوا سپونر سے ہوئی جو عمر میں اس سے کئی سال بڑا تھا۔ شادی اس کے باپ جنرل ٹموتھی رگلز نے طے کی تھی۔ بتھشیبا نے سسرال جا کر معاشقے شروع کر دیے۔ **1776** میں بتھشیبا اپنے باپ کی طرح کنگ جارج کی زبردست حامی تھی۔ جبکہ اس کا شوہر علیحدگی پسندوں کا حامی تھا۔ ایک روز کوئی سولہ

سالہ سپاہی سامنے کے دروازہ سے گزرا۔ بتھشبا نے اسے کھانے کی دعوت دے کر اندر بلا لیا۔ سولہ سالہ ایڈ راراس جلد اس کے عاشقوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ فروری 1877 میں بتھشبا نے دو انگریز سپاہیوں کو کھانے پر بلایا جو امریکی جیل سے بھاگے تھے۔ اس نے راس اور دونوں انگریزوں کو اپنے شوہر کے قتل کی ترغیب دی۔ یکم مارچ 1878 کو انہوں نے اسے گلا دبا کر مار دیا اور لاش کنوئیں میں پھینک دی۔ اگلی صبح بتشبیا نے شوہر کے لاپتہ ہونے پر سخت پریشانی ظاہر کی۔ تلاش کرنے والوں کی ایک پارٹی نے سپونر کی لاش ڈھونڈھ لی جس کے کپڑے بھی اتار لیے گئے تھے۔ تینوں قاتل دورسٹر کے قریب ایک سرائے میں ٹھہر گئے۔ جہاں انہوں نے کچھ رقم خرچ کی جو بتشبیا نے انہیں دی تھی۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ انہوں نے فوراً اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ اوروں کے ساتھ بتیشیا کو بھی سزائے موت ہوئی۔ اس نے یہ کہہ کر کہ وہ حاملہ ہے سزا ٹلنے کی بہت کوشش کی مگر کسی نے اس پر اعتبار نہ کیا۔ سزا کے بعد جب پوسٹ مارٹم کیا گیا تو پتہ چلا کہ وہ پانچ مہینوں سے حاملہ تھی۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ بتھشبا کا انتظار کیتھرین ہیس کو نصف صدی سے تھا۔ مگر ہیڈن برگ کے جان ہوور نے اس کمال کا مظاہرہ کیا کہ جس کی کوئی مثال نیوگیٹ کیلنڈر میں نہیں۔ جب اس نے الزبتھ شلٹر سے شادی کی تو اسے توقع تھی کہ اپنے باپ کی وراثت سے اسے حصہ ملے گا۔ مگر جب پیٹر شلٹر 1795 میں فوت ہوا تو اس نے اپنی جائداد کا بڑا حصہ اپنے دو بیٹوں پیٹر اور فرانسس کے لیے چھوڑا۔ الزبتھ کے حصہ میں صرف ایک ہزار ڈالر آئے۔ ہوور نے وصیت نامہ کو عدالت میں چیلنج کیا مگر ناکام ہوا۔ پھر وہ دونوں بھائیوں کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ اس نے ان کے باپ کو خواب میں دیکھا ہے۔ جس نے تاکید کی ہے کہ وراثت کی مساویانہ تقسیم کی جائے۔ مگر دونوں بھائیوں نے اس کا یقین نہ کیا ہوور نے انہیں ڈرایا کہ ان کے باپ کی بات نہ مانی گئی تو وہ انہیں ڈرائے گا اور زندگی بھر ان کا پیچھا کرے گا۔ کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ سن کر دونوں بھائی جاگے تو صحن میں جا کر دیکھا کہ ہوور منہ سے ڈراؤنی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ان کے باپ کی روح نے اسے یہاں بلایا ہے۔ اس دفعہ انہوں نے اسے اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا۔

دو برس بعد وہ ایک سرائے میں گیا اور چار آئرش مزدوروں سے باتیں کرنے لگا اور انہیں دونوں بھائیوں کے قتل پر آمادہ کیا۔ اس وعدہ پر کہ ان کی دولت آپس میں بانٹ لیں گے کرسمس کے تین روز بعد مزدور شلٹز ہاؤس میں داخل ہوئے۔ فرانسس کو کان میں گولی مار کر ہلاک کیا۔ پھر کلہاڑے سے اس پر وار کیے۔ پھر انہوں نے پیٹر کے کمرہ میں جا کر اس پر حملہ کیا۔ مگر پیٹر

کھڑکی سے کود کر بھاگ جانے میں کامیاب ہوا۔ جس آسانی سے ڈاکو گھر میں داخل ہوئے اور ٹھیک بیڈ روموں تک پہنچے اس سے شک پیدا ہوا جس پستول سے فرانس قتل کیا گیا تھا وہ بھی برآمد ہو گیا۔ پستول کا مالک ایک آئرش مزدور تھا۔ انہوں نے ہوور کو بھی ملزم ٹھہرایا اور پانچوں کے خلاف مقدمہ دائر ہوا۔ صرف ہوور اور پستول کے مالک مانوس پر فرد جرم لگائی گئی۔ ہوور نے پولیس کو اپنے پاگل ہونے کا یقین دلانے کی پوری کوشش کی کبھی کپڑے پھاڑ کر برہنہ ہوا اور کبھی اپنے قریب آنے والے ہر شخص کو کاٹنے لگا۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ جولائی 1798 میں اسے پھانسی دے دی گئی۔

اٹھارویں صدی کے خاتمہ پر یورپ کی نسبت امریکا قانون کا زیادہ احترام کرنے والا ملک تھا۔ اخلاقیات کی گرفت مضبوط تھی۔ دیہی علاقوں میں بڑے جرائم تقریباً ناپید تھے۔ چور ڈاکو تھے مگر ان کی زندگی مختصر تھی۔ اوہیو کے جنگل میں بگ ہوپ اور لٹل ہوپ نامی دو ڈاکوؤں نے درجنوں شکاری قتل کیے مگر آخر مارے گئے۔ بگ ہوپ کو قتل کر کے اس کا سر کاٹ لیا گیا۔ لٹل ہوپ بھاگ گیا۔ اگلے سال میسن نامی ایک قاتل کا سر ایک شکاری بل سٹین نے تن سے جدا کر دیا مگر سٹین کی بد قسمتی کہ اسے میسن سمجھ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ حالانکہ میسن کا سر شناخت کے لیے ایک جار میں رکھا گیا تھا۔

حیرانی ہے کہ اس عرصہ میں زیادہ جرائم غلاموں نے کیے۔ پومپ، ایک غلام نے 1795 میں اپنے آقا چارلس فربش کو اس لیے قتل کیا کہ فربش نے اسے کوڑے مارے تھے اور رات بھر باندھے رکھا تھا۔ 1794 میں ایڈمنڈ فورس نے پامیلا ٹلٹن آف ویسل بودھ کو ریپ اور قتل کیا۔ 1803 میں کاٹو ایک غلام نے چیسٹر ٹن (نیو یارک) میں مے ایٹکن کو ریپ اور قتل کیا۔ 1800 میں ایک غلام جبریل نے رچمنڈ ورجینیا کے قریب ایک ہزار کالوں کی فوج تیار کی کہ گوروں کو قتل کیا جائے اور کئی گورے قتل بھی کیے اس سے پیشتر کہ ملیشیا نے آکر اس کی فوج کو شکست دے، نیو جرسی میں سائرس ایمیلی نے اپنے آقا ہمفری وال کو قتل کیا۔ 1831 میں ایک غلام نٹ ٹرنر نے ورجینیا میں ایک نیگرو بغاوت کی قیادت کی اور گرفتار ہونے سے پہلے پچاس سفید فام قتل کیے۔ مقدمہ کے دوران نٹ ٹرنر نے جیوری سے کہا کہ 'میں نے خموشی اور اطمینان کے ساتھ مقتولوں کی بگڑی ہوئی لاشیں دیکھیں جن میں بچے بھی شامل تھے پھر فوراً اوروں کی تلاش میں چلا گیا'۔

نفرت پر مبنی قتل کا یہ ابتدائی دور تھا ایک طبقہ کی حیثیت سے نیگرو گوروں کی نسبت اپنی

نفرت کے لیے بہتر جواز رکھتے تھے اس لیس یہ حیرانی کی بات نہیں کہ ان میں سے بعض افراد معاشرہ کے خلاف لیسینئر جیسا رویہ اپنائیں۔'ریپ قتل' کے معاملہ میں بھی غالباً یہ بات صحیح ہے سفید فام عورت روایتی 'ممنوعہ' کی نمائندہ تھی چنانچہ نیگرو پر حرام تھی۔اس لیے 'ریپ قتل' جتنا جنسی جرم تھا اتنا ہی سماجی جرم بھی تھا۔

امریکا کا پہلا اجتماعی قاتل، سموئیل گرین بھی نفرت کی بنا پر قتل کرتا تھا۔اس لحاظ سے وہ کارل پنیزرم کے بہت قریب تھا۔**1800** میں میریڈتھ (نیوہیمپشائر) کے اندر پیدا ہو۔گرین پیدائشی چور تھا۔اس نے ابتدائی عمر میں چوری شروع کی تھی۔ایک لوہار کا شاگرد تھا، چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔اس لیے اسے کوڑے مارے گئے۔اور گھر واپس بھیج دیا گیا۔اسے پھر کوڑے لگے تو اس نے اپنے کتے کو کوئیں میں پھینک دیا۔جس سے کنوئیں کا پانی آلودہ ہو گیا۔اسے پھر سزا دی گئی تو اس نے کسی پالتو جانور کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا۔پھر وہ ڈن نامی ایک شخص کے ساتھ رہنے کے لیے نیوہیمپٹن چلا گیا۔پرانے سائیکل چرانا اور کوڑے کھانا پھر اس کا معمول بن گیا۔دو دفعہ اس نے ڈن کے قتل کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔اس دفعہ اسے اتنا مارا گیا کہ لہولہان ہو گیا اور گوشت اس کے زخموں سے پھوٹ کر باہر آ گیا۔آخر اس نے ایک اپنے جیسے آوارہ گرد ایلش کے ساتھ دوستی کی اور ایک جعل ساز کے ساتھ کام کرنا شروع کیا جو ان کے ذریعہ جعلی کرنسی بازار بھیجتا تھا۔ ان دنوں کا ایک واقعہ گرین کی انتقامی ذہنیت ظاہر کرتا ہے۔اس نے ایک تیز رفتار برف گاڑی کے نیچے لکڑی کا ایک بہت بڑا ٹکڑا پھینک کر اسے الٹا دیا۔جس سے اس میں سوار کئی بچے زخمی ہو گئے۔ سکول ماسٹر نے ایلش اور گرین دونوں کو مار مار کر بے حال کر دیا کچھ دیر بعد دونوں باہر جا کر اس کا انتظار کرنے لگے۔وہ آیا تو اسے مار مار کر بے ہوش کر دیا اور برہنہ حالت میں باندھ کر سردی سے ٹھٹھر کر مرنے کے لیے وہیں چھوڑ دیا۔خوش قسمتی سے وہ مرنے سے پہلے لوگوں کو مل گیا۔

گرین کا پہلا قتل جیولری کے ایک سیلز مین کا قتل تھا جسے وہ اور ایلش ایک سرائے میں ملے تھے۔جو نیوہیمپشائر میں واقع تھی۔انہوں نے موقعہ پا کر اسے لوٹا اور سوچنے لگے کہ اسے مارنا کیا ان کے لیے بہتر ہو گا۔"ایک مرا ہوا مرغا کبھی بانگ نہیں دیتا" ایلش نے کہا اور گرین نے اس کا کام تمام کر دیا۔

گرین پھر مغرب کا روایتی 'برا آدمی' بن گیا۔چوری میں مہارت اور مداخلت پر قتل اس کا معمول ہو گیا۔کوئی نہیں جانتا کہ گرین نے کتنے قتل کیے مگر وہ جلد ہی امریکہ کا انتہائی مطلوب مجرم قرار دیا گیا۔**1820** میں اس کا کیریئر اپنے انجام کو پہنچا۔جب وہ نشہ میں ایک سٹور سے چوری

کرتے ہوئے پکڑا گیا۔اسے چار سال قید کی سزا ہوئی۔سزا کاٹنے کے لیے اسے بوسٹن بھیجا گیا۔ کئی بار اس نے جیل سے بھاگنے کی کوشش کی اور ہر بار نا کام ہوا جس سے اس کی سزا میں بار بار اضافہ ہوا۔آخر اسے پتہ چلا کہ ایک نیگرو قیدی ولیمز نے اس کے فرار کی آخری کوشش کے بارے میں گارڈز کو خبردار کر دیا تھا۔ایک صبح وہ ولیمز کو گھیرنے میں کامیاب ہوا اور اسے مار کر بے ہوش کیا اور پھر اس کی باہیں، پسلیاں اور لاتیں بڑے اہتمام اور سکون کے ساتھ توڑیں۔ولیمز زخموں سے چور ہو کر مر گیا اور گرین اپریل 1822 میں پھانسی لگ گیا۔پینزرم کے برعکس اس نے اپنے جرائم کی کہانی نہیں لکھی۔اس لیے ہم 1878 سے 1820 تک اس کی دوسالہ مجرمانہ سرگرمیوں کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ زوردار شخصیت کا مالک تھا اور پینزرم کی طرح اسے بھی جھکانا مشکل تھا۔وہ لیسینئر کی قسم کا قاتل تھا۔جس کے لیے قتل اس کے اظہار ذات کا بگڑا ہوا ذریعہ تھا۔اس لیے کہ وہ لیسینئر سے چودہ برس پہلے پھانسی لگا تھا ہم اسے جرائم کی نئی تاریخ کا 'پہلا قاتل' کہہ سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے باقی حصہ میں مجرم کا یہ ٹائپ عام ہوتا گیا۔اس صدی کے آخر میں نیٹشے سے سڑن برگ کے نام خط میں ایک قاتل پراڈو کا ذکر کیا ہے۔'جرائم پیشہ خاندانوں کی تاریخ ہمیں واپس اس افراد کی طرف لے جاتی ہے جو اپنے مخصوص سماجی ماحول سے زیادہ طاقتور تھے۔ پراڈو اس کی کلاسیکی مثال ہے۔پراڈو اپنی سمجھ، جرأت اور ضبط نفس کے لحاظ سے ججوں بلکوں وکیلوں سے بھی بڑھ کر تھا۔اس کے باوجود کہ مقدمہ کی پریشانی سے وہ جسمانی طور پر اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ بعض گواہوں نے اس کی پرانی تصویر کی مدد سے اسے پہچانا، پراڈو دراصل ایک اور لیسینئر تھا، ایک ڈاکو جو پہچانے جانے کی صورت میں قتل سے دریغ نہیں کرتا تھا۔1887 میں وہ ایک ہوٹل میں ڈاکہ ڈالتے ہوئے بھاگا تو پکڑا گیا۔مگر اس سے پہلے اس نے پولیس پر گولی چلا کر ان کا آدمی زخمی کر دیا۔کچھ عرصہ بعد جرائم میں ملوث ہونے کے باعث اس کی دو داشتائیں بھی پکڑی گئیں، انہیں جیل کے اندر ایک ہی کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ایک نے دوسری سے کہا کہ ایک طوائف میری آگیٹن کو پراڈو نے پچھلے سال قتل کیا۔اس کا گلا کاٹا اور زیور لے کر بھاگ گیا۔ڈیوٹی مجسٹریٹ کو بھی اس واقعہ کا پتہ چل گیا۔پولیس نے وہ جیولر بھی تلاش کر لیا جس نے پراڈو کو پہچان لیا کہ اسی شخص نے میری کا زیور اس کے پاس بیچا تھا۔عدالت میں پراڈو نے آپ اپنی وکالت کی اور جیسا کہ ایچ بی اروِنگ نے اپنی .... میں لکھا ہے۔''خوب پڑھا لکھا، مناسب الفاظ سے مالا مال، نہ ختم ہونے والا احتجاج، ججوں کو مسترد کرتا ہوا، مگر سب بے کار، اسے پھانسی دے دی گئی۔

موت کی کوٹھڑی سے اس نے ایک دوست کو لکھا 'سمجھدار آدمی کے لیے قانون نام کی کوئی چیز نہیں۔ کوئی قانون غلطی اور استثنیٰ سے پاک نہیں اس لیے ہر سمجھدار آدمی کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ قانون کا احترام کرے یا اسے توڑے'

مگر لیسینئر کی طرح پراڈو بھی پیدائشی ایکٹر تھا۔ نیٹشے کا خیال درست ہے کہ پراڈو ایک فرد کی حیثیت سے اپنے مخصوص سماجی ماحول سے زیادہ طاقتور تھا۔ مگر جب وہ یہ کہتا ہے کہ پراڈو ضبط نفس میں اپنے ججوں سے بڑھ کر تھا تو یہ حقیقت نہیں رومان ہے۔ مقدمہ کی کارروائی سے پتہ چلتا ہے کہ اسے باتیں کرنے کا بہت شوق تھا، جب اسے ٹیلی ویژن پر آنے کا موقعہ ملا تو اس نے اس موقعہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔ 'عقلمند آدمی' کے متعلق اس کی باتیں ایک مجرم مارکس ارلیٹس کی باتوں جیسی ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ محض ایک طوائف کا گلا کاٹنے کی وجہ سے وہ عدالت کے کٹہرے میں تھا۔

قاتل کے متعلق جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ اس کا 'غلط اندازہ' ہے۔ لیسینئر خود اپنے اندر احساس کی کمی کا ذکر اس وقت کرتا ہے جب وہ قتل کرتا ہے۔ جیسے وہ دور کھڑا ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ بنیادی طور سے یہ فکر و عمل کا تضاد ہے، حقیقت سے فرار ہے۔ یہی بات ہم اس دور کے ایک اور اہم مقدمہ میں دیکھتے ہیں۔ جین بپٹسٹ ٹراپ مین **1869** میں السا ک کے اندر پیدا ہوا۔ وہ ایک غریب مکینک کا بیٹا تھا۔ سیموئیل گرین اور لیسینئر کی طرح اس کا باپ بھی اس سے بدسلوکی جبکہ ماں پیار کرتی تھی۔ ہم جنس پرست تھا۔ سکول میں اسے ڈرایا دھمکایا جاتا مگر جب اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جاتا تو وہ اس طرح مارنے مرنے پر تیار ہو جاتا کہ بالآخر انہوں نے اس کا خیال چھوڑ دیا۔ باپ کی ورکشاپ میں کام کرتے ہوئے اس کا بھائی اسے ڈراتا دھمکاتا ایک دن اس نے ہتھوڑا لیا اور ایڈورڈ کے منہ پر دے مارا۔ اس کے بعد ایڈورڈ نے اس کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔

ٹراپ مین کھلاڑیوں کی طرح باقاعدہ ورزش کرتا یہاں تک کہ اس کا جسم مضبوط اور طاقتور ہو گیا۔ یوجین سو کی فرضی اور خوفناک کہانیاں '**The Whilbring Tea**' وہ بار بار پڑھتا۔ غالباً زہر سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے چھپ کر کیمسٹری کا مطالعہ کیا کرتا۔ غرضیکہ دنیا میں نام پیدا کرنے کے لیے کئی منصوبے تیار کرتا تھا۔

دنیا میں نام پیدا کرنے والے مقتولوں میں اس کا ایک منصوبہ بیک وقت تمام خاندانوں کو ہلاک کرنا تھا۔ جب ایک دولت مند بزنس مین کنک اسے ملا تو اس نے کنک کو کئی منافع بخش

سکیموں میں سرمایہ کاری کے لیے کہا لیکن کنک نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے انکار کر دیا۔ آخر ٹراپ مین کسی کاروباری کام کے بہانے اسے ساتھ لے گیا۔ گاؤں جا کر اس نے کنک کو شراب کا گلاس دیا جس میں سانا ئیڈ تھا۔ اس کے پینے سے کنک فوراً مر گیا۔ ٹراپ مین نے اسے جنگل میں دفن کیا اور اس کے بڑے بیٹے گستاؤ کو گاؤں اپنے ساتھ لے گیا۔ اسے بھی ہلاک کر کے دفن کیا، پھر میڈیم کنک کو اس کے پانچ بچوں سمیت شوہر ملانے کے بہانے پیرس کے قریب پنٹین لے گیا۔ ٹیکسی سے اترنے کو کہا، ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور کسی ویران جگہ لے جا کر سب کو مار دیا۔

دوسری صبح ایک مزدور نے سڑک پر خون دیکھا۔ خون کے نشانوں کے ذریعہ اس جگہ پہنچا جہاں زمین نئی کھدی ہوئی تھی۔ لوگوں نے لاشیں گڑھے سے نکالیں تو اندازہ ہوا کہ انہیں کسی سفاکی سے قتل کیا گیا تھا۔ ایک بچے کے کوٹ پر لگے ہوئے لیبل سے کنک فیملی کی شناخت ہوئی۔ ٹراپ مین لی ہیور سے گرفتار ہوا۔ جہاں سے وہ امریکہ بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے لوگوں کے سامنے پھانسی دی گئی۔ اور مشہور ناول نگار ترگنیف کو اس کی کوٹھڑی سے تختہ دار تک اس کے ساتھ جانے کی اجازت ملی۔ ترگنیف اس اکیس سالہ خوش شکل نوجوان سے متاثر تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی سزا کو بربریت سمجھتا تھا۔ اس کے ایک ہمراہی نے کہا کہ اسے ایسا لگا کہ ہم کسی عام مجرم کی سزا نہیں دیکھ رہے بلکہ یہ سال **1794** ہے اور ہم ایک ارسٹوکریٹ (امیر شخص) کی موت کا نظارہ کر رہے ہیں۔ تاہم ترگنیف نے اس جرم کی نوعیت کا ذکر کبھی نہیں کیا جس کے تحت ٹراپ مین کو سزا ہوئی۔

ٹراپ مین ایک اور قاتل تھا ایک اور شخص جو اپنے مخصوص سماجی ماحول سے زیادہ طاقتور تھا۔ پھر بھی جرم کے متعلق ناقابل فہم بات مجرم کے 'غلط اندازے' ہیں۔ ریڈ کلف ہائی وے قتل کی طرح اس قتل کا منصوبہ بھی واہیات اور مبالغہ آمیز تھا۔ اس نے اتنا احمقانہ منصوبہ کیوں بنایا؟ اس کا جواب ہمیں یوجین سو کی تصنیف **The Wardring Jew** سے ملتا ہے جسے وہ بار بار پڑھتا تھا۔ یوجین کا ناول پادری روڈین کے متعلق ہے۔ جو اپنے حلقہ کے لیے وسیع ترکہ اور جائداد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جو سائمن خاندان کے آخری سات ارکان وانڈرنگ جیو کے ورثا کے لیے بھی کافی ہو۔ وانڈرنگ جیو عیسیٰ کا مذاق اڑاتا تھا جس کی سزا تھی کہ مسیح کے دوبارہ ظہور تک دنیا میں بھٹکتا رہے۔ غرضیکہ وہ انہیں وراثت میں حق مانگنے سے روکنے کے لیے ہوتا ہے۔ ایک کو نشہ کی دوا دی جاتی ہے۔ ایک پاگل مشہور کیا جاتا ہے۔ ایک قرضہ کے سلسلہ میں قید ہوتا ہے۔ ظالم پادری کسی سے زہریلا مقدس پانی لے کر پیتا ہے اور ہلاک ہو جاتا ہے۔ 'وانڈرنگ جیو' ٹراپ مین کے لیے

انجیل تھی۔ اسی لیے وہ سانائیڈ اور اس کے اثرات کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ مگر اس نے فادر روڈین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سارے خاندان کو ہلاک کر دیا۔ ٹراپ مین اپنی بلکہ یوجین سو کی خواہشات کا غلام تھا۔

دراصل ماسلو کے 'نظریہ ضرورت' کے تحت جرم کی نوعیت بدل رہی تھی۔ ماسلو کے مطابق انسان کی بنیادی ضرورت خوراک اور پانی ہے۔ زیادہ جرائم روٹی اور پانی کے لیے کیے جاتے ہیں۔ دوسری ضرورت چھت ہے جس کے نیچے سر چھپایا جا سکے امریکہ نے اپنی قائدانہ صلاحیت اور زراعت پیشہ لوگوں کی مدد سے ان دونوں میں یورپ پر سبقت حاصل کر لی تھی، جہاں بالخصوص بڑے شہروں میں مجرموں کی اکثریت نیم فاقہ کش تھی اور آسمان کی چھت تلے رہتی تھی۔ **1826** میں برک اور ہیئر کے جرائم بھی روٹی نمک کے لیے تھے۔ جبکہ بیتھیا سپونر، جان ہوورا اور سیموئیل گرین کے جرائم چھت کے لیے تھے۔ اگر چہ ان جرائم میں ان کے اس تکبر کا دخل بھی تھا کہ مجرم برے بھلے، صحیح یا غلط کا فیصلہ خود کر سکتا ہے۔

دراصل اس طرح کے جرائم انیسویں صدی کے خصوصی جرائم بن گئے تھے۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے بلکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے کہ جب ان کا ذکر ہو تو ہمیں انہیں انیسویں صدی کے جرائم کی خصوصیت سے پہچان اور یاد کر لیتے ہیں۔ ہمیں ایک میڈیکل کالج کے ڈاکٹر جان ویسیٹر کا خیال آتا ہے جس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر پارک مین کے سر میں ڈنڈا مار کر اسے ہلاک کیا۔ پھر لاش کے ٹکڑے لیبارٹری کی بھٹی میں جلا دیئے۔ کانسٹین کینٹ، سولہ سالہ سکول گرل جس نے اپنے چار سالہ سوتیلے بھائی کی گردن کاٹ کر لاش دفن کر دی۔ ڈاکٹر پچرڈ کا خیال آتا ہے جس نے گلاسکو میں اپنی بیوی اور ساس کو زہر دیا اور فلوریش کی براوو جس پر اپنے شوہر کو زہر دینے کا الزام لگا، میر لافریج جس پر آرسینک دے کر اپنے شوہر کو مار دینے کا الزام لگا۔ لزی بورڈن جس نے اپنے باپ اور سوتیلی ماں کو کلہاڑی سے ہلاک کیا۔ رگلے کا ڈاکٹر ولیم پامر جس نے اپنی بیوی بچوں اور کئی بدنصیب کاروباری ساتھیوں کو زہر دیا۔ میڈیلین سمتھ، جس نے اپنے عاشق کو زہر دیا اس لیے کہ نہیں مانتا تھا کہ وہ اس سے تھک چکی ہے۔ ان تمام جرائم پر وکٹوریائی عہد کی مہر لگی ہے۔ بنیادی طور پر یہ 'گھریلو قتل' ہیں ان کے کئی مقاصد ہیں لیکن سب سے بڑھ کر قاتل کا گھریلو امن اور تحفظ ہے۔ صرف ایک کنسٹانس کینٹ ہے جو اس فہرست میں شامل نہیں۔ مضبول دل و دماغ کی ایک قاتلہ جس نے نفرت کی وجہ سے قتل کیا اور اس کا اعتراف کر کے اپنے ضمیر کو اس کے بوجھ سے آزاد کیا اور تمام زندگی جیل میں گزاری۔ انسپکٹر جوناتھن وچر آف سکاٹ لینڈ یارڈ کی شاندار کارکردگی

کی وجہ سے اس کا مقدمہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ اس سے کولنز اور ڈکنز اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے آئیڈیل پولیس مین کی حیثیت سے اسے اپنے ناولوں میں جگہ دی۔

جرائم کی پرانی پرتشدد دنیا پیچھے رہ گئی تھی۔ صنعتی انقلاب نے دولت دی اور دولت نے تحفظ کا نیا شعور دیا کہ گھریلو استحکام زندگی کی بنیاد ہے۔ اٹھارویں صدی کا ناول ٹام جونز، رابنسن کروسو، پیری گرائن پکل، گل بلاس جیسے سیلانیوں اور آوارہ گردوں کے متعلق تھا۔ انیسویں صدی کے ناول اور اس کے کردار ایک مضبوط اور متوازن گھریلو ماحول میں زندہ ہیں۔ وکٹورین عہد کے لوگ فارغ البال قابل عزت لوگوں کے متعلق پڑھنا چاہتے تھے۔ جیسے سکوئر براؤن، بشپ پراؤڈک مسٹر پک وک اور جان ہیلی فکس وغیرہ۔ ان کا آئیڈیل بستر میں لپٹا ہوا، سونے کے لباس میں محفوظ بنجمن کا چھوٹا بچہ ہے۔ ڈکنز کرسمس کی عکاسی کرتے ہوئے اس احساس کو سب سے بہتر بیان کرتا ہے۔ چاہے وہ ڈنگلے ڈیل کا کھیت ہو یا کریچٹ کا خستہ حال گھر ہو۔ اس لیے وکٹوریائی قتل نان نمک کا معاملہ نہیں اس کی وجہ 'گھریلو تحفظ' ہے۔

سوشلزم کے فروغ کی بھی یہی وجہ ہے۔ اٹھارویں صدی کے غریبوں نے مان لیا تھا کہ وہ پیدائشی 'جنٹلمین' نہیں اور اپنی قسمت پر صبر کر لیا تھا۔ مگر انیسویں صدی کے غریب جاننا چاہتے تھے کہ ہمارے سروں پر چھت کیوں نہیں۔ ہمارے گھر ہر روز روٹی کیوں نہیں پکتی۔ ہماری کوئی باقاعدہ آمدنی کیوں نہیں حالانکہ سب کو یہ آسانیاں حاصل ہیں۔ اس سے 'علیحدگی' کا بے چینی کا احساس پیدا ہوا اور لوگ آپس میں دست وگریباں ہو گئے۔

وکٹورین (ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ کے لوگ) ڈکنز جیسے صاحب نظر وکٹورین بھی 'اجنبیوں' لیسینر جیسے 'اجنبیوں' کی روز بروز بڑھتی تعداد کا نوٹس نہ لے سکے۔ جنہوں نے اپنے آپ کو معاشرے کا حصہ سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا اظہار ادب میں پہلی بار **1888** میں ہوا۔ اس سال کا اکتوبر تھا جب ناروے کے ایک بیس سالہ نوجوان نٹ پیڈرسن نے **Hunger** کے عنوان سے ایک اسکیچ بنایا۔ جس میں اس نے فاقوں سے بدحال ایک شخص کو 'تنہا' ایک تاریک کمرہ (کرسچیانا اوسلو) میں رہتے ہوئے دکھایا۔ جو اپنے آپ کو 'جلاوطن' زندگی سے دور دھتکارا ہوا انسان کہتا ہے۔ جیسے کوئی شہری شہر سے کٹ کر تنہا جنگل میں رہتا ہو۔ دو برس بعد پیڈرسن نے کہانی کو پھیلا کر ناول بنایا اور اپنا نام بدل کر 'نٹ ہمسن' رکھا۔ اس کا ناول ایک بے حس، نامہربان سوسائٹی کے خلاف ایک فرد جرم ہے۔

اس سال **1888** میں ہی انگلینڈ کو اچانک اس اجنبی، اس یکہ وتنہا شخص کے وجود کا

احساس ہوا۔ 31 اگست کی صبح ایک مزدور نے کام کرتے ہوئے مشرقی لندن کے ڈسٹرکٹ وائٹ چیپل میں زمین پر پڑا ایک بنڈل دیکھا۔ بنڈل میں ایک نیم برہنہ عورت تھی۔ جسے ریپ کیا گیا تھا۔ یہ لاش اس جرم میں اضافہ کی علامت تھی۔ مزدور نے اس کا چہرہ چھو کر دیکھا وہ مر چکی تھی۔ بدنصیب عورت میری این نکولس ایک طوائف تھی۔ جو شام سے چند سکوں کے لیے بھٹک رہی تھی کہ ڈوس ہاؤس میں رات بسر کرنے کے لیے کرایہ ادا کر سکے۔

اسی علاقہ میں ایک ہفتہ کے بعد ایک اور لاش 29 ہینبس بری سٹریٹ سے ملی۔ لاش اس طرح بگاڑی گئی تھی کہ شبہ ہوتا تھا کہ قاتل انسانی اعضا کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔

لندن خبردار ہو گیا کہ کوئی پاگل جنونی قاتل درپئے آزاد ہے۔ پہلے قتل سے صدمہ ہوا تھا۔ دوسرے قتل سے سنسنی پھیل گئی۔ اب یاد آیا کہ ایک اور عورت شروع اگست میں جارج یارڈ بلڈنگز وائٹ چیپل میں قتل ہوئی تھی۔ جس کے جسم پر انتیس زخم تھے۔ ان دو وارداتوں سے ہر طرف اتنا ہی خوف پھیلا جتنا کہ 1811 میں ریڈکلف ہائی وے قتل کے موقعہ پر پھیلا تھا۔ پولیس نے درجنوں گرفتاریاں کیں۔ ہمسایوں کو جو شخص انوکھا اور عجیب نظر آیا وہ مشتبہ قرار پایا کئی بدحواس افراد نے قتل کا اعتراف کرتے ہوئے پولیس کا رخ کیا۔ ستمبر کے آخر میں قاتل نے اپنا نام 'جان دی ریپر' رکھ لیا۔ سنٹرل نیوز ایجنسی کو ایک دھمکی آمیز خط ملا ''میں جب تک گرفتار نہیں ہوتا ان آوارہ فاحشاؤں کے پرخچے اڑا دوں گا'' دستخط جیک دی ریپر، شرابیوں اور حواس باختہ افراد کی طرف سے 'جیک دی ریپر' کے نام سے خط آتے رہے، جن میں وہ قتل کا اعتراف کرتے رہے۔

'ریپر' کے خط سے دو روز بعد قاتل نے ایک رات میں دو وارداتیں کیں۔ برنر سٹریٹ کی انٹرنیشنل ورکرز ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ میں اس نے ایک طوائف الزبتھ سٹرائیڈ کا گلا کاٹ دیا۔ مگر ایک گھوڑا گاڑی کی آمد سے گھبرا کر بھاگ گیا۔ شہر جاتے ہوئے راستہ میں اس نے کیتھرین ایڈوز ایک طوائف کو مٹر سکوئر کے ایک کونے میں لے گیا۔ طوائف ابھی ابھی بشپ گیٹ پولیس سٹیشن سے رہا ہوئی تھی جہاں اسے نشہ اور بدامنی کے الزام میں لے جایا گیا تھا۔ ایک پولیس کانسٹیبل جو ہر پندرہ منٹ بعد سکوئر کا چکر لگاتا تھا۔ اس نے وہاں ایک لاش پڑی دیکھی جس کے گردے نکال لیے گئے تھے۔ دوسری صبح اس سے پیشتر کہ اخبارات کو خبر ملے۔ سنٹرل نیوز ایجنسی کو 'جیک دی ریپر' کا ایک اور خط ملا۔ جس میں معذرت کی گئی تھی کہ اس کے کام میں مداخلت ہوئی تھی جس کی وجہ سے وعدہ کے مطابق مقتولہ کے کان کاٹ کر ایجنسی کو نہ بھیج سکا۔ (کان کاٹنے کی کوشش ہوئی تھی)۔

چھ ہفتوں بعد 8 نومبر 1888 کو رپر نے اپنا آخری قتل کیا۔ اس دفعہ اس نے ایک پچیس سالہ آئرش طوائف میری جینٹ کیلی (ملرز کورٹ ڈوسیٹ سٹریٹ) کو اپنا نشانہ بنایا۔ صبح دو بجے وہ اپنے کمرہ میں قتل ہوئی۔ ہمسایوں نے 'قتل' کی چیخ سنی مگر توجہ نہ دی۔ رپر نے باقی رات لاش بگاڑنے میں گزاری۔ صبح اس کی لاش ملی تو اس کے سر تقریباً جسم سے الگ تھا۔ دل اس کے پاس تکیہ پر رکھا تھا۔ ایک بازو جسم سے تقریباً الگ کیا گیا تھا۔ قاتل نے اس کے چہرے اور ٹانگوں سے گوشت اتارنے میں ضرور کچھ وقت صرف کیا ہوگا۔

قتل کی وارداتیں ختم ہوگئیں مگر قاتل کی شناخت کبھی نہ ہوئی۔ پولیس کمشنر نے بیان دیا کہ قاتل جان ڈرٹ نامی ایک نوجوان ناکام بیرسٹر ہے۔ جس نے اپنے آخری قتل کے بعد ڈوب کر خودکشی کی ہے۔

عجیب بات ہے کہ وکٹوریہ عہد کے ان لوگوں کو صرف معمولی سا شک تھا کہ یہ جنسی قتل ہیں۔ کسی اخبار نے انہیں جنسی قتل نہیں لکھا۔ حالانکہ قاتل کو اخلاقی لحاظ سے پاگل اور دیوالیہ کہتے تھے۔ برنارڈ شا نے مذاقاً کہا کہ 'قاتل شاید سماجی ریفارمر ہے۔ جو مشرقی لندن کی حالت زار کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے' اس کا تبصرہ اس کے اندازہ سے زیادہ صحیح تھا۔ وہ جنون کی حد تک قتل وخون کا خواہش مند تھا۔ اس قدر نفاست پسند تھا کہ لاشیں ہمیشہ قاعدے اور ترتیب سے رکھتا تھا۔ مگر سب سے معنی خیز بات اس کا اپنے آپ کو معاشرہ سے بالکل الگ سمجھنا تھا۔ لیسنیئر کی طرح اسے غالباً بیگانگی، بے تعلقی کا احساس تھا۔ جو صرف اس وقت ختم ہوتا تھا جب وہ قتل کرے یا قتل کرنے کے خواب دیکھے۔ اگرچہ وہ سماجی حالات سے بے تعلق تھا اس کے باوجود مارکس کے 'الگ سماج' کی پیداوار تھا۔

اس عشرہ کا نہایت سنسنی خیز امریکی مقدمہ جو کئی لحاظ سے جیک رپر کے مقدمہ سے بھی زیادہ قابل ذکر ہے۔ ہرمن ویسٹر مگٹ 1860 میں نیو ہمپشائر کے اندر پیدا ہوا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں میڈیکل سٹوڈنٹ تھا۔ شادی کی، دھوکہ دہی کا آغاز یعنی انشورنس فراڈ ایک مریض کی نقلی موت سے کیا۔ جبکہ ابھی میڈیکل سکول میں تھا۔ وہ مورز فورکس، نیویارک سٹیٹ میں 1886 تک پریکٹس کرتا رہا۔ پھر شکاگو چلا گیا۔ جہاں جا کر ایچ ایچ ہومز بن گیا۔ اب اس نے قاتل کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کیا۔ ایک دوست ڈاکٹر لی کاک کو لائف انشورنس کی وجہ سے قتل کیا۔ دوسری بار شادی کی مگر اپنی بیوی کے انکل کے نقلی دستخط کر کے مصیبت میں مبتلا ہوا۔ مسز ہولڈن 63rd سٹریٹ اینگل وڈ کے ڈرگ سٹور میں اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا اور 1890 میں حصہ

دار بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد مسز ہولڈن لا پتہ ہو گئی اور ہومز ڈرگ سٹور کا مالک بن گیا۔ کاروبار میں اتنا کامیاب ہوا کہ اس نے سٹور کے سامنے نیا گھر بنایا۔ جو بعد میں 'قتل محل' کہلایا۔ اس کی ایک خصوصیت اس کے راستہ کی پھسلن تھی جو تہہ خانہ تک چلی جاتی تھی، پائپ تھے جن کے ذریعہ کمروں میں گیس بھر سکتا تھا۔ اس کا ایک واقف کار ڈاکٹر رسل کرسی کی چوٹ سے ہلاک ہوا تو اس کی لاش ایک میڈیکل سکول کے پاس بیچی گئی۔ جس نے اس ہلاکت کی وجہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

اس کے بعد ہومز نے روپیہ حاصل کرنے کے لیے اپنے ایک ساتھی کو قتل کیا جو مچھلی کے شکار پر اس کے ساتھ گیا تھا۔ ایک اور شخص چارلس کول کو بھی اسی لیے قتل کیا۔ اس کے سر پر اس زور سے کوئی ہتھیار مارا گیا کہ اس کی کھوپڑی ٹوٹ پھوٹ کر میڈیکل سکول کے لیے بے کار ہو گئی۔ پھر ایک گھریلو ملازمہ لیزا کا قتل کیا گیا کہ اسے ڈر تھا کہ اس چوکیدار لیزا کو لے کر بھاگنے والا ہے جبکہ اسے چوکیدار کی بہت ضرورت تھی۔ ہومز اس کی لاش بحری جہاز سے میڈیکل سکول بھیجنے والا تھا کہ اس کی سیکرٹری میرصی لہرا ایمپ ایک حاملہ عورت سارہ کک کو ساتھ لیے اندر آ گئی۔ ہومز نے دونوں کو ایک کمرہ میں دھکیل دیا۔ جہاں وہ گیس سے دم گھٹ کر مر گئیں۔

ایمیلی سگرانڈ اس کی نئی سیکرٹری اور داشتہ بھی بنی۔ جب اس نے بتایا کہ اس کی شادی ہونے کو ہے اس نے ایمیلی کو گیس کے کمرہ میں بند کر دیا اور حکم دیا کہ اپنے منگیتر کے نام منگنی ٹوٹنے کا خط لکھے۔ لڑکی نے خط لکھ دیا۔ پھر بھی ہومز نے اسے گیس میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود بیٹھا اس کی سسکتی ہوئی موت کے مزے لیتا رہا۔ بعد میں اس نے اعتراف کیا کہ وہ لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

چند مہینوں میں مزید دس افراد ہلاک کیے گئے۔ روپیہ کے لیے ہومز نے اب زہر بھی لوگوں کو دینا شروع کر دیا تھا۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں جن میں سے اکثر اس کی داشتائیں بھی تھیں۔ انہیں میں سے ایک لڑکی منی ولیمز بھی تھی۔ جس سے ہومز نے کئی ہزار ڈالر بٹور لیے تھے۔ ہومز نے اس کی بہن نینی کو گیس چیمبر میں ہلاک کیا اور اس کے بھائی کو بہکا کر اس کی انشورنس پالیسی کا وارث بھی بن گیا۔ بعد میں اسے اپنی جان بچانے کے بہانے گولی مار دی۔ منی بھی قتل کر دی گئی کیونکہ اس نے ایک انشورنس ایجنٹ کو بتا دیا تھا کہ 'محل' میں لگنے والی آگ دانستہ آتش زنی تھی۔

اس کے جلد بعد ہومز نے ایک شخص بنجمن پٹزل کو بھی جرائم میں شریک کر لیا۔ ہومز شروع سے ہی پٹزل کی جان کے درپے تھا۔ اس کے پہلے مشترکہ جرم نے ہومز کو پہلی بار جیل پہنچا

دیا۔اس نے سینٹ لوئیس میں ایک ڈرگ سٹور خریدا۔ڈرگ سٹور کا مال گروی رکھا اور پٹزل سے کہہ کر مال وہاں سے اٹھوا دیا۔اس نے دل روز جیل میں گزارے۔اس سے پیشتر کہ اس کی نئی بیوی جار جینز یوک ضمانت پر اسے رہا کرائے۔جیل میں ہی اس کی ملاقات مشہور ''ریل رہزن'' میریون ہیڈ پیتھ سے ہوئی۔ جسے اس نے انشورنس کے سلسلہ میں ایک فراڈ کا منصوبہ بتایا کہ کسی شخص کی زندگی کا بیمہ کر کے اسے اتفاقی حادثہ میں قتل کیا جائے۔ پھر اس کی لاش کی جگہ کوئی اور لاش رکھ دی جائے۔ ہیڈ پیتھ نے اسے انشورنس کے معاملات طے کرنے کے لیے ایک وکیل کا پتہ بتایا ہومز نے کامیابی کی صورت میں وکیل کو پانچ سو ڈالر ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

اگست 1894 میں پولیس فلاڈلفیا کے ایک گھر بلائی گئی۔ جہاں ایک لاش ملی تھی۔ لاش اس کی تھی جو کلوروفارم دھماکہ سے ہلاک ہوا تھا۔لاش دراصل پٹزل کی تھی اور ہومز بیمہ کی رقم کا وارث تھا۔انشورنس کمپنی نے اسے دس ہزار ڈالر ادا کیے مگر اس نے ہیڈ پیتھ یا وکیل کو ایک پیسہ بھی نہ دیا۔ ہیڈ پیتھ نے اس کا راز افشا کر دیا۔انشورنس کمپنی کو فراڈ کا پتہ چل گیا اور ہومز اچانک مطلوب شخص ہو گیا۔

دراصل ہومز پٹزل خاندان کے باقی افراد سے نجات حاصل کر رہا تھا۔کسی نہ کسی طرح اس نے مسز پٹزل کو آمادہ کر لیا کہ اپنے تین بچے باپ سے ملانے اس کے ساتھ بھیجے۔خوش قسمتی سے بروقت اس کا پتہ چل گیا جبکہ مسز پٹزل اور اس کے تین بچے ابھی زندہ تھے۔اسے فلاڈلفیا واپس لایا گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق پٹزل کی موت کلوروفام سے ہوئی تھی۔ایک سراغ رساں گیئر تین لا پتہ بچوں کی لاشوں کا پتہ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔دو لڑکیاں ٹورنٹو کے ایک تہہ خانہ میں دفن تھیں اور نو سالہ لڑکا انڈیانا پولیس کے قریب ایک گھر میں تھا مگر اب اس کی جلی ہوئی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔

موت کی سزا ہونے کے بعد ہومز نے اعتراف کیا کہ اس نے ستائیس قتل کیے تھے۔ ہومز نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے جرائم اس لیے کیے تھے کہ 'اپنے ہم جنسوں کے قتل سے' ان کی چیخوں سے لطف اندوز ہو، ٹارچر وقتل کے آلات اس کے 'قتل محل' سے برآمد ہوئے۔

ہومز پیدائشی اذیت پسند نہیں تھا، نیو یارک سٹیٹ میں اس نے آٹھ سال پریکٹس کی تھی۔اس کے ساتھ بیوی بچہ بھی تھے، اس کا رویہ بالکل نارمل تھا۔ایک دھوکہ باز تھا۔اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔رفتہ رفتہ قاتل بنا۔آغاز میں وہ صرف اس لحاظ سے نارمل نہیں تھا کہ عورتوں کا بہت شوقین تھا۔

ہومز کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی بڑھتی ہوئی بے حسی کے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی جسمانی خستہ حالی بھی شامل ہے۔ وہ لومبروسو کے ان متروکہ خیالات سے بھی واقف تھا کہ انسان کی ایک ایسی 'مجرمانہ قسم' موجود ہے جو عام نارمل انسان سے مختلف ہے۔ اسے اس تصور پر بھی یقین تھا کہ چہرے کے دو حصے، کردار کے دو مختلف پہلوؤں کے مظہر ہیں۔ بایاں نظری کردار جبکہ دایاں اکتسابی کردار کا حامل ہے۔ ہومز کو یقین تھا کہ اس کے جسم اور چہرے کا ایک حصہ زبوں حالی کا شکار ہے۔ ڈیوڈ فرینک اپنی 'ٹارچر ڈاکٹر میں (نیو یارک 1975) اس حالت کو قدیم سائنس آف کریمنالوجی کی علامت قرار دیتا ہے۔ 1886 مگر ہومز کے ایک فوٹو گراف سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے چہرے کی دو اطراف بالکل مختلف ہیں اور دائیں طرف خاص طور سے روبہ زوال ہے۔ وہ کہتا ہے کہ 'کہ میرے چہرے کی ایک سائیڈ اور ایک آنکھ اتنی بری طرح مسخ ہیں کہ ہال کینن (ہمعصر ناول نگا) میرے چہرے کی اس سائیڈ کو جرم اور شیطنت کا عکس سمجھتا ہے۔

جیک ریپر کی طرح ہومز بھی سماجی تاریخ کا ایک عبرت ناک باب ہے۔ مگر ریپر کی نسبت اس کی اذیت پسندی زیادہ سوچی سمجھی ہوئی اور باقاعدہ تھی۔ اگر ایسا ہے تو ریپر نے کیوں وائٹ چیپل قاتل کی طرح اپنے پیچھے خوفناک خیالی کہانیاں نہیں چھوڑیں؟ ایک وجہ یہ ہے کہ ریپر کبھی گرفتار نہیں ہوا۔ اس لیے لوگ اسے جن بھوت یا شیطان، جو چاہیں سمجھیں۔ ایک وجہ اور ہے کہ ہومز کے ہمعصر اس کے مقاصد کبھی نہیں سمجھ سکتے تھامس ایس ڈیوک کی ....

کے مطابق وہ دھوکہ باز تھا اور مال کی خاطر قتل کرتا تھا۔ اس کے اس اعتراف کو اہمیت نہیں دی گئی کہ اس نے کبھی قتل نہیں کیا۔ دوسرے اعتراف کو بھی ناقابل اعتماد سمجھا گیا۔ اکثر لکھاریوں کو یقین تھا کہ ہومز نے جرائم کی تفصیل میں مبالغہ سے کام لیا تا کہ اخبارات بڑھ چڑھ کر اسے اہمیت دیں۔ مگر ہم ان مقدموں سے واقف ہیں۔ جن میں سزایافتہ مجرموں نے اپنے جرائم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مسرت محسوس کی۔ اصل بات یہ ہے کہ مجرم کسی مبالغہ و جواز کے بغیر سچ اور صرف سچ بیان کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

اس کا اعتراف ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ ہومز اس مجرمانہ ذہنیت کا اعلیٰ ترین نمائندہ ہے جو نسل انسانی کا ورثہ ہے۔ مثلاً پہرے دار کو گیس چیمبر میں بند کرنا اور فاقوں مرنے دینا، پہرہ دار نے ہومز سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہومز کا جواب قاتلانہ غصہ تھا غصہ جو ایک رومی شہنشاہ کو ایک غلام کے ہاتھوں اپنی توہین پر آتا۔ اسی طرح ایملی کا اپنی شادی کی بات کرنے پر اسے گیس چیمبر میں دھکیل دینا اور اس سے منگنی توڑنے کا خط لکھوانا اس کے باوجود گیس

سے اذیت دے کر اسے ہلاک کرنا اسی مجرمانہ ذہنیت کی بھرمار نمائندگی ہے۔

ہم ہومز کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر ایک 'رائٹ مین' کو بھی اپنی بے سروپا انانیت چھپانے کا فن آنا ضروری ہے، اس کے لیے بھی نارمل نظر آنے کے سوا چارہ نہیں۔ صرف کوئی اٹیلا یا ہلاکو ہی دنیا کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ ہومز ایک رائٹ مین کی خوش فہمیوں، اس کی گہری اور بے ٹوک انانیت کو حقیقت بنانے چلا تھا۔ اس کا 'قتل محل' اس کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ اس کی قتل و ہلاکت اور ٹارچر کی مشینیں اس کی بے رحم انانیت کی بے گمان توسیع تھیں۔ جب وہ ایمیلی سگرانڈ کو دم توڑتے ہوئے دیکھ چکا تو اس کی لاش بھٹی میں جلا کر خاک کر دی۔ اس وقت سوچتا ہوگا کہ وہ دنیا کا سب سے طاقتور اور خطرناک انسان ہے اور شکاگو کی نمائش میں لوگوں کے درمیان چلتے ہوئے ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو انسان کے بھیس میں خدا سمجھتا ہو۔